بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

فتاویٰ حصاریہ

و

مقالاتِ علمیہ

مصنف

مولانا حضرت عبدالقادر حصاری

www.KitaboSunnat.com

کاوش و تحقیق

شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف

[illegible]

جمع و ترتیب

حضرت مولانا ابراہیم خلیل

[illegible]

ناشر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون

فتاویٰ حصاریہ

و

مقالاتِ علمیہ

مصنف

محقق العصر حضرت مولانا عبدالقادر حصاری رحمہ اللہ

جلد ششم

کاوش و پیشکش

شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف حفظہ اللہ

بانی دار الحدیث راجووال اوکاڑہ

جمع و ترتیب

حضرت مولانا ابراھیم خلیل حفظہ اللہ

آف حجرہ شاہ مقیم اوکاڑہ

ناشر

عبداللطیف ربانی مکتبہ اصحاب الحدیث

حافظ پلازہ مچھلی منڈی بالمقابل جلال دین ہسپتال

اردو بازار، لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب .... فتاویٰ حصاریہ ومقالات علمیہ

نام مصنف .... محقق العصر حضرت مولانا عبدالقادر حصاری رحمہ اللہ

کاوش وکوشش .... شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف (راجووال)

نام مرتب .... مولانا ابراہیم خلیل حجرہ شاہ مقیم

طبع اوّل 2012ء

مطبع .... العربیہ پرانی انارکلی لاہور

قیمت مکمل سیٹ .... سات ہزار روپے

تعداد 600

ناشر

مکتبہ اصحاب الحدیث

حافظ پلازہ، مچھلی منڈی بالمقابل جلال الدین ہسپتال، اردو بازار، لاہور

042-37321823 - 0301-4227379

فہرست عنوانات جلد ششم

نکاح کے مسائل

نکاح کے مسائل	۸
قانون مناکحت	۱۳
مناکحت بریلویہ کا حکم	۲۳
مسئلہ مناکحت بربنائے خطبہ علی الخطبۃ	۲۸
جوڑ ملنے پر بھی نکاح نہ کرنا	۳۹
داماد سے شادی کا خرچہ لینا	۴۲
ولیمہ اور نیندرہ	۴۶
کیا بوقت نکاح دولہا پھولوں کا ہار استعمال کر سکتا ہے؟	۵۲
مسئلہ جہیز	۵۳
حضور ﷺ کی کتنی شادیاں ہوئیں اور متوفیہ بیوی کے مہر کی ادائیگی کی کیا صورت ہے؟	۶۰
اسلام لانے سے پہلے کیا ہوا نکاح قائم رہتا ہے یا نہیں؟	۶۱
متوفیہ کے مہر کی ادائیگی وغیرہ	۶۲

ولایت کا بیان

ولی قریب کے ہوتے ہوئے دوسرے کا ولی بن کر النخ	۶۳
ولی کی اجازت کے بغیر نکاح درست نہیں	۶۳
بغیر اذن ولی کے نکاح کا حکم (ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حنفیہ کا معارضہ)	۶۹
ایک غلط فتوئی کی اصلاح	۷۱
الاعتصام کے ایک فتوئی پر تبصرہ	۷۴
نکاح سے متعلق دو مسئلے	۸۰

یہ نکاح حرام ہے	۸۲
ایک زانیہ اور ایک منکوحہ عورت کا نکاح	۸۳
تعاقب بر مسئلہ شروط نکاح	۸۵
تعقب بر تعاقب کلکتوی	۸۸
حرمت نکاح حلالہ	۱۲۶
نکاح حلالہ پر محققانہ تبصرہ	۱۳۴
مسئلہ نکاح شغار کی تحقیق	۱۴۱
فیصلہ علماء ابرار در حرمت نکاح شغار	۱۵۴
نکاح بٹہ اور فیصلہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ	۱۷۶
جواز نکاح بٹہ کی ناکام کوشش	۱۸۶
فقہ حدیث (نکاح شغار کا عام رواج)	۱۹۱
اشتہار ''نکاح شغار کیا ہے؟'' پر تبصرہ چیلنج منظور	۱۹۴
مسئلہ نکاح شغار (مولانا محمد داؤد غزنوی کا فیصلہ)	۱۹۹
نکاح بٹہ کے فیصلہ کے بارے میں ثالث کا تقرر	۲۰۲
احادیث شغار (روایت باللفظ اور روایت بالمعنیٰ کی بحث)	۲۰۶
نکاح شغار حرام ہے	۲۱۱
نکاح شغار جائز ہے یا نہیں؟	۲۱۴
کیا نکاح شغار فسخ ہو سکتا ہے؟	۲۱۵
جمعیتہ میانوالی کے رسالہ (نکاح شغار) پر تبصرہ	۲۱۶
مسئلہ نکاح بٹہ کے نزاع میں انعامی چیلنج	۲۳۰
جناب مولانا محمد ذکریا صاحب غزنوی و دیگر علماء کے فتوے	۲۳۳
اہل شغار کی نکاح بٹہ پر عجیب دلیل	۲۴۸

زانی، زانیہ کے نکاح کا حکم

زانی زانیہ کے نکاح کا حکم	۲۵۱

نکاح حاملہ بالزنا کی تحقیق	۲۵۹
زانی زانیہ کے نکاح کا کیا حکم ہے؟	۲۷۴
مذہبی زناکاری	۲۸۳
تائب کی توبہ	۲۹۱
کیا ابو شحمہ کو زنا کی حد لگائی گئی؟	۲۹۴
زانی زانیہ کی مناکحت میں حنفیہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا معارضہ	۲۹۴
نکاح حبلی بالزنا	۲۹۶
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک صاحبزادہ اور کوڑوں کی سزا	۳۰۰
مسئلہ نکاح زانیہ (اعتصام کے ایک فتویٰ پر نظر)	۳۰۴

طلاق کے مسائل

شوہر مفقود الخبر کی بیوی کے متعلق سوال	۳۰۹
عدت گذر جانے پر بیوی زوجیت میں رہتی ہے یا نہیں؟	۳۱۰
فتویٰ بابت طلاق ثلاثہ	۳۱۱
دھوکے کی طلاق	۳۱۱
مظلومہ بیوی کے متعلق سوال	۳۱۵
فتویٰ بابت طلاق ثلاثہ	۳۱۵
فتویٰ بابت طلاق ثلاثہ	۳۱۶
منکوحہ لونڈی کا بیچنا طلاق ہے یا نہیں؟ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حنفیہ میں مخالفت	۳۱۸
فتویٰ بابت خلع	۳۱۹
قاصر حق زوجیت سے بیوی شرعاً کیونکر چھٹکارا پا سکتی ہے؟	۳۲۱
مظلومہ بیوی کے متعلق استفسار	۳۲۴
مفقود الخبر کی بیوی اور اس کے ترکہ کے متعلق سوالات	۳۲۴
دھوکہ سے فسخ نکاح کا فیصلہ کالعدم سمجھا جائے	۳۲۵
مسئلہ طلاق ثلاثہ اور اس کی صحیح پوزیشن	۳۲۹

مذاکریہ علمیہ (سوالات علمیہ کے جوابات)	۳۵۰
مسئلہ خیار بلوغ	۳۵۴
طلاق مکرہ کا حکم	۳۵٦
مشروط طلاق	۳٦۰
مسئلہ طلاق	۳٦٦
مسئلہ عدت	۳٦۹
بیوی کی نافرمانی پر طلاق دی جائے تو الخ	۳۷۰
کیا مظلومہ بیوی بحالت مجبوری طلاق لے کر دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے؟	۳۷۱
زبانی طلاق	۳۷۳
ایک طہر کی متفرق طلاقیں	۳۷۴

قسم کے متعلقات

استفتاء بابت حلف	۳۸۸
ضمیمہ مضمون قسم لغیر اللہ	۳۹۲
اگر مدعی کے پاس شہادت نہ ہو تو قسم صرف مدعی علیہ پر ہوگی دوسرے کسی پر نہیں	۳۹۵
کیا نبی اکرم ﷺ کا حلف اٹھانا ثابت ہے؟	۴۰۱

خرید و فروخت کے مسائل

کیا دینی تعلیم پر اُجرت جائز ہے؟	۴۰۳
تعلیم دین پر اُجرت	۴۱۰
تعلیم دینیات پر اُجرت	۴۳۰
چڑھاوے کا خرید کیا ہوا جانور الخ	۴۴۰
اُدھار بیع کا مسئلہ 'نقد اور اُدھار میں فرق جائز ہے	۴۴۱
مسئلہ بیع سلم	۴۵۹
اُدھار بیع کی صورت میں قیمت کی زیادتی کا مسئلہ	۴٦۲

نقد اور اُدھار بیع میں نرخ کی کمی وبیشی کا مسئلہ	۴۶۶
مفتی شاکوٹی اور مولانا حصاری کے فتاوئی پر روپڑی رحمۃ اللہ علیہ محاکمہ	۵۰۱
حرام چیزوں سے علاج	۵۰۸
جنگی کی ملازمت' میونسپل کمیٹی کی ممبری الخ	۵۱۵
ایک تعاقب (فقہ حدیث)	۵۱۶
مسئلہ سود پر تحقیقی بحث	۵۱۸
فقہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور فقہ حنفیہ ایک تقابل	۵۳۲
دوکانات ومکانات کی پگڑی لینا حرام ہے	۵۳۵
دوکانات ومکانات کی پگڑی حرام ہے	۵۴۱
حدیث ربو	۵۴۴
زمین ایک بیگھے کے دو بیگھے الخ	۵۴۹

وراثت کے مسائل

لاولد متوفیہ کے ترکہ کے بارے میں سوال	۵۵۰
کیا ایسی لڑکی وراثت سے محروم کی جاسکتی ہے؟	۵۵۰
کیا بعض اولاد کو چھوڑ کر بعض کو بذریعہ تملیک جائیداد دی جاسکتی ہے؟	۵۵۲
کن کن گناہوں کی بنیاد پر اولاد کو وراثت سے محروم کیا جاسکتا ہے؟	۵۵۵
عاق اولاد کے لیے وعید سخت ہے تاہم الخ	۵۵۸
کافر اور عاق اولاد کی وراثت کا حکم	۵۷۱

نکاح کے مسائل

قرآن کریم پارہ۔۲۱ ' سورہ روم ' رکوع۔۶ میں ارشاد الٰہی یہ ہے : ومن اٰیاتہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یتفکرون۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ ہماری جنس کی ہماری بیویاں بنا دینا اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے۔ غیر جنس جن ' حیوان ہماری بیوی بنائے جاتے تو محبت پیدا نہ ہوتی۔ ہماری بیویاں ہماری جنس سے ایک قسم انسان ہیں ' اس لیے مردوں کو عورتوں سے سکون حاصل ہے اور آپس میں محبت اور رحم و ترس پیدا ہو رہا ہے ؎

کند ہم جنس باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

محبت اور آپس کا تعلق نکاح سے پیدا ہوتا ہے ' اس لیے یہ حکم ہے : فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنٰی وثلاث وربع۔ یعنی "تم ان عورتوں کو نکاح کرو جو خوش لگیں ' دو دو ' تین تین ' چار چار۔" لیکن ایک سے زیادہ کے نکاح میں عدل شرط رکھی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے : فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ۔ آج کئی بیویاں نکاح کرکے دوسری پر ظلم کر رہے ہیں ' ان کو فالج ہو گا ' ان کا ایک دھڑ مارا ہوا ہو گا۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ جنوں سے نکاح جائز نہیں۔

ابن عدی نے کامل میں یہ روایت ذکر کی ہے جس کو حیوۃ الحیوان جلد۔۱ ' ص۔۲۷ میں نقل کیا ہے : عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم احد ابوی بلقیس کان جنیا۔ لیکن یہ واقعہ سند نہیں ہو سکتا ' کیونکہ یہ نکاح کفار کا ہے جو قابل عمل نہیں ہے۔

ایک حدیث یہ نقل کی ہے : ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نھی عن نکاح الجن۔ پس صحیح مسئلہ ہے کہ انسان اور جن کا نکاح صحیح نہیں ہے۔ غیر جنسی حیوان سے بھی نکاح حرام ہے۔ مثلاً گھوڑی یا گدھی وغیرہ سے انسان نکاح کرے تو نکاح باطل ہو گا۔

ضلع بنوں کے ایک شخص موحد مسلمان خواندہ نے بیان کیا کہ ہمارے علاقے میں جب

کوئی حنفی پٹھان تین طلاق دے کر عورت حرام کر لے تو حلالہ اس طرح نکالتے ہیں کہ عورت کا نکاح کسی مرغ سے کرا کر پھر اس کو ذبح کر لیتے ہیں پھر عورت اپنے خاوند مرغ سے نکاح کی عدت وفات گذار کر پھر وہ پٹھان اس عورت بیوہ سے نکاح دوبارہ کر لیتا ہے۔ یہ حیلہ حرام ہے جو قیاس سے بنایا گیا ہے۔ اسی طرح جاہل جاٹ یہ حدیث اپنی بنا کر عمل کر رہے ہیں جو حرام ہے۔

مگر حدیث میں یہ آیا ہے کہ : عن ابن عباس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من اتی بھیمۃ فاقتلوہ واقتلوھا معہ۔

اگر جنس ایک ہو مگر ایک مرد ہو اور دوسرا ہیجڑا پھر بھی نکاح حرام ہے' دوسرا جوڑا عورت قابل اولاد ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ نسائی میں حدیث ہے' ایک شخص دربار رسالت میں آیا' اس نے بیان کیا کہ انی اجبت امراۃً ذات حسب ومنصب الا انھا لا تلد افلا اتزوجھا فنھاہ ثم اتاہ الثانیۃ فنھاہ ثم اتاہ الثالثۃ فنھاہ فقال تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم۔

علامہ مناوی نے کواکب دریہ میں لکھا " امام حسن رضی اللہ عنہ نے سات سو عورت سے نکاح کیا کہ وہ نکاح کے بعد جلد طلاق دے دیتے۔ آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو روک دیا کہ کوئی شخص اس کو نکاح نہ دے' یہ بہت طلاق دینے والا ہے۔ (رسالہ اصلاح ذات البین ص۔۸۴) مصنفہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم بھوپالی۔

تاریخ الخلفاء ص۔۱۴۶ میں ہے : کان الحسن رجلاً کثیر نکاح النکاح۔ نیز یہ لکھا ہے : کان الحسن طلاقًا للنساء۔

الحاصل ہیجڑا سے نکاح جائز نہیں ہے' اگرچہ ہم جنس ہے۔ اسی طرح مرد مرد کا ہم جنس ہے مگر آپس میں نکاح نہ ہو گا اور نہ عورت کا عورت سے نکاح ہو گا۔ اب اگر یہ باہم تعلق ناجائز پیدا کر کے نکاح والا معاملہ کریں گے تو یہ بدترین جرم ہے۔ حدیث میں ہے : من وجد تموہ یعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول بہ۔

(واقعہ) اخبار کی یہ خبر ہے کہ ہوشیار پور کے ایک فوجی کپتان کے پیٹ میں بڑا درد ہوا' آخر مجبور ہو کر اس کا آپریشن کیا گیا تو شکم سے دو بچے برآمد ہوئے۔

پس قانون فطرت یہ ہے کہ مرد عورت کا آپس میں جوڑا بنے' ان میں نکاح سے محبت اور شفقت پیدا ہو جائے گی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا : وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔

حدیث میں ہے: لم تر للمتحابین مثل النکاح۔ اس سچی محبت میں آکر اگر خاوند بیوی ایک دوسرے کو یہ کہیں کہ ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس لیے حکم یہ ہے کہ نکاح شادی سے پہلے مرد عورت ایک دوسرے کو دیکھ لیں تاکہ محبت پیدا ہو اور ایک دوسرے کو پسند کر کے نکاح میں راضی ہو جائیں' کیونکہ ناکح منکوحہ کی رضامندی نکاح میں شرط ہے۔

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو پیغام نکاح دیا' آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو اس کو فرمایا: ھل نظرت الیھا قلت لا قال فانظر الیھا فانہ احزی ان یودم بینکما۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لڑکی کو دیکھ کر نکاح کیا۔

<u>مقاصد نکاح:</u> نکاح کا مقصد انسانی نسل کو بڑھانا اور ترقی دینا ہے۔ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یہ حکم دیا ہے: تناکحوا وتوالد واتکاثروا۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام جن کا کام عبادت کرنا' تبلیغ کرنا' علم پڑھانا تھا' وہ بھی نکاح کرتے رہے اور ان سے اولاد ہوتی رہی۔ قرآن ناطق ہے: ولقد ارسلنا رسلا من قبلک وجعلنا لھم ازواجا وذریۃ۔ (پارہ ۱۳' سورہ ۳۸)

حدیث میں ہے: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اربع من سنن المرسلین الحیاء والعطر والسواک والنکاح۔ پس نکاح سنت واجبہ ہے اور جس شخص کو قوت کا زور ہو' اس پر فرض ہے۔ حدیث میں ہے: عن ابی نجیح رضی اللّٰہ عنہ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال من کان موسرا لان ینکح ثم لم ینکح فلیس منی۔

ابوذر رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث ہے' اس میں یہ وارد ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عکاف رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ھل لک زوجۃ قال لا قال ولا جاریۃ قال ولا جاریۃ وانت موسر بخیر قال وانا موسر بخیر قال انت اذاً من اخوان الشیاطین لو کنت من النصاری کنت من رھبانھم ان سنتنا النکاح وشرار کم عزالکم واراذل موتاکم عزالکم ابا لشیطان عروسون؟ ما للشیطان سلاح ابلغ فی الصالحین من النساء الا المتزوجون اولٰئک المطھرون المبرء ون من الفناء (الٰی قولہ) یاعکاف تزوج الافانت من المدبرین۔ (رواہ احمد' جمع

الفوائد) مجردوں کی برائی ثابت ہوئی' اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نکاح کی بڑی کوشش کرتے۔

تلخیص الحبیر جلد-۲' ص-۲۷۰ میں یہ روایت ہے: عن معاذ انه قال فی مرض موته زوجونی لا القی اللّٰه عزبا۔

درمختار میں لکھا ہے: لیس من عبادة شرعت من عهد اٰدم الی الاٰن ثم استمر فی الجنة الا النکاح والایمان۔

شامی میں ہے: عبادة من وجه ومعاملة من وجه۔

تیسری غرض نکاح سے گناہوں سے بچنا ہے' اس لیے آنحضور ﷺ نے قریش کے نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: من استطاع منکم الباة فلیتزوج فانه اغض للبصر و احصن للفرج ومن لم یستطع فعلیه بالصوم فانه له وجاء۔ (باة کا معنی نکاح)

جو شخص لڑکے' لڑکی کی شادی بالغ ہونے پر نہ کرے تو جو گناہ وہ کریں گے تو اس کا گناہ اس کے باپ کے ذمے ہو گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تین چیزوں میں دیر نہ کرو۔ نماز' نماز جنازہ اور بے خاوند والی عورت جس کا کفو موجود ہے۔

کفو دین کا تلاش کرنا واجب ہے: حدیث شریف میں ہے: الدنیا متاع وخیر متاع الدنیا المراة الصالحة۔ حدیث میں آیا ہے: تنکح المراة لاربع لما لها ولحسنها ولحسبها ولدینها فاظفر بذات الدین۔ دیگر حدیث میں ہے: ولا تزوجوا النساء لحسنهن فعسٰی حسنهن ان یردیهن ولا تزوجوهن لا موالهن فعسٰی اموالهن ان تطغیهن ولٰکن تزوجوهن علی الدین ولامة خرماء سوداء ذات دین افضل۔ (ابن ماجه)

مشرکوں' کافروں سے نکاح حرام: قرآن مجید میں ہے: ولا تنکحوا المشرکات حتّٰی یؤمن۔ "مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو۔" اسی طرح یہ ارشاد ہے: ولا تنکحوا المشرکین حتّٰی یؤمنوا۔ اور جگہ ارشاد ہے: لا هن حِلٌّ لهم ولاهم یحلون لهن۔ بلکہ کافرہ عورت کو عقد میں رکھنا بھی حرام ہے۔ اگر دونوں عقد کے وقت مسلمان موحد تھے پھر ایک نے شرک اور کفر کیا تب بھی نکاح ٹوٹ گیا۔

آج کل بدکار عورتوں' مشرکہ عورتوں' کافر عورتوں' مشرک مردوں سے مناکحت ہو رہی ہے' یہ نکاح باطل ہیں۔ زناکاری ہو رہی ہے' اولاد حرام کی پیدا ہو رہی ہے' تعزیہ پرست' قبر

پرست، پیر پرست، بت پرست، مشرک فی الرسالت جیسے مرزائی، منکرین حدیث، نیچری، چکڑالوی، پرویزی وغیرہ گمراہ فرقوں سے اہلحدیث اہلسنت سے مناکحت حرام ہے، نکاح نہ ہو گا۔ یہ آپس میں کفو نہیں، فاسق صالحہ کا کفوہ نہیں ہے۔

زانیہ کا عفیف سے اور عفیف کا زانیہ سے نکاح نہ ہو گا، حرام ہے۔ مگر آج کل دنیادار، زمانہ ساز، طمعی لالچی، نفس پرست، قوم پرست، مولوی، ملا، قاضی، عالم عبد الدینار وعبد الدرہم نکاح پڑھ رہے ہیں۔ یہ نکاح حرام ہے، عقد نہ ہو گا۔ اولاد حرام پیدا ہو گی۔

مولوی نور محمد صاحب حنفی سوتری فرماتے ہیں ؎

اوہ دوزخ سڑن جو بدعتیاں گھر دھیاں پت پرناون
جے جوائیاں نوہاں کراون توبہ اوہ پیارے تر جاون
اے بھائی نور غریب دا سوال بجا لیاویں
ستیاں سیتی سوت اکھیں کل گندیاں تھیں ٹٹ جاویں
جو دعویٰ ایمان بے دیناں تھیں دلوں پیار نہ توڑن
سن رب کہیا اوہ مومن ناہیں دوزخ دے ول دوڑن
بدعتیاں نال اہل ایماناں ساک جو کیتے اگلے
جوائیاں نوہاں کراون توبہ جے کوئی وس چلے
جے وس نہ چلے دھیاں پتر اونہاں کنوں نکھیڑن
جے نکھڑنا ہیں صبر کرن پر پھیر نہ ساک سہیڑن
جے نکھڑن ناہیں پر مندا جانن عاصی مومن ہوندے
جے چنگا جانن راضی ہوون اوہ بھی کافر ہوندے
آپوچہ سبھنیں نوں ساک کرن دیاں قادر دیہ توفیقاں
تاں غیر شرع دا داغ نہ لگے اہل شریعت لوکاں

یہ میرا یا مولوی نور محمد کا ہی فتویٰ نہیں بلکہ ہر مذہب والا اپنے مذہب والے کو یہی فتویٰ دے رہا ہے مگر لوگ باز نہیں آتے۔

عبدالقادر عارف حصاری

اعتصام جلد ۱۹، شمارہ ۲۸ مورخہ ۹/ فروری سنہ ۱۹۶۸ء

قانون مناکحت

اسلامی مشاورتی کونسل توجہ کرے

حکومت نے مملکت کو خالص اسلامی ملک بنانے کے لیے اسلامی مشاورتی کونسل مقرر کر رکھی ہے جو باہمی مشورہ سے اسلامی قوانین مرتب کر رہی ہے۔ اس لیے تمام اہل علم کو یہ موقعہ غنیمت سمجھ کر تمام فرق اسلامیہ کے عقائد اور مسائل متنازعہ کے پیش نظر ایسے مسائل جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں اور مسلمہ طور پر صحیح ہیں لیکن وہ حکومت اور مشاورتی کونسل کے پیش نظر نہ ہوں' اس طرح وہ مرتب اور نافذ ہونے سے رہ جائیں گے اور متنازعہ مسائل کی بنا پر مقدمات عدالتوں میں جائیں گے تو عدالت کے حکام کو فیصلہ صادر کرنے میں بہت دقت اور مشکل پیش آئے گی۔ اِس لیے اِس وقت محققین علماء اسلام کو توجہ فرمانی چاہیے کہ وہ ضروری قانون کو متنازعہ اور مختلفہ امور کے فیصلہ کے لیے کوئی صورت پیش کریں۔ مثلاً خاکسار بطور مشورہ ایک قانون مناکحت پیش کرتا ہے کیونکہ یہ بات مشہور ہے کہ پاکستان میں سب لوگ کلمہ گو مسلمان ہیں جو جملہ حقوق اسلامی کے مساوی حقدار ہیں۔ یہ بات اور عقیدہ غلط بلکہ باطل ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے فرقہ مرزائیہ کو جو کلمہ گو احمدی کہلاتے ہیں' تمام علماء عرب وعجم اور آئین پاکستان نے متفقہ طور پر دعویٰ نبوت کے پیش نظران کی تکفیر کر دی اور ان کو خارج از اسلام قرار دے کر ملک کی غیر مسلم اقلیت میں شمار کیا ہے جس سے متفقہ طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ ہر کلمہ گو فرقہ مسلمان نہیں اور شریعت اسلامیہ میں نیز تمام علماء اسلام بلکہ ہر فرقہ کے اہل علم کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ ہر کلمہ گو مومن مسلمان جنتی نہیں ہے۔

چنانچہ مختصر فتاویٰ مصریہ کے ص۔۹۳ میں یہ لکھا ہے: (ترجمہ) جس شخص کا یہ عقیدہ ہے کہ جس نے کلمہ شہادت پڑھ لیا وہ جنتی ہو گیا' دوزخ میں داخل نہ ہو گا' وہ شخص گمراہ ہے اور اس کا یہ عقیدہ قرآن وحدیث اور اجماع امت کے خلاف ہے۔

ترغیب وترہیب جلد۔۲' ص۔۴۱۳ میں محدث علامہ منذری رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں: (ترجمہ) اکابر علماء اسلام جو علم کے ستون تھے اکثر کا یہ مذہب تھا کہ جو احادیث مطلقہ اس بارہ

میں وارد ہیں کہ جس شخص نے کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھ لیا وہ جنتی ہو گیا اور دوزخ کی آگ اس پر حرام ہو گئی' یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا جبکہ صرف دعوت توحید دی جاتی تھی۔ پس جب دیگر احکام اسلامی فرائض وحدود نازل ہوئے اور آیت الیوم اکملت لکم دینکم نازل فرما کر دین کی حد بندی کر کے اس کو مکمل کر دیا گیا تو وہ احادیث مطلقہ مقید کر دی گئیں اور بعض علماء نے یہ فرمایا کہ دراصل اقرار کلمہ توحید میں بھی یہ امر داخل ہے کہ میں اللہ ورسول کو مانتا ہوں اور ان کے جملہ احکام اوامر ونواہی کی تعمیل کروں گا۔ یہ توجیہ بھی ٹھیک ہے۔

ایک حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آنحضور ﷺ جب مکہ معظمہ میں تھے تو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ باہر جنگل کی طرف نکلے تو ایک اونٹنی سوار آرہا تھا' جب آنجناب ﷺ کے قریب آیا تو اس نے دریافت کیا کہ میں نے مکہ میں ایک شخص سے ملنا ہے جس کا نام محمد ہے' وہ یہ کہتا ہے کہ جو شخص مجھ پر ایمان لایا اور میرا کلمہ پڑھا وہ جنتی ہو گیا' دوزخ میں نہ جائے گا' وہ شخص کہاں ملے گا؟ آنحضور ﷺ نے فرمایا وہ شخص میں ہوں اور ساتھیوں نے بھی تصدیق کر دی کہ وہ شخصیت یہی ہے۔ اس نے آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے یہ کہا کہ آپ کا کیا دعویٰ ہے اور کیا کہتے ہیں؟ آنجناب ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ جس نے یہ گواہی دی لا الہ الا اللہ ان محمد رسول اللہ وہ جنتی ہوا۔ اس نے کہا کہ آپ اس بات کے ذمہ دار اور ضامن ہیں کہ اگر میں نے یہ کلمہ پڑھ لیا تو جنت میں چلا جاؤں گا؟ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہاں میں ضامن ہوں' تب اس نے کلمہ مذکور پڑھ لیا اور اس نے اپنی اونٹنی کی مہار کو کھینچا اور اس کو اپنے راستہ کی طرف موڑا تو اس طرف کسی جانور کا چوڑا سا بل یا گڑھا تھا' اس میں اونٹنی کا پاؤں پڑ گیا' وہ گرنے لگی تو وہ کلمہ گو اس سے پہلے ہی اپنی گردن کے بل گرا۔ آنحضور ﷺ نے گرنے کے وقت لوگوں سے کہا کہ اس کو پکڑو لیکن وہ پہلے ہی زمین پر گر گیا اور اس کی روح گرتے ہی پرواز کر گئی۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا عمل قلیلا واجر کثیرا کہ تھوڑا سا عمل کر کے اجر کثیر حاصل کر گیا۔

پس حدیث من قال لا الہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ ایسے ہی مواقع پر دال ہے۔ امام بخاری علیہ رحمتہ الباری حدیث ہذا کے متعلق رقم طراز ہیں : هذا عند الموت او قبله اذا تاب وندم وقال لا اله الا اللّٰه ومات على ذالك غفرله وادخل الجنة۔ یعنی کلمہ سے دخول

جنت اس شخص کے لیے ہے کہ جس نے کلمہ پڑھ کر کفر سے توبہ کی اور اپنے گناہوں سے پشیمان ہوا اور پھر اسی حالت میں فوت ہو گیا تو وہ جنت میں داخل ہوا۔

اور یہ مطلب بخاری و مسلم کی اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہوا۔ ما من احد قال لا الہ الا اللّٰہ ثم مات علی ذالک الا دخل الجنۃ۔

جناب نواب صاحب محدث بھوپالی اپنی کتاب ھدایۃ السائل الی ادلۃ المسائل کے ص۔۳۹۲ میں یہ فرماتے ہیں: (ترجمہ) قائل کلمہ کے لیے دخول جنت کا جن احادیث میں ذکر ہے وہ فرائض و واجبات کے ساتھ مقید ہیں۔ اگر کسی فرض الٰہی میں خلل واقع ہوا یا مرتکب کبیرہ سے توبہ نہ کی تو صرف کلمہ شہادت موجب نجات نہ ہو گا۔ پس جو لوگ اس قسم کے دلائل سے معارضہ کرتے ہیں' وہ اس مقصد کے لیے حجت نہیں ہیں۔

سنہ۔۱۹۷۰ء کے انتخاب میں یہ مسئلہ چلا ہے کہ کیا سوشلزم پر ایمان رکھنے والے سب کلمہ گو مسلمان ہیں جو پاکستان میں آئین اسلام نافذ کرنے کے منکر ہیں تو یک سو چودہ علماء نے ان پر فتویٰ کفر لگایا تھا جن میں سب فرقوں کے علماء شامل تھے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ صرف کلمہ گوئی سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوتا۔ چنانچہ فرقہ بریلویہ کے مجدد احمد رضا خاں نے اپنے فتاویٰ افریقہ کے ص۔۱۲۶ سے ص۔۱۳۱ تک اس پر اپنے مسلک کی رو سے بحث کی ہے۔ چنانچہ ص۔۱۲۷ میں سورۃ منافقون کی آیت شروع والی لکھ کر پھر یہ کہتے ہیں: "دیکھو کیسی لمبی چوڑی کلمہ گوئی' کیسی کیسی تاکیدوں سے مؤکد' کیسی کیسی قسموں سے موید ہرگز موجب اسلام نہ ہوئی اور اللّٰہ واحد قہار نے ان کے جھوٹے کذاب ہونے کی گواہی دی تو من قال لا الہ الا اللّٰہ دخل اجنۃ کا یہ مطلب گھڑنا صراحتاً قرآن عظیم کا رد کرنا ہے۔ ہاں جو کلمہ پڑھتا ہے' اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو' اسے مسلمان جانیں گے جب تک اس سے کوئی کلمہ' کوئی حرکت' کوئی فعل منافی اسلام صادر نہ ہو۔ بعد صدور منافی کلمہ گوئی ہرگز کام نہ دے گی۔"

پھر اس پر بحث کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ "اصل بات یہ ہے کہ اصطلاح ائمہ میں اصل قبلہ وہ ہے کہ تمام ضروریات دین پر ایمان رکھتا ہو۔ ان میں سے ایک بات کا بھی منکر ہو تو قطعاً یقیناً اجماعاً کافر مرتد ہے۔ ایسا کہ جو اسے کافر نہ کہے وہ خود کافر ہے۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صرف کلمہ گوئی اسلام نہیں تو اب ہر فرقہ اپنے آپ کو مسلمان

سمجھتا ہے اور اپنے اپنے مذہب اور عقائد لکھ رکھے ہیں اور ضروریات دین تجویز کر رکھی ہیں۔ ان کی رو سے سب فرقے ایک دوسرے کو گمراہ قرار دیتے ہیں۔ اِس لیے اسلامی مشاورتی کونسل کو باہمی مناکحت کا یہ قانون تجویز کرنا چاہیے کہ ہر فرقہ اور مذہب والا اپنے فرقہ کے مرد کی مناکحت کرے' دوسرے فرقہ اور مذہب کے مرد عورت سے نکاح نہ کرے ورنہ نکاح فسخ کیا جائے گا۔ اگر یہ قانون پاس ہو کر نافذ نہ ہوا تو عدالتوں میں نکاح کے بارہ میں تنازعات اور مقدمات دائر ہوں گے اور تنسیخ نکاح کی درخواستیں پائیں گے تو پھر اس وقت حاکم عدالت کو فیصلہ کرنے میں مشکل پیش آئے گی۔ ہر فرقہ کے علماء دوسرے فرقہ کے مرد عورت کے نکاح کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ احمد رضا خاں اپنی کتاب احکام شریعت حصہ اول ص-۱۲۶ میں یہ لکھتا ہے "وہابیہ گمراہ نہ ہوں گے تو ابلیس بھی گمراہ نہ ہو گا کہ اس کی گمراہی ان سے ہلکی ہے۔

فتاویٰ افریقہ کے ص-۲۶ میں یہ لکھا ہے : "مسلمان عورت کے نکاح میں گواہ اگر بد مذہب بھی ہوں مثلاً تفضیلی جب بھی نکاح میں خلل نہیں' ہاں سب گواہ اگر بد مذہب ہوئے جن کی ضلالت کفر وارتداد کو پہنچی ہوئی ہے تو نکاح نہ ہو گا' کیونکہ مسلم کے نکاح میں دو مسلمان گواہ شرط ہیں۔"

اس فتویٰ سے ظاہر ہوا کہ بریلوی علماء دیگر فرقوں کو مرتد قرار دیتے ہیں اور ان کا نکاح میں گواہ بنانا بھی جائز نہیں کہتے اور ملفوظات حصہ-۲' ص-۹۷ میں یہ لکھا ہے کہ آج کل کے روافض تو عموماً ضروریات دین کے منکر اور مرتد ہیں' ان کے مرد یا عورت کا کسی سے نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ اور فتویٰ افریقہ کے ص-۱۱۹ میں ہے کہ "ہمارے لیے بری مثل نہیں جو عورت کسی بد مذہب کی بیوی بنی' وہ ایسی جیسے کسی کتے کے تصرف میں آئی۔"

ان تمام حوالوں سے یہ ثابت ہوا کہ فرقہ بریلویہ اپنی عورتوں کا نکاح دیگر فرقوں کے مردوں سے کرنا حرام جانتے ہیں تو دوسرے فرقوں کے لوگ بھی ان کو اپنی لڑکیاں دینی حرام جانتے ہیں۔ بریلوی فرقہ کا ایک مفتی ابو یوسف محمد شریف سکنہ کوٹلی مغربی لوہاراں ضلع سیالکوٹ نے ایک رسالہ مناکحت وہابیہ شائع کیا تھا' جس میں اہل حدیث اور دیوبندی سے بریلوی حنفی مرد عورت کا نکاح حرام لکھا ہے اور پھر یہ لکھتا ہے کہ جب ہم مشرک ہیں تو ہم سے مناکحت ناجائز ہے۔ یہ اس نے الزاماً لکھا ہے اور بات اس کی ٹھیک ہے لیکن ہر مذہب

کے عوام کالانعام ایسا کرتے ہیں' علماء نہیں کرتے۔ یہ عمل دونوں جانب سے ہے کہ بریلوی فرقہ کے عوام اپنی لڑکیاں اہل حدیث اور دیوبندیوں کے مردوں کو نکاح میں دے رہے ہیں۔ بعض کتب فقہ میں علماء حنفیہ نے یہ لکھا ہے کہ عوام جہلاء کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ مذہب اس شخص کا ہوتا ہے جس کو بصیرت اور علم حاصل ہو۔

یہ ضرورت محسوس کر کے اس خاکسار نے بھی ایک رسالہ شائع کر دیا تھا جو ایک دفعہ جماعت غرباء اہلحدیث نے دہلی سے شائع کیا۔ جب پاکستان میں ہجرت کر کے آئے اور آباد ہوئے تو کمترین نے دوبارہ شائع کرایا' جس کا نام ہے "صیاحة الجنان بمناکحت اهل الایمان۔" اس رسالہ میں دلائل شرعیہ بینہ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ موحدین اہل حدیث واہل سنت اور اہل بدعت کے درمیان مناکحت درست نہیں اور اس رسالہ میں دیگر علماء کرام کے فتوے بھی درج ہیں۔ یہ رسالہ قابل مطالعہ تھا لیکن ختم ہوا' اب نایاب ہے۔

اسلام میں کفو کا مسئلہ : جہان کے تمام ادیان میں سچا دین اسلام ہے جس پر قرآن ناطق ہے۔ ان الدین عند اللّٰہ الاسلام۔ دنیادار لوگوں نے ذاتوں' قوموں' پیشوں کو کفو بنا رکھا ہے کہ اپنی قوم کے بے دین شخص کو پسند کرتے ہیں۔ پٹھان پٹھان کو اور راجپوت راجپوت کو اور لوہار لوہار کو' دوسری قوم کا شخص خواہ کتنا متقی صالح ہو' اس کو حقیر جانتے ہیں۔ نکاح اور شادیوں میں قومیت پیش نظر رہتی ہے۔ اسلام نے اس کی تردید کی ہے اور یہ جاہلیت کی رسم ہے۔ اسلام میں کفو دینی معتبر ہے کہ زوجین مرد اور عورت کا دین اور مذہب ایک ہو۔ ذات اور پیشہ جدا جدا ہو۔ جو لوگ نسبی کفو کا لحاظ کر کے بے دینوں اور گمراہ لوگوں کو نکاح دیتے ہیں' یہ مناکحت حرام ہے۔

زاد المعاد میں ہے : (ترجمہ) "شرعی حکم کا اقتضاء یہ ہے کہ کفو میں دین کا اعتبار ہے' پس اس اصول شرعی کی رو سے مسلمہ عورت کا نکاح کافر کے ساتھ کرنا جائز نہیں ہے اور صالحہ پارسا عورت کا نکاح کسی بدکار اور بدمعاش سے کرنا جائز نہیں ہے۔"

فتاویٰ عالمگیری فقہ حنفیہ کی رو سے بھی یہی حکم ہے : لا یکون الفاسق کفو الصالحتہ سواء کان معلن الفسق او لم یکن۔ یعنی فاسق شخص زانی یا بدکار کسی عورت صالحہ پارسا کا کفو نہیں' خواہ فسق ظاہر ہو یا پوشیدہ۔

مختصر الفتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے ص۔۴۲۳ میں ہے : ولا یصلح لاحد ان

ینکح مولیتها رافضیا ولا من یترک الصلاۃ۔ یعنی "کسی ولی اور وارث کے لیے یہ صحیح اور جائز نہیں کہ اپنی لڑکی' بہن کسی عورت رشتہ دار کا نکاح کسی رافضی مذہب کے شخص سے یا کسی بے نماز سے کرے۔" اگر نکاح کے وقت کوئی شخص رافضی مذہب سے توبہ کر گیا یا بے نماز نمازی بن گیا پھر نکاح کے بعد وہ رافضی بن گیا اور نمازی بے نماز ہو گیا فانهم یفسخون نکاحه۔ تو نکاح ان کا فسخ کیا جائے۔

حکایت قابل عبرت: مذہب حنفیہ کی مشہور کتاب رد المختار شرح در مختار عرف شامی جلد سوم ص۔ ۳۹۳ میں لکھا ہے جس کی عربی عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ قاضی ابوبکر جوزجانی کے عہد میں ایک حنفی شخص نے کسی اہل حدیث شخص سے اس کی دختر کا رشتہ طلب کیا تو اس نے انکار کر دیا اور پھر یہ کہا کہ میں اِس شرط سے تم کو اپنی لڑکی کا نکاح دے سکتا ہوں کہ تم اپنا مذہب حنفی چھوڑ دو کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھو اور رفع یدین کرو اور اس طرح اہل حدیث کے دوسرے کام بھی کرتے رہو۔ اس حنفی نے یہ شرط منظور کر لی اور مذہب اہل حدیث پر عامل ہو گیا۔ اس اہل حدیث نے اپنی لڑکی اس شخص سے نکاح دی۔ یہ تھی ان مخلص شخصوں میں غیرت دینی اور حمیت مذہب کہ جب اس حنفی مقلد نے اہل حدیث شخص سے رشتہ طلب کیا تو اس نے انکار کر دیا۔ جب وہ اہل حدیث ہو گیا تو اس کو اپنی لڑکی کو نکاح میں دے دیا۔ مشاورتی کونسل کے ارکان کو بھی اس طرف توجہ کرنی چاہیے کہ یہ واقعہ تیسری صدی کا ہے۔ اس وقت زوجین میں مذہب اتحاد شرط کر کے مناکحت کی گئی کیونکہ زوجین میں مذہب اختلاف ہو تو ان کا باہم نزاع رہتا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ: امام بخاری کی کتاب خلق افعال العباد اہل علم میں مشہور ہے۔ اس میں بعض گمراہ فرقوں کا ذکر کر کے یہ حکم لکھا ہے: ولا یسلم علیهم ولا یعادون ولا یناکحون ولا یشهدون ولا یوکل ذبائحهم۔ یعنی "گمراہ فرقہ کے لوگوں کو نہ سلام کہا جائے اور نہ ان کی بیمار پرسی کی جائے اور نہ ان سے مناکحت کی جائے اور نہ ان کے جنازے میں حاضری دی جائے اور نہ ان کا ذبیحہ کھلایا جائے۔" آج کل پاکستان میں اس کے برخلاف عمل ہو رہا ہے' دینی اور مذہبی غیرت اُٹھ گئی۔ انا للّٰہ وانا الیه راجعون۔

شیخ المشائخ تاج الاولیاء جیلانی کا فتویٰ: حضرت شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ غنیۃ الطالبین میں بہت تفصیل سے لکھا ہوا ہے کہ اہل بدعت گمراہ فرقوں سے کلی پرہیز کیا جائے۔ امام

بخاری کی طرح ان کا فتویٰ ہے، جن میں ایک حکم یہ لکھا ہوا ہے فلا تناکحوھم کہ گمراہ فرقوں سے مناکحت نہ کی جائے۔

مولانا عزیز الرحمٰن مفتی کا فتویٰ اخبار محمدی دہلی مطبوعہ ۱۵/ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "غیر مقلدین باعتبار عقائد واعمال اہل سنت والجماعۃ کے خلاف ہیں۔ ان سے حنفیوں کو علیحدہ رہنا چاہیے اور مناکحت ان سے نہ کی جائے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اہل ہویٰ سے مجالست، مواکلت اور مناکحت وغیرہ امور سے منع فرمایا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا اہلحدیث پر فتویٰ: دیوبندی حنفیہ کے شیخ الطریقت مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک کتاب مختلف علوم پر مجموعہ رسائل کے نام سے شائع کی ہے، اس کے ص ۱۰۷ پر لکھا ہے۔ یعنی اسلام کے لیے بہت ضرر رساں تصنیف یعنی کتابیں چھوٹے بڑے نیچریوں کی اور دیگر گمراہ فرقوں کی ہیں۔ پھر آگے جا کر یہ لکھا ہے واھل الا ھواء منھم غیر المقلدین الذین یدعون اتباع الحدیث وانی لھم ذالک۔ یعنی اہل ہویٰ فرقہ غیر مقلدین کا ہے جو اتباع حدیث کے مدعی ہیں اور یہ ان کو کہاں نصیب ہے؟

میں کہتا ہوں کہ مولانا تھانوی کا دعویٰ اہل سنت والجماعت ہونے کا ہے اور اس فرقہ کو وہ حق پر سمجھتے ہیں۔ اگر ان کے اعتقادات مسائل اور ان کی تصنیفات کا جائزہ لیا جائے تو وہ اہل سنت تو کجا موحد مومن ہی ثابت نہیں ہوتے۔ لیکن یہاں مسائل کی بحث مقصود نہیں، ان کے فتویٰ کا اظہار مقصود ہے کہ وہ اپنے فرقہ کے ماسوا دوسرے سب فرقوں کو گمراہ جانتے ہیں اور اہل حدیث کے مرد عورت سے اپنے مذہب کے آدمیوں سے نکاح حرام قرار دیتے ہیں۔ اس لیے اہل حکومت کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ ملک میں یہ آئین نافذ کیا جائے کہ ہر فرقہ والے اپنے مذہب میں شادی کریں کہ خاوند بیوی کا مذہب ایک ہو۔ اگر دو مذہب ہوئے تو خاوند بیوی کی لڑائی رہے گی، اتفاق نہ ہو سکے گا۔

مفتی اعظم پنجاب محدث روپڑی کا فتویٰ: کمترین راقم السطور نے مولوی اشرف علی کا مذکورہ مسلک لکھ کر جناب حضرت مولانا حافظ عبداللہ صاحب محدث روپڑی پنجاب کے مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ارسال کر کے استصواب رائے کیا تو انہوں نے مندرجہ ذیل حکم لکھ کر بھیجا جو بندہ کے پاس پہنچا اور وہ ان کی زندگی میں کتاب میں شائع ہوا۔ چنانچہ فرماتے ہیں "مولوی اشرف علی نے اہل حدیث پر زبردست حملہ کیا ہے کہ ان کو اہل بدعت

میں شمار کیا ہے۔"

علامہ ابن قیم جو بتصدیق ملا علی قاری اولیاء اللہ میں شمار ہیں' وہ اپنی بے نظیر کتاب اعلام الموقعین جلد۔۲' ص۔۱۸۹ میں رقمطراز ہیں اور تقلید شخصی پر بحث کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں : وانما حدثت هذه البدعة فى القرن الرابع المذموم على لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ یعنی "تقلید شخصی کی بدعت قرون ثلاثہ کے بعد چوتھی صدی میں پیدا ہوئی اور یہ وہ زمانہ ہے جس کی مذمت رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر جاری ہو چکی ہے۔" اور ص۔۱۸۸ پر فرماتے ہیں : المقلد لا علم له بصحة القول والفساد۔ "کہ مقلد کو کسی قول امام کے صحیح اور غلط کا علم نہیں ہوتا۔" اندھا دھند تقلید کرتا چلا جاتا ہے' اِس لیے مقلد علماء میں شمار نہیں۔ چنانچہ ص۔۱۸۹ میں فرماتے ہیں : واذا لم يكن المقلدين من العلماء باتفاق العلماء لم يدخل فى شئى من هذه النصوص۔ یعنی "جب اس بات پر سب علماء اسلام کا اتفاق ہے کہ مقلد علماء میں شمار نہیں ہے تو جس قدر علماء کی شان میں نصوص شرعیہ وارد ہیں' مقلد ان کا مصداق نہیں۔"

فتاویٰ مصریہ مختصر فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے ص۔۴۴۲ میں ہے۔ (ترجمہ) وہ مسلک جس پر تمام ائمہ مسلمین متفقہ طور پر قائم ہیں' وہ یہ ہے کہ کسی شخص پر لازم اور یہ امر مشروع نہیں کہ کسی معین شخص کی اس طرح تقلید کرے کہ ہر وہ چیز جس کو وہ واجب کہے واجب جانے اور جس کو وہ حرام کہے حرام سمجھے اور جس چیز کو وہ مباح کہے مباح جانے مگر یہ کہ ان تمام امور میں جناب رسول اللہ ﷺ کی ذات معین ہے کہ ان کی اتباع کی جائے۔

میں کہتا ہوں کہ مقلدین دیوبندی فرقہ کا یہی مذہب ہے۔ چنانچہ رسالہ تجلی دیوبند پرچہ بابت جنوری فروری مطبوعہ سنہ۔۱۹۶۸ء ص۔۴۷ میں یہ لکھا ہے' ایک مسئلہ کا جواب دیتے ہوئے ایک حنفی مفتی رقمطراز ہیں : "یہ دراصل اسی قاعدہ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے کہ مقلدین (حنفی لوگوں کے لیے) حدیث و قرآن کے حوالہ کی ضرورت نہیں بلکہ ائمہ و فقہاء کے فیصلوں اور فتووں کی ضرورت ہے۔" اور درمختار میں صاف یہ لکھا ہے جس کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔ "یعنی قرآن کا کچھ حصہ (تبرکاً) پڑھ لیا باقی ماندہ قرآن سے فقہ کا پڑھنا افضل ہے بلکہ تمام فقہ پڑھے بغیر چارہ نہیں ہے۔" دراصل شریعت کوفیہ شریعت محمدیہ سے الگ چیز ہے۔

اِس لیے ان سے الگ رہنما واجب ہے۔

مولانا مفتی عبدالجلیل صاحب محدث جھنگوی کا فتویٰ: جناب مولانا عبدالجلیل محدث جھنگوی جماعت غرباء اہلحدیث کے مشہور مفتی تھے' وہ مسئلہ مناکحت کے بارہ میں یہ لکھتے ہیں کہ بیشک مشرکین' مبتدعین' تارکین ارکان اسلام سے مناکحت یعنی اپنے لڑکے لڑکی کا رشتہ نکاح کرنا حرام ہے تاوقتیکہ شرک اور بدعت کو چھوڑ کر توحید وسنت اور ارکان اسلام کے صحیح طور پر پابند نہ ہو جائیں۔ ۲۳/ ربیع الثانی سنہ۔ ۱۳۷۲ھ

الغرض ہر فرقہ اپنے مذہب والوں کو غیر فرقہ سے مناکحت کرنے سے حرام قرار دے کر روکتا ہے اور عقلاً اور مقلداً یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ ہر مذہب والوں کو آپس میں مناکحت کرنی چاہیے۔ دوسرے مذہب والوں سے نہیں کرنی چاہیے تاکہ حق وباطل کا اختلاط ہو۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ نے اہل کتاب کی عورتوں سے مناکحت کرنے سے روک دیا تھا حالانکہ شرعاً جائز تھی اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ مجھے خطرہ ہے کہ یہ شر اور برائی نہ پھیلا دیں۔

اہل حدیث کی ہر علاقہ میں جو علمی ودینی تنظیمیں قائم ہیں' ان کو اپنے نظام عمل میں یہ قانون بطور اصول جماعت نافذ کرنا لازم اور لابدی امر ہے کہ وہ آپس میں مناکحت کریں اور دیگر گمراہ فرقوں سے مناکحت نہ کریں اور اگر جاہل عوام ایسی شادی کریں تو اس کا بائیکاٹ کر دیں تاکہ یہ رسم منقطع ہو جائے۔

ہمارے بعض علماء نے دور اندیشی اور حقیقت کو نظرانداز کر کے یہ فتویٰ دیا ہے کہ جیسے بروئے قرآن اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے' ویسے گمراہ فرقوں کی عورتوں سے بھی نکاح جائز ہے' ہاں اپنی لڑکیاں اور عورتیں ان کے نکاح میں نہ دینی چاہیے۔ یہ قیاس غلط اور سراسر فاسد ہے۔ جیسے کوئی ماملکت ایمانکم جس سے صرف لونڈیاں مراد ہیں' کوئی من چلا اس کو عام قرار دے کر غلاموں اور حیوانوں پر چسپاں کر کے ان سے جماع کرنے لگے تو یہ بالاتفاق حرام ہے۔ پس نص کے مقابلہ میں یہ قیاس فاسد ہے بلکہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا خود خلاف قیاس ہے۔ یہ اپنی جگہ بند رہے گا۔ محاورہ قرآن وحدیث اہل کتاب سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے کفار مشرکین سے مستثنیٰ کر کے الگ ذکر کیا ہے اور خاص اسرائیلی مراد ہیں۔ تمام قوموں کے مسخ شدہ عیسائی مراد نہیں ہیں کیونکہ ہر نبی

صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوا تھا۔ ہمارے نبی آخر الزمان ﷺ کی طرح تمام قوموں کی طرف مبعوث نہ ہوئے' اِس لیے جو اسلام قبول کرے گا وہ مسلمان کہلائے گا لیکن یہود ونصاریٰ کا یہ حق نہیں ہے کہ اپنی قوم اسرائیلی سے باہر دیگر اقوام کو دعوت دیں کہ تم یہود' نصاریٰ اور عیسائی ہو جاؤ' یہ درست نہیں۔ اگر دوسری قوم یا مذہب کا شخص ان کی دعوت قبول کر کے یہودی عیسائی ہو گا تو وہ مرتد کہلائے گا۔

جب اسلامی مشاورتی کونسل قوانین کتاب وسنت کی رو سے تجویز کر رہی ہے تو اِس کو مندرجہ ذیل مسئلہ کی طرف بھی توجہ مبذول کرنی چاہیے تاکہ پاکستان کے مسلمان غیر شرعی نکاحوں سے پاک اور طاہر ومطہر ہو جائیں۔

۱۔ بغیر ولی کے اذن کے نکاح حرام ہے۔ عورتوں کو آزادی بخش کر جرائم کو فروغ ملا ہے' جو شخص چاہتا ہے عورت اغوا کر کے نکاح کر لیتا ہے۔

۲۔ نکاح متعہ قطعاً حرام اور قیامت تک حرام ہے۔

۳۔ اسی قسم کا نکاح حلالہ حرام ہے جس کا اسلام میں وجود ہی نہیں ہے۔ متعہ میں تو ہفتہ' عشرہ' ماہانہ' سالانہ میعاد ہوتی ہے' حلالہ صرف ایک رات کا ہوتا ہے۔

۴۔ نکاح زانی اور زانیہ کا حرام ہے' کئی لوگ عورتوں سے یارانہ لگا کر ان کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور پھر کسی ملا مولوی کے ذریعہ نکاح کرا لیتے ہیں' یہ نکاح حرام ہے۔

۵۔ تن بخشی اور خفیہ نکاح حرام ہے' نکاح کا اعلان اور گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔

۶۔ جبری نکاح حرام ہے' بعض بغیر رضامندی عورت باکرہ کے نکاح کر دیتے ہیں۔

۷۔ حاملہ عورت کا نکاح حرام ہے' خواہ زنا کا حمل ہو یا نکاح کا۔

۸۔ نکاح بٹہ سٹہ حرام ہے۔

۹۔ نکاح عفیف صالح کا فاسقہ فاجرہ عورت سے حرام ہے۔

۱۰۔ رسومات کفریہ' شرکیہ شادی میں کرنے والے مرد عورت کا نکاح حرام ہے۔

تِلک عشرہ کاملہ' ایسے نکاح شرعاً حرام ہیں' لہٰذا حکومت کو خالص نکاح حلال جائز قرار دے کر باقی سب حرام نکاح بند کرنے کی اپیل ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری سلمہ الباری

الاسلام لاہور جلد۔۵' شمارہ۔۵۱' مورخہ ۱۵/ فروری سنہ۔۱۹۸۰ء

مناکحت بریلویہ کا حکم

کوٹلی لوہاراں ضلع سیالکوٹ کے ایک مفتی صاحب بریلوی خیال کے رسمی حنفی نے ایک رسالہ شائع کیا ہے جس کا نام ہے "مناکحت وہابیہ"۔ تمام رسالہ کا دو حرفی خلاصہ یہ ہے کہ اہلحدیث اور حنفی کے مابین کوئی رشتہ نکاح کا نہ ہونا چاہیے یعنی نہ اہلحدیث کو حنفی لڑکی دیں اور نہ ان سے لیں۔ پھر اس امر کے ثبوت میں مقلدانہ حیثیت سے گذر کر مجتہدانہ رنگ اختیار کرتے ہوئے مفتی صاحب نے بیس وجوہات لکھی ہیں جو کہ درج کر کے بحث کرنا میرے موضوع سے خارج ہے۔ جس صاحب کو ضرورت ہو وہ اصل رسالہ منگوا کر اخبار "تنظیم" روپڑ جلد ۷، نمبر ۳۰، مورخہ ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۳۸ء میں ملاحظہ کر سکتا ہے۔

"مناکحت وہابیہ" کے مصنف کے ساتھ اس امر میں مجھے پورا اتفاق ہے کہ ہم اہلحدیث ان رسمی حنفیوں کو ان بیس وجوہات کی بناء پر کافر و مشرک جانتے ہیں اور اس امر میں بھی اتفاق ہے کہ ایک دوسرے سے رشتہ ناطہ، لین دین کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔

اب اس سے آگے میرا روئے سخن سید العلماء مولانا المحترم مفتی دوران حضرت مدیر "تنظیم" متع اللہ المسلمین بطول حیاتہٖ اور حاجی حرمین المکرم مولانا حافظ عبدالقادر صاحب دام اقبالہ کی طرف ہے جنہوں نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اہلحدیث کو بریلویوں کی لڑکیاں نکاح میں لینا ممنوع نہیں۔ دلیل اس پر یہ دی ہے کہ بریلوی اہل کتاب کے حکم میں ہیں اور اہل کتاب کی عورتیں اہل اسلام کے لیے حلال ہیں۔ لہٰذا بریلویوں کی عورتیں بھی موحدین کے لیے حلال ہیں۔ اہل کتاب کی عورتوں کا اہل اسلام کے لیے حلال ہونا تو مسلم ہے، گو اس میں بھی صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ عنہم کا کتب تفسیر قرآن مجید میں اختلاف مذکور ہے لیکن فرقہ بریلویہ مشرک حنفیوں کا اہل کتاب کے حکم میں ہونا مسلم نہیں ہے۔ لہٰذا اس پر جو نتیجہ مرتب کیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ تفصیل اس امر کی یہ ہے کہ فرقہ بریلویہ اپنے عقائد اور اعمال کے لحاظ سے مشرک ہے۔ چنانچہ بیس عدد وجوہات میں اس شرک کا انہوں نے صاف اظہار کیا ہے، اس لیے مندرجہ ذیل دلائل کی بناء پر ان سے مناکحت درست نہیں ہے۔

پہلی دلیل : قرآن مجید میں ہے : الزانی لا ینکح الا زانیة او مشرکة الزانیة لا ینکحہا الا زان او مشرک وحرم ذلک علی المؤمنین۔ یعنی "زانی نہیں نکاح کرتا مگر زانیہ کو یا مشرکہ کو اور زانیہ کو نہیں نکاح کرتا مگر زانی یا مشرک اور یہ نکاح مومنوں پر حرام کیا گیا ہے۔" یہ لفظی ترجمہ ہے اور اصل میں بتائید حدیث نفی بمعنی نہی ہے' فتذکر۔

اس آیت سے صاف واضح ہوا کہ زانیہ اور مشرکہ سے عفیف اور موحد شخص کو نکاح نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارا محل استدلال آیت کا آخری جملہ ہے جس سے حرمت ثابت ہوتی ہے اور اس حرمت کی دو وجوہ علماء نے بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ مشرک مومن کا اور زانی عفیف کا کفو نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ ایک سے دوسرے کو اس گناہ کی علت نہ لگ جائے۔ مناکحت' مجالست اور مصاحبت کو مستلزم ہے جس کا اثر ایک دوسرے کو پہنچنا لازمی ہے یعنی مصاحبت سے وہ ضرور متاثر ہو جائیں گے۔ ان مفاسد کی وجہ سے مناکحت حرام کر دی۔ حدیث میں ہے : لا یاکل طعامک الا تقی ولا تصاحب الا مؤمنا۔ یعنی "کھانا بھی نیک شخص ہی کو کھلانا چاہیے اور مصاحبت بھی مومن ہی کی کرنی چاہیے۔"

زمانہ شاہد ہے کہ کئی موحد تھے جن کی عورتیں مشرکہ تھیں جو خانقاہوں پر جانے کی عادی تھیں۔ جب ان میں مناکحت ہوئی تو خانقاہ پر جانے کے لیے عورت نے تقاضا کیا جس پر مرد مومن نے منع کیا آخر باہمی چپقلش رفع کرنے کو یا اپنا گھر بے آباد ہوتا دیکھ کر مرد مغلوب ہو گیا اور عورت غالب آئی' رفتہ رفتہ مرد کو بھی امور شرکیہ کا عادی بنا لیا چنانچہ بہت لوگ مناکحت کی وجہ سے مراسم شرکیہ کے عادی ہو چکے ہیں اور کئی عورتیں اہل اسلام کی اہل بدعت سے نکاح کر دینے کی وجہ سے مشرکہ بن گئی ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر یہ مناکحت حرام کر دی ہے۔

دوسری دلیل : قرآن مجید میں اور جگہ یوں وارد ہے : الخبیثات للخبیثین والخبیثون للخبیثات والطیبات للطیبین والطیبون للطیبات۔ یعنی "خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے ہیں اور طیب عورتیں طیب مردوں کے لیے ہیں اور طیب مرد طیب عورتوں کے لیے ہیں۔ (سورہ نور) یعنی ان کا باہم تعلق موزوں اور مناسب ہے' برعکس نہیں۔

اس آیت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ مشرکہ عورتوں سے اہلحدیث موحدین کو نکاح نہ کرنا

چاہیے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حصر کر دیا ہے کہ سب خبیث عورتیں خبیث مردوں ہی کے لیے مخصوص ہیں' کوئی خبیث عورت طیب مرد کے لیے نہیں ہے اور طیب مرد پاک عورتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ کوئی پاک آدمی خبیث عورت کے لیے نہیں ہے۔ غرض جانبین میں حصر کر دیا ہے۔ اب یہ آیت اس پہلی آیت کے موافق ہے اور یہ ایک دوسری کی مئوید ہیں۔

تیسری دلیل: قرآن میں اور جگہ آیا ہے لا تمسکوا بعصم الکوافر۔ یعنی "کافرہ عورتوں کو نکاح میں مت رکھو۔" اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر کافرہ عورتوں کا نکاح حرام فرمایا ہے اور ان کے نکاح پر اقامت کرنے سے روک دیا ہے۔ بریلویوں کی لڑکیاں مراسم شرکیہ کرنے والیاں چونکہ عندالشرع کافرہ ہیں' لہٰذا موحدین مومنین کو ان کا نکاح میں لانا اور ان کے نکاح پر اقامت کرنا حرام ہوا۔ تمام اہلحدیثوں کو اس سے بچنا چاہیے ورنہ بریلوی لوگ اپنی لڑکیاں دے دے کر اہلحدیثوں کو اپنے اندر جذب کر لیں گے' فافھم۔

چوتھی دلیل: قرآن مجید میں ایک جگہ یوں ارشاد ہے: ولا تنکحوا المشرکات حتی یؤمن۔ یعنی "شرک کرنے والیوں کو مت نکاح کرو' یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔" بریلویہ عورتیں پیروں اور قبروں کو سجدہ کرتی ہیں' اموات سے حاجات طلب کرتی ہیں' ان کے نام کی نذر نیاز دیتی ہیں اور ان کو مشکل کشا جانتی ہیں اور بیاہ شادی میں تمام رسومات شرکیہ کرتی ہیں۔ غرضیکہ ان کے مشرکہ ہونے میں نہ اہلحدیث کو کوئی کلام ہے اور نہ محققین حنفیہ کو' سب ہی مشرکہ قرار دیں گے۔ پھر اس دلیل کے ہوتے ہوئے ان سے نکاح کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ اب آپ کو جائز ہونے کے لیے کوئی صریح دلیل پیش کرنی چاہیے۔

جب آپ بریلویہ عورتوں کو نکاح میں لانا جائز سمجھتے ہیں تو پھر شیعہ' چکڑالوی' مرزائی' نیچری وغیرہ تمام گمراہ فرقوں سے بھی نکاح جائز جانتے ہوں گے کیونکہ ان سب میں کافر ہونے کے سبب سے اور مدعی اسلام ہونے کے سبب سے کوئی فرق نہیں ہے' سب ہی آپ کے نزدیک اہل کتاب کے حکم میں ہوں گے۔ جب آپ نے یہ فتویٰ دے دیا تو آپ کے معتقدین ان تمام مذاہب کی عورتوں کو نکاح میں لانے کی کوشش کریں گے پھر جو مفاسد اس سے پیدا ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔ نیز قرآن وحدیث کے ظاہر دلائل کے یہ خلاف ہے جس کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔ اس لیے عرض ہے کہ آپ فتویٰ ہذا پر دوبارہ غور فرمائیں۔ گمراہ

مذہبوں کی مناکحت جائز کر کے مفاسد کا ذمہ اٹھانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہم تو اس کو ناجائز جانتے ہیں۔ ہاں اگر بریلویہ عورت توحید وسنت کی تابع ہو کر کفر و شرک وبدعت سے سچی توبہ کرلے تو پھر اس سے نکاح ہو سکتا ہے۔

پانچویں دلیل: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بعض گمراہ فرقوں کے ذکر میں رسالہ خلق افعال العباد میں فرمایا ہے: ولا یسلم علیھم ولا یعادون ولا یناکحون ولا یشھدون ولا یوکل ذبائحھم۔ یعنی "جہمی رافضی کو نہ سلام کہے' نہ بیمار پرسی کرے اور نہ مناکحت کرے اور نہ جنازہ پر حاضر ہو اور نہ ان کا ذبیحہ کھائے۔" پیر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے گمراہ فرقوں کی تردید میں فرمایا ہے: فلا تناکحوھم یعنی تم ان سے مناکحت نہ کرو۔

چھٹی دلیل: ایک حدیث میں ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت تین چیزوں کی بناء پر نکاح کی جاتی ہے۔ دین پر' مال پر' جمال پر۔ ایک روایت میں چوتھی کا ذکر ہے کہ حسب پر۔ پھر فرمایا فعلیہ بذات الدین یعنی تم دین اسلام کو مطمح نظر رکھو۔ جو نیک' دین والی ہو اس کو نکاح کرو۔ ایک روایت میں تزوجوھن علی الدین وارد ہے۔ اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ بے دین عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں۔

ان عبارۃ النص دلائل کے سامنے آپ کا اجتہاد کمزور ہے کہ مشرکین بریلوی اہل کتاب کے حکم میں ہیں۔ اہل کتاب کے حکم میں وہ دو وجہ سے نہیں ہو سکتے۔ ایک یہ کہ اس آیت میں من قبلکم کی قید وارد ہے جس میں بعد کے گمراہ فرقے داخل نہیں ہو سکتے۔ دوم قرآن کی اصطلاح میں اہل کتاب کا اطلاق محض یہود ونصاریٰ پر ہے' دوسرے فرقوں کو اپنے قیاس سے داخل کرنا جائز نہیں ہے' ہاں حنفیہ کے مذہب کے مطابق آپ کا فتویٰ درست ہے' کیونکہ شرح عقیدہ میں ہے: بخلاف اھل الھواء فانھم معترفون بالانبیاء والکتب ویختلفون فی تاویل الکتاب والسنۃ وھو لا یوجب اختلاف الملۃ۔ یعنی "اہل ہوا بت پرستوں کے حکم میں نہیں' کیونکہ وہ انبیاء اور کتب سماویہ کے مقر ہیں اور کتاب وسنت کی تاویل کرتے ہیں جس سے ---- نہیں ہوتی۔" قال فی المبتین ---- ثم کل من یعتقد دینا ---- کتاب منزل کصحف ابراھیم وشیث وزبور داؤد فھو من اھل الکتاب فتجوز مناکحتھم واکل ذبائحھم۔ یعنی "جو لوگ دین سماوی اور کتاب آسمانی کے معتقد ہیں' وہ اہل کتاب میں داخل ہیں' ان سے مناکحت جائز ہے اور ان کا ذبیحہ بھی درست ہے۔" لیکن

ہم اہل حدیث تو صاف شرعی دلیل کے طالب ہیں' اگر کوئی ہے تو پیش کریں' فقط والسلام۔

(خاکسار ابو الشکور محمد عبدالقادر اگلنگوی الحصاری)

مدیر تنظیم: بریلویوں کے اہل کتاب کے حکم میں نہ ہونے کی دو وجہیں آپ نے بیان کی ہیں' وہ آپس میں تناقض ہیں۔ کیونکہ اگر من قبلکم کی قید تخصیص کے لیے لگائی ہے تو پھر اہل کتاب قرآنی اصطلاح میں یہود ونصاریٰ کے ساتھ خاص نہیں رہتا ورنہ من قبلکم کے ساتھ تخصیص کی کیا ضرورت تھی۔ ہاں اگر یہ اصطلاح مشرکین کے مقابلہ میں ہو اور اصل معنی کے رُو سے اس کا استعمال اس امت کے منافقین وغیرہ میں بھی درست ہو تو اس صورت میں من قبلکم کی قید درست ہو سکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ قید یہود ونصاریٰ کی تخصیص کے لیے ہو یعنی انہی کی عورتیں حلال ہوں۔ دیگر اہل کتاب کی نہ ہوں بلکہ یہ قید اس لیے بھی ہو سکتی ہے کہ بوجہ بُعد یہود ونصاریٰ کے اس حکم کو اسی امت کے اہل کتاب سے خاص نہ سمجھ لیا جائے کیونکہ رشتہ کا معاملہ نازک ہے جو ہم سے زیادہ بعید ہے' اس سے رشتہ کی اجازت ذرا بعید معلوم ہوتی ہے' اس لیے من قبلکم کی قید لگا کر اس بات کو صاف کر دیا۔

رہے اس امت کے اہل کتاب تو وہ بطریق اولیٰ داخل ہوں گے' اس کی مثال ایسی ہے جیسے حدیث میں کھڑے پانی میں پیشاب سے منع کیا ہے۔ پاخانہ سے نہی بطریق اولیٰ سمجھی گئی۔ ٹھیک اسی طرح اس امت کے اہل کتاب کو سمجھ لیں' اس کو آپ کا قیاس کرنا غلطی ہے بلکہ یہ دلالتہ النص ہے۔ حنفیہ کے ساتھ ہماری ضد نہیں کہ جو وہ کہیں ہم اس کا خلاف کریں بلکہ اگر ان کی کوئی بات حق ہو تو ہمیں لے لینی چاہیے۔

رہا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا منع کرنا تو یہ بناء بر احتیاط ہے۔ چنانچہ یہود ونصاریٰ کی عورتوں کو بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم احتیاطاً منع کرتے ہیں۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اہل کتاب کی عورتیں نکاح کیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روکا اور فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ اہل کتاب کی عورتیں حلال ہیں مگر تم لوگوں کے مقتدا ہو' تمہارے ایسا کرنے سے عام رستہ کھل جائے گا جو فتنہ کا باعث ہو گا۔ فقط والسلام

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم روپڑ' جلد ۷' شمارہ ۳۸' مورخہ ۲۲/ اگست سنہ ۱۹۳۸ء

مسئلہ مناکحت بربنائے خِطبہ علی الخِطبہ

حضرات! زمانہ جاہلیت کا ایک تو وہ دَور تھا کہ ہندوستان میں لڑکیوں کی شادی کو راجپوت اور بعض لوگ بہت معیوب سمجھتے تھے اور اس سے شرم وعار کرتے تھے۔ آج اس کے برعکس یہ زمانہ ہے کہ وہی لوگ اپنی لڑکیوں کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں اور لڑکیوں سے روپیہ کما رہے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ اپنی لڑکی کی منگنی ایک جگہ کر دیتے ہیں اور وہاں حسب رسومات قومی کچھ زیور' کپڑے' نقد روپیہ لے کر رشتہ پختہ کر دیتے ہیں اور عقد نکاح تک لڑکے والوں سے جانی' مالی فوائد ومنافع حاصل کرتے رہتے ہیں۔

لڑکے والے بقول "صاحب الغرض مجنون" کہ غرض مند دیوانہ ہوتا ہے' لڑکی والوں کی خوشامد حاجت روائی' خدمت گذاری ہر طرح کرتے رہتے ہیں۔ پھر بعض لوگ تو چند سالوں کے بعد لڑکے والوں کے بار بار تقاضا سے نکاح دے دیتے ہیں اور حسب منشا اُن سے نقد روپیہ اور شادی کے ضروری اور غیر ضروری اخراجات لے لیتے ہیں اور بعض کئی سال لوٹ' کھسوٹ کر کے نکاح دینے سے جواب دے دیتے ہیں اور نفسانیت سے انکار کی کوئی نہ کوئی وجہ پیدا کر لیتے ہیں اور اپنی لڑکی کی شادی کسی دوسری جگہ زیادہ روپے لے کر' کر دیتے ہیں اور بعض کسی دوسری جگہ منگنی کر دیتے ہیں جس سے پہلی منگنی والے ناراض ہو جاتے ہیں اور باہم فساد شروع ہو جاتے ہیں۔ پنچائتیں ہوتی ہیں' مقدمات چلتے ہیں۔ اگر پہلی منگنی والے اپنی قومی' مالی' سیاسی قوت سے غالب آجائیں تو خرچہ منگنی کا واپس کرا لیتے ہیں' اگر کمزور ہوں تو ان کو پیسہ بھی نہیں ملتا' وہ صبر کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔

بعض جگہ کئی کئی منگنیاں ہوتی ہیں' جس سے لڑکی والوں سے اور دوسری منگنی والوں سے پہلی منگنی والوں کے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ کئی لڑائیاں خانہ جنگیاں اور مختلف مفاسد ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ قوم اوڈ میں ایسے واقعات بہت ہوتے ہیں۔ اب قریب ہی کا ایک واقعہ ہے کہ ایک قبیلہ کے لوگوں نے کسی جگہ اپنی لڑکی کی منگنی کر دی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ منگنی توڑ دی گئی پھر دوسری جگہ منگنی کر دی اور حسب رواج خرچہ اور نقد روپیہ لے لیا۔ جب ایک دو سال اس منگنی کو گذر گئے اور لڑکے والوں نے نکاح کا مطالبہ کیا تو لڑکی والے نکاح التواء میں ڈالتے رہے' آخر تقاضا پر تقاضا ہونے لگا تو لڑکی والوں نے مہر مقررہ

اور اخراجات شادی کا مطالبہ کیا' جس کو لڑکے والوں نے ادا کر دیا اور اجلاس عام میں تاریخ نکاح فریقین نے معین کر دی۔ جب تاریخ مقررہ پر لڑکے کی برات کسی قریب مقام پر اُتری تو اس شخص نے جس سے کہ پہلے منگنی ہوئی تھی اور پھر توڑ دی گئی تھی' لڑکی والوں کی برات والوں سے ایک ہزار روپیہ زائد کہہ کر لڑکی مخطوبہ کا نکاح اپنے لیے منظور کرا لیا اور اس سے پہلے پہلے روپے ادا کر کے ایک مولوی کو بلا کر اپنا نکاح پڑھا لیا۔

جب برات والوں کو علم ہوا کہ ہماری مخطوبہ لڑکی کا نکاح دوسری جگہ ہو چکا ہے تو انہوں نے جنگ کی تیاری کر دی۔ فریق ناکح، منکوحہ نے جب معلوم کیا تو انہوں نے بھی لڑائی کا سامان کر لیا۔ جب دو فریق نے لاٹھیوں اور بندوقوں وغیرہ اسلحہ سے مسلح ہو کر جنگ کا محاذ قائم کیا تو مقامی پولیس موقعہ پر پہنچ گئی جس سے لڑائی نہ ہو سکی اور دونوں فریق منتشر ہو گئے۔ جب تھانہ دار دو چار سو روپیہ لے کر چلا گیا تو جنگ کا اعلان پھر ہونے لگا۔ آخرکار برادری کی پنچائیت نے اس فساد کو دفع کرنے کے لیے ناکح اور منکوحہ کے فریق سے کوئی ہزار روپیہ لے کر برات والوں کو دیا اور پھر کہیں جا کر فساد ختم ہوا لیکن بایں ہمہ دو تین قبیلوں میں دائمی عداوت پیدا ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کی ایذا رسانی بلکہ قتل قتال کی گھات میں ہیں۔ اس لیے علمائے دین کا یہ فرض ہے کہ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں کہ منگنی پر منگنی کرنے کا کیا حکم ہے؟ اور منگنی پر منگنی کر کے جو نکاح حاصل کیا جائے اس کا کیا حکم ہے؟ اس مناکحت' خِطبہ علی الخِطبہ سے ایسے مفاسد پیدا ہو گئے ہیں کہ کئی علماء بھی اس فساد کی شراکت سے بچ نہیں سکے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں فریقین کے جو پیشوا اور راہنما ہیں' وہ بھی اپنے اپنے فریق کی طرف داری کر رہے ہیں۔ واقعہ مذکورہ بالا میں جس مولوی نے خِطبہ علی الخِطبہ کرنے والے شخص کا نکاح پڑھا ہے' وہ اس نکاح کا مجوز ہے اور دوسرے فریق کا مولوی اس نکاح کا محرم (حرام کرنے والا) ہے۔ برات والا فریق اس تاک میں ہے کہ نکاح خواں مولوی ہم کو کسی جگہ مل جائے تو اس کو ایسی سزا دیں کہ پھر وہ کسی کا نکاح ہی نہ پڑھ سکے۔

الغرض قوم میں اس مسئلہ پر نزاع پیدا ہو گیا اور قوم کے سرکردہ لوگ بحکم فان تنازعتم فی شیئی فردوہ الی اللّٰہ۔ (ترجمہ) ''کہ جب تم کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔'' اس مسئلہ کو علماء شریعت کی طرف لوٹا رہے ہیں کہ وہ اس میں فیصلہ صادر فرما دیں کہ یہ خِطبہ علی الخِطبہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو نکاح

صحیح ہو گیا ہے یا باطل ہے۔ یہ مسئلہ اگرچہ معمولی ہے لیکن اس میں مفاسد ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ جن کی رُو سے دھڑا بندی ہو گئی ہے اور جنگ وجدال کا سخت اندیشہ ہے۔ اگر شرعی نکتہ نگاہ سے یہ مسئلہ حل ہو جائے تو فریقین کو اس کے پابند ہونے کی تلقین کی جائے اور تفرقہ وفساد سے روکا جائے۔ ان ارید الا الاصلاح ماستطعت وما توفیقی الا باللّٰہ۔

کمترین کو اس مسئلہ کے متعلق جو تحقیق ہے وہ علماء دین کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ اس پر بامعان نظر غور فرما کر اس کی تائید یا تنقید فرمادیں اور اپنی تحقیقات سے فریقین کو مستفیض فرمائیں۔ انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم۔

مسئلہ خِطبہ علی الخِطبہ میں علماء کے اختلاف کا مظاہرہ: قدرت الٰہی سے مختلف طبائع اور اختلاف فہم کا یہ تقاضا ہے کہ علماء عموماً ہر مسئلہ میں اصولی ہو یا فروعی' اعتقادی ہو یا عملی اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ جب کوئی مسئلہ چھوٹا ہو یا بڑا' اختلاف کی زد سے نہ بچ سکا تو یہ مسئلہ علماء کی اختلاف رائے سے کس طرح بچ سکتا تھا۔ چنانچہ مسئلہ زیر بحث میں بھی یہ اختلاف ہے کہ منگنی پر منگنی کرنی جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں تو کیا اس کی بناء پر جو نکاح کیا جائے وہ درست ہے یا نہیں؟

ہمارے علماء ہم عصر میں سے بعض کا قول ہے کہ منگنی پر منگنی جائز ہے اور وہ یہ حدیث دلیل میں پیش کرتے ہیں جو مسلم اور ترمذی وغیرہ میں ہے کہ فاطمہ بنت قیس مطلقہ تھی' جب اس کی عدت گذر چکی تو اس کو ابو جہم اور معاویہ رضی اللہ عنہما نے خِطبہ کیا۔ وہ آنحضرت ﷺ کے پاس آئی اور بیان کیا کہ مجھے ابو جہم اور معاویہ نے پیغام نکاح دیا ہے۔ آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ تو مفلس اور فقیر ہے' اس کے پاس کوئی مال نہیں ہے اور ابو جہم عورتوں پر سختی کرنے والا ہے اور بہت مارتا ہے تو اُسامہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لے۔ چنانچہ حضرت اُسامہ نے فاطمہ مذکورہ کو پیغام نکاح دیا تو اس نے اُسامہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لیا۔ اس حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک عورت سے کئی شخص نکاح طلب کر سکتے ہیں اور خِطبہ پر خِطبہ کرنا جائز ہے۔ چنانچہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو یکے بعد دیگرے تین شخصوں نے تین خِطبے کئے تھے۔ آخر ایک کے ساتھ نکاح ہو گیا تھا۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کا خِطبہ دو شخصوں کے بعد ہوا جن کو جناب نبی کریم ﷺ نے منع نہیں فرمایا بلکہ مشورہ دیا کہ اِن دونوں میں تو یہ عیب ہے اور فاطمہ

رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تو اُسامہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لے۔ اس نے اس مشورہ پر عمل کر کے اُسامہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لیا (ترمذی) اور کہا کہ فبارک اللّٰہ لی فی اُسامۃ کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے اُسامہ کے نکاح میں برکت عطا فرمائی۔ (ترمذی)

اس سے خِطبہ علی الخِطبہ کا جواز ثابت ہوا۔ جن احادیث میں پیغام پر پیغام دینا منع ہوا ہے' اُن میں بھی تادیب پر محمول ہے یعنی یہ مسلمانوں کو اخلاقی طور پر ادب سکھلاتا ہے کہ اگر ایک خِطبہ کرے تو دوسرا اس پر خِطبہ کر کے اس کا کام نہ بگاڑے۔ اس کا فیصلہ ہو لینے دے' خِطبہ پر خِطبہ کرنا اخلاقی حیثیت سے غیر مناسب ہے لیکن حرام اور گناہ نہیں ہے۔

مولانا سید احمد حسن صاحب دہلوی مرحوم حاشیہ بلوغ المرام ص ۴۹' جلد دوم میں فرماتے ہیں: قال بعض العلماء النھی للتادیب کہ جن احادیث میں خِطبہ پر خِطبہ کرنے کی نہی آئی ہے' وہ تادیب پر محمول ہیں۔ بعض علماء کا یہی قول ہے۔ جن علماء کے نزدیک نہی تحریمی نہیں ہے' ان کے نزدیک خِطبہ علی الخِطبہ کی بنا پر جو نکاح ہو گا وہ بھی جائز ہے۔ اس کے برخلاف بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ خِطبہ پر خِطبہ کرنا ناجائز اور حرام ہے کیونکہ احادیث میں اس کی نہی آئی ہے اور نہی فساد کو چاہتی ہے۔

بعض روایتوں میں لا یحل کا لفظ وارد ہے جو حرمت کو مقتضی ہے۔ لہٰذا منگنی پر منگنی حرام ہے۔ چنانچہ جمہور کا بھی یہی مذہب ہے۔ علامہ سید احمد حسن مرحوم حاشیہ بلوغ المرام ص ۴۹' جلد دوم میں فرماتے ہیں کہ ذھب الجمھور الی ان النھی للتحریم کہ جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ احادیث نہی خِطبہ علی الخِطبہ میں نہی تحریمہ ہے۔ پھر نکاح خِطبہ علی الخِطبہ کا درست ہے یا نہیں؟ جمہور کہتے ہیں کہ نکاح درست ہے لیکن امام مالک اور امام داؤد رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نکاح فسخ ہو گا' جائز نہیں ہے۔ یہی میرا مذہب ہے' اب اس کی تفصیل عرض کروں گا۔

خِطبہ کے معنی اور اس کی کیفیت: لفظ خُطبہ خاء کے ضمہ کے ساتھ ہو تو کلام اور تقریر کا معنی دیتا ہے جبکہ کسی سے خطاب کیا جائے اور سامعین کو مخاطب کر کے تقریر کی جائے تو اس کو خُطبہ کہتے ہیں۔ اگر خِطبہ خاء کی زیر کے ساتھ ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ اظہار استدعاء التزوج یعنی نکاح کرنے کی درخواست کرنا صراح میں ہے۔ خِطبہ بالکسر زن خواستن یعنی خِطبہ خاء معجمہ کی زیر کے ساتھ ہے جس کے معنی ہے عورت چاہنا' عورت کا رشتہ مانگنا۔ پس عربی محاورہ میں نکاح کے پیغام دینے اور منگنی کرنے کو خِطبہ کہتے ہیں۔ یہ منگنی کئی طرح سے مروج ہے۔

ایک یہ کہ عورت کو نکاح کا پیغام دیا جاتا ہے یا عورت کے ولی کو نکاح کی درخواست کی جاتی ہے۔ یہ پیغام نکاح اور درخواست سن کر عورت مخطوبہ یا اس کا ولی عہد خاموش ہو جائے یا کہے کہ ہم اس بات کو سوچیں گے' غور کریں گے اور اپنے رشتہ داروں سے اس امر کا مشورہ کریں گے پھر جواب دیں گے یہ بھی خِطبہ ہے۔ دوم یہ کہ کسی کو پیغام نکاح دیا جائے اور وہ قبول کر لے لیکن فریقین (خاطب اور مخطوبہ) کی طرف سے لین دین نہ ہو۔ سوم یہ کہ کسی شخص سے اس کی مولیہ عورت کا نکاح طلب کیا جائے اور وہ یہ کہہ دے کہ میں نے اپنی لڑکی تیرے لڑکے کو دے دی یا تجھ کو دے دی اور وہ قبول کر لے۔ اس پر مٹھائی تقسیم کر دی جائے اور زیور کپڑے دیئے جائیں اور مہر مقررہ ادا کیا جائے۔ چہارم یہ کہ کسی سے نکاح طلب کیا جائے اور وہ بالصراحت منظور کر لے اور یہ کہہ دے اور پختہ عہد کر لے کہ میں اپنی لڑکی تجھ کو دے دوں گا یا تیرے لڑکے کو دے دوں گا۔ لڑکے خاطب کی طرف سے کچھ زیور' کپڑے لڑکی والوں کو لڑکی کے لیے دیئے جائیں۔ ان تمام صورتوں کے مختلف حکم ہیں۔ صورت اولیٰ میں خِطبہ پر خِطبہ کرنا حرام نہیں' خلاف اولیٰ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ایسی صورت میں کسی کے خِطبہ پر خِطبہ نہ کیا جائے۔ لڑکی والوں کی طرف سے ہاں یا نہ سے جواب ہو لینے دیا جائے۔ بحکم یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ "اپنے بھائی مسلمان کے لیے وہی چیز دوست رکھیں جو اپنے نفس کے لیے رکھتے ہیں۔"

ہاں اگر پہلے خِطبہ کا علم ہی نہ ہو تو پھر بلا شبہ جائز ہے۔ دوسری صورت خِطبہ میں کسی دوسرے کو خِطبہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح چوتھی کا حکم ہے کیونکہ ان دونوں صورتوں میں مخطوبہ کی طرف سے تصریح بالاجابۃ ہو چکی ہے اور یہ عہد ہے جس کا ایفاء واجب ہے بحکم اوفوا بالعھد' اوفوا بالعقود اس عہد کو پورا کیا جائے۔ اب کسی اور شخص کو یہ جائز نہیں ہے کہ فریقین میں سے کسی کو بہکا کر عہد شکنی کرائے۔ اگر ایسا کرے گا تو مجرم ہو گا۔

بلوغ المرام میں حدیث ہے کہ عن ابن عمر رضی اللہ عنھما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یخطب احدکم علی خِطبۃ اخیہ حتّٰی یترک الخاطب قبلہ او یاذن لہ۔ متفق علیہ واللفظ للبخاری۔ یعنی "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کوئی شخص اپنے بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام نکاح

نہ دے، جب تک کہ وہ پیغام دینے والا اپنے پیغام کو چھوڑ نہ دے یا کسی کے لیے اذن نہ دے دے۔ روایت کیا اس حدیث کو بخاری و مسلم نے اور عبارت بخاری کی ہے۔" اس حدیث سے خِطبہ پر خِطبہ کرنے کی ممانعت ثابت ہو گئی۔

(۲) اخرج احمد عن سمرة مرفوعًا بلفظ نهى ان يخطب الرجل على خِطبة اخيه (تحفة الاحوذى جلد۔۲، ص۔۱۴۳) یعنی "سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ کوئی مرد اپنے بھائی مسلمان کے خِطبہ پر خِطبہ کرے۔"

(۳) مشکوٰۃ نمبر۔۳ میں ہے کہ عن ابى هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يخطب الرجل على خِطبة اخيه حتّٰى ينكح او يترك (متفق عليه) یعنی "ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کوئی مرد اپنے مسلمان بھائی کے خِطبہ پر خِطبہ نہ کرے، یہاں تک کہ وہ نکاح کرے یا چھوڑ دے۔

(۴) حديث عقبة بن عامر فاخرجه احمد ومسلم ولفظ "المومن اخ المومن فلا يحل للمومن ان يتباع على بيع اخيه ولا يخطب على خِطبة اخيه حتى يذر۔ (تحفة الاحوذى جلد۔۲، ص۔۱۴۳) یعنی "عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن مومن کا بھائی ہے، مومن کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ اپنے بھائی کی بیع پر بیع کرے یا اس کی منگنی پر منگنی کرے جب تک کہ وہ چھوڑ نہ دے۔ اس حدیث کو مسلم اور احمد نے روایت کیا ہے۔"

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث ولا يخطب على خِطبة اخيه نقل فرما کر لکھا ہے کہ قال مالك بن انس انما معنى كراهية ان يخطب الرجل على خِطبة اخيه اذا خطب الرجل المراة فرضيت به فليس لاحد ان يخطب على خطبة۔ یعنی " خِطبہ پر خِطبہ کرنا اس وقت منع ہے کہ مرد کسی عورت کو خِطبہ کرے اور وہ اس سے نکاح کرنے پر راضی ہو جائے تو پھر کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی کرے۔"

پھر لکھا ہے کہ قال الشافعى معنى هذا الحديث لا يخطب الرجل على خِطبة اخيه هذا عندنا اذا خطب الرجل المراة فرضيت به وركنت اليه فليس لاحد ان يخطب على خطبة فاما قبل ان يعلم رضاها او ركونها اليه فلا باس ان يخطبها والحجة فى ذالك حديث فاطمة بنت قيس حيث جاء ت النبى صلى الله عليه وسلم فذكرت له

ان ابا جهم بن حذیفة ومعاویة بن ابی سفیان خِطباها فقال اما ابو جهم فرجل لا یرفع عصاه عن النساء واما معاویة فصعلوک لا مال له ولکن انکحی اسامة فمعنی هذا الحدیث عندنا واللّٰه اعلم ان فاطمة لم تخبره برضاها بواحد منهما فلوا خبرته لم یشر علیها بغیر الذی ذکرته۔ (ترمذی بمع شرح تحفة الاحوذی جلد۔۲، ص۔۱۹۲) یعنی "امام شافعی نے فرمایا کہ حدیث لا یخطب الرجل علی خطبة اخیه کا معنی ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جب کوئی مرد کسی عورت کو خِطبہ کرے اور وہ عورت اس مرد سے نکاح کرنے پر راضی ہو جائے اور اس کی طرف شادی کرنے کو مائل ہو تو پھر کسی شخص کے لیے یہ حق نہیں ہے کہ اس کے خِطبہ پر خِطبہ کرے ہاں اگر عورت کی رضامندی اور میلان کا علم نہ ہو تو پھر خِطبہ پر خِطبہ کرے۔ ہاں اگر عورت کی رضامندی اور میلان کا علم نہ ہو تو پھر خِطبہ پر خِطبہ کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اس بارہ میں وہ حدیث دلیل ہے جو فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے متعلق ہے کہ جب اس نے نبی کریم ﷺ کے پاس آکر ذکر کیا کہ ابو جہم اور معاویہ رضی اللہ عنہما نے مجھے پیغام نکاح دیا ہے تب آنجناب ﷺ نے فرمایا کہ ابو جہم تو عورتوں پر سے لاٹھی نہیں اُٹھاتا یعنی عورتوں کو بہت مارتا ہے اور معاویہ مفلس ہے، جس کے پاس مال نہیں ہے تو اُسامہ سے نکاح کر لے۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضور ﷺ پر اپنی رضامندی کسی شخص سے نکاح کرنے کی ظاہر نہیں کی تھی کہ فلاں شخص سے میں نکاح کرنے پر راضی ہو چکی ہوں۔ اگر وہ آنحضرت ﷺ کو اپنی رضامندی سے آگاہ کر دیتی تو آنحضور ﷺ اس کے خلاف اس کو مشورہ نہ دیتے۔

سبل السلام شرح بلوغ المرام جلد۔۲، ص۔۳۳ میں ہے کہ والنهی یدل علی تحدیم ذالک وقد اجمع العلماء علی تحریمها اذا کان قد صرح بالاجابة ولم یاذن ولم یترک۔ یعنی "نہی خِطبہ پر خِطبہ کرنے کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے اور اس کی حرمت پر علماء کا اجماع ہے جبکہ خاطب کا خِطبہ صراحت کے ساتھ قبول کر لیا گیا ہو اور پھر اُس نے چھوڑا نہ ہو اور نہ کسی کو اذن دیا ہو۔

نیل الاوطار میں ہے: استدل بهذا الحدیث علی تحریم الخطبة علی الخطبة۔ یعنی "اس حدیث سے خِطبہ علی الخِطبہ کی حرمت پر استدلال کیا گیا ہے۔"

تحفۃ الاحوذی جلد۔۲، ص۔۱۹۲ میں ہے کہ قال النووی فی شرح مسلم هذه

الاحادیث ظاهرة فی تحریم الخطبة علی خطبة اخیه واجمعوا علی تحریمها اذا کان صرح للخاطب بالاجابة ولم یاذن ولم یترک۔ یعنی "یہ احادیث منگنی پر منگنی کرنے کے حرام ہونے پر ظاہر دلیل ہیں اور اس پر علماء کا اتفاق ہے جبکہ خاطب کا خِطبہ بالصراحۃ منظور کر لیا گیا ہو اور اس نے وہ رشتہ نہ چھوڑا ہو اور نہ کسی کو اس کا اذن دیا ہو۔"

فتح الباری وغیرہ میں بھی اسی طرح ہے۔ اس تصریح سے یہ معلوم ہو گیا کہ جب خِطبہ منظور ہو جائے اور منگنی طے ہو جائے تو پھر کسی دیگر شخص کو اس پر خِطبہ کرنا' منگنی کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ اگر خاطب اول کے خِطبہ کا علم پا کر خاطب ثانی خِطبہ کرے گا تو مجرم ہو گا۔ سبل السلام میں ہے : فان تزوج والحال هذه عصی اتفاقا۔ تحفۃ الاحوذی میں ہے کہ فلو خطب علی خِطبة وتزوج والحالة هذه عصٰی۔ دونوں عبارتوں کا حاصل مطلب یہ ہے کہ اگر منظور شدہ خِطبہ پر خِطبہ کر کے کسی نے نکاح کر لیا تو یہ بالاتفاق گنہگار ہوا۔ اب جو شخص یہ کہتا ہے کہ خِطبہ پر خِطبہ جائز ہے' اس کا قول مردود ہے' کیونکہ حدیث میں لفظ لا یحل وارد ہے جو حرمت پر دال ہے۔

<u>نکاح کا حکم</u>: باقی رہا یہ مسئلہ کہ خِطبہ مصرح بالاجابۃ پر خِطبہ کر کے جس شخص نے نکاح عورت مخطوبہ کا لے لیا وہ نکاح صحیح ہے یا فاسد ہے۔ سو اس میں اختلاف ہے' جمہور علماء تو صحیح کہتے ہیں اور امام داؤد اور ایک روایت میں امام مالک اس کو صحیح نہیں کہتے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ نکاح فسخ ہے۔ امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں : وصح النکاح ولم یفسخ وهذا مذهبنا ومذهب الجمهور وقال داؤد یفسخ النکاح وعن مالک روایتان کالمذهبین وقال جماعة من اصحاب مالک یفسخ قبل الدخول لا بعده۔ یعنی "ہمارے شافعیہ اور جمہور علماء کے نزدیک نکاح صحیح ہے اور امام داؤد کے نزدیک یہ نکاح فسخ ہے اور امام مالک سے دو روایتیں ہیں۔ ایک جماعت مالکیہ کا یہ مذہب ہے کہ دخول سے پہلے تو فسخ ہے بعد میں فسخ نہیں ہے۔"

سبل السلام میں ہے : وصح عند الجمهور وقال داؤد یفسخ النکاح ونعم ما قال وهی روایة عن مالک "کہ جمہور کے نزدیک یہ نکاح صحیح ہے اور امام داؤد نے فرمایا کہ نکاح فسخ ہے اور یہ اس نے اچھا کہا ہے' یہی روایت مالک سے آئی ہے۔" میرے فہم ناقص میں امام داؤد کی بات راجح ہے کہ اگر والدین نے خِطبہ منظور کر لیا اور تصریح بالاجابۃ کر دی

خصوصاً زیور، مہر وغیرہ بھی وصول کر لیا پھر کسی نے مزید رقم دے دی اور نفسانیت سے ان کو بہکا دیا، جس پر والدین نے خاطب ثانی کو نکاح دے دیا اور محض طمع نفسانی اور لالچ پر اس نے یہ کام کیا تو یہ نکاح فاسد ہے کیونکہ منظور شدہ خِطبہ پر خِطبہ کرنا حرام ہے۔ اس حرام کے ذریعہ جو نکاح حاصل کیا وہ بھی حرام ہے بلکہ وہ بلاولیٰ حرام ہونا چاہیے کیونکہ خِطبہ سے منع کرنا دراصل نکاح سے روکنا ہے ورنہ محض خِطبہ سے روکنے کا کچھ معنی نہیں ہے۔

دیگر یہ کہ جب خاطب اول کا خِطبہ منظور ہو چکا اور اس نے مہر دے کر رشتہ پختہ کر لیا تو اب اس کا حق بن گیا اور لڑکی والوں کے ذمہ یہ نکاح دینا واجب ہو گیا۔ اب جو شخص مداخلت بیجا کر کے اس کے حق میں دست اندازی کرتا ہے، وہ ظلم کرتا ہے، گناہ کرتا ہے، حق تلفی کرتا ہے۔ اس بناء پر جو نکاح کرے گا وہ فاسد ہو گا کیونکہ فریقین کا معاملہ فاسد ہے۔ اس لیے حدیث میں یترک اور یاذن کے الفاظ وارد ہیں کہ خاطب اول چھوڑ دے یا دوسرے کو اذن دے دے۔ لفظ اذن سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ خاطب اول کا اس لڑکی مخطوبہ پر حق ثابت ہو چکا ہے۔ اگر دوسرا بغیر اذن کے نکاح لے گا اور مخطوبہ عورت یا اس کا ولی بغیر فیصلہ خاطب اول کے دوسرے خاطب سے نکاح کرے گا تو یہ نکاح جائز نہ ہو گا۔ یہ پہلے کے حق میں بلا اذن دست اندازی ہے اور اس کا حق غصب کرنا ہے۔ اس لیے ایسا نکاح جو سراسر ظلم اور گناہ پر مبنی ہے، فسخ ہے۔ امام امیر یمنی صاحب سبل السلام نے اسی کو پسند فرمایا ہے اور کہا ہے کہ نعم ما قال کہ امام داؤد نے کیا اچھا فرمایا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس منگنی میں رشتہ پختہ کر دیا گیا اور کچھ جہیز بھی وصول کر لیا گیا ہو اور عقد کا معاہدہ ہو گیا ہو اس کا دوسری جگہ لینا دینا حرام ہے، جب تک کہ پہلے سے فیصلہ نہ کر لیا جائے۔ دلائل اس کے اوپر ذکر ہو چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرما دیا ہے۔ دیگر یہ کہ اوفوا بالعھد وعدہ اور عہد کا ایفاء واجب ہے اور ترک حرام ہے، سوم اس سے تفرقہ پیدا ہوتا ہے، دل آزاری ہوتی ہے، فساد پھیلتا ہے۔ چہارم یہ کہ خاطب اول کی مہر وغیرہ دینے سے حقیقت ثابت ہو گئی اب دوسرے کو اس کا حق غصب کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی وجہ شرعی یا دنیوی ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ والدین خاطب اول کو نکاح لڑکی کا دینا نہیں چاہتے تو ان کو چاہیے کہ جس طرح رشتہ کیا ہے، اسی طرح ہی معذرت پیش کر کے رشتہ فسخ کر دیں اور اس کا خرچہ واپس کر دیں۔ جب معاملہ صاف ہو جائے تو پھر دوسری جگہ رشتہ کر دیں۔

جو علماء منگنی پر منگنی کرنا شرعاً جائز قرار دیتے ہیں اور قبل از فیصلہ ہی نکاح پڑھ دیتے ہیں' وہ مفسد ہیں جو لوگوں میں فساد ڈالتے ہیں اور نکاح کو جائز کہہ کر حرام اور گناہ کا ارتکاب کراتے ہیں۔ اسی وجہ سے لوگ کئی کئی جگہ منگنیاں کر لیتے ہیں اور طمع نفسانی میں آکر باطل طریقہ سے لوگوں کا مال کھاتے رہتے ہیں' جس سے کئی فسادات پیدا ہوتے ہیں۔ پس ان تمام جرائم کی ذمہ داری ان مولویوں پر ہے۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ خِطبہ پر خِطبہ کرنا تو شرعاً اور اخلاقاً حرام ہے لیکن نکاح بنفسہ دوسری جگہ کرنا صحیح ہے' نکاح منعقد ہو جائے گا تب بھی قبل از عقد ایسے نکاح کو فسخ کر دینا چاہیے اور مفسدہ دفع کرنے اور مصلحت مسلمانان کو مدنظر رکھنے کی وجہ سے نکاح فسخ کر دینا جائز ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جو خلافت فاروقی میں مدائن کے گورنر تھے' ایک یہودیہ عورت سے نکاح کر لیا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ اس کو فوراً الگ کر دو حالانکہ نکاح بنفسہ جائز تھا۔ اسی طرح ایک عورت نے اپنے غلام سے نکاح کر لیا تھا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان میں تفریق کر کے پھر اس عورت کو حکم دیا کہ کسی دوسری جگہ نکاح نہ کرے۔ دوسری جگہ نکاح کرنا اس پر حرام کر دیا حالانکہ جائز تھا۔ اسی طرح ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک رجعی طلاق ہوتی ہے جس میں رجوع جائز ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین کو جاری کر کے رجوع کو ناجائز کر دیا' یہ سب مصلحت وقتی اور سیاسی وتعزیری احکام ہیں۔ اسی طرح خِطبہ پر خِطبہ کرنے کے فسادات کا بھی انسداد ضروری ہے کہ اس کو حرام ٹھہرا کر نکاح نہ کیا جائے۔

باقی رہی منگنی کی تیسری صورت کہ جس میں لڑکی کا ولی خاطب سے مجلس عام میں اس کے خِطبہ پر یہ لکھ دیتا ہے کہ میں نے لڑکی تم کو دے دی یا اپنی لڑکی میں نے تم کو بخشی' وہ قبول کر لیتا ہے اور مٹھائی تقسیم کر دی جاتی ہے اور زیور' کپڑے' مہر دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ اگرچہ رواج عام میں اس کو نکاح تصور نہ کیا جائے اور پھر وہ تاریخ مقرر کر کے نکاح پڑھتے پڑھاتے رہیں لیکن شرعی نکتہ نگاہ سے صورت مذکورہ میں نکاح ہو چکا ہے۔ کیونکہ نکاح ایجاب وقبول ہی کا نام ہے۔ سو یہ گواہان کے سامنے برضاء فریقین واقع ہو چکا ہے۔ مہر کا بھی فیصلہ ہو گیا ہے۔ پھر نکاح میں کیا شبہ باقی رہا۔ قاضی نکاح کو بلا کر خِطبہ پڑھانا اور اس کو وکیل بنا کر نکاح کروانا اور پھر گواہ نام بنام مقرر کرنا اور رجسٹر میں اندراج کرانا یہ سب رواج زمانہ ہے اور انتظام سیاسی ہے اور بندوبست قومی ہے' ورنہ یہ

چیزیں شرعاً رکن نکاح یا شروط نکاح نہیں ہیں اور بہ ہیئت کذائیہ مامور بہ شارع کی طرف سے نہیں ہیں۔ نکاح تو محض برضائے فریقین ایجاب وقبول کرنے کا نام ہے۔ خِطبہ مسنون ہے' گواہوں کا ہونا شرط ہے' سو گواہ مقرر کرنے سے نہیں بنا کرتے بلکہ جب کسی کے سامنے کوئی کام ہو جائے اور وہ دیکھ لے تو وہ شخص اس کام پر گواہ ہو چکا' خواہ اس کا نام اس وقت گواہ نہ رکھا جائے' اسی طرح قاضی نکاح کا بلانا اور اس کے واسطے سے ایجاب وقبول کرانا ضروری نہیں ہے بلکہ ولی نکاح خود بھی ایجاب وقبول کر سکتا ہے۔ نہ رجسٹر میں اندراج شرط ہے۔ یہ صرف حکومتی نظام ہے۔

الغرض منگنی کی صورت مذکورہ میں نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں کسی دوسرے کو خِطبہ کرنا بھی حرام ہے اور نکاح پڑھنا پڑھانا بھی حرام ہے۔ اگر نکاح کیا تو منعقد نہ ہو گا۔ میرے خیال میں اس مسئلہ میں کسی محقق عالمکو اختلاف نہ ہو گا اور اس بات سے کوئی انکار نہ کرے گا۔ ہاں بعض علماء ابنا الزمان جو زمانہ کے رواج کو مستند جانتے ہیں' وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ صورت بھی محض منگنی میں شمار ہے اور نکاح نہیں ہوتا۔ نکاح اس وقت ہوتا ہے جس وقت برات آتی ہے اور مجلس نکاح منعقد ہوتی ہے اور قاضی نکاح کو بلایا جاتا ہے اور مہر باندھ کر اس کے عوض بطریق معروف ایجاب وقبول کرایا جاتا ہے۔ جیسا کہ خطبات اردو پنجابی میں نکاح معروف کا طریقہ درج ہے۔

سو یہ قیود بالزوم ثابت نہیں ہیں اور ان کا ایسا تعین شرع سے ثابت نہیں ہے کہ اس کے بغیر نکاح نہ ہو۔ نکاح کا رکن تو ایجاب اور قبول ہیں۔ جیسے صورت بیع میں ہے' جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ بغیر اس ہیئت کذائیہ مروجہ کے نکاح نہیں ہوتا' وہ کسی دلیل شرع سے ثابت کرے۔ ودُونہ خرط القتاد۔

دیگر علماء دین کی خدمت عالیہ میں عرض ہے کہ منگنی مروجہ اور اس پر دوسری منگنی کر کے نکاح کرنے کے جواز عدم جواز والے نکاح کی حرمت وحلت پر ضرور روشنی ڈالیں اور اپنی اپنی تحقیق سے مسلمانوں کو مستفید فرمائیں' والسلام

کتبہ عبدالقادر عارف حصاری

از دارالاقامتہ چک 71/5L ضلع منٹگمری (ساہیوال)

اہل حدیث سوہدرہ جلد۔ ۳' شمارہ۔ ۴'۵'۶' مورخہ ۲۴/ جنوری' یکم و ۸/ فروری سنہ۔ ۱۹۵۱ء

جوڑ ملنے پر بھی نکاح نہ کرنا

سوال : کوئی شخص بھی جس کے گھر میں لڑکی ۲۸ سال کی بیٹھی ہو اور پیغام مسلمان' دیندار' صوم وصلوٰۃ کے پابند کے ملتے ہوں اور وہ کوئی شرعی عذر نکالے بغیر کوئی نہ کوئی نقص نکالتا ہو' کیا ایسے شخص کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے؟

حاجی نور محمد ڈیرہ غازی خاں

الجواب بعون الوھاب' واضح ہو کہ جب لڑکا' لڑکی بالغ ہو جائیں تو ان کی شادی اور نکاح کر دینا واجب ہے' دیر کرنا جائز نہیں ہے۔ قرآن کریم سورہ نور میں ہے : وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ یعنی "تم میں جو بے نکاح ہیں' ان کا نکاح کر دو۔"

اس آیت میں لفظ أَنكِحُوا صیغہ امر ہے۔ علم عربی قواعد کی رو سے یہ وجوب کے لیے ہوتا ہے تاوقتیکہ کوئی قرینہ صارفہ نہ ہو۔ جیسے قرآن کریم میں یہ حکم وارد ہے : اقیموا الصلٰوۃ نماز قائم کرو۔ واٰتوا الزکٰوۃ زکوٰۃ ادا کرو۔ پس اقیموا واٰتوا دونوں صیغے امر کے ہیں' اس لیے نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ اسی طرح آیت سورہ نور میں أَنكِحُوا صیغہ امر ہے کہ بے خاوند عورتوں کا نکاح کر دو۔ اَیَامٰی "اَیِّم" کی جمع ہے۔ اور اَیِّم کہتے ہیں من لا زوج له بکرا او ثیبا ومن لا امراۃ له (قاموس) اس عورت کو جس کا کوئی خاوند نہ ہو' خواہ وہ کنواری یا بیوہ یا مطلقہ ہو' اور اس مرد کو بھی کہتے ہیں جس کی بیوی نہ ہو۔

اب مطلب صاف واضح ہو گیا کہ جس عورت کا خاوند نہ ہو یا جس مرد کی بیوی نہ ہو' ان کی شادی اور نکاح کر دو۔ اس حکم کی تعمیل کرنا واجب ہے۔ ترغیب میں یہ حدیث ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : من کان موسرا لان ینکح ثم لم ینکح فلیس منی۔ "جو مرد اور عورت نکاح کرنے کی وسعت رکھنے کے باوجود نکاح نہیں کرتے' وہ جماعت سے خارج ہیں۔"

مشکوٰۃ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اے علی! تین کاموں میں تاخیر اور دیر نہ کرنا۔ ایک یہ کہ جب نماز کا وقت آجائے تو فوراً نماز پڑھنا' دوسرا یہ کہ جب میت حاضر ہو تو اس کا فوراً جنازہ پڑھ کر تدفین عمل میں لانا' تیسرا یہ کہ جب لڑکا' لڑکی بالغ ہوں اور ان کا اسلامی کفو ملے تو فوراً ان کا نکاح کر دینا۔

غور کرو کہ لڑکی اور لڑکے کے نکاح کو پانچ وقتی نماز اور میت کے جنازہ کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ ان تین کاموں میں دیر اور تاخیر کرنا منع ہے۔

پس جس امام کی لڑکی ۲۸ سال کی بیٹھی ہے اور اس نے اس کا اسلامی کفو ملنے کے باوجود اس کے نکاح کا فرض ادا نہیں کیا' وہ اللہ اور رسول کا عاصی ونافرمان ہے۔ اس کو فوراً امامت سے معزول کیا جائے' وہ نافرمان امام مسلمانوں کی امامت کرنے کے لائق نہیں۔ اس کا کوئی عذر قابل سماعت نہیں ہے کہ وہ سب مسلمانوں سے بدگمانی رکھتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ کوئی مسلمان نہیں ملتا حالانکہ .بفضلہ تعالیٰ جماعت اہلحدیث میں کتنے لڑکے باشرع موجود ہیں۔ مدرسوں اور درسگاہوں میں طلباء موجود ہیں' کسی لڑکے علم دار اور صالح موحد سے نکاح کر دے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قصہ پڑھو کہ رسول اللہ ﷺ سے جب ان کا نکاح ہوا تو وہ چھ برس کی تھیں اور زفاف جب ہوا تو وہ نو برس کی تھیں۔ جب آپ رحلت فرما گئے تو اس وقت اٹھارہ برس کی تھیں۔ (صحیح مسلم)

مشکوٰۃ میں یہ حدیث ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کی اولاد پیدا ہو تو اس کو چاہیے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور جب بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کر دے۔ اگر بالغ ہونے کے بعد باپ نے نکاح نہ کیا تو جو گناہ لڑکی یا لڑکا کریں گے' وہ باپ کے ذمہ ہو گا۔

اور دوسری حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ توراۃ شریف میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جس شخص کی لڑکی بارہ سال کی ہو جائے اور وہ اس کی شادی نہ کرے اور وہ کسی گناہ میں مبتلا ہو جائے تو اس کا گناہ اس کے باپ پر عائد ہو گا۔

ان احادیث سے یہ ظاہر ہوا کہ جس شخص کے گھر میں لڑکی ہے' اس کی شادی کر دینا فرض اور ضروری ہے۔ پس جس امام کی لڑکی عمر میں ۲۸ سال کی ہو گئی ہے اور اس نے اب تک اس کی شادی نہیں کی تو وہ فرض کا تارک ہے اور فرض کا تارک مرتکب کبیرہ ہے اور لڑکی گناہ کرے گی تو وہ اس پر عائد ہے۔ اس طرح بھی وہ فاسق اور دیوث ہے۔ پس ایسے امام کو امامت سے معزول کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔

ابوداؤد میں حدیث ہے کہ ایک شخص نے مسجد کی قبلہ کی جانب والی دیوار پر تھوک دیا تھا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو امامت سے معزول کر دیا تھا۔ اگر اس مسجد والوں نے اس

لڑکی والے امام فاسق کو امامت سے معزول نہ کیا تو اس کی اقتدا میں نماز مکروہ تحریمہ ہو گی اور وہ مسلمان مقتدی اس حدیث کے نافرمان قرار پائیں گے کہ حدیث شریف میں یہ وارد ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

ان سرکم ان تقبل صلٰوتکم فلیؤمکم خیارکم فانھم وفدکم بینکم وبین ربکم۔ (رواہ الطبرانی والحاکم) "اگر تم کو یہ بات اچھی لگتی ہے کہ تمہاری نماز قبول ہو جائے تو نماز کے لیے تم نیک' صالح اور پرہیزگار لوگوں کو اپنے امام بناؤ کیونکہ وہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ایلچی ہیں۔"

اگر لڑکی باپ کو چھوڑ کر اپنے خاندان میں سے کسی کو ولی بنا کر اپنا نکاح کسی نیک شخص سے کر لے تو یہ جائز ہے۔ باپ کو ولایت سے معزول کر دیا جائے کیونکہ نکاح میں ولی مرشد شرط ہے' اب باپ ولی مرشد نہیں ہے۔

جو لڑکیاں پردہ میں ہیں' ان کو شرعی مسئلہ کا علم نہیں ہے کہ ہم کو نکاح کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ اگر علم ہو تو وہ کسی کو خود ولی بنا کر اپنا نکاح کرا سکتی ہے۔ اگر علم ہونے پر نکاح نہ کرے تو بالغہ بھی گنہگار ہو گی۔ حدیث میں ہے : ان سنتنا النکاح شرارکم عذابکم واراذل موتاکم عذابکم۔ یعنی "نکاح کرنا ہمارا شرعی طریقہ ہے' تمہارے میں سے بدترین وہ لوگ ہیں جو بے نکاح ہیں اور مرنے والوں میں بدترین وہ لوگ ہیں جو بغیر نکاح کے مرتے ہیں۔"

اسی لیے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے اپنے اقرباء سے کہا تھا زَوِّجُوْنِیْ کہ میرا کسی عورت سے نکاح کر دو لاَ اَلْقَی اللّٰہَ عَذَبًا کہ میں مرنے کے بعد اللہ سے ملاقات کروں تو بے نکاحا نہ ہوں۔ (تلخیص جلد۔۲' ص۔۲۷۰)

درمختار میں ہے کہ ہمارے لیے بجز نکاح اور ایمان کے اور کوئی ایسی عبادت نہیں جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک مشروع رہی اور پھر جنت میں بھی مستمر ہو۔

پس نکاح عبادت ہے اور عبادت بھی ایسی کہ تمام شرائع میں مشترک چلی آئی ہے اور جنت میں بھی اس پر تعامل رہے گا۔ قرآن میں ہے : وَزَوَّجْنٰھُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ٭ "کہ بیاہ دیا ہے متقیوں کو گوریوں اور اچھی آنکھوں والیوں عورتوں کے ساتھ۔"

پس افسوس صد افسوس ہے اس امام پر جس نے اپنی لڑکی کو اس عبادت سے محروم کر

رکھا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تم نکاح زیادہ کرو تاکہ میری امت کی اکثریت ہو جائے تاکہ قیامت کے دن میں اکثریت سے دیگر انبیاء پر فخر کر سکوں۔ اگر پندرہ سال کی عمر میں وہ امام اپنی لڑکی کی شادی کر دیتا تو ۲۸ سال کی عمر تک کتنے بچے پیدا ہوتے' جس سے امت محمدیہ بڑھ جاتی۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

حررہ عبدالقادر العارف الحصاری غفرلہ الباری

صحیفہ اہل حدیث جلد۔۶۰' شمارہ۔۱۹' ۲۰' مورخہ یکم و ۱۶ شوال سنہ۔۱۳۹۹ھ

داماد سے شادی کا خرچہ لینا

عام طور پر شادی کے موقعہ پر دو قسم کا خرچ لیا جاتا ہے۔ (۱) عرفی (۲) شرعی۔ عرفی خرچ شادی کا یہ ہے کہ مثلاً لڑکی والے اپنے رشتہ داروں کو لڑکی کے بیاہ پر دعوت دیتے ہیں اور برات کو ایک یا دو روز گھر پر رکھتے ہیں پھر سب کے لیے کھانا خاص طور پر تکلف سے تیار کیا جاتا ہے اور شادی میں حجام' میراثی' لوہار' ماشکی وغیرہ جو زمینداروں کے ہاں عموماً کام کرتے ہیں' ان کو اُجرت "لاگ" کے نام سے دی جاتی ہے' لڑکیاں جو شادی میں شریک ہو کر گاتی ہیں' ان کو دامے درمے خوش کیا جاتا ہے' علاوہ ان کے ڈھول' تماشہ کرنے والوں کو بھی دیتے ہیں اور بہت سی رسومات کرتے ہیں۔ ایسے کاموں کے لیے خرچہ لینا قطعاً ناجائز ہے' کیونکہ یہ اخراجات شوہر ناکح کے ذمہ نہیں ہیں۔ اس لیے کہ بعض کام اور رسمیں تو سرے سے ناجائز ہیں اور بعض لڑکی کے ولی کے ذمہ ہیں یعنی رشتہ داروں اور برات والوں کو بطور مہمانی کے کھانا دینا لڑکیکے اولیاء کے ذمہ ہے۔ ان کو چاہیے حسب وسعت اپنے آدمیوں کو دعوت دیں اور برات کے لوگوں کو بلائیں اور سادگی سے ایک دن کھانا دے کر ان کو وداع کر دیں' زیادہ تکلف نہ کریں۔ مولانا حافظ محمد صاحب مرحوم لکھوی کا پنجابی میں شعر ہے ؎

جو پیش نکاحوں کھانا دیون اوہ ولیمہ نائیں
جے قصد کرن مہمانی دعوت ہوسی روا تدائیں

یعنی نکاح سے پہلے کھانا کھلانا کسی صورت ولیمہ نہیں کہلا سکتا' ہاں بطور مہمان نوازی کھلا دینا جائز ہے۔ پس مہمانوں کا حق گھر والوں پر ہے۔ اب یہ درست نہیں ہے کہ مہمانوں کے

کھانے کی قیمت مہمانوں ہی سے وصول کی جائے۔

اگر خرچ شرعی مراد ہے تو یہ لینا جائز ہے' خرچ شرعی سے مراد یہ ہے کہ جو لڑکے اور لڑکی کی خانہ آبادی اور ضروریات کے لیے چیزیں تیار کی جائیں تو ان کے لیے اپنے داماد نا کح یا اس کے ولی سے خرچہ لینا جائز ہے اور لڑکی کا ولیمہ بھی اسی خرچہ سے کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ لڑکی راضی ہو۔ اس کے ثبوت کے لیے لفظ حدیث احق ما یکرم الرجل دلیل نہیں ہے' بلکہ یہ حدیث دلیل ہے : عن ابن عباس قال لما تزوج علی فاطمه قال له رسول الله صلی الله علیه وسلم اعطها شیئا قال ما عندی شئی قال این ودعک الحطیئة۔ یعنی "ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہوا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ فاطمہ کو کوئی شئی مہر میں دو' تو انہوں نے معذرت فرمائی کہ میرے پاس کوئی نقد چیز نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا تمہاری زرہ کہاں ہے؟ وہ لا کر دے دو۔"

اس سے ثابت ہوا کہ داماد سے لڑکی کا مہر اور جہیز کا سامان لیا جا سکتا ہے اور جو کچھ خرچ' ہدیہ' عطیہ عقد سے پہلے لیا جائے گا' وہ سب لڑکی کا حق متصور ہو گا۔ اس لیے لڑکی والے جو کپڑے زیور وغیرہ لڑکے یا اس کے ولی سے شرط کر لیتے ہیں' وہ سب لڑکی کا حق ہوتا ہے۔ ہاں بعد عقد نکاح اور شادی ہونے کے لڑکی کے وارثوں کو لڑکا یا اس کا ولی کوئی نقدی یا کوئی دیگر چیز ہدیہ اور عطیہ اکرام اور استحسان کے طور پر دیں تو یہ بہت اچھا ہے اور عزت افزائی ہے اور لڑکی کے ولی کو لینا حلال ہے' ان سب باتوں کا ثبوت اس حدیث میں ہے :

ایما امراة نکحت علی صداق او حباء او عدة قبل عصمة النکاح فهو لها وما کان بعد عصمة النکاح فهو لمن أعطیه واحق ما اکرم علیه الرجل ابنته واخته۔ (ابوداؤد) یعنی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی عورت مہر' عطیہ یا کسی شرط وعدہ پر نکاح کرے تو ان سب چیزوں کی عورت حقدار ہے' (خواہ کوئی دوسرا اسے اپنے لیے سمجھے رکھے) بشرطیکہ نکاح ہونے سے پہلے پہلے ہو اور جو نکاح کے بعد ہو' وہ اسی کا حق ہے جس کو دیا جائے کیونکہ بہت اچھی چیز جس پر انسان کی عزت کی جائے اس کی بیٹی یا بہن ہے' یعنی ان کی وجہ سے اُن کے متعلقین کا وقار واحترام ہو۔"

اِس حدیث کو ابن ماجہ نے بھی ذکر کیا ہے۔ اس مسئلہ پر یہ نص صریح ہے کہ لڑکی کی

ضروریات کے لیے لڑکی کے وارث جو اپنے ہونے والے داماد یا اس کے وارثوں سے کوئی چیز لیں تو یہ جائز ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ والی حدیث بھی اس پر دلیل ہے۔

امام مالک نے موطا میں اس مسئلہ پر یوں باب منعقد کیا ہے کہ باب ما اشترط الولی لنفسه فهو للمراة ان ابتغته یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ "ولی اپنی رشتہ دار عورت کے نکاح میں اپنے لیے کوئی چیز شرط کر لے تو وہ عورت کا حق ہے۔" پھر اس پر یہ روایت پیش کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حکومت کے افسروں کو یہ حکم لکھا کہ اپنی ماتحت رعایا کی نگہداشت کرو کہ نکاح دہندہ باپ ہو یا کوئی دیگر ولی اس کو اس نکاح میں جو عطیہ یا ہدیہ ملے تو وہ اُس ولی کا حق نہیں ہو گا بلکہ اس عورت منکوحہ کا حق ہو گا بشرطیکہ وہ طلب کرے۔ (ہاں عورت کی رضامندی سے ولی کھا سکتا ہے)

اس ضابطہ اسلامی کا فلسفہ یہ ہے کہ عقد سے پہلے جو ناکح یا اس کے وکیل سے چیز لی جائے گی وہ معاوضہ نکاح متصور ہو گا اور نکاح کے معاوضہ کی حقدار عورت ہے' اس کا ولی نہیں۔ ولی کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ اس عورت کی خیر خواہی کے لیے اس کا مناسب جگہ مناسب معاوضہ میں نکاح کر دے۔ اب اگر وہ روپیہ یا نقدی مال یا کوئی چیز اپنے لیے لینا شرط کرے گا اور اس کے بغیر اس لڑکی کی شادی اور نکاح نہ کرے گا تو یہ رشوت ہو گی جو اس پر حرام اور موجب لعنت ہے۔

چنانچہ درمختار میں لکھا ہے : اخذ اهل المراة شيئا عند التسليم فللزوج الاسترداد قائما او هالكا لانه رشوة۔ یعنی لڑکی والوں کا لڑکی دینے کے وقت کوئی چیز لینا رشوت ہے۔" ناکح کو واپس لے لینا چاہیے (کیونکہ دینا اور لینا دونوں گناہ ہیں) اگرچہ وہ دی ہوئی چیز موجود ہو یا خرچ ہو گئی ہو۔

اسی طرح شامی میں ہے اور درمختار باب الحظر میں ہے : ومن السحت ما ياخذ الصهر من الختن بطيب نفسه۔ یعنی خسر کا اپنے داماد سے نکاح میں کوئی چیز اپنے لیے شرط کر کے لینا حرام ہے (لیکن بعد نکاح داماد خوشی سے خود بخود کچھ دے دے تو جائز ہے)۔

بعض قوموں میں اُلٹ شرط ہے کہ لڑکے والے جب کسی سے لڑکی لیتے ہیں تو ان سے کچھ مال لینے کی شرط کرتے ہیں' ورنہ ان سے لڑکی نہیں لیتے یہ بھی حرام ہے۔ چنانچہ رد المختار باب الہبہ میں ہے : حبطت المال علی نفسها عوضا عن النکاح وفي النكاح

العوض لا یکون علی المراۃ یعنی عورت سے نکاح کے عوض مال لینا بیکار ہے' کیونکہ عورت پر شرعاً نکاح کا عوض نہیں ہے' (ناکح پر ہے)۔

ہمارے گاؤں میں جو سکھ مالدار تھے' اگر ان کو کوئی اپنی لڑکی کا رشتہ دینا چاہتا تو وہ ان سے پانچ دس ہزار روپیہ یا اتنی مالیت کی چیز طلب کرتے تھے' جو سکھ یہ مال دے دیتا تھا' اس سے لڑکی لے لیتے تھے ورنہ نہیں۔

اخبار نوائے وقت میں یہ خبر درج ہے کہ فیروز پور میں ایک وکیل کی لڑکی کی منگنی ایک سکول ٹیچر سے قرار پائی تھی مگر عین اس وقت جبکہ رسومات شروع ہونے والی تھیں' لڑکے والوں نے تین ہزار روپے نقد شگن کا مطالبہ کیا' وکیل صاحب صرف چھ سو روپیہ دینے پر آمادہ تھے' جب ہونے والے داماد نے زیادہ اصرار کیا تو وکیل صاحب نے اپنے گھر سے نکال دیا اور رشتہ توڑ دیا۔

اسی طرح حیدر آباد دکن کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک ہیڈ ماسٹر صاحب دولہا بن کر برات سمیت اپنے ہونے والے خسر کے ہاں وارد ہوئے مگر نکاح نامہ پر دستخط ہونے سے پہلے جہیز پر جھگڑا ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب زیادہ جہیز مانگتے تھے' خسر صاحب عدم استطاعت کا عذر کر کے کچھ کم دیتے تھے' جھگڑا ہوتا رہا آخر تنگ آ کر اس نے دولہا سے یہ کہا کہ اچھا آپ اپنے گھر تشریف لے جائیں' پھر اس نے حاضرین میں سے ایک مناسب حال نوجوان کو شادی پر آمادہ کر کے اسی وقت اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کر دیا۔

الغرض لڑکی والوں سے کچھ مانگنے کا جو رواج ہے' یہ بالکل ہی باطل ہے۔ ہاں لڑکی والے لڑکے والوں سے مہر اور جہیز کا سامان طلب کر سکتے ہیں لیکن بوجھ بن کر یا اس کی طاقت سے بڑھ کر نہیں۔ لڑکے کی استطاعت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے' زیادہ مہر گو جائز ہے لیکن مستحب وہی ہے جو آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عام معمول تھا۔

ورثاء عورت کے طلب کرنے کے بغیر محض تالیف قلوب کی غرض سے ناکح کا از خود دے دینا بھی درست ہے۔ علامہ شوکانی نیل الاوطار جلد۔۶' ص۔۹۱ میں فرماتے ہیں : قولہ احق ما یکرم علیہ الرجل ابنتہ واختہ فیہ دلیل علی مشروعیۃ صلاۃ اقارب الزوجۃ واکرامھم والاحسان الیھم وان ذلک حلال لھم ولیس من قبیل الرسوم المحرمۃ الا ان یمتنعوا من التزویج الا بہ۔ یعنی "یہ حدیث احق ما یکرم علیہ الرجل میں اس بات پر

دلیل ہے کہ زوجہ کے قریبی ولیوں کو کچھ دے کر صلہ رحمی کرنا' ان کی عزت افزائی کرنا اور اگر غریب ہوں تو ان کی امداد کر کے ان پر احسان کرنا' یہ سب مشروع ہیں اور یہ ان کے لیے حلال ہے' یہ رسوم محرمہ میں داخل نہیں ہے مگر اس صورت میں کہ لڑکی کے اولیاء شرط کرلیں کہ ہم کو اتنے روپے دو' تب نکاح دیں گے یہ حرام ہے۔"

اس کو لڑکی بیچنا نہیں کہتے بلکہ رشوت کہتے ہیں۔ عورت بیچنا تو یہ ہے کہ کسی عورت کی قیمت ٹھہرا کر اسے فروخت کر دے پھر آگے وہ نکاح کرے یا ویسے گھر میں رکھے یا کسی سے نفع لے کر فروخت کر دے' جیسے عام طور پر بدمعاش بردہ فروشی کیا کرتے ہیں' یہ بھی سخت حرام ہے۔ حدیث قدسی میں ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تین شخصوں کی طرف سے میں خود ان کے مجرموں سے جھگڑا کروں گا۔ ایک وہ شخص کہ میرے نام سے کوئی چیز دیا گیا اور پھر غداری کی' دوسرا وہ شخص جس نے آزاد کو غلام کی طرح فروخت کیا اور تیسرا وہ شخص جس نے کسی کو مزدوری پر مقرر کیا اور اس مزدور نے کام پورا کر دیا پھر اس نے اس کو مزدوری نہ دی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عورت کے ولی کا ناجائز خرچ لینا یا اپنے لیے کچھ طلب کرنا حرام ہے اور لڑکی کی ضروریات کے لیے جائز حدود کے اندر اندر لینا جائز ہے' بشرطیکہ پھر وہ لڑکی کا جہیز بنا دے۔ ورثاء عورت کو آبرو مندانہ نکاح کر دینے کے بعد ناکح خوشی سے کچھ دے دے تو جائز ہے' کیونکہ حدیث مقدس کے صاف الفاظ ہیں : ما اکرم به ابوھا او اخوھا او ولیھا بعد عقد النکاح فھو له۔ یعنی (بغیر کسی شرط اور دباؤ کے) نکاح کر لینے کے بعد دولہا کی طرف سے اگر سسرال والوں کی کسی ہبہ سے عزت کی جائے گی تو یہ ان کے لیے روا ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

قوانین فطرت' سوہدرہ جلد۔۷' شمارہ۔۵' ماہ مئی سنہ۔۱۹۶۰ء

ولیمہ اور نیندرہ

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہمارے علاقہ میں شادی کے موقع پر ولیمہ کے بجائے کھانا کھانے والوں سے شادی والے پیسے وصول کرتے

ہیں، جسے "نینڈرہ" کہتے ہیں۔ کیا از روئے شرع شادی میں سنت کھانا کھلانا چاہیے یا کھانے کے پیسے وصول کئے جائیں؟ ہمارے ہاں اس مسئلہ میں علماء دین کے دو فریق ہیں، جن میں سے فریق اول جو ان میں شمولیت کو ناجائز کہتا ہے، اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

(ا) عقیقہ اور اضحیٰ (قربانی) کا گوشت بیچنا حرام ہے۔ اسی طرح ولیمہ جو کہ سنت نبوی ہے، اس کے پیسے وصول کرنا ناجائز ہیں۔ چونکہ ان رسومات کا آنحضرت ﷺ نہ آپ کے صحابہ یا خلفاء راشدین سے کوئی ثبوت ہے، اسی بناء پر ایسی شادی میں شمولیت کرنا بدعت کو فروغ دینا ہے۔ لہٰذا اس شادی میں نہ شریک ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں ایک آدمی روپیہ کا کھانا کھاتا ہے لیکن شادی والے اس سے دس یا بیس روپیہ وصول کرتے ہیں جو سراسر غلو اور اسراف ہے۔ ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین اور ان اللّٰہ لا یحب کل مختال فخور وغیرہٗ۔

فریق ثانی جو اس شادی میں شمولیت کو جائز قرار دیتا ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

تعاونوا علی البر والتقویٰ ۔ اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے شادی کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرمایا کہ فلاں فلاں چیز لاؤ۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم سامان لائے تو آپ نے ولیمہ کیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو کھلایا۔ علاوہ "نینڈرہ" ہدیہ کی طرح ہے، اب آپ از روئے قرآن وحدیث دونوں فریقوں سے جس فریق کو قوی دلائل کی بناء پر صحیح سمجھیں، اس کے متعلق وضاحتی دلائل قرآن وحدیث سے دے کر مشکور فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

(سائل حکیم مولوی جان محمد ضلع تھرپارکر سندھ)

الجواب بعون الوھاب، الحمد للّٰہ رب العالمین، اما بعد فاقول وباللّٰہ التوفیق۔ واضح ہو کہ شادی کے بعد ولیمہ کرنا سنت ہے جو قولی وفعلی حدیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ مسند احمد جزء۲۱، ص۲۹۴ باب حکم ولیمہ میں یہ حدیث وارد ہے جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ بیان فرماتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی تو اس پر خوشبو اور اثر ظاہر ہوا۔ آپ نے فرمایا یہ کیا حال ہے اے عبدالرحمٰن! تو اس نے کہا "تزوجت امراۃً من الانصار" کہ میں نے ایک انصاری عورت سے نکاح کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کتنا مہر دیا ہے؟ اس نے کہا ایک گٹھلی سونے کی دی ہے۔ فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اولم ولو بشاۃ۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ولیمہ کر اگرچہ ایک بکری ہی ہو۔

دوسری روایت میں ہے: بارک اللہ لک اولم ولو بشاۃ۔ اللہ تعالیٰ تیرے لیے برکت کرے، ولیمہ کر اگرچہ بکری ہو۔

اس حدیث قولی سے ایک تو یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ ولیمہ شادی کے بعد دولھا اور دولہن کے میل ملاپ ہو جانے پر کیا جانا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ ولیمہ کرنا سنت خیر الانام ہے۔ تیسرا یہ کہ جس کی شادی ہو، اس کو مبارکباد دینی جائز ہے۔ چوتھا یہ کہ مہر دینا ضروری ہے اور وہ پہلے دے دینا چاہیے۔ پانچواں یہ کہ مہر عورت کا حق ہے، اس کی ملک کر دینا چاہیے۔

دوسری حدیث جزء-۲، ص-۲۰۵ میں یہ مذکور ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ما رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اولم علی امراۃ من نسائہ ما اولم علی زینب بنت جحش قال فاولم بشاۃ۔ یعنی "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ازواج مطہرات میں سے اپنی کسی بیوی پر ایسا بڑا ولیمہ کرتے نہیں دیکھا جیسا کہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی شادی پر کیا کہ ایک بکری ذبح کر کے کھلائی۔"

تیسری حدیث میں یوں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: لما دخل النبی صلی اللہ علیہ وسلم بزینب بنت جحش اولم فاطعمنا خبزا لحما وفی لفظ فاشبع المسلمین خبزا ولحما۔ یعنی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے ملاپ کر چکے تو ولیمہ کیا تو ہم کو کھلایا اور تمام مسلمانوں کو روٹی اور گوشت سے سیر کر دیا۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ ولیمہ کرنا سنت نبوی ہے۔ دوسرا یہ کہ ولیمہ گوشت روٹی سے کرنا افضل ہے۔ تیسرا یہ کہ حسب توفیق جماعت مسلمین کو بلا کر ولیمہ کا کھانا کھلایا جائے۔

مسند احمد میں اسی صفحہ پر چوتھی حدیث حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بابت پیغام شادی دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرما کر یہ ارشاد فرمایا: لابد للعروس من ولیمہ یعنی شادی کے لیے ولیمہ کرنا ضروری ہے۔

تب یہ سن کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرے ذمہ ایک دنبہ ہے کہ میں ولیمہ کے لیے ایک دنبہ دے دوں گا۔ کسی دوسرے شخص نے کہا اتنا ہی میں دے دوں گا اور کچھ اناج جوار کی قسم سے دوں گا۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ شادی کے لیے ولیمہ کرنا سنت واجبہ ہے یعنی ضرور کرنا پڑے گا۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ کسی غریب شخص کو اپنی خوشی سے تعاونوا علی البر والتقوٰی کی بناء پر حسب توفیق کچھ دینا جائز ہے۔ چنانچہ اس حدیث

کی شرح میں لکھا ہے : ان الصحابة رضی اللّٰہ عنہم کانوا یسابقون الی البر وافعال الخیر عملاً بقوله تعاونوا علی البر والتقوٰی۔ یعنی ”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نیکی اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کیا کرتے تھے اور وہ اس آیت پر عمل کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نیکی اور بھلائی میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔“

پانچویں حدیث میں جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا ولیمہ کیا جو آپ کی زوجہ محترمہ تھیں کہ ایک دسترخوان لایا گیا‘ اس پر کھجور‘ گھی اور پنیر لائے گئے۔ فشبع الناس لوگ سیر ہو گئے۔ اس حدیث سے بھی دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ گوشت کے بغیر دوسری میٹھی لذیذ چیزوں سے بھی ولیمہ جائز ہے۔ دوسرا یہ کہ لوگوں کو بلا کر ولیمہ کا کھانا کھلانا چاہیے۔

چھٹی حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : اذ دُعی احدکم الٰی ولیمة عروسٍ فلیجب۔ یعنی ”جب کوئی تمہارا شادی کے ولیمہ کی طرف بلایا جائے تو چاہیے کہ اس کی دعوت قبول کرے۔“

ساتویں حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے : شر الطعّام طعام الولیمة یدعی الغنی ویترک المسکین وھی حق فمن ترکھا فقد عصٰی۔ یعنی ولیمہ کا بدترین کھانا وہ ہے جس میں غنیوں (امیروں) کو بلایا جائے اور مسکینوں (غریبوں) کو چھوڑا جائے۔ ولیمہ کی دعوت حق ہے جو قبول نہ کرے وہ نبی اکرم ﷺ کا نافرمان ہے۔

آٹھویں حدیث ص-۲۰۸ پر یہ ہے کہ عکرمہ بن عمار بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابو عاریہ یمانی سے سنا‘ اس نے بیان کیا کہ میں مدینہ میں آیا تو وہاں کثیر بن صلت کا قاصد آیا‘ اس نے ان لوگوں کو جو مسجد میں بیٹھے تھے‘ دعوت ولیمہ دی‘ تو اُن میں سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور پانچ شخصوں کے علاوہ کوئی کھڑا نہ ہوا۔ ان پانچ میں سے ایک میں تھا۔ ہم اس داعی کے گھر چلے گئے‘ وہاں جا کر کھانا کھایا‘ پھر واپس آئے تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ دھو کر فرمایا : واللّٰہ یا اھل المسجد انکم لعصاة لابی القاسم۔ یعنی ”اے مسجد والو تم نبی اکرم ﷺ کے نافرمان ہو۔“ اس حدیث سے دعوت قبول کرنے کا وجوب ثابت ہوا۔

نویں حدیث ص-۲۰۹ پر یہ وارد ہے : ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال الولیمة اول یوم حق والثانی معروف والیوم الثالث سمعة وریاء۔ یعنی ”پہلے دن ولیمہ

کرنا ضروری ہے' دوسرے دن مستحب ہے اور تیسرے دن ریاکاری اور نمود ہے۔"

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ولیمہ بعد شادی کے ایک دن یا دو دن کھلانا جائز ہے۔

دسویں حدیث مسند احمد ص۔۸۰/۱ پر یوں مذکور ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر سے شادی کرنے کا پیغام دینا چاہا تو میں نے دل میں یہ کہا مالی من شئی فکیف۔ یعنی شادی کے اخراجات کے لیے میرے پاس کوئی چیز تو ہے نہیں' میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کی بیٹی سے شادی کا پیغام دینے کی کس طرح جرأت کر سکتا ہوں۔ پھر میں نے یاد کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق حسنہ اور صلہ رحمی کرنا اور قریبوں پر احسان کرنا اور زیارت کے لیے گھروں میں آنا جانا وغیرہ جملہ اوصاف حسنہ سے متصف ہیں' اس لیے وہ میرے پیغام کو مسترد نہیں فرمائیں گے۔ پس خِطبہ کر دیا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ھل لک من شئی قلت لا یعنی آپ کے پاس کوئی چیز ہے؟ میں نے کہا کچھ نہیں۔ تو آپ نے فرمایا تمہاری حطمی زرہ جو میں نے تم کو فلاں دن دی تھی' وہ کہاں ہے؟ قال ھی عندی قال فاعطھا ایاہ۔ کہا وہ میرے پاس ہے' فرمایا وہی مہر میں دے دو۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مہر شادی سے پہلے دے دینا چاہیے اور وہ عورت کا حق ہے۔

گیارہویں حدیث (مسند احمد) ص۔۱۴۷/۲ پر حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ میں سے ایک شخص سے یہ سوال کیا کہ کیا تم نے شادی کر لی ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں جناب! کیونکہ لیس عندی مال اتزوج بہ۔ یعنی میرے پاس شادی کے لیے خرچ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تیرے پاس قل ھو اللہ احد نہیں ہے؟ اس نے کہا ہاں یہ تو ہے۔ آپ نے فرمایا یہ چوتھا حصہ قرآن کا ہے پھر فرمایا تیرے پاس قل یاایھا الکٰفرون سورۃ نہیں ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں ہے۔ آپ نے فرمایا یہ چوتھا حصہ قرآن کا ہے۔ پھر فرمایا کہ تیرے پاس اذا زلزلت الارض نہیں ہے؟ اس نے کہا ہاں ہے' فرمایا یہ چوتھا حصہ قرآن کا ہے پھر فرمایا کہ تیرے پاس اذا جاء نصر اللہ نہیں ہے؟ اس نے کہا ہاں ہے۔ آپ نے فرمایا یہ چوتھا حصہ قرآن کا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کیا تیرے پاس آیت الکرسی نہیں ہے؟ اس نے کہا ہاں موجود ہے۔ آپ نے فرمایا یہ چوتھا حصہ قرآن کا ہے۔ پھر آپ نے اس کو تین دفعہ فرمایا تَزَوَّجُ تَزَوَّجُ تَزَوَّجُ یعنی تو ان سورتوں کے بدلے میں شادی کر لے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قرآن پڑھانے کی اجرت لینا درست ہے۔ اس اجرت کو مہر بنانا درست ہے۔

بارہویں (حدیث مسند احمد) کے ص-۲۲۹ پر یوں ہے کہ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے دو جوتیوں کو مہر بنا کر کسی عورت سے نکاح کر لیا پھر وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا تو آنحضور ﷺ نے اس کے نکاح کو جائز رکھا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مہر کی کوئی حد نہیں ہے' کم وبیش ہر عورت اور عورت کا ولی راضی ہو جائے' اسی پر نکاح کرنا جائز ہے۔

تیرہویں حدیث (مسند احمد) کے ص-۱۷۵ پر یوں آئی ہے' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے بیان کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ایما امراۃ نکحت علی صداق او حباء او عزۃ قبل عصمۃ النکاح فھو لھا وما کان بعد عصمۃ النکاح فھو لمن أعطیہ۔ یعنی "جس عورت نے نکاح کیا مہر پر یا کسی ہبہ کی ہوئی چیز پر یا کسی وعدہ اور شرط پر پہلے نکاح سے وہ حق عورت کا ہے اور جو چیز دی جائے بعد عقد نکاح کے پس وہ اس شخص کے لیے ہے جس کو دی جائے۔" پھر فرمایا واحق ما یکرم علیہ الرجل ابنتہ واختہ۔ یعنی "زیادہ حقدار وہ چیز جس پر آدمی کی عزت کی جائے اس کی بیٹی اور بہن ہے۔" اس حدیث سے ظاہر ہوا عقد نکاح سے پہلے جو چیز دولہا سے مہر میں لی جائے' یا وہ کوئی چیز ہبہ کردے یا کسی چیز کی شرط اور وعدہ کرلے تو وہ حق اور ملک عورت کا ہے اور نکاح کے بعد دولہا کی طرف سے اس کے باپ یا بھائی کو بطور ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کوئی چیز دی جائے تو وہ حق عورت کے اولیاء کا ہے۔

چودھویں حدیث (مسند احمد) کے ص-۱۷۷ میں اس طرح ہے کہ مائی ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ان سے نکاح کر لیا تو یہ فرمایا' میں تیری اس چیز سے کمی نہیں کروں گا جو تجھے تیرے بھائیوں نے دیا ہے۔ دو چکیاں' گھڑا اور تکیہ چمڑے کا جس میں کھجور کے پتے چھال بھری ہوئی ہے۔

حاصل مطلب ان احادیث کا یہ ہے کہ دولہا کے ذمہ اس کی منکوحہ بیوی کا مہر ہے اور لڑکی کو اس کے رشتہ دار کوئی چیز شادی میں بطور ہدیہ دیں تو جائز ہے' ولیمہ شادی کے بعد ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص مسکین غریب ہو تو اس کو بطور تعاون علی البر والتقوی کوئی مسلمان امداد کردے تو یہ جائز ہے۔

باقی سوال میں جو ولیمہ پر پابندی سے کوئی نیوتا یا کوئی رقم برادری لینے دینے کی جاری کر لے اور اس پر عمل درآمد ہو تو یہ رسم ناجائز اور حرام ہے جس میں کسی مسلمان کو شریک

ہونا اور دعوت کھانا جائز نہیں ہے۔ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن اجابت دعوۃ الفاسقین۔ کہ رسول کریم ﷺ نے فاسقوں کی دعوت قبول کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ الباری

صحیفہ اہل حدیث جلد ۵۹' شمارہ ۹' مورخہ یکم جمادی الاول سنہ ۱۳۹۸ھ

کیا دولہا بوقت نکاح پھولوں کا ہار استعمال کر سکتا ہے؟

سوال : زید بوقت نکاح پھولوں کا ہار استعمال کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ارشاد الٰہی ہے : قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (الایۃ) حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ مجھے تین چیزیں زیادہ مرغوب ہیں جن میں سے ایک خوشبو ہے۔ مذکورہ آیت کریمہ اور حدیث کے پیش نظر خوشی کے موقع پر التزاماً یا رسماً نہیں بلکہ خوشبو کی غرض سے قلیل مقدار میں پھولوں کا ہار استعمال کرلینے میں از روئے شریعت محمدیہ کوئی قباحت نہیں ہے۔

بکر کہتا ہے کہ بوقت نکاح پھول کا استعمال مطلقاً بدعت اور ناجائز ہے اور ایسی مجلس میں شرکت کرنا بھی شرعی نقطہ نظر سے جائز نہیں۔ وارثین علم محمدی سے گذارش ہے کہ مذکورہ بالا صورت حال میں آیا زید حق بجانب ہے یا بکر؟ والسلام --- محمد رحمتہ اللہ خاں بنگلور سٹی۔

جواب : ہر خوشی اور زینت کے کام پر بدعت کا حکم نہیں لگانا چاہیے۔ بدعت وہ کام ہے جو ثواب اور دین سمجھ کر کیا جائے یا کسی رسم ہنود کو جو ان سے مخصوص ہو' رسماً کیا جائے۔ ہار پھولوں کا خوشی سے یا زینت سے پہن لیا یا کسی نے ڈال دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں' مباح ہے۔ بدعت کی تعریف اس پر صادق نہیں' الا اس صورت میں کہ اس کو رسم جان کر التزاماً کیا جائے اور نکاح میں ضروری اعتقاد کیا جائے تو بدعت بن سکتا ہے ورنہ خوشی اور زینت اور خوشبو کے طور ہو تو درست ہے۔ حدیث وما سکت عنہ فھو عفو اس پر دال ہے کہ جس چیز کو شارع نے منع نہ کیا وہ معاف ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری

الجواب صحیح ابو محمد عبدالستار دہلوی

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص ۱۲۹

مسئلہ جہیز

اخبار قوانین فطرت مطبوعہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۹۰ء کے ص ۲ پر ایک مضمون بعنوان "جہیز کی حقیقت" حضرت مولانا محمد جعفر شاہ صاحب مدظلہ العالی کی طرف سے شائع ہوا ہے جس میں جہیز شادی کو جاہلیت کی رسم قرار دے کر اس سے مطلقاً انکار کیا گیا ہے۔ یہ تو سب کو مسلم ہے کہ انقلاب روزگار نے اسلامی، معاشرتی، اخلاقی، اقتصادی، سیاسی امور میں تغیر عظیم پیدا کر دیا ہے۔ مشروع کاموں کی کیفیت اور ہیئت بھی اس قدر بدل گئی ہے کہ اسلام کفر ہو گیا ہے اور کفر اسلام بن گیا ہے، سنت بدعت ہو گئی ہے اور بدعت سنت قرار پا چکی ہے۔

خصوصاً منگنی اور شادی کی رسومات کو تو بعض اہل علم نے قیامت صغریٰ اور کبریٰ سے تعبیر کیا ہے کہ نکاح جو سنت انبیاء تھا، تغیر عظیم سے بدعت کا طوفان بن گیا ہے، جس میں عاقبت کا سراسر خسران ہے، لیکن جیسے رسومات شادی سے نفس شادی کا انکار صحیح نہیں ہے، ایسے ہی جہیز کی ہیئت مرسومہ سے متاثر ہو کر نفس جہیز سے انکار کر دینا صحیح نہیں ہے۔ اپنی اولاد کی خیر خواہی، حق ادائی اور صلہ رحمی کی نیت سے جہیز دینا مشروع ہے، اس سے انکار کرنا صحیح نہیں ہے۔

کہا گیا ہے کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر کہیں نہیں ہے اور فقہ میں باب الجہیز موجود نہیں ہے، ازواج النبی ﷺ اور بنات الرسول ﷺ کے جہیز کا کوئی ذکر نہیں ہے اور اس کو سنت رسول کہنا موجب غضب ہے، وغیرہ۔

اس نفس مسئلہ کے متعلق اس راقم کمترین خلائق نے کچھ عرض کرنا ہے، جس کو رسومات مروجہ سے خالی الذہن ہو کر سمجھنا چاہیے۔ لفظ جہاز جہیز کا اطلاق اگرچہ مطلق سامان پر ہوتا ہے لیکن اس کا اطلاق سامان شادی پر (جو دلہن یا دولہا کو دیا جاتا ہے) بھی وارد ہے۔ چنانچہ علم لغت کی کتابوں میں یوں تحریر ہے :

لغات الحدیث میں لکھا ہے سامان مسافر کا ہو یا میت کا یا دلہن کا سب کو جہیز کہا جا سکتا ہے۔

بیان اللسان میں ہے، جَہاز، جِہاز مُردہ کی تجہیز و تکفین کا سامان، دلہن کا اسباب، مسافر کا اسباب سب پر حاوی ہے۔

مصباح اللغات میں ہے : الجَہاز والجِہاز للمیت او للمسافر او للعروس۔ لفظ

جَهَّزَهُ لِلْعُرُوْسِ کا ترجمہ لکھا ہے جہیز کا سامان تیار کرنا۔ جب جہاز جہیز کا معنی مطلق سامان اور اسباب کا ہوا تو عبارات میں جس کا ذکر ہو گا' اس کا سامان مراد لیا جائے گا' مثلاً میت کا ذکر ہوا تو اس سے میت کا سامان مراد ہو گا اور اگر بیاہ شادی کے ذکر میں جہاز یا جہیز کا لفظ ہو گا تو اس سے دلہن کا سامان مراد ہو گا۔ بہرحال لفظ جہاز اور جہیز کا اطلاق سامان دلہن پر وارد ہے اور یہ اہل لغت عربی و اُردو میں مسلم ہے' جس سے انکار کرنا محال ہے۔ پس جو سامان شادی میں دلہن کو دیا جائے گا' اس کو جہاز جہیز کہیں گے' خواہ وہ سامان قلیل ہو یا کثیر' اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ یہ دلہن یا دولہا کے اولیاء کی استطاعت پر موقوف ہے کہ اگر وہ مالدار ہوں گے تو اپنی لڑکیکو زیادہ سامان دیں گے اور اگر غریب ہوں گے تو تھوڑا دے دیں گے' جیسے مہر کا حکم ہے کہ اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے' کیونکہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا قرآن کی ایک سورت مہر مقرر ہوا تھا اور بعض کا اسلام قبول کرنا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو آزاد فرمایا تو اس کا آزاد کرنا ہی مہر قرار دے دیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں جب مہر کثیر سے منع کیا تو ان کے مقابلہ میں ایک بڑھیا نے اُٹھ کر آیت قنطار پیش کر دی یعنی قرآن کہتا ہے خواہ تم نے حق مہر میں ایک خزانہ دیا ہو' یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے قول سے رجوع کر کے اس کی بات تسلیم کر لی۔ (تفسیر مدارک) ایسے ہی جہاز کا حکم ہے کہ یہ بھی وسعت کی بناء پر حسب استطاعت دیا جاتا ہے' اشیاء یا ان کی تعداد میں نہیں' اب اس کا ثبوت سنئے :

نسائی شریف جلد۔۲' ص۔۸۲ میں مستقل باب ہے' "جِهَازُ الرَّجُلِ اِبْنَتَهٗ" یعنی اپنی بیٹی کو شادی میں جہیز دینے کا بیان۔ امام نسائی نے یہ عنوان "کتاب النکاح میں قائم کیا ہے اور ان کے عنوانات بمنزلہ ابواب ہیں تو یہ باب جہیز کے ذکر میں ہے۔ پھر اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل حدیث پیش کی ہے :

عن علی رضی اللہ عنہ قال جَهَّزَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاطمۃ فی خمیل وقربۃ ووسادۃ حشوھا اذخر۔ یعنی "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یہ جہیز دیا' ایک حاشیہ دار چادر' ایک مشکیزہ اور ایک تکیہ جس کی بھرائی اذخر گھاس نامی سے تھی۔"

ابن ماجہ کی روایت میں دو تکیوں کا ذکر ہے' جن کو حضرت عائشہ وام سلمہ رضی اللہ عنہما نے

کھجور کے چھال کو دھن کر تکیوں کو بھرا تھا۔ پہلی روایت میں اذخر کا ذکر ہے' تو وہ بھی بیچ میں ملا دی ہو گی۔ سیرۃ النبی جلد-۱' ص-۲۴۶ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جہیز میں پلنگ اور ایک بستر دیا۔ اصابہ میں لکھا ہے کہ آپ نے ایک چادر دو چکیاں اور ایک مشک دی۔

اصلاح الرسوم ص-۴۳ میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی فرماتے ہیں' جہیز حضرت سیدۃ النساء کا یہ تھا : "دو چادر یمانی جو سوسی کے طور پر بنی تھیں' دو نہالی جن میں چھال بھری ہوئی تھی اور چار گدی' دو بازو بند چاندی کے اور ایک کملی' ایک تکیہ' ایک پیالہ' ایک چکی' ایک مشکیزا اور ایک گھڑا' ایک پلنگ۔" (بحوالہ ازالۃ الخفاء)

گو روایات میں اشیاء کی کمی بیشی سے اختلاف ظاہر ہے' مگر مجموعہ سے کچھ اسباب دینا ضروری ثابت ہے۔ نسائی شریف جلد-۲' ص-۷۸ میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی شادی بذریعہ بادشاہ نجاشی کے ذکر میں ہے کہ زوجھا النجاشی وامھرھا اربعۃ الاف۔ ابوداؤد کی روایت میں اربعۃ الاف دراھم کے الفاظ ہیں وجھزھا من عندہ یعنی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح نجاشی نے آنحضور ﷺ کے ساتھ کر دیا اور ان کو چار ہزار درہم بطور مہر اور جہیز اپنے پاس سے دیا تھا۔ گو اس جہیز کی تفصیل مذکور نہیں لیکن جب نفس جہیز دینا ثابت ہے تو تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر ملک' ہر قوم اور ہر گھر کا سامان حسب استطاعت اور حسب توفیق سامان شادی میں دینا مشروع ثابت ہوا۔ اب اگر تمام بنات نبوی اور ازواج مطہرات کے جہیز کا ذکر نہ ہو تو کچھ حرج نہیں' کیونکہ عدم ذکر سے عدم شئی لازم نہیں ہے۔

دیگر یہ کہ باپ بیٹی کو بوجہ غربت نہ دے سکے تو اس کا کچھ حرج نہیں' یہ واجبات نکاح سے نہیں ہے اور نہ ہی کوئی واجب جانتا ہے اور جو لوگ جہیز کو ضروریات شادی سمجھتے ہیں' وہ طبعاً اور اخلاقاً سمجھتے ہیں' شرعاً نہیں۔ ہاں جو شخص قومی رسم سمجھ کر یا ریا' نمود اور فخر و کبر کے لیے ایسا کرے گا' اس کو اس جہیز دینے کا کچھ ثواب نہ ہو گا لیکن اس سے نفس جواز پر اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً بعض ریاء سمعہ کے لیے نمازیں پڑھتے ہیں تو نماز پڑھنا ناجائز نہ ہو گا' اس نیت کی اصلاح واجب ہو گی۔ بہرکیف شادی میں باپ کا بیٹی کو جہیز دینا ثابت ہے۔

سیرۃ النبی جلد-۲ میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر (ابو العاص رضی اللہ عنہ) کے فدیہ میں اپنا وہ ہار بھیجا تھا جو خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے بیٹی کو اس کے جہیز میں دیا تھا۔ اس سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی میں جہیز کا ذکر ملتا ہے۔ اگر کوئی ذکر بھی نہ ملے تو جواز کے

لیے صرف ایک بار ک[illegible] بھی کافی ہے اور اس کو سنن عادیہ سے قرار دیا جائے گا' جس کا کرنا مستحب [illegible] جائز ہے۔ اگر ایک بار کے فعل کو کوئی جواز کے لیے کافی نہ سمجھے اور وہ تکرار [illegible] مطالبہ کرے تو وہ شرعاً مجرم قرار پاتا ہے۔

[illegible] امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اصول فرمایا ہے کہ ان فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الشئی مرۃ واحدۃ حجۃ باقیۃ وحق ثابت ابدا مالم ینہ عما فعل من ذٰلک ومن قال لا یکون فعل رسول اللہ الشئی حقا الا حتّٰی یکرر فعلہ فھو کافر مشرک وسخیف لانہ یقال لہ مثل ذٰلک فیما فعل مرتین او ثلاثا او الف مرۃ ولا فرق وھٰذا لا یقولہ مسلم ولا ذو عقل۔ (محلّٰی جلد۔۲' ص۔۲۴۹) یعنی "رسول اللہ ﷺ سے ایک بار کسی کام کا کرنا ثابت ہو جائے تو وہ حجت اور حق ہے' (جیسے جنازہ غائب پڑھنا ایک بار کا فعل ہے پھر ثابت نہیں' فتفکر) جب تک اس فعل کی ممانعت آپ سے ثابت نہ ہو اور جو شخص یہ کہے کہ آنحضور ﷺ کا ایک بار کسی کام کو کرنا حق نہیں ہے جب تک آپ مکرر اس کام کو نہ کریں تو ایسے خیال کا شخص کافر اور مشرک اور صاف بے وقوف ہوتا ہے' کیونکہ اس طرح تو دو بار کے فعل پر یہی کہا جا سکتا ہے تین بار پر بھی بلکہ ہزار بار کے فعل پر بھی کہا جائے گا کہ یہ کئی ہزار کیوں نہ ہوا' سو ایسی بات کوئی عقلمند مسلمان نہیں کہہ سکتا۔

دیگر کفار اور اہل جاہلیت کے لوگ جہیز دیتے ہیں اور ملک کا عرف بھی ہے تو اس ملک میں کیا خرابی ہے' یہ معاملات اور برتاؤ کی قسم ہے' سو کفار اور اہل جاہلیت کے جو کام بترع اور حسن سلوک کے طور پر ہوتے چلے آئے ہیں اور شارع نے ان سے ممانعت نہیں کی تو وہ بھی مباح ہیں جو عرف ملک خلاف شرع نہ ہو' وہ حرام نہیں ہے۔ محض اتحاد فعل اہل اسلام اور اہل کفر میں کچھ قباحت نہیں رکھتا بلکہ وہ معتبر ہے اور اصول الشرع کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً وسعت سے زیادہ جہیز اور مہر کا لینا دینا درست نہیں ہے' جو ملے اسی کو غنیمت جانے' زیادہ کا تکرار سے مطالبہ نہ کرنا چاہیے جیسا کہ حیدر آباد دکن کا واقعہ ہے کہ ایک ہیڈ ماسٹر دولہا بن کر گئے' جب نکاح کے وقت امور نکاح طے ہونے لگے اور مہر اور جہیز کا ذکر ہوا تو ہیڈ ماسٹر اپنے خسر سے جہیز زیادہ مانگنے لگے اور خسر حسب توفیق دینے لگا تو اس پر تکرار ہو گئی' آخر خسر نے تنگ آکر ہیڈ ماسٹر کو نکاح دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آپ اپنے گھر تشریف لے جائیں۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے لکھا ہے کہ جہیز میں تین امر کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ اول اختصار کہ گنجائش سے زیادہ تردد نہ کرے' دوم ضرورت کا لحاظ کہ جن چیزوں کی بے حد ضرورت واقع ہو' وہ دینا چاہیے' سوم اعلان نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ اپنی اولاد کے ساتھ صلہ رحمی ہے' دوسروں کو دکھلانے کی کیا ضرورت ہے؟ حضور ﷺ کے فعل سے جو اس روایت میں مذکور ہے' تینوں امر ثابت ہیں۔ (اصلاح الرسوم ص۔۱۳۳)

میں کہتا ہوں کہ شادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو احسن عرس فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ میں ہے: فما رأینا عرسًا احسن من عرس فاطمہ۔ یعنی "ہم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی سے احسن شادی کسی کی نہیں دیکھی۔" یہ تو آنحضور ﷺ کے اہل بیت کی شہادت ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے کہ عن جابر قال حضرنا عرس عَلِيٍّ وَّفَاطِمَةَ فما رأینا عرسا احسن منہ حشونا الفراش یعنی اللیف واُتینا بتمر وزبیب فاکلنا وکان فراشها لیلة عرسها اِهاب کبش۔ (رواہ البزار) یعنی "حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی پر حاضر ہوئے' اس سے اچھا بیاہ ہم نے کسی کا نہیں دیکھا۔ ہم نے چھال کھجور کو دھن کر ان کا بچھونا بھرا تھا اور ولیمہ میں کھجور اور انگور خشک ہم نے خوب کھائے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جو بستر دیا گیا تھا وہ دنبہ کے چمڑا کا تھا۔"

اس میں بستر کا ذکر ہے' شاہ صاحب نے ہاتھی دانت کے کنگن اور چاندی کا ہار بھی ذکر کیا ہے۔ یہ مجموعہ اشیاء سے جہیز کلی بن جاتا ہے جس سے روز روشن کی طرح جہیز کا دینا مسنون ہوا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آنحضور ﷺ علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما دونوں کے سرپرست تھے' ان کا گھر بسانا تھا' اس لیے یہ سامان دیا گیا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پہلے سے کوئی گھر ہوتا تو کچھ بھی نہ کرتے۔ یہ خیال بالکل فضول اور محض ایک وہم ہے۔ جب اپنے داماد اور لڑکی کی خیر خواہی اور خانہ آبادی مدنظر ہے تو پھر خواہ ساتھ ہو یا علیحدہ اشیاء دینے میں کیا فرق پڑتا ہے۔ اب بھی جب لڑکے شادی کرنے کے بعد گھر جاتے ہیں تو والدین کے ساتھ معمولی عرصہ رہ کر جھٹ الگ ہو جاتے ہیں۔ بہو اور ساس' خسر کا باہم اتفاق نہیں ہوتا اور لڑکے بھی عموماً اپنی بیویوں کی طرف جھک جاتے ہیں' جس سے تکرار ہو کر علیحدہ خانہ آبادی ہو جاتی ہے تو پھر کیا اس وقت لڑکی کو وہی سامان ملتا ہے جو اس کے باپ نے دیا ہوتا

ہے' اس کے خسر اور سالن اس سے ہمدردی نہیں کرتے؟ عام طور پر دانشمند لوگ اسی دور اندیشی سے جہیز دیتے ہیں کہ علیحدہ ہونے پر ہماری لڑکی کے کام آئے گا۔

پھر شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ آنحضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مہر پہلے ہی لے لیا تھا' اس سے مراد اگر نکاح سے پہلے لینا ہے تو غلط ہے اور اگر بعد نکاح اور وداع کرنے سے پہلے لینا مراد ہے تو یہ صحیح ہے۔ چنانچہ ابوداؤد کی روایتوں سے بھی ثابت ہے۔ پھر شاہ صاحب نے یہ عجیب فرمایا کہ "اگر لوگ فی الواقع جہیز کو سنت سمجھتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ اسے زر مہر ہی سے مہیا کریں"

بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے' یہ تو ایسا ہے جیسے کسی مسافر نے کہیں جانا ہو اور وہ ریل یا موٹر پر سوار ہو کر جانا چاہیے۔ سنت یہ ہے کہ گھوڑے یا گدھے یا اونٹ پر سواری کی جائے حالانکہ مقصد منزل پر پہنچنا ہے' سواری مقصود نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے خسر نے جہیز دے دیا کہ بکریاں تھیں اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو جہیز اور مہر نجاشی نے دے دیا تو اس میں کیا قباحت ہوئی۔ باپ اپنے گھر سے جہیز لڑکی کو بطور عطیہ دے دے تو یہ ممنوع کیوں ہے؟ احادیث صحاح سے زرہ کا مہر میں دینا تو ثابت ہے' اس کو بیچ کر جہیز بنانا کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔ من ادعی فعلیه البیان۔ اہل سیرت نے صرف ذکر کر دیا ہے' مگر سند صحیح درکار ہے۔ باپ جب اپنے گھر سے جہیز دے گا تو وہ لڑکی کی ملک ہو گا۔

عون الباری میں ہے: فتجهیز بنته بجهاز الی الزوج تملیک۔ یعنی "کسی شخص کا اپنی بیٹی کو جہیز دینا اس کو اس سامان کا مالک بنا دینا ہے۔" جہیز از قسم عطیہ اور ہبہ ہے' جو جائز ہے۔ جو لوگ اس کو وراثت کا حصہ تصور کر کے لڑکیوں کو ترکہ سے محروم کرتے ہیں' یہ ظلم ہے۔ جہیز دینے سے بھی لڑکی برابر وارث رہے گی۔ کتب فقہ میں بھی جہاز کا ذکر ملتا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: لو جهز ابنته وسلمه الیها لیس له فی الاستحسان استرداده وعلیه الفتوىٰ۔ یعنی "باپ نے بیٹی کو سامان شادی تیار کر کے اس کے سپرد کر دیا' تو اب اس کو واپس لوٹانا استحسان کے خلاف ہے' فقہاء کا فتویٰ اسی پر ہے۔"

فتاویٰ مولانا عبدالحی لکھنوی جلد-۲' ص ۱۳-۵۱ میں ہے کہ "باب الجهاز" "جہیز کا بیان" پھر اس کے نیچے یہ سوال وجواب ہے کہ زید نے اپنی لڑکی کو مع اسباب جہیز اس کے شوہر کے گھر بھیج دیا۔ اس کے بعد لڑکی مر گئی' اب زید کہتا ہے کہ اسباب جہیز میں نے عاریتاً دیا تھا'

اور عمرو کہتا ہے کہ ہبہ کیا تھا' پس کس کا قول معتبر ہے' اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عالمگیری میں ہے :

رجل جهز ابنته بماله ووجهه الابنته مع الجهاز ای زوجها فماتت البنت فادعی الاب انه کان عاریةً وزوجها یدعی الملک اختلفوا فیه قال بعضهم القول اول الزوج والبینة علی الاب وبه قال الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل وقال بعضهم القول قول الاب لانه هو الدافع کذا فی فتاویٰ قاضی خان۔ یعنی "کسی مرد نے اپنی لڑکی کو جہیز دے کر اس کے خاوند کے حوالہ کر دیا پھر لڑکی فوت ہو گئی' اب پھر باپ نے یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ جہیز میں نے عاریتاً دیا تھا' واپس کر دو۔ زوج نے کہا کہ نہیں تم نے لڑکی کے ملک کر دیا تھا۔ اَب فقہا میں اس مسئلہ پر اختلاف ہے۔ بعض نے کہا خاوند کا قول معتبر ہے اور باپ کے ذمہ گواہ لانے ہیں۔ شیخ امام ابوبکر کا بھی فتویٰ یہی ہے۔ بعض نے کہا کہ باپ کا قول معتبر ہے' کیونکہ وہ جہیز دہندہ ہے۔"

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے عزیز الفتاویٰ جلد اول' ص۔۱۱۲ میں "باب الجهاز والمهر" ہے اور فتاویٰ نذیریہ جلد۔۲' ص۔۲۰۲ میں ہے کہ شادی میں جو لڑکے والوں سے مل زیور وغیرہ شرط کر کے وصول کیا جاتا ہے' وہ لڑکی کا ملک ہے اور اسی جلد کے ص۔۳۳۰ میں ہے کہ جو چڑھاوا لڑکی کو میکے یا سسرال سے چڑھا ہو' وہ ملک لڑکی کے ہوتا ہے۔ عرف میں اس طرح جو چڑھاوا لڑکی کی جانب سے لڑکے کو چڑھا ہو' وہ ملک زید لڑکے کے ہے۔ یہ جواب ہے اس سوال کا کہ جو اشیاء والدین نے لڑکی کو بروقت نکاح چڑھائیں اور ناکح نے لڑکی کو چڑھائی تھیں' ان ہر دو اشیاء کا مستحق کون ہے؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نفس جہیز دینا لینا مشروع ہے اور اس کا ذکر احادیث اور کتب فقہ اور علماء کے فتووں میں ملتا ہے۔ پس اس کو غیر اسلامی قرار دینا بالکل غلط ہے۔ جہیز کا انکار کرنے والے کو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی فرمانے کی درخواست ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

ماہنامہ قوانین فطرت' سوہدرہ

جلد۔۷' شمارہ۔۶'۷ بابت ماہ جون و جولائی سنہ۔۱۹۹۰ء

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی شادیاں ہوئیں؟

متوفیہ بیوی کے مہر کی ادائیگی کی کیا صورت ہے؟

سوال : بخدمت جناب مولانا مولوی ابو محمد عبدالستار صاحب السلام علیکم، بندہ خیریت کا خواہاں ہے۔ التماس ہے کہ بندہ کے چند سوالوں کا جواب ارسال فرمائیں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی شادیں ہوئیں اور نکاح کس نے پڑھایا؟

(۲) اگر عورت مرجائے اور خاوند نے مہر ادا نہ کیا ہو تو ادائیگی کی صورت حال کیا ہے؟

جوابات باحوالہ دیں۔ (حافظ محمد حنیف کوچہ کلاں)

جواب : صحیح احادیث سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی تعداد گیارہ ثابت ہے۔ دو بیویاں تو آپ کی زندگی میں وفات پا گئی تھیں۔ ایک خدیجہ رضی اللہ عنہا اور دوسری زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا۔ باقی آپ کی زندگی میں ایک وقت میں جمع رہی ہیں بلکہ آخری وقت تک آپ کے گھر میں آباد رہیں اور آپ کے بعد فوت ہوئی ہیں۔ گیارہ سے زیادہ جو بتائے تو ثبوت اس کے ذمہ ہے۔

باقی رہا دوسرا سوال کہ ان کے نکاح کس نے پڑھائے؟ سو یہ تفصیل ہر ایک کے متعلق ملنی مشکل ہے اور کیفیت وخطبہ خوانی کا ہر ایک کی بابت کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اجمالی طور پر ہم وہی کہہ سکتے ہیں جو حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حدیث میں ہے : فلقد کانت رضی اللہ عنہا تفخر علی ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم تقول زوجکن اھالیکن وزوجنی اللہ من فوق سبع سمٰوٰت۔ (بخاری) یعنی "حضرت زینب رضی اللہ عنہا باقی ازواج پر یہ فخر کرتی تھیں کہ تمہارے نکاح تو تمہارے اولیاء نے کئے ہیں اور میرا نکاح اللہ نے ساتوں آسمانوں پر کیا ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ ازواج کے نکاح ان کے اولیاء نے کئے ہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ان کے چچا عمرو بن اسد نے کیا۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ان کے والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا شاہ حبشہ نے اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ان کے بیٹے عمر بن ابو سلمہ رضی اللہ عنہا نے، حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے پڑھایا اور بعض سے

آپ نے خود ہی کر لیا کہ وہ اسیر ہو کر آئی تھیں' آپ ہی ان کے والی تھے' واللہ اعلم۔

(۲) مہر عورت کی وفات کے بعد دینا پڑے گا۔ وہ مہر عورت متوفیہ کا ورثہ متصور ہو کر اس کے اقرباء میں تقسیم ہو گا۔ اگر عورت کے اولاد نہ تھی تو خاوند کو مہر ودیگر ورثہ سے نصف اور اگر اولاد ہے تو چہارم حصہ تمام ورثہ سے ملے گا۔ باقی اس کے قریبیوں کو جو اولاد یا والدین زندہ ہوں۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری

الجواب صحیح ابو محمد عبدالستار دہلوی

فتاویٰ ستاریہ' جلد چہارم' ص۔ ۱۵۲

اسلام لانے سے پہلے کا کیا ہوا نکاح قائم رہتا ہے یا نہیں؟

سوال : یہ کہ ایک مسلمان موقع فسادات اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان جو گندر نگر ریاست منڈلی ضلع کانگڑہ میں ٹھہرا رہا اور غیر مسلم سکھوں وغیرہ کے قبضہ میں رہ کر ٹھاکر دوارہ میں غیر مسلم یعنی ہندو ہو کر وہاں ٹھہرا رہا۔ اس نے ایک بیوہ عورت سابقہ مسلمان جو کہ اس کے ساتھ تھی' اس بیوہ عورت سابقہ مسلمان سے عقد نکاح کر لیا۔ بعد ازا وہی مرد اور وہی عورت دونوں کچھ عرصہ کے بعد پاکستان پہنچے۔ پاکستان آکر اس مرد نے اس عورت کے ساتھ عقد نکاح بموجب اہل اسلام کے دوبارہ نہ کیا' موجودہ وقت پر وہی عورت اس کے گھر آباد ہے۔ کیا جو عقد نکاح بحالت ہندو ہو کر ہندوستان میں کیا ہے' وہ عقد نکاح بموجب شریعت کے جائز ہے؟ یا کہ دوبارہ عقد نکاح کرنا ضروری ہے؟

خادم نور محمد برانچ پوسٹ ماسٹر ضلع گوجرانوالہ

جواب : نکاح ایجاب وقبول کا نام ہے' وہ سابقہ نکاح درست ہے۔ عہد نبوی میں جو مرد وعورت مسلمان ہوئے' ان کا وہی نکاح باقی رہا' نیا نکاح نہیں پڑھایا گیا تھا۔ لہٰذا ہندوستان والا نکاح درست ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری

الجواب صحیح ابو محمد الستار دہلوی

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم' ص۔ ۱۵۰

متوفیہ کے مہر کی ادائیگی' داڑھی کے گناہ اور عورت کی کمائی مرد کے کھانے کے بارہ میں سوالات

سوال : بخدمت جناب مولانا الحاج عبدالستار صاحب السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔
مزاج شریف' عرض خدمت ہے کہ ایک مسئلہ درپیش ہے جس کو حل کر کے تحریر فرمائیں۔

(۱) ایک شخص نے اپنی بیوی کا مہر نہ ہی ادا کیا اور نہ ہی معاف کرایا' اسی حال میں بیوی رحلت کر گئی' کیا اب بھی اس کا مہر ادا کیا جا سکتا ہے؟ اگر اب ادا کیا جائے تو کس کو دیا جائے؟ مفصل تحریر فرمائیں' نوازش ہو گی۔

(۲) کیا داڑھی منڈانا ایسا گناہ ہے جیسا کہ ماں سے صحبت کرنا؟ کیا کسی حدیث سے ثابت ہے؟ تحریر فرمائیں۔

(۳) کیا عورت کی کمائی کھانی مرد کو ناجائز ہے؟ مثلاً عورت ملازمت کرتی ہے' وغیرہ۔
فاطمہ بیگم دختر مرحوم اصغر علی خاں نمبردار صاحب کی طرف سے مولانا صاحب کے اندرون خانہ کو بہت بہت السلام علیکم۔

فاطمہ بیگم اول معلمہ ڈی بی گرلز اسکول' ڈھوڈیال تحصیل چکوال

جواب : (۱) ہاں اب بھی مہر ادا کرنا ضروری ہے لیکن اب مہر اس عورت کا ورثہ قرار دیا جائے گا' جس سے خاوند کو بھی حصہ ملے گا۔ اس لیے عورت کے تمام قریبی رشتہ دار لکھ کر پھر اس کے حصے کسی عالم سے کرا کر اس فریضہ کو ادا کرو' ورنہ خاوند اس حق مہر میں قیامت کو پکڑا جائے گا۔

(۲) داڑھی منڈانا گناہ ہے مگر یہ کہنا کہ ماں سے صحبت کرنے کے برابر ہے' یہ غلط ہے۔

(۳) عورت خوشی سے کھانا کھلائے اور اپنی کمائی دے تو یہ جائز ہے۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری

الجواب صحیح ابو محمد عبدالستار دہلوی

فتاویٰ ستاریہ' جلد چہارم' ص-۱۲۶

ولی قریب کے ہوتے ہوئے دوسرے کا ولی بن کر نکاح کر دینے سے نکاح ہو گیا یا نہیں؟

سوال: بغیر ولی کے نکاح جائز ہے یا نہیں؟ حقیقی ولی باپ فوت ہو گیا ہے' حقیقی تایا اپنی خود ولایت کے ساتھ اپنی بھتیجی کا نکاح اپنے لڑکے کے ساتھ کرتا ہے' مسماۃ مذکورہ کا حقیقی بھائی بالغ ہے' وہ رضامند مذکور کے نکاح میں نہیں ہے اور مسماۃ مذکورہ کی والدہ بھی رضامند نہیں ہے' کیا اس صورت میں مسماۃ مذکورہ کا نکاح جائز ہے یا نہیں؟ (سائل حاجی اللہ دین اوڈ)

جواب: ولی کے بغیر نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ حدیث میں ہے لا نکاح الا بولی کہ ولی کے بغیر کوئی نکاح نہیں ہے۔ ولی عصبات میں سے وہ ہوتا ہے جو بہت قریبی ہو۔ لڑکی کا بھائی حقیقی اس کا ولی ہے' اس کی اجازت کے بغیر نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ ماں ولی نہیں ہے مگر اس کا مشورہ لینا اور اس کو راضی کرنا ضروری ہے' کیونکہ لڑکی کو ماں کی اطاعت کا حکم ہے۔ تایا ولی ابعد ہے' جب ولی اقرب موجود ہے تو ابعد کی ولایت صحیح نہیں ہے۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری

الجواب صحیح ابو محمد عبدالستار دہلوی

فتاویٰ ستاریہ' جلد چہارم' ص۔۱۸۷

ولی کی اجازت کے بغیر نکاح جائز ہے یا نہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ اگر ثیبہ عورت یعنی خاوند دیدہ بیوہ وغیرہ اپنے وارثوں اور اولیاء سے علیحدہ جا کر کسی دوسرے علاقہ یا شہر میں کسی شخص سے مرضی ملا کر نکاح کر لے اور یہ کہہ دے کہ میرے وارثوں کو یہ خبر نہ کرنا اور پھر وہ اپنے ناکح کے گھر میں عام اعلانیہ آباد نہ رہے بلکہ خفیہ آ آ کر اس کی نفسانی خواہش پوری کر جائے تو کیا یہ نکاح شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی مولوی اور خطیب اور امام مسجد ہو کر ایسا نکاح کسی عورت سے کر لے اور کہے کہ یہ جائز ہے' کیونکہ بیوہ عورت خود مختار ہے'

ولی کی اس کے نکاح میں شرط نہیں ہے تو کیا نکاح حلال اور اس مولوی خطیب کا یہ مسئلہ حق اور صحیح ہے یا نہیں؟ مدلل جواب عنایت فرمائیں تاکہ اس امام خطیب کو یہ جواب اور دلائل سمجھائے جاسکیں۔

پھر اگر وہ نہ سمجھے تو نماز اس کی اقتداء میں درست ہے یا نہیں؟ اس مولوی کے بال پہلے سفید تھے اور وہ بیت اللہ کا حج کر کے آیا ہے' اس نے آتے ہی خضاب لگا کر بال سیاہ کر لئے اور مذکورہ عورت سے نکاح کر لیا۔ کیا سیاہ خضاب کرنا حلال ہے یا حرام ہے؟ جو مولوی سیاہ خضاب لگاتا ہو' اس کو امام بنانا اور اس کی اقتدا میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ یہ مولوی کہتا ہے کہ سیاہ خضاب میں مہندی ملا کر لگایا جائے تو یہ جائز ہے' حالانکہ مہندی ملانے سے بھی بال سیاہ ہوتے ہیں۔ پس نکاح اور خضاب ہر دو مسئلوں کا فیصلہ بروئے دلائل شرعیہ عنایت فرمایا جائے' مہربانی ہو گی۔ بینوا توجروا۔

(المرسل مولوی عبدالمجید پارچہ فروش حلقہ گگو ضلع ساہیوال)

الجواب : بعون الوهاب وهو الموفق للصواب۔ الحمد لله رب العالمين اما بعد فاقول وبالله التوفيق۔ واضح ہو کہ جس مولوی نے ثیبہ عورت سے بغیر اذن ولی کے نکاح خفیہ کیا ہے' یہ نکاح سراسر حرام ہے۔ وہ عورت منکوحہ اور وہ مولوی ناکح اس حرام نکاح کی وجہ سے دونوں زانی ہیں اور سیاہ خضاب جس کے لگانے سے دیکھنے والے کو بال سیاہ نظر آئیں' حرام ہے۔ اس مولوی نے دو گناہوں کا ارتکاب کیا ہے' لہٰذا اس کو امامت اور خطابت سے فوراً برطرف کر دینا چاہیے۔

چنانچہ تفصیل اس کی یہ ہے کہ بخاری شریف کتاب النکاح میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ انہوں نے فرمایا فلما بعث محمد صلى الله عليه وسلم بالحق هدم نكاح الجاهلية كله الا نكاح الناس اليوم۔ یعنی "زمانہ جاہلیت میں کئی قسم کے نکاح مروج تھے' جب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے تمام نکاح جاہلیت کے مٹا کر صرف ایک نکاح قائم اور باقی رکھا ہے جو آج تمام مسلمانوں میں مروج ہے۔" پھر اس کی تعریف یوں بیان فرمائی : نكاح الناس اليوم يخطب الرجل الى الرجل وليته او ابنته فيصدقها وينكحها۔ یعنی "آج اس عہد رسالت میں جو نکاح لوگوں میں شرعاً مروج ہے وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اس کی بیٹی یا رشتہ دار

عورت بہن وغیرہ کی بابت خِطبہ یعنی پیغام نکاح دے دیتا ہے تو وہ اس کو منظور کرنے کے بعد مہر مقررہ کے عوض میں نکاح کر دیتا ہے۔"

بس یہ ایک قسم کا نکاح ہے جو عہد نبوی سے اب تک اہل اسلام میں مروج چلا آرہا ہے' جس میں نہایت شرم وحیا سے شادیاں ہوتی ہیں اور اس میں طرفین کے سب اقرباء شمولیت کرتے ہیں اور مبارکبادیاں ملتی ہیں اور خاوند بیوی عیش وخوشی سے خانہ آبادی کر لیتے ہیں۔ اس نکاح کے علاوہ سب نکاح سفاح ہیں جو مردود ہیں۔ نکاح متعہ' نکاح بٹہ' نکاح خفیہ' جو عورت خود کہیں جا کر بغیر اذن ولی کے کرا لیتی ہے یا تن بخشی کہ پیر مریدنی سے یا استاد بعض شاگرد عورتوں سے بغیر گواہ اور اذن اولیاء کے کر لیتے ہیں اور نکاح حلالہ جو وقتی طور پر حرام عورت کو کسی پر حلال کرنے کے لیے کرتے ہیں' سب حرام ہیں' جو منعقد نہیں ہوتے اور ان میں زناکاری ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح بیوہ اور مطلقہ عورت کو خود مختار قرار دے کر لوگ اور مسجدوں کے ملا' مولوی بغیر اذن وارثوں کے خود ہی کسی سے نکاح پڑھ پڑھا دیتے ہیں' یہ بھی نکاح شرعی مروجہ کے خلاف بالکل حرام ہے۔

صحیح حدیث میں آیا ہے جو تیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا لا نکاح الا بولی "کہ ولی کے بغیر کوئی نکاح نہ ہو گا۔" اس میں لا نفی جنس کا ہے اور لفظ نکاح نکرہ عام ہے' جو چیز نفی میں آکر عموم کو چاہتا ہے' پس ہر نکاح بغیر ولی کے منعقد نہ ہو گا۔ جب منعقد نہ ہوا تو باطل اور حرام ہوا۔

چنانچہ دوسری حدیث مرفوع میں صاف یہ وارد ہے: ایما امراۃ نکحت بغیر اذن ولیھا فنکاحھا باطل فنکاح باطل فنکاحھا باطل۔ یعنی "جو کسی عورت نے بغیر اذن ولی کے نکاح کیا' اس کا نکاح باطل ہے' اس کا نکاح باطل ہے' اس کا نکاح باطل ہے۔" یہ حدیث بھی عام ہے جو ہر عورت بالغہ' نابالغہ' باکرہ' ثیبہ کو شامل ہے اور تاکید کے طور پر تین بار فرمایا کہ اس کا نکاح باطل ہے۔ تو اب اس کے حرام ہونے میں کیا شبہ ہے۔

موطا امام مالک میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان شان یہ ہے: لا تنکح المراۃ الا باذن ولیھا او ذوی الرائی من اھلھا او السلطان۔ یعنی "کسی عورت کا نکاح بغیر اذن ولی کے نہ کیا جائے' اگر ولی نہ ہو تو اس کے قبیلہ کے کسی ذی رائے شخص کے اذن سے کیا جائے' اگر یہ بھی نہ ہو تو خلیفہ وقت کے اذن سے کیا جائے۔" اس فاروقی حکم سے بھی یہ ظاہر ہے کہ

عورت خود اپنا نکاح نہیں کرا سکتی' ولی کا اذن شرط ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں ولی ابعد کرائے ورنہ بادشاہ اسلام کی طرف ولایت منتقل ہو گی۔ ہر ملا' مولوی عورت سے میل ملاپ کر کے ہرگز نکاح نہیں کر سکتا۔ اگر کرے گا تو وہ حرام ہو گا اور زناکاری تصور کی جائے گی۔

چنانچہ منتقی میں یہ حدیث وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : لا تزوج المراۃ المراۃ ولا تزوج المراۃ نفسھا فان الزانیه ھی التی تزوج نفسھا۔ یعنی "کوئی عورت ولی بن کر کسی عورت کا نکاح نہ کرے۔ (جیسے آج کل ماں اپنی بیٹی کا نکاح کرا دیتی ہے) اور کوئی عورت نہ اپنے نفس کا کسی سے نکاح کرے اور وہ زانیہ ہے جو ولی بن کر اپنے نفس کا نکاح کراتی ہے۔"

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ عورت خود مختار نہیں ہے۔ نکاح سے پہلے اپنے ولیوں کے ماتحت ہے اور نکاح کے بعد اپنے خاوند کے ماتحت ہے' اس لیے اولیاء کو حکم ہے : انکحوا الایامی منکم۔ "کہ تمہارے میں جو بے خاوند عورتیں ہیں' ان کا نکاح کر دو۔" اس سے بھی ولی کی شرطیت ثابت ہو گئی۔

سبل الاسلام میں حدیث مذکورہ پر یہ لکھا ہے کہ نکاح میں عورت کو نہ ولایت کا حق ہے' نہ وکالت کا۔ اسی طرح محلّی ابن حزم میں ہے کہ عورت باکرہ ہو یا ثیبہ اس کے عقد میں ولی کا اذن شرط ہے۔ پس جو اس مولوی نے کسی آوارہ عورت سے بلا اذن ولی کے نکاح کیا ہے' وہ نکاح خفیہ ہے' اس نے اپنا اُلو سیدھا کیا ہے' حالانکہ خفیہ نکاح ممنوع ہے۔ حدیث میں ہے : عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللہ علیه وسلم نھی عن نکاح السر۔ (مجمع الزوائد) یعنی "نبی کریم ﷺ نے خفیہ نکاح سے منع فرمایا ہے بلکہ حکم یہ ہے اعلنو النکاح کہ نکاح کا اعلان کرو۔ اور فرمایا واضربوا علیه الدف کہ نکاح کرنے کے بعد دف بجا دو۔ نکاح کا اعلان عورت کے نکاح کا اس کے خاندان میں ہونا ضروری ہے' دف نہ ہو تو غربال بجا دو کہ اعلان مقصود ہے۔

خفیہ نکاح شرع میں اس نکاح کو کہتے ہیں کہ جس میں ولی اور گواہ نہ ہوں۔ اگر ولی ہو اور گواہ اور اعلان نہ ہو تب بھی خفیہ ہے اور اگر گواہ ہوں اور ولی نہ ہو' تب بھی خفیہ ہے۔ اس لیے حدیث میں آیا ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ لا نکاح الا بولی مرشد شاھدی عدل (او کما قال' مجمع الزوائد) یعنی "ولی مرشد اور دو عادل گواہوں کے بغیر

نکاح نہ ہو گا۔"

بغیر ولی اور وارثوں کے نکاح عورتوں کی خود مختاری سے جائز قرار دینا اہل رای کا مسلک ہے' جو کتاب وسنت کے سراسر خلاف ہے۔ یہی مسلک انگریزوں اور حکومت پاکستان کا ہے اور یہی مسلک مسٹر بھٹو کا ہے جس کو وہ اب جاری کرے گا اور حرام نکاحوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس لیے جماعت اہل حدیث فرقہ ناجیہ کو یہ ہدایت ہے کہ حرام نکاحوں کا رواج بکثرت ہے' متعہ رافضیوں میں' حلالہ حنفیوں میں اور نکاح .ٹہ حنفیوں اور بعض نام نہاد اہل حدیثوں میں اور بیواؤں کا نکاح عام طور پر بغیر اولیاء کے ہو رہا ہے اور حرام نکاحوں سے اولاد حرام کی پیدا ہو رہی ہے' یہ سب جاہلیت کا ظہور ہے۔ اسلام میں ان نکاحوں کا وجود نہیں پایا گیا۔ اسلام میں صرف وہی ایک نکاح ہے جس کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرما دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : افحکم الجاھلیة یبغون ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون○ یعنی "کیا یہ لوگ جاہلیت کا حکم ڈھونڈتے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زیادہ اچھا اور خوب حکم اور کون سا ہو گا" لیکن یہ بات ایمان دار قوم ہی سمجھ سکتی ہے' اہل ہویٰ قوم تو اپنی خواہشات کا دستور ہی قائم کرے گی۔ اہل حق کا مذہب یہی ہے کہ بغیر ولی کے نکاح باطل ہے۔

چنانچہ نیل الاوطار جزو سادس ص۱۱۹ میں ہے : وقد ذھب الی ھٰذا علی وعمرو ابن عباس وابن عمرو ابن مسعود وابوھریرہ وعائشة والحسن البصری وابن المسیب وابن شبرمه ابن ابی لیلیٰ والعترة واحمد واسحاق والشافعی وجمھور اھل العلم فقالوا الا یصلح العقد بدون ولی۔ یعنی "صحابہ کرام حضرت علی اور عمر اور ابن عباس اور ابن عمر اور ابن مسعود اور ابو ہریرہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم اور امام حسن بصری اور رئیس التابعین ابن مسیب اور ابن شبرمہ اور ابن ابی لیلیٰ اور عترت اور امام احمد اور امام اسحاق اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ اور جمہور علماء سلف وخلف اس بات کے قائل ہیں کہ بغیر ولی کے عقد نکاح صحیح نہ ہو گا۔"

پھر لکھا ہے : قال ابن المنذر انه لا یعرف عن احد من الصحابة خلاف ذالک۔ یعنی "ابن منذر نے فرمایا کہ اس مسلک کے خلاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی شخص نہیں پایا گیا۔"

باقی رہا بعض مولویوں کا یہ کہنا کہ بیوہ عورت کے لیے ولی کی شرط نہیں ہے' صرف اس کے اذن سے ہی نکاح کرنا جائز ہے۔ بعض اہل علم اس کو جائز کہتے ہیں' سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ اس حدیث سے دھوکہ کھائے ہوئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : الثیب احق بنفسھا من ولیھا۔ یعنی "ثیبہ عورت ولی سے اپنے نفس کی خود زیادہ حقدار ہے۔" محدثین امام نووی وغیرہ نے یہ جواب دیا ہے کہ اس سے ولی کی عدم شرط اور عورت ثیبہ کا عقد میں کلی اختیار ثابت نہیں ہوتا۔ اس میں لفظ احق صیغہ اسم تفضیل ہے جو مفضل علیہ کو چاہتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ولی اور ثیبہ دونوں کا اذن شرط ہے مگر ولی عورت ثیبہ کے تابع رہے کہ جہاں وہ چاہے نکاح کر دے اور ثیبہ عورت اذن بالقول دے' محض اس کی خاموشی سے ولی کسی جگہ نکاح نہیں کر سکتا' جس طرح باکرہ کا نکاح ولی اپنے اختیار سے کرتا ہے' اس سے اذن طلب کر کے اس کے سکوت کو کافی سمجھتا ہے۔

نیل الاوطار میں علامہ شوکانی فرماتے ہیں : واجیب بان المراد اعتبار الرضا منھا جمعًا بین الاخبار۔ کذا فی البحر۔ اس حدیث کی پوری تفسیر واقعہ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے معلوم کریں کہ اس کی ہمشیرہ ثیبہ تھی' اس کی رضا پہلے خاوند کی طرف تھی' تو بھائی نے حلف کھائی تھی کہ اس نے طلاق دی ہے' میں اس کو ہرگز نکاح نہ دوں گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آیت فلا تعضلوھن بھیج کر یہ تنبیہہ کر دی کہ عورتوں کو روکو مت' جس جگہ چاہیں وہاں ہی نکاح کر دو۔ تب حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے قسم کا کفارہ دے کر اپنی ہمشیرہ کا نکاح دوبارہ طلاق دہندہ سے ہی کر دیا۔

امام بخاری نے اس آیت کو ولی کی شرطیت کے لیے پیش کیا ہے۔ اگر ولی کے بغیر نکاح ہوتا تو ان کی ہمشیرہ خود ہی نکاح کر لیتی اور حضرت معقل رضی اللہ عنہ کو قسم کا کفارہ دینے کی ضرورت نہ ہوتی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ولی کے بغیر نکاح باطل ہے اور جس مولوی نے نکاح کیا ہے' اس کو چاہیے کہ عورت کو اپنے سے جدا کر دے اور اس گناہ سے توبہ کرے ورنہ اس کا ج بھی بیکار اور امامت بھی ناجائز ہے۔ اس کو امامت سے معزول کر کے نیک متقی عالم کو امام اور خطیب مقرر کر دینا چاہیے ورنہ سب جماعت مجرم قرار پائے گی۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری غفرلہ الباری

اہل حدیث لاہور' جلد-۲' شمارہ-۱۰' مورخہ ۵/ مارچ سنہ ۱۹۷۱ء

(بغیر اذن ولی کے نکاح کا حکم؟)

حنفیہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا معارضہ

فقہ حنفیہ کی کتاب قدوری ص-۱۳۵ میں ہے : "عورت آزاد اور بالغہ عاقلہ کا نکاح اس کی رضامندی سے ابوحنیفہ کے نزدیک منعقد ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ولی اس عقد کا اذن نہ دے' عورت خواہ باکرہ ہو یا کنواری ہو یا ثیبہ' بیوہ وغیرہ ہو۔"

چنانچہ یہ مسلک حنفیہ کا مشہور ہے' اسی طرح نکاح کے گواہوں کا عادل صالح ہونا شرط نہیں۔ اگرچہ نکاح کے گواہ زانی' شرابی' داڑھی منڈے' بے نماز' سود خوار' فاسق فاجر ہوں تب بھی نکاح ہو جائے گا۔

جیسے قدوری فقہ کی درسی کتاب کے ص-۱۳۵ میں ہے : عدولا کانوا او غیر عدول "کہ نکاح کے گواہ عادل ہوں یا غیر عادل ان کی موجودگی میں نکاح ہو جائے گا۔" حنفیہ کا یہ مذہب قرآن وحدیث وصحابہ کرام کے مطابق نہیں ہے۔ خصوصاً حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ سنن دار قطنی جو حدیث کی مشہور کتاب ہے' اس میں یہ حدیث ہے : عن عبداللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نکاح الا بولی وشاھدی عدل۔ یعنی "عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عورت کے ولی وارث اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح صحیح نہ ہو گا۔"

دار قطنی ص-۳۸۴ میں یہ حدیث ہے : عن ابی ھریرۃ قال کنا نتحدث ان التی تنکح نفسھا ھی الزانیۃ۔ یعنی "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں یہ مسئلہ بیان کیا کرتے تھے کہ جو عورت اپنی ذات کا خود کسی شخص سے نکاح کراتی ہے' وہ زانیہ ہے۔"

اور حدیث کی پہلی کتاب بلوغ المرام میں یہ حدیث ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ایما امراۃ نکحت بغیر اذن ولیھا فنکاحھا باطل (الحدیث) یعنی "جس کسی عورت نے بغیر اپنے ولی کے کسی سے اپنی رضامندی سے

نکاح کرا لیا تو وہ نکاح باطل ہے۔"

اور سبل السلام جلد-۳' ص-۱۱۵ میں نقل کیا ہے کہ اس بارہ میں حضرت علی اور حضرت ابن عباس وغیرہ تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ بغیر اذن ولی کے نکاح صحیح نہیں ہوتا اور ابن منذر نے کہا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ ولی کے بغیر عورت خود بخود اپنا نکاح کرا سکتی ہے۔

پھر یہ لکھا ہے جمہور علماء اسلام کا یہ مذہب ہے کہ نکاح میں ولی کا ہونا اذن دینا شرط ہے اور اپنا نکاح خود نہیں کرا سکتی اور بلوغ المرام میں یہ حدیث ہے : عن ابی ھریرة قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لا تزوج المراة المرأة ولا تزوج المراة نفسھا۔ (ابن ماجه' دارقطنی' رجاله ثقات) یعنی "ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کی عورت ولی بن کر نکاح نہ کرائے اور نہ اپنے نفس کی خود مختار بن کر کسی سے اپنے نکاح کرائے' اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔"

بخاری شریف اور ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ بیان فرماتی ہیں کہ جاہلیت میں کئی قسم کے نکاحوں کا رواج تھا : فلما بعث محمد بالحق ھدم نکاح الجاھلیة کله الا نکاح الناس الیوم۔ "جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو سب نکاح جاہلیت کے معدوم کر دیئے' صرف ایک نکاح شرعی باقی رکھا جو آج جاری ہے۔" پھر اس کی یہ کیفیت بیان کی ہے' یعنی آج جو شرعی نکاح مروج ہے' اس کی کیفیت یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو خِطبہ کرے یعنی اس کی بیٹی یا کسی رشتہ دار عورت کی بابت پیغام نکاح دے' وہ منظور کر کے پھر مہر مقرر پر اس لڑکی کا اس شخص خاطب سے نکاح کر دے' پس یہ نکاح مشروع ہے جو عہد نبوی سے لے کر اب تک چلا آرہا ہے۔

اب ترقی یافتہ دَور ہے' انگریزوں میں عورت کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جس شخص کو پسند کرے' اس سے نکاح کرے۔ اب حکومت پاکستان میں بھی وہی انگریزی دستور گھوم رہا ہے اور ملک میں احناف کی اکثریت ہے۔ پھر ستم یہ بھی ہے کہ ہمارے معاشرہ میں غلط رسومات بڑھتی جا رہی ہیں۔ لوگ پہلے لڑکیوں سے آشنائی پیدا کر لیتے ہیں پھر ان کو اغوا کر کے عدالتوں میں پیش کرتے ہیں اور اپنی آزادی اور نکاح کے بیانات کرا کر پھر کسی حنفی مولوی سے نکاح پڑھا لیتے ہیں۔

یہ نکاح بروئے قرآن وحدیث حرام ہیں۔ مشکوٰۃ میں حدیث ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں : فان الزانیه هی التی تزوج نفسها۔ یعنی "وہ عورت زانیہ ہے جو اپنی ذات کا خود کسی سے نکاح کرتی ہے۔" اور دار قطنی وغیرہ میں حدیث ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں : ولا تنکح المرأة نفسها ان التی تنکح نفسها هی البغی۔ یعنی "عورت خود مختار بن کر کسی سے اپنا نکاح نہ کرے جو عورت اپنا نکاح کراتی ہے وہ زانیہ ہے۔" شیعہ رافضی مذہب میں متعہ وغیرہ کا رواج ہے جو کسی طرح جائز نہیں ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بروئے حدیث یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ بغیر ولی اور صالح عادل گواہوں کے نکاح نہیں ہوتا' ایسا نکاح باطل ہے۔ پس حنفیہ خواہ مخواہ حضرت ابن مسعود صحابی رسول رضی اللہ عنہ کو بدنام کرتے ہیں کہ ان کے مذہب پر ہمارا دارومدار ہے حالانکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مذہب اور حنفیہ میں بعد المشرقین ہے۔

از عبدالقادر عارف حصاری

ہفت روزہ الاسلام لاہور' جلد۔۲' شمارہ۔۷ ۴' مورخہ ۳۰/ جنوری سنہ۔۷۷ء

ایک غلط فتوے کی اصلاح

اہلحدیث اخبار کے ص۔۴ میں ایک سوال ہے کہ منجملہ ان کے ایک لڑکی کی شادی ہے' اب فرمایئے اجازت نکاح اس کا ہندو باپ دے یا مسلمان ماں یا خود لڑکی؟ اس کا جواب اہلحدیث میں دیجیے' انتھٰی۔

سوال بالکل صاف ہے کہ لڑکی کا ولی از روئے شریعت محمدیہ کون تجویز ہونا چاہیے' باپ ہندو یا والدہ مسلمہ یا خود لڑکی؟ اس سوال سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ لڑکی بالغہ ہے' ورنہ اگر نابالغہ ہوتی تو سائل لڑکی کے لیے اختیار نکاح کا سوال نہ کرتا۔ بہرحال اس سوال کا جواب جو مدیر اہلحدیث نے عنایت فرمایا ہے' وہ آپ ہی کے لفظوں میں درج ہے۔

جواب : ہندو بوجہ عدم نکاح شرعی باپ نہیں' لہٰذا وہ حکم عدم میں ہے' حسب تصریح فقہا ماں ولی ہے' لہٰذا وہی اجازت دے۔

پس یہ جواب آپ کا حدیث شریف کی رُو سے اور حسب تصریح محدثین درست نہیں ہے' کیونکہ عورت کو ولایت نکاح کی حاصل نہیں ہے بلکہ فقہاء کے نزدیک عورت بالغہ خود

بھی اپنا آپ نکاح کرا سکتی ہے لیکن محدثین کے نزدیک نہیں کرا سکتی۔ چنانچہ ابن المنذر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ بغیر ولی کے نکاح نہیں ہو سکتا۔ حنفیہ کا وراثت اور بیع پر قیاس کر کے عورت بالغہ کو اختیار نکاح دینا یا ولی بنانا فاسد الاعتبار ہے۔ آپ نے اگر فقہا ہی کی تقلید کرنی تھی تو یہ فرما دیتے کہ لڑکی جس جگہ چاہے خود اجازت دے کر اپنا نکاح کر سکتی ہے' کیونکہ حسب تصریح فقہاء یہ مسئلہ اسی طرح ہے۔

چنانچہ فقہاء باریکیوں کے خزانہ میں لکھتے ہیں: نفذت نکاح حرة مکلفه بلا ولی ولا تجبر بکر بالغة علی النکاح انتھی۔ میرے خیال میں آپ نے یہ اس لیے نہ لکھا ہو گا کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے لا نکاح الا بولی ممکن ہے کہ ولایت کو تو آپ نے مناسب جانتے ہوئے مدنظر رکھ لیا ہو لیکن فقہاء کی دوسرے مسئلہ میں تقلید کر لی ہو کہ ولایت نکاح کا اختیار ماں کو ہے حالانکہ یہ بھی خلاف حدیث کے ہے۔ ولایت نکاح کا عہدہ عورت کو نہیں دیا گیا ہے جو بالکل ناقص العقل ہونے کی وجہ سے اس کا اہل نہیں ہے۔

چنانچہ اس کے متعلق حدیث مندرجہ ذیل دلیل ہے کہ عورت ولایت نکاح کی قابلیت نہیں رکھتی۔ عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تزوج المراة المراة ولا تزوج المراة نفسها فان الزانیة هی التی تزوج نفسها۔ (دارقطنی) ترجمہ "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہ نکاح کرا دے عورت کسی عورت کا اور نہ نکاح کرا دے عورت اپنے نفس کا پس تحقیق زانیہ وہی ہے جو اپنے نفس کا آپ نکاح کرا دے۔"

یہی روایت ابن ماجہ میں ہے۔ اس حدیث کے راوی سب ثقہ ہیں' کوئی اس میں معمولی جرح ظاہر کرے تو وہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ اس حدیث کی شرح میں سبل السلام کے مصنف فرماتے ہیں: فیه دلیل علی ان المراة لیس بها ولایة فی الانکاح نفسها ولا لغیرها فلا عبارة لها فی النکاح ایجابا ولا قبولا فلا تزوج نفسها باذن الولی ولا غیره ولا تزوج غیرها بولایة ولا بوکالة ولا تقبل النکاح بولایة ولا وکالة وهو قول الجمهور انتھی۔ (جلد ۲' ص-۱۵) "نکاح حاصل نہیں ہے' نہ اپنا نکاح آپ کرائے نہ کسی غیر کا' نہیں اعتبار ہے بیچ نکاح کے ایجاب اور قبول میں واسطے عورت کے اگرچہ ولی یا کوئی کہہ دے پھر بھی اپنے آپ کا یا کسی دوسری عورت کا ولی یا وکیل ہو کر نکاح نہ کراوے

کیونکہ عورت کی ولایت اور وکالت نکاح میں قبول نہیں ہے۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔"

مولانا شمس الحق مرحوم عظیم آبادی اپنے فتویٰ مندرجہ فتاویٰ نذیریہ میں کتاب کشف القناع شرح الاقناع للشیخ منصور بن ادریس الحنبلی سے نقل کرتے ہیں: ویشترط فی الولی سبعة شروط احدها حریة والثانی ذکوریة والثالث اتفاق دین والرابع بلوغ والخامس عقل والسادس عدالة (الی آخره) یعنی "ولی میں سات شرطیں ہیں' آزاد ہونا' مذکر ہونا' دین میں اتفاق ہونا' بالغ ہونا' عاقل ہونا' آخر تک۔"

حاصل کلام یہ ہے کہ ولایت میں مرد ہونے کی شرط ہے' عورت ولی نہیں ہو سکتی' نہ اپنے نفس کا اور نہ کسی غیر کا۔ چنانچہ حدیث مذکور اس پر دلیل ہے اور فقہاء کے دونوں مسئلے کہ عورت ولی بھی ہو سکتی ہے اور خود بھی اپنا آپ نکاح کر سکتی ہے' اس حدیث سے مسترد کیے گئے ہیں۔ اب اگر آپ کے پاس فقہا کی جانب سے عورت کے ولی ہونے پر کوئی دلیل شرعی موجود ہو تو پیش کریں تاکہ اس پر غور کیا جائے۔

مولانا صاحب! آپ کو چاہیے تھا کہ اول سائل سے یہ دریافت فرماتے کہ اس لڑکی کا کوئی بھائی مسلمان ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس لڑکی کیمل کے پاس اور اولاد بھی بتائی گئی ہے۔ ممکن ہے کوئی بھائی بالغ ہو' اگر بھائی ہے تو وہ ولی ہو گا کیونکہ فقہاء کے نزدیک بھی ماں کو ولایت اس وقت ملتی ہے جبکہ کوئی عصبہ موجود نہ ہو۔ الولی فی النکاح العصبة بنفسه فان لم یکن عصبة فالولایة للام انتھی۔ (درمختار) اگر بھائی وغیرہ کوئی موجود نہ ہو تو اس عورت کا ولی بادشاہ ہو گا کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا: فالسلطان ولی من لا ولی له۔ "جس کا کوئی ولی نہ ہو تو اس کا ولی بادشاہ ہے۔" چونکہ اب مسلمان بادشاہ نہیں ہے تو اس لڑکی بالغہ اور اس کی والدہ کو چاہیے کہ کسی شخص صالح کو اپنا ولی تجویز کر لیں۔ بہتر ہے کہ اس جگہ کا کوئی عالم یا گاؤں کا نمبردار مسلمان دیندار تجویز کیا جائے۔ اس کے زیر سایہ اپنا نکاح پڑھا لیں' پھر جائز ہو گا۔

چنانچہ دار قطنی ابواب النکاح ص۔۴۲۵ میں ہے' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اذا کان ولی المراة مضارا فولت رجلا فانکحها فنکاحه جائز۔ یعنی "اگر عورت کا ولی مضار ہو تو کسی دیگر شخص کو ولی بنا کر نکاح پڑھا لے' پس نکاح جائز ہے۔"

آپ کو فتاویٰ میں احادیث اور اقوال صحابہ سے کام لینا چاہیے تھا' امید ہے کہ اس پر غور فرمائیں گے۔

راقم الحروف ابو الحسنات محمد عبدالقادر گنگوہی عفی عنہ حال مقیم فاضلکا

اخبار محمدی دہلی شمارہ۔۵' جلد۔۷' بابت ۱۵/ نومبر سنہ۔۱۹۲۹ء

باب تنقید الفتاویٰ

"الاعتصام" کے ایک فتویٰ پر تبصرہ

اخبار "الاعتصام" لاہور مطبوعہ یکم نومبر سنہ۔۱۹۶۸ کے باب الفتاویٰ میں ایک سوال مع جواب شائع ہوا' جس میں مفتی الاعتصام نے جو فتاویٰ دیا ہے' وہ غلط ہے۔ بندہ اس غلط فتویٰ کی اصلاح ضروری سمجھتا ہے۔ اس لیے سوال وجواب بعینہ درج ہیں۔ ناظرین اہل فتویٰ اور تنقیدی اصلاح پر منصفانہ غور فرما کر انصاف کریں کہ یہ فتویٰ صحیح ہے یا غلط ہے؟ (عارف)

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین در ایں مسئلہ کہ ایک عورت یتیمہ بالغہ مسمات خاتونکے ایام ایک لڑکے کے ساتھ مقرر ہوئے اور وہ لڑکا بہ نسبت لڑکی کے چھوٹا ہے اور اس لڑکی نے اس لڑکے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا' اس وجہ سے وہ اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں ایک لڑکے کے ساتھ نکل کر چلی گئی اور اس نے بلا اجازت اپنے بھائی ولی کے نکاح کر لیا اور عدالت مجسٹریٹ میں دو گواہ پیش کر کے نکاح کو پختہ کیا اور انگوٹھے وغیرہ بھی لگا دئے۔ اس کے بھائی کو پتہ چلا کہ وہ کہیں چلی گئی ہے اور اس نے نکاح کر لیا ہے۔ چنانچہ اس کے بھائی نے بذریعہ پنچائت اور گاؤں کے رئیس آدمیوں کے لڑکی کو واپس کرا لیا' چونکہ اس لڑکی کا بھائی اس لڑکے کے ساتھ کرنا چاہتا تھا جس سے کہ پہلے ایام نکاح مقرر ہوئے تھے' اس لیے انہوں نے گاؤں کے امام صاحب کو بلایا اور لڑکی سے بوقت نکاح دریافت کیا کہ تو پہلے نکاح پر راضی ہے یا نہیں؟ لڑکی نے کہا میں وہیں نکاح کرنا چاہتی ہوں جہاں میرا بھائی راضی ہو اور جہاں نکاح کرے۔ چنانچہ امام صاحب نے باجازت ولی اور رضامندی لڑکی کے اس لڑکے کے ساتھ نکاح کر دیا اور اب اس امام کے بعض مقتدی متنفر ہو گئے ہیں اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا نہیں چاہتے' چونکہ وہ کہتے ہیں کہ نکاح علی النکاح کیا ہے۔ اب کیا یہ ثانی نکاح درست

ہے یا نہیں؟ بمطابق قرآن حدیث وضاحت مطلوب ہے تاکہ اس غلط فہمی کا ازالہ ہو اور تنفر ختم ہو' بینوا توجروا۔

الجواب : پہلا نکاح درست ہے' چونکہ لڑکی یتیمہ بالغہ ہے اور بھائی اس پر جبر نہیں کر سکتا۔ جب لڑکی اور بھائی میں اختلاف ہو تو اس صورت میں حکومت بطور سرپرست نکاح کر سکتی ہے اور حدیث میں ہے : فان تشاجروا فالسلطان ولی من لا ولی لہ "جب اختلاف ہو تو ولی حاکم ہوتا ہے۔" اور دوسرا نکاح درست نہیں ہے۔ کیونکہ عورت شادی شدہ سے نکاح کرنا بحکم والمحصنات من النساء ممنوع ہے۔ مگر پہلا نکاح بدون ولی بھائی کے ہوا ہے' اس لیے شبہ پڑتا ہے کہ بحکم حدیث لا نکاح الا بولی نکاح نہ ہوا ہو' اس لیے امام پر الزام عائد کرنا مشکل ہے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ سابقہ نکاح ہو چکا ہے' اس لیے امام کو اعلان کرنا چاہیے کہ میں نے جو نکاح پڑھایا ہے' وہ درست نہیں' پہلا نکاح درست ہے اور لڑکیکو لڑکے سے الگ رکھنا چاہیے اور اگر امام اعلان کر دے تو اس پر ناراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس نے غلطی سے رجوع کر لیا ہے۔ (الاعتصام ۹/ شعبان سنہ۔۱۳۸۸ھ یکم نومبر سنہ۔۱۹۶۸ء ص۔۹)

یہ جواب سراسر غلط بلکہ باطل ہے' یہاں پہلے صحیح جواب لکھ کر پھر اس کی تنقید اور وجہ بطلان لکھی جائے گی۔

الجواب بالصواب : صورت مذکورہ در سوال کی رو سے صحیح جواب یہ ہے کہ دونوں نکاح باطل اور حرام ہیں۔ کوئی نکاح بھی درست اور صحیح نہیں ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ لڑکی بالغہ کا بھائی اس کا اصلی ولی ہے' اس کو چاہیے تھا کہ ولی مرشد بن کر اس لڑکی کا کسی ایسے لڑکے سے نکاح کرتا جو دین اور خلق کے لحاظ سے صالح اور لڑکی کی منشاء کے مطابق ہوتا۔

جس جگہ اس نے نکاح کرنا چاہا' تو وہاں لڑکی نے ناراضگی کا اظہار کیا' اب اس کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ اس لڑکے میں فلاں فلاں خوبیاں اور صفات حمیدہ ہیں' دین اور دنیا میں تجھے فائدہ ہو گا تو وہ راضی ہو جاتی' جیسے وہ دوبارہ راضی ہو گئی تھی' اسی طرح اس وقت بھی راضی ہو جاتی۔ تو اس کا بھائی اس لڑکے سے (جس کے ایام مقرر ہوئے تھے) نکاح کر دیتا لیکن لڑکی کی ناراضگی اس کی بدکاری سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اس کی آشنائی اس دوسرے لڑکے کے

ساتھ تھی' جس کے ساتھ اغوا ہو کر چلی گئی' کیونکہ شادی کے مقرر دنوں میں جلدی اغوا کرنا تب ہی ہوا کرتا ہے جب کہ اس سے پہلے سے آشنائی ہو۔

مسماۃ خاتون کا غیر لڑکے کے ساتھ اغوا ہو کر پہلے جانا زناکاری ہے۔ آنکھ کا زنا' کان کا زنا' زبان کا زنا' ہاتھ کا زنا تو بدیہی ہے اور اصلی زنا جس کے ذرائع پہلے زنا ہیں' غالب ظن ہے کہ پایا گیا ہو۔ پھر اس نے اپنا کوئی رشتہ دار خواہ ولی ابعد ہوتا' مقرر نہ کیا اور نکاح خود بغیر ولی کے کر لیا' یہ نکاح باطل ہے جس کی کئی وجہ ہیں۔

اول یہ کہ وہ اغوا ہو کر چلی گئی' یہ زنا کا باعث ہے۔ زانی زانیہ کا نکاح حرام ہے۔ اگر زنا ثابت ہو گیا تو حرمت صاف ظاہر ہے کہ قرآن میں ہے: وحرم ذالک علی المؤمنین۔ "مومنوں پر زانیہ کی مناکحت حرام کی گئی ہے۔" اگر زنا ثابت نہ ہو تو اس طرح آشنائی اور اغوا ہو کر غیر محرم لڑکے کے ساتھ جانے میں زنا کا ظن غالب ہے' تب بھی نکاح نہ کرنا چاہیے کہ حلال ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان کے درمیان شبہات ہے' ان سے بچنا بھی واجب ہے۔

دوم یہ کہ اس لڑکی خاتون سے پہلے ایک لڑکے کا خِطبہ ہو رہا ہے' دن مقرر ہو چکے ہیں۔ جب تک ان کے ساتھ فیصلہ نہ ہو جائے' تو دوسرے کو خِطبہ کرنا حرام ہے۔ چہ جائے کہ اس مخطوبہ کو اغوا کر کے لے جائے اور اس سے نکاح کر لے۔ خِطبہ پر خِطبہ کرنا اور نکاح کرنا حرام ہے۔ اس میں دوسرے بھائی کی حق تلفی اور بد خواہی پائی جاتی ہے۔ جب تک مخطوبہ کا ولی خاطب سے فیصلہ نہ کر لے اور وجہ نکاح نہ دینے کی بیان کر کے اس کو جواب نہ دے دے' اس وقت تک دوسرے کو نکاح کرنا حرام ہے۔

لقوله علیه السلام لا یخطب احدکم علٰی خِطبة اخیه حتی یترک الخاطب قبله او یاذن له۔ (متفق علیه) "نہ پیغام دے نکاح کا کوئی تم میں سے کسی پیغام پر جب تک پہلے پیغام والا نہ چھوڑ دے یا اذن نہ دے۔"

تیسری وجہ بطلان نکاح کی یہ ہے کہ یہ نکاح اغوا شدہ لڑکی سے بغیر اذن ولی کے ہوا ہے۔ حدیث میں ہے: لا نکاح الا بولی۔ یعنی "ولی کی اجازت کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہے۔"

دوسری حدیث بطلان نکاح کی یہ ہے: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ایما امراۃ نکحت بغیر اذن ولیھا فنکاحھا باطل فان دخل بھا فلھا المھر بما استحل من فرجھا فان اشتجروا فالسلطان ولی من لا ولی له۔ (بلوغ المرام) "فرمایا رسول اللہ ﷺ

نے جس عورت نے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا' اس کا نکاح باطل ہے۔ پس اگر ناکح اس عورت سے صحبت کر بیٹھا تو اس پر استحلال فرج کی وجہ سے مہر دینا لازم ہوا۔ پس اگر اختلاف کریں تو خلیفہ اسلام اس عورت کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔"

اس حدیث سے تین مسائل ثابت ہوئے۔ اول یہ کہ بغیر اذن ولی وارث کے نکاح کرنا کرانا حرام ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر کوئی ایسا نکاح باطل ہو جائے اور ناکح اس نکاح کو درست خیال کر کے اپنی منکوحہ سے صحبت کر بیٹھے تو اس کو مہر دینا واجب ہے۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر نکاح میں دو ولیوں کا جھگڑا ہو جائے تو وہ معزول ہو جائیں گے اور ولایت دوسرے ولیوں کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ جب کوئی ولی باقی نہ رہا تو اس کا ولی خلیفہ اسلام ہے۔

اس حدیث پر سبل السلام میں لکھا ہے : والضمیر فی قوله ان اشتجروا عائد الی الاولیاء الدال علیهم ذکرا لولی والسیاق والمراد بالاشتجار منع الاولیاء من العقد علیها وهذا هو العضل وبه تنتقل الولایة الی السلطان ان عضل الاقرب' وقیل بل تنتقل الی الا بعد وانتقالها الی السلطان مبنی علی منع الاقرب الا بعد وهو محتمل۔

حدیث کے الفاظ "ان اشتجروا" میں ضمیر اولیاء کی طرف راجع ہے اور قرینہ اس پر یہ دلالت کرتا ہے کہ اس سے پہلے ولی کا ذکر ہے اور سیاق عبارت بھی یہی چاہتا ہے کہ ولیوں کے باہم جھگڑا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص لڑکی کا نکاح کسی مرد سے کرنے لگے تو دوسرا ولی اس کو روکے اور وہ دوسری جگہ کرنا چاہیے اور ان میں باہم نزاع پیدا ہو جائے تو اس سے دونوں ولی ولایت سے معزول ہو جائیں گے۔ اس طرح جب کوئی ولی نہ رہا جو لڑکی کا عقد اس کی خیر خواہی کے لیے کر دے تو ولایت خلیفہ اسلام کی طرف منتقل ہو جائے گی تاکہ وہ ولی مرشد بن کر اپنے اذن سے جہاں لڑکی رضامند ہو' نکاح کر دے۔

بعض علماء تو یہ کہتے ہیں کہ ولی اقرب کے معزول ہونے سے ولایت بادشاہ اسلام کی طرف منتقل ہو جائے گی اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ ولی جو دور کا رشتہ دار ہے اس کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ اگر ان کا بھی آپس میں نزاع ہو اور کوئی ولی باقی نہ رہے تو پھر ولایت بادشاہ کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ بادشاہ کی طرف ولایت منتقل ہونا اس بات پر مبنی ہے کہ ولی دُور کا قریبی بھی باقی نہ رہے اور سب عقد سے روکیں' یہ احتمالی بات ہے۔

نیز اس سے آگے یہ لکھا ہے : ودل علی ان السلطان ولی من لا ولی لها لعدمه او

لمنعه ومثلهما غيبة الولي يويد حديث الباب ما اخرجه الطبراني من حديث ابن عباس مرفوعًا لا نكاح الا بولي والسلطان ولي من لا ولي لها۔ یعنی "اور دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ بادشاہ ولی اس عورت کا ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔" یعنی بالکل ہی نہ ہو' یا عقد سے روکنے والے ہوں جس سے وہ معزول ہو جائیں۔ اسی کی مثل وہ ولی جو غائب ہو کر مفقود الخبر ہو جائیں۔

اور حدیث مذکورہ کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو طبرانی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بغیر ولی کے کوئی نکاح صحیح نہیں ہے اور جس کا کوئی ولی نہ ہو' اس کا بادشاہ اسلام ولی ہے۔ اس حدیث سے اور اس کی شرح سے یہ ظاہر ہوا کہ بادشاہ اسلام کی طرف ولایت اس وقت منتقل ہوئی کہ جب ولی اقرب اور ابعد کوئی باقی نہ رہے۔

باقی نہ رہنے کے دو مطلب ہیں : ایک یہ کہ سب فوت ہو گئے ہوں یا باہم ایک دوسرے سے جھگڑا کرنے کی وجہ سے معزول ہو گئے ہوں تو اس وقت ایسی عورت کا ولی بادشاہ اسلام ہو گا۔ بادشاہ اسلام سے وہ خلیفہ اسلام مراد ہے جس کی لوگوں نے بیعت کی ہو اور وہ قوانین اسلام کو نافذ کرتا ہو۔ علاوہ اس کے جو دنیا کے بادشاہ ہیں وہ ملکی بادشاہ ہیں جن کی ملکی انتظامات میں اطاعت کی جاتی ہے۔

نکاح مذکور میں چونکہ ایک ہی ولی ہے' لڑکی کی ناراضگی ہوئی اور اس نے کسی دوسرے ولی کی طرف رجوع نہ کیا اور وہ ناجائز طریقے سے اغوا ہو کر غیر شخص کے ہمراہ چلی گئی اور اس نے بغیر اجازت ولی کے نکاح کر لیا تو یہ نکاح باطل ہوا اور موجودہ زمانے میں جو عورتیں اغوا ہو کر حکام کی عدالتوں میں بیان دے کر اپنا اُلو سیدھا کر لیتی ہیں اور وہ اپنی رائے سے بغیر دوسرے فریق کو حاضر کرنے کے فیصلہ کر دیتے ہیں' وہ فیصلہ شرعاً مردود ہے۔ کیونکہ ایک تو شرعی طریقہ سے فیصلہ نہیں کیا جاتا' دوسرا وہ خلیفہ اسلام نہیں ہیں جن کی رعایا نے بیعت کر کے ان کو اپنا شرعی خلیفہ تسلیم کیا ہو۔

پس یہ نکاح عدالت میں جانے سے پہلے ہو چکا ہے اور درخواست بعد میں دے کر تصدیق کروایا ہے تو یہ نکاح بغیر ولی کے تصور ہو گا۔

موجودہ حکام اور دیگر حکومتوں کا یہ مسلک ہے کہ عورت بالغہ خود مختار ہے' وہ جس جگہ چاہے نکاح کر لے' وہ اپنے اس مسلک کی رُو سے بالغہ عورتوں کے خود کردہ نکاح کو جائز قرار

دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ نکاح شرعاً باطل ہے' کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : لا تزوج المراۃ المراۃ ولا تزوج المراۃ نفسھا رواہ ابن ماجہ والدارقطنی ورجالہ ثقات (بلوغ المرام) "نہ عورت کسی عورت کا نکاح کرے اور نہ عورت اپنے نفس کا کسی شخص سے نکاح کرے۔"

حدیث ابن ماجہ میں مزید یہ الفاظ ہیں : فان الزانیۃ ھی التی تزوج نفسھا۔ "جو عورت اپنے نفس کا آپ نکاح کرے' وہ زانیہ ہے۔"

سابقہ احادیث اور اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ جس عورت نے اغوا ہو کر کسی لڑکے سے یارانہ کی بناء پر نکاح کر لیا' یہ نکاح باطل ہے۔ اس نکاح باطل کی کسی عدالت غیر شرعی میں تصدیق کرانے سے شرعاً یہ نکاح صحیح نہیں ہو تک۔ ولی ہونے میں یہی حکمت ہوتی ہے کہ باہم فساد نہ ہو۔ چنانچہ ولی نے لڑکی واپس کرالی' کیونکہ اس نے اس اغوا کرنے والے لڑکے کو بدکار سمجھ کر دینی مناسب نہ سمجھی اور دوسری جگہ نکاح کر دیا اور پہلے خاطب کے خِطبہ پر خِطبہ کرنے کی بھی یہی حکمت ہے کہ باہم فساد نہ ہو۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ خاطب اول نے لڑکی کے ولی پر زور دیا کہ حسب وعدہ لڑکی کو لا کر ہمیں نکاح دو اور ممکن ہے کہ خاطب اول نے حسب رواج عامہ اس منگنی پر کچھ مال بھی خرچ کیا ہو' جس کو اس نے واپس طلب کیا ہو تو لڑکی کے بھائی کو شرم محسوس ہوئی تو اس نے بذریعہ پنچائت لڑکی واپس کرالی تو پھر اس سے نکاح کر دیا۔

لیکن یہ نکاح بھی حرام ہے' کیونکہ لڑکی اغوا کرنے سے زانیہ ہو گئی اور اس نے اپنا آپ نکاح کرایا' جس سے وہ پھر بھی زانیہ رہی' کیونکہ وہ نکاح باطل تھا۔ زانی اور زانیہ کا نکاح از روئے قرآن حرام ہے اور زانیہ اور شریف کا نکاح بھی باہم حرام ہے۔ اس نکاح میں بھی تفریق کرانی ضروری ہے۔

اگر وہ زانیہ نہ ہوتی تو یہ دوسرا نکاح جائز ہو جاتا کیونکہ اس میں تمام ارکان نکاح موجود ہیں۔ ولی بھی موجود ہے اور لڑکی نے بھی رضامندی ظاہر کر دی اور گواہ بھی موجود ہیں اور خاطب اول نے بھی بہ رضا و رغبت نکاح قبول کر لیا تو یہ نکاح منعقد ہو گیا۔ لیکن چونکہ لڑکی زانیہ ظاہر ہو گئی' اس لیے بحکم وحرم ذالک علی المؤمنین۔ یعنی "زانیہ کا نکاح مومنوں پر حرام ہے۔" یہ دوسرا نکاح بھی حرام ہو گیا۔

جب دونوں نکاح حرام ہوئے تو لڑکی کو سب سے جدا ہو کر اپنے بھائی ولی کے پاس وقوف کرنا چاہیے۔ جب وہ توبہ نصوح کر جائے اور سابقہ صحبتوں کی وجہ سے استبراء رحم ہو جائے تو پھر لڑکی کی رضامندی سے اس کا بھائی ولی بن کر کسی صالح شخص سے نکاح کر دے تو پھر نکاح درست ہو گا۔

امام صاحب کی جہالت اس پر جرم لگانے سے مانع ہے۔ ہاں اس قدر اس کو تنبیہہ ضرور ہونی چاہیے کہ وہ امامت سے معزول کر دیا جائے اور کسی ایسے شخص عالم بامراللہ کو جو متقی ہو' امام بنایا جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک امام کو قبلہ کی طرف نماز میں سامنے کی دیوار پر تھوکنے سے مجرم قرار دے کر امامت سے معزول کر دیا تھا۔ حالانکہ اس نے جہالت سے ایسا کیا تھا تو اس شخص کو بھی امامت سے معزول کرنا چاہیے۔ ہاں اگر اس سے بہتر امام نہ ملے تو اس وقت تک اس کے پیچھے نماز پڑھتے رہنا چاہیے کیونکہ جماعت کا قائم کرنا ضروری ہے۔

کتبہ عبدالقادر عارف حصاری سلمہ الباری

تنظیم اہل حدیث لاہور

جلد۔۲۱' شمارہ۔۴۲'۴۳'۴۴'۴۴' مورخہ ۷' ۱۴' ۲۱/ فروری سنہ۔۱۹۶۹ء

نکاح سے متعلق دو مسئلے

سوال نمبر۔۱ : زید کی دو بیویاں ہیں۔ ایک ہندہ' دوسری بشریٰ۔ ہندہ سے ایک لڑکی ہے جو زید نے اپنے بھتیجے بکر کو بیاہ دی ہے۔ زید فوت ہو چکا ہے۔ اب اس کا بھتیجا بکر جو پہلے زید کا داماد بھی ہے' اپنی سوتیلی ساس (بشریٰ) سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کیا زید کی بیٹی ہوتے ہوئے بشریٰ کے ساتھ نکاح درست ہو گا یا نہیں؟ بینوا بالصواب۔

(عبدالجبار محمدی' لنگر مخدوم براہ۔ ربوہ)

جواب : درست ہے' کیونکہ یہ صورت محرمات میں داخل نہیں۔ وقال اللہ تعالیٰ واحل لکم ما ورآء ذٰلکم (النسآء) ایسی صورتیں اور فتاویٰ زمانہ سلف سے بھی مروی ہیں۔ صحیح بخاری (باب ما یحل من النساء وما یحرم) میں ہے : وجمع عبداللّٰہ بن جعفر بین ابنة علی وامراة علی وقال ابن سیرین لاباس بہ کے تحت لکھتے ہیں وصلہ

البغوی فی الجعدیات من طریق عبدالرحمٰن بن مهران انه قال جمع عبداللّٰہ بن جعفر بین زینب بنت علی وامراة علی لیلٰی بنت مسعود واخرجه سعید بن منصور عن وجه اٰخر فقال لیلٰی بنت مسعود وام کلثوم بنت علی لفاطمة فکانتا امراتیه وقوله ای من فاطمة بنت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم۔ اور اثر ثانی پر لکھتے ہیں : وصله سعید بن منصور بسند صحیح واخرجه ابن ابی شیبة مطولاً من طریق عکرمة بن خالد ان عبداللّٰہ بن صفوان یزوج امراة رجل من ثقیف وابنته من غیرها قال ایوب فسئل عن ذٰلک ابن سیرین فلم یر به بأسًا۔ انتهی ملخصًا من فتح الباری (جلد۔۵' ص۔۵۳' طبع دهلی)

علامہ عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ کی عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری (جلد۔۲' ص۔۱۰۱) میں ہے : واباحه ابن سیرین وسلیمان بن یسار والثوری والاوزاعی والشافعی واحمد واسحاق والکوفیون وابو عبید وابو ثور وقال مالک لا اعلم حرامًا (قال ابن المنذر) وبه نقول۔ انتهٰی۔

فقہ حنفی کے مشہور ومتداول متن المختصر القدوری میں ہے : ولا بأس بان یجمع بین امراة وابنة زوج کان لها۔ انتهٰی۔ حاشیے پر ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اثر منقول ہے۔ ان ابن عباس جمع بین امراة رجل وابنته من غیرها۔ انتهٰی۔ هٰذا ما عندی واللّٰہ اعلم

عطاء اللہ حنیف بھوجیانی

سوال نمبر۔۲ : اگر کوئی باپ اپنے سگے بیٹے کی بیوی کے جسم کو نفسانی خواہش کے ساتھ چھوئے اور بیٹا خود بھی اس فعل کو دیکھ لے' اس کے بعد بیٹا اپنی بیوی کو بدستور اپنے گھر میں رکھ سکتا ہے یا نہیں اور باپ کے اوپر اس کا اثر پڑے گا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیا جائے۔

یہاں ملتان کے ایک حنفی مفتی صاحب نے فتویٰ دیا ہے کہ یہ عورت اپنے خاوند پر حرام ہوگئی ہے۔ بیٹے کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ دے تاکہ وہ کسی اور جگہ نکاح کرلے' کیا یہ فتویٰ درست ہے؟

(سائل عبدالخالق ولد کرم الدین عارف والہ)

جواب : والد کا اپنے لڑکے کی بیوی کو اپنے ہاتھ سے شہوت کے ساتھ مس کرنا اور

چھوٹا گناہ کا کام ہے' تاہم اس سے اس کے لڑکے پر بیوی حرام نہیں ہوئی' کیونکہ شرعاً یہ حرمت ثابت نہیں' نہ اس پر کوئی نص موجود ہے۔

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ (مجدد قرن خامس) المحلیٰ (جلد۔۹' ص۔۵۲۷) میں لکھتے ہیں : اما من حرمها بالمس للشهوة دون ما ذلک او بالنظر الى الفرج خاصة دون ما ذلک فاقوال لا دليل على صحة شئى منها انما هى آراء مجردة لا يويدها قرآن ولا سنة ولا رواية ساقطة ولا قياس انتهى۔ یعنی "کسی شخص کا شہوانی مس یا اس سے کم سے یا فرج کی طرف شہوت کی نظر سے دیکھنا یا اس عورت کے حسن پر شہوت سے نظر کرنا باعث حرمت مصاہرت نہیں۔ یہ ایسے اقوال ہیں جن پر کوئی دلیل قرآن' سنت کسی ضعیف روایت اور قیاس شرعی سے موجود نہیں۔"

بنا بریں سوال میں مذکور لڑکے کی بیوی اس پر بدستور حلال اور وہ اس کے نکاح میں ہے۔ اس لڑکے کو حسب دستور اس سے بلاشبہ خانہ آبادی رکھنی چاہیے' کسی مفتی نے اگر اپنی رائے سے اس حلال کو حرام کیا ہے تو سخت گناہ کیا ہے' اس پر توبہ واجب ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام جلد۔۳۰' شمارہ۔۱۰' مورخہ ۶/ اکتوبر سنہ۔۱۹۷۸ء

یہ نکاح حرام ہے

سوال : کسی شخص نے عورت کو طلاق بائنہ دے دی کہ یکبارگی تین طلاق وارد کر دیں پھر دس روز بعد طلاق دہندہ نے اس مطلقہ عورت کی حقیقی بہن سے نکاح کر لیا اور ایک حنفی مولوی نے وہ نکاح پڑھا دیا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ حنفی مذہب کی رُو سے یہ نکاح جائز ہے یا حرام اور جس مولوی نے یہ نکاح پڑھ دیا ہے وہ تقلیدی مذہب حنفی سے خارج ہوا یا نہیں؟ فقہ حنفیہ سے اس سوال کا جواب دیا جائے۔

(عبدالرؤف خطیب جامع ہارون آباد ضلع بہاولنگر)

جواب : الحمد للہ رب العالمین امابعد! واضح ہو کہ یہ نکاح حنفی مذہب کی رُو سے ناجائز اور حرام ہے۔ چنانچہ فقہ حنفیہ کی مشہور کتاب قدوری ص۔۳۵' ۳۶ میں محرمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے : واذا طلق الرجل امراة طلاقا بائنا لم يجز له ان يتزوج باختها

حتی تنقضی عدتھا۔ یعنی "جب کوئی شخص اپنی عورت کو طلاق بائنہ دے دے تو اس کو اس عورت کی بہن سے طلاق کی عدت گذرنے سے پہلے نکاح کرنا حرام ہے۔" اور دلیل اس کی قدوری کے حاشیہ تنقیح الضروری سے یہ لکھی ہے کہ امام زیلعی نصب الرایہ میں لکھتے ہیں : رواہ ابو عبیدۃ السلمان ان اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یجتمعوا علی شئی کاجتماعھم علی اربع قبل الظھر وان لا تنکح امراۃ فی عدت اختھا۔ یعنی "ابوعبیدہ سلمانی رحمہ اللہ نے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کسی چیز پر اجماع نہیں کیا جیسا کہ ان دو چیزوں پر اجماع کیا ہے۔ ایک ظہر سے پہلے چار رکعت سنت پڑھنے پر، دوسرا یہ کہ کسی عورت کو نکاح نہ کیا جائے جب اس عورت کی بہن ناکح کی طلاق سے عدت میں بیٹھی ہو۔ پس حنفی مذہب کی رُو سے یہ نکاح حرام ہے اور نکاح خواں حنفی مذہب کی تقلید سے خارج ہو گیا اور جتنے لوگ ناکح منکوحہ کے اولیاء اور گواہ حنفی مذہب رکھتے ہیں، وہ سب حنفی مذہب سے خارج ہوئے۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہل حدیث جلد ۲۶، شمارہ ۱، مورخہ ۶، ۱۹/ اپریل سنہ ۱۹۷۳ء

ایک زانیہ اور ایک منکوحہ عورت کا نکاح؟

سوال : ایک عالم نے ایک زانیہ عورت کا جس کو زنا کی وجہ سے حمل بھی ہے اور ایک دوسری عورت ہے جس کا پہلے سے نکاح ہے اور وہ اب دوسرے آدمی کے گھر آباد ہو گئی ہے اور اسی عالم سے ان دونوں کا نکاح پڑھوا لیتے ہیں، کیا یہ دونوں نکاح از روئے شریعت جائز ہیں؟ نیز جس عالم نے یہ دونوں نکاح پڑھے ہیں، اس عالم کے پیچھے شریعت کی رُو سے نماز پڑھنی جائز ہے کہ نہیں؟

سائل ابو العطاء عبدالرحمٰن الحصاری الرحمانی چک ۶۷۹۔ گ ب

جواب : اقول وباللہ التوفیق بشرط صدق بیانات سائل جواب اس کا یہ ہے کہ دونوں نکاح قطعاً حرام ہیں اور منکوحہ اور نکاح خواں عالم دونوں شریعت سے جاہل اور شرعی لحاظ سے بہت بڑے مجرم ہیں۔

پہلا نکاح تین وجہ سے حرام ہے۔ ایک یہ کہ زانی زانیہ کا نکاح ہے جو حرام ہے۔ سورہ

نور میں زانی زانیہ کی مناکحت کے ذکر کے بعد یہ ارشاد ہے : وحرم ذلک علی المؤمنین "کہ مومنوں پر یہ مناکحت حرام ہے۔" بعض علمائے اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے ان سے توبہ کرا لی ہے۔ یہ یہودیانہ حیلہ ہے' کیونکہ پہلے زانی زانیہ کو الگ الگ کرنا چاہیے کہ ان کا باہم یارانہ نہ رہے پھر وہ خوف الٰہی سے خالص توبہ کریں اور ایک حیض استبراء رحم اس زانیہ کی عدت ہے۔ اس کے بعد نکاح کی گنجائش ہے۔

دوسری وجہ حرام ہونے کی یہ ہے کہ زانیہ حاملہ تھی اور حاملہ کا نکاح کرنا حرام ہے۔ قرآن مجید میں یہ عام حکم وارد ہے : واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن۔ یعنی "حمل والیوں کی عدت وضع حمل ہے۔" اس آیت میں مطلق حمل والیوں کی عدت وضع حمل ہے' خواہ مطلقہ ہو یا بیوہ ہو' خواہ زانیہ ہو۔ حمل خواہ حلال ہو یا حرام ہو۔ اس کے علاوہ سنن ابوداؤد میں یہ حدیث ہے کہ ایک شخص نے کنواری لڑکی سے نکاح کیا' جب اس کے قریب گیا تو وہ حاملہ پائی گئی۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے دونوں میں جدائی کرا دی۔ عون المعبود جلد۔۲' ص۔۲۰۸ میں ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حاملہ بالزنا سے نکاح صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ زانی کا حمل ہو' تب بھی نکاح صحیح نہیں ہے کیونکہ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے۔

تیسری وجہ حرام ہونے کی یہ ہے کہ یہ نکاح بغیر ولی کے ہوا ہے۔ بعض لوگ عورتوں کو اغوا کر کے لاتے ہیں اور کسی جگہ جا کر کسی نکاح خواں کو روپے دے کر نکاح کروا لیتے ہیں۔ ایسے نکاح حرام ہیں۔ حدیث شریف میں ہے : لا نکاح الا بولی کہ "عورت کے ولی کے اذن کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہے۔" دوسری حدیث میں ہے جو عورت اپنا نکاح آپ کرائے وہ زانیہ ہے۔

اسی طرح دوسرا نکاح بھی حرام ہے۔ ایک تو زانی زانیہ کا نکاح ہوا' اسی لیے حرام ہے' دوسرا یہ کہ یہ نکاح بھی بغیر ولی کے ہوا ہے اور بغیر ولی کے نکاح حرام ہے۔ تیسرا یہ کہ اس عورت کا خاوند زندہ موجود ہے' اس لیے طلاق نہیں دی تو خاوند والی عورت کا نکاح حرام ہے۔ پانچویں پارہ کے شروع میں یہ ذکر ہے : والمحصنات من النساء "کہ خاوند والی عورتیں تم پر حرام ہیں۔"

جب دونوں نکاح حرام ہیں تو ان کے درمیان جدائی ضروری ہے ورنہ دونوں نکاح کے مرد

وعورتیں زنا کرتے رہیں گے اور جس مولوی نے نکاح پڑھایا ہے' وہ بھی اس جرم میں شریک ہوگا۔ اعاذنا اللہ منہ۔

اور ان مولوی صاحب نے اگر ان حرام نکاحوں کو حلال بنا کر کیا ہے تو یہ بھی سخت جرم ہے کیونکہ حرام کو حلال کرنا کفر ہے اور نکاح خواں نے جو اُجرت حرام نکاح کی لی ہے' وہ حرام ہے۔ پس ایسے حرام خور حضرات قطعاً امامت کے اہل نہیں۔

عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام جلد۔۳۲' شمارہ۔۳۸' مورخہ ۷/ اپریل سنہ۔۱۹۸۱ء

تعاقب بر مسئلہ شروط نکاح

(حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کلکتہ والے)

مولانا عبدالقادر صاحب حصاری نے ایک نکاح کو فسخ کہا ہے۔ پنجاب والوں نے خاکسار سے بھی اس مسئلہ کا استفسار کیا اور خواہش ظاہر کی کہ میں اس مسئلہ کی صحیح نوعیت پیش کروں اور یہ بھی نظر رکھوں کہ مولانا حصاری نے اس فسخ نکاح پر جو دلائل و حوالہ جات پیش کئے ہیں وہ صحیح بھی ہیں کہ نہیں؟ اور ان پر تبصرہ بھی کر دیا جائے۔ جب میں نے مولانا حصاری کا فتوئی پڑھا تو ایسا معلوم ہوا کہ جن دلائل کو پیش کیا گیا ہے' وہ بالکل بے محل اور بے معنی ہیں۔ بخاری شریف کے تراجم یا بخاری شریف کی احادیث پیش کیے جانے سے یہ قیاس تو ممکن ہے کہ بخاری کی ورق گردانی ضرور کی ہے مگر بخاری شریف کے تراجم سمجھنے سے کوسوں دور رہے ہیں۔ بلکہ جن احادیث کو پیش کیا گیا ہے ان سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ جو شرائط لگائیں ان کو پورا کریں اور وہ شروط بھی ایسی ہوں جن کی شرع میں حیثیت قائم ہو۔ اسی طرح نیل الاوطار کے حوالے یا علمائے قدیم سے حدیث کی عبارتیں جو پیش کی گئی ہیں وہ بھی سب کی سب شرائط کو پورا کرنے کی راہنمائی کرتی ہیں نہ یہ کہ شرائط کو نہ پورا کرنے والے کا نکاح فسخ ہے ہو جاتا ہے۔

الغرض مولانا کا فتوئی بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ اس شرط لگانے کا ثبوت جب تک ساس کو بھی خرچہ نہ دو گے نکاح نہ دیا جائے گا' نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ پیغمبر خدا

ﷺ نے اعلان فرمایا ہے کہ جو شرائط ایسی لگائی جائیں جن کا قرآن میں ذکر نہ ہو' وہ سب کی سب باطل ہیں۔ اگرچہ ایک شرط کیا سو شرطیں بھی کیوں نہ ہوں' سب ہی باطل ہیں۔ یہ میرا تعاقب صحیفہ اہلحدیث کراچی میں چھپ چکا ہے' ملاحظہ ہو صحیفہ اہلحدیث یکم فروری سنہ ۱۹۶۸ء اور ۱۶/ فروری سنہ ۱۹۶۸ء اور پھر ۲/ مارچ سنہ ۱۹۶۸ء۔

حصاری صاحب نے میرے تعاقب پر جن الفاظ میں تخاطب کیا ہے' خاکسار کو ان غلط الفاظ کا تو جواب دینا ہرگز مقصود جنہیں بلکہ نفس مسئلہ کو پبلک کے سامنے واضح کرنا مقصود ہے۔ لہٰذا مولانا حصاری صاحب کو دس ہزار ایک سو ایک پاکستانی سکہ رائج الوقت جو میری حسب منشا ہو گا پیش کر دیا جائے گا' جبکہ وہ کوئی ایک حدیث بھی بخاری شریف سے پیش کر دیں کہ ناکح اگر شرط پوری نہ کرے تو نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔

اب قارئین صحیفہ اہلحدیث منتظر رہیں اور دیکھیں کہ یہ حدیث پیش کر کے انعام حاصل کرتے ہیں یا نہیں۔ پس جب وہ صحیفہ میں یہ اعلان پڑھ لیں کہ مولانا موصوف مذکورہ بالا انعام لے چکے ہیں تو خاکسار مولانا کی علمی قابلیت کا اعتراف کر کے صحیفہ اہلحدیث میں اعلان کر دے گا اور اگر مولانا نے پھر غلط الفاظ کا صحیفہ اہلحدیث میں اعادہ کیا تو معاملہ برعکس سمجھ لینا چاہیے۔

یاد رہے کہ مولانا حصاری صاحب نے مولانا وحید الزماں صاحب کا بھی نام پیش کیا ہے اور مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم کا بھی ذکر کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ کیا اگر میں بخاری نہیں جانتا تو مولانا وحید الزماں صاحب بھی نہیں جانتے؟ عرض کروں گا کہ وہ خوب جانتے ہیں بلکہ استاد حدیث سمجھنا چاہیے۔ سوال تو آپ کی سمجھ کا ہے کہ آپ نے بخاری کے تراجم کو سمجھا بھی ہے یا نہیں؟ میں کہوں گا قطعاً ہی نہیں سمجھا اور نہ ہی بخاری شریف کی احادیث کو سمجھا ہے بلکہ میں یہ بھی کہوں گا کہ آپ نے حضرت شعیب علیہ السلام کا واقعہ بیان کر کے اور اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان کر کے اپنے رہے سہے علم کو بھی بٹہ لگا دیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنی خدمت کا آٹھ دس سال قبل از نکاح وعدہ لیا تھا جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پورا کر دیا اور نکاح لے لیا۔ اس واقعہ کو فسخ نکاح سے کیا تعلق؟

صحیفہ اہلحدیث مورخہ ماہ جولائی سنہ ۱۹۶۸ شمارہ نمبر ۷' ص ۱۴ کالم دوم سطر ۶ پر اس طرح گوہر افشانی فرماتے ہیں کہ ""ہمیں آپ کا بخاری سمجھنے کا دعویٰ باطل کرنا ہے۔"" قارئین

صحیفہ نے جب اس صحیفہ کو جس میں یہ مضمون ہے' پڑھا ہو گا تو حصاری صاحب کی پریشانی کو محسوس کر لیا ہو گا۔ یوں تو وہ کافی ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں مگر ان کے سب دلائل بے سود بیکار ملیں گے' جن کا مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو کچھ بھی وہ پیش کر رہے ہیں' ان سب کا مقصد یہ ہے کہ جو شرط شرعی ہو' اس شرط کو پورا کرنا چاہیے۔ مگر مولانا حصاری کو اب پتہ چل جائے گا کہ کسی شخص سے واسطہ پڑا ہے اور پبلک خود پڑھ لی گی کہ بخاری شریف کے ابواب اور احادیث کلکتہ والے سمجھتے ہیں یا حصاری۔ اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ کون علم سے نابلد ہے اور کون یتیم فی العلم ہے' آخر ایسی حدیث کیوں پیش نہیں کی جاتی جس سے یہ ثابت ہو کہ جو شخص شرط کو پورا نہیں کرتا اس کا نکاح فسخ ہے یا فسخ ہو جاتا ہے۔

اگر حصاری صاحب میں دَم خم اور علمی قابلیت ہے یا اُن کے شیخ الحدیث مولوی عبداللہ صاحب جامعہ سلفیہ لائلپور (فیصل آباد) والے میں یا مناظر اسلام میں یا کوئی اور جس میں علمی رمق باقی ہے تو حصاری صاحب ان سب کو جمع کر لیں اور بخاری شریف سے کوئی ایک ہی حدیث پیش کر دیں کہ شرط کو پورا نہ کرنے والے کا نکاح فسخ ہے تو بیشک میرا دعویٰ کہ مولوی عبدالقادر حصاری بخاری کے تراجم تو درکنار بخاری کی حدیث کو بھی نہیں سمجھے' غلط ثابت ہو جائے گا۔

اگر مولانا حصاری نے کوئی حدیث پیش نہ کی اور نہ ہی ان کے حواریوں نے' تو سمجھ لینا چاہیے کہ ابھی مولانا حصاری اسی لائق ہیں کہ بحر العلوم میں آکر بخاری شریف کے تراجم کا کسی میرے ادنیٰ شاگرد سے استفادہ کریں۔ اس صورت' وہ بہت ہی خوش قسمت سمجھے جائیں گے۔ اب آپ اس خیال کو ترک کر دیجئے کہ آپ کے پاس یا آپ کے حواریوں کے پاس کوئی دلیل فسخ نکاح کی ہے یا ہو گی' ہرگز نہیں۔ لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔

محمد یوسف کلکتوی

صحیفہ اہلحدیث کراچی' جلد۔۴۹' شمارہ۔۱۲' مورخہ ۱۶/ جمادی الثانی سنہ۔۱۳۸۸ھ

تعقب پر تعاقب کلکتوی

واضح ہو کہ ضلع ملتان کی تحصیل خانیوال کے ایک چک میں بایں طور مناکحت واقع ہوئی ہے کہ ایک عورت نابینی تھی جس کے پاس ایک لڑکی تھی جو اس کی خدمت کرتی تھی۔ جب وہ بالغہ ہو کر قابل نکاح ہوئی تو ایک شخص حافظ قرآن امام مسجد نے اس لڑکی کی بابت پیغام نکاح دیا جو منظور کیا گیا مگر نکاح سے پہلے اس حافظ سے یہ شرط طے کی گئی کہ اس لڑکی کی والدہ نابینی کو اپنے گھر میں لڑکی کے پاس رکھنا ہو گا اور اس کی پرورش اور خبرگیری کرنی ہو گی' تب تم کو اس لڑکی کا نکاح دیا جاتا ہے۔

اس شخص ناکح نے یہ شرط منظور کر لی اور نکاح کر دیا گیا۔ نکاح کے بعد کچھ عرصہ تک ناکح نے اپنی نابینی ساس کو اپنے پاس رکھا اور پھر یہ جواب دے کر گھر سے نکال دیا کہ میں تیری پرورش نہیں کرتا۔ اس پر جماعت مسلمین نے یہ سوال اٹھایا کہ اس شخص امام مسجد نے نکاح کی شرط توڑ کر عہد شکنی کی ہے' اس کا نکاح فسخ ہو گیا یا باقی رہا؟ اور اس کے پیچھے نماز پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

چنانچہ جماعت نے ایک استفسار میں یہ سب قصہ لکھ کر علماء اہلحدیث کی طرف بھجوایا۔ ایک سوال میرے پاس بھی آیا' جس کا جواب دیا گیا جو درج ذیل ہے :

<u>نقل فتویٰ حصاری :</u> جس شخص حافظ قرآن کا نکاح اس شرط پر ہوا کہ نابینی ساس کی پرورش اور خبرگیری کرتا رہے' پھر اس نے یہ شرط توڑ دی تو اس کا نکاح بھی فسخ ہوا۔ اب اس کی عورت کو اختیار ہے کہ اس کے گھر میں رہے یا نہ رہے۔ اگر نہ رہے تو دوسری جگہ جا کر نکاح کر سکتی ہے' کیونکہ شرط باطل کرنے سے نکاح باطل ہو گیا۔

بخاری میں حدیث ہے جس پر امام بخاری نے یوں باب باندھا ہے : باب الشروط فی المهر عند عقدة النكاح یعنی "یہ باب اس بارہ میں ہے کہ عقد نکاح کے وقت مہر وغیرہ میں جو شرطیں طے کی جاتی ہیں' ان کا کیا حکم ہے" پھر عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : احق الشروط ان توفوا به ما استحللتم به الفروج۔ یعنی "تمام شرطوں میں سے نکاح کی شرطیں جن کی بناء پر شرمگاہیں حلال کی جاتی ہیں' پورا کرنے

کے زیادہ لائق ہیں۔" جب حافظ قرآن نے شرط پوری نہ کی اور غداری کی تو نکاح فسخ ہوا' کیونکہ قاعدہ شرعی یہ ہے : اذا فات الشرط فات المشروط "کہ شرط فوت ہو جائے تو مشروط بھی فوت ہو جاتا ہے۔"

اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے امام بخاری نے یہ نقل کیا ہے : قال عمران مقاطع الحقوق عند الشرط فلک ما اشترطت۔ یعنی "شرطیں قطع ہونے سے حقوق قطع ہو جاتے ہیں' پس تیرے لیے وہ حق ملے گا جس کی تو نے شرط کی ہے۔" حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے آٹھ سال کی قبل از نکاح شرط کی جس کو پورا کیا بلکہ دو سال زیادہ گزارے اور نکاح لے لیا۔ پس حافظ قرآن کو چاہیے کہ اپنی ساس کی پرورش کرے اور اس کی لڑکی پر ماں کی خدمت واجب ہے' وہ بجا لائے۔ اگر شرط پوری نہ کرے تو نکاح فسخ ہے۔ اس حافظ کو امامت سے معطل کر کے اس کی بیوی کا دوسری جگہ نکاح کر دیا جائے' ورنہ اس ظلم اور غداری کا بدلہ حافظ آخرت میں پائے گا۔ (عبدالقادر حصاری)

مقامی جماعت نے راقم الحروف کے علاوہ دیگر علماء سے بھی صورت مسئولہ بیان کر کے فتویٰ حاصل کئے ہیں اور بعض علماء سے زبانی سوال کر کے بھی اس مسئلہ کی تحقیق میں کوشش کی ہے۔ چنانچہ مولانا حافظ عبداللہ صاحب شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ لائل پور (فیصل آباد) سے فتویٰ حاصل کیا جو درج ذیل ہے :

از حافظ عبداللہ بڈھی ملوی جامعہ سلفیہ (الجواب)

میرے خیال ناقص میں نکاح قابل فسخ ہو چکا ہے۔ عورت فسخ کروا سکتی ہے' کیونکہ شرط مفقود ہونے سے مشروط بھی پختہ نہیں رہ سکتا۔ جیسے کوئی خرچہ نہ دے یا مہر نہ دے یا کوئی رکن ادا نہ کرے (مثلاً سکنیٰ' حسن عشرت) تو حاکم سے یا پنچائت سے رجوع کر کے فسخ کرانے کا حق پہنچتا ہے۔

والسلام العبد عبداللہ بڈھی ملوی مدرس جامعہ سلفیہ لائل پور (فیصل آباد)

جماعت میں سے بعض نے مولانا احمد الدین صاحب مناظر گکھڑوی سے ایک جلسہ پر سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ شرائط کے عدم ایفاء سے مشروط نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ اذا فات الشرط فات المشروط اصول بیان فرمایا ہے۔

پھر یہ سوال مولانا محمد رفیق صاحب پسروری کی خدمت میں بھیجا گیا' تو انہوں نے مندرجہ

ذیل جواب لکھ کر ارسال کیا :

جواب مولانا پسروری : (۱) بوقت نکاح یہ شرط طے ہوئی تھی کہ اگر اس نابینا عورت کی کفالت نہ کرے گا تو نکاح فسخ ہو جائے گا تو اس کی بد عہدی پر نکاح فسخ ہو گیا' ورنہ نکاح میں کوئی نقصان نہیں ہوا' بد عہدی کرنے کی سزا اسے ضرور ملے گی۔

(۲) حدیث پاک میں سب سے بہتر آدمی کو امام بنانے کا حکم ہے۔ اگر امام واقعی خلاف شریعت کام کرنے والا بد عہد اور اعلانیہ مخالف شرع امور کا مرتکب ہوتا ہے تو امامت کے قابل نہیں۔

(۳) حق مہر واجب فرض ہے' قیامت کو اسے ضرور دینا پڑے گا' انکار کرنے اور نہ دینے والے پر سخت عذاب ہو گا۔ والسلام (محمد رفیق خان پسروری)

میں کہتا ہوں کہ بخاری شریف مترجم میں حدیث عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ پر یہ لکھا ہے' نکاح کے وقت جو شرطیں کی جائیں ان کا پورا کرنا خاوند پر لازم ہے۔ امام احمد اور اہلحدیث کا یہی قول ہے۔ (پھر یہ لکھا ہے) ان شرطوں کا پورا کرنا خاوند پر لازم ہے' ورنہ عورت قاضی کے پاس نالش کر کے مرد سے جدا ہو سکتی ہے۔

یہ مولانا وحید الزماں مرحوم محدث حیدر آبادی کا فتویٰ اور حدیث بخاری کی تشریح ہے۔ نیل الاوطار میں شروط نکاح پر اختلاف ائمہ ذکر کر کے یہ لکھا ہے : وقال احمد وجماعة یجب الوفاء بالشرط مطلقا۔ یعنی "امام احمد اور ایک جماعت اہل علم کا یہ مسلک ہے کہ شرط نکاح کا ایفاء علی الاطلاق واجب ہے۔"

فتاویٰ ثنائیہ جلد۔۳ کے ص۔۹ پر کتاب النکاح کی بابت ایک مقالہ افتتاحیہ درج ہے جو حضرت العلام مولانا ابو المکارم ظفر عالم صاحب شیخ الحدیث جامعہ محمدیہ مالی گاؤں نے ارشاد فرمایا ہے۔ اس طویل مقالہ میں ایک عنوان "شرائط النکاح" ہے۔ (اس میں لکھتے ہیں) :

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احسن شروط کہ جس کو تم وفا کرو' وہ شرطیں ہیں جن سے تم نے فروج کو حلال کیا ہے۔ مراد اس سے یا تو مہر ہے یا تمام وہ شرائط ہیں جن کی ترغیب دے کر نکاح کیا ہے' یا وہ باتیں ہیں جن کی عورت بمقتضائے زوجیت مستحق ہے' ورنہ ایسی شرطیں جو شرع کے خلاف ہیں' ان کا پورا کرنا لازم نہیں۔ جیسے یہ شرط کرنا کہ دوسرا نکاح نہ کروں گا' میں تعزیہ کی زیارت کو جایا کروں گا' قبروں پر

جانے سے بھی نہ رکوں گی' الخ۔

میں کہتا ہوں کہ نکاح بہ مروجہ جائز کہنے والوں نے ایک رسالہ بنام سبیل الرشاد میانوالی سے شائع کیا ہے' اس میں ایک فتویٰ مولانا شرف الدین صاحب دہلوی کا درج ہے جن کی تعریف شروع فتویٰ میں یوں لکھی ہے : رئیس المحدثین شیخ الحدیث حضرت مولانا ابو سعید محمد شرف الدین صاحب دہلوی جناب شیخ الحدیث نے امام ابن حزم کے فتویٰ مندرجہ محلّی متعلقہ شغار پر تعاقب کیا ہے۔

چنانچہ امام ابن حزم نے یہ لکھا ہے کہ باوجود تقرر صداق تبادلہ نکاح بھی شرط ہے جو کتاب اللہ میں نہیں' لہٰذا ناجائز ہے۔ میں کہتا ہوں (شرف الدین) اس کا یہ استدلال باطل ہے۔ اس لیے کہ بحکم ما اتاکم الرسول فخذوہ الایہ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے : احق الشروط ان توفوا ما استحللتم بہ الفروج متفق علیہ میں عموم ہے۔ نیز حدیث نبوی المسلمون علی شرطھم الا شرطا حرم حلالا او احل حراما۔ (رواہ الترمذی) لہٰذا تاوقتیکہ نص صریح سے کسی شرط کی حرمت ثابت نہ ہو' مثلاً نکاح میں منکوحہ یا اس کے ولی نے بعد تقرر صداق کے قرآن پڑھانے یا بشرط استطاعت حج کرانے کی' کی تو اس کا ایفاء واجب ہے۔ (رسالہ۔۵۸)

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ مولانا وحید الزماں حیدر آبادی' مولانا ظفر عالم شیخ الحدیث' مولانا حافظ عبداللہ صاحب شیخ الحدیث' مولانا شیخ الحدیث شرف الدین دہلوی' مولانا احمد الدین صاحب مناظر اسلام وغیرہ سب اس اصول شرعی پر متفق ہیں کہ نکاح سے پہلے جو نکاح کے انعقاد کے لیے کوئی شرط ولی نکاح یا خود منکوحہ کرے بشرطیکہ وہ حرام وممنوع نہ ہو تو اس کا ایفاء واجب ہے اور حدیث بن عامر رضی اللہ عنہ اپنے عموم سے یا اطلاق سے اس پر ناطق ہے۔ جب یہ شرط توڑ دی گئی تو منکوحہ کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہے۔

راقم الحروف کا فتویٰ اس بستی کی جماعت نے کراچی اور ملتان بھیج دیا کہ وہاں کے علماء اس کی تائید یا تنقید کردیں۔

اول ملتان سے تعاقب ہوا کہ مولانا ملک عبدالعزیز صاحب ملتانی نے میرے فتویٰ کا جواب لکھا اور شرط سے مراد محض مہر لیا۔ ان کے ساتھ راقم کا تبادلہ خیالات تحریری طور پر ہوتا رہا ہے جو علیحدہ ایک دلچسپ بحث ہے جس کو کسی دوسری فرصت میں شائع کرایا جائے گا۔

19190

دوسرا تعاقب بحرالعلوم سعودیہ کراچی کے مفتی پاکستان مولانا محمد یوسف صاحب دنیا نگری کلکتہ والوں کی طرف سے ہوا ہے جس پر یہاں بحث کی جائے گی..... مولانا محمد یوسف صاحب دنیا نگری کی جماعت اہلحدیث میں شہرت بہت ہے لیکن ایک عربی مقولہ ہے: "رب مشہور لا اصل لہ" "کہ بہت لوگ ویسے ہی مشہور ہو جاتے ہیں لیکن ان کی حقیقت اور اصلیت کچھ بھی نہیں ہوتی۔" مولانا میں مثل مدیر تجلی دیوبند کے تعلی حد سے زیادہ ہے۔ اس لیے انہوں نے بندہ کے فتویٰ پر تعاقب ایسے غیر مہذبانہ الفاظ سے کیا کہ مقامی جماعت نے ان کے اس تعاقب سے اچھا اثر نہیں لیا بلکہ نفرت کا اظہار کیا ہے۔

چنانچہ وہاں کے ایک ماسٹر صاحب بندہ کو خط بھیجتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس فتویٰ میں نہ تو فقروں کی کوئی بناوٹ ہے اور نہ ہی الفاظ کی ادائیگی صحیح طور پر کی گئی ہے۔ جماعت کے چند خالص حضرات کی جانب سے آپ کو تاکید ہے کہ آپ براہ راست مولانا محمد یوسف کو خط لکھیں کہ اگر انہوں نے یہ عبارت خود لکھی ہے تو افسوس ہے کہ اتنا نکما نوشتہ ہے اور اگر کسی شاگرد سے لکھوائی ہے تو ان کی خدمت میں تحریر کریں کہ وہ کسی قابل شاگرد سے لکھوایا کریں۔"

میں کہتا ہوں کہ علماء میں اختلاف رائے بھی ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے پر جرح اور تنقید بھی کرتے ہیں مگر ایسے غیر مہذب نہیں ہوتے کہ اپنے مخالف کو حقیر جانیں اور اس کو دلآزار الفاظ سے خطاب کریں۔ چنانچہ مولانا محمد یوسف صاحب کلکتوی جو اپنے آپ کو بڑا محدث اور علامہ تصور کرتے ہیں، میرے فتویٰ پر بایں الفاظ تعاقب کرتے ہیں۔

(مولانا محمد یوسف صاحب کلکتوی کا تعاقب): مولانا عبدالقادر حصاری صاحب کا فتویٰ دربارہ فسخ نکاح ایک نابینے حافظ قرآن کے، نظر سے گذرا۔ مولانا عبدالقادر حصاروی کے دلائل پر تعجب ہوا کہ بچارے امام بخاری کے باب باندھنے کو نہ سمجھ سکے اور حقیقت ہی ہے کہ بخاری کا سمجھنا کسی کسی کا کام ہے۔ مولانا صاحب کا فتویٰ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علم حدیث میں حقیقت بہت کم رکھتے ہیں۔ میں نے اکثر فتوے موصوف کے دیکھے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے غور نہیں کرتے، خیر بہر کیف فتویٰ بالکل غلط ہے جو شرائط مہر میں ہو، اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ وہ بھی ایسے شرائط ہوں، جو شرح کے موافق ہوں ورنہ ان کا پورا کرنا ہرگز جائز ہی نہیں۔

ساس کی پرورش ایک الگ بات ہے' یہ وعدہ کے خلاف ہے جو اخلاقاً شرعاً قابل مواخذہ ہے' نہ یہ کہ نکاح فسخ ہے۔ ان احق الشروط الخ میں صاف ہما استحللتم به الفروج کہ یہ شرط ہو کہ بیوی اس شرط کے بغیر پورے کئے حلال ہی نہ ہو سکے یہ کون سی تُک ہے کہ ساس کی پرورش تم کرو گے۔ ہاں پرورش کرے مگر اس کو نکاح کی شروط میں قطعاً دخل نہیں۔

ہم سے سنئے' بریرہ لونڈی کا قصہ بخاری ودیگر کتب میں موجود ہے۔ بریرہ رضی اللہ عنہا کے مالکوں نے یہ شرط لگائی کہ اگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بریرہ لونڈی کے پیسے مالکوں کو ادا کر دے تو ہم لونڈی دے دیتے ہیں مگر ولاء ہماری ہو گی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ بریرہ کے مالک ولاء کی شرط لگاتے ہیں کہ ہم کو ملنی چاہیے اور پیسے تم ادا کر کے آزاد کر دو' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : عائشہ واشترطی لهم الولاء "عائشہ تو بیشک ان سے یہ شرط مان لے"' جب ان لوگوں نے اس شرط پر بریرہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور ڈانٹا کہ ما بال رجال يشترطون شروطا ليست فی كتاب الله فما كان من شرط ليس فی كتاب الله فهو باطل وان كان مائة شرط او كما قال۔ یعنی "افسوس ہے ایسے لوگوں پر جو شرط لگا لیتے ہیں اور وہ کتاب اللہ میں نہیں ہیں' ایسی شرطیں سو بھی کیوں نہ ہوں' سب باطل ہیں۔" پس ہم حصاری صاحب سے پوچھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرط لگا کر لونڈی لے لی اور پھر اس کو توڑ دیا' یہ کیوں؟

پس ساس کا شرط لگانا نکاح میں شرعاً خلاف ہے' اس کے خلاف کرنے سے نکاح فسخ نہیں ہو گا' ہاں وعدہ خلافی ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کا واقعہ بیان کر کے اپنے علم کو ضائع کر دیا' وہ قبل نکاح تھا اور وعدہ تھا کہ بھائی اگر تم کچھ میری خدمت کرو گے تو وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی لڑکی کا نکاح دے دوں گا جیسے ہم کہیں کہ مولانا عبدالقادر صاحب آپ ہم کو اپنے نکاح میں ضرور بلائیے گا۔ مولانا نے ہم سے کہا کہ میں نکاح ہی تب کروں گا کہ جب تم لوگ آؤ گے۔ اب اتفاق سے ہم نے سوچا کہ کراچی سے اتنی دور کون جائے اور ادھر مولانا کی شادی قرار پا کر قاضی صاحب نے نکاح پڑھا دیا۔ جب کسی دوسرے مولوی کو معلوم ہوا کہ مولانا حصاروی صاحب نے کہا تھا کہ

تمہارے آئے بغیر نکاح نہ کروں گا' لہٰذا نکاح حصاروی صاحب کا فسخ' تو کیا مولانا اس فتویٰ کو جائز قرار دیں گے یا ایسے مفتی مولوی کا مذاق اُڑائیں گے۔

الغرض مولانا صاحب حصاری کا فتویٰ غلط ہے اور نکاح صحیح ہے' واللہ اعلم۔

(محمد یوسف)

بحر العلوم سعودیہ۔ کراچی

(نشان مہر)

اس تعاقب کی کتابت وعبارت بہت بھدی ہے' بظاہر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تعاقب حضرت العلامہ مولانا محمد یوسف صاحب کلکتوی کا لکھا ہوا ہے' کیونکہ وہ علم کا بڑا دعویٰ رکھتے ہیں اور لوگ جو ان کے معتقدین ہیں' ان کو علامہ کے لقب سے ملقب کرتے ہیں' مگر چونکہ جماعت اہلحدیث نے استفتاء فتویٰ ان کے نام بھیجا تھا اور فتویٰ پر مہر بھی ان کی چسپاں ہے اور ان کا سلوب تحریر وتقریر بھی مقابلہ کے وقت اسی طرح ہوتا ہے' اس لیے یہ تعاقب ان کا ہی تصور کیا جائے گا۔

باقی رہا اسلوب تحریر اور عبارت کا بھدا پن اور تلفظ غلط ہونا' اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ اصل پنجابی النسل ہیں۔ ابتداء" دیہات میں رہے تو انتہاء" کلکتہ میں رہنے سے ان کی حقیقت نہیں بدلی۔ چنانچہ کلکتہ میں امارت کے منصب پر فائز رہے تو رسالہ "دعوت حق" اپنی امارت کو پختہ کرنے کے لیے شائع کیا تو اس میں حاشیہ پر حضرت العلامہ مولانا حافظ عبداللہ صاحب محدث روپڑی مرحوم سے مجادلہ کرتے ہوئے یوں عبارت لکھتے ہیں : "اس شخص پر تو آیت وضو کا چسپاں ہو ہی نہیں سکتا" حاشیہ ص ۲ اسی صفحہ پر پھر لکھتے ہیں : "اس پر آیت وضو کا چسپاں ہو سکتا ہے۔" لفظ آیت مونث ہے' اس کو مذکر تصور کر رہے ہیں۔ اسی طرح تعاقب میں لفظ حصاری کو حصاروی لکھ رہے ہیں' حالانکہ یہ نسبت ضلع حصار کی طرف ہے تو اس میں واؤ بڑھانا کسی قاعدہ کی رو سے صحیح نہیں ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ حضرت الفقیہ نے کوئی اپنی اختراعی فقہ سے قاعدہ تجویز کر لیا ہو۔ بہرکیف تعاقب مذکورہ مولانا موصوف الصدر ہی کا تصور کر کے جواب عرض کیا جاتا ہے۔

اچھا مولانا! آپ نے فرمایا ہے کہ تعجب ہے کہ امام بخاری کے باب باندھنے کو نہ سمجھ سکے۔ خیر بندہ تو نہ سمجھ سکا' کیا مولانا وحید الزمان مرحوم جن کو بہت بڑا جید عالم تصور کر کے

حضرت العلامہ مولانا نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے کتب حدیث کے تراجم اور دیگر کتب دینیات کی تالیف پر مقرر فرمایا تھا' وہ بھی نہ سمجھ سکے؟ اور کیا جامعہ سلفیہ کے شیخ الحدیث مولانا حافظ عبداللہ صاحب جو آپ سے زیادہ کئی بار بخاری شریف پڑھا چکے ہیں' وہ بھی بخاری کا باب نہ سمجھ سکے اور کیا مولانا شرف الدین صاحب دہلوی جن کی تمام عمر بخاری پڑھاتے اور طلباء کا امتحان لیتے گذری' وہ بھی نہ سمجھ سکے تو پھر آپ کو بخاری سمجھنے کا دعویٰ کیسے ہوا؟ کیا آپ کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ براہ راست کلکتہ یا کراچی میں تشریف لا کر بخاری شریف پڑھا گئے تھے کہ آپ کو اپنے فہم پر قطعی یقین ہے کہ بخاری کے ہر مقام کو بغیر کسی احتمال خطا کے ہمیشہ صحیح سمجھتے ہیں؟ اگر یہ عقیدہ ہے تو آپ کا عقیدہ دیگر گمراہ فرقوں کی طرح خراب ہے۔

چنانچہ حکایات اولیاء کے ص-۲۷۲ میں مولانا نانوتوی کے تذکرہ میں ان کی کرامت بیان کرتے ہوئے راؤ عبدالرحمٰن خان صاحب ٭ نجلاسہ کی روایت سے یہ لکھا ہے کہ "رخصت کے وقت مولانا نے فرمایا کہ میرے لیے دعا فرمائیے' اس پر فرمایا کہ بھائی میں تمہارے لیے کیا دعا کروں؟ میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں دونوں جہاں کے بادشاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بخاری پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔" (یہ دیوبندی توحید کا نمونہ ہے ورنہ قرآن ناطق ہے والملک یومئذ اللہ)

پس اگر آپ کا بھی یہ دعویٰ ہے تو واقعی دیگر علماء آپ سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر یہ دعویٰ نہیں تو پھر بغیر کسی قطعی مرجح کے ہم آپ کو دیگر علماء پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ اگر بغیر کسی مرجح کے آپ تعلی اختیار کریں تو میں اس کو تکبر فی العلم اور استعظام بیجا تصور کرتا ہوں۔

پھر آپ نے یہ فرمایا ہے کہ حقیقت ہے کہ بخاری کا سمجھنا کسی کسی کا کام ہے۔ بندہ آپ سے دریافت کرتا ہے کہ ان کسی کسی میں آپ بھی داخل ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو آپ کو تعاقب کرنے کا کیا حق ہے؟ خاموش بیٹھئے۔ اگر آپ ان کسی کسی علماء میں داخل ہیں تو پھر یہ کیا وجہ ہے کہ حضرت العلام محدث روپڑی ممتحن مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ کے احادیث کا مطلب غلط سمجھنے کا سرٹیفکیٹ آپ کو دیا ہے؟ پہلے آپ ان سے کتب حدیث پڑھ کر احادیث کا مطلب صحیح سمجھنے میں مہارت پیدا کر لیتے پھر میرے ایسے غریبوں کی تنقید

کرنے کا حق حاصل کرتے۔ لیکن اب تو بہت مشکل پڑے گی کہ برابر کی چوٹ ہے۔ پھر آپ نے یہ فرمایا' میں نے اکثر فتوے موصوف کے دیکھے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غور نہیں کرتے۔ اگر آپ نے اکثر فتووں میں نقص دیکھا تو پھر اب تک آپ نے سکوت کیوں رکھا۔ حدیث من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ الحدیث کی آپ نے نافرمانی کی ہے۔

چنانچہ محلّٰی ابن حزم جلد۔۱' ص۔۲۶ میں ہے : والامر بالمعروف والنھی عن المنکر فرضان علٰی کل اَحد علٰی قدر طاقتہ۔ یعنی "بروئے حدیث مذکورہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا ہر ایک پر حسب طاقت فرض ہے۔" پس آپ اس فرض کے تارک ہوئے اور دل ہی دل میں کڑھتے رہے۔ حدیث میں ہے : ذالک اضعف الایمان "کہ یہ درجہ بہت ضعیف ایمان کا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ آپ سائل کے سوال پر ہی غور نہیں کر سکے تو جواب صحیح دینے کے لیے کیسے غور کر سکیں گے۔ چنانچہ لکھا ہے : "فتویٰ دربارہ فسخ نکاح ایک نابینے حافظ قرآن کا نظر سے گذرا" حالانکہ اس کی ساس نابینی ہے جو حافظ قرآن نہیں ہے' اس کا داماد ناکح حافظ قرآن ہے' وہ نابینا نہیں ہے۔

پھر آپ نے اپنے علامہ ہونے کی صفت کا اظہار ان "مہذبانہ" الفاظ سے کیا ہے : "فتوا بالکل غلط لچر بیہودہ ہے۔" مسئلہ مابہ النزاع اختلافی ہے' بڑے بڑے علماء بندہ کے مسلک سے متفق ہیں۔ جیسے پہلے ظاہر کر چکا ہوں اور آئندہ بھی ثبوت آرہا ہے۔ راقم الحروف نے ازخود رائے سے کچھ نہیں لکھا' اپنے سے زیادہ علم وفقہ رکھنے والے علماء کی تحقیق کے پیش نظر لکھا ہے۔ اس کو آپ اپنے مسلک کی رُو سے غلط تو کہہ سکتے ہیں لیکن لچر اور بیہودہ کہنا آپ کے علمی شان کے بہت خلاف ہے اور کبر پر مبنی ہے' کبر کی تعریف حدیث میں یوں آئی ہے : "بطر الحق وغمط الناس" یعنی حق بات نہ ماننا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔ یہ دونوں صفتیں آپ میں بدرجہ اتم موجود ہیں جیسا کہ آئندہ بحث سے یہ ثابت ہو جائے گا' انشاء اللہ۔

علامہ صاحب فرماتے ہیں "شرائط مہر میں ہو' اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔" افسوس ہے آپ علامہ تو کہلانے لگے لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں کہ مہر میں شرائط کون سے ہیں؟ مہر تو خود شرط ہے جس کے عوض نکاح ہوتا ہے یا پھر آپ کو اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کا طریقہ نہیں آیا کہ آپ علم میں غرق ہو کر بیہوش ہو گئے۔ مطلب یوں ادا کرنا تھا کہ شرط سے مراد

مہر ہے' اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ مولانا مہر تو سب جانتے ہیں کہ اس کے عوض نکاح ہوتا ہے' اس کا پورا کرنا ضروری ہے لیکن آپ کی طرح ایک سند یافتہ مولوی تو یہ کہتا تھا کہ مہر اگر نہ دے اور شرط مہر کی پوری نہ کرے تب بھی نکاح فسخ نہ ہو گا حالانکہ یہ قول باطل ہے۔ اگر اس شرط کے پورا کرنے کا عزم بالجزم نہ ہو اور نا کہ دینے سے انکار کر دے تو عورت کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہے' کیونکہ استحلال فرج کا سبب دیگر شرائط کی طرح مہر بھی ہے۔ جب مہر نہ رہا تو حق زوجیت قطع ہو گیا۔

امام بخاری نے جو مقاطع الحقوق عند الشروط فیصلہ فاروق کا آخری جملہ لکھا ہے' اس کا یہی مطلب ہے۔ اس سے قاعدہ اذا فات الشرط فات المشروط بنایا گیا ہے کہ شرط کے فوت ہونے سے مشروط فوت ہو جاتا ہے۔ آپ کے ہم خیال مولوی نے اسی مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ اگر کوئی مہر بھی نہ دے اور دینے سے انکار کر دے تو نکاح فسخ نہ ہو گا حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ وہ زانی اٹھایا جائے گا۔

چنانچہ الزواجر عن اقتراف الکبائر کی جلد۔۲' ص۔۲۸ میں ہے : اخرج الطبرانی بسند رواته ثقات انه صلی الله علیه وسلم قال ایما رجل تزوج امراة علی ماقل من المهرا وکثر ولیس فی نفسه ان یؤدی الیها حقها خدعها فمات ولم یود الیها حقها لقی الله یوم القیمة وهو زان۔ یعنی "آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی عورت سے تھوڑے یا زیادہ مہر پر نکاح کیا اور اس کی نیت اس مہر کے ادا کرنے کی نہیں ہے' اس نے دھوکہ کیا کہ مہر نکاح میں مقرر کرا لیا اور پھر ادا نہ کیا اور مر گیا تو دن قیامت کے اللہ تعالیٰ سے جب ملے گا تو وہ زانی ہو کر پیش ہو گا۔"

آج کل مہر باندھنے کا صرف رواج ہے' نہ کوئی دیتا ہے اور نہ دینے کی نیت رکھتا ہے' الا ماشاء اللہ تو یہ سب زانی اٹھیں گے۔ مولانا مفتی پاکستان نے فرمایا ہے کہ "وہ بھی ایسے شرائط ہوں جو شرح کے موافق ہوں ورنہ ان کا پورا کرنا ہرگز جائز نہیں۔" مولانا کے اس قول پر ہمارا صاد ہے کہ شرع کے موافق جو شرائط ہوں ان کا پورا کرنا لازم ہے' اگر موافق نہ ہوں تو ان کا پورا کرنا ہرگز جائز نہیں" مگر آپ نے لفظ شرع جو بالعین ہے' اس کو شرح بالحاء لکھا ہے یہ غلط ہے۔ اس کو صحیح کر لیں ورنہ علامہ ہونے کے درجہ سے ساقط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد حضرت علامہ صاحب اپنے علم کی ضو افشانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اس

کی پرورش ایک الگ بات ہے' یہ وعدہ کے خلاف ہے جو اخلاقاً شرعاً قابل مواخذہ ہے نہ یہ کہ نکاح فسخ ہے۔" مولانا یہی بات ذرا غور کر کے سمجھنے کی ہے کہ یہ محض وعدہ ناکح کی طرف سے نہیں تھا بلکہ جب ناکح نے اس نائیکی سے اس کی لڑکی کا رشتہ طلب کیا تو اس نے اس کے سامنے یہ شرط پیش کی کہ یہ لڑکی میری خدمت گذار ہے' میں نائیکی ہوں۔ اگر اس کو بیاہ کر دوسرے کے حوالہ کر دوں گی تو میرا کوئی خبر گیر نہ رہے گا۔ اس لیے میں اس شرط پر یہ لڑکی تم کو نکاح دیتی ہوں کہ مجھے لڑکی کے ساتھ رکھا جائے تاکہ یہ میری خبر گیری کرتی رہے اور میرا خرچہ تمہارے ذمہ رہے گا۔ لڑکی بھی اس وقت پاس ہے جو اس شرط کرانے میں شامل ہے اور اپنی والدہ کو پاس رکھنا چاہتی ہے۔

اس حافظ قرآن نے اس شرط کو منظور کر لیا' یہ شرطیہ معاہدہ اس نکاح کا موقوف علیہ تھا۔ پنجاب میں ایسی شرطیں کی جاتی ہیں۔ کبھی داماد کو آٹھ نو سال اپنے گھر میں رکھنے کی شرط کر لیتے ہیں' کبھی اس کے ساتھ منکوحہ کے بوڑھے باپ یا بوڑھی والدہ کو رہنے کی شرط کر لیتے ہیں' کبھی کوئی اپنے لڑکے کے لیے ناکح کی بہن یا کوئی رشتہ دار عورت نکاح لینی کر لیتے ہیں اور ناکح اور اس کے اولیاء یہ شرطیں اور معاہدے بخوشی منظور کر لیتے ہیں۔ جو لوگ ان شرطوں کو پورا کرتے ہیں' ان کی باہم صلح رہتی ہے اور جو خلاف کر کے شرطیں توڑ دیتے ہیں تو فساد اور جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور لڑکیاں جدا کر لی جاتی ہیں۔ جب یہ عرف ہے کہ فریقین اس شرط پر نکاح کا دارومدار رکھتے ہیں اور یہ شرطیں جائز ہیں' منع نہیں ہیں' سوائے لڑکی تبادلہ میں لینے کے کہ یہ حرام بوجہ شغار ہے۔ ان جائز شرطوں کا پورا کرنا واجب ہے ورنہ خصومت اور فتنہ پیدا ہو گا جیسا کہ اب ہو رہا ہے پھر اس شرط کو شرط نکاح قرار نہ دینا اور محض زائد وعدہ ٹھہرانا عرف عام کے سراسر خلاف ہے اور شرع نے عرف عام کا اختیار رکھا ہے۔

چنانچہ امام الدنیا فی الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "باب الشروط التی یتعارفھا الناس بینھم" یعنی "ان شرطوں کا بیان جو لوگوں میں عموماً جاری ہیں" پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی شریح سے نقل کیا کہ : من شرط علی نفسہ طائعا غیر مکرہ فھو علیہ۔ یعنی "جس شخص نے کوئی شرط اپنی خوشی سے قبول کی اور اس پر اکراہ نہیں کیا گیا تو یہ شرط اس کے ذمہ ہے۔"

پس عام رواج کی رُو سے حافظ قرآن نے یہ شرط خوشی سے مان لی تھی تو اس کا ایفاء واجب

ہے۔ قرآن میں اوفوا بالعهد اور اوفوا بالعقود جو حکم وارد ہے' اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس شرطیہ معاہدہ پر ناکح کو پابندی ضروری ہے' کیونکہ یہ معاہدہ جائز ہے' جیسا کہ مولانا نے تسلیم کر لیا ہے کہ یہ وعدہ خلافی اخلاقاً و شرعاً قابل مواخذہ ہے۔ جب یہ شرط جائز ہے تو اس کا ایفاء بموجب عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث احق الشروط کے واجب ہے۔ کیونکہ یہ حدیث ہر جائز شرط کے ایفاء پر علی الاطلاق ناطق ہے' اس کو مہر ملی سے خاص کرنا تخصیص بلا مخصص ہے اور تقیید بلا مقید ہے اور نکاح فسخ کرنا لڑکی کی رضامندی پر موقوف ہے۔ اگر وہ عدم ایفاء کی وجہ سے نکاح فسخ کرانا چاہے تو نکاح فسخ ہو جائے گا' کیونکہ نکاح سے پہلے کی تمام شرطیں اور عطیے لڑکی منکوحہ کا حق ہیں' وہ خود لے یا اپنے ولی کو دلائے' اس کی مرضی ہے۔

سبل السلام میں ہے : والعرف معتبر فی هذا۔ (جلد ۳' ص ۱۲۸) یعنی "نکاح کے معاملہ میں لوگوں کا عرف معتبر ہے۔" اب یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد مہر اور حسن عشرت وغیرہ ہیں' ان کی تردید کرتے ہوئے علامہ امیر صنعانی سبل السلام جلد ۳' ص ۱۳۳ میں فرماتے ہیں : قلت هذه الشروط ان ارادوا انه يحمل عليها الحديث فقد قللوا فائدته لان هذه امور لا زمته للعقد لا تفتقر الى شرط۔ یعنی "مہر اور حسن عشرت وغیرہ امور پر حدیث احق الشروط کو محمول کیا جائے تو اس سے معمولی فائدہ ہے' کیونکہ ان امور کی شرط نہیں کی جاتی کہ یہ خود عقد نکاح کو لازم ہیں' شرط کے محتاج نہیں ہیں۔"

میں کہتا ہوں کہ ان امور کی پنجاب اور دیگر ممالک میں کبھی شرط نہیں کی جاتی کہ میری لڑکی کو روٹی کپڑا دینا ہو گا' مکان دینا ہو گا وغیرہ کیونکہ یہ بات متعارف ہے کہ جب نکاح ہوا' یہ امور ناکح پر لازم ہو گئے۔ شرط اس چیز کی' کی جاتی ہے جس کا اولیاء اور منکوحہ کو خاص فائدہ ہو۔ اس لیے علامہ یمنی فرماتے ہیں : فالمراد فی الحديث الشروط الجائزة لا المنهی عنه فامكن شروطها ان لا يخرجها من منزلها فهذا شرط غير منهی عنه فتعين الوفاء۔ یعنی "حدیث عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ احق الشروط کا یہ مطلب ہے کہ جائز شرطوں کو پورا کرنا چاہیے اور ممنوع شرطوں کو پورا کرنا جائز نہیں ہے۔ جیسے عورت یہ شرط کر لے کہ اس کو اس کے گھر سے باہر کسی دوسرے مقام پر نہیں لے جایا جائے گا تو یہ شرط منع نہیں' اس لیے اس کا پورا کرنا واجب ہے۔"

اب علامہ صاحب بتائیں کہ امیر یمنی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ غیر فقیہ ہیں

اور بخاری کو نہیں سمجھ سکے اور ان کی یہ بات لچر اور بیہودہ ہے لیکن یہ خیال رکھئے کہ کبھی بلوغ المرام پڑھاتے ہوئے سبل السلام کو ہاتھ نہ لگایئے کہ وہ بخاری کو نہ سمجھ سکے تھے۔

افسوس تو یہ ہے کہ آپ ہمہ دانی کا اپنے دماغ میں تصور رکھتے ہوئے لفظ شرط کی حقیقت لغویہ و شرعیہ وعرفیہ کو نظر انداز کئے ہوئے اہل ہویٰ کی طرح اپنی رائے کو ترجیح دے رہے ہیں اور فرماتے ہیں "نہ یہ کہ نکاح فسخ ہے" میں کہتا ہوں کہ فسخ کیوں نہیں ہو گا کہ شرط شرعاً جائز اور عرفاً ثابت اور شرط کی تعریف میں یہ امر داخل کہ انتفاء شرط سے انتفاء شروط ہو جاتا ہے اور حدیث عقبہ رضی اللہ عنہ سے بالعموم ایفاء واجب ہے۔ مولانا کلکتہ کی فقاہت سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں : " ان احق الشروط الخ میں صاف بما استحللتم به الفروج کہ یہ شرط ہو کہ بیوی اس شرط کے بغیر پورے کئے حلال ہی نہ ہو سکے۔"

میں کہتا ہوں کہ حدیث نے تو عام قانون بیان فرما دیا کہ جن جائز شرطوں سے فروج حلال ہوں' ان کا ایفاء واجب ہے اور عرف عام لوگوں کا یہ ہے کہ نکاح سے پہلے بعض شرطیں لکھوا لیتے ہیں اور بعض زبانی معاہدہ قائم رکھتے ہیں کہ اگر یہ شرط نہ ملنے یا پوری نہ کرے تو لڑکی تمہارے گھر نہ رہے گی' ہم واپس لے لیں گے۔ چنانچہ بعض ناکح شرط توڑ کر بھاگ گئے تو عورت کے اولیاء نے اپنی لڑکی دوسری جگہ بیاہ دی اور صاف یہ کہا کہ ہم نے شرط کی تھی' اس لیے پوری نہ کی' ہم نے نکاح کالعدم سمجھ لیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شرط موجب استحلال فرج ہے۔ استحلال فروج کے لیے مہر ملی کی خصوصیت نہیں بلکہ بہت سے شرائط ہیں۔

مثلاً ولی کا اذن دینا' بغیر ولی کے نکاح نہ ہو گا اور استحلال فروج نہ پایا جائے گا۔ گواہوں کا ہونا بغیر گواہوں کے خفیہ نکاح کرے گا تو نکاح نہ ہو گا' اعلان شرط ہے۔ اگر ہمیشہ نکاح میں رکھنے کی نیت اور عمل کرے گا تو عورت حلال ہو گی۔ نکاح حلالہ' نکاح موقت' نکاح متعہ سے عورت حرام رہے گی۔ خواہ علامہ صاحب تمام علوم کا زور خرچ کر کے اور مہر ملی دے کر نکاح پڑھیں تو نکاح حرام ہو گا۔ نکاح دوسری عورت کے تبادلہ میں نہ ہو ورنہ عورت حلال نہ ہو گی' خواہ تمام علماء اہل شغار جمع ہو کر نکاح کریں' نکاح نہ ہو گا اور عورت ناکح پر حلال نہ ہو گی۔ زوجین میں اسلام اور ایمان پایا جاتا ہو' اگر ایک مسلمان اور دوسرا مشرک ہوا تو نکاح نہ ہو گا اور عورت حلال نہ ہو گی۔ ٹھیک اسی طرح عورت کے اولیاء نے یا عورت نے

یہ شرط کرلی کہ ہمارے گھر دس سال تک رہ کر دوکان کا کام یا کھیتی کا کام یا بکریاں چرانی ہوں گی۔ اگر یہ کام نہ کرو تو نکاح نہ دیا جائے گا تو یہ شرط پوری کرنی واجب ہو گی ورنہ عورت نہ ملے گی یا پہلے یہ شرط اور معاہدہ طے کرا کر اس کا ایفاء بعد نکاح کے رکھا گیا تو اس کا پورا کرنا واجب ہو گا ورنہ عورت حلال نہ ہو گی۔ ان تمام صورتوں کو یا اس کی مثل جائز شرطوں کو حدیث عقبہ اپنے اطلاق سے شامل ہے' جس سے انکار کرنا فرقہ سوفسطائیہ میں داخل ہونا ہے۔ جب کسی آیت اور حدیث کے عموم اور اطلاق کی تخصیص و تقیید کسی قول صحابی یا تابعی سے جائز نہیں تو آراء علماء سے کیسے جائز ہے؟

سبل السلام جلد۔۳' ص۔۱۱ میں ہے: والقول بانه قيد اطلاقها الاثار عن السلف غير صحيح اذ باجماع وتقييد الايات بأراء العلماء باطل۔ یعنی "آثار سلف کے مطلق کو مقید کرنا صحیح نہیں' کیونکہ یہ اجماع نہیں ہے اور آراء علماء سے آیتوں کو مقید کرنا باطل ہے۔"

پس عقبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث عام ہر شرط جائز کو شامل اور ہر شرط جائز جس پر دارومدار نکاح کا ہو' توڑنے سے مشروط باطل ہو جاتا ہے کہ عرف یہی ہے۔ مولانا محمد رفیق خاں کا کہنا کہ اگر فسخ کی شرط کریں گے تو فسخ ہو جائے گا ورنہ نہیں' یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ شرط کا انقطاع ہی کافی ہے کیونکہ شرط میں عرفاً یہ داخل ہے کہ اگر شرط پوری نہ کی تو نکاح فسخ ہو جائے گا۔ قواعد الاحکام میں لکھا ہے کہ اقتضاء عرفی مثل اقتضاء لفظی کے ہے۔

چنانچہ اعلام الموقعین جلد۔۳' ص۔۳ میں ہے: "عنوان الشرط العرفی کالشرط اللفظی" قائم کر کے اس عرف سے ثابت کیا گیا ہے۔ عقود نکاح ہوں یا بیع ہوں' سب میں عرف عام کا اعتبار کیا گیا ہے جبکہ کسی خاص حکم میں عرف عام کے خلاف شرع وارد نہ ہو۔ فتذكروا ولا تكونوا من المعاندين۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع صحیح بخاری میں شروط نکاح کے بارہ میں تین باب منعقد کئے ہیں۔ ایک کتاب الشروط میں جو بایں الفاظ مذکور ہے: باب الشروط فی المهر عند عقدة النكاح یعنی "عقد نکاح کے وقت مہر میں شرطیں کرنے کے بارے میں یہ باب ہے۔"

اس کے تحت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فیصلہ سے یہ حکم نقل کیا ہے: وقال عمر ان مقاطع الحقوق عند الشروط ولک ما اشترطت۔ یعنی "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حق اس وقت ادا ہوتا ہے جب شرط پوری کی جائے اور تو جو شرط کرے گا اس کو پورا کرنے کا

تجھ کو حق ہے۔" اور پھر مسور رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے داماد ابو العاص رضی اللہ عنہ کی تعریف کی کہ اس نے دامادی کا حق پورا ادا کیا' جو بات کی اور وعدہ کیا اس کو پورا کیا اور پھر عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ والی روایت نقل کی جس کے الفاظ یہ ہیں : احق الشروط ان توفوا ما استحللتم به الفروج۔ یعنی "جو شرطیں پوری کرنے کے بہت لائق ہیں' وہ شرطیں ہیں جن سے تم عورتوں کی شرمگاہیں حلال کرتے ہو۔"

مولانا وحید الزماں مرحوم اس حدیث کے حاشیہ پر لکھتے ہیں : "امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اہلحدیث کا یہ قول ہے کہ ہر قسم کی شرطیں پوری کرنی پڑیں گی کیونکہ حدیث مطلق ہے۔"

پھر کتاب النکاح میں دوسرا باب یوں منعقد کیا ہے : باب الشروط فی النکاح یعنی "نکاح میں جو شرطیں ہوں' ان کا پورا کرنے کے بیان میں یہ باب ہے۔" پھر اس کے ثبوت میں وہی قول حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پیش کیا ہے اور وہی روایت مسور رضی اللہ عنہ اور حدیث عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی ذکر کر کے حکم ایفاء شروط ثابت کیا ہے۔

پھر تیسرا باب یوں منعقد کیا ہے : باب الشروط التی لا تحل فی النکاح یعنی "یہ باب ان شروط کے بیان میں ہے جو نکاح میں کرنی حلال نہیں ہیں۔" پھر اس کے ثبوت میں قول ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوعاً نقل کی ہے۔ دونوں کا مطلب یہ ہے کہ کوئی عورت نکاح کے وقت یہ شرط نہ کرے اور اس کے لیے یہ حلال نہیں کہ وہ اپنی بہن کی طلاق کی درخواست کرے تاکہ اس کے حصہ کے پیالہ کو خود انڈیل لے' کیونکہ تقدیر میں جو اس کی قسمت ہے' اس کو وہی ملے گا۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ جن شرطوں کی ممانعت شرع میں آئی ہے' ان کا نکاح میں باندھنا حلال نہیں ہے۔ اگر باندھی جائیں تو ان کا ایفاء واجب نہیں بلکہ منع ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے اور جو شرطیں جائز ہیں' ان کا ایفاء واجب ہے اور یہ حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار ذکر کی ہے کہ جو شرط کتاب اللہ میں نہ ہو' وہ باطل ہے تو اس کا مطلب امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان فرمایا ہے جو اعلام الموقعین مصری جلد۔۳' ص۔۴۰۲ میں درج ہے کہ قواعد شرعیہ سے یہاں دو قاعدہ کلیہ ہیں : احدهما ان كل شرط خالف حكم الله وناقض كتابه فهو باطل كائنا ما كان۔ "ایک یہ ہے کہ ہر شرط جو مخالف حکم الٰہی اور مناقض کتاب اللہ ہو' وہ باطل ہے' خواہ کیسی شرط ہو۔" مثلاً یہ شرط کرے کہ میں تم کو اس

شرط پر لڑکی دیتا ہوں کہ تم مرزائی' احمدی ہو جاؤ۔ نا کح قبول کر لے تو یہ شرط باطل ہے جو کتاب وسنت کے خلاف ہے' اس کا ایفاء حرام ہے۔

والثانية ان كل شرط لا يخالف حكمه ولا ينقض كتابه وهو يجوز تركه وفعله بدون الشرط۔ یعنی "تحقیق ہر وہ شرط جو حکم الٰہی کے مخالف اور کتاب اللہ کے معارض نہ ہو بایں طور کہ بغیر شرط کے اس کام کا کرنا اور چھوڑنا بروئے شرع جائز ہو تو اس کا اصل کتاب اللہ میں پایا گیا۔ فهو لازم بالشرط ایسا کام شرط کر لینے سے لازم ہو جائے گا۔"

مثلاً صورت متنازعہ میں نابینی عورت کی خبر گیری اور خدمت کرنا اور پرورش جائز اور موجب ثواب ہے۔ اگر ترک کر دے تو گناہ نہیں ہے کیونکہ یہ اس کے ذمہ واجب نہیں ہے لیکن جب وعدہ کر لیا اور عہد کیا تو پھر خبر گیری اور خدمت واجب ہو گئی لیکن نکاح میں اس کو شرط کر لیا تو پھر اس کا ایفاء احق اور زیادہ لازم ہو گیا اور حدیث عقبہ رضی اللہ عنہ اور حکم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تحت آ گیا۔ یہی مطلب ہے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا کہ انہوں نے قول عمر رضی اللہ عنہ پیش کر کے اپنا عندیہ ظاہر کر دیا ہے کہ جو شرط حرام اور ممنوع نہ ہو' اس کا پورا کرنا واجب ہے۔

چنانچہ فیصلہ فاروقی سے یہ ثابت ہے جس کا پورا قصہ فتح الباری میں درج ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بن غنم کہتے ہیں کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا' میرا گھٹنہ ان کے گھٹنے سے لگتا تھا' ان کے پاس ایک شخص آیا' اس نے بیان کیا کہ اے امیر المومنین! میں نے اس عورت کو اس شرط پر نکاح کیا ہے کہ اس کو اس کے وطن سے دوسری جگہ نہ لے جاؤں گا۔ اب میرا ارادہ فلاں ملک کو لے جانے کا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس عورت کے لیے اس کی مقرر کردہ شرط ہے۔ اس مرد نے کہا کہ پھر مرد تو ہلاک ہو گئے' کیونکہ کوئی عورت اپنے خاوند سے طلاق نہ چاہے گی مگر طلاق دی جائے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مومن اپنی شرطوں پر قائم ہیں۔ جب ان کے حقوق کے فیصلے ہوں گے تو شرطوں پر ہوں گے۔

ترمذی میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اذا تزوج الرجل المراة وشرط ان لا يخرجها لزم۔ یعنی "جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور اس سے یہ شرط کر لے کہ اس کو شہر سے یا گھر سے یا وطن سے باہر نہ نکالے گا تو یہ شرط پوری کرنی لازم ہو گی۔"

پھر ترمذی میں لکھا ہے : وبه یقول الشافعی واحمد واسحاق یعنی "یہی فتویٰ امام شافعی اور امام احمد اور امام اسحاق کا ہے۔" اور یہی مذہب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ صحابی اور طاوس تابعی اور ابو الشعثاء تابعی کا ہے۔

محلی ابن حزم میں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایسا قضیہ آیا تو انہوں نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا' انہوں نے فرمایا لها شرطها "کہ عورت کو شرط پورا کرانے کا حق پہنچتا ہے۔" یہی مذہب قاسم بن محمد وسالم بن عبداللہ اور جابر بن زید کا ہے اور یہی شریح سے مروی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان صحابہ اور تابعین اور ائمہ محدثین کا مذہب حدیث عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے موافق ہے' اس کے خلاف بھی بعض صحابہ اور ائمہ اہل رائے کوفیوں کا مسلک ہے مگر وہ حدیث عقبہ رضی اللہ عنہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے صحیح نہیں۔

نیز ہم نے تو امام بخاری رحمہ اللہ کی تبویب اور ان کے پیش کردہ دلائل پر فیصلہ کرنا ہے کہ وہ ہمارے حق میں ہے اور کلکتوی کے سراسر خلاف ہے اور وہ تبویب بخاری جو ان کا دعویٰ ہے اور دلائل بخاری فیصلہ فاروقی اور حدیث عقبہ کو نہیں سمجھ سکے اور نہ سمجھ سکیں گے۔

مولانا کلکتوی کو غور کرنا چاہیے: کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل بھی روایت کی ہے اور قول عمر رضی اللہ عنہ بھی نقل کیا ہے۔

اب آپ بتائیں کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے جس شرط پر فیصلہ کیا ہے' وہ کتاب اللہ میں ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ آیت نقل کر دیں تاکہ اہل علم آپ کی قرآن دانی ملاحظہ کر لیں اور اگر نہیں تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شرط پر فیصلہ کیوں کیا؟ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے ایسے قول کو جس کا فیصلہ باطل شرط پر ہے' نقل کر کے استناد کیوں کیا؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے دو باب منعقد کئے ہیں' دونوں میں ہی قول فاروق رضی اللہ عنہ اور حدیث عقبہ رضی اللہ عنہ سے استدلال کیا ہے۔ اب اہل علم کو آپ کا راز کھلے گا کہ بخاری کو کون اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا فیصلہ اس کے خلاف فتح الباری میں آیا ہے' وہ میرے موافق ہے تو میں یہ کہوں گا کہ آپ وہ بات کریں جو بخاری میں آیا ہے' اس سے خارجی بات پیش نہ کریں کیونکہ ہم نے آپ کا دعویٰ بخاری سمجھنے کا باطل کرنا ہے۔

یہ اعتراض بھی آپ پر عائد ہوتا ہے جو بخاری سمجھنے کے مدعی ہیں اور کہتے ہیں کہ جس

نے بخاری سمجھی ہو' وہ بحر العلوم سعودیہ میں آئے تو آپ ہی یہ بتائیں کہ جب دوسرا قول مندرجہ فتح الباری موجود تھا تو امام المحدثین نے وہ کیوں لیا جس کی شرط کتاب اللہ میں نہیں اور بقول کلکتوی باطل ہے۔ ہم تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ فیصلہ فاروقی حدیث عقبہ کے موافق تھا' اس لیے اس کو لے لیا اور اس کے مخالف کو چھوڑ دیا گویا وہ ثابت ہی نہیں ہے۔ جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دو قول مروی ہیں۔ ایک سے یہ ثابت ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہی شمار ہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق تین ہی شمار ہیں۔ عورت حرام ہو گئی تو اہل حدیث قول اول کو لے لیتے ہیں کہ وہ حدیث مسلم کے موافق ہے اور دوسرے کو ترک کر دیتے ہیں۔ بس یہی معاملہ امام بخاری نے کیا ہے کیونکہ امام بخاری اہلحدیث تھے اور اہلحدیث کا مسلک وہی ہے جو ہم بیان کر آئے ہیں کہ حدیث عقبہ رضی اللہ عنہ اپنے اطلاق سے ہر اس شرط کو شامل ہے جو شرع میں ممنوع نہ ہو اور اس کی بناء پر عقد ہوا ہو۔ اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب شروط نکاح میں لفظ شروط صیغہ جمع سے ذکر کیا ہے تاکہ تمام شرطوں کو شامل رہے۔

اگر حدیث عقبہ رضی اللہ عنہ سے صرف مہر مالی مراد ہوتا تو پھر نہ لفظ شروط کی ضرورت تھی اور نہ فیصلہ فاروقی ذکر کرنے کی ضرورت تھی۔ امام بخاری نے شروط فی المهر میں بھی قول فاروقی لا کر یہ ظاہر کیا ہے کہ عقد کے وقت جو شرطیں طرفین طے کریں گے وہ مالی مہر کی طرح واجب الایفاء ہوں گی جیسا حدیث میں آیا ہے کہ عقد سے پہلے جو مہر اور وعدہ وغیرہ ذکر ہو' وہ عورت کا حق ہے' جس کی بناء پر استحلال فرج ہوا ہے لیکن ولی نکاح اپنی مولیہ کی رضامندی سے استفادہ کر سکتا ہے۔

جیسے حضرت شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا اور اگر مولانا کلکتوی یہ کہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دوسرا قول امام بخاری کو ملا نہ ہو گا اس لیے اس کو ذکر کر کے استناد کر لیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات بھی ہمارے موافق ہے۔ کیونکہ ہمارا مطلب بخاری سمجھنے اور سمجھانے کا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تبویب اور فیصلہ فاروقی کی نقل اور حدیث عقبہ رضی اللہ عنہ سے یہ ظاہر بلکہ ثابت ہے کہ ہر وہ شرط جو شرعاً ممنوع نہ ہو اور عقد کے وقت فریقین باندھ لیں تو اس کا ایفاء واجب ہے' اس کے خلاف کوئی مطلب کلکتوی فقاہت ظاہر نہیں کر سکتی' ان کا ملح اجاج ہمارے عذب فرات کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔

کیونکہ حدیث عقبہ رضی اللہ عنہ کے موافق فیصلہ فاروقی ماء زمزم کا حکم رکھتا ہے۔ اگر مولانا کلکتوی یہ عذر داری کریں کہ ہمارا فیصلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مطابق ہے تو اس کا رد یہ ہے کہ پھر آپ صحیح بخاری سے باہر نکل جائیں گے۔ ہمارا مقصد آپ کو صحیح بخاری کا مطلب سمجھانے کا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں سند پر غور کریں تو ایک راوی منہال بن عمرو ہے جو مخدوش ہے کہ اس میں یحیٰی بن سعید اور جوزجانی اور ابن حزم نے کلام کیا ہے اور شعبہ نے اس کو روگی ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا اور ابن حجر نے اس کو وہمی لکھا ہے تو یہ روایت مخدوش ہے۔

دوم ظاہر حدیث عقبہ رضی اللہ عنہ کے خلاف ہے۔ سوم جب قول فاروق رضی اللہ عنہ اور قول علی رضی اللہ عنہ کا مقابلہ ہو تو قول فاروق رضی اللہ عنہ کو ترجیح ہے کہ خلافت میں ان کا تقدم ہے۔ چنانچہ جمعہ کے متعلق حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا حکم ہے کہ جمعوا حیثما کنتم یعنی "تم جہاں ہو شہر یا گاؤں میں وہاں ہی جمعہ ادا کر لیا کرو۔" اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لا جمعة ولا تشریق الا فی مصر جامع۔ یعنی "جمعہ' عید بڑے شہر کے بغیر صحیح نہیں ہے۔ اب اہلحدیث قول فاروقی رضی اللہ عنہ کو قول علی رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے ہیں اور کوفی اہل رائے قول علی رضی اللہ عنہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ مسئلہ مابہ النزاع میں بھی یہی حال ہے کہ اہلحدیث فیصلہ فاروق رضی اللہ عنہ پر قائم ہیں اور اہل رائے قول علی رضی اللہ عنہ پر قانع ہیں۔

مولانا کلکتوی کوفیوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بھی شریک ہیں۔ پس فیصلہ فاروق رضی اللہ عنہ راجح ہے اور اس پر اہلحدیث قائم ہیں اور فیصلہ فاروقی رضی اللہ عنہ دو قاعدوں کی رُو سے صحیح ہے اور وہ دو قاعدے شریعت میں ثابت شدہ ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں : ودل علیهما کتاب اللّٰہ وسنة رسوله واقوال الصحابة۔ یعنی "ان دو قاعدوں کے صحیح ہونے پر قرآن وحدیث واقوال صحابہ ناطق ہیں۔" یہ ہر دو قاعدے پہلے اعلام سے نقل کر چکا ہوں' جن میں سے ایک یہ ہے کہ جو شرط جائز ہو اور مخالف کتاب اللہ نہ ہو تو اس کا ایفاء لازم ہے پھر دلائل اور نظائر سے اس کو ثابت کیا ہے مثلاً نذر میں یہ قاعدہ ہے کہ اگر قبل از نذر کوئی فعل جائز اور طاعت الٰہی میں داخل ہے تو نذر سے وہ لازم ہو جائے گا پھر فرماتے ہیں :

وکذالک کل شرط قد جاز بذله بدون الاشتراط لزم بالشرط فمقاطع الحقوق عند الشروط۔ یعنی "مسئلہ نذر کی طرح یہ مسئلہ ہے کہ ہر شرط کہ بغیر شرط کے اس کا بخشش کرنا" عمل میں لانا جائز ہے تو شرط کرنے سے وہ لازم ہو جائے گا۔ کیونکہ حقوق کے فیصلے شرطوں پر کیے جاتے ہیں اور مسند احمد اور سنن کے حوالہ سے یہ حدیث اعلام جلد۔۳' ص۔۴۰۰ میں منقول ہے کہ حضرت سفینہ صحابی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا غلام تھا انہوں نے مجھ سے یہ فرمایا: اعتقعک واشترطت علیک ان تخدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی "میں تجھے آزاد کرتی ہوں اور تجھ سے یہ شرط کرتی ہوں کہ تو تازندگی آنحضور ﷺ کی خدمت کرتا رہے گا۔" سفینہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر آپ شرط نہ کریں تب بھی یہ بندہ آنحضور ﷺ کی خدمت تازندگی کرتا رہتا پھر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے سفینہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کر دیا اور اس سے خدمت نبوی کی شرط کر لی۔

اب مولانا کلکتوی فرمائیں کہ آزادگی میں دوسرے کی خدمت شرط کرنا کتاب اللہ سے ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی دلیل کتاب اللہ سے پیش کریں اور اگر یہ شرط بلفاظہ قرآن میں نہیں ہے تو پھر بقول آپ کے یہ شرط باطل ہونی چاہیے۔

مگر علامہ ابن القیم کے قاعدہ کی رُو سے یہ شرط کتاب اللہ میں اصولاً ہے کہ کسی ادنیٰ مسلمان کی خدمت کرنا نیکی ہے تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت عمر بھر کرنا سب سے بڑی نیکی ہے تو اس کی شرط کرنا جائز اور اس کا ایفاء واجب ہوا۔ ٹھیک اسی طرح نابینی عورت کی خبر گیری اور پرورش جائز اور موجب ثواب اور اس سے وعدہ کر کے پورا کرنا اخلاقاً ضروری ہے جیسا کہ مولانا کلکتوی نے اس کا اعتراف کیا ہے تو پھر اس کی شرط کرنا جائز اور اس کا ایفاء واجب ہو گا۔ یہی ہمارا دعویٰ تھا جو الحمدللہ کتاب وسنت سے ثابت ہوا بلکہ صحیح بخاری سے ثابت ہوا۔

چنانچہ علامہ ابن القیم جلد۔۳' ص۔۴۰۰ میں فرماتے ہیں: وذکر البخاری فی صحیحہ عن عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ قال مقاطع الحقوق عند الشروط ولک ما شرطت۔ یعنی "امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ حقوق کا فیصلہ کرنا وقت شرطوں کے ہے اور تجھے وہی پورا کرنا لازم ہے جو تو نے کی ہے۔"

پس شیخ الاسلام امام ابن القیم رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کے بابوں اور احادیث کا وہی مطلب سمجھا ہے جو ہم نے سمجھا ہے اور آپ نے جو سمجھا ہے وہ غلط سمجھا ہے اور وہ امام بخاری کے خلاف ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

آپ نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریرہ رضی اللہ عنہا کی بابت شرط کر لی تھی پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور شرط کو توڑ دیا' یہ استدلال سراسر غلط ہے کیونکہ ان لوگوں کی شرط خلاف شرع تھی جس کا توڑنا ضروری تھا کیونکہ قانون یہ تھا کہ الولاء لمن اعتق۔ یعنی "ولاء اس کی ہے جو لونڈی' غلام آزاد کرے۔" چونکہ آزاد کرنے والی حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا تھیں تو ولاء حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کی تھی' ان کا اپنے لیے شرط کرنا ممنوع ہوا' جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لغو کر دیا۔ لیکن ہمارے پاس استفتاء آیا ہے اس میں کوئی شرط ممنوع نہیں ہے' صرف ساس نابینی کی خبر گیری اور پرورش کی شرط کی گئی ہے اور نابینی عورت ہو یا مرد اس کی خدمت اور خبر گیری ممنوع نہیں بلکہ کار ثواب ہے تو یہ استدلال باطل ہوا۔

ہاں ہماری دلیل حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا والی کہ سفینہ رضی اللہ عنہ سے یہ شرط کی کہ میں نے تجھے آزاد کیا' اس شرط پر کہ تازندگی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا رہے' یہ دلیل ہمارے دعویٰ سے چسپاں ہے کہ اس میں شرط جائز ہے جو شرعاً ممنوع نہیں ہے مگر کتاب اللہ میں بلفظہٖ موجود نہیں ہے تو موجود ہونے کا یہ مطلب لینا کہ وہ شرط بالفاظہ قرآن میں ہو' سراسر غلط ہے۔ کتاب اللہ میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا جواز عموم حکم قرآن سے ظاہر ہو اور اس کی ممانعت کتاب وسنت میں نہ آئی ہو۔ ایسی شرطیں جو ممنوع ہوں' ان کا ایفاء بحکم اوفوا بالعہد اور اوفوا بالعقود واجب ہے اور نکاح میں شرط ہونے سے حدیث عقبہ رضی اللہ عنہ سے اور اہمیت بڑھ گئی تو ایفاء زیادہ لازم ہو جائے گا' فتذکروا۔

مولانا کلکتوی اگر علم کامل سے کام لیتے تو پہلے نابینی ساس کی خبر گیری ممنوع ثابت کرتے اور پھر اس کا شرط کرنا حرام اور ممنوع ثابت کرتے پھر حدیث بریرہ رضی اللہ عنہا والی پیش کر کے استدلال کرتے لیکن ایسا کرنا آپ سے ممکن نہ تھا تو غلط طریقہ اختیار کر لیا کہ شرط ممنوع پر شرط غیر ممنوع کو قیاس کرنے لگے' یہ قیاس مع الفارق ہے جو مردود ہے۔

لہٰذا آپ کا تعاقب صحیح نہیں ہوا۔ حدیث بریرہ رضی اللہ عنہا جس کو آپ نے بیجا طور پر پیش

کیا ہے' ان احادیث مشکلہ سے ہے جس کی توجیہ میں محدثین حیران ہیں کہ جب شرط فاسد اور باطل تھی تو آنحضور ﷺ نے عقد میں ایسی شرط کرنے کا اذن کیوں دیا؟ اس کی توجیہیں مختلف کی گئی ہیں' جن پر اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ امام نووی نے ایک اقوی الاجوبہ لکھا ہے کہ یہ حکم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہی مخصوص تھا تاکہ اسی طرح شرط کرا کر ان لوگوں کو زجر اور توبیخ کر کے ادب سکھلایا جائے کہ ایسی باطل شرطیں عقد میں نہ کیا کریں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تو پھر آئندہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر مسلمانوں نے ایسی فاسد شرطیں بند کر دیں۔

مولانا کلکتوی شاید ایسا عمل اپنے معاملات میں رکھتے ہوں گے کہ عقدوں میں فاسد شرطیں کر کے پھر توڑ دیتے ہوں گے لیکن ہم تو اس کو باعث فتنہ وفساد تصور کرتے ہیں۔ اگر تجربہ کرنا ہو تو مولانا گاؤں میں آ کر کسی زمیندار سے فاسد شرط کر کے پھر اس کو توڑ دیں اور یہ کہیں کہ میں اہل حدیث ہوں اور میں نے حدیث بریرہ رضی اللہ عنہا پر عمل کیا ہے۔ آؤ اب تم کو خطبہ سناؤں پھر اس کا نتیجہ کیا ہو گا وہ اظہر من الشمس ہے تو وہ زمیندار کہے گا کہ ان مولوی صاحب نے فلاں چیز کی بیع یا زمین کے ٹھیکہ کا معاملہ کیا تھا اور اس میں فلاں شرط زبان سے پختہ کر کے طے کر لی تھی' اب انہوں نے وہ شرط توڑ دی ہے اور ہمارے ساتھ غدر اور غداری کر رہا ہے۔ مولانا سے لوگ بیان لیں گے تو مولانا یہ فرمائیں گے کہ مسجد میں چلو میں یہ مسئلہ خطبہ میں بیان کروں گا۔ عوام کہیں گے کہ مولانا! یہ وقت جمعہ یا عید یا جلسہ کا نہیں ہے کہ ہم آپ کا وعظ سنیں' یہ وقت تو فریقین کے نزاع کا فیصلہ کرنے کا ہے۔ اگر آپ بیان نہ دیں گے تو یہ شخص غلط طریقہ استعمال کرے گا پھر آپ ان کو واقعہ بریرہ رضی اللہ عنہا سنا کر مسئلہ بتائیں گے کہ عوام کہیں گے کہ مولانا یہ ایسی حدیث آپ کہاں سے لے آئے' اس سے تو وعدہ خلافی اور عہد شکنی' جھوٹ بولنے کا جواز نکلتا ہے' ہم تو پہلے ہی اس کے عادی ہیں کہ ہمیشہ وعدہ خلافیاں' عہد شکنیاں' فریب کاریاں کرتے ہیں' مگر ان کو گناہ نہیں خیال کرتے ہیں۔ اب آپ حدیث سے ایسے کاموں کا ثبوت دینے لگیں تو ہم ان کاموں کو گناہ بھی نہ سمجھیں گے۔

غرض اس وقت حدیث بریرہ رضی اللہ عنہا پر عمل کرنا باعث فساد ہے۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان ہے کہ حدثوا الناس ما تعرفون اتحبون ان یکذب اللہ ورسولہ۔ (رواہ

البخاری) یعنی "لوگوں سے وہ احادیث بیان کرو جن کو وہ سمجھ سکیں' ایسی احادیث بیان نہ کرو جو اُن کے دماغ میں نہ آسکیں۔" کیا تم ایسی احادیث سنا کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تکذیب کرانا چاہتے ہو؟

میں کہتا ہوں کہ واقعہ بریرہ رضی اللہ عنہا پر تو اہل علم یہ کہہ رہے ہیں : قد استشکل صدور الاذن منہ صلی اللہ علیہ وسلم بشرط فاسد فی البیع۔ اس لیے امام شافعی نے تو اس روایت کے ثبوت کا ہی انکار کر دیا ہے' جس میں شرط فاسد کے اذن کا ذکر ہے۔ بعض نے مختلف توجیہات کی ہیں' ملاحظہ ہو نیل الاوطار جلد۔۵' ص۔۱۸۱ تو پھر عوام حیران کیوں نہ ہوں گے اور منکرین حدیث برے نتیجے نکال نکال کر گمراہ کیوں نہ کریں گے پھر اس واقعہ کا تعلق مسئلہ مابہ النزاع سے کچھ بھی نہیں ہے' کیونکہ حافظ قرآن نے جو شرط اپنی ساس نائینی سے کی ہے' وہ جائز ہے باطل نہیں ہے۔ چنانچہ مولانا گنگوہی نے اس کا اعتراف کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ "ساس کی پرورش ایک الگ بات ہے' یہ وعدہ کے خلاف ہے' اخلاقاً شرعاً قابل مواخذہ ہے' نہ یہ کہ نکاح فسخ ہے۔"

مولانا کی اس عبارت کا مطلب بالکل صاف ہے کہ ناکح نے جو اپنی ساس کی پرورش کا وعدہ کیا ہے' اس کو پورا نہ کرنا وعدہ خلافی ہے اور اخلاقاً و شرعاً یہ وعدہ خلافی قابل مواخذہ ہے مگر نکاح فسخ نہیں ہو گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شرط فاسد اور باطل نہیں ہے۔ جیسے بریرہ رضی اللہ عنہا والی شرط باطل تھی کہ نہ اس کا پورا کرنا جائز تھا اور نہ قابل مواخذہ تھی' اس لیے خطبہ میں اس کی تردید کر کے اس کو توڑ دیا گیا۔ مولانا نائینی کی پرورش کی شرط کو وعدہ قرار دیتے ہیں اور اس کے خلاف کو قابل مواخذہ ٹھہراتے ہیں تو پھر واقعہ بریرہ رضی اللہ عنہا اور واقعہ ساس نائینی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس سے کوئی عالم باللہ وعالم بامر اللہ استدلال نہیں کر سکتا۔ ہاں کوئی نام کا علامہ واقعہ بریرہ رضی اللہ عنہا سے واقعہ نائینی پر دلیل لائے تو یہ ممکن ہے مگر اہل علم میں اس کی کوئی وقعت نہ ہو گی۔

شرط نائینی کا ایفا اخلاقاً و شرعاً درست ہے اور خلاف قابل مواخذہ ہے۔ اس سے تغیر شرع لازم نہیں آتی اور واقعہ بریرہ رضی اللہ عنہا میں شرط کا ایفا جائز نہ تھا اور شرط کو پورا کرنے سے تغیر حکم شرع لازم آتا تھا' اس لیے اس باطل شرط کو دفع کر دیا گیا لیکن نائینی کی شرط کا دفع کرنا جائز نہیں کہ قابل مواخذہ ہے' پس ایفا واجب ہوا۔ قرآن میں ہے : اوفوا بالعھد کہ

مد کو پورا کرو۔

شیخ الاسلام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ زاد المعاد جلد چہارم ص۔۴ میں رقمطراز ہیں اور حدیث عقبہ ق الشروط نقل کر کے یہ فرماتے ہیں : فیتضمن ھٰذا الحکم وجوب الوفاء بالشروط تی شرطت فی العقد اذا لم تتضمن تغییرا لحکم اللّٰہ ورسولہ۔ یعنی "حدیث عقبہ ؓ میں جو حکم ہے یہ ان شرطوں کو پورا کرنے کو واجب قرار دے رہا ہے جو عقد میں کی باتی ہیں اور ان کو پورا کرنے سے اللہ اور رسول کا کوئی حکم شرعی نہیں بدلتا۔" مثلاً ناکح اپنی ساس تایبنی والی شرط پوری کرتا رہتا تو اس سے کوئی حکم شرعی نہیں بدلتا تھا بلکہ عدم ایفا سے واخذہ ہے' کما تقدم۔

باقی رہا عدم ایفاء سے نکاح فسخ ہونا سو یہ قاعدہ اذا فات الشرط فات المشروط سے ابت ہے کہ جب شرط فوت ہو جائے تو مشروط فوت ہو جاتا ہے اور انتفاء شرط سے انتفاء شروط ہو جاتا اہل علم میں مسلم ہے جس پر فیصلہ فاروقی "مقاطع الحقوق عند الشروط" اطق ہے۔ زاد المعاد میں ہے : متی لم یف بہ فلھا الفسخ عند احمد۔ یعنی "جب شرط کو اکح نے پورا نہ کیا تو عورت کو اختیار فسخ کا حاصل ہے۔"

علامہ ابن القیم اغاثۃ اللھفان جزء ثانی کے ص۔۲۰ میں لکھتے ہیں : المثال الثلاثون ذا تزوجھا علی ان لا یخرجھا من دارھا او بلدھا او لا یتزوج علیھا ولا یتسری علیھا فالنکاح صحیح والشرط لازم۔ ھٰذا اجماع الصحابۃ رضی اللّٰہ عنھم فانہ صح عن عمر وسعد ومعاویۃ ولا مخالف لھم من الصحابۃ وذھب عامۃ التابعین وقال بہ احمد۔ یعنی "تیسویں مثال یہ ہے کہ جب کسی شخص نے کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ اس کو اس کے گھر سے یا شہر سے باہر نہ لے جائے گا' یا یہ شرط کہ اس پر کسی دوسری عورت سے نکاح نہ کرے گا اور نہ لونڈی لائے گا تو یہ نکاح صحیح ہے اور شرط لازم واجب العمل ہے اور اس پر صحابہ کا اجماع ہے کہ حضرت عمر اور سعد اور معاویہ رضی اللہ عنہم سے روایات آئی ہیں اور صحابہ میں سے کوئی ان کے مخالف معلوم نہیں ہوا ہے اور عام تابعین بھی اسی مسلک پر ہیں اور یہی امام احمد کا مذہب ہے۔"

امام شوکانی در رہبیہ جلد۔۲' ص۔۵۵ مع شرح میں یہ فرماتے ہیں : ویجب علی الزوج الوفاء بشرط المرأۃ الا ان یحل حراما او یحرم حلالا۔ یعنی "خاوند پر وہ شرط

پوری کرنی واجب ہے جو نکاح کے وقت عورت سے کی ہے مگر اس شرط کا پورا کرنا واجب نہیں ہے جو حرام چیز کو حلال کر دے یا حلال کو حرام بنا دے۔" پھر شرح درر مضیہ میں اس مسئلہ شرط پر حدیث عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی پیش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب شرطوں سے پورا کرنے کے زیادہ لائق وہ شرطیں ہیں جن کے ذریعے سے تم شرمگاہوں کو حلال کرتے ہو۔

پس نابینی والی شرط کا ایفا اس کے داماد پر واجب ہے کیونکہ اس شرط سے نہ تو حلال حرام ہوتا ہے اور نہ حرام حلال کیا جاتا ہے بلکہ نابینی کی خبر گیری موجب ثواب ہے۔ اگر شرط کا خلاف کیا تو قیامت میں مواخذہ ہو گا اور دنیا میں غداری کا جرم عائد ہو گا اور ناکح کی بے اعتباری اور غداری ظاہر ہو گی۔ ایفائے شرط پر یہ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی بھی علی الاطلاق ناطق ہے: عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم المسلمون علٰی شروطھم۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی والحاکم) یعنی "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان لوگ اپنی شرطوں پر قائم ہیں۔"

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا اپنی شرطوں پر قائم رہنا ضروری ہے جو وہ آپس میں طے کر لیں۔ اب شرطوں کی فہرست کتاب اللہ میں نہیں ہے جس میں ہر شرط بلفظہ مذکور ہو بلکہ اصولاً موجود ہونا ہی کافی ہے۔ پھر ہم نے قصہ موسیٰ وشعیب علیہما وعلٰی نبینا الصلوٰۃ والسلام' کتاب اللہ سے پیش کیا کہ انہوں نے جو مناکحت کی تھی وہ بھی آٹھ دس سال کی خدمت سے مشروط تھی۔ اس مناکحت کو اللہ تعالیٰ نے صحیح قرار دے کر واقعتاً قرآن کریم میں بیان کیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام بھی مکفوف البصر ہونے کی وجہ سے معذور تھے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے آٹھ دس سال بکریاں چرانا نکاح میں شرط کر لی تھی اور ملتانی ناکح کی ساس بھی مکفوف البصر تھی' اس نے بھی معذورہ ہونے کی وجہ سے اپنی لڑکی کے نکاح میں یہ شرط کر لی کہ تازندگی میری لڑکی کے پاس مجھے رکھ کر خبر گیری کرنی ہو گی۔ پس پہلی صورت دوسری صورت کے لیے نظیر ہے تو حمل النظیر علی النظیر کے بطور میں نے اس مسئلہ میں شرط کا جواز قصہ شعیب علیہ السلام سے ثابت کیا جس سے علامہ صاحب تیز ہو گئے اور لکھا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کا واقعہ بیان کر کے اپنے علم کو ضائع کر دیا' وہ قبل نکاح تھا اور وعدہ تھا کہ بھائی اگر تم کچھ میری خدمت کرو گے تو وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی لڑکی کا

نکاح دے دوں گا۔

حضرت علامہ صاحب! حضرت شعیب علیہ السلام کی مناکحت میں جو شرط ہوئی اور اس کے عوض مناکحت واقع ہوئی' اس کو سرسری وعدہ عام وعدوں کی طرح تصور کر رہے ہیں حالانکہ سورہ قصص میں قصہ شعیب و موسیٰ علیہما السلام کا وارد ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچے تو ان کے گھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مزدور رکھنے کا مشورہ ہونے لگا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی ایک بیٹی نے اپنے والد بزرگوار سے عرض کیا کہ ابا جی! اس شخص کو نوکر رکھ لیجئے کہ بہترین نوکر وہی ہوتا ہے جو طاقتور اور امانت دار ہو' یہ ایسا ہی ہے۔

چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یوں خطاب فرمایا : اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَكَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ وَمَا اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ۔ اس کا ترجمہ قرآن مترجم ثنائی میں یوں لکھا ہے۔ "میں چاہتا ہوں کہ ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کر دوں' اس شرط پر کہ تو اس کے مہر کے عوض میں آٹھ سال میرا کام کرے اور اگر تو دس سال تک کر دے گا تو یہ تیری طرف سے احسان ہو گا مگر میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر مشقت ڈالوں۔"

جب حضرت شعیب علیہ السلام نے یہ شرط پیش کی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ جواب دیا جو بمع ترجمہ ثنائی درج ذیل ہے : قَالَ ذٰلِكَ بَیْنِیْ وَبَیْنَكَ ؕ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ؕ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا یہ بات میرے اور آپ کے درمیان مقرر ہو چکی' ان دونوں میعادوں میں سے جو میعاد میں پوری کروں تو مجھ پر کسی طرح کا جبر نہ ہو اور اللہ تعالیٰ ہمارے کلام پر گواہ اور ذمہ دار ہے۔"

یہ ترجمہ مولانا ثناء اللہ صاحب فاضل امرتسری کا ہے۔ آپ کے ترجمہ سے یہ ظاہر ہوا کہ مناکحت شعیب علیہ السلام میں آٹھ دس سال تک کام کرنے کی شرط حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ذکر ہوئی جس کو انہوں نے منظور فرما کر اس پر اللہ تعالیٰ کو گواہ اور ذمہ دار ٹھہرایا اور یہ شرط نکاح کا عوض قرار پائی۔ یاد رکھئے عربیت کا قاعدہ ہے کہ کلمہ علیٰ مستعمل بمعنی الشرط قال اللہ تعالیٰ "یبایعنک علی ان لا یشرکن باللّٰہ شیئا لان الجزاء لازم للشرط (نور الانوار ص۔۱۳۹) یعنی "کلمہ علیٰ شرط کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی بیعت کے سلسلہ میں فرمایا ہے کہ عورتیں آپ سے اس شرط پر بیعت کریں کہ وہ اللہ

کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی وغیرہ وغیرہ۔ تو آپ ان کو بیعت کر لیں' جیسے یہاں لفظ علیٰ شرط کے لیے آیا ہے' ایسے ہی کلام شعیب علیہ السلام میں کلمہ علیٰ شرط کے معنی میں آیا ہے۔

جناب مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رفیق ندوۃ المصنفین دہلی نے ایک کتاب قصص القرآن لکھی ہے جو اہل علم میں بہت مقبول ہے کیونکہ وہ متعدد تفاسیر کے پیش نظر نہایت تحقیق سے انبیاء کے واقعات لکھتے ہیں۔ انہوں نے قصص القرآن کی جلد اول' ص۔ ۳۵۴ میں قصہ شیخ مدین سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رشتہ مصاہرت لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اگر تم آٹھ سال تک میرے پاس رہو اور میری بکریاں چراؤ تو میں اپنی بیٹی کی تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں اور اگر تم اس مدت کو دو سال بڑھا کر دس سال کر دو تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی اس لڑکی کا مہر ہو گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ (تا آخر)

طرفین کی اس منظوری کے بعد بزرگ میزبان نے اس بیان کردہ مدت کو مہر قرار دے کر موسیٰ علیہ السلام سے اپنی اس بیٹی کی شادی کر دی۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مدت ختم ہونے پر عقد عمل میں آیا اور عقد کے فوراً بعد ہی موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کو لے کر روانہ ہو گئے۔ پھر آیات سورہ قصص کی نقل کر کے ترجمہ کیا ہے۔ "میں چاہتا ہوں کہ بیاہ دوں تجھ کو ایک بیٹی اپنی اس شرط پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ برس۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ دونوں بزرگوں کے درمیان شرط پر مناکحت ہوئی تھی۔ محض وعدہ سرسری نہ تھا۔ تفسیر معالم التنزیل میں ہے : ذالک بینی وبینک یعنی ھذالشرط بینی وبینک فما شرطت علیی فلک وما شرطت عن تزویج احدھما فلی الامر بیننا۔ اسی طرح تفسیر خازن میں ہے' یعنی یہ مشروط عہد آپ کے اور میرے درمیان قرار پایا ہے۔ پس جو شرط آپ نے میرے ذمہ لگائی ہے وہ آپ کا حق ہے اور جو آپ نے اپنی بیٹی نکاح دینے کی شرط کی ہے' وہ میرے لیے ہے۔ یہ معاہدہ یا شرط ہمارے درمیان قائم ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے : فانا ان فعلت اقلھما فقد برئت من العھد وخرجت من الشرط۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر میں اقل مدت آٹھ سال پوری کر دوں گا تو اس عہد سے بری اور شرط کے ذمے سے پاک ہو جاؤں گا۔ اس تصریح سے یہ خوب ثابت ہوا کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی لڑکی شرطیہ معاہدہ پر دی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ سے زائد دس سال تک اس شرط کو استحساناً پورا کیا اور نکاح ہوا۔

ٹھیک اسی طرح ناہینی ساس لڑکی منکوحہ کا شرطیہ عہد ناکح حافظ سے ہوا' یہ جائز تھا۔ لیکن اس نے غداری کی' لہٰذا نکاح قابل فسخ ہے اور علامہ صاحب کا یہ کہنا کہ یہ شرطیہ معاہدہ نہ تھا اور نکاح اس کے عوض نہ ہوا' سراسر باطل ہے۔

مخفی نہ رہے کہ نکاح سے پہلے جو شرط اور عہد ہو یا عطیہ دیا جائے' وہ لڑکی کا حق ہوتا ہے لیکن لڑکی کی رضامندی ہے جبکہ وہ اپنے ولیکے ساتھ ہو' ولی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور شرط اور مال جو کچھ عقد سے پہلے فریقین میں قرار پائے وہ تمام مہر اور نکاح کا عوض تصور ہوتا ہے۔ خواہ شرط پہلے پوری کرا کر عقد کیا جائے' خواہ عقد پہلے کیا جائے اور شرط بعد میں پوری کی جائے' ہر دو طرح جائز ہے۔ حدیث عقبہ رضی اللہ عنہ اس پر ناطق ہے' مہر کی کوئی ولی اور منکوحہ کی باہمی رضامندی سے جس قدر نکاح کا عوض قرار پائے گا ناکح کو منظور کرنے کے بعد دینا پڑے گا۔ ناہینی کی پرورش جو منکوحہ کی والدہ ہے' مہر میں داخل ہے۔ اگر ساتھ مالی مہر بھی مقرر ہو تو کچھ حرج نہیں ہے کہ مہر کی کوئی حد شرع نے مقرر نہیں کی۔

سبل السلام جلد-۳' ص-۱۳۳ میں ہے : فیصح بکل ما تراضی علیہ الزوجان او من الیہ ولایۃ العقد فیہ منفعۃ۔ یعنی "ہر وہ چیز جس پر زوجین یا ولی نکاح راضی ہو جائیں اور اس میں نفع حاصل ہو' اس پر ہی نکاح کرنا صحیح ہے۔" یہ حسن اتفاق ہے کہ اس ناکح کی ساس ناہینی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر نابینے' دونوں نے لڑکیوں کی رضامندی سے اپنے لیے نفع کی بات ٹھہرالی۔ جس پر دونوں راضی ہو گئے تو نکاح ہو گیا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وفاداری کی اور حافظ ناکح نے ناہینی ساس سے غداری کی تو نکاح قابل فسخ ہو گیا جبکہ منکوحہ اور اس کی والدہ فسخ چاہیں' کیونکہ نکاح شرط پر معلق ہے۔ شرط ٹوٹ گئی تو مشروط ٹوٹ گیا۔

جیسے اعلام میں لکھا ہے کہ ولا ریب ان الحکم المعلق بالشرط ینتفی عند انتفائہ۔ یعنی "حکم معلق بالشرط شرط کے انتفاء سے منتفی ہو جائے گا۔" جیسے وضو نماز کے لیے شرط ہے تو وضو کے منتفی ہونے پر نماز منتفی ہو جائے گی۔ اگرچہ ثبوت تو اس بات کا کافی ہو چکا ہے کہ حضرت موسیٰ اور شعیب علیہما السلام کی طرف سے مناکحت مشروط تھی لیکن ہم چاہتے ہیں کہ مسئلہ ہذا خوب اچھی طرح واضح ہو جائے' اس لیے مزید ثبوت کے لیے سنئے :

اعلام الموقعین جلد سوم' ص-۳۹۹ میں ارشاد فرماتے ہیں : وتعلیق النکاح بالشرط فی

تزویج موسیٰ بابنتہٖ صاحب مدین وھو من اصح نکاح علی وجہ الارض۔ یعنی "نکاح کو شرط کے ساتھ معلق کرنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مناکحت میں ہے جو مدین کے بزرگ کی بیٹی کے ساتھ ہوئی اور یہ وہ نکاح ہے جو روئے زمین پر سب سے صحیح تر نکاح ہے۔"

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے شرط پر نکاح کرنے کے ثبوت میں اس واقعہ کو پیش کیا ہے اور میں نے بھی اپنے فتویٰ میں تابینی کے شرطیہ نکاح کو اسی واقعہ سے ثابت کیا ہے تو علامہ صاحب بول اٹھے کہ مولانا حصاری نے اس استدلال سے اپنا علم ضائع کر دیا۔ اب وہ بتائیں کہ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کا علم رہ گیا تھا یا ضائع ہو گیا تھا؟

میرے فتویٰ پر بعض علماء نے یہ کہا کہ یہ سابقہ شریعت کا قصہ ہے' ہمارے لیے حجت نہیں۔ اس کا جواب بندہ نے ان کو تفسیر فتح القدیر للشوکانی کے حوالہ سے لکھ دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اکابر انبیاء کے اسمائے گرامی ذکر فرما کر آخر میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطاب فرمایا کہ فبھداھم اقتدہ یعنی "آپ بھی سابقہ انبیاء کی پیروی کریں۔"

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ ایک صحابی کا بیان ہے : کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یحب موافقۃ اھل الکتاب فیما لم یؤمر بہ۔ یعنی "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب تک کوئی حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہ ہوتا تھا تو اہل کتاب کی موافقت کو دوست رکھتے تھے۔"
علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ اہل علم کا اس میں اختلاف ہے کہ سابقہ شریعت ہمارے لیے لازم الاتباع ہے یا نہیں۔ پھر جواب یہ دیا ہے : فذھب الجمھور الٰی انہ یلزمنا اذا لم ینسخ وھو الحق۔ یعنی "جمہور علماء یہ کہتے ہیں کہ ہم کو سابقہ شریعت پر عمل کرنا لازم ہے (کہ وہ بھی منزل من اللہ ہے) جب تک کہ اس شریعت کا کوئی حکم ہماری شریعت منسوخ نہ کرے' یہ مسلک حق ہے۔"

میرے اس فتویٰ کی تائید علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ارشاد مناکحت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرے کے بعد یہ ہے : ولم یات فی شریعتنا ما ینسخہ بل اتت مقررۃ لہ کقولہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان احق الشروط ان توفوا ما استحللتم بہ الفروج فھٰذا صریح ان حل الفروج بالنکاح قد یعلق علٰی شرط۔ یعنی "ہماری شریعت میں کوئی ایسا حکم نازل نہیں ہوا جس سے تزویج موسیٰ کی صورت منسوخ قرار دی جائے بلکہ اس کو ہماری شریعت نے برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ تمام شرطوں

سے زیادہ حق ان شرطوں کے پورا کرنے کا ہے جس کی بناء پر تم نے عورتوں کی شرمگاہیں حلال کی ہیں' یہ صریح حکم ہے کہ عورتوں کی شرمگاہوں کا نکاح کے ساتھ حلال ہونا شرط کے ایفاء پر معلق ہے۔"

پھر اس کے بعد فرماتے ہیں : ونص الامام احمد علی جواز تعلیق النکاح بالشرط وھذا ھو الصحیح کما یعلق الطلاق والجعالة والنذر وغیرھا من العقود۔ یعنی "امام احمد نے یہ تصریح کی ہے کہ نکاح کو کسی شرط کے ساتھ معلق کرنا جائز ہے' یہی مسلک صحیح ہے' جیسا کہ طلاق اور مزدوری کا معاملہ اور نذر وغیرہ عقود شرطوں پر جاری ہیں۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث بھی بالعموم اسی پر ناطق ہے : المسلمون علی شروطھم الا شرطا احل حراما او حرم حلالا۔ یعنی "مسلمان اپنی شرطوں پر قائم رہتے ہیں مگر ایسی شرط کہ جو حرام کو حلال کرے یا حلال کو حرام کرے تو اس کا ایفاء ناجائز ہے۔" تاپنی نے جو اپنے داماد سے شرط کی ہے' وہ نہ تو حلال کو حرام کرتی ہے اور نہ حرام کو حلال کرتی ہے' اس لیے اس کا ایفاء واجب ہے اور اس کی نظیر قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تزویج کا ہے کہ اس میں آٹھ سال تک بکریاں چرانے کی شرط کی گئی تھی' یہ عوض نکاح کا تھا۔

چنانچہ سلطان العلماء امام محدث فقیہہ ابو محمد عز الدین عبدالعزیز بن عبدالسلام سلمی اپنی کتاب قواعد الاحکام جلد۔۲' ص۔۳۲ میں اجارہ منافع بالمنافع کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں : وکما انکح شعیب ابنته من موسیٰ برعی عشر حجج مقابل منافع البضع بالرعی کما قابل صلی اللہ علیه وسلم منافع البضع بتعلیم القرآن۔ یعنی "جیسے حضرت شعیب علیہ السلام نے اجارہ کا معاملہ کیا کہ اپنی بیٹی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نکاح میں دے دی اور دس سال بکریاں چرانا اُجرت ٹھہرائی یہ منافع بضع کا بکریاں چرانے کے مقابلہ میں ہوا' جیسے ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافع بضع کو تعلیم قرآن کے عوض میں ٹھہرایا تھا۔"

اب علامہ صاحب کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ سلطان العلماء کا علم ضائع ہو گیا یا رہ گیا ہے؟ اگر کوئی سلیم العقل شخص ہو تو مولانا سے مثل سن لے اور پھر ان کے علم و عقل کا موازنہ کرے کہ ان میں کون سی زیادہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں جیسے ہم کہیں کہ مولانا عبدالقادر صاحب آپ ہم کو اپنے نکاح میں ضرور بلوائیے گا' مولانا نے ہم سے کہا کہ میں نکاح ہی تب کروں گا جب تم لوگ آؤ گے۔ اب اتفاق سے ہم نے سوچا کہ کراچی سے اتنی دور کون

جائے اور ادھر مولانا کی شادی قرار پا کر قاضی صاحب نے نکاح پڑھا دیا۔ جب کسی دوسرے مولوی کو معلوم ہوا کہ مولانا حصاری نے یہ کہا تھا کہ تمہارے آئے بغیر نکاح نہ کروں گا' لہذا نکاح حصاری کا فسخ۔ مولانا اس فتوے کو جائز قرار دیں گے یا ایسے مفتی مولوی کا مذاق اُڑائیں گے؟

مولانا مفتی پاکستان کی یہ مثال بالکل بے محل ہے۔ کہاں رہا فریقین مناکحت کا انعقاد نکاح کی شرطیں طے کرنا جو عوض بمقابلہ نکاح ہیں اور کہاں رہی یہ بات کہ دوستوں یاروں کی شمولیت شادی کو اپنے یاروں کے ساتھ شرط کرنا۔ اصل مثال یوں دینی چاہیے کہ کسی شخص نے کسی کی لڑکی کا اپنے لڑکے کے لیے رشتہ طلب کیا۔ اس نے منظور کر لیا لیکن یہ شرط کی کہ دس سال تک میری دکان پر کام کرے اور میرے ساتھ رہے۔ اس نے اور لڑکے نے یہ شرط منظور کر لی اور نکاح ہو گیا۔ لڑکے نے کام کرنا شروع کیا اور لڑکی کے ساتھ خلوت بھی ہو گئی مگر سال چھ ماہ بعد لڑکا کام سے گھبرا گیا اور دکان چھوڑ کر کہیں چلا گیا' پھر اس نے اس کو بلایا کہ لڑکا شرطیہ معاہدہ توڑ گیا ہے' اب کیا معاملہ کیا جائے؟ باپ نے لڑکے کو بلا کر کہا کہ شرط پوری کرو' اس نے کہا کہ میں دس سال تک سسر کا قیدی رہنا نہیں چاہتا۔ میں نے تو حدیث بریرہ رضی اللہ عنہا پر عمل کر کے اس کی لڑکی کو نکاح میں لینا تھا' لے لیا' یہ شرط باطل ہے۔ خسر صاحب مجھے لڑکی عنایت کر دیں تاکہ میں اس کو اپنے گھر لے جاؤں۔ اب مفتی پاکستان صاحب سے فتویٰ طلب کیا گیا کہ نکاح فسخ ہوا یا نہیں؟

مولانا آپ کی مثال ممثل لہ کے مطابق نہ ہونے سے باطل ہوئی اور نابینی کی شرط جو منکوحہ کی والدہ کی خدمت استحلال فرج کا موجب ہے۔ اگر ناکح عقد نکاح کے وقت اس شرط کے ماننے سے انکار کر دیتا تو وہ استحلال فرج نہ کر سکتا یعنی نکاح نہ کیا جاتا اور قاعدہ اذا فات الشرط فات المشروط پر عمل ہو جاتا۔ مولانا شاید آپ کے نزدیک وعدہ کی کوئی حقیقت نہ ہو لیکن شرع میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے کفار سے عہد اور وعدے کئے تو پورے کئے پھر جو وعدہ مؤکد بالشرط ہو' اس کا ایفاء تو زیادہ واجب ہے۔ حدیث میں ہے کہ سفینہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا غلام تھا' انہوں نے کہا کہ میں تجھے اس شرط پر آزاد کرتی ہوں کہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ خدمت کرتا رہے۔ میں نے یہ شرط منظور کر لی تو انہوں نے مجھے آزاد کر دیا۔ چنانچہ سفینہ رضی اللہ عنہ ہمیشہ

آنحضور ﷺ کے خادم رہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کی شرط بکریاں چرانے کی منظور کر کے نکاح کر لیا۔ چنانچہ ابن کثیر نے مختلف طریقوں سے یہ حدیث نقل کی ہے : ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان موسٰی علیہ السلام أجر نفسہ بعفۃ فرجہ وطعمۃ بطنہ۔ یعنی "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو نکاح اور کھانے پر مزدور رکھا۔" تفسیر خازن میں ہے : ثم موسٰی لما قضی الاجل سلم شعیب ابنتہ۔ "کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب مدت شرط پوری کر دی تو حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی لڑکی ان کے سپرد کر دی۔"

پس علامہ صاحب کا یہ کہنا کہ وہ ایک وعدہ تھا کہ میری خدمت کرو گے تو وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی لڑکی نکاح دے دوں گا" سراسر غلط ہے اور نص قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔ جیسا کہ اوپر اس کی تفصیل ہو چکی ہے۔ پھر "کچھ خدمت" صاف غلط کہا ہے۔ آٹھ سال واجبی میعاد اور دس سال استحسانی میعاد مقرر ہو چکی تھی' یہ صاف نص ہے۔ اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُنۡکِحَکَ اِحۡدَی ابۡنَتَیَّ ہٰتَیۡنِ عَلٰۤی اَنۡ تَاۡجُرَنِیۡ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ۔ یعنی "میرا ارادہ یہ ہے کہ میں آپ کا اپنی ان دو لڑکیوں میں سے ایک کا اس شرط پر نکاح کر دوں کہ آپ آٹھ سال تک میری مزدوری (بکریاں چرانا) اختیار کریں اور اگر آپ دس سال پورے کریں تو یہ آپ کی مہربانی ہے۔"

جب آپ اس صراحت کو نہ سمجھے بس پھر آپ کے علم کا اللہ ہی مالک ہے۔ سنئے اس واقعہ سے چار امور ظاہر ہوئے۔ ایک باپ کا ولی بن کر اپنی بیٹی کا نکاح کرنا' دوم نکاح کا عوض آٹھ سالہ مزدوری' سوم اجارہ کی میعاد مقرر کرنا' چہارم اپنی بیٹی کے نکاح کی منفعت اٹھانا جبکہ وہ اس پر راضی ہو اور ولی معذور ہو۔ معذور ہونا اس سے ظاہر ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام مکفوف البصر تھے اور لڑکی کی رضامندی اس سے ظاہر ہے کہ لڑکی نے خود مشورہ دیا ہے کہ ابا جی! آپؑ اس شخص کو مزدور رکھ لیں' یہ قوی اور امین ہے۔ پھر معاہدہ اس کے سامنے طے ہوا اور اس نے اس پر کوئی انکار یا اعتراض نہیں کیا۔ پھر جب نکاح ہو گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اہلیہ محترمہ سے یہ کہا کہ آپ اپنے والد سے کچھ بکریاں طلب کریں کہ ہماری ان سے گزران چلتی رہے کہ اب ہم بے خرچ ہیں۔ چنانچہ لڑکی نے اپنے والد سے

درخواست کی تو انہوں نے جملہ بکریوں کے ایک سال کے تمام بچے ان کو دے دیئے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی اور ریوڑ کو مدین سے لے کر مصر روانہ ہوئے۔ تمام قصہ مفصل تفاسیر ابن کثیر، خازن، معالم وغیرہ میں موجود ہے۔

علامہ کبر و عجب کے جوش میں آکر لکھتے ہیں "الغرض مولانا حصاری کا فتویٰ غلط ہے اور نکاح صحیح ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ ایسے مولوی غلط فتویٰ دینے والے کو امامت سے الگ کر دیں، اگر کہیں امام ہوں۔ ..... مولانا کلکتوی نے فتویٰ کے غلط ہونے پر کوئی نص پیش نہیں کیا، البتہ بریرہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث لوگوں کو وعدہ خلافی، جھوٹ بولنے، غداری کی تعلیم دینے کے لیے پیش کی ہے جس کا نکاح متنازعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس حدیث میں یہ ذکر ہے کہ جو شرط کتاب اللہ میں نہ ہو، وہ باطل ہے۔ ہم مولانا سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ کسی شرط کے کتاب اللہ میں نہ ہونے سے کیا مراد ہے؟ تفصیلاً نہ ہو یا تاصیلا؟ اگر اس سے تفصیل مراد ہے تو آپ وضو، غسل، نماز وغیرہ احکام کی شرطیں تفصیل کے ساتھ قرآن میں دکھائیں ورنہ آپ کو باطل ماننی پڑیں گی اور اگر تاصیلا مراد ہے تو پھر اس نکاح کی شرط کی نظیر قصہ موسیٰ علیہ السلام میں موجود ہے جس کی تفصیل پیش کر دی گئی ہے کہ نکاح کی شرط کا ایفاء واجب ہے۔

اعلام میں ہے : بل الشروط فی حقوق العباد اسع من النذر فی حق اللہ والالتزام به اوفی من الالتزام بالنذر۔ نیز لکھا ہے : فالشرطا الجائز بمنزلة العقد بل هو عقد وعهد۔ یعنی "جو شرطیں حقوق العباد میں آجاتی ہیں، وہ اللہ کے حقوق منت وغیرہ سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، ان کا پورا کرنا نذر وغیرہ کے پورا کرنے سے بھی زیادہ لازم ہے۔

پس ناکح، حافظ نابینی کی پرورش وخبر گیری کرے، کیونکہ یہ اس سے شرطیہ معاہدہ ہو چکا ہے۔ اگر وہ غداری کرے گا جیسا کہ مولانا کلکتوی حدیث بریرہ رضی اللہ عنہا وغیرہ سے اس کو تعلیم دے رہے ہیں تو نکاح فسخ ہو گا، کیونکہ فیصلہ فاروقی مقاطع الحقوق عند الشروط ہے۔ اگر فسخ نہ ہو تو شرط کا معنی لغو ہو جاتا ہے۔ العلام میں ہے : وذالک یستلزم اخراجا لشرط عن حقیقته وهو محال۔ یعنی "اگر شرط کے فوت کرنے پر مشروط کو فوت نہ کیا جائے تو اس سے شرط کو اس کی حقیقت لغویہ، شرعیہ، عرفیہ سے نکال دینا لازم آتا ہے جو محال ہے۔

باقی رہا مفتی صاحب کا یہ حکم نافذ کرنا کہ حصاری کو امامت سے معزول کیا جائے تو یہ بناء فاسد علی الفاسد ہے' کیونکہ فتویٰ صحیح ہے اور اس کی تصدیق و تائید دیگر علماء اور محققین نے کر دی ہے۔ اب آپ کو ایسے اختلافی مسئلہ میں جرم عائد کرنے کا کیا حق ہے؟ کیا حکومت کی طرف سے محکمہ افتاء آپ کے نام رجسٹرڈ ہو چکا ہے کہ آپ جو چاہیں فتویٰ دیں' وہ نافذ ہے اور دوسرے مفتی کا فتویٰ مسدود ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کا ثبوت پیش کریں۔ پھر آپ سے یہ ثبوت مطلوب ہے کہ کسی امام اور خلیفہ نے غلط فتویٰ اپنی غلط فہمی سے دیا ہو تو اس کو معزول کر دیا گیا ہو بلکہ اس کے برعکس واقعات ملتے ہیں۔

چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ثالث کے پاس ایک عورت لائی گئی جس نے شادی کے بعد چھ ماہ گزرنے پر بچہ جن دیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو حاملہ بالزنا قرار دے کر رجم کا حکم صادر کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس فیصلہ کا علم ہوا تو انہوں نے اس حکم پر تعاقب کیا اور فرمایا : اما تقرأ القرآن "کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟" فرمایا کیوں نہیں' پڑھا تو ہے۔ حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حمله و فصاله ثلاثون شهرا "کہ حمل اور بچہ کی ماں سے جدا ہونے کی مدت کل تیس ماہ ہے۔" بروئے آیت حولین کاملین' پس دو برس رضاعت کے نکال دیں تو باقی چھ ماہ حمل کی مدت کے رہ جاتے ہیں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا واللّٰہ ما فطنت بھذا۔ "اللہ کی قسم! میرا اس طرف خیال ہی نہیں گیا تھا۔" اچھا اس عورت ملزمہ کو میرے پاس واپس لاؤ۔ جب لوگ لینے گئے تو اس کو رجم کیا جا چکا تھا لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ ان کو امامت اور خلافت سے معزول کر دیا جائے کیونکہ انہوں نے غلط حکم دے کر ایک بے گناہ عورت کو سنگسار کرا دیا۔

اسی طرح حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں یہ حکم دیا کہ عورتوں کے مہر زیادہ نہ باندھے جائیں کہ یہ طریقہ نبوی کے خلاف ہے جو زیادہ باندھے گا تو زائد مہر کو اس سے لے کر بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا۔ اس مسئلہ پر ایک عورت نے اسی اجلاس میں تعاقب کیا اور کہا کہ آپ نے سنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس بارے میں کیا حکم نازل فرمایا ہے اور آپ لوگوں کو زیادہ مہر مقرر کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا : ای ذالک "کہ وہ حکم کون سا ہے؟ تو اس عورت نے آیت وآتیتم احدٰھن قنطارا پارہ نمبر۴

سے پیش کر دی۔ تب حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور حکم ممانعت کا واپس لیا اور کہا کہ کل الناس افقہ من عمر ''کہ سب لوگ ہی عمر سے زیادہ سمجھدار ہیں۔'' ___ اس پر کسی نے یہ حکم نافذ نہ کیا کہ آپ عورتوں کے برابر بھی قرآن کی سمجھ نہیں رکھتے' اس لیے امامت وخلافت سے معزول ہیں۔ اسی طرح اور بھی واقعات ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے رضاعت بچگان کی مدت ڈھائی سال مقرر کر دی جو آج تک کتب فقہ میں درج ہوتی چلی آتی ہے اور یہ صریح قرآن وحدیث کے خلاف ہے اور تمام ائمہ ان کے مخالف ہیں۔ مگر کسی نے ان کو محکمہ افتاء سے خارج نہیں کیا بلکہ اسلامی دنیا کثیر تعداد میں ان کی مقلد ہوتی چلی آرہی ہے تو آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اپنے خلاف دوسرے علماء کا فتویٰ دیکھیں تو ان کی امامت کو مسترد کر دیں۔ کیا دوسرے علماء یہ حق نہیں رکھتے کہ وہ بھی اس قسم کا فتویٰ آپ پر صادر کر دیں۔ آپ کبر وعجب کو ترک فرما کر تواضع اختیار کریں کہ اسی میں بلندی ہے' آپ کو یہ گمان ہے کہ میرے برابر کوئی بھی نہیں' سب ہیچ ہیں۔

راقم الحروف حصاری کی صورت معاش اصلی اپنی زمین ہے' بندہ زمیندار ہے۔ امامت وخطابت فی سبیل اللہ کرتا ہوں' نہ تنخواہ نہ فطرانہ' نہ چرمہائے قربانی لیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بندہ عوام جہلا کے ماتحت ہو کر مرعوب نہیں ہے' پھر آخر میں مولانا یوں موتی بکھیرتے ہیں۔ ''نہیں امام تو ان سے آئندہ مسائل مشکلہ کا فتویٰ ہی نہ لیا کریں۔'' .... مولانا منطقی کہلاتے ہیں' اس لیے مانع الخلو کی صورت میں کلام کرتے ہیں کہ اگر حصاری امام ہو تو امامت سے الگ کر دیں' اگر امام نہیں تو مسائل مشکلہ میں فتویٰ نہ لیا کریں۔ جس سے ظاہر ہے کہ امامت سے الگ کر دیا جائے تو فتویٰ مسائل مشکلہ میں لینا جائز ہے' کیونکہ اس طرح ایک تعزیر لگ گئی' وہ کافی ہے اور اگر امام نہیں تو پھر فتویٰ مسائل مشکلہ نہ لیا جائے' اس پر اہل علم خوب غور کریں گے۔

پھر اپنے فتویٰ کے اخیر میں لکھتے ہیں ہاں چھوٹے موٹے مسائل وضو کے' استنجا کے' ڈھیلے استعمال کے پوچھ لیا کریں یا دعوت وغیرہ کھانے پکانے کے پوچھ لیں اور بس۔ مشکلات کے مسائل میں رجوع بڑے بڑے جید علماء کی طرف کیا کریں' یہ انتہی کلامہ بلفظہ۔

مولانا نے بندہ حصاری کو خفت دینے کے لیے علو اور عجب میں آکر یہ لکھا ہے تاکہ لوگ

مولانا کو بڑا جید عالم سمجھ لیں اور حصاری کو قلیل العلم اور مسائل میں ہمیشہ ان کی طرف رجوع ہو' خیر یہ بھی مولانا کی مہربانی ہے کہ بعض مسائل کو حقیر جان کر ان کی اجازت دے دی ہے حالانکہ مچھر کی مثل کو اللہ تعالیٰ کے لیے اور بول' براز' استنجاء کے مسائل کو آنحضرت ﷺ کے لیے حقیر جاننا کفار کا شیوہ ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے : ان نبیکم یعلمکم کل شیئی حتی الخراٰۃ یعنی "کفار کہتے تھے کہ تمہارا نبی تم کو ہر چیز سکھلاتا ہے یہاں تک کہ ہگنا (پاخانہ کرنا) بھی۔"

علامہ صاحب تو ایسے مسائل میں فتویٰ دینے سے شرماتے ہیں مگر آنحضور ﷺ استنجاء کے مسائل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں : انما انا لکم مثل الوالد "کہ میں تمہارے لیے مثل والد کے ہوں کہ چھوٹے موٹے مسائل سب سمجھاتا ہوں۔" اس سے ظاہر ہے کہ یہ مسائل کسی کو حقیر جان کر سپرد نہ کرنے چاہئیں بلکہ مثل والد کے درجہ دے کر سپرد کرنے چاہئیں اور ہم تو بفضلہ تعالیٰ سب مسائل ہی لوگوں کو یکساں سکھلاتے ہیں' کوئی فرق نہیں کرتے کہ نبی اور نبی کے نائب کی شان یہی ہے۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں : علمنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کل شیئی حتی الخراءۃ "کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو ہر چیز کی تعلیم دی' یہاں تک کہ پاخانہ کی بھی کہ اس طرح کرو۔" ... اچھا مولانا! اگر بندہ نے لوگوں کو ان مسائل میں فتوے دینے شروع کیے تو آپ پھر ناراض ہونے لگ جائیں گے کیونکہ یہ مسائل کثیر الوقوع ہیں۔ اکثر لوگ میری طرف رجوع کریں گے اور آپ مشکل مسئلہ کے سوال میں بیٹھے رہیں گے کیونکہ وہ نادر الوقوع ہیں۔ پھر آپ مجبور ہو کر دوسرا حکم نافذ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس حصاری کو کوئی فتویٰ دینا بھی مناسب نہیں ہے' خاموشی بہتر ہے کیونکہ استنجاء اور ازالہ نجاست میں بھی اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ آپ چونکہ ان مسائل کو صغیر و حقیر تصور کرتے ہیں' اس لئے ان میں بھی آپ غلطیاں کریں گے' جیسے شروط نکاح کے بارے میں غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔

اگر آپ کو اپنے محفوظ عن الخطا ہونے کا یقین ہے تو پھر امتحان کر لیں کہ ہر نجاست کا ازالہ ضروری ہے کہ اس کی کوئی قسم معاف بھی ہے۔ اگر ہے تو وہ کتنی قسمیں ہیں؟ اور مزال بہ کے متعلق سوال ہے کہ وہ کتنی قسم پر ہے؟ اور کیفیت ازالہ ہر نجاست کا نسی کیا

ہے؟ استنجاء کے انواع کیا ہیں اور ان کے احکام وکوائف کیا ہیں اور استنجاء ممنوع کون سا ہے؟ اور استنجاء کے ڈھیلوں میں ایتار واجب ہے یا مسنون؟ وضو کے متعلق بھی سوال ہے کہ مس ذکر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں۔ مس مقعد کا حکم بھی مس قضیب کا ہے یا دوسرا ہے' اس پر نص پیش کریں۔ الغرض پہلے آپ ہی بتائیں کہ ان مسائل اختلافیہ میں راہ صواب کیا رکھتے ہیں؟ اگر آپ کا مسلک کسی مسئلہ میں بندہ کے خلاف ہوا تو میں اس پر تعاقب کروں گا تو لاچار ہو کر آپ کو یہ حکم نافذ کرنا پڑے گا کہ اس شخص سے کوئی مسئلہ بھی نہ پوچھو۔ پھر آپ ان مسائل کو حقیر جان کر علامہ ہونے کی وجہ سے بتائیں گے' نہیں تو پھر لوگ ہمارے حلقہ کے کدھر جائیں گے۔ یہ بتانا ضروری ہے کیونکہ آپ نے تو سربراہ مملکت کا درجہ لے کر امتناعی حکم جاری کر دیا کہ حصاری سے کوئی مسئلہ دریافت نہ کیا جائے بلکہ بڑے بڑے جید علماء کی طرف رجوع کیا جائے۔

اچھا پھر آپ عوام کو جید علماء کے معلوم ہونے کا معیار بھی بتائیں' کیونکہ وہ تو جاہل ہیں۔ ہر سند یافتہ بلکہ چند کتابیں اور ترجمتہ قرآن پڑھنے والے کو بھی عالم تصور کر کے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ وہ بیچارے کس طرح معلوم کریں گے کہ یہ جید ہے یا غیر جید۔ مثلاً انہوں نے مولانا حافظ عبداللہ صاحب شیخ الحدیث جامع سلفیہ لائل پور (فیصل آباد) کو جید اور بڑا عالم جان کر مسئلہ نابینی کی شرط کا دریافت کیا تو انہوں نے نکاح قابل فسخ بتایا' پھر مولانا احمد الدین صاحب گکھڑوی مناظر اسلام سے دریافت کیا تو انہوں نے بھی نکاح مشروطہ قابل فسخ بتایا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ جید علماء معلوم کرنے کا معیار کیا ہے؟ یا یہ کہ ان اکابر علماء کی فہرست تیار کر کے شائع کر دیں تاکہ لوگ ان سے مسائل دریافت کر لیا کریں۔ لیکن میرے خیال میں تو اب اس دور میں آپ کی نظر میں تو کوئی بھی جید عالم نہیں ہے' کیونکہ آپ اپنے دماغ میں کسی کو بھی جید عالم نہیں سمجھتے۔

اچھا مولانا صاحب! آپ فرماتے ہیں کہ مسائل مشکلہ میں جید علماء کی طرف رجوع کریں تو اب آپ کی طرف اس مشکل مسئلہ میں رجوع کیا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ علماء کے درمیان زیر بحث آچکا ہے کہ دو لڑکیاں توام (جوڑواں) پیدا ہوئی ہیں جن کی پیٹھیں باہم ملی ہوئی ہیں' وہ یکساں کھاتی پیتی ہیں' جب بلوغت کو پہنچ جائیں تو ان کے نکاح کی صورت کیا ہے؟ یعنی ایک شخص سے ہو یا دو سے؟ اگر ایک سے ہو تو جمع بین الاختین لازم آئے گا اور اگر دو

سے ہو تو ایک کے سامنے دوسری سے جماع کرنا لازم آئے گا۔ دونوں شقیں ممنوع ہیں اور اگر نکاح نہ کیا جائے تو دونوں کا زنا میں پڑنے کا خطرہ ہے کہ نکاح واجب ہے۔ اب آپ علامہ بن کر اس کو دلائل سے حل کریں تاکہ علماء کو معلوم ہو کہ آپ بھی جید علماء کی فہرست میں شامل ہیں۔

اسی طرح ایک ہندو کافر ہے اگر وہ بسم اللہ پڑھ کر جانور ذبح کرے تو وہ ذبیحہ حلال ہے یا حرام؟ اسی طرح اگر کافر مشرک نماز پڑھا رہا ہو تو بحکم وارکعوا مع الراکعین اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست ہے تو دلیل درکار ہے اور اگر منع ہے تو ممانعت کی دلیل پیش کریں۔ یہ چند مسائل مشکلہ آپ کے سامنے پیش ہیں تاکہ آپ کا جید عالم ہونا معلوم کیا جا سکے۔

پھر آپ نے حصاری کو دعوت کھانے پکانے کی دے دی' یہ بھی غضب کیا' کیونکہ معاشرہ خراب ہے' اس کا حل بھی مشکلات سے ہے۔ بعض علماء فاسقین کی دعوت قبول کرنے سے منع کرتے ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ نذیریہ جلد دوم میں اس طرح لکھا ہے اور جید علماء کی اس پر تصدیق ہے لیکن آج کل فاسقین میں اکثر شمار ہیں اور متقی قلیل کالمعدوم ہیں تو دعوت کا سلسلہ ہی ختم ہو جاتا ہے اور اگر یہ دیکھا جائے کہ آنحضرت ﷺ نے یہود کی دعوت قبول کر لی تھی تو ہمارے فاسقین کی کیوں قبول نہ ہو۔ بہرکیف یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے جو کمزور علم والا حل نہیں کر سکتا۔ پھر ختنہ کی دعوت کو بعض مشروع کہتے ہیں جیسا کہ فتاویٰ ثنائیہ میں درج ہے اور بعض بدعت کہتے ہیں جیسا کہ رسالہ رد بدعات روپڑی میں درج ہے۔

اسی طرح محرم کی دسویں تاریخ کو توسیع طعام کے طور پر بعض' مسکینوں کی دعوت کرتے ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ نذیریہ جلد ۱ میں توسیع طعام کا سلسلہ جائز لکھا ہے اور بعض ناجائز اور بدعت کہتے ہیں۔ فتاویٰ ابن تیمیہ میں اس کی تفصیل ہے اور وہ حدیث توسیع طعام کو موضوع قرار دیتے ہیں تو یہ مسئلہ کھانے پکانے کا بھی مشکل ہو گیا' اس کو آپ ہی حل کریں۔

خلاصہ تمام بحث کا یہ ہے کہ نابینی کی لڑکی کا نکاح مشروط ہے اور اس کی شرط جائز ہے۔ فاسد نہیں کہ قرآن میں اس کی کوئی ممانعت نہیں آئی بلکہ اس کی نظیر قصہ موسیٰ وشعیب علیہما السلام میں موجود ہے۔ یہ نکاح روئے زمین پر اہم ہے تو اب اس کا ایفاء واجب ہوا'

ورنہ نکاح فسخ ہے۔ مولانا سلطان العلماء عرب نے اور جناب مولانا حضرت امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس شرط کی بہت اہمیت بیان کی ہے اور اس کا پورا کرنا واجب قرار دیا ہے ورنہ شرط کے عدم ایفاء پر نکاح عورت اگر چاہے تو فسخ کر دیا جائے۔ مقاطع الحقوق عند الشروط "کہ شروط کے زائل ہونے پر نکاح بھی زائل ہو جاتا ہے۔" یہ مسلک صحیح اور حق ہے۔ اللہ تعالیٰ جملہ مسلمانوں کو نیک توفیق دے۔ آمین۔ وآخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہلحدیث' جلد۔۴۸' شمارہ۔۲۱' ۲۲' ۲۳ سنہ۔۱۹۸۷ء وجلد۔۴۹' شمارہ۔۷' ۸' ۹' ۱۱' ۱۲ مورخہ یکم و ۱۶ ذوالقعدہ' یکم ذوالحجہ ویکم و ۱۶ ربیع الثانی' یکم جمادی الاولیٰ' یکم و ۱۶ جمادی الثانی سنہ۔۱۳۸۸ھ

حرمت نکاح حلالہ

ایک مجلس میں تین طلاق کہنے والے جو کئی گناہ کرتے ہیں' ان میں سے ایک گناہ نکاح حلالہ بھی ہے۔ جیسے ہندوؤں کے فرقہ آریہ وغیرہ میں نیوگ ہے اور رافضیوں میں متعہ ہے' اسی طرح بریلوی حنفیوں میں نکاح حلالہ ہے جو شریعت محمدیہ میں حرام ہے۔

<u>نکاح حلالہ کی تعریف:</u> حلالہ اسی حیلہ سازی کے نکاح کو کہتے ہیں جو کسی کی عورت مطلقہ ثلاثہ کو اس قصد اور شرط سے نکاح کرے کہ مجامعت کر کے پھر طلاق دے دوں گا تاکہ یہ عورت اپنے پہلے خاوند پر حلال ہو جائے۔ اس میں ایک محلل ہوتا ہے' دوم محلل لہ۔ قاضی عیاض نے محلل کی تعریف یہ لکھی ہے کہ المحلل الذی تزوج مطلقة الغیر ثلاثا علی قصد ان یطلقھا بعد الوطی لیحل للمطلق نکاحھا "یعنی محلل وہ شخص ہے جس نے نکاح کیا کسی عورت سے کہ جس کو تین طلاقیں دی گئی تھیں' بمقصد اِس کے کہ بعد وطی کرنے کے اس کو طلاق دے تاکہ نکاح کرنا اس سے طلاق دینے والے پر حلال ہو جائے۔" اور محلل لہ سے مراد خاوند ہے' جس نے تین طلاق دے کر اپنے پر عورت حرام کرلی۔ اب اس حیلہ سے اس پر وہ عورت حلال بنائی جا رہی ہے۔ (تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی)

حنفیہ کے نزدیک محلل کو محلل اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دوسرے کے لیے حلت نکاح کا سبب ہوتا ہے۔ اس نکاح میں اس امر سے چارہ نہیں ہے کہ زوج ثانی محلل اس عورت مطلقہ سے صحبت کرے تو کم از کم حشفہ کو غائب کر کے اس سے لذت حاصل کر لے' انزال ہونا شرط نہیں ہے۔ اگر اس سے زیادہ صحبت کرے تو اس کا اختیار ہے لیکن کم از کم اتنی وطی کرنی ضروری ہے۔ نکاح مشروع میں رغبت سے نکاح کرنا اور ہمیشہ نکاح میں رکھنا اور قصد فراق نہ کرنا شرط ہے اور ملعونہ حلالہ جو نکاح غیر مشروط ہے' شرعی نکاح کے بالکل برعکس ہے جو کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہے بلکہ حرام ہے۔ پس قدرتی حلالہ اور کسبی حلالہ میں ناظرین فرق سمجھ لیں۔

نکاح حلالہ موجب لعنت ہے: بلوغ المرام میں ہے: عن ابن مسعود رضی اللّٰہ عنہ قال لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المحلل والمحلل لہ رواہ احمد والنسائی والترمذی وصححہ "یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے محلل اور محلل لہ پر لعنت کی ہے۔" یعنی نکاح حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے نکاح حلالہ کیا گیا ہے' دونوں رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر ملعون ہیں۔

سنن نسائی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سود کھانے والا' سود کھلانے والا' اس پر گواہ بننے والا' سود کا لکھنے والا جبکہ انہیں علم ہو اور بالوں میں ملانے والی اور ملوانے والی اور زکوٰۃ روکنے والا اور اس میں حد سے گذرنے والا اور ہجرت کر کے پھر آکر وہیں رہنے والا اور نکاح حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے حلالہ کرایا جائے ملعونون علی لسان محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم یوم القیامۃ کہ یہ سب محمد ﷺ کی زبان پر ملعون ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے محلل اور محلل لہ دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ لعن اللّٰہ المحلل والمحلل لہ کہ حلالہ کرنے والے اور جن کے لیے حلالہ کیا ہے' دونوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔ پس حلالہ والے اللہ اور رسول کی طرف سے ملعون ہیں۔ اسی طرح اس لعنتی نکاح کے پڑھنے والے اور اس پر گواہ بننے والے اور ایسی لعنتی چیز کی تجویزیں کرنے والے سب اس لعنت

میں شریک ہوں گے' کیونکہ یہ فعل حرام ہے جیسے سود حرام ہے' اس میں تعاون کرنے والے سب ملعون ہیں۔ مومنوں کو چاہیے کہ اس لعنت سے بچیں اور ان مقلدین کو خوب یاد رکھنا چاہیے کہ جو حلالہ کرتے کراتے ہیں وہ آنحضور ﷺ کے دربار میں ملعون ہیں' خواہ وہ نبی کو اللہ سمجھتے رہیں لیکن ان پر آپ کی طرف سے لعنت ہے۔

حلالہ زناکاری ہے: نکاح حلالہ باطل ہے اور یہ عین زناکاری ہے۔ چنانچہ تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی میں ہے: روی الحاکم والطبرانی فی الاوسط من طریق ابی غسان عن عمر بن نافع عن ابیه قال جاء رجل الی ابن عمر فساله عن رجل طلق امرته ثلاثا فتزوجها اخ له عن غیر امرة هو لیحلها لاخیه هل یحل للاول قال لا الا بنکاح رغبة کنا نعد هذا سفاحا علی عهد النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم رواہ الحاکم فی المستدرک وصححه "یعنی نافع نے کہا کہ ایک شخص نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے آکر مسئلہ پوچھا کہ ایک مرد نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں پھر اس عورت کو اس کے خاوند کے بھائی نے بغیر کسی کے کہنے کے ازخود نکاح کر لیا' اس نیت سے کہ وہ عورت اس کے بھائی طلاق دینے والے پر حلال ہو جائے' کیا یہ جائز ہے؟ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ جائز نہیں مگر یہ کہ نکاح دلی رغبت سے ہو' ہم تو اس طرح کے نکاح کو نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں زنا شمار کرتے تھے۔ امام حاکم نے اس حدیث کو روایت کر کے صحیح کہا ہے۔"

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ سئل ابن عمر عن تحلیل المراۃ لزوجها فقال ذاک السفاح "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے عورت کے حلالہ کے بارہ میں مسئلہ دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ تو زنا ہے۔" مسند عبدالرزاق میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی پھر نادم ہوا اور اسے گھر میں لانے کا خواہش مند ہوا اور یہ چاہا کہ اس سے کوئی نکاح کر کے پھر طلاق دے دے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ کلاهما زان وان مکث عشرین سنة او نحو ذالک اذا کان اللّٰہ یعلم انه یرید ان یحلها له۔ (اعلام الموقعین) "کہ اس ارادہ سے حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے حلالہ کیا ہے' دونوں زانی ہیں گو بیس سال تک وہ عورت اپنے پاس رکھے جبکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس کا ارادہ پہلے خاوند کے لیے حلال کرنے کا ہے۔"

حلالہ موجب سزا ہے: جب حلالہ حرام ہے' اس میں عورت سے صحبت کرنا زنا ہے تو

پھر حلالہ کرنے والوں پر سزا شرعی واجب ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لا اوتی بمحلل ولا محلل له الا رجمتھما "کہ محلل اور محلل لہ دونوں میرے پاس لائے گئے' تو میں ان دونوں کو سنگسار کروں گا۔"

حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ سے حلالہ کا زنا ہونا ثابت ہے اور اس پر اجماع صحابہ ہے تو سزا شرعی ان پر واجب ہے۔ اگر حکومت اسلامی ہو تو جو لوگ حلالہ کرتے ہیں ان پر حد شرعی لگائی جائے تب ان کا انسداد ہو سکتا ہے ورنہ حلالہ سے یہ لوگ رکتے نہیں ہیں۔ ہاں اگر نکاح کیا اور پھر دونوں اس طرح پر ہمیشہ کے لیے قائم ہونے کا ارادہ کرلیں اور طلاق نہ دیں تو اس سزا سے بچ سکتے ہیں۔

چنانچہ نیل الاوطار میں عبدالرزاق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان امرة ارسلت الى رجل فزوجه نفسها ليحلها لزوجها فامر عمر بن الخطاب ان يقيم معها ولا يطلقها و اوعده ان يعاقبه ان طلقها۔ (نیل الاوطار) "یعنی ایک عورت کسی مرد کی طرف بھیجی گئی کہ وہ کسی سے نکاح حلالہ کرے تاکہ پہلے خاوند پر حلال ہو تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ وہ ہمیشہ اس عورت کے ساتھ آباد رہے اور اس کو طلاق نہ دے اور کہا کہ اگر طلاق دی تو اس کو سزا دی جائے گی۔" بہرکیف حلالہ کرنے والے لائق سزا ہیں۔ حضرت عطاء تابعی سے سوال ہوا کہ عمداً حلالہ کرنے والے پر کوئی سزا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ انی لاری ان یعاقب "کہ میرے نزدیک اسے سزا دینی چاہیے۔

<u>حلالہ کا نکاح فاسد ہے</u>: جس نکاح کے کرنے پر لعنت آئی ہے اور اس کو عہد نبوی میں زنا قرار دیا گیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر سزا کا حکم دیا ہے تو پھر یہ نکاح فاسد ہے' نہ اس سے عورت دوسرے کے لیے حلال ہے اور نہ پہلے کے لیے حلال ہے' دونوں کا نکاح ناجائز ہے' عورت بدستور حرام ہے۔ جب تک کہ دلی رغبت سے ہمیشہ کے لیے آباد کرنے کی غرض سے عورت نکاح نہ کی جائے اور پھر تقدیر الٰہی سے یہ دوسرا خاوند فوت ہو جائے یا کسی وجہ سے اتفاقیہ طلاق دے دے تو پھر وہ عورت آزاد ہے' پہلے سے نکاح کرلے یا کسی اور شخص سے نکاح کرے' جائز ہے۔

ترمذی شریف میں نکاح حلالہ کے متعلق حدیث لعنت نقل کر کے یہ لکھا ہے کہ والعمل على هذا عند اهل العلم من اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم منهم عمر

بن الخطاب وعثمان ابن عفان وعبدالله ابن عمر وغيرهم وهو قول الفقهاء من التابعين وبه يقول سفيان الثوری وابن المبارک والشافعی واحمد واسحاق وسمعت الجارود یذکر عن وکیع انه قال بهذا وقال ینبغی ان یرٰی بهذا الباب من قول اصحاب الرای قال وکیع وقال سفیان اذا تزوج المراة لیحللها ثم بداله ان یمسکها فلا یحل له ان یمسکها حتی یتزوجها بنکاح جدید "یعنی اہل علم اصحاب نبی ﷺ کا یہی مذہب ہے کہ یہ نکاح ناجائز ہے' انہی میں سے حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ خاص قابل ذکر ہیں اور فقہائے تابعین کا بھی یہی مذہب ہے۔ ائمہ دین سفیان ثوری اور عبداللہ بن مبارک اور شافعی' احمد' اسحاق کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ میں نے جارود سے سنا کہ امام وکیع نے بھی یہی فرمایا ہے اور یہ کہا ہے کہ اہل رائے کا قول جواز اس بارہ میں پھینک دینے کے لائق ہے۔ وکیع نے کہا امام سفیان نے فرمایا کہ جب عورت کو کسی نے اس لیے نکاح کیا تاکہ وہ پہلے خاوند کے لیے حلال کرے پھر اس کو ظاہر ہوا کہ اس کو گھر میں بسانا ٹھیک ہے تو اس کو روکنا حلال نہیں ہے' جب تک نیا نکاح نہ پڑھائے (کیونکہ پہلا نکاح جائز نہیں ہوا)۔"

اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ جس غرض کے لیے یہ نکاح کیا گیا ہے' وہ قائم رہے ت یہ نکاح باطل ہے' لیکن اگر نکاح کے بعد ہمیشہ قائم رہنے کا عہد کر لیں اور طلاق نہ د جائے تو پھر اس میں اختلاف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان گذر چکا ہے کہ وہ اسی نکاح پر قا رہیں' استیناف کی ضرورت نہیں ہے' لیکن امام سفیان ثوری کا فتویٰ یہ ہے کہ پھر نیا نکا پڑھائیں۔ اصولی طور پر امام سفیان ثوری کا فتویٰ صحیح ہے کیونکہ جب بقول ابن عمر یہ نکا نہیں ہے اور حسب فرمان حضرت فاروق رضی اللہ عنہ وہ قابل سنگسار ہیں تو پھر پہلا نکاح قابل اعتم کس طرح ہو سکتا ہے؟

حضرت عمرو بن دینار جو عمدہ تابعی سے ہیں' ان سے کسی شخص نے یہ مسئلہ پوچھا ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاقیں دے دیں پھر ایک شخص کسی بستی کا جو مرد اور عو دونوں کو نہیں جانتا تھا' آیا اور اس نے اپنے محلل سے اس عورت کا نکاح اس لیے کر د اس کو اس کے شوہر پر حلال کر دے' تب حضرت عمرو بن دینار نے فرمایا کہ درست ہے' پھر فرمایا کہ جائز نہیں ہے' پھر فرمایا کہ آنحضرت ﷺ سے کسی نے ایسا ہی مسئلہ پو

آپ نے ارشاد فرمایا کہ جائز نہیں ہے جب تک کہ نکاح دلی رغبت سے نہ ہو اور جب اپنی رغبت سے نکاح کر لیں تو پہلے خاوند کو حلال نہ ہو گی یہاں تک کہ دوسرا شوہر اس سے حلاوت صحبت پا لے' روایت کیا اس حدیث کو ابوبکر بن شیبہ نے اپنی مصنف میں عمدہ اسناد سے۔

اس سے بھی یہ ثابت ہوا کہ نکاح حلالہ درست نہیں ہے' نکاح وہ درست ہو گا جو مرد عورت کا بغیر کسی دوسرے کے لیے حلال کرنے کے خود بخود دلی رغبت اور ہمیشگی کے لیے ہو' دوسرے کی خاطر نکاح دلی رغبت سے نہیں ہوا کرتا' دلی رغبت سے مراد ہے' اس عورت سے نکاح کر کے ہمیشہ کے لیے آباد رہنے کی خواہش کرنا' یہ مراد نہیں کہ اپنے دل کی مستی نکالنا اور دوسرے کے لیے یہ کام کرنا کیونکہ یہ ناجائز ہے۔

امام جوزجانی کی کتاب التراجم میں ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے سامنے وہ شخص پیش کیا گیا جس نے ایک عورت سے اس لیے نکاح کیا تھا کہ وہ اگلے خاوند پر حلال ہو جائے تب خلیفۃ المسلمین نے ان دونوں میں جدائی کرا دی' الفاظ یہ ہیں : تفرق بینھما وقال لا ترجع الیہ الا بنکاح رغبۃ غیر دلسۃ "کہ دونوں میں تفریق کر دی اور فرمایا کہ یہ عورت اس اگلے خاوند کے پاس نہیں جا سکتی جب تک کہ رغبت اور محبت سے دوسرا نکاح نہ کرے جس میں حیلہ اور مکاری نہ ہو۔" (نکاح محمدی ص۔۵۴)

ابن المنذر کی کتاب الاوسط میں ہے کہ ایک شخص دربار عثمانی میں حاضر ہوا اور کہا کہ میرے پڑوسی نے بحالت غصہ اپنی بیوی کو طلاق دے دی' اب اسے سخت پریشانی ہو رہی ہے' میں اس کی پریشانی دُور کرنے کے لیے اپنے مال وجان سے حاضر ہوں' چاہتا ہوں کہ اس عورت سے نکاح کر لوں پھر اس سے مل کر طلاق دے دوں تاکہ وہ اس کے لیے حلال ہو جائے' آپ فرمائیں کہ اس میں کیا فتویٰ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ لا تنکحھا الا نکاح رغبۃ "یعنی ایسا نکاح نہ کرنا' نکاح وہ ہوتا ہے جس سے میاں بیوی بن کر رہنا مقصود ہو۔" (نکاح محمدی ص۔۵۴)

حضرت قتادہ تابعی فرماتے ہیں : اذا نوی الناکح او المنکح او المراۃ او احد منھم التحلیل فلا یصلح یعنی نکاح کرنے والا یا نکاح کرانے والا یا عورت یا اِن میں سے کوئی بھی حلالہ کی نیت رکھتا ہے تو' امام ابوحنیفہ کے استاد امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اذا کان

نیته الثلاثة الزوج الاول او الزوج الاخرا والمراة انه محلل فنکاح الاخر باطل ولا یحل للاول "یعنی جب تینوں میں سے ایک کی نیت پہلے خاوند کی یا دوسرے خاوند کی یا عورت کی حلالہ کی ہے تو یہ نکاح باطل ہے اور پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔" (اعلام الموقعین)

امام حسن بصری نے فتویٰ دیا کہ اذا هم احد الثلاثة بالتحلیل فقد افسد "کہ جب ان تینوں میں سے ایک کی نیت بھی حلالہ کی ہے تو یہ نکاح فاسد ہے۔" (اعلام الموقعین) حضرت عطاء تابعی سے پوچھا جاتا ہے کہ کسی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں پوری کر دیں۔ اس کے بعد کسی شخص کو اس پر رحم آیا اور اس کے مشورے بغیر' اس کے کہے بغیر اسی عورت سے نکاح کر لیا کہ پھر طلاق دے دوں گا تاکہ یہ حلال ہو جائے تو یہ جائز ہے' آپ نے فرمایا کہ ان کان تزوجها لیحلها له لم یحل له "کہ جب اس کے حلال کرنے کے لیے نکاح کیا ہے تو یہ نکاح اس کے لیے حلال نہیں ہے۔"

حضرت سید التابعین سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا کہ ایک شخص کسی عورت سے نکاح کرلے' اس عورت کو بھی معلوم نہ ہو اور نہ اس کے خاوند طلاق دینے والے کو علم ہو' لیکن نکاح کرنے والے کے دل میں ہو کہ میں اس سے نکاح کر کے پھر طلاق دے دوں گا تاکہ پہلے کے لیے حلال ہو جائے تو کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ان کان انما نکحها لیحلها فلا یصلح لهما فلا یحل "اگر اس لیے نکاح کیا ہے کہ اس عورت کو حلال کرے تو یہ ٹھیک نہیں ہے' عورت اس کے اگلے خاوند پر حلال نہ ہوگی۔"

علامہ خطابی معالم السنن میں فرماتے ہیں کہ اذا کان ذالک عن شرط بینهما فا النکاح فاسد لان العقد متناه الی مدة کنکاح المتعة (تحفة الاحوذی) "کہ جب دونوں نے شرط باندھ کر یہ نکاح کیا ہے تو نکاح فاسد ہے کیونکہ اس عقد کی انتہا مدت کی جانب ہے جیسے نکاح متعہ میں ہے یعنی یہ نکاح موقت ہے' متعہ اور نکاح موقت حرام ہیں۔"

سبل السلام میں ہے کہ الحدیث دلیل علی تحریم التحلیل لانه لا یکون اللعن الا علی فاعل المحرم وکل محرم منهی عنه والنهی یقتضی الفساد "یہ حدیث لعنت حلالہ کے حرام ہونے پر دلیل ہے کیونکہ لعنت حرام کام کرنے والے پر ہوتی ہے اور ہر کام حرام ممنوع ہے اور نہی فساد کو چاہتی ہے۔"

نیل الاوطار میں ہے : والاحادیث المذکورۃ تدل علی تحریم التحلیل لان اللعن انما یکون علی ذنب کبیر "کہ احادیث مذکورہ حلالہ کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ ان میں لعنت وارد ہے اور لعنت گناہ کبیرہ پر ہوتی ہے پس حلالہ گناہ کبیرہ ہے۔"

جب یہ گناہ کبیرہ ہوا تو اس کے کرنے اور کرانے والے سب فاسق ہیں' فاجر ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جب احادیث لعنت ان کو پہنچ گئی ہیں اور خلفاء اور تابعین کا فیصلہ انہوں نے سن لیا کہ نکاح حلالہ حرام ہے' اب جو شخص اس کو حلال جان کر نکاح کرے گا وہ کافر ہے' کیونکہ حرام کو حلال جاننا کفر ہے۔

نیل الاوطار میں حافظ ابن حجر سے بحوالہ تلخیص نقل کیا ہے کہ استدلوا بھذا الحدیث علی بطلان النکاح اذا شرط الزوج انه نکحھا بانت منه او شرط انه یطلقھا او نحو ذالک وحملوا الحدیث علی ذالک "کہ علماء محدثین نے اس حدیث لعنت سے استدلال کیا ہے کہ جب شرط کر لیا کہ جب وطی کر لیں گے تو عورت جدا ہو جائے گی' یا طلاق دینا شرط کر لیا تو نکاح باطل ہے' انہوں نے حدیث کو اسی صورت پر محمول کیا ہے۔"

امام شافعی' امام ابن حزم وغیرہ ائمہ محدثین بھی شرط کو معتبر ٹھہراتے ہیں کہ کوئی فریق شرط کر لے گا تو نکاح حرام ہے' کیونکہ انما الاعمال بالنیة اور حدیث ابن عمرؓ سے یہی ثابت ہوا' کمامر۔

مسلک احناف : لیکن حنفیہ کے نزدیک حلالہ معمول بہا ہے۔ تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی میں ہے کہ وفی بعض کتب الحنفیة انه ماجور وان شرطاہ بالقول لقصد الاصلاح وھذا ھو معمول به عند حنفیة دیارنا فیعملون به ویظنون انھم ینفعون اخوانھم ویصیرون ماجورین فھدا ھم اللہ تعالٰی الی التحقیق "کہ حنفیوں کی بعض کتب فقہ میں لکھا ہے کہ اگرچہ دونوں میں شرط حلالہ کی ہوئی ہو تب بھی جائز ہے کیونکہ ارادہ اصلاح اور خیر خواہی کا ہے اور یہ ہمارے شہروں میں حنفیوں کا معمول ہے کہ وہ تین طلاقیں دے کر حلالے کرتے ہیں اور خیال یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے مذہبی بھائیوں کو نفع پہنچا رہے ہیں جس سے ان کو ثواب ملے گا اور وہ جنت میں جائیں گے' نعوذ باللہ منہم' اللہ تعالٰی ان کو تحقیق کرنے کی ہدایت دے' آمین۔

مولانا انور شاہ عرف شذی میں فرماتے ہیں کہ والمشھور عندنا ان شرط الم والنکاح

صحیح "کہ حلالہ میں شرط کرنا تو گناہ ہے مگر نکاح ہمارے نزدیک صحیح ہے۔" نیز لکھا ہے کہ اگر شرط نہیں کی لیکن وہ شخص ایسا ہے کہ ہمیشہ حلالے نکالتا ہے اور وہ سانڈ بن کر مشہور ہو رہا ہے تو پھر یہ مکروہ تحریمہ ہے۔ (فتح القدیر) نیز مولانا انور شاہ صاحب عرف الشذی میں فرماتے ہیں کہ وفی بعض کتبنا انه اذا لم یشترط فی اللفظ فالمحل له ثواب لانه نفع اخیه المسلم "کہ جب حلالہ کرنے والے لفظوں میں حلالہ کی شرط نہ کریں' دل ہی دل میں راز پوشیدہ رکھیں تو حلالہ کرنے والے کو بڑا ثواب ہے' اس نے اپنے مسلمان بھائی کو نفع پہنچایا ہے۔"

لیکن حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا کہ یہ زنا ہے۔ مشکوٰۃ مترجم جو مقلدین احناف نے مظاہر حق کے حاشیہ سے شائع کی ہے' اس کے ربع سوم' ص-۲۵ میں حاشیہ پر ہے کہ اس حدیث سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ عقد باطل ہوتا ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ صحیح ہوتا ہے اس لیے کہ اس نکاح کرنے والے کو محلل کہا اور محلل جب ہی ہوتا ہے کہ عقد صحیح ہو' عقد فاسد سے محلل نہیں ہوتا۔

پہلے احادیث اور اقوال صحابہ کرام اور دیگر ائمہ سلف صالحین سے جو کچھ بیان کیا گیا تھا' وہ تو عین شریعت تھی اور یہ جو اب بیان ہو رہا ہے یہ حنفیت ہے۔ بھلا جس چیز کو رسول اللہ ﷺ ملعون قرار دیں اور آپ کے عہد میں وہ زناکاری سمجھی جائے اور علماء محدثین اس نکاح کو فاسد قرار دیں' وہ مقلدین کے نزدیک باعث ثواب اور موجب خیر ہے۔ کس قدر بے سمجھی ہے کہ لفظ محلل سے نکاح کو حلال ثابت کیا جا رہا ہے' حالانکہ یہ ان حیلہ گروں کے ظن کی بناء پر نام رکھا گیا ہے' سماہ محللا علی حسب ظنه۔ اگر شرعاً یہ نکاح حلال ہوتا تو موجب رحمت ہوتا پھر لعنت کیوں پڑتی' فتذکر۔

نکاح حلالہ پر محققانہ تبصرہ

<u>مسئلہ حلالہ</u>: بہشتی زیور حصہ چہارم ص-۴ میں ہے: "تیسری دفعہ اگر طلاق دے گا تو پھر وہی حکم ہے کہ بغیر دوسرے خاوند کئے اس سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اگر دوسرے مرد سے اس شرط پر نکاح ہوا کہ صحبت کر کے عورت کو چھوڑ دے گا تو اس اقرار لینے کا کچھ اعتبار نہیں۔ اس کو اختیار ہے چاہے چھوڑ دے یا نہ چھوڑے۔ جب جی چاہے یہ اقرار کر کے

نکاح کرنا بہت گناہ اور حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت ہوتی ہے' لیکن نکاح ہو جاتا ہے اور اگر نکاح کے بعد دوسرے خاوند نے صحبت کر کے چھوڑ دیا یا مر گیا تو پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے گی۔" (ص-۲۴)

میں کہتا ہوں کہ اس نکاح کو جس میں یہ شرط ہو کہ صحبت کر کے دوسرا خاوند چھوڑ دے' نکاح حلالہ کہتے ہیں' اس کا حکم مذہب حنفی کی حکمت میں بھی مختلف ہے۔

ہدایہ جلد-۲' ص-۴۰۰ میں ہے : وعن ابی یوسف انه یفسد النکاح لانه فی معنی الموقت فیه ولا یحلها علی الاول لفساده "یعنی قاضی ابو یوسف نے فرمایا کہ یہ نکاح حلالہ کا فاسد ہے کیونکہ یہ نکاح موقت کے حکم میں ہے اور نکاح موقت باطل ہے' اس نکاح حلالہ سے عورت مطلقہ پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہو گی کیونکہ اس نکاح میں شرعاً خرابی ہے پس یہ حرام ہے۔"

وعن محمد انه یصح النکاح لما بینا ولا یحلها علی الاول لانه استعجل ما اخره الشرع فیجازی بمنع مقصوده "یعنی امام محمد سے یہ روایت ہے کہ حلالہ کا نکاح تو صحیح ہے لیکن اس حیلہ سازی سے پہلے شخص' طلاق دہندہ پر عورت مطلقہ حلال نہ ہو گی کیونکہ شرع نے اس کے لیے جو مہلت دی تھی' اس میں اس نے جلد بازی سے کام لیا ہے' اس کی سزا اس کو ملنی چاہیے۔" جیسے کوئی شخص اپنے مورث کو اس ارادے سے قتل کر دے کہ اس کی جائیداد کا وارث ہو جائے تو اس قاتل کو ورثہ سے محروم کر دینے کا حکم ہے۔

اب یہاں تین حکیموں کی حکمتیں متعارض ہیں' جن میں حکمت نبوی کی رُو سے قاضی ابو یوسف کی حکمت فائق ہے کہ نکاح فاسد ہے اور اس حیلہ سازی اور فریب کاری سے نہ یہ عورت مطلقہ ثلاثہ دوسرے کے لیے حلال ہے نہ پہلے کے لیے حلال ہے بلکہ سب ملعون اور مردود ہیں اور نکاح حلالہ محض زناکاری' حرام کاری ہے' جس کو فتاویٰ حنفیہ میں باعث اجروثواب قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ فتاویٰ برہنہ میں لکھا ہے کہ نکاح حلالہ میں محلل کے لیے ثواب اور اجر ہے' کیونکہ اس نے محلل لہ پر احسان کیا ہے کہ جو عورت اس پر مدت مدید اور وقفہ بعید تک حرام تھی' نکاح حلالہ سے بہت جلدی اس پر حلال ہو گئی۔

یہ حکمت قیاسیہ' سفاہت اور حماقت سے کتب حنفیہ میں یوں تبدیل کی گئی ہے کہ لفظ

محلل اور محلل لہ جو شارع علیہ السلام کے کلام میں وارد ہے' سے نکاح کی حلت ثابت ہوتی ہے' نعوذ باللّٰہ من ھٰذا الفھم الباطل۔

ہدایہ جلد۔۲' ص۔۳۹۹ میں ہے : سماہ محللا وھو المثبت للمحل "یعنی نبی کریم ﷺ نے نکاح حلالہ کرنے والے کا نام محلل رکھا ہے' اس لیے کہ یہ حلت کا مثبت ہے۔"

یہ اس ہدایہ کا بیان ہے جس کو نعوذ باللہ منہ مثل القرآن کہا گیا ہے۔

اور قدوری کے حاشیہ تنقیح ضروری میں دیوبند کے مدرسہ دارالعلوم کے ایک ادیب نے یہ لکھا ہے کہ اما لو نویا ذاک فی قلبھما ولم یشترطاہ بالقول فلا عبرۃ بہ ویکون الرجل ماجوراً بذالک لقصدہ الاصلاح (بحوالہ زیلعی ص۔۱۵۲ حاشیہ نمبر۔۱۰' قدوری) "یعنی اگر محلل اور محلل لہ نے یا محلل مرد اور محللہ عورت نے اپنے دلوں میں نکاح حلالہ کی نیت کر لی اور زبان سے شرط نہیں کی تو اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور محلل شخص کو ثواب ملے گا کیونکہ اس کی نیت اصلاح کی ہے۔" کہ سابق خاوند کا اپنی بیوی سے معاملہ درست ہو جائے' تو یہ کوفہ کی حکمت قیاسیہ ہے جس کی دیوبند کے دارالعلوم میں تعلیم دی جا رہی ہے۔

افسوس ہے کہ مولوی اشرف علی صاحب حکیم امت حنفیہ اس حکمت باطلہ کا زیور بنا کر پاک وہند کی عورتوں کو پہنا چکے ہیں جو حکمت شرعیہ نبویہ کے سراسر خلاف ہے۔ ملاحظہ کیجئے :

<u>نکاح حلالہ موجب لعنت:</u> صحیح حدیث میں آیا ہے جو فریقین کو مسلم ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا : لعن اللّٰہ المحلل والمحلل لہ "یعنی اللہ تعالیٰ کی ان شخصوں پر لعنت ہے جو نکاح حلالہ کرنے والا ہے اور جس کے لیے کیا گیا ہے۔"

چنانچہ مولوی اشرف علی صاحب نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ نکاح بہت گناہ اور حرام ہے' اللہ تعالیٰ کی اس پر لعنت ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں جیسے بیاج کے معاملہ میں سود لینے والے اور دینے والے اور لکھنے والے اور گواہوں پر لعنت برستی ہے' اسی طرح نکاح حلالہ پڑھانے والے اور حلالہ کرانے والے اور کرنے والے اور گواہوں پر بھی لعنت برستی ہے اور اس عورت پر بھی لعنت برستی ہے جو نکاح حلالہ کرا کر صحبت کرا رہی ہے' بشرطیکہ اس کو خبر ہو۔

افسوس ہے کہ پاک وہند میں یہ نکاح کئی مقامات پر لعنت کی بارش کر رہا ہے۔ اخبار تنظیم لاہور میں نکاح حلالہ کا ایک عجیب کارنامہ شائع ہو چکا ہے جس کا عنوان یہ ہے: "تقلید کی برکتیں" — "حلالہ کی رنگینیاں" (تنظیم ۲/ صفر سنہ ۱۳۴۴ھ ص۳) یہ ایسا قبیح اور حیا سوز فعل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر لعنت کی ہے اور رسول کریم ﷺ نے بھی لعنت کی ہے۔

ابن ماجہ ص۱۴۰ میں حدیث وارد ہے: عن ابن عباس قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المحلل والمحلل لہ "یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے نکاح حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے نکاح حلالہ کیا گیا ہے' دونوں پر لعنت اور پھٹکار کی ہے۔"

پس جس نکاح لعنتی پر اللہ اور رسول ہر دو لعنت فرماتے ہیں' اس کو مولوی اشرف علی کی حکمت صحیح قرار دیتی ہے' یاللعجب۔

سانڈھ مستعار: ابن ماجہ ص۱۴۰ میں حدیث وارد ہے' جس میں یہ مذکور ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خطاب فرمایا کہ کیا میں تم کو ایک ایسے سانڈھ کی خبر دوں جو (شہوت رانی کے لیے) مانگ کر لایا گیا ہے۔ صحابہ نے عرض کی ہاں یارسول اللہ! حضور ﷺ نے بیان فرمایا: ھو المحلل لعن اللہ المحلل والمحلل لہ "کہ وہ سانڈھ وہ شخص ہے جو نکاح حلالہ کرنے والا ہے' لعنت ہو اللہ کی حلالہ کرنے والے پر اور جس کے لیے حلالہ کیا گیا ہے۔"

آنحضور ﷺ نے نکاح حلالہ کرنے والے کو سانڈھ مستعار قرار دیا ہے کہ تین طلاق دے کر عورت کو حرام کرنے والے خاوند پر حلال کرنا چاہتے ہوں' تو کسی شخص کو لاتے ہیں اور اس کو ایک رات کے لیے بشرط طلاق دینے کے نکاح کروا کر صحبت کرواتے ہیں۔

جب وہ سانڈھ اپنی شہوت رانی سے فارغ ہو جاتا ہے تو پھر اس سے طلاق لے لیتے ہیں اور اس طلاق کی عدت گزار کر سابق خاوند دوسرا نکاح اس عورت مستعملہ سے کر لیتا ہے۔ اس شخص محلل کو نبی اکرم ﷺ نے سانڈھ مستعار قرار دیا ہے۔ محلل شخص کو سانڈھ مستعار قرار دینے سے ظاہر ہوا کہ یہ لعنتی نکاح صحیح نہیں فاسد ہے۔ جیسا کہ جمہور سلف صالحین اور محدثین اور ائمہ دین مجتہدین کا مسلک ہے' جو حکمت نبوی پر قائم ہے۔

جناب شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں : "اس سے وہ مصلحت پوری نہیں ہوتی جو نکاح سے مقصود ہے۔ نیز اس میں بے حیائی اور بے عزتی ہے' اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔" (حجۃ اللہ جلد۔۲' ص۔۴۰)

اس شرمناک حلالہ کے نکاح کو صحیح قرار دے کر حنفی دنیا اس پر عمل درآمد کر رہی ہے۔ پس مقلدین حنفیہ کا نکاح حلالہ بے حیائی اور بے عزتی میں آریہ کے نیوگ کے مشابہ ہے۔ (درایہ تخریج ہدایہ ص۔۲۲۹)

نکاح حلالہ زنا ہے: نیل الاوطار جزء۔۶' ص۔۱۳۹ میں یہ حدیث ہے : عن عمر انه جاء اليه رجل فساله عن رجل طلق امراته ثلاثًا فتزوجها اخ له عن غير مؤامرة يحلها لاخيه هل تحل للاول قال لا الا بنكاح رغبة كنا نعد هذا سفاحًا على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم (الحاكم) "یعنی ایک شخص عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اس شخص کے بارے میں مسئلہ دریافت کرنے کے لیے آیا کہ ایک شخص نے اپنی زوجہ کو تین طلاق دے دی ہیں پس اس کو اس کے بھائی نے نکاح کر لیا تاکہ اپنے بھائی طلاق دہندہ پر اس عورت مطلقہ کو حلال کر دے تو کیا اس حیلہ سازی سے وہ عورت پہلے خاوند پر حلال ہو جائے گی یا نہیں؟ تب ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا حلال نہ ہو گی مگر یہ کہ نکاح رغبت سے ہو اور اس نیت سے ہو کہ ہم ہمیشہ رغبت اور محبت سے رہیں گے' ہم تو عہد نبوی میں اس نکاح کو زنا سمجھتے تھے۔"

امام ابراہیم نخعی جو امام ابوحنیفہ کے دادا استاد ہیں کہ وہ حماد کے استاد اور حماد کے ابوحنیفہ شاگرد ہیں' وہ روایت کرتے ہیں : قال ابراهيم النخعي لا يحلها لزوجها الاول الا ان يكون نكاح رغبة فان كانت نية احد الثلاثة الزوج الاول او الثاني او المراة انه محلل فالنكاح باطل ولا تحل للاول "یعنی ابراہیم نخعی نے کہا کہ نکاح حلالہ میں پہلے خاوند کے لیے عورت مطلقہ حلال نہ ہو گی مگر یہ کہ نکاح رغبت کے بطور ہمیشہ آباد کرنے کی نیت سے ہو' پس اگر تین میں سے ایک کی نیت حلالہ کی ہو' پہلے خاوند کی ہو یا دوسرے کی ہو یا عورت کی نیت ہو کہ وہ محلل ہے تو نکاح باطل ہے اور پہلے خاوند کے لیے یہ عورت مطلقہ حلال نہ ہو گی۔"

اغاثۃ اللہفان جلد اول' ص۔۲۸۹ میں ہے : "عبداللہ بن شریک عامری نے کہا کہ میں

نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے سنا جبکہ ان سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنے چچا کی بیٹی کو طلاق دے دی پھر پشیمان ہو کر اس کی طرف راغب ہوا اور ارادہ کیا کہ اس کو کوئی شخص میرے لیے حلال کرنے کو نکاح کر لے تو اس کا کیا حکم ہے؟ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کلاھما زان وان مکث عشرین سنۃ او نحو ذالک "کہ وہ دونوں زانی ہیں اگرچہ اس شرط اور نیت سے بیس سال اس نکاح پر ٹھہرے رہیں۔" پھر فرمایا : اذا کان اللّٰہ اعلم انہ یرید ان یحلھا لہ "یعنی جب کہ اللہ تعالیٰ ان کی نیت کو جانتا ہے کہ ان کا ارادہ اس نکاح سے' پہلے شخص کے لیے اس عورت کا حلال کرنا ہے۔" تو بس یہ زنا کاری ہے' اس سے مقلدین کا یہ مذہب بھی باطل ہوا کہ اگر زبانی شرط نہ کریں' صرف مرد عورت دل میں نیت کر لیں کہ یہ پہلے خاوند پر حلال ہو جائے تب ان کو اجر ملے گا اور یہ جائز ہے۔

نیز اغاثۃ اللھفان کے ص ۲۸۹ پر یہ روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے : انہ قال لا اوتی بمحلل ولا محلل لہ الا رجمتھما (وھو صحیح عن عمر) "یعنی میرے پاس محلل اور محلل لہ لائے گئے تو میں ان کو دیگر زانیوں کی طرح رجم کر دوں گا۔"

اس سے ظاہر ہے کہ نکاح حلالہ حرام اور باطل ہے اور نکاح منعقد اور صحیح نہیں ہوتا' بلکہ زناکاری ہوتی ہے' اس لیے اس کی سزا رجم ہے۔

اب کہاں ہیں وہ مقلدین جو بیس تراویح کے ثبوت میں ان کا قول نقل کر کے حدیث "فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین" سنایا کرتے ہیں۔ اب اس قول فاروقی پر عمل کر کے ان حنفیوں کو رجم کیا کریں جو نکاح حلالہ کرتے کراتے ہیں ورنہ یہ کہا جائے گا : افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض "کہ تم بعض مسائل پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو۔"

نیز یہ اثر ابن عمر رضی اللہ عنہ درج ہے : سئل ابن عمر عن تحلیل المراۃ لزوجھا فقال ذاک السفاح "یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ رئیس الصحابہ سے سوال کیا گیا کہ نکاح حلالہ کا کیا حکم ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ یہ زنا کاری ہے۔"

اس سے ثابت ہوا کہ نکاح حلالہ سے نہ عورت پہلے خاوند کے لیے حلال ہوتی ہے اور نہ دوسرے کے لیے' یہ صریح زناکاری ہے' جس سے جو اولاد پیدا ہو گی' وہ ولد الزنا تصور کی جائے گی۔ تفصیل کے لیے میرا رسالہ سیاحۃ الجنان کا مطالعہ کریں' جس میں تمام گمراہ فرقوں

سے مناکحت حرام قرار دی گئی ہے۔ اسی طرح نکاح شغار کا حکم ہے جس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں ہے۔

نیز اغاثہ کے صفحہ مذکورہ میں ہے کہ سلیمان بن یسار تابعی بیان کرتے ہیں : رفع الی عثمان رجل تزوج امراۃ یحلھا لزوجھا ففرق بینھما "یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ کی عدالت میں ایک شخص پیش کیا گیا جس نے ایک عورت سے نکاح حلالہ کیا تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان میں تفریق کرا دی۔" اس سے بھی ثابت ہوا کہ یہ نکاح باطل ہے ورنہ بلا طلاق تفریق نہ کی جاتی۔

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ محلل کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ نکاح حلالہ کی عورت محلل کی طرف نہ لوٹائی جائے مگر یہ کہ یہ نکاح رغبت اور دستور شرعی سے ہو' ورنہ یہ کتاب اللہ سے مذاق کرنا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو ملعون قرار دیا ہے۔ (اغاثہ)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں اور شیخ الاسلام امام ابن القیم نے اغاثہ وغیرہ اپنی تصنیفات میں ادلہ صریحہ' اقوال صحابہ' اقوال تابعین وتبع تابعین اور اقوال ائمہ محدثین و مجتہدین سے یہ ثابت کیا ہے کہ نکاح حلالہ میں خواہ زبانی شرط کی ہو یا دونوں طرف سے صرف دل میں نیت کی گئی ہو' نکاح صحیح نہیں ہے' باطل ہے' صاف زنا کاری ہے۔

صحیح حدیث میں ہے : انما الاعمال بالنیات "کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔"

جب نیت فریقین یا زوجین کی خاوند اول کے لیے تحلیل کی ہے اور یہ نکاح رغبت سے دائمی نہیں ہے' صرف وقتی حیلہ سازی ہے تو اس کے باطل ہونے میں کسی متشرع اور متدین عقلمند آدمی کو کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

اغاثہ میں ہے کہ ابن جریج نے حضرت عطاء تابعی سے جن کی صداقت پر امام ابو حنیفہ کی شہادت منقول ہے' سوال کیا کہ نکاح حلالہ میں محلل طلاق دے دے تاکہ زوج اول کی طرف عورت رجوع کرے تو انہوں نے فرمایا کہ ویسے اس نکاح میں تفریق کی جائے۔

حضرت قتادہ رئیس التابعین نے فرمایا کہ اگر محلل طلاق دے دے تب بھی پہلے خاوند پر نکاح حلالہ والی عورت حلال نہ ہو گی۔ امام حسن بصری تابعی رئیس الصوفیہ نے فرمایا کہ جب تین میں سے کسی ایک نے بھی تحلیل کی نیت کر لی تو نکاح فاسد ہو جائے گا۔ نیز امام

حسن نے فرمایا: اتق اللہ ولا تکن سمار نار فی حدود اللہ "یعنی حلالہ کرنے والے سے یہ کہا کہ تو اللہ کا خوف کر اور اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑ کر آگ کا کیل نہ بن۔"

حلالہ کی وجہ تسمیہ: اپنی حماقت اور سفاہت کو حکمت قرار دینے والے جو اس نکاح کو گناہ و حرام اور موجب لعنت کہتے ہیں اور پھر لفظ محلل سے اس نکاح کو حلال اور صحیح قرار دیتے ہیں' یہ استدلال سراسر غلط ہے۔ اگر حلال ہوتا تو اس پر لعنت نہ برستی اور صحابہ کرام اس کو سفاح اور زنا قرار نہ دیتے۔ حرام اور موجب لعنت کہنا اور پھر لفظ محلل سے حلال قرار دینا سفاہت ہے' جس کو فقاہت تصور کر رہے ہیں۔

اغاثہ میں شیخ الاسلام علامہ ابن القیم جن کو ملا علی قاری نے اکابر اولیاء میں شمار کیا ہے' یہ فرماتے ہیں: انما سماہ محللا لانہ احل ما حرم اللہ فاستحق اللعنۃ "یعنی محلل کو اس لیے محلل کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو اپنے حرام فعل سے حلال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

عون المعبود جلد۔۲' ص۔۱۸۸ میں ہے: سمّی محللا لقصدہ الی التحلیل "یعنی محلل کو اس لیے محلل کہا گیا کہ وہ حرام کو حلال کرنے کا قصد کرتا ہے۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ محلل نام رکھنے سے شارع کا مقصد حلال نکاح کرنے والا نہیں ہے۔ ہاں یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خیال فاسد میں زوج اول کے لیے نکاح حلالہ سے عورت حرام شدہ کو حلال کرنے والا ہے۔ لیکن اس کے اس لعنتی فعل سے عورت پہلے خاوند کے لیے حلال ہو گئی یا نہیں؟ یہ دوسرے دلائل پر موقوف ہے اور وہ مظہر بطلان ہیں۔

حررہ عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہل حدیث' جلد۔۵۴' شمارہ۔۸' مورخہ ۲۱/ ربیع الثانی سنہ۔۱۳۹۳ھ

مسئلہ نکاح شغار کی تحقیق

بندہ نے مسئلہ نکاح۔ شہ مروجہ پر ایک رسالہ بنام "فیصلہ سید الابرار در حرمت نکاح شغار" لکھا ہے تاکہ اس کے مفاسد کا انسداد ہو جائے۔ وہ رسالہ ضلع میانوالی میں بھی بھیجا گیا لیکن

بجائے اس کی تائید کرنے کے ہمارے فاضل دوست مولوی فضل حق قریشی نے ۵/ جولائی کے الاعتصام میں اس پر تعاقب فرمایا ہے اور ساتھ ہی مجھے اطلاع نامہ بھیجا کہ میں آپ کے رسالہ پر ایک مضمون تحقیق حق کی غرض سے بھیج رہا ہوں۔ آپ اس کا جواب ٹھنڈے دل سے دیں۔

نکاح بٹہ جو ہمارے ملک میں رائج ہے اور جس کی حرمت کے ہم قائل ہیں' اس میں طرفین کی لازماً یہ شرط ہوتی ہے کہ "تیری لڑکی مجھے یا میرے لڑکے کو نکاح میں دے دے' جب میں تجھ کو یا تیرے لڑکے کو اپنی لڑکی نکاح میں دے دوں گا۔"

جن لوگوں میں یہ شرط لازماً ہے' وہ ایک کے لڑکی دینے سے انکار کرنے پر اپنی لڑکی ان کو نہیں دیتے اور راقم نے اپنے رسالہ میں ایسی لازمی شرط کرنے کو ہی نکاح بٹہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ ص ۷ پر لکھا ہے کہ بدلہ میں دینا ایسا مشروط ہو کہ بغیر اس کے دوسرا نکاح نہ ہو۔ اگر ہو تو اس کو معتبر تصور نہ کیا جائے' بس یہ نکاح بٹہ ہے جو شرعاً حرام ہے۔ اس شرط کو شرط لازمی ٹھہرانے میں بندہ بضد نہیں ہے بلکہ اس نکاح کے عادی لوگ عملاً' قولاً' رسماً و رواجاً بضد ہیں۔ اگر ایسی شرط نہیں ہے بلکہ شرط کئے بغیر ایک دوسرے کو لڑکی دے دیتے ہیں تو وہ شغار نہیں ہے۔ چنانچہ ص ۸ پر اس کی تفصیل موجود ہے کہ بغیر شرط کے ایک شخص نے اپنی لڑکی دوسرے کو دے دی اور دوسرے نے اپنی خوشی سے اپنی لڑکی اس کو دے دی۔ نہ زبان سے بٹہ لینا کیا اور نہ دل میں قصد اور ارادہ کیا اور ہر دو کا نکاح مہر کے عوض ہوا' جس طرح عام طور پر نکاح عورتوں کے مہر کے عوض ہوتے ہیں' سو یہ جائز ہے۔

آپ اپنے مکتوب میں یہ فرماتے ہیں : "بندہ کے خیال میں "نکاح بٹہ مروجہ" شغار کی صفت میں اس لیے بھی نہیں آتا کہ ایسے نکاح کے وقت بٹہ کی شرط نہیں ہوتی بلکہ طرفین ایک دوسرے سے زیادہ قریب اور نزدیکی بن جانے کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں' نہ کہ اس ارادے سے کہ ادلا بدلی ہی ہو گی۔" (مکتوب قلمی)

میرے رسالہ میں اس نکاح بٹہ کی تردید درج ہے جس میں طرفین بٹہ لینے دینے کی شرط کرتے ہیں اور بوقت عقد نکاح یا عقد سے پہلے طے کر کے اس کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ آپ اپنے مزعومہ نکاح کی بنا پر میرے رسالہ پر جرح کر رہے ہیں جو انصاف سے بعید اور حقیقت کے خلاف ہے۔ آپ مروجہ نکاح بٹہ کے کوائف معلوم کریں کہ جن خاندانوں میں نکاح بٹہ

کا رواج ہے' ان میں باہمی لینے دینے کی شرط کس طرح پختہ ہوتی ہے اور جہاں بٹہ دینے لینے کا عرف عام ہے' وہاں زبان سے کہہ کر مناکحت میں اس کی عملی پابندی ہوتی ہے اور ارادہ میں بدلہ ملحوظ ہوتا ہے۔ انما الاعمال بالنیة "کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔" ولکل امری مانوٰی "اور ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی ہے۔"

زاد المعاد میں یہ لکھا ہے کہ اگرچہ زبان سے نہ کہا لیکن ارادہ میں ملحوظ رہا تو بھی عقد صحیح نہ ہوگا۔ والمشروط عرفا کالمشروط لفظا فیبطل العقد "یعنی عرف میں جو مشروط ہے' وہ لفظی مشروط کی طرح ہے' پس عقد باطل ہے۔"

رہا آپ کا یہ فرمان کہ اگر ایک انکار کردے تو کیا پہلا نکاح جو ہو چکا ہے' وہ خود بخود فسخ ہو جائے گا یا نہیں؟ اس کے متعلق عرف ہے کہ نکاح بٹہ فسخ ہے اور زوجین میں تفریق کی جائے گی' جیسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ حالانکہ بنو ہاشم اور بنو امیہ ہر دو قبیلوں میں باہمی قرابت اور نزدیکی بھی تھی پھر بھی نکاح فسخ قرار دے کر حکم تفریق نافذ کیا گیا۔

علامہ ابن حزم نے فرمایا ہے کہ یفسخ ابدا۔ اور اگر شرط بٹہ نہیں تھی تو پھر نکاح فسخ نہیں ہوگا۔ باقی جو لوگ اس شرط اور وعدہ کو جائز رکھتے ہیں' وہ بھی اس نکاح کو اس طرح قابل فسخ قرار دیتے ہیں کہ حدیث میں ہے: احق الشروط ان توفوا به ما استحللتم به الفروج "یعنی لائق ترین شرطوں کا کہ جن کو تم پورا کرتے ہو' وہ شرط ہے جس کے ذریعہ تم نے شرم گاہوں کو حلال کیا ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ مقاطع الحقوق عند الشروط "یعنی شرطوں کے قطع ہونے سے حقوق بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔" لہٰذا جب دوسرے نے شرط پوری نہ کی تو پہلا بھی اس نکاح کو کالعدم سمجھتا ہے۔ چنانچہ کئی واقعات ہوئے ہیں کہ جب ایک نے نکاح دیا اور دوسرے نے نہ دیا تو پہلے نے اپنی لڑکی روک لی کہ جب تک دوسرا نکاح نہ دے گا تب تک لڑکی نہ بھیجوں گا پھر فریقین کی لڑائیاں جھگڑے' مقدمے قائم ہوتے ہیں' بروئے شرع تو یہ نکاح فسخ ہے لیکن وہ اپنے مذہب میں اس کو جائز تصور کرتے ہیں۔ اس لیے بذریعہ عدالت کوئی بہانہ بنا کر نکاح فسخ کراتے ہیں یا بروئے پنچائت طلاق لیتے ہیں یا نکاح بٹہ حرام کہنے والوں سے مل کر اس نکاح کو حرام کہہ کر بلا طلاق ہی اپنی لڑکی کو دوسری جگہ بیاہ دیتے ہیں۔

اب ذرا "الاعتصام" ۲۱/ اگست سنہ ۱۹۵۱ء کو سامنے رکھیں اور اس میں محمد عالم سائل کا

سوال پڑھیں وہ لکھتے ہیں کہ "علماء کرام کا اس مسئلہ میں شریعت کی رُو سے کیا خیال ہے کہ زید و عمرو دونوں اپنے بچوں کا نکاح نابالغی کے زمانہ میں .ٹہ کا کرتے ہیں' کچھ زمانہ کے بعد ناراضگی کی وجہ سے زید بلا کسی فیصلہ یعنی طلاق حاصل کئے بغیر اپنی لڑکی اور لڑکے کا نکاح دوسری جگہ کر دیتا ہے۔ عمرو پانچ سال تک خاموش رہا یعنی اپنی لڑکی کا رشتہ اور کسی جگہ نہیں کیا' وہ فیصلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن زید فیصلہ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا بلکہ انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اپنے بچوں کے نکاح اور جگہ کر لئے ہیں' تم بھی کر لو۔ کیا اب عمرو اپنی لڑکی کا نکاح از روئے شرع کر سکتا ہے یا نہیں؟"

اس واقعہ پر غور کریں کہ زید نے بلا فیصلہ اپنے بچوں کا نکاح دوسری جگہ کر دیا اور دوسرے سے کچھ فیصلہ نہ کیا اور کہا کہ تم بھی اپنے بچوں کا نکاح دوسری جگہ کر لو' جس کا مطلب صاف ہے کہ ہمارا .ٹہ تھا جس کو ہم نے خود ہی توڑ دیا ہے۔ فیصلہ اور طلاق کی اس میں ضرورت ہی کیا ہے' اس لیے اس نے دلچسپی نہیں لی کہ معاوضہ کا معاہدہ توڑنا اپنا اختیار ہے۔

جناب مولانا داؤد صاحب محدث غزنوی مدظلہ العالی نے حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ لکھ کر جو فیصلہ صادر فرمایا' اس کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ "جو نکاح تبادلہ کی شکل میں ہو' اس میں مہر کا ذکر ہو یا نہ ہو' وہ ناجائز ہے۔ اس لیے صورت مسئولہ میں نکاح ہی صحیح نہیں۔

آپ کا مطالبہ واقعہ اور فتویٰ کی رُو سے ہم نے پورا کر دیا ہے۔ اب ماننا یا نہ ماننا آپ کا اختیار ہے۔

جناب قریشی صاحب فرماتے ہیں: "مولانا نے اسی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم نامہ کو بنیادی حیثیت دے کر موجودہ مروجہ نکاح .ٹہ کو حرام قرار دیا ہے۔" یہ فرمانا غلط ہے۔ آپ میرے رسالہ کو دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔ بندہ نے ص۔۳ پر عنوان "نکاح .ٹہ کی حرمت کے دلائل" لکھ کر سات عدد دلائل پیش کئے ہیں۔ اول حدیث انس رضی اللہ عنہ "لا شغار فی الاسلام" دوم حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ "نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن الشغار" سوم حدیث عمران بن حصین رضی اللہ عنہ' چہارم حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ' پنجم حدیث عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ' ششم حدیث "لا نکاح الا بولی مرشد" ہفتم حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا "ما کان من شرط لیس فی کتاب اللّٰہ فھو باطل۔" بندہ نے ان سات دلائل کو بنیادی حیثیت دی ہے۔

پھر ص ۔ ے پر یہ عنوان لکھا ہے : "لفظ شغار کی تعریف اور اس کے اقسام" پھر شغار مطلق کی تعریف یہ کی کہ "لڑکی عوض لڑکی کے شرط کر کے نکاح میں دینا" پھر شغار کی دو قسمیں بنا کر ہر قسم کو علیحدہ علیحدہ لکھا ہے۔ ایک قسم تفسیر نافع سے ذکر کی کہ اپنی بیٹی دوسرے کو اس شرط پر بیاہ دینا کہ دوسرا اس کو اپنی بیٹی بیاہ دے اور درمیان میں مہر نہ ہو۔ دوسری قسم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت کی کہ اپنی بیٹی دوسرے کو اس شرط پر بیاہ دینا کہ دوسرا اس کو اپنی بیٹی بیاہ دے اور درمیان میں مہر مقرر کرنا' پھر حدیث لا شغار فی الاسلام سے لائے' دو قسم کی حرمت ثابت کی ہے کہ یہ حدیث مطلق شغار کی نفی کر رہی ہے جو اپنے اخلاق سے دونوں قسموں کو شامل ہے۔

حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ پر قریشی صاحب لکھتے ہیں : "اول تو مذکورہ فیصلہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہے جس کو خود امیر معاویہ رضی اللہ عنہ معناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر رہے ہیں نہ کہ لفظاً"

یہ آپ کی اصولی غلطی ہے کہ آپ ایک فقیہہ اور فہیم اور پھر امیرالمومنین اور پھر وہ شخص جس کے فیصلہ اور روایت پر دیگر صحابہ کا سکوت ہو چکا ہے' اس کو روایت بالمعنی قرار دے کر مخدوش ظاہر کر رہے ہیں' حالانکہ روایت بالمعنی کو جمہور سلف وخلف نے جائز رکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو مقدمہ شرح مسلم للنووی) امام سفیان ثوری کا قول ہے کہ اگر ہم ایک حدیث کو اپنے سنے ہوئے کے موافق بیان کرنا چاہیں تو نہیں بیان کر سکتے۔ (تذکرۃ الحفاظ) امام ابن سیرین کا بیان ہے کہ میں نے ایک حدیث کو دس شیوخ سے سنا' ہر ایک نے مختلف الفاظ میں بیان کیا مگر معنی ایک ہی تھا۔ (مصنف عبدالرزاق) اسی طرح ترمذی کتاب العلل میں امام شعبی اور حسن بصری وغیرہ تابعین سے منقول ہے۔ پھر صحابہ کرام کی روایت بالمعنی کی قبولیت میں تو کسی اہل حدیث کو کلام نہیں ورنہ اہل حدیث کو بہت سی احادیث سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن نکاح المتعة اور دوسرا صحابی کہتا ہے کہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن المتعة اور اسی صحابی سے یہ الفاظ ہیں : ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن المتعة وقال الا انها حرام یومکم هذا الی یوم القیامة۔ غور فرمائیے کہ سب

روایات کے الفاظ مختلف ہیں مگر معنی ایک ہی ہے جو سب کے نزدیک قابل قبول ہے۔

شغار کے متعلق ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے : ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نھی عن الشغار۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے : نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن الشغار۔ لیکن کسی نے وہ الفاظ بیان نہیں کیے جن لفظوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا۔ بس اسی طرح معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرما دیا کہ کہ یہ وہی شغار ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے تو ان میں فرق ہوا؟ سب مرفوع ہیں اور قابل تسلیم۔ صحابہ کرام پر ہم کو اعتماد کرنا واجب ہے کہ جو کچھ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کریں وہ صحیح اور مرفوع ہے' وہ کبھی اپنی رائے کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔

دوسرا اعتراض قریشی صاحب کا حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ ہے کہ یہ صحیحین کی حدیث سے متعارض ہے۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں کیونکہ صحیحین کی احادیث مرفوعہ مطلق شغار کی ممانعت پر وارد ہیں۔ کسی مرفوع حدیث میں شغار کی تعریف موجود نہیں ہے۔ میں نے اپنے رسالہ میں بلوغ المرام کے حوالہ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بخاری و مسلم دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ یہ تفسیر نافع کی ہے' نافع تابعی ہیں جن کا درجہ صحابی سے نیچے ہے' پھر ان کا قول کس طرح حجت ہو سکتا ہے؟

صحیحین کی حدیث کو حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کے معارض قرار دینا علمی غلطی ہے جس میں قریشی صاحب مبتلا ہیں۔ بخاری کتاب الحیل میں صاف مذکور ہے کہ عبیداللہ راوی نے کہا : قلت لنافع ما الشغار "کہ میں نے نافع سے پوچھا شغار کیا چیز ہے؟" قال ینکح بنت الرجل وینکحه ابنته بغیر صداق "یعنی نافع نے یہ کہا کہ آدمی اپنی بیٹی کسی کو نکاح دے اور وہ اس کو اپنی بیٹی نکاح دے اور درمیان میں مہر نہ ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حدیث صحیحین کی مرفوع نہیں ہے بلکہ نافع کا قول ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ نافع کے قول کو لیا جا رہا ہے اور حضرت معاویہ صحابی رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کو چھوڑا جا رہا ہے' حالانکہ مدینہ کے سب قریشی اس کو تسلیم کر چکے ہیں۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں سے بھی کسی نے انکار نہیں کیا لیکن میاں والی کے قریشی اس فیصلہ کو مسترد کر رہے ہیں۔

پھر قریشی صاحب نے ذکر کیا ہے کہ حصاری صاحب کی توجہ حضرت العلام حافظ محمد

صاحب مدظلہ العالی کے فتویٰ کی طرف کرائی گئی۔ میں کہتا ہوں کہ ان کا فتویٰ آپ کے بھی خلاف ہے' کیونکہ عندالعقد اگر شرط ذکر کر دی تو ان کے نزدیک شغار ممنوعہ ہو جائے گا اور یہ بھی انہوں نے لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ مہر کا ذکر نہ ہو تو شغار نہیں۔ حلانکہ قریشی صاحب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ۔۔۔ یہ ہے کہ ایک شخص اپنی لڑکی دوسرے کو اس شرط پر بیاہ دے کہ وہ دوسرا اس کو اپنی لڑکی بیاہ دے اور درمیان میں مہر نہ ہو۔ پس مولانا حافظ محمد صاحب مدظلہ کا فتویٰ کسی مذہب کے بھی موافق نہیں۔

جناب قریشی صاحب نے اکابر علماء اسلام مولانا سید داؤد صاحب غزنوی مدظلہ العالی اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد علی صاحب مدنی متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ کے فتووں کا تذکرہ کرتے ہوئے سب کو صحیحین کی طرف توجہ دلائی ہے' حلانکہ ان کے کہنے سے پہلے ہی سب صحیحین کے عاشق ہیں۔ لیکن سب ہی یہ جانتے ہیں کہ صحیحین میں شغار کی تعریف مرفوعاً مروی نہیں ہے۔ خود مولانا حافظ محمد صاحب زیدت مجدہ نے اس کو راوی کا قول قرار دیا ہے اور صحیحین کی وہ احادیث دیگر احادیث پر مقدم ہیں جو مرفوع ہیں' اقوال کو کسی نے بھی حجت نہیں ٹھہرایا اور نہ ان کو دیگر کتب کی احادیث پر مقدم قرار دیا ہے۔ قریشی صاحب کا صحیحین کے تقدم کو ثابت کرنے کے لیے محدثین کی عبارات پیش کرنا اس موقع پر صحیح نہیں' کیونکہ بے محل ہیں۔ تعارض کے وقت صحیحین کی احادیث مرفوع کو مقدم رکھنے سے علماء اہل حدیث کو انکار نہیں ہے اور اقوال کو مقدم کرنے کا کسی کا مذہب نہیں ہے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی سے جو عبارت نقل کی ہے' وہ صاف ہماری تائید اور قریشی صاحب کی تردید کرتی ہے۔ آپ نے جو ترجمہ کیا ہے' اس پر غور کریں۔ "تمام محدثین نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ جو احادیث ان دونوں کتابوں (بخاری و مسلم) میں متصل مرفوع ہیں' وہ یقیناً صحیح ہیں۔ جو ان کی شان کو گھٹائے گا' وہ بدعتی ہے اور مسلمانوں کے طریقہ سے الگ ہے۔" پس ہمارا بھی اس پر صاد ہے' لیکن جو اقوال ہیں ان کا معارضہ کسی حدیث یا قول صحابی سے ہو جو ان دو کتابوں سے باہر ہیں تو ان کو مقدم کرنے کے ہم قائل نہیں ہیں۔

باقی رہا مولانا محمد صاحب کا یہ فرمان کہ اثبات لغت کے لیے وہ کافی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ اثبات لغت اور حکم شرعی کے اثبات کے لیے اس سے بھی زیادہ کافی ہے

کیونکہ ایک تو وہ مرفوع ہے' دوم اس پر اجماع سکوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مولانا شیخ الحدیث عبیداللہ محدث رحمانی ادام اللہ فیوضہ کو کہ انہوں نے اس فیصلہ کو خوب سمجھا ہے' فرماتے ہیں : الظاهر عندی ان تفسير معاوية للشغار فی حدیث ابی داؤد مرفوع فانه اضافه الى النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ولیس مبنيا على فهمه واجتهاده فمن البعيد ان يقول شيئا من عند نفسه ثم ينسبه الى رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ومعنى يدل قول معاوية هذا ان هذا فرد من افراد الشغار فليس فيه ما يقتضى حصر الشغار فی تلک الصورة التى ذكرت فی الحديث ومن المعلوم ان تفسير الصحابى الذى ذكره سندا الى رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا سبيل الى مرده بل هو اولى واحق بالقبول۔ "یعنی میری تحقیق یہ ہے کہ تفسیر معاویہ رضی اللہ عنہ مرفوع ہے کیونکہ انہوں نے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ وہی شغار ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ یہ بات ان کے فہم اور اجتہاد پر مبنی نہیں ہے۔ یہ بڑی دُور کی بات ہے کہ ایک صحابی اپنے فہم سے بات کہہ کر پھر اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرے اور معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شغار کی قسموں سے یہ بھی ایک قسم شغار کی ہے اور نافع وغیرہ کی حدیث میں جو نفی مہر والی صورت مذکور ہے' اس میں کوئی حصر نہیں ہے کہ بس یہی ایک صورت ہے اور کوئی نہیں ہے۔ یہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے کہ جو تفسیر صحابی کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو' اس کو رد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ وہ سب سے زیادہ قابل قبول ہے۔" (رسالہ محدث دہلی جلد۔۱' نمبر۔۴' جولائی سنہ ۱۹۳۶ء)

میں کہتا ہوں کہ حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ اور تفسیر نافع صحیحین والی میں کوئی معارضہ نہیں ہے۔ اگر بظاہر معارضہ ہو تو اس میں مطابقت کرنی چاہیے' کیونکہ محدثین کے نزدیک جمع بین الروایات اولیٰ ہے اور اعمال بالدلیلین اہمال سے زیادہ لائق ہے' لہٰذا تطبیق یہ ہے کہ اہل لغت نے جو تفسیر شغار کی' کی ہے اور نافع وغیرہ نے جو کی ہے' وہ ایک قسم شغار کی ہے جو جاہلیت میں زیادہ مشہور اور کثیر الوقوع تھی۔ اس لیے اس کو اہل لغت اور فقہاء نے زیادہ ذکر کیا اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے جو شغار کی صورت ظاہر ہے وہ قلیل الوقوع تھی جو بعض کو معلوم تھی' جیسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ۔ یہ دوسری قسم شغار کی ہوئی تو دونوں ممنوع اور

حرام ہیں اور علت اس میں اشتراط اور تعلیق اور توقیف ہے' جو ہر دو صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ پس یہ صورت عمل کی تقویٰ اور احتیاط پر مبنی ہے اور اس سے سب احادیث شغار پر عمل ہو جاتا ہے۔

تفسیر نافع وغیرہ میں جو قید لا صداق یا بغیر صداق وارد ہے' یہ احترازی نہیں ہے بلکہ اکثری ہے۔ جیسے قرآن میں ہے : ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق۔ لا تاکلوا الربلٰء اضعافا مضاعفہ وربائبکم التی فی حجورکم' وغیرھا من الایات۔ اسی طرح آیت وما اھل بہ لغیر اللّٰہ کی تفسیر میں عند ذبیحہ کی قید ہے جو اغلب اور اکثر وقوع کے لحاظ سے ہے۔ اسی طرح شغار کی تفسیر میں لا صداق کی قید کو جان لیں۔ جب حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ سے دوسری صورت ظاہر ہو گئی تو شغار مطلق کی دو فردیں ہو گئیں۔ اب حدیث منع شغار دونوں قسموں کو حاوی ہو گی۔

چنانچہ میرے مضمون مندرجہ الاعتصام مطبوعہ ۱۰/ مئی سنہ ۱۹۵۷ء میں تحفۃ الاحوذی کے حوالہ سے یہ قاعدہ نقل ہو چکا ہے کہ جب مطلق دو متنافی قیدوں سے مقید ہو جائے تو اس کو کسی ایک میں منحصر نہ کیا جائے بلکہ وہ اپنے اطلاق پر رہ کر دونوں کو شامل ہو گا۔ اگر معارضہ صحیح رکھ کر ترجیح کی صورت اختیار کی جائے تو پھر حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ راجح ہو گی کیونکہ تفسیر نافع تابعی کی تفسیر ہے اور حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ میں تفسیر صحابی ہے جو منسوب الی الرسول ہے۔ صحابی کا تابعی پر تقدم ظاہر ہے اور جو حدیث ضعیف اس تفسیر کے بارہ میں ہے' وہ ایک تو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ہے' اس میں ایک راوی یوسف بن خلد ہے جس کو کسی نے ضعیف' کسی نے خبیث' کذاب عدو اللّٰہ اور رجل سوء کہا ہے' کسی نے ذاہب الحدیث' کذاب زندیق اور کسی نے کہا کہ یہ احادیث گھڑا کرتا تھا۔ اس سے روایت کرنا حلال نہیں ہے اور دوسری ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ہے' اس میں ابو الصباح عبدالغفور متروک ہے' لہٰذا یہ حدیث احکام میں حجت نہیں ہے اور حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کی دوسرے طبقہ کی ہے اور حدیث ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی تیسرے طبقہ کی ہے۔ پس طبقہ دوم' تیسرے پر راجح اور مقدم ہے۔ پھر حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ صحیح ہے اور حدیث ابی رضی اللہ عنہ کی ضعیف ہے۔ صحیح ضعیف پر راجح ہے' پھر حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کے منطوق سے .شہ مروجہ حرام ثابت ہے اور حدیث نافع کے مفہوم سے اباحت نکلتی ہے تو مفہوم پر منطوق مقدم ہے۔ پھر فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ پر اجماع سکوتی ہے جو غیر

پر نہیں۔ لہٰذا وہ حجت ہے اور سب سے مقدم ہے۔ الغرض ہر لحاظ سے حدیث فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ حجت اور قابل استدلال ہے جس سے انکار تحکم ہے۔

قریشی صاحب فرماتے ہیں "کسی لفظ کے معنی اور مفہوم کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے صحیحین کا درجہ ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ بات بے دلیل ہے' اس کا ثبوت درکار ہے۔ حجۃ اللہ کی عبارت میں الفاظ "من المتصل المرفوع" آپ کی تردید کر رہے ہیں۔

پھر آپ آخری قسط میں فرماتے ہیں: "صحیحین کی حدیث سے ثابت ہے کہ نکاح شغار وہی ہے جس میں شرط نکاح تبادلہ ہو' اور مہر کا ذکر نہ ہو۔"

میں کہتا ہوں' یہ سراسر غلط ہے اور آپ نے بار بار یہ دھوکا کھایا ہے حالانکہ شغار کی تعریف میں صحیحین کی کوئی حدیث مرفوع نہیں ہے' صرف راوی کا قول ہے جو حجت نہیں ہے۔ قول راوی کو حدیث قرار دینا بہت بڑی علمی غلطی ہے اور پھر دوسری علمی غلطی یہ ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے فرمان منسوب الی الرسول پر ضعیف روایت کو مقدم کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ زیادہ صحیح ہے حالانکہ فرمان معاویہ رضی اللہ عنہ محض فرمان معاویہ رضی اللہ عنہ نہیں ہے' اس پر صحابہ کا اجماع ہو چکا ہے۔ امام ابن حزم محلّٰی میں فرماتے ہیں: فھذا معاویة بحضرة الصحابة لا یعرف له منهم مخالف یفسخ هذا النکاح وان ذکرا فیه الصداق یقول انه الذی عفی عنه رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فا انفع الاشکال جملة "یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بہ موجودگی صحابہ فیصلہ کیا اور اگرچہ فریقین نے مہر بھی مقرر کیا تب بھی اس نکاح کو فسخ کر دیا اور کہا کہ یہ وہی شغار ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ صحابہ میں سے کسی کا اس پر انکار ثابت نہیں ہے۔ پس اس سے مخالفین کے سب اشکال رفع ہو گئے۔" فللہ الحمد۔

قریشی صاحب نے فتاویٰ نذیریہ سے مولانا عبدالوہاب صاحب جھنگوی مرحوم کا فتویٰ بھی پیش کیا ہے جس سے ۔ٹہ مروجہ کو جائز بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ فتویٰ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس فتویٰ کے مفتی مولانا عبدالوہاب صاحب نے اس فتویٰ سے رجوع کر لیا تھا جس طرح مولانا داؤد صاحب' مولانا ذکریا صاحب' مولانا محمد علی صاحب ادام اللہ فالہ لھم نے اپنے سابقہ فتووں سے رجوع کر لیا ہے۔

چنانچہ مولانا عبدالوہاب کے شاگردوں میں سے مولانا عبداللہ صاحب رئیس القوم اوڈ' مولانا عبدالجلیل صاحب مدیر صحیفہ اور خود ان کے صاحبزادے مولانا عبدالستار صاحب شاہد عدل ہیں کہ مولانا عبدالوہاب صاحب۔ شٹہ مروجہ کو حرام جانتے تھے۔ بندہ نے ان کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ اس بارہ میں مولانا کا آخری مسلک کیا تھا تو انہوں نے مجھے جواب دیا اور یہ لکھا : "والدی ماجدی نور اللہ مرقدہ جواز نکاح شغار کے ہرگز قائل نہ تھے بلکہ درس وتدریس وغیرہ میں اکثر اس کی تردید کرتے تھے' فتاویٰ نذیریہ کی عبارت سے اس کے جواز پر استدلال کرنا بالکل غلط اور خلاف ہے۔" (خط نمبر ۱۵۶۰)

نیز دوسرے خط میں فرماتے ہیں : "نکاح شغار مروجہ قطعاً حرام ہے' یہی مولانا مرحوم کا عقیدہ تھا۔"

پس اس سے ظاہر ہے کہ یہ فتویٰ طالب علمی کے زمانہ کا تھا۔ جب خوب تحقیق ہوئی تو رجوع کر لیا' یہی اہل حق کا شیوہ ہے۔

دوم یہ کہ ہم اپنے علماء یا غیر مذہب کے علماء کے مقلد نہیں ہیں۔ ہر عالم کی بات کو تحقیق سے قبول کرتے ہیں' یہی اہلحدیث کا مذہب ہے۔ پس تحقیق کی رُو سے اس فتویٰ کا وہ حصہ جو فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف ہے' بالکل غلط ہے کیونکہ اس میں فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کی رائے قرار دیا گیا ہے حالانکہ وہ مرفوع حدیث ہے جس کو قریشی صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ معناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے۔ اس کی نظیر نسائی کی یہ حدیث ہے کہ زیاد بن صبیح نے کہا کہ میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں نماز پڑھی اور ہاتھ اپنا کمر پر رکھا' انہوں نے ہاتھ کو مار کر مجھے سمجھایا اور کہا کہ یہ صولی پر چڑھنے والے کی شکل ہے۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عفانا عنہ "یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس سے منع فرمایا ہے۔"

اب اہل شغار بتائیں کہ یہ حدیث مرفوع ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس طرح کے لفظوں کی تمام احادیث سے انکار کرتے جائیں اور اگر مرفوع ہے تو پھر حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ بھی مرفوع ہے۔ ما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

دوسری وجہ اس فتویٰ کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ اس کو خلاف حدیث صحیح کے قرار دیا گیا ہے۔ کسی حدیث صحیح میں نفی مہر سے شغار کی تعریف وارد نہیں ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے

کہ فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلاف لغت ٹھہرایا گیا ہے جو غلط ہے۔

علامہ ابن حزم نے محلّٰی میں تمام احادیث نقل فرما کر مسئلہ شغار پر محدثانہ بحث کی ہے اور تمام مخالفین کے اقوال کو اُڑا کر یہ فیصلہ دیا ہے کہ "نکاح شغار حرام ہے" اور مہر ذکر ہو یا نہ ہو بہرحال ہمیشہ کے لیے فسخ ہے۔ چنانچہ میرے مضمون مندرجہ الاعتصام میں ان کی عبارت درج ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اس نکاح کے شغار وعدم شغار سے قطع نظر کر کے بھی اس کو باطل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ قد صح عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کل شرط لیس فی کتاب اللّٰہ فھو باطل ووجدنا اشغار ذکر فیہ صداق او لم یذکر قد اشترطا فیہ شرطا لیس فی کتاب اللّٰہ عزوجل فھو باطل بکل حال۔ (جلد ۹ ص۔ ۵۱۵) "یعنی یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت ہو چکی ہے کہ ہر وہ شرط جو کتاب اللہ سے ثابت نہیں ہے' وہ باطل ہے تو ۔ٹہ مروجہ میں مہر ذکر ہو یا نہ ہو' دونوں فریق جو شرط اس نکاح میں طے کرتے ہیں' وہ کتاب اللہ میں نہیں ہے تو وہ باطل ہے۔" پھر لکھا ہے جو اس شرط باطل کی بناء پر نکاح ہوا' وہ بھی باطل ہے۔

جناب مولانا عبدالواحد صاحب محدث غزنوی رحمہ اللہ کا فتویٰ جو ایک اشتہار میں شائع شدہ ہے' درج ذیل ہے :

میرے فہم میں نکاح کے درمیان لازم بلکہ شرط صحت ہے۔ کہ لڑکی کو امانت الٰہی جان کر وہاں نکاح کر دیان چاہیے جہاں اس کو دینی بھی آرام ہو اور دنیوی بھی اور اپنے فائدے کے لیے ہرگز نہ نکاح کر کے دے۔ چنانچہ نکاح شغار (نکاح ۔ٹہ) لڑکی' لڑکی کے بدلے اور عوض میں دیتے ہیں اور لڑکی کی خیر خواہی کے لیے نہیں دیتے بلکہ صرف اپنی خود غرضی اور اپنی خانہ آبادی کی نیت پر دیتے ہیں۔ اگرچہ مہر جانبین سے مقرر ہو جائے لیکن مہر کے عوض نہیں دیتے بلکہ لڑکی محض کے عوض دیتے ہیں تاکہ ہمارا خانہ آباد ہو جائے۔ جب نیت خیر خواہی لڑکی نہیں ہے تب یہ نکاح شغار ناجائز بلکہ باطل ہے۔ کما قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات وانما لکل امری ما نوی (الحدیث) وقال لا شغار فی الاسلام۔ "عمل صرف نیتوں کے ساتھ ہیں اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی اور فرمایا کہ اسلام میں شغار نہیں ہے۔" اور اگر لڑکی دیتا ہے' اسی کی خیر خواہی دینی و دنیوی کے لیے اور یہ بات ٹھہرا لے کہ تم اپنی لڑکی دے دو' میں اپنی لڑکی دے دوں گا اور

مہر مقرر کرلیں اور یہ شرط نہ کریں کہ میں اپنی لڑکی بایں شرط دوں گا کہ تم اپنی لڑکی دے دو' میں اپنی دے دوں گا ورنہ میں بھی نہ دوں گا۔ اذا فات الشرط فات المشروط وقال امیر المؤمنین عمر مقاطع الحقوق عند الشروط۔ تب جاؤ ہو گا لیکن چونکہ آج کل نکاح شغار نکاح بٹہ کا بڑا روا ہے' حتیٰ کہ بعض جگہوں پر بغیر نکاح بٹہ نکاح ہوتا ہی نہیں' لہٰذا میرے فہم میں علماء کو چاہیے کہ سدا للذریعہ نکاح مبادلہ کو بالکل بند کر دیں۔ کل امر ینلرع بہ الی محظور فھو محظور۔ (مشکٰوۃ) "یعنی جو شے حرام کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہو' وہ بھی حرام ہے۔" ھذا واللہ اعلم۔ (الفقیر الی اللہ الغنی عبدالواحد بن عبداللہ الغزنوی)

مولانا غزنوی مرحوم کی مقدس ہستی شہرہ آفاق ہے۔ ان کے علم و عمل' زہد واتقاء کو سب جانتے ہیں۔ میرے عالم تخیل میں ان کی مثل آج ملک پنجاب میں کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ لہٰذا ان کا یہ فتویٰ واجب القبول ہے۔

علاوہ ازیں بہت علماء اہلحدیث کے فتوے بندہ کے پاس موجود ہیں۔ خصوصاً مولانا حافظ عبداللہ صاحب امرتسری روپڑی امت برکاتہم کا ایک مبسوط رسالہ اس نکاح بٹہ مروجہ کی حرمت پر شائع ہو چکا ہے۔ اسی رسالہ میں جناب مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم کا یہ فتویٰ شائع ہو چکا ہے۔ آپ فرماتے ہیں : "زمانہ رواں میں نکاح تبادلہ (شغار) میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں' ان پر نظر کرکے یہی فتویٰ ہونا چاہیے کہ شغار کسی طرح کا جائز نہیں' ہاں بلا شرط ایک طرف کا رشتہ ہو جائے تو اس کے بعد دوسری طرف کی تحریک ہو جو فریقین کی مرضی سے ہو تو یہ جائز ہے۔" (ابو الوفاء ثناء اللہ کفاہ اللہ امرتسری)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شغار عورت کے بدلہ میں نکاح دینے کو کہتے ہیں' خواہ مہر ملی درمیان میں مقرر ہو یا نہ ہو اور یہ نکاح باطل قابل تفریق ہے اور حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ جس پر صحابہ کا اجماع سکوتی ہے مرفوع کا حکم رکھتی ہے اور وہ حجت ہے اور قول تابعی اور ضعیف روایت سے راجح ہے اور بٹہ مروجہ کی حرمت پر نص ہے۔

عبدالقادر عارف الحصاری

الاعتصام لاہور جلد ۹' شمارہ ۲۱' ۲۲' ۲۳ مورخہ ۲۰ و ۲۷ دسمبر و ۳ جنوری سنہ ۱۹۵۷ء

فیصلہ علماء ابرار در حرمت نکاح شغار

نکاح وٹہ مروجہ کے حرام ہونے پر علماء ابرار کا فیصلہ

نکاح وٹہ کی دو صورتیں تسلیم کرلی گئیں: نکاح شغار جس کو نکاح مبادلہ وتبادلہ اور پنجابی زبان میں "وٹہ دا ساک" "وٹے دی شادی" کہتے ہیں۔ علمائے محققین کے نزدیک از روئے احادیث دو قسم ہے۔

ایک یہ کہ ایک لڑکی دوسری لڑکی کے عوض نکاح دینی شرط کی جائے اور درمیان مہر مقرر نہ ہو۔ دوسری قسم یہ کہ ایک لڑکی دوسری لڑکی کے عوض نکاح دینی شرط کی جائے اور ساتھ مہر بھی مقرر ہو۔

پہلی قسم حدیث نافع تابعی رحمۃ اللہ علیہ سے ثابت ہے اور دوسری قسم حدیث فیصلہ امیر المومنین حضرت معاویہ صحابی رضی اللہ عنہ ہادی مہدی سے ثابت ہے' جو بڑے مدبر اور اعلم بالحال تھے اور عطاء' تابعی سے بھی ثابت ہے جیسا کہ محلّٰی ابن حزم میں درج ہے۔ عطاء نافع کے پایہ کا ہے' لہٰذا دونوں قسمیں نکاح شغار ہیں۔

زمانہ حاضرہ کے اہل شغار جو نکاح وٹہ کا شکار کھیلتے ہیں' وہ دوسری قسم کر کے جو حضرت معاویہ صحابی رضی اللہ عنہ کے فیصلہ سے ثابت ہے' شغار نہیں سمجھتے۔ البتہ بعض مفتیوں کو حقیقت واقعہ اور حوادث زمانہ نے تھپڑ مار کر دوسری قسم بھی تسلیم کروالی ہے' جیسا کہ آگے اس کی تفصیل آئے گی' انشاء اللہ۔ اور بعض مارد متمرد پہلی قسم کو وٹہ کہنے پر مصر اور دوسرے کے وٹہ ہونے کے بدستور منکر ہیں بلکہ بذریعہ تحریر وتقریر اس کی اشاعت کر رہے ہیں۔ اب پہلے علماء محققین سے ان قسموں کا وجود ثابت کیا جاتا ہے پھر منکرین کا اقرار و تسلیم ذکر کیا جائے گا' وباللہ التوفیق۔

(ا) امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ جو مجدد قرن خامس ہیں' اپنی بے نظیر کتاب محلّٰی جلد ۹' ص ۵۱۶ میں فرماتے ہیں: ولا یحل نکاح الشغار سواء ذکرا فی کل ذالک صداقا لکل واحدۃ منہما او لاحدھما دون الاخری اولم یذکرا فی شئی من ذالک صداقا کل ذالک سواء یفسخ ابدًا۔ "یعنی نکاح تبادلہ حرام ہے' خواہ دونوں فریق دونوں عورتوں کا یا دونوں میں

سے ایک کا مہر مقرر کردیں یا نہ کریں یکساں ہے' نکاح ہمیشہ کے لیے فسخ ہے۔"

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک "شغار" دو قسم ہے' ایک بلا مہر اور دوسرا بالمہر' دونوں حرام ہیں اور علت حرمت ان میں اشتراط کو ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ ص-۵۱۵ میں فرماتے ہیں: ووجدنا الشغار ذکر فیه صداق اولم یذکر قد اشترط فیه شرطا لیس فی کتاب اللّٰہ عزوجل فھو باطل بکل حال "یعنی ہم نے شغار میں یہ معلوم کیا ہے کہ مہر کا ذکر ہو یا نہ ہو' دونوں طرف سے شرط باطل ہے' جو کتاب اللہ میں نہیں ہے۔"

یعنی لڑکی کے وٹہ میں لڑکی دینا کتاب اللہ میں نہیں ہے اور جو شرط کتاب اللہ میں نہ ہو وہ باطل ہے' لہٰذا یہ نکاح بہرحال باطل ہے۔

علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے شغار بلا مہر کو حدیث نافع اور شغار بالمہر کو حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ سے ثابت کیا۔

(۲) امام ابو القاسم عمر بن حسین بن عبداللہ بن احمد خرقی جو حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان اور شاگردان شاگردوں میں سے ہیں' جن کی وفات سنہ-۳۳۴ھ میں ہوئی ہے' انہوں نے "مختصر" نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس کی شرح علامہ ابن قدامہ نے بنام "مغنی" شائع کی ہے' اس کی جلد-۷' ص-۵۶۷ میں لکھا ہے: وقال (ای الخرقی) واذا زوج ولیته علٰی ان یزوجه الاخرا ولیته لا نکاح بینھما وان سمّٰی مع ذالک مداقا ایضًا۔ "یعنی امام خرقی نے فرمایا ہے کہ جب کسی نے اپنی رشتہ دار عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے اس شرط سے کیا کہ وہ بھی اپنی رشتہ دار عورت کا نکاح اس سے کردے تو ان کا نکاح نہ ہو گا' اگرچہ انہوں نے ساتھ مہر بھی مقرر کیا ہو۔"

اس کی شرح میں علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ھذا النکاح یسمی الشغار "اس مہر والی مناکحت کا نام بھی شغار رکھا گیا ہے۔"

زاد المعاد میں ہے: وقال الخرقی لا یصح ولو سموا مھرًا علٰی حدیث معاویة رضی اللّٰہ عنه۔ "امام خرقی نے کہا کہ نکاح شغار صحیح نہیں ہے اگرچہ مہر بھی مقرر کریں۔"

اس صراحت سے ثابت ہوا کہ امام خرقی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کی رو سے ایک شغار بالمہر بھی ہے جو حرام ہے۔

(۳) ترمذی شریف میں ہے : ولا یحل وان جعل لهما صداقا وهو قول الشافعی واحمد واسحاق "اگرچہ ان دونوں فریق کے لیے مہر بھی مقرر کریں تب بھی شغار حلال نہیں ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ جب درمیان میں شرط موجود ہے تو مہر مقرر ہونے سے بھی وہ حلال نہ ہو گا تو شغار مہر کے ساتھ بھی حرام ہے۔ امام شافعی' امام احمد اور امام اسحاق کا بھی یہی فتویٰ ہے' یہی مسلک اہل حدیث کا ہے۔

(۴) امام عبدالوہاب بن احمد بن علی شعرانی انصاری رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے سنہ۔۹۴۲ھ میں ایک کتاب بنام "کشف الغمہ" تصنیف کی ہے' اس کی جلد۔۲' ص۔۴۴ فصل فی نکاح الشغار میں لکھتے ہیں : کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ینھی عن نکاح الشغار ویقول لا شغار فی الاسلام "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح تبادلہ سے منع فرمایا ہے اور فرمایا کہ اسلام میں نکاح وٹہ کا کوئی وجود نہیں ہے۔"

پھر شغار کی دو تفسیریں ذکر کی ہیں۔ اول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے : والشغار ان یزوج الرجل ابنته علی ان یزوجه ابنته ولیس بینهما صداق او یقول زوجنی اختک علی ان ازوجک اختی کذالک "شغار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی دوسرے کو اس شرط پر نکاح دے کہ دوسرا اس کو اپنی بیٹی نکاح کر دے اور دونوں کے درمیان مہر مقرر نہ ہو۔" یا دونوں بہنوں کا باہم اس طرح رشتہ کریں۔

پھر لکھتے ہیں : وکان معاویة رضی اللّٰہ عنه یری نکاح الشغار ان یتزوج رجل ابنته رجلا علی ان یتزوجه ابنته والاخر کذالک وکل منهما بصداق وکان یامر بالتفریق ویقول ھذا ھو الشغار الذی نھی عنه رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم "حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ نکاح شغار یہ ہے کہ کوئی مرد اپنی بیٹی دوسرے مرد کو اس شرط پر نکاح کر دے کہ دوسرا بھی اپنی بیٹی کو اس سے نکاح کر دے اور دونوں جانب سے مہر مقرر ہو۔ ایسے نکاح میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور حکومت میں تفریق کرا دی تھی۔"

امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں صورتوں کو ذکر کر کے شغار کی دو قسمیں ظاہر کر دی ہیں۔

(۵) علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نیل الاوطار باب نکاح الشغار میں فرماتے ہیں : وللشغار صورتان احدھما المذکورة فی الاحادیث وھو خلو بضع کل منهما من الصداق والثانیة

یشرط کل واحد من الولیین علی الاخر یزوجه ولیته "یعنی شغار کی دو صورتیں ہیں' ایک جو اکثر احادیث میں مذکور ہے کہ درمیان میں مہر نہ ہو۔ دوسری یہ کہ ایک نکاح دوسرے نکاح کے لیے شرط ہو۔"

دوسری صورت میں مہر ہو تو دوسری صورت بنے گی اور اگر مہر نہ ہوا تو وہی پہلی صورت ہو جائے گی پھر دوسری کہنی فضول ہو گی۔ اس لیے متبادلہ الی الذہن یہی صورت ہے کہ دوسری میں مہر والی صورت شغار ہے۔

(۶) علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے شرح کبیر جلد۔۷' ص۔۵۶۷ میں شغار کی مہر والی صورت کی بھی تصدیق کی ہے۔

(۷) کشف القناع ص۔۱۴۱ میں ہے' ایک صورت شغار بغیر مہر کے ذکر کر کے پھر یہ لکھا ہے : وکذا لو جعلا بضع کل واحدة ودراهم معلومة مهرا للاخرى فان سموا لكل واحدة منهما مهرا "یعنی ہر طرح یہ صورت بھی شغار کی ہے کہ یہ عورت کی شرمگاہ کو دوسرے کے عوض میں کرتے ہوئے ساتھ مہر الگ دراہم بھی مقرر کریں۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ علماء میں ہمیشہ سے دو صورتیں چلی آ رہی ہیں اور دونوں ثابت شدہ ہیں۔

(۸) مدونہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جلد۔۴' ص۔۲ میں ہے' عبدالرحمٰن بن القاسم فرماتے ہیں : "امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا کہ ایک شخص دوسرے کو کہے تو مجھے اپنی لڑکی پچاس روپے کے عوض نکاح دے' میں تجھے اپنی لڑکی سو روپے کے عوض نکاح دوں گا' کیا یہ درست ہے؟ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو برا جانا اور اس کو شغار کی ایک صورت قرار دیا۔" (رسالہ نکاح شغار فاضل روپڑی ضمیمہ)

اس سے ثابت ہوا کہ شغار کی دوسری صورت علماء حق میں ہمیشہ سے مسلم چلی آ رہی ہے' اس کو نظرانداز کر کے نکاح وٹہ حرام کا رواج دینا ظلم ہے۔

(۹) رسالہ شغار محدث روپڑی کے ضمیمہ ص۔۶۵ میں ایک روایت شغار کی بحوالہ مدونہ امام مالک جلد۔۲' ص۔۳۹ میں درج ہے۔ اس میں شغار کی تعریف بلا مہر کے ساتھ دوسری صورت بایں الفاظ مذکور ہے : وما یشبه ذالک "یعنی دوسری صورت جو بلا مہر کی صورت کے مشابہ ہے۔"

اور وہ صورت مہر والے شغار کی ہے کہ ایک لڑکی دوسری کے عوض ہونے کی وجہ سے

اس صورت کے جو مہر کے بغیر ہے' بوجہ اشتراط فریقین کے مشابہ ہے۔ جب علت اشتراط ہے تو دونوں کا حکم ایک ہے' اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو شغار قرار دیا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ عہد صحابہ و تابعین وتبع تابعین میں دو صورتیں مسلم تھیں' جو ان کے عہد میں مروج تھیں۔

(۱۰) جناب فضیلتہ الشیخ عبدالعزیز بن باز دامت فیوضہ ملک عرب میں ایک شہرہ آفاق ہستی ہیں جن کا فتویٰ اہل عرب میں بڑا مستند مانا جاتا ہے اور اب ان کی آمد کی خبر سن کر پاکستان کے اسلامی اخباروں میں بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا مگر افسوس کہ وہ کسی خاص وجہ اور عذر حکومتی سے پاکستان میں تشریف نہ لا سکے' آنجناب ایدہ اللہ بنصرہ سے بندۂ عارف حصاری کی سنہ ۱۹۶۵ء میں مدینہ منورہ میں ملاقات ہوئی جب کہ راقم الحروف بموقع حج مسجد نبوی کی زیارت سے مشرف ہونے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس ملاقات بابرکات میں حضرت الشیخ نے بندہ کو چند رسالے بطور ہدیہ عنایت فرمائے تھے' جن میں سے ایک رسالہ جو خاص ان کی تصنیف ہے' خاص قابل ذکر ہے۔ اس کا نام "نصیحة وتنبیه علی مسائل فی النکاح مخالفة للشرع" ہے۔ یعنی اس رسالہ میں نکاح کے ان مسائل پر تنبیہہ کر کے نصیحت کی گئی ہے جو مخالف شرع ہیں۔ پھر اس کے ص۔۳ پر سب سے پہلے نکاح شغار کا ذکر شروع کیا ہے' کیونکہ اس باطل نکاح کا عہد حاضرہ میں بڑا رواج ہے اور پھر دیگر مسائل کا کیا ہے۔

چنانچہ مسئلہ شغار کے بارہ میں حضرت الشیخ عبدالعزیز ایدہ اللہ بنصرہ نے جو محدثانہ ومحققانہ ارشاد فرمایا ہے' وہ یہاں درج ہے : منها نکاح الشغار وهو ان یزوج الرجل ابنته او اخته او غیرهما ممن له الولایة علیه علی ان یزوجه الاخر او یزوج ولده او ابن اخیه ابنته او اخته او بنت اخیه او نحو ذالک "مخالف شرع نکاحوں میں سے ایک نکاح تبادلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی یا بہن یا دیگر رشتہ دار عورت کا جس پر اس کو ولائت حاصل ہے' دوسرے شخص سے یا اس کے بیٹے سے یا بھتیجے سے اس شرط پر نکاح کرے کہ وہ دوسرا اس کا اپنی بیٹی یا بہن یا بھتیجی وغیرہا سے نکاح کر دے۔"

وهذا العقد علی هذا الوجه فاسد سواء ذکر فیه مهرام لا لان الرسول صلی الله علیه وسلم نهی عن ذالک وحذر منه "یہ عقد اس صورت شرطیہ سے فاسد ہے' خواہ

اس میں مہر کا ذکر ہو یا نہ ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس ناجائز شرط والے نکاح سے منع فرمایا اور ڈرایا ہے۔"

اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ جو چیز تم کو رسول دے' وہ لے لو اور جس سے منع کر دے' اس سے رک جاؤ۔ چنانچہ صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے : ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم نھیٰ عن الشغار "نبی اکرم ﷺ نے نکاح وٹہ سے منع فرمایا ہے۔"

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے : ان الرسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم نھیٰ عن الشغار قال والشغار ان یقول الرجل زوجنی ابنتک وازوجک ابنتی او زوجنی اختک وازوجک اختی "رسول اللہ ﷺ نے نکاح شغار کرنے سے منع فرمایا ہے اور فرمایا کہ نکاح شغار (تبادلہ) یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ تو مجھے اپنی بیٹی نکاح کر دے' میں تجھ سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دوں گا' یا یہ کہے کہ تو مجھے اپنی بہن کا نکاح دے دے' میں تجھے اپنی بہن کا نکاح دے دوں گا۔"

وقال علیہ الصلوٰۃ والسلام لا شغار فی الاسلام "اور فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ اسلام میں وٹہ کا نکاح صحیح نہیں ہے۔"

فھذہ الاحادیث الصحیحۃ تدل علی تحریم نکاح الشغار وفسادہ وانہ مخالف لشرع اللّٰہ ولم یفرق النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بین ما سمی فیہ مھر وما لم یسم فیہ شئی "یہ احادیث صحیحہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نکاح وٹہ حرام اور فاسد ہے اور شریعت الٰہی کے بالکل خلاف ہے۔ ان احادیث میں نبی اکرم ﷺ نے کوئی فرق بیان نہیں کیا کہ ایسے نکاح تبادلہ میں مہر مقرر ہو یا نہ مقرر ہو۔" (علی الاطلاق ذکر ہے کہ شغار ممنوع ہے)

واما ماورد فی حدیث ابن عمر من تفسیر الشغار بان یزوج الرجل ابنتہ علی ان یزوجہ الاخر ابنتہ ولیس بینھما صداق فھذا التفسیر قد ذکر اھل العلم انہ من کلام نافع الراوی (کما ذکرہ الشیخان فی صحیحھما کذا فی بلوغ المرام) "وہ تفسیر جو حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ میں وارد ہے کہ ایک شخص دوسرے کو اپنی بیٹی اس شرط سے نکاح دے کہ دوسرا اس کو اپنی بیٹی نکاح دے اور درمیان مہر مقرر نہ ہو تو اس کے متعلق علمائے محدثین کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ تفسیر نافع راوی کی ہے۔"

ولیس ھو من کلام النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وقد فسرہ النبی صلی اللّٰہ علیہ

وسلم فی حدیث ابی ہریرۃ بما تقدم وھو ان یزوج الرجل ابنته او اخته علی ان یزوجه ۔۔ الاخرابنته او اخته ولم یقل ولیس بینھما صداق فدل ذالک علی ان تسمیة الصداق او عدمھا لا اثرلھا فی ذالک انما المقتضی للفساد ھو اشتراط المبادلة۔ وہ تفسیر جو حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ میں ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کلام نہیں ہے (بلکہ نافع کا قول مدرج ہے) (تعلیقات سلفیہ علی النسائی جلد۔۲' ص۔۷۶ میں ہے' لھذا التفسیر مدرج فی الحدیث من قول نافع)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر تو وہ ہے جو روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں صحیح مسلم کے حوالہ سے پہلے گذر چکی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص دوسرے کو اپنی بیٹی یا بہن اس شرط سے نکاح دے کہ وہ دوسرا اس کو اپنی بیٹی یا بہن نکاح دے۔ یہ مطلق ذکر ہے' اس میں مہر نہ ہونے کی قید کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ مقتضیٰ فساد کا فریقین کا ایک دوسرے سے نکاح لینے کی شرط کرنا ہے۔ مہر ملی ہونے یا نہ ہونے کا اس شرطی نکاح میں کوئی اثر نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں شغار کی تفسیر جو بغیر ذکر مہر کے وارد ہے' یہ مرفوع یعنی کلام نبوی ہے۔ چنانچہ تلخیص الجبیر ص۔۲۹۴ میں ہے کہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ میں تو تفسیر شغار قول نافع سے ہے۔

واما فی حدیث ابی ھریرۃ فھو علی الاحتمال والظاھر انه من کلام النبی صلی اللہ علیه وسلم فان کان من تفسیر ابی ھریرۃ فھو مقبول لانه اعلم بما سمع وھو من اھل اللسان۔ "حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں جو تفسیر شغار کی ہے' اس میں احتمال ہے۔ ظاہر حدیث اسی پر دال ہے کہ یہ تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اگر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی بھی ہو تو بھی مقبول ہے' کیونکہ وہ فرمان نبوی کا مطلب خوب جانتے تھے اور اہل زبان تھے۔" کہ شغار کے محاورہ کو خوب سمجھتے تھے (اور نافع عجمی تھے)

اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تفسیر نبوی ہونے کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو فتح الباری جزء۔۲۱' ص۔۵۷ میں ہے کہ عبدالرزاق نے معمر سے اور اس نے ثابت اور ابان سے اور ان دونوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ لا شغار فی الاسلام والشغار ان یزوج الرجل اخته باخته "اسلام میں نکاح وٹہ نہیں ہے اور وٹہ یہ

ہوتا ہے کہ اپنی بہن دوسرے شخص سے اس کی بہن کے بدلہ میں نکاح کر دے۔"

اس مرفوع روایت میں نفی مہر کا ذکر نہیں ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ اصل شغار تو لڑکی کے بدلے لڑکی لینا شرط کرنا ہے' خواہ مہر ہو جیسے حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ میں ہے اور خواہ مہر نہ ہو جیسے حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ میں بتفسیر نافع ہے۔ شغار کی دو صورتیں ہیں اور دونوں ہی حرام ہیں۔ اہل شغار جو ایک عدم مہر کی صورت لے کر دوسری کو جائز قرار دیتے ہوئے رواج دے رہے ہیں' یہ تحکم اور صریح ظلم ہے۔

پھر حضرت شیخ صاحب فرماتے ہیں : وفی ذالک فساد کبیر لانه یفضی الی اجبار النساء علی نکاح من لا یرغبن فیه ایثار المصلحة الاولیاء علی مصلحة النساء وذالک منکر وظلم للنساء "نکاح وٹہ میں کئی مفاسد ہیں۔ ایک بہت بڑا فساد یہ ہے کہ عورتوں کو نکاح وٹہ میں مجبور کیا جاتا ہے' خواہ وہ اس نکاح پر راضی نہ ہوں' اس میں اولیاء اپنی مصلحت کو عورتوں کی مصلحت پر مقدم رکھتے ہیں۔ یہ بہت بری بات اور عورتوں پر ظلم ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ نکاح تبادلہ میں یہ اکثر دیکھا اور سنا گیا ہے کہ کبھی نابالغ لڑکے سے بالغہ لڑکی کا نکاح کر کے اپنے لیے جوان عورت حاصل کی گئی اور کبھی بوڑھے شخص کو جوان نوعمر لڑکی دے کر عورت نکاح میں لی گئی۔ اسی طرح دیگر عیوب پائے گئے جن کی بنا پر لڑکیاں نکاح پر رضامند نہ ہوئیں اور بصورت ناراضگی حیوانوں کی طرح ان کے وارثوں نے غیروں کے حوالے کر کے اپنا اُلو سیدھا کر لیا' جس میں عورتوں کی صریح حق تلفی پائی گئی اور ولی مرشد نہ رہا' حالانکہ نکاح میں ولی کا مرشد ہونا شرط تھا۔

پھر حضرت الشیخ فرماتے ہیں : ولان ذالک ایضا یقتضی الی حرمان النساء من مهور امثالهن کما هو الواقع بین الناس المتعاطین لهذا العقد المنکر الا من شاء الله "اور اس مفسدہ کی وجہ سے بھی یہ تبادل حرام ہے کہ یہ عورتوں کو ان کے مہر مثل لینے سے محروم کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اس عقد باطل کے کرنے والوں میں واقعات پیش آ رہے ہیں کہ اول تو مہر دیتے ہی نہیں۔ اگر دینا ہو تو معمولی مہر دے کر طرفین کے اولیاء اپنے لیے آسانی پیدا کرتے ہیں' لڑکیوں کی حق تلفی ہو جاتی ہے' حسب منشا مہر نہیں لے سکتیں۔"

حضرت الشیخ فرماتے ہیں : کما انه کثیرا ما یفضی الی النزاع والخصومات بعد

الزواج وھذا من العقوبات للعاجلة لمن خالف الشرع "بسا اوقات مناکحت کے بعد ہی جھگڑے فساد مقدمہ بازی شروع ہو گئی اور دونوں طرف کی لڑکیاں معلقہ ہو کر بیٹھی رہیں۔ یہ لوگ شرع کے خلاف چلنے پر دنیا ہی میں سزا پا رہے ہیں۔" (آگے آخرت باقی ہے)

اس کے بعد حضرت الشیخ فرماتے ہیں : وروی احمد وابوداؤد باسناد صحیح عن عبدالرحمٰن بن ھرمزان العباس بن عبداللّٰہ بن عباس انکح عبدالرحمٰن الحکم ابنته وانکحه عبدالرحمٰن ابنتا وقد کانا جعلا صداقا فکتب امیر المومنین معاویۃ بن ابی سفیان رضی اللّٰہ عنه الی امیر المومنین مروان بن الحکم یامرہ بالتفریق بینھما وقال فی کتابه ھذا الشغار الذی نھی عنه رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم "امام احمد اور ابوداؤد نے صحیح اسناد کے ساتھ عبدالرحمٰن بن ہرمز سے یہ واقعہ روایت کیا ہے کہ عباس بن عبداللہ بن عباس نے اپنی بیٹی کا نکاح عبدالرحمٰن بن حکم سے کر دیا اور عبدالرحمٰن نے اپنی بیٹی کا عباس بن عبداللہ سے نکاح کر دیا اور دونوں نے مہرولی ملی بھی مقرر کر دیا تھا۔ پس امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے (اطلاع پا کر) امیر مدینہ مروان کے نام یہ حکم نامہ لکھا کہ ان دونوں نکاحوں میں (بلا طلاق) تفریق کرا دیں (کہ یہ مناکحت حرام ہے) اور اپنے حکم نامہ میں یہ لکھا کہ یہ بھی وہی شغار ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا۔"

پھر شیخ صاحب فرماتے ہیں : فھذہ الحادثة التی وقعت فی عھد امیر المؤمنین معاویۃ توضح لنا معنی الشغار الذی نھی عنه الرسول صلی اللّٰہ علیه وسلم فی الاحادیث المتقدمة وان تسمیة الصداق لا تصح النکاح ولا تخرجه عن کونه شغارا ومعاویۃ رضی اللّٰہ عنه اعلم باللغة العربیة وبمعانی احادیث الرسول صلی اللّٰہ علیه وسلم من نافع مولی ابن عمر رضی اللّٰہ عنه عن الجمیع "یہ حادثہ جو امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں واقع ہوا ہے' ہمارے لیے شغار کا معنی خوب واضح کر رہا ہے کہ سابقہ احادیث میں جس شغار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے' یہ بھی اس میں داخل ہے (کہ علت اشتراط اور مقابلہ نکاح بالنکاح پایا گیا) اور اس نکاح بالنکاح میں مہرملی کا مقرر کرنا اس مناکحت کو نہ صحیح کر سکتا اور جاہلیت کے شغار سے (جو اکثر بلا مہرملی ہوتا تھا) اس کو باہر نہیں نکال سکتا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ صحابی رسول' خلیفہ اسلام لغت عربی کے اور احادیث نبویہ کے معنوں کے نافع تابعی عجمی الاصل سے زیادہ عالم تھے۔"

میں کہتا ہوں کہ فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ شغار کی دوسری صورت جس پر بنو ہاشم اور بنو امیہ مدینہ کے دو مشہور قریشی خاندانوں نے عمل کیا تھا' نص قاطع ہے اور اس پر تمام سلف صالحین صحابہ و تابعین کا جو عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں موجود تھے' اجماع سکوتی پایا گیا ہے۔ کسی نے اس حکم تفریق پر انکار نہیں کیا اور حکم امیر کی اطاعت اس کو مقتضی ہے کہ یہ حکم نافذ ہوا۔ اب جو علماء اہل شغار مروجہ اس واقعہ قطعیہ کی تاویلات فاسدہ اور عذرات باردہ کرتے ہیں' وہ سب لغو اور باطل ہیں۔

بہرکیف ملک عرب کے ایک بہت بڑے عالم اور مفتی نے جو مدینہ منورہ کی اسلامی یونیورسٹی کے مہتمم ہیں' شغار کی دوسری صورت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کو حرام قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح ہمارے علمائے اہلحدیث' مفتیان دین بھی اکثر اس صورت ثانیہ کو تسلیم کر کے نکاح وٹہ کے حرام ہونے کا فتویٰ صادر کر چکے ہیں جن کی تحریرات راقم الحروف عارف حصاری کے دفتر میں موجود ہیں۔ بوجہ خوف طوالت مضمون ان کو یہاں نقل نہیں کیا جا رہا' البتہ ان علماء اسلام کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں :

(۱) جناب حضرت مولانا سید عبدالواحد صاحب محدث غزنوی رحمۃ اللہ علیہ (۲) حضرت العلام مولانا حافظ عبداللہ صاحب محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ (۳) حضرت العلام حافظ محمد حسین صاحب مولوی فاضل رحمۃ اللہ علیہ (۴) حضرت واعظ الاسلام حافظ محمد اسماعیل صاحب روپڑی رحمۃ اللہ علیہ (۵) حضرت مفسر القرآن والحدیث مولانا حافظ عبدالستار صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (۶) حضرت مولانا عبدالمجید صاحب مدیر "اہلحدیث" سوہدرہ رحمۃ اللہ علیہ (۷) حضرت مولانا عبدالقادر صاحب لکھوی رحمۃ اللہ علیہ (۸) حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب محدث لکھوی (۹) حضرت مولانا عبدالکریم صاحب امین غزنوی (۱۰) حضرت مولانا اشرف صاحب سندھو بلوکی رحمۃ اللہ علیہ تلک عشرہ کاملہ۔

یہ علماء ہمارے ان مشاہیر علماء اکابرین سے ہیں جو اس دار فانی سے رحلت فرما کر عالم برزخ میں پہنچ چکے ہیں۔ اب ان علمائے کرام کے اسماء گرامی درج کئے جاتے ہیں جو اس وقت بقید حیات ہیں اور تبلیغ حق کر رہے ہیں :

(۱) جناب مولانا محمد اسماعیل صاحب امیر جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان مدظلہ (۲) حضرت مولانا حافظ عبدالقادر صاحب روپڑی مناظر اسلام ایدہ اللہ بنصرہ (۳) جناب مولانا احمد الدین

صاحب گکھڑی دام فیوضہ (۴) جناب مولانا حافظ عبداللہ صاحب محدث بڈھیماوی شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ لائل پور دامت برکاتہ (۵) جناب مولانا عبدالجلیل صاحب مدیر صحیفہ اہلحدیث کراچی متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ (۶) جناب مولانا الحاج قاری عبدالغفار صاحب سلفی خطیب جامع محمدیہ کراچی (۷) جناب حضرت مولانا عبیداللہ صاحب شیخ الحدیث رحمانیہ دہلی مصنف مرعاۃ المفاتیح مدظلہ العالی (۸) جناب حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی ادام اللہ فیوضہ (۹) جناب حضرت مولانا حافظ عبدالمنان صاحب شیخ الحدیث ساہیوال دام فیضہ (۱۰) جناب حضرت مولانا صوفی محی الدین صاحب واعظ لکھوی دامت برکاتہ (۱۱) جناب مولانا عبداللہ صاحب محدث لائل پوری مدظلہ العالی (۱۲) جناب مولانا محمد اسحاق صاحب مولوی فاضل شیخ الحدیث مدرسہ دارالقرآن والحدیث دام فیوضہ۔

یہ ایک درجن ان علمائے کرام کے اسماء گرامی ہیں جو اس وقت زندہ موجود ہیں اور ان کے علاوہ بندہ کے پاس بہت سے علماء کرام کے فتوے موجود ہیں جن کے اندراج سے خوف طوالت مانع ہے۔

اب یہاں ان علماء کرام کے اسماء گرامی مع ان کی تحریری فتووں کے مختصر اقتباسات کے درج کرتا ہوں جو پہلے دوسری صورت نکاح وٹہ کے جواز کے قائل رہ کر پھر صورت ثانیہ کو شغار تسلیم کرتے ہوئے حرمت وٹہ مروجہ کی طرف رجوع فرما چکے ہیں اور ان کا یہ رجوع الی الحق ان کے مخلص ہونے پر دال ہے۔

(۱) جناب حضرت مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی رحمۃ اللہ علیہ قوم اوڈ کے ایک نزاع واقعہ بنام ریاست پٹیالہ میں ثالثین میں شمار تھے' آنجناب نے نکاح وٹہ مروجہ جو مہر کے ساتھ ہوتا ہے جائز قرار دیا تھا' جس کو جمعیت اہل حدیث میانوالی نے ایک پمفلٹ میں نقل کر کے بہت اپنایا' حالانکہ بندہ نے حضرت مولانا مرحوم کا رجوع ان کے بعد کے فتوے سے ثابت کر دیا تھا جو ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ چنانچہ اخبار الاعتصام لاہور مطبوعہ ۳۱/ اگست سنہ ۱۹۵۱ء میں ان کا مکمل فتویٰ درج ہے جو مع سوال وجواب ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے :

سوال : علمائے کرام کا اس مسئلہ میں شریعت کی رُو سے کیا خیال ہے کہ زید و عمرو دونوں اپنے بچوں کا نکاح نابالغی کے زمانہ میں وٹہ کا کرتے ہیں۔ کچھ زمانے کے بعد ناراضگی کی وجہ سے زید بلا کسی فیصلہ یعنی طلاق حاصل کئے بغیر اپنی لڑکی لڑکے کا نکاح دوسری جگہ کر

دیتا ہے۔ عمرو پانچ سال تک خاموش بیٹھا رہا یعنی اپنی لڑکی کا رشتہ اور کسی جگہ نہیں کیا۔ وہ فیصلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن زید فیصلہ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا بلکہ انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اپنے بچوں کے نکاح اور جگہ کر لیے ہیں' تم بھی کر لو۔ کیا اب عمرو اپنی لڑکی کا نکاح ازروئے شرع کر سکتا ہے یا نہیں؟ (سائل محمد عالم)

ناظرین! اول مفاسد وٹہ پر غور کریں کہ نکاح وٹہ والے مہرلالی وغیرہ کو مقصود بالذات تصور نہیں کرتے بلکہ لڑکی کو لڑکی کے عوض سمجھ کر معاملہ کرتے ہیں۔ اس لیے مولانا غزنوی مرحوم نے وٹہ کی حقیقت پر پہنچ کر مندرجہ ذیل فتویٰ صادر فرمایا' جس سے ان کا رجوع الی الحق ثابت ہوا' فللّٰہ الحمد۔

جواب : اقول وباللہ التوفیق۔ حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے .ٹہ کا نکاح ناجائز قرار دیا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ .ٹہ کا نکاح ممنوع ہے (مگر جمعیت اہلحدیث میانوالی اور اس کے مفتیان شغار اختلاف پیدا کر رہے ہیں جو حرام ہے) لیکن اگر کوئی .ٹہ کا نکاح کرے تو اکثر ائمہ دین کے نزدیک یہ نکاح صحیح نہ ہو گا۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ عباس بن عبداللہ بن عباس نے اپنی بیٹی کا نکاح عبدالرحمٰن بن حکم سے کر دیا اور عبدالرحمٰن بن حکم نے اپنی بیٹی عباس بن عبداللہ سے بیاہ دی اور دونوں نے مہر بھی مقرر کیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان کو لکھا (جو اس وقت حاکم حجاز تھے) کہ اس نکاح کو ناجائز قرار دیا جائے اور اس کو فسخ کر دیا جائے اور اپنے حکم نامہ میں لکھا کہ یہ وہی شغار ہے کہ جس سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ جو نکاح تبادلہ کی شکل میں اس میں مہر کا ذکر ہو یا نہ ہو وہ ناجائز ہے۔ اس لیے صورت مسئولہ میں نکاح صحیح نہیں۔ (الاعتصام ۳۱/ اگست سنہ ۱۹۵۱ء)

فیصلہ سنام میں جناب حضرت رئیس المتقین مولانا سید عبدالواحد صاحب غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے۔ آپ نے اس مسئلہ کا جو فیصلہ صادر فرمایا تھا وہ مولوی عبدالرحمٰن اوڈ کے اشتہار "القول الفیصل" میں درج ہے۔ جمعیت اہلحدیث میانوالی کے ارکان نے اس کو اپنے رسالہ سبیل الرشاد میں نقل کیا ہے مگر سراسر خیانت سے کام لیا ہے کہ پورا فیصلہ نقل نہیں کیا۔ اس میں کتر بیونت سے کام لے کر اپنے مطلب کی عبارت نقل کر دی۔ یہ یہودیانہ روش ہے' اہلحدیث کو ایسی روش سے بچنا واجب ہے۔

مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی نے صاف یہ لکھا ہے : "چنانچہ نکاح شغار میں لڑکی' لڑکی کے بدلے اور عوض میں دے دیتے ہیں اور لڑکی کی خیر خواہی کے لیے نہیں دیتے بلکہ صرف اپنی خود غرضی اور اپنی خانہ آبادی کی نیت پر دیتے ہیں۔ اگرچہ مہر جانبین سے مقرر ہو جائے لیکن مہر کے عوض نہیں دیتے ہیں بلکہ لڑکی ہی کے عوض میں دیتے ہیں تاکہ ہمارا خانہ آباد ہو جائے۔ جب نیت لڑکی کی خیر خواہی نہیں تب یہ نکاح شغار ناجائز بلکہ باطل ہے۔"

رسالہ کے ص-۲۷ پر جو ناقص فیصلہ درج ہے اس میں ہماری نقل کردہ عبارت میں سے "لڑکی کی خیر خواہی" کے الفاظ سے لے کر الفاظ "بلکہ باطل ہے" تک تین سطر عبارت اڑا دی جس سے فیصلہ حق اور صواب ظاہر ہوتا تھا اور اس سے .ٹہ مروجہ کی تردید پائی جاتی تھی۔

ہر چند بندہ نے اس خیانت کا اظہار کر کے فیصلہ درست کر کے شائع کرنے کو لکھا تھا مگر جمعیت نے اس گناہ کو مولوی عبدالرحمٰن اوڈ پر ڈال کر اس کی اصلاح نہ کی اور غلط فیصلہ بدستور جاری ہے۔

اس فیصلہ سنام میں مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی صاحب بھی ثالث تھے۔ آنجناب نے .ٹہ مروجہ کو نفی مہر کی قید نہ ہونے اور مہر مقرر کرنے کی وجہ سے جائز قرار دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس کو نکاح .ٹہ نہ کہا جائے گا مگر حقیقت نہ بدل سکی کہ لوگ اشتراط سے نکاح کرتے رہے اور اس کا نام .ٹہ رکھتے رہے اور .ٹہ ہونے کے نتائج ظاہر ہوتے رہے تو مولانا غزنوی مرحوم نے امیر جمعیت اہلحدیث مقرر ہونے کے بعد سنہ-۱۳۷۰ھ میں اپنا فتویٰ نکاح .ٹہ مروجہ کے باطل ہونے کا شائع کر کے اپنا فیصلہ سناہی جو سنہ-۱۳۴۳ھ میں ہوا تھا' منسوخ و مسترد کر دیا۔ اب یہ فتویٰ سنہ-۱۳۷۰ھ کا فیصلہ سنہ-۱۳۴۳ھ کا ناسخ ہے۔

فیصلہ سناہی میں تیسرے ثالث جناب حضرت مولانا سید محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی تھے جو آج بھی .بفضلہ تعالیٰ بقید حیات ہیں اور منڈی صادق گنج ضلع بہاولنگر کی مسجد غزنویہ کے خطیب لبیب ہیں جو منیب الی اللہ ہو کر اس مسئلہ میں رجوع الی الحق کر چکے ہیں۔ چنانچہ ان کا قلمی فتویٰ بندہ کے پاس موجود ہے جس میں وہ یہ فرماتے ہیں :

"صورت مذکورہ بالا میں نکاح صحیح نہیں ہوتا' خواہ مہر ہو یا نہ ہو' اس لیے کہ حدیث مرفوع کے مقابلہ میں اقوال کی کوئی حیثیت نہیں۔" ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

(تحریر ۲۷/ شوال سنہ ۱۳۷۴ھ) (محمد زکریا غزنوی)

سنام کے فیصلہ میں جناب موصوف الصدر کے دستخط بحیثیت ثالث ہو چکے ہیں مگر .ٹہ کی حقیقت پر اطلاع پا کر اپنے تایا زاد بھائی مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم کی طرح اس تصدیق اور فیصلہ کو منسوخ کر چکے ہیں۔ پس .ٹہ کی ہر دو صورتوں کے یہ تینوں غزنوی ثالث قائل ہو کر اس فیصلہ سناہی کو مسترد فرما گئے ہیں' فللہ الحمد۔

رسالہ میانوالی کے مفتی نمبر۔۴ کا رجوع : جمعیت میانوالی نے نکاح باطل .ٹہ مروجہ کو حلال اور سبیل الرشاد اور صراط مستقیم قرار دیتے ہوئے جن مفتیوں کا فتویٰ اور نام لکھ کر عوام کو یہ دھوکہ دیا ہے کہ یہ سب .ٹہ مروجہ کو جائز کہتے ہیں' ان میں سے کئی ایک عالم رجوع فرما کر .ٹہ مروجہ کی حرمت کے قائل ہو کر اس رسالہ کو مسترد کر چکے ہیں۔ جن میں سے ایک مفتی اعظم مناظر اسلام حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب فاضل امرتسری ہیں جو اپنے عہد میں سردار اہلحدیث تھے۔ آنجناب کا ایک فیصلہ اخبار اہلحدیث مطبوعہ ۳/ جنوری سنہ ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا ہے جو سابقہ فتویٰ جواز کا پورا ناسخ ہے اور یہ مولانا کا آخری فتویٰ ہے۔ اس کے بعد مولانا مرحوم پاکستان کی طرف ہجرت فرما کر سرگودھا میں مقیم رہے اور پھر وہیں رحلت فرما گئے' انا للہ۔

اخبار مذکور میں دو عالموں کا نزاع درج ہے جو بصورت سوال فیصلہ کے لیے آیا' جس کی نقل مندرجہ ذیل ہے۔

نکاح .ٹہ زنا کاری ہے : (سوال نمبر۔۳) ہمارے یہاں ایک مولوی صاحب شغار (نکاح .ٹہ) کے جواز کے متعلق حدیث : عن ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن الشغار والشغار ان یزوج الرجل ابنتہ علی ان یزوجہ الاخر ابنتہ ولیس بینھما صداق (متفق علیہ) بیان کرتے ہیں کہ مہر کے بغیر شغار ناجائز ہے' مہر مقرر کر دیا جائے تو جائز ہے۔ (اس حدیث میں عبارت الشغار سے لے کر آخر تک حدیث نبوی نہیں ہے۔ تعلیقات سلفیہ بر نسائی جلد۔۲' ص۔۷۶ میں ہے : ھذا التفسیر مدرج فی الحدیث من قول نافع "یہ تفسیر قول نافع کا ہے' جو حدیث رسول کہتا ہے وہ جاہل ہے۔")

میں یہ حدیث پیش کرتا ہوں : لا شغار فی الاسلام "شغار اسلام میں مطلق جائز نہیں۔" کیونکہ نکرہ جب نفی کے بعد واقع ہوتا ہے تو فائدہ عموم کا دیتا ہے' میں تو شغار کو

سول میرج کی طرح دائمی زنا سمجھتا ہوں۔ کیا یہ صحیح ہے؟
(عبدالمجید اکاؤنٹنٹ صادق اسٹیٹ حیدر آباد سندھ)

جواب نمبر۔۳۰ : شغار کے متعلق آپ کی رائے صحیح ہے۔ "لیس بینھما صداق" یہ فقرہ اتفاقیہ ہے' قید احترازی نہیں۔ اس مسئلہ کی مفصل بحث نیل الاوطار میں ملاحظہ ہو' اللہ اعلم۔

سائل نے ۔ٹہ مروجہ کو ناجائز اور دائمی زنا قرار دے کر مولانا سے استصواب کیا تھا تو مولانا نے پہلے محض کی دلیل میں عدم مہر کی قید کو اتفاقی رکھ کر اور قید احترازی کی نفی کرتے ہوئے سائل کی رائے کو صحیح قرار دیا کہ شغار مطلق جائز نہیں اور یہ دائمی زنا ہے۔

مولانا کا ایک فتویٰ اخبار اہلحدیث امرتسر جلد۔۲۳' مطبوعہ ۶/ رجب سنہ۔۱۳۶۵ھ میں درج ہے۔

سوال نمبر۔۱۰۱ : ۔ٹے کا نکاح شریعت محمدیہ میں حلال ہے یا حرام؟ اور جو ملا اس قسم کا نکاح کرے' وہ گنہگار ہو سکتا ہے یا کہ نہیں؟ (محمد سلطان فیروز پوری)

جواب نمبر۔۱۰۱ : ۔ٹے کا نکاح بحکم حدیث لا شغار فی الاسلام منع آیا ہے۔ حدیث شریف کے خلاف کرنے والا گنہگار ہے' چاہے کوئی ہو۔

اس فتویٰ سے ظاہر ہوا کہ نکاح ۔ٹہ پڑھانا بھی حرام ہے اور نکاح خواں گنہگار ہے۔ فتاویٰ ثنائیہ جلد۔۲' ص۔۳۳۰ تا ص۔۳۳۵ میں مسئلہ شغار کی بحث درج ہے' جس میں مولانا عبدالجلیل صاحب سامرودی نے ایڑی سے چوٹی تک زور لگا کر شغار بلا مہر کو حرام اور شغار بالمہر کو جائز بنانے کی کوشش کی تھی۔ مولانا ثناء اللہ صاحب نے ان کی دلجوئی فرماتے ہوئے ان کی تحقیق کو قابل قبول کہہ کر پھر اس پر پانی پھیر کر اس کو مسترد کر دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

"تحقیق انیق قابل قبول ہے' پہلے میرا فتویٰ وہی تھا مگر واقعات سے ثابت ہوا کہ چند پیسے مہر رکھ کر بھی نکاح شغار میں بڑا فساد یہ ہوتا ہے کہ ایک فریق کا بہو سے کچھ بگاڑ ہوا تو اپنی لڑکی روک لی' دوسرے فریق کو تکلیف دینے کے لیے یا ایک فریق نے بوجہ ناچاقی بہو کو معلق رکھا تو دوسرا اسی طرح کرتا ہے' اس لیے بسا اوقات بے گناہوں پر بھی ظلم کرتے ہیں' اس لیے آج کل میرا فتویٰ یہ ہے کہ "نکاح شغار باوجود مہر کے بھی جائز نہیں۔" (فتاویٰ

ثنائیہ جلد-۲' ص-۳۵)

مولانا فاضل امرتسری کے آخری فتووں سے ظاہر ہوا کہ وہ سابقہ فتویٰ سے رجوع فرما کر شغار کی دوسری صورت کو بھی حرام تسلیم کر چکے ہیں' جس سے ظاہر ہوا کہ میانوالی عقیدہ کہ "بٹہ مروجہ صراط مستقیم ہے" سراسر باطل ہے۔ ان کے مسلمہ مفتیان دین اس راستہ کو حرام اور زناکاری کا راستہ بتا رہے ہیں' پس یہ راستہ ضلال ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالجلیل صاحب سامرودی جو پہلی صورت شغار کے سخت حامی اور دوسری کے مجوز تھے' ان کو علمائے محرمین مثلاً حضرت العلام محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقات علمیہ اور واقعات نے ایسا مجبور کیا کہ وہ بھی دوسری صورت کو تسلیم کر گئے۔ ع

"جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے"

چنانچہ جمعیت میانوالی نے ان کا فیصلہ اپنے رسالہ کے آخر میں لکھ کر تمام رسالہ پر سیلاب پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کے فتویٰ کے چند اقتباسات یہ ہیں :

سبیل الرشاد کے ص-۷۶ میں مراسلہ سامرودی درج ہے' اس میں یہ لکھا ہے : "شغار کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) وہ جو احادیث میں وارد ہے' خالی ہونا بضع مہر واحد کا صداق ہے۔ (کذا فی الاصل) (۲) ہر دو عورتوں کے والی ایک دوسرے پر شرط لگائیں کہ وہ اپنی مولیہ کا ایک دوسرے سے نکاح کر دے۔ یہ دونوں ہی صورتیں ممنوع ہیں۔"

اور ص-۷۷ میں ہے : "اگر شرط ہے' بس یہی وہ شغار حرام وباطل ہے ...... اگر ہر دو جانب سے اشتراط عقد ہے تو بٹہ درست نہیں بلااتفاق۔" (اس سے ظاہر ہے کہ مولانا سامرودی کے نزدیک شرط بھی علت حرام ہونے کی' کی ہے سو یہ بٹہ میں موجود ہے۔)

ص-۷۹ میں لکھا ہے : "صرف ابن حزم نے شرط کو بالوضاحت بیان کر دیا ہے جو کہ نفس حدیث ہی سے مستفاد ہے۔ اگر شرط کے طریقہ سے یہ نکاح نہ ہو تو ابن حزم تو منع نہیں کرتے۔"

پھر آخری ص-۸۰ پر یہ منقول ہے : "قوم اوڈ ہو یا جس قوم میں مقصود بالذات فرج کا لینا اور فرج کا دینا اور اسی پر مدار نکاح ہو اور مہر کالعدم یا برائے نام ہو اور وہ بھی دینے کی نیت نہ ہو تو یہ بھی وہی شغار منہی عنہ ہے۔"

کچھ شک نہیں کہ بٹہ مروجہ میں اشتراط ہوتا ہے اور مہر برائے نام ہوتا ہے اور بٹہ میں مہر

لینے دینے کا کوئی رواج نہیں اور مقصود لڑکی کے عوض لڑکی ہوتی ہے' یہی قوم اوڈ اور دیگر اقوام میں (اس شغار کا) رواج پختہ ہے۔

پس مولانا سامرودی نے شغار کی دوسری صورت بھی تسلیم کرلی اور ابن حزم کی تحقیق سے اتفاق کرلیا' جس سے مولانا شرف الدین صاحب دہلوی کا بھی رد ہو گیا' فللّٰہ الحمد۔

انہوں نے امام ابن حزم پر ناپاک اور غیر مہذبانہ حملے کئے تھے۔ مولانا سامرودی نے ان کا فیصلہ برقرار رکھا ہے' جس سے دوسری صورت تسلیم ہو گئی۔ باقی مولوی سامرودی نے اپنی تحریروں میں فرج بدلے فرج کا جو وظیفہ کیا ہے' یہ لڑکی کے عوض لڑکی ہونے میں بھی پایا جاتا ہے کہ فرج ان میں شامل ہے بلکہ اصل مقصود ہے۔ اگر کسی کو یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی فرج نہیں بلکہ مخنث ہے تو اس کو کوئی بھی قبول نہ کرے گا۔ ہاں شاید سامرودی یا میانوالی میں لڑکی کا تبادلہ لڑکی سے اور فرجوں کا مہر ملی کے ساتھ تصریح کر کے سودا کرتے ہوں تو پھر یہ شغار کی نئی صورت تیار ہو جائے گی جو علماء اہلحدیث کے نزدیک یہ بھی حرام ہے۔

جمعیت اہلحدیث میانوالی نے نکاح بٹہ کا قلعہ تعمیر کر کے اس کا نام صراط مستقیم رکھا ہے اور اس کو اھدنا الصراط المستقیم پڑھ کر ہمیشہ طلب کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کے اساطین گر چکے ہیں۔ چنانچہ ایک ان میں سے مولانا عطاء اللہ صاحب لکھوی مرحوم ہیں جو علوم عالیہ و آلیہ میں استاد پنجاب مشہور تھے اور وہ راقم الحروف کے بھی استاد تھے' ان کا اسم گرامی بھی پمفلٹ میں درج ہے' رسالہ کا ص-۷۵ ملاحظہ ہو۔

اب ان کا فیصلہ سنئے کہ جناب موصوف الصدر عارف والہ ضلع منٹگمری (ساہیوال) میں مولوی ابراہیم خطیب جامع عارف والہ کے مکان پر تشریف لائے تو حسن اتفاق سے بندہ راقم الحروف بھی وہاں موجود تھا۔ ضروری مراسم ملاقات ادا کرنے کے بعد بندہ نے ان کی خدمت میں اپنا رسالہ فیصلہ سید الابرار بابت مسئلہ شغار پیش کیا۔ جناب والا نے اس کو خوب غور سے سنا اور پھر تقریظ لکھی جو درج ذیل ہے' جس میں صورت ثانیہ شغار کو تسلیم کر کے میانوالی کا قلعہ شغار مسمار کر دیا گیا ہے۔

رسالہ' فیصلہ سید الابرار در حرمت نکاح شغار کو اول سے آخر تک سنا جو مسئلہ حرمت شغار کے متعلق لکھا گیا ہے' بالکل صحیح اور درست ہے۔ بٹہ مروجہ قطعاً حرام ہے۔ بعض لوگ جو مہر والا بٹہ جائز کہتے ہیں وہ سخت غلطی میں مبتلا ہیں' وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بلا مہر شغار

جو اس وجہ سے حرام ہے کہ لڑکی عوض لڑکی' شرم گاہ عوض شرم گاہ' منفع عوض منفع ہے تو جس شغار میں مہر ہے وہ بھی اسی وجہ سے حرام ہے کہ مہر کے ساتھ لڑکی بھی عوض دوسری کا ہے' مہرو منفع دونوں مل کر عوض ہیں۔ جس چیز کا کلا عوض بنانا حرام ہے' اس کو جزء" بھی عوض بنانا حرام ہے اور یہ عوض ہونا اس شرط سے ثابت ہے جس پر مناکحت کا دارومدار ہے تو بٹہ کے حرام ہونے میں کیا شبہ ہوا؟ یہ بھی ان کے نزدیک حرام ہونا چاہیے' لیکن انصاف مدنظر نہیں ہے یا حقیقت پر نظر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو حق سمجھنے کی توفیق دے' آمین۔

(مرقومہ ۱۲/ ذوالحجہ سنہ۔۱۳۶۹ھ عطاء اللہ المدرس مدرسہ جامعہ محمدیہ لکھوی حال وارد اوکاڑہ)

تحریری اور زبانی جو مولانا موصوف نے استفادہ کیا اس سے یہ ظاہر ہوا کہ آنجناب ہمیشہ سے نکاح بٹہ مروجہ کی حرمت کے قائل رہے ہیں۔

<u>مولانا محمد علی لکھوی مدنی کا رجوع</u> : جناب مولانا محمد علی صاحب لکھوی خاندان کے مشہور عالم ہیں' جن کے دو صاحب زادے مولانا محی الدین صاحب ومولانا معین الدین صاحب اوکاڑہ میں درس گاہ قائم کئے ہوئے ہیں اور دینی فرائض کو بجالا رہے ہیں۔

مولانا محمد علی صاحب کا فتویٰ سابقہ نکاح بٹہ کے جواز کا تھا پھر جب آپ کو واقعات سے حقیقت کا انکشاف ہوا اور حدیث معاویہ پر محدثانہ نظر سے غور فرمایا تو اپنے سابقہ فتویٰ سے رجوع کیا اور نکاح بٹہ کو حرام تسلیم کر لیا۔ چنانچہ آپ کا مفصل مضمون "الاعتصام مطبوعہ ۲۲/ نومبر سنہ۔۱۹۵۴ء جلد۔۶' شمارہ۔۱۵ میں شائع ہو چکا ہے اور رسالہ صحیفہ اہلحدیث کراچی جلد۔۳۵' شمارہ۔۲۰ مطبوعہ ۷/جون سنہ۔۱۹۵۵ء میں بھی شائع ہوا تھا' جس کا عنوان یہ ہے :

"نکاح شغار کی شرعی حیثیت۔"

آپ شروع میں ارشاد فرماتے ہیں : "لفظ شغار بروزن کتاب لغت عربیہ میں دو صورتوں میں ہی مستعمل ہے۔"

پھر اس پر بحث کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں : "لہٰذا بٹہ کا نکاح جو آج کل پنجاب میں مروج ہے' اگرچہ اس میں مہر بھی مقرر کیا جائے وہ شغار میں داخل ہے' کیونکہ اس عقد کی علت غائیہ عورت سے عورت ہی کا تبادلہ ہے۔ مہر کا ذکر محض حیلہ تحلل حرام ہے۔ جیسا کہ مطلقہ ثلاثہ کے لیے حلالہ کا حیلہ حرام ہے' یا جیسا کہ ذبیحہ غیراللہ کے لیے بوقت ذبح بسم اللہ

اللہ اکبر کہہ کر حرام کو حلال گمان کیا جاتا ہے۔"

پھر حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر فرما کر لکھتے ہیں : "حدیث ..... احمد' ابوداؤد کی سند صحیح سے ثابت ہے' جس میں کان جعلا صداقا کا لفظ موجود ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شغار بامہر تھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسی شغار یا مہر کو ھذا الشغار الذی نھی عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما کر شغار یا مہر کو مرفوع بتایا ہے' جس سے صاف ظاہر ہے کہ شغار کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) شغار بلا مہر (۲) شغار بامہر"

بعض علماء حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کی تحریف بصورت تاویل یوں کرتے ہیں کہ "ان لڑکیوں کو ہی آپس میں ایک دوسرے کا مہر مقرر کیا تھا۔"

مولانا اس کا ابطال فرماتے ہوئے یہ لکھتے ہیں : "عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ صبرامت کے بیٹے پر یہ بدگمانی کہ وہ جاہلیت کے نکاح پر جرأت ایسے زمانہ میں کرے جس میں ہزاروں تابعین اور صحابہ موجود ہوں' یہ قطعی ناممکن ہے بلکہ یقیناً اس نے حیلہ شرعی سمجھ کر یہ کام کیا (جیسے آج کل بٹہ کرنے والے ایسا ہی سمجھ کر کر رہے ہیں) کہ مہر کی وجہ سے جائز ہو جائے گا' جس کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کر کے فیصلہ کر دیا کہ یہ بھی شغار ہے' جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔"

پھر مولانا نے آخر مضمون کے یہ ارشاد فرمایا ہے : "اگرچہ شروع شروع میں راقم الحروف کا یہ خیال تھا کہ نکاح بٹہ جائز ہے مگر اب مدت سے تدقیق و تحقیق کے بعد راقم الحروف اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ بالیقین نکاح بٹہ موجہ پنجاب حرام و باطل ہے۔ (حررہ محمد علی لکھوی)

یہاں تک ان علماء کرام کے اسمائے گرامی ختم ہوئے جو پہلے شغار کی ایک صورت کو جس میں مہر کی نفی ہے' مانتے تھے کہ اکثر اقوال تعریف میں اس کا ذکر تھا لیکن جب محلّی ابن حزم وغیرہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عطاء رحمہ اللہ وغیرہ کی تعریفوں کو امام ابن حزم رحمہ اللہ کی تشریح کے ساتھ ملاحظہ کیا تو عصبیت اور کبر سے دور ہٹ کر شغار کی دوسری صورت کو تسلیم کر گئے' جزاھم اللہ احسن الجزاء' جنات عدن فی السموات العلی۔

ان علمائے محققین نے نفی مہر کو قید اکثری عہد جاہلیت کو تصور فرما کر اہل علت حرمت بٹہ کے نکاح کی اشراط فریقین کو قرار دیا ہے کہ یہ قید تعریف کے سب اقوال میں موجود ہے جو اصل چیز ہے۔

چنانچہ مولانا اسماعیل صاحب امیر جمعیت اہلحدیث وشیخ الحدیث آف گوجرانوالہ اپنے فتویٰ میں کیا خوب فرماتے ہیں : "نکاح شغار کی تفسیر میں علماء مختلف ہیں۔ الفاظ حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوا' اصل وجہ حرمت "الشرط من الطرفین" ہے' وہ مہر کے وجود وعدم وجود دونوں میں موجود ہے۔ اس لیے نکاح شغار یعنی ایک نکاح جب دوسرے کے لیے شرط ہو تو صحیح اور درست نہیں ہو گا۔" (زادالمعاد)

(بقلم خود اسماعیل گوجرانوالہ بحوالہ روپڑی رسالہ شغار)

<u>سامرودی ملاقات میں تذکرہ شغار :</u> جب سنہ ۱۹۵۱ء میں بندہ راقم الحروف قوم اوڈ کے قافلہ کے ہمراہ بیت اللہ شریف میں فریضہ حج ادا کرنے کے لیے پہنچا تو حسن اتفاق سے اس سال حضرت مولانا محدث سامرودی مدظلہ العالی بھی حج کرنے کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔ ہمارے امیر قافلہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب رئیس القوم اوڈ کی وساطت سے ہمارے تمام قافلہ نے مولانا سامرودی سے شرف ملاقات حاصل کیا اور بندہ بھی ان کی ملاقات سے مشرف ہوا۔ مراسم ملاقات کے بعد مسائل شرعیہ کا تذکرہ شروع ہوا اور کئی ایک مسائل میں تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔

پھر دوسری ملاقات مدینہ منورہ میں ہوئی تو ہم سب مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے باہم گفتگو کر رہے تھے کہ ایک شخص مسمی عبدالرحمٰن ولد چندہ اوڈ نے جو اپنی قوم اور خاندان میں چودھری مشہور ہیں' مولانا سامرودی سے یہ استفسار کیا کہ آپ نے صحیفہ اہل حدیث کراچی میں نکاح بٹہ کے متعلق جو مضمون شائع کرایا ہے جس کو ہماری قوم کے بعض مولویوں نے جہانیہ ضلع ملتان کے جلسہ میں پڑھ کر سنایا تھا اور یہ اعلان کیا تھا کہ "ملک بھارت کے مشہور عالم مولانا سامرودی نے اس نکاح بٹہ کو جائز قرار دیا ہے' کیا یہ بات صحیح ہے؟"

تو مولانا سامرودی نے اس کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ "یہ بات سراسر غلط ہے اور ان مولویوں نے میری تحریر سے لوگوں کو دھوکہ دیا ہے۔ میں نے نکاح بٹہ مروجہ کو جو قوم اوڈ میں رائج ہے' اپنے مضمون میں ناجائز لکھا ہے کہ شرط کر کے جو بٹہ کا نکاح کیا جاتا ہے' یہ منع ہے۔"

چنانچہ مولانا سامرودی کے اس بیان پر قافلہ حجاج گواہ ہے اور اب بھی مولانا سامرودی بفضلہ تعالیٰ زندہ موجود ہیں' اس بیان سے انکار نہیں کر سکتے اور ان کے مضمون میں دو طرفی

نکاحوں کے جواز میں یہ شرطیں لکھی ہیں کہ "البتہ ہر دو جانب سے عقد مشروط نہیں' ہر دو جانب سے مہر بھی شرعی طریقہ سے (جیسے بغیر .ٹہ کے مہر مثل دیگر عورتوں کا ہوتا ہے) تقرر میں آیا ہو اور کوئی نفسانیت کو اس میں دخل نہیں' اس کے درست اور جواز میں کون سی چیز مانع ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ کوئی چیز مانع نہیں' ہمارا بھی اس کے جواز پر اتفاق ہے لکن مروجہ .ٹہ ان شرطوں سے خالی ہے' اس لیے وہ حرام ہے۔

جناب علامتہ الدہر حضرت مولانا عبیداللہ صاحب شیخ الحدیث مدرسہ رحمانیہ مدظلہ العالی جو مشکوۃ کے مشہور شارح ہیں اور اہل شغار کے تمام مفتیان سے زیادہ جامع العلوم اور فائق ہیں' ان کے سامنے ایک سوال میں چار اشخاص ضلع ملتان کے باشندگان کے نکاحوں کا ذکر ہوا کہ انہوں نے اپنی اپنی ہمشیرہ ایک دوسرے کے عوض نکاح میں دی اور حق المہر بھی دینا کیا۔ اگر ان میں سے ایک اپنی بہن دینے سے انکاری ہوتا تو دوسرا بھی انکاری ہو جاتا۔ اگر چاروں نکاحوں کا حق المہر برابر ہو یا کم و بیش تو کیا حکم ہے؟ شغار کے تحت میں آتا ہے یا نہیں؟

اس کا جواب حضرت العلامہ مدظلہ نے دیا' وہ رسالہ "محدث" دہلی جلد ۱' نمبر ۴' مجریہ ماہ شعبان سنہ ۱۳۶۵ھ میں شائع ہو چکا ہے جس کا کچھ حصہ عربی اور کچھ اُردو ہے اور مضمون بہت طویل اور نہایت علمی ہے۔ جس کا ضروری حصہ بمطابق اپنے مضمون کے درج کرتا ہوں تاکہ ناظرین کو فائدہ اور تصدیق حاصل ہو کہ نکاح .ٹہ قطعاً حرام ہے۔ چنانچہ مولانا عبیداللہ صاحب محدث مبارکپوری فرماتے ہیں : "میرے نزدیک شغار کی دو صورتیں ہیں اور دونوں منہی عنہ ہیں۔"

پھر مولانا نے دوسری صورت کے لیے حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ پیش کی ہے اور فرمایا ہے :

الظاهر عندي ان تفسير معاوية في حديث ابي داؤد مرفوع فانه اضافه الى النبي صلى الله عليه وسلم "یعنی ظاہر یہ بات ہے کہ تفسیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جو حدیث ابوداوٗد میں مروی ہے وہ مرفوع ہے کہ انہوں نے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کیا ہے اور یہ نہایت بعید بات ہے کہ صحابی اپنی رائے سے بات بنا کر پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر دے۔"

پھر فرماتے ہیں : يدل قول معاوية هذا ان هذا من افراد الشغار فليس فيه ما يقتضي

حصر الشغار فی تلک الصورة التی ذکر فی الحدیث ومن المعلوم ان تفسیر الذی ذکرہ مسندًا الٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا سبیل الی مردۃ "یعنی قول معاویہ رضی اللہ عنہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ صورت مہر والی بھی شغار کے افراد سے ہے اور نافع والی حدیث میں جو تفسیر ہے' اس میں حصر کا کوئی مقتضیٰ نہیں ہے اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ تفسیر صحابی جس کو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرے وہ قابل قبول ہوتی ہے' اس کے رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"

پھر بحث کرنے کے بعد یہ حکم بطور فتویٰ نافذ فرمایا ہے : "پس صورت مسئولہ میں اگرچہ چاروں اشخاص برابر یا کم وبیش مہر مقرر کریں گے لیکن چونکہ شغار کی دوسری صورت یعنی بطلان نکاح شغار کی دوسری علت اشتراط و تعلیق وتوفیق یہاں محقق وموجود ہے' اس لیے یہ چاروں نکاح ناجائز ہوں گے کہ شغار کی صورت ممنوعہ میں داخل ہیں۔" (منقولہ از رسالہ صحیفہ بحوالہ رسالہ محدث دہلی)

سنہ ۱۹۵۱ء میں جب بندہ راقم الحروف فریضہ حج ادا کرنے گیا تو اس سال حسن اتفاق سے مولانا عبدالمجید صاحب مدیر اہلحدیث سوہدرہ اور مولوی صمصام صاحب واعظ وشاعر لائل پوری (فیصل آبادی) بھی حج کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے۔ مولانا صمصام صاحب نے مسئلہ شغار پر ایک استفسار عربی زبان میں تحریر فرما کر مفتیان مکہ ومدینہ شریف کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس پر انہوں نے جو فتوے صادر فرمائے تھے' وہ میرے رسالہ "حرمت نکاح شغار" کے آخر میں درج ہیں' جو کراچی کے مکتبہ شعیب ہنس روڈ نے شائع کیا ہے۔ ان مفتیان ملک حجاز کے اسماء گرامی یہ ہیں : (۱) مولانا شیخ عبدالرزاق حمزہ مدرسہ حرم مکہ مکرمہ۔ (۲) شیخ عبدالمہیمن ابو السمح امام مسجد الحرام مکہ مکرمہ۔ (۳) شیخ عبدالعزیز امام مسجد نبوی مدینہ منورہ۔ (۴) حضرت الشیخ عبدالرحمٰن افریقی مدرس حرم نبوی مدینہ منورہ۔ (۵) حضرت الشیخ محمد احمد تنکی مدرس مسجد نبوی مدینہ منورہ۔ (۶) مولانا محمد علی صاحب لکھوی شیخ الحدیث مدینہ منورہ۔ (۷) مولانا ابو سعید عبداللہ صاحب لکھنوی مدرس مسجد حرام' مدرسہ دارالحدیث مکہ مکرمہ۔

ان سب مفتیان عرب کے فتووں کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ مروجہ نکاح وٹہ حرام ہے اور اس میں جو مہر ہے' یہ حرام کو حلال کرنے کے لیے حیلہ ہے اور دراصل یہ وہی شغار جاہلیت

ہے' اسی لیے امیرالمومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے اصل مقصود اشتراط پر نظر فرمائی اور اس کو باطل ٹھہرا کر فریقین میں تفریق کرا دی تھی۔ تقرر مہر کسی طرح مفید نہیں ہے جبکہ ایک لڑکی دوسری کا نکاح لینے میں شرط اور بدلہ قرار پائی ہوئی ہے' یہ مسلک عین حق ہے جس پر کوئی غبار نہیں ہے اور اس سے کوئی شخص گمراہ نہیں ہو سکتا مگر جو حدیث نبوی کا مخالف ہو کر ہلاک ہونے والا ہے۔

ان فتووں کی تصدیق مولانا عبدالمجید مرحوم سوہدروی نے فرمائی کہ یہ میری موجودگی میں لکھے گئے ہیں۔

میں کہتا ہوں یہ کل علماء اہلحدیث شمار میں چالیس آچکے ہیں جن کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ شغار کی دوسری صورت جس میں مہر مقرر ہوتا ہے' شغار میں داخل ہے اور ایسا نکاح بٹہ حرام اور باطل ہے۔ اب اس کو جو لوگ سبیل الرشاد اور صراط مستقیم قرار دے کر حلال کہتے ہیں' وہ ہالک اور بدترین گمراہ اور گنہگار ہیں۔ قیامت کو اس حرام نکاح کے ذمہ دار ہوں گے۔

حررہ عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور' جلد۔۱۹' شمارہ۔۳۰' ۳۱' ۳۴' ۳۵' ۳۶' ۳۷' ۳۹' ۴۰

مورخہ ۳۰ دسمبر و ۶ و ۲۷ جنوری و ۳ و ۱۰ فروری و ۳ و ۱۰ مارچ سنہ۔۱۹۶۷ء

نکاح بٹہ اور فیصلہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

نکاح بٹہ کے بارہ میں علماء مختلف رائے رکھتے ہیں۔ بعض اس کو حرام کہتے ہیں اور بعض جائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اخبار الاعتصام میں بھی اس مسئلہ پر کئی متضاد فتوے شائع ہو چکے ہیں۔

حضرت مولانا سید داؤد غزنوی صدر جمعیت اہلحدیث مدظلہ العالی اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد علی صاحب لکھوی مدنی متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ کے دو فتوے تو نکاح بٹہ مروجہ کی حرمت پر ناطق ہیں اور ان کا دارومدار فیصلہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر ہے اور تیسرا فتویٰ حضرت مولانا حافظ محمد صاحب محدث گوندلوی ادام اللہ فیوضہ کا شائع ہوا ہے جو نکاح بٹہ کے جواز پر دال ہے۔ اس میں فیصلہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مسترد کر کے اقوال علماء اور ایک ضعیف روایت پر بنیاد رکھی گئی ہے۔

اب راقم الحروف اپنے اکابر علماء اہلحدیث کی عدالت میں خصوصاً اور دیگر اہل علم حضرات کی خدمت میں عموماً اپنی تحقیق پیش کرتا ہے کیونکہ عرصہ دو سال تک ایک مقدمہ شغار میں شامل رہ کر علماء فریقین کی عالمانہ بحث سننے اور پڑھنے کے بعد اس مسئلہ کی حقیقت تک پہنچ چکا ہے' فللّٰہ الحمد۔

واضح ہو کہ احادیث شغار اور اس کی تفسیر' فیصلہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح مندرجہ محلّٰی پر غوروفکر کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ شغار کی جس کو نکاح تبادلہ کہتے ہیں' دو صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ ایک لڑکی کا نکاح دوسری لڑکی کے نکاح کی شرط ہو اور درمیان میں مالی مہر نہ ہو۔ یہ صورت ملک عرب میں اکثر تھی۔ اس لیے اہل لغت نے اس کا عام طور پر ذکر کیا ہے اور ایک ضعیف روایت میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ اس صورت کے بطلان پر جمہور علماء اسلام متفق ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک لڑکی کا نکاح دوسری لڑکی کے نکاح کی شرط ہو اور ان نکاحوں میں مالی مہر مقرر کیا جائے' اس صورت کا کم رواج تھا۔ اس لیے عہد امارت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں بنو ہاشم اور بنو امیہ کے بعض لوگوں نے مدینہ منورہ میں ایک رشتہ اس صورت ثانیہ سے عدم علم کی بنا پر کر دیا اور انہوں نے علماء مجوزین کی طرح شغار کو صرف پہلی صورت میں ہی منحصر سمجھا لیکن جب ملک شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس مناکحت کی اطلاع پہنچی یا ان سے استصواب رائے کیا گیا تو انہوں نے ایک حکم نامہ بھیج کر اس رشتہ کو توڑ دیا اور یہ فرمایا کہ ھذا الشغار الذی نھی عنه رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم۔ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حسن بتایا ہے' بہرحال یہ حدیث حجت ہے۔

اس حدیث میں لفظ ھذا اسم اشارہ کا مشار الیہ وہ نکاح ہے جو عباس بن عبداللہ از خاندان بنی ہاشم اور عبدالرحمٰن بن حکم از خاندان بنو امیہ کے مابین ہوا تھا اور ان نکاحوں میں مالی مہر مقرر تھا' جیسا کہ جملہ "کانا قد جعلا صداقا" اس پر دال ہے۔

اس حدیث سے شغار کی دوسری صورت بھی حرام ثابت ہو گئی ہے اور یہ معلوم ہوا کہ اصل وجہ حرمت اشتراط نکاح لڑکی کا عوض نکاح لڑکی ہے' مالی مہر کا وجود اور عدم یکساں ہے

اور حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ ظاہر کر دیا کہ شغار کی تعریف میں جو "لا صداق بینھما" کی قید وارد ہے' یہ احترازی نہیں ہے' اکثری اور اتفاقی ہے۔ جیسے جمعہ میں حکم وذروا البیع وارد ہے کہ اذان جمعہ ہونے پر بیع چھوڑ دو۔ اس سے بعض حنفیہ جمعہ کے لیے مصریت کی شرط ثابت کرتے ہیں کہ خطاب اہل بیع کو ہے' حالانکہ حکم عام ہے اور ہر کام مانع جمعہ کو ترک کر دینا لازم ہے۔ بیع چونکہ نزول آیت کے وقت کثیر الوقوع تھی' اس لیے یہ لفظ وارد ہوا۔ اسی طرح لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفة کہ سود دگنا دگنا کر کے نہ کھاؤ' حالانکہ سود دو چار آنہ بھی حرام ہے۔ سو یہ الفاظ حسب رواج وارد ہیں' اس کی امثلہ بہت ہیں۔ اسی طرح شغار میں قید "لا صداق" کو سمجھ لیں جس کا اظہار حدیث فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کر دیا اور شغار کی دو قیدیں ظاہر ہو گئیں اور وہ دو قسم کا ہوا۔ ایک شغار بالمہر المال' دوم شغار بلا مہر مال۔

پس حدیث صحیح "لا شغار فی الاسلام" مطلق شغار کی نافی ومانع ہو گی' کیونکہ قاعدہ علمیہ یہ ہے جو تحفۃ الاحوذی جلد۔۱' ص۔۳ میں درج ہے۔ "ان المطلق اذا قید بقیدین متنافیین لم یحمل علی واحد منھما ویرجع الی اصل الاطلاق" یعنی جب مطلق دو متنافی قیدوں سے مقید ہو جائے تو اس کو کسی ایک قید پر محمول کر کے اس میں منحصر نہ کیا جائے گا بلکہ وہ اپنے اصل اطلاق کی طرف راجع ہو گا۔

شغار کی دونوں صورتوں میں اصل چیز اشتراط ہے' اس کو اس پر محمول کیا جائے گا اور عورت عوض عورت کے شرط کرنی حرام ہو گی' اس لیے بعض روایتوں میں یہ اشتراط مطلق بھی مروی ہے۔ مثلاً مسلم میں ہے : والشغار ان یقول الرجل للرجل زوجنی ابنتک وازوجک ابنتی وزوجنی اختک وازوجک اختی۔ اور فتح الباری میں ہے : والشغار ان یزوج الرجل اختہ باختہ۔ یعنی شغار یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے یہ کہے کہ تو مجھے اپنی بیٹی نکاح کر دے' میں تجھ کو اپنی بیٹی نکاح کر دوں گا' یا یہ کہے کہ تو مجھے اپنی بہن نکاح کر دے' میں تجھے اپنی بہن نکاح کر دوں گا۔ یہ مطلق اشتراط بلا کسی قید کے وارد ہے جس سے ہماری بات کی تصدیق ہوتی ہے' اس لیے علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے شغار سے حقیقت شناس ہو کر یہ فرمایا ہے کہ "ولا یحل الشغار سواء ذکر فی کل ذالک صداقا لکل واحدۃ منھما او لاحدھما دون الاخری او لم یذکر فی شئی من ذالک صداقا کل ذالک سواء فسخ ابدا۔" یعنی نکاح شغار حرام ہے' خواہ فریقین مہر کا ذکر کریں یا نہ کریں یا ایک

لڑکی کا مہر ذکر کریں اور دوسری کا نہ کریں' بہرحال نکاح ہمیشہ کے لیے فسخ ہے۔" (محلی)

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے مہر عدم مہر کی روایات کو نقل کر کے پھر یہ فیصلہ کیا ہے جو بالکل حق اور صحیح ہے۔ فماذا بعد الحق الا الضلال۔

علماء مجوزین بجائے اس بات کے کہ تمام احادیث کو مان کر ان میں موافقت کرتے' حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کے استیصال کرنے پر کمربستہ ہو گئے کہ ان کے لیے یہ حدیث سد راہ تھی۔ چنانچہ احتمالات باردہ کے ناکام ہتھیار لے کر اس پر حملہ آور ہوئے جو بالکل بیکار ثابت ہوئے۔

کسی نے تو یہ کہا کہ حدیث فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ میں الفاظ "جعلاہ صداقا" ہیں' یعنی انہوں نے اسی باہمی مناکحت ہی کو مہر مقرر کیا تھا' مالی مہر نہ تھا' یہ سراسر تحریف ہے۔ کسی روایت میں "جعلاہ" کے ضمیر کے ساتھ وارد نہیں ہے' صرف نیل الاوطار میں جو منتقی کا متن منقول ہے' اس میں یہ ضمیر درج ہے جو یا کسی کی خیانت و تحریف ہے یا تصحیف یا غلطی کتابت پر محمول ہے۔ دیگر کسی کتاب حدیث میں یہ ضمیر وارد نہیں ہے۔ اصل منتقی الاخبار میں بھی یہ ضمیر درج نہیں ہے۔ سنن ابوداؤد' سنن بیہقی' مسند احمد' محلی ابن حزم وغیرہ میں حدیث فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ درج ہے' کسی میں بھی ضمیر موجود نہیں ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ کثیرا ما یقلد الساھون الساھین یعنی بہت لوگ بھولنے والے ہیں جو بھولنے والوں کی ان کی بھول میں تقلید کرتے چلے جاتے ہیں۔ تحقیق کوئی نہیں کرتا کہ یہ بھول ہو گئی ہے' اس کو چھوڑ دیں۔

یہی معاملہ یہاں ہو رہا ہے کہ شوکانی یا کاتب سے بھول ہو گئی ہے۔ بعض علماء اسی کی تقلید کرتے چلے جاتے ہیں' حالانکہ سوائے شوکانی کے کسی محدث نے اس کو نقل نہیں کیا ہے۔

بذل المجہود شرح ابوداؤد جلد۔۳' ص۔۱۷ میں ہے۔ مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری فرماتے ہیں: ووجدت فی ما کتب الشوکانی من نسخة منتقی الاخبار "وقد جعلاہ صداقا" بالضمیر ولم اجدہ لغیر الشوکانی" یعنی علامہ شوکانی نے جو نسخہ منتقی کا نقل کیا ہے' اس میں میں نے ضمیر کے ساتھ جعلاہ لکھا ہوا پایا ہے اور شوکانی کے سوا کسی محدث کی کتاب میں' میں نے یہ لفظ نہیں پایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا خلیل احمد صاحب باوجود حنفی ہونے اور قائلین جواز شغار کے ایک فرد ہونے کے از روئے انصاف یہ صاف تسلیم کرتے ہیں کہ "بل فیھما تقرر الصداق لکل واحدۃ منھما غیر البضع من المال یعنی اس مناکحت میں لڑکیوں کا مالی مہر مقرر کیا گیا تھا' کسی کا بضع مہر نہ تھا۔

پس ثابت ہوا کہ غیر ثابت شدہ ضمیر کی بناء پر حدیث کا مطلب بگاڑنا سینہ زوری ہے۔

بعض علماء نے عون المعبود کا حوالہ دے کر جعلاہ کا مفعول محذوف نکالا ہے اور یوں معنی کیا ہے : "ای کانا جعلا نکاح کل واحد منھما للاخر ابنتہ صداقا" "یعنی نکاح کرنے والوں نے اپنی بیٹیوں کو ایک دوسری کا مہر مقرر کیا تھا۔" یہ تاویل بھی دو طرح سے باطل ہے۔ ایک یہ کہ جعل متعدد معانی پر محمول ہے۔ اگر بمعنی عین قرر ہو تو ایک مفعول پر کفایت کرتا ہے جیسے "جعلا لہ شرکاء" اور کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے' جیسے فرمایا "فجعلھم کعصف ماکول" ۔ اسی طرح حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ میں سمجھ لیں۔ چنانچہ ترمذی میں ہے : "ولا یحل وان جعل لھما صداقا" یعنی شغار حرام ہے اگرچہ مالی مہر مقرر کریں۔

نیز قاعدہ علمیہ ہے کہ جب بغیر حذف عبارت کے معنی صحیح ہو سکے تو حذف نکالنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ خلاف الاصل ہے۔ چنانچہ علامہ ابن القیم کتاب التقدیر مترجم ص ۱۱۷ میں فرماتے ہیں : "پہلی وجہ یہ ہے کہ عبارت میں حذف اور تقدیر اختیار کرنا خلاف اصل ہے۔ جب حذف کے بدوں کلام صحیح ہو سکے تو اس کو اختیار کرنا صحیح نہیں۔"

پس اس بنا پر عون المعبود کی عبارت اختراعی' ناقابل سماعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا خلیل احمد صاحب نے باوجود حنفی ہونے کے محذوف نکالنے کا تکلف نہیں کیا کہ ان کو یہ قاعدہ ملحوظ تھا۔ اگر اسی طرح عبارتیں محذوف نکال نکال کر احادیث کو بگاڑنا ہو تو کوئی مسئلہ بھی ثابت نہ ہو گا۔

بعض حنفی حدیث "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" میں بھی محذوف عبارت نکال کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حدیث منفرد کے بارہ میں ہے "ای وحدہ" اور ثبوت کے لیے ترمذی سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول پیش کرتے ہیں حالانکہ یہ ناقابل قبول ہے۔

دوسری وجہ اس توجیہہ و تاویل کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ صحابہ و تابعین خصوصاً اہل مدینہ کی شان اسلامی و علمی کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد علی صاحب

مدنی متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ اپنے مضمون مسئلہ شغار میں رقمطراز ہیں : "نیز عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بیٹے پر یہ بدگمانی کہ وہ ایام جاہلیت کے نکاح پر جرأت ایسے زمانہ میں کرے جس میں ہزاروں تابعین اور صحابہ موجود ہوں' یہ قطعی ناممکن ہے۔ بلکہ یقیناً اس نے حیلہ شرعی سمجھ کر یہ کام کیا کہ مہر کی وجہ سے جائز ہو جائے گا جس کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے نبی تک مرفوع کر کے فیصلہ کر دیا کہ یہی وہ شغار ہے جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ جب وہ خاندانی مسلمان تھے اور اسلام کے مرکزی شہر میں بسنے والے تھے تو وہ عورت کو مہر کیسے بنا سکتے تھے؟ جس کو ہمارے عامی مسلمان بھی گوارا نہ کریں گے! انہوں نے اسی چیز کو مہر مقرر کیا تھا جو بروئے عرف شرع مہر بن سکتی ہے۔ ہاں انہوں نے اپنے قیاس سے نکاح طرفین کا اشتراط قبل از عقد کر لیا پھر عقد کے وقت مالی مہر مقرر کر کے نکاح پڑھا لیا تھا۔ اس کو انہوں نے شغار ممنوعہ نہ "سمجھا" جیسے اب بعض مسلمان ایسا کر رہے ہیں اور ہمارے بعض علماء اس کو شغار نہیں سمجھتے لیکن حضرت امیر المومنین معاویہ ہادی مہدی رضی اللہ عنہ نے اس کا انکشاف کر دیا کہ طرفین کا اشتراط نکاح ہی شغار ہے۔ تمہارا تقرر مہر اس کو شغار کے حکم سے خارج نہیں کرتا۔ یہی مشروط مناکحت ہی وہ شغار ہے جس سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا۔ لہذا ان نکاحوں میں تفریق کر دو۔

پھر اہل مدینہ سمجھ گئے اور انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور کسی کو انکار کی گنجائش نہ رہی اور اس پر اجماع سکوتی ہو گیا اور یہ نہایت قوی دلیل ہے کہ جس شغار میں مہر مقرر ہو گا وہ بھی قطعاً حرام ہے۔

حضرت علامہ ابن حزم فرماتے ہیں : والصحابة یومئذ بالشام والمدینة اکثر عددا من الذین کانوا احیاء ایام ابن الزبیر "یعنی صحابہ عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں شام اور مدینہ میں ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے زیادہ تھے۔" پھر فرماتے ہیں : فھذا معاویة بحضرة الصحابة یعرف له منھم مخالف یسفخ ھذالنکاح وان ذکرا فیه الصداق یقول انه الذی نھی عنه رسول اللّٰہ صلی اللہ علیه وسلم فارتفع الاشکال جملة الحمد للّٰہ رب العالمین۔ "یعنی یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے صحابہ کرام کی موجودگی میں اس نکاح کو فسخ کیا ہے جس پر کسی صحابی نے انکار نہیں کیا۔ اگرچہ انہوں نے اس مناکحت میں مہر بھی ذکر کیا تھا۔ تاہم یہ

بھی فرما دیا کہ یہ وہی شغار ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا تھا۔ اس سے تمام خدشات واعتراضات رفع ہو گئے' الحمد للہ۔"

اصطلاح علماء میں اس کو اجماع سکوتی کہتے ہیں۔ پس اس ایک حدیث سے کئی باتیں ثابت ہو گئی ہیں۔ اول تعریف شغار' دوم حدیث مرفوع سے اس کی حرمت کا اظہار' سوم تفریق بلا طلاق' چہارم شغار کی ایک صورت کا اہل مدینہ کو عدم علم' پنجم تسلیم وسکوت از انکار۔

لیکن افسوس ہے کہ علماء مجوزین شغار اس حدیث اور اس کے فوائد کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ مہر معمولی تھا' مہر مثل نہ تھا' اس لیے شغار ہوا۔ یہ خیال بھی خام ہے کیونکہ نکاح میں مہر کی کوئی حد نہیں ہے۔ جس قدر فریقین رضامندی سے مقرر کر لیں وہی جائز ہے۔ خواہ ایک انگوٹھی ہو یا سورہ قرآن ہو پھر ایسے احتمال نکالنے کا کیا فائدہ؟

اگر یہ کہا جائے کہ یہ کمی مہر کی اشتراط نکاح المراۃ بالمراۃ کی بنا پر تھی' مہر ملی مقصود بالذات نہ تھا تو میں کہتا ہوں کہ یہ موجودہ نکاح .ٹہ میں بھی ہے کہ اصل مقصود نکاح بالنکاح ہوتا ہے اور مہر معمولی باندھتے ہیں جو مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ چنانچہ جن لڑکیوں کا .ٹہ نہیں ہوتا' ان کے مہر اور زیورات حسب خواہش لڑکی اور برادری کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ہزار دو ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ اور جو نکاح تبادلہ ہو' اس میں برائے نام مہر صرف پچیس یا پچاس ہوتا ہے جس میں دینا لینا بھی مقصود نہیں ہوتا۔ صرف جواز نکاح کے لیے رواجاً باندھتے ہیں۔ اس .ٹہ سے لڑکیوں کی صریح حق تلفی ہوتی ہے۔ علماء مجوزین کو چاہیے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرح اس کو بھی ممنوع قرار دیں۔

بعض کہتے ہیں کہ آج کل کے مروجہ .ٹہ میں پہلے ایک دوسرے سے نکاح لینے دینے کا وعدہ کر لیا جاتا ہے پھر نکاح کے وقت ایجاب وقبول ہوتا ہے تو اس وقت اس شرط کا ذکر نہیں ہوتا' اس لیے یہ شغار نہیں ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں ہے اور ایسا ہے جیسے بعض اہل بدعت کسی جانور کو غیر اللہ کے نام پر مشہور کر دیتے ہیں پھر اس غیر اللہ کے نام زدہ پر عندالذبح بسم اللہ پڑھ کر ذبح کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ کے نام سے ذبح کیا ہے اور عندالذبح غیر اللہ کا نام نہیں لیا ہے' اس لیے حلال ہے۔ حالانکہ بالکل حرام ہے' کیونکہ غیر اللہ کے تقرب پر مشہور ہو چکا ہے اور

اسی نیت سے ذبح کیا گیا ہے۔ صرف بسم اللہ رواجاً پڑھی گئی ہے جس کے پڑھنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح لڑکی عوض لڑکی کے بنام نکاح "ٹہ" مشہور ہو چکی ہے اور اس کی شرط بڑی پختہ طے ہو چکی ہے اور نیتوں میں اس پر نکاحوں کا دارومدار ہے اور مہرملی کا ذکر بطور رواج ہے۔ مقصود ذاتی مہر ہے' لہٰذا یہ بھی حرام ہے کیونکہ انما الاعمال بالنیات ولکل امری ما نوی اور اس پر حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ بین دلیل کالشمس فی نصف النہار ہے' جس کا جواب باصواب مجوزین قیامت تک نہیں دے سکتے۔ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔

نیز یہ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر دلوں اور عملوں پر ہے' مالوں اور شکلوں پر نہیں ہے۔ دل میں اور عملوں میں نکاح "ٹہ" ہو رہا ہے اور اسی لیے اس کا نام "ٹہ" رکھا گیا ہے۔

ایسے مجوزین کو علامہ ابن القیم کا یہ قاعدہ ذہن نشین کر کے پھر غور سے فتویٰ دینا چاہیے۔ علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ والذی یجیئی الی اصلہ انھم متی عقدوا علی ذالک وان لم یقولوا بالسنتھم انہ لا یصح لان القصود فی العقود معتبرۃ والمشروط عرفا کالمشروط لفظا فیبطل العقد بشرط ذالک والتواطی علیہ ونیتہ۔ (زاد المعاد) "یعنی وہ مسئلہ جو اس قاعدہ کی طرف آتا ہے' یہ ہے کہ جب انہوں نے اس شرط کی بنا پر عقد کیا اور زبان سے نہ کہا تو عقد صحیح نہ ہو گا کیونکہ عقدوں میں ارادے اور نیتیں معتبر ہیں اور جو چیز عرف میں مشروط ہے' وہ ایسی ہے جیسے لفظوں میں مشروط ہوتی ہے' پس عقد باطل ہو گا جب کہ اس شرط کی نیت رکھ کر کیا گیا ہے۔"

بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے اور فہم پر مبنی ہے اور لغت کے خلاف ہے' لہٰذا متعلق بحث نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں یہ قول بھی سراسر باطل ہے اور ایسا برا خیال ہے جو شان صحابہ اور دیگر سلف کے خلاف ہے۔ اس کا جواب حضرت مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی مبارک پوری مدظلہ العالی نے دیا ہے جو رسالہ محدث دہلی مطبوعہ ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء جلد ۱' نمبر ۴ میں درج ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں : ان تفسیر معاویۃ للشغار فی حدیث ابی داؤد مرفوع فانہ اضافہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولیس مبنیا علی فھمہ واجتھادہ فمن البعید ان یقول شیئا من عند نفسہ لم ینسبہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (الی قولہ) ومن العلوم ان تفسیر الصحابی الذی

ذکرہ منسوبا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا سبیل الی ردہ بل ھو اولی واحق بالقبول۔ "یعنی حدیث ابوداؤد میں جو شغار کی تفسیر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کی ہے' وہ مرفوع ہے کیونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کیا ہے اور فرمایا کہ یہ وہی شغار ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے اور اجتہاد پر مبنی نہیں ہے اور یہ صحابی کی شان سے بعید ہے کہ اپنی رائے سے کوئی بات کہہ کر پھر اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرے اور یہ مسلم بات ہے کہ جو تفسیر صحابی کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو' اس کو رد کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

تعجب ہے کہ مجوزین ایک ضعیف روایت اور نافع وغیرہ قول راوی کو تو لے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اثبات لغت کے لیے کافی ہے اور کوئی کہتا ہے کہ ہماری تفسیر قول راوی مقبول ہے کیونکہ وہ اعلم بالمقال وواقف بالحال ہے۔ لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مسترد کر رہے ہیں' حالانکہ وہ حدیث مرفوع ہے اور ثبوت کے لحاظ سے قوی ہے۔ اگر قول معاویہ رضی اللہ عنہ بھی تصور کیا جائے تب بھی مقبول ہے اور اثبات لغت کے لیے کافی ہے کیونکہ معاویہ رضی اللہ عنہ اہل لسان سے ہیں اور اعلم بالحال ہیں۔ لیکن ہم مجوزین کی طرح یک طرفہ ڈگری نہیں دیتے بلکہ سب کو اپنی اپنی جگہ تسلیم کر کے شغار کی دو صورتیں مانتے ہیں اور دونوں کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ پس مجوزین علماء کا فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو رد کرنا زیادتی ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ روایت ہی مخدوش ہے کیونکہ اس کی اسناد میں محمد بن اسحاق واقع ہے جو متکلم فیہ ہے اور وہ منفرد ہو تو حجت نہیں ہے۔ یہ خیال بھی قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ محمد بن اسحاق ثقہ ہے اور اکابر محدثین نے اس کی توثیق کی ہے۔ چنانچہ امام الدنیا فی الحدیث امام بخاری نے جزاء القراۃ میں اور امام بیہقی نے کتاب القراۃ میں اس کی تفصیل کی ہے اور اکابر حنفیہ سے علامہ ابن الہمام اور زیلعی نے اس پر اتفاق کیا ہے۔ ہاں تدلیس کا عیب ہے جس کو حدثنی کے لفظ سے اس نے دفع کر دیا ہے۔ بذل المجہود میں ہے: قلت اختلاف الائمۃ فی حدیثہ اذا حدث بعن وفی ھذا الحدیث حدث ابن اسحاق بلفظ التحدیث وھو مقبول۔ خلاصہ یہ کہ محمد بن اسحاق مقبول ہے' ابن حزم نے اس کی حدیث کو صحیح اور حافظ ابن حجر نے حسن قرار دیا ہے۔

فتح الباری ص۔۵۴' ۵۶ ملاحظہ کریں کہ ابن اسحاق منفرد ہو اور تحدیث کی تصریح کرے تو

اس کی حدیث درجہ حسن کا رکھتی ہے اور حدیث حسن حجت ہے' لہٰذا جارحین کی جرح صحیح نہیں۔ اسی طرح ان کے دیگر احتمالات اور تاویلیں سب محل نظر ہیں کیونکہ وہ بغیر کسی دلیل کے ہیں۔

بعض نے لکھا ہے کہ فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ میں جو صورت شغار درج ہے' یہ کسی کے نزدیک بھی منع نہیں ہے۔ چنانچہ مصنف بذل المجہود لکھتے ہیں : فهذه الصورة بظاهره ليس فيها علة الفساد عند احد من العلماء "یعنی اس صورت میں کوئی علت فساد نہیں ہے اور یہ کسی عالم کے نزدیک بھی منع نہیں ہے' یہ خیال قابل تسلیم نہیں۔"

اس حدیث سے بالمقابل مناکحت ثابت ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے شغار قرار دینے سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ مناکحت باہم مشروط تھی لیکن انہوں نے مہر مقرر کر کے اس کو جائز سمجھ لیا تھا' جس کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مسترد کر دیا کہ مہر کا کچھ فائدہ نہیں ہے کہ اس میں لڑکی کا نکاح دوسری لڑکی کے نکاح سے مشروط ہے۔ لہٰذا اس میں وہی صورت شغار ہے جو ممنوع ہے۔ چنانچہ حدیث کا ترجمہ یہاں لکھا جاتا ہے' آپ غور کر لیں :

> "عبدالرحمٰن بن ہرمز اعرج سے روایت ہے کہ عباس بن عبداللہ بن عباس نے اپنی لڑکی کا نکاح عبدالرحمٰن بن حکم بن ابو العاص سے کر دیا اور عبدالرحمٰن بن حکم نے اپنی لڑکی کا نکاح عباس سے کر دیا اور دونوں نے مہر مقرر کیا۔ پس معاویہ رضی اللہ عنہ نے (جو وائسرائے شام تھے) مروان حاکم مدینہ کے نام حکم نامہ لکھا کہ ان دونوں کے نکاحوں میں تفریق کرا دی جائے کیونکہ یہ وہی شغار ہے جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔" (ابوداؤد' مسند احمد)

شغار کے بطلان کی علتیں علماء نے مختلف ذکر کی ہیں۔ قفال نے تعلیق وتوقیف بتلائی ہے کہ جب شرط کرتے ہیں تو ایک نکاح کو دوسرے پر معلق اور موقوف رکھتے ہیں۔ جب حسب شرط ایک نکاح ہو جاتا ہے تو دوسرا ہوتا ہے۔ اگر ایک انکار کر دے تو دوسرا بھی انکار کر دیتا ہے۔ یہ اشتراط اور باہمی معاہدہ شغار ہے۔ علامہ خرقی حسین بن عبداللہ جو شاگردان امام احمد سے ہیں' ایسے شغار کو جس میں مہر ملی بھی مقرر ہو' باطل کہتے ہیں۔ امام ابن حزم بھی باطل کہتے ہیں اور املاء میں امام شافعی نے ایسے نکاح کو باطل قرار دیا ہے اور مفتی ابن قدامہ جزء ۷' ص ۵۶۷ میں ہے : فلا نكاح بينهما وان سموا مع ذالك صداقا ايضا

ھذا النکاح یسمی الشغار "یعنی دونوں طرف کا نکاح نہ ہو گا اگرچہ مہر مقرر کر دیں اور اس کا نام بھی شغار ہے۔" اور زاد المعاد میں ہے : وقال الخرقی لا یصح ولو سموا مھرا علی حدیث معاویۃ۔

اس سے مولانا خلیل احمد صاحب کا یہ کہنا کہ کوئی عالم بھی اس صورت میں علت فساد نہیں سمجھتا' صحیح نہیں۔ اور محلی جلد ۹ باب الشغار میں امام ابن حزم نے حضرت عطاء اور بعض ائمہ سے ایسے شغار کی حرمت نقل کی ہے جس میں مہر ہو۔ چنانچہ حضرت عطاء تابعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کر کے اس کی حرمت ثابت کی ہے اور پھر یہ فرمایا ہے کہ ھذا قولنا وما نعلم عن احد من الصحابۃ والتابعین خلافا "یعنی یہ ہمارا مذہب ہے اور صحابہ و تابعین سے اس کا کوئی بھی مخالف معلوم نہیں ہوا" یعنی اس پر اجماع سکوتی ہے۔

پھر مولانا خلیل احمد نے یہ فرمایا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے صرف احتیاط اور سد ذرائع کے طور ممانعت کر دی تھی۔ یہ بھی محل نظر ہے' کیونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کو شغار قرار دے کر اس کی ممانعت کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر رہے ہیں جو حکم شرعی پر دال ہے۔ مصلحتی حکم تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طلاق ثلاثہ مجلس واحدہ میں تھا جس میں وہ صاف فرماتے ہیں : فلوا مضیناہ فامضاہ "کہ کاش ہم تینوں کو ہی جاری کر دیں' پس جاری کر دیا۔" یہ حکم تعزیری تھا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شغار کی دو صورتیں ہیں۔ بلا مہر اور بالمہر اور دونوں حرام ہیں۔ عندالعقد شرط ہو یا قبل از عقد ہو لیکن عقد کے وقت ملحوظ ہو اور فریقین کے دل اس پر متفق ہوں تو حکم یکساں ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام لاہور جلد ۸' شمارہ ۴۱' ۴۲ مورخہ ۱۰ و ۱۷ مئی سنہ ۱۹۵۷ء

جواز نکاح ۔ٹہ کی ناکام کوشش

یاروں نے گو انا الحق اس منہ سے بول دیکھا
ہیں سر حق سے غافل سب کو ٹٹول دیکھا

نکاح ۔ٹہ حرام ہے اور اس کی حرمت پر کئی رسالے اور متعدد فتوے اکابر علماء اہلحدیث کی

طرف سے شائع ہو چکے ہیں' مثلاً ملک حجاز کے مقامات مقدسہ حرمین شریفین مکہ ومدینہ کے مفتیان اسلام سے مولانا شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ مدرس حرم مکی ومولانا شیخ عبدالعزیز بن صالح امام مسجد نبوی' شیخ عبدالرحمٰن افریقی مرحوم مدینہ عرب' مولانا شیخ عبدالمہیمن ابو السمح امام مسجد حرام' مولانا الفاضل شیخ محمد علی صاحب محدث لکھوی مدنی وغیرہم ان علماء کرام کے فتوے رسالہ "فیصلہ سید الابرار" میں درج ہیں۔ پاکستان کے بڑے بڑے مفتیان اسلام کے چالیس کے قریب فتاویٰ دوسرے حصہ میں درج ہیں' جو بنام فیصلہ علماء اخیار در حرمت نکاح شغار زیر طبع ہے' بیشتر علماء کرام نکاح .ٹہ مروجہ کو حرام قرار دے کر اپنے فتوے نافذ کر چکے ہیں' لیکن میانوالی کے مکتبہ فکر کے ایک قریشی صاحب نے جو محکمہ بہبودی حیوانات کے کلرک ہیں' ایک ٹریکٹ شائع کیا ہے' جس میں نکاح .ٹہ کو صراط مستقیم قرار دے کر سنت حضرت آدم علیہ السلام بتایا ہے' نعوذ باللہ منہ۔

ٹریکٹ میں لکھا ہے کہ سبیل الرشاد یا صراط مستقیم یہی ہے کہ اس نکاح (.ٹہ) کو جائز ہی کہا جائے۔ کس قدر کج فکر ہو کر یہ مکروہ عقیدہ ظاہر کیا ہے کہ نکاح .ٹہ کو جائز کہنا ہی صراط مستقیم ہے' گویا یہ لوگ اھدنا الصراط المستقیم پڑھتے ہیں تو نکاح .ٹہ ہی اللہ سے طلب کرتے ہیں ؎

برین عقل و دانش بباید گریست!

اسی بنا پر اس رسالہ کا نام سبیل الرشاد رکھا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اس نکاح تبادلہ کو حرام کہنے والے صراط مستقیم سے علیحدہ ہو کر راہ ضلالت پر قائم ہیں۔

یہ عقیدہ صرف مؤلف رسالہ مذکورہ کا ہی نہیں ہے' غالباً میانوالی کی تمام جمعیت اہلحدیث کا یہ عقیدہ ہے۔ چنانچہ رسالہ کے ص-۱۸ پر یہ لکھا ہے کہ جماعت اہل حدیث میانوالی کی یہ تیسری پیشکش ہے ؎

فخر کیا کرتا ہے ایسی بوجھ پر
روئے گا محشر میں ایسی سوجھ پر

پھر مؤلف نے لکھا ہے کہ مرکزی جمعیت اہلحدیث مغربی پاکستان کے دستور کی تیسری بنیاد کے مطابق اہلحدیث کی دعوت ایک سلفی دعوت ہے' اس لیے کہ یہ اسلام کی اس پاک وصاف اور سادہ تعلیم کی طرف دعوت دیتے ہیں جو سلف صالحین نے امت کے سامنے پیش

کی ہے' جو ہر قسم کی بدعات ورسوم سے پاک ومنزہ تھی۔

تمسخر آل احمد سے تلعب دین برحق سے
کہاں تک بڑھ گئی اس دشمن ایماں کی بیباکی

اس عبارت میں مرکزی جمعیت کا جو دستور بتلایا گیا ہے کہ وہ صحیح اور راہ مستقیم ہے' لیکن نکاح تبادلہ کا جواز اس دستور کے سراسر خلاف ہے اور یہ جمعیت میانوالی نے پاکستان کی اسلامی پبلک کو مغالطہ دیتے ہوئے صاف لکھ دیا ہے کہ نکاح بٹہ کی حلت اور اس پر عمل درآمد مرکزی جمعیت اہلحدیث کا مسلک ہے اور ان کے شائع کردہ دستور کے مطابق ہے' کیونکہ مرکزی جمعیت اہلحدیث کے قائداعظم جو صدر جمعیت ہیں' وہ نکاح بٹہ مروجہ کو حرام اور فیصلہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مطابق اس پر استدلال کر چکے ہیں' ملاحظہ ہو اخبار الاعتصام مطبوعہ ۲۷/۲ ذیقعدہ سنہ ۷۰ ۱۳ھ

دوسرے جمعیت کے رکن اعظم مولانا محمد اسماعیل صاحب آف گوجرانوالہ ہیں' جو شیخ الحدیث اور جمعیت کے مفتی اعظم ہونے کے علاوہ ناظم جمعیت مرکزی ہیں' وہ بھی بٹہ مروجہ کو حرام ٹھہرا چکے ہیں۔

جب جمعیت اہلحدیث کے اکابر علماء اس کو حرام قرار دے کر رسم جاہلیت سمجھتے ہیں تو پھر یہ رسالہ ان کے شائع کردہ دستور کی بنیاد پر کس طرح قائم ہے' بلکہ اس کے بالکل متضاد ہے۔ چنانچہ صدر جمعیت نے جن کے حکم سے دستور مرتب ہوا ہے' اپنے فتویٰ میں یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں بنو ہاشم اور بنو امیہ کے لوگوں نے نکاح بٹہ مہر مقرر کر کے کیا تھا' تو وہ ممنوع قرار دے کر فسخ کر دیا گیا تھا۔ کیا یہ صراط مستقیم ہے؟ جس پر سلف کا دستور نافذ ہوا' جس پر اب بھی مرکزی جمعیت کے اکابر قائم ہیں' لیکن میانوالی کی جمعیت خود فریبی میں مبتلا ہو رہی ہے کہ ہماری مرکزی جمعیت نکاح بٹہ کے جواز کو صراط مستقیم تصور کرتی ہے' یہ بالکل باطل الزام ہے۔

لیا عقل و دیں سے نہ کام انہوں نے
کیا دین حق کو بدنام انہوں نے

میانوالی کی جمعیت کی تیسری پیشکش سے یہ لازم آرہا ہے کہ مرکزی جمعیت اہلحدیث نکاح تبادلہ کو حرام جاننے والی صراط مستقیم سے خارج ہے

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

میانوالی کی جمعیت نے مرکزی جمعیت کے اکابر کو صراط مستقیم سے علیحدہ ظاہر کرنے کے باوجود نکاح کا جواز کسی ایک دلیل شرعی سے اور تعامل صحابہ سے ثابت نہیں کیا' صرف یہ کوشش کی ہے کہ .ٹہ مروجہ شغار نہیں ہے لیکن یہ کوشش رائیگاں گئی کہ صرف شغار کے کانٹوں میں اُلجھ کر رہ گئے اور .ٹہ مروجہ کی علت پر کوئی شرعی دلیل نہ لا سکے' جب سب نے مل کر علمی سمندر کو خوب کھنگالا تو رسالہ پورا ہونے کے بعد ایک مُردہ دلیل ملی جو حاشیہ پر درج ہے جس کی عبارت یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے بھی ہابیل قابیل کے نکاح میں باوجود نکاح شرعی بحکم الٰہی تبادلہ بنات ہی بصورت مروجہ (.ٹہ) ہے اور تبادلہ بنات سنت حضرت آدم علیہ السلام ہے۔

ناظرین اہل علم! آپ حضرات ذرا ان یتامیٰ فی العلم مولویوں کی دلیل اور ان کے طرز استدلال اور دعویٰ اور دلیل کی مطابقت تامہ اور ان کے سوء تدبر پر غور فرمائیں کہ علمی روشنی میں یہ کہاں تک صحیح ہے؟ اول تو ہمشیرگان کی شادی بھائیوں سے یہ قصہ نہ قرآن میں ہے اور نہ صحیح حدیث میں ہے' محققین نے کہا ہے کہ "ھذہ الحکایۃ" "یہ بنی اسرائیلیوں کی خانہ ساز حکایت ہے۔" جب مناکحت کی کیفیت اور نوعیت کا تفصیلی علم نہیں' محض احتمالی بات ہے تو اس سے استدلال کیسے درست ہوا؟

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے پارہ نمبر ۱۳ کے ص۔ ۲۲۳ میں ذکر کیا ہے کہ ثعلبی نے ناقابل وثوق سند سے امام جعفر صادق سے یہ نقل کیا ہے کہ آدم کی اولاد میں بہن بھائیوں کی شادی کا خیال غلط ہے۔ دوم اگر محض تفسیری باتوں پر اعتماد رکھ کر اس مناکحت کو تسلیم کیا جائے تو اس میں یہ کہاں ذکر ہے کہ اس میں فریقین ایک نکاح کو دوسرے نکاح کے تبادلہ میں کرتے تھے' کیونکہ ان لڑکی لڑکوں کے باپ صرف حضرت آدم تھے' وہ اپنے اختیار بلا شرط سے ایک لڑکی کو دوسرے جوڑے کے لڑکے سے بیاہ دیتے تھے' پھر کسی وقت ایک لڑکے کو دوسرے جوڑے کی لڑکی سے بیاہ دیتے تھے۔ جب یہ بھی ممکن ہے تو استدلال باطل ہوا' کیونکہ بلا اشتراط ایک لڑکی کا عقد دوسرے لڑکے سے کرنا اور دوسرے کی ہمشیرہ کا نکاح پہلے لڑکے سے کرنا تبادلہ نہیں کہلاتا۔ جو شخص اس واقعہ سے استدلال کرے اس کے ذمہ یہ ثبوت ہے کہ

وہ ان نکاحوں کا ایک وقت میں ہونا اور اشتراط سے ہونا ثابت کرے۔ ودونہ خرط القتاد۔

سوم ہابیل قابیل کا نکاح ہی نہ ہوا تھا بلکہ وہ انکاری ہوا' جس سے خونریزی ہوئی تو اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ نکاح بٹہ فتنہ فساد ہے' ہابیل کی بہن وسیمہ تھی اور قابیل کی بہن جمیلہ تھی۔ قابیل نے جمیلہ کے تبادلہ میں وسیمہ لینی منظور نہ کی' جس پر فساد ہوا' اس لیے اب بھی شغار میں ایک کی لڑکی خوبصورت ہو اور دوسرے کی بھونڈی صورت ہو تو اعتراض ہوتا ہے۔ پھر بعض ایک جمیلہ کے عوض دو لڑکیاں لیتے ہیں اور بعض روپیہ زائد لیتے ہیں تو یہ موجب فتنہ اور فساد ہوا' اس لیے ہماری شریعت میں حرام ہے۔

چہارم جامع البیان کے حاشیہ ص ۱۴۱ میں فتح البیان سے منقول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت صرف اصول تھے' شریعت مقرر نہ ہوئی تھی کہ یہ رشتہ حرام ہے اور فلاں حلال ہے' ضرورت معاش اور بقاء نسل انسانی کی خاطر جس طرح اس حال میں مناسب ہوا عمل کر لیا گیا۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام کے وقت شریعت مقرر ہوئی' امہات اور بنات اخوات کی تحریم نازل ہوئی' یہاں تک کہ حضرت خاتم النبیین پر من کل الوجوہ شریعت کامل کر دی گئی۔ ان سابقہ شرع والوں کے ابتدائی معاملہ سے استدلال کرنا صریح بطالت ہے۔

پنجم' اگر یہ نکاح تبادلہ تھا اور سنت آدم ہے تو پھر اس سنت کی ہیئت کیوں بدلتے ہو؟ تم بھی جوڑا پیدا ہونے والے لڑکی لڑکوں کے جو ایک ہی ماں باپ سے ہوں' تبادلہ کیا کرو' العیاذ باللہ!

ششم' اس سے استدلال کرنا ایسا ہے جیسے بعض عوام کالانعام پیروں کے تعظیمی سجدہ کے ثبوت میں ملائکہ کے سجود برائے آدم علیہ السلام سے استدلال کرتے ہیں۔ اگر تمہارا استدلال صحیح ہے تو پھر ان کا بھی صحیح ہو گا۔ اگر دونوں کا صحیح ہے تو پھر اپنی بہنوں سے بھی مناکحت شروع کر دو۔ صرف ایک بٹہ کی کوشش کیوں ہے۔

ہفتم' یہ استدلال ایسا ہے جیسے حضرت آدم اور حوا کی مناکحت سے بیٹی سے نکاح کرنے کی دلیل لینا ہے' تم لوگ اس طرح بھی سنت آدم پر عمل کرنا شروع کر دو' ورنہ ما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

ہشتم' فتح الباری پارہ ۲۲' ص ۱۷ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مجوسیوں کے بدبخت امام نے شراب سے مخمور ہو کر اپنی بہن سے بدکاری کا ارتکاب کیا' لوگوں نے اس

حاکم پر اعتراض کیا تو اس نے یہ جواب دیا کہ اِنَّ اٰدم کان ینکح اولادہ بناتہ "(مجبوری سے) آدم علیہ السلام کے وقت بھی آخر بہن بھائیوں کی شادی ہوا کرتی تھی۔" اس پر بعض تو اس دلیل کو مان گئے اور بعض نے انکار کر دیا کہ ہم اس استدلال کو تسلیم نہیں کرتے۔ پس اہل شغار کا استدلال بھی اسی قسم کا ہے اور ہوا پرستوں کا طرز عمل اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے۔

نہم' اس واقعہ آدم علیہ السلام میں یہ ذکر نہیں ہے کہ اس مناکحت میں مہر مقرر ہوتا تھا' اگر مہر تھا تو ثبوت دیں۔ اگر مہر نہ تھا تو ایسا شغار تمہارے نزدیک بھی حرام ہے۔ پھر استدلال سنت آدم سے کیسے جائز ہوگا۔

دہم' اگر یہ سنت آدم قابل عمل ہے تو مرکزی جمعیت اہلحدیث کے صدر اور ناظم صاحبان سے تصدیق کرا دیں ورنہ میانوالی کی جمعیت پر کون اعتماد کرتا ہے' جس کا مسلک مرکزی مسلک کے صریح خلاف ہے۔

کتبہ عبدالقادر عارف حصاری

قوانین فطرت سوہدرہ' جلد۔۷' شمارہ۔۸' بابت ماہ اگست سنہ۔۱۹۶۰ء

فقہ حدیث!

نکاح شغار کا عام رواج

نکاح شغار' جس کو ہماری زبان اور محاورہ میں "نکاح بٹہ" کہتے ہیں۔ جاہلیت کی رسومات سے ایک رسم ہے۔ جس کا اسلام میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بایں ہمہ فرقہ اہل الرائے وقیاس نے اس کو حیلہ وبہانہ سے رواج دے کر اسلام میں داخل کر رکھا ہے اور عوام الناس عام طور پر نکاح بٹہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس کے مفاسد شہرۂ آفاق ہو چکے ہیں اور اس کی حرمت اور بطلان بالکل ظاہر ہے' چونکہ ملک میں اہل الرائے کی اکثریت ہے' اس لیے وہ باب الاحتیال سے گذر کر' اس کو لوگوں میں رائج کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ جس چیز کا رواج عام ہو جائے' اس کی حرمت اور مفاسد بالکل نظر انداز ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی بھیڑ چال کے طور پر لوگ اس کے مرتکب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

چنانچہ ہمارے اہلحدیث بھائی بھی نکاح شغار کا شکار ہو چکے ہیں اور اس کے جائز کرنے کی

ناجائز کوشش کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ قوم اوڈ میں ایک مولوی عبدالرحمٰن مالیر کوٹلوی ہیں' جو اس جاہلیت کے نکاح کو اپنی قوم میں رواج دے رہے ہیں اور اس گناہ کی بار برداری کا صاف طور پر اعلان کر رہے ہیں۔ خود بھی انہوں نے لڑکے لڑکیوں کا نکاح بٹے کے طور پر کیا ہے اور قوم اوڈ کے تمام قبائل میں اس کا اجرا کر رہے ہیں۔

بنا بریں اس خادم المسلمین نے ایک رسالہ بنام "فیصلہ سید الابرار در حرمت نکاح شغار" شائع کیا ہے' جس میں اس مسئلہ پر مختصر سی بحث کی گئی ہے اور دوسرا حصہ اس کا تیار ہو رہا ہے' جس میں اس مسئلہ پر مفصل بحث ہو گی' (انشاء اللہ)

زمانہ حاضرہ کے جمہور علماء اہلحدیث نے ہمارے رسالہ کی تائید کی ہے' علاوہ ازیں گذشتہ ماہ ذوالحجہ میں یہ خادم الموحدین فریضہ حج ادا کرنے گیا تو علماء حرمین شریفین سے بھی شغار سے متعلق فتویٰ لے آیا جو مندرجہ ذیل ہے' ناظرین اس پر غور فرما کر اس رسم جاہلیت کا انسداد کریں۔

فتویٰ علماء حرمین شریفین' در حرمت شغار متناکحین

: سادة العلماء! فما قولكم دام فضلكم فى رجل يزوج ابنته لابن رجل آخر على شرط ان يزوج الاخر' ابنته لابن ذالك الرجل ويعلقان النكاح علٰى هذا الشرط وانهما يجعلان الصداق فى الانكحة بالشرط المتقدم ولهذا الصداق المقرر يكون اقل القليل اذا رعيت المثلية مراعاة' منهما فى ذالك الشرط العقود عليه النكاح فهل هذا الشرط جائز عند الشريعة؟ وهل هذا النكاح هو الشغار المنهى عنه فى الشريعة؟ فاذا لم يكن لانه جعل فيه الصداق فما جوابكم عن حديث معاوية رضى الله عنه الوارد فى سنن ابى داؤد انه فسخ النكاح المشروط بهذا الشرط مع كون الصداق حاصلا افتونا ولكم الاجر والبارى يرعاكم۔ سنه هجرى ۷۰۔۱۲۔۱۸

(السائل على محمد صمصام ليلبورى لاى المطوف محمود ناصر جياد مكه مكرمه)

الجواب : هذا النكاح هوالشغار الذى كان يجرى فى الجاهلية وجاء فى الحديث النهٰى واما ذكر الصداق الذى يراد به الاحتيال على تحليل ما

حرم اللّٰہ فلا یفید وفی الحدیث "انما الاعمال بالنیات" وبذالک نظر معاویۃ رضی اللّٰہ عنہ الی المقصود فابطل ھذا النکاح ابطالا للحیلۃ فی تحلیلہ واللّٰہ اعلم۔

نشان مھر | دستخط

محمد عبدالرزاق | محمد عبدالرزاق حمزہ مدرس

بالحرم المکی الشریف' بمکہ المکرمہ

تصدیق

الشھادۃ ما قالہ فضیلۃ الشیخ محمد عبدالرزاق حق

عبدالمھیمن ابو السمع امام المسجد الحرام بمکۃ المکرمہ۔

تصدیق آخر

لائق مجیب کا جواب صحیح ہے۔

ابو سعید عبداللہ لکھنوی مدرس مسجد الحرام

ومدرس مدرستہ دارالحدیث مکہ ۱۹/ ذی الحجہ سنہ ۷۰ سالھ

میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ جواب بیت اللہ میں میرے سامنے لکھا گیا ہے جو صحیح ہے۔

حررہ عبدالمجید خادم مدیر جریدہ اہل حدیث سوہدرہ مورخہ ۱۹۵۱-۱۰-۱۱ء

یہ عربی فتویٰ تو علماء دین کے لیے قابل غور ہے۔ اب عامتہ المسلمین کے لیے اس کا اردو ترجمہ ذیل میں نمبروار درج کیا جاتا ہے' ملاحظہ فرمائیں۔

سوال: کیا فرماتے ہیں سادۃ العلماء' اس شخص کے بارے میں کہ وہ اپنی بیٹی کسی شخص کے بیٹے سے اس شرط پر نکاح کرے کہ وہ دوسرا شخص اپنی بیٹی اس کے بیٹے کو نکاح کر دے اور وہ دونوں شخص' اس نکاح کو اس شرط پر معلق کر دیں لیکن ہر دو نکاح میں شرط مذکورہ کے ساتھ مہر مالی بھی مقرر کر دیں اور یہ مہر مقررہ اقل قلیل ہوتا ہے' کیونکہ فریقین کی طرف سے اس میں اس شرط کی وجہ سے رعایت رکھی جاتی ہے جس کی بنا پر نکاح منعقد ہوا ہے' کیا یہ شرط جائز ہے؟ اور کیا یہ شغار ممنوعہ ہے؟ اگر نہیں' کیونکہ اس میں مہر مقرر ہے تو پھر حدیث امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا کیا جواب ہے؟ جو سنن ابوداؤد میں وارد ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے باوجود مہر مقرر ہونے کے اس نکاح مشروط کو اس شرط کی وجہ سے فسخ کر دیا

تھا۔

آپ حضرات علماء ہمیں اس بارے میں فتویٰ دیں' اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے اور حفاظت فرمائے۔

(سائل' علی محمد صمصام لیلپوری مقیم نزد محمود ناصر معلم مطوف مکہ مکرمہ محلہ جیاد)

جواب علماء حرم مکہ: یہ نکاح وہی شغار ہے جو زمانہ جاہلیت میں جاری تھا' جس کی حدیث میں نہی آئی ہے اور مہر کا ذکر کرنا جس کا مراد حرام کو حلال کرنے کا حیلہ نکالنا ہے' ان کو کس طرح مفید و بہتر ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ عملوں کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اس واسطے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اصل مقصود پر غور فرماتے ہوئے اس نکاح کو باطل کر دیا تاکہ حرام کو حلال کرنے کا حیلہ باطل ہو' واللہ اعلم۔

(محمد عبدالرزاق حمزہ مدرس حرم شریف مکہ مکرمہ)

تصدیق نمبر-۱: میں گواہی دیتا ہوں کہ جو کچھ فضیلتہ الشیخ محمد عبدالرزاق صاحب نے فرمایا ہے' وہ حق ہے۔ (ابو السمح عبدالمہیمن امام مسجد حرم مکہ مکرمہ۔

تصدیق نمبر-۲: لائق مجیب کا جواب صحیح ہے۔ (ابو سعید عبداللہ لکھنوی مدرس مسجد الحرام ومدرس مدرسہ دارالحدیث مکہ ۱۹/ ذی الحجہ سنہ-۷۰ ۱۳ھ

عبدالقادر عارف حصاری

اعتصام لاہور مورخہ ۴/ اپریل سنہ-۱۹۵۲ء

اشتہار "نکاح شغار کیا ہے؟" پر تبصرہ!

چیلنج منظور!

حضرات ناظرین کرام!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ! اما بعد

واضح ہو کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل زمانہ جاہلیت وکفر میں جس طرح دیگر رسومات قبیحہ وعادات شنیعہ کا رواج عام تھا۔ اس طرح نکاح جاہلیت کی بھی چند قسمیں مروج تھیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت سید الکونین رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا تو آنجناب نے ملک عرب کی خصوصاً اور دیگر ممالک کی عموماً اصلاح فرمائی اور تمام رسومات کفریہ اور عادات جاہلیہ کا استیصال فرمایا۔ مفاسد، فواحش اور برائیوں کو مٹایا۔ انہی میں سے نکاح بٹہ بھی ہے جس کو عربی زبان میں شغار اور اردو زبان میں ادلا بدلی (تبادلہ کا نکاح) کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے نکاح شغار کو حرام قرار دے کر ملک عرب سے اس کا خاتمہ کر دیا اور ارشاد فرمایا : لا شغار فی الاسلام "کہ اسلام میں نکاح بٹہ کا کوئی وجود نہیں ہے۔"

پھر عہد رسالت میں اور عہد خلفائے راشدین میں نکاح بٹہ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت کا زمانہ آیا اور کچھ شر و فساد شروع ہوا تو اہل مدینہ میں نکاح شغار کی ابتدا بھی ہوئی، بایں طور کہ :

بنو ہاشم اور بنو امیہ دو قبیلوں نے آپس میں مناکحت کی تو درمیان میں مہر کا حیلہ تجویز کر کے اس نکاح کو منعقد کر دیا۔ امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فوراً حکم نامہ بھیج کر اس مناکحت کو فسخ کرا دیا۔ اس کے بعد قرون ثلاثہ کی آخری حد تک نکاح بٹہ نہ ہوا۔

پھر جب مسلمانوں میں فرقہ بندی اور شر و فساد برپا ہوا اور مختلف قسم کے فتنے سر اٹھانے لگے تو وہی رسومات جاہلیہ و کفریہ عود کر آئیں اور ایسا تغیر پیدا ہوا کہ اسلامی ملکوں میں وہی رسومات جاہلیت حیلوں، بہانوں سے، عقائد و خیالات میں، عبادات و معاملات میں داخل ہو کر مذہبی صورت اختیار کر گئیں۔ انہی میں سے رسم متعہ، رسم حلالہ اور رسم نکاح شغار ہے۔

اسلام نے ان رسومات کو حرام قرار دیا تھا لیکن آج یہ نکاح کی رسمیں بعض فرقوں اور قوموں میں مروج بالحلت ہیں۔ علمائے ابن الزمان ان کے جواز کے فتوے دے کر ان کی حرمت کو حلت بدعت کو سنت، ضلالت کو ہدایت اور شر و فساد کو امن و سکون قرار دے رہے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں پر صریح ظلم ہے۔

نکاح بٹہ و تبادلہ، اصول شرعیہ کی رُو سے حرام ہے، اس کی حرمت ذاتی وصفی اور بالکل بدیہی ہے اور اس کی خرابیاں ہر خاص و عام پر عیاں ہیں۔

علمائے اسلام کا فرض تھا کہ اس کا انسداد کرتے لیکن افسوس ہے کہ بعض علماء اس حرام نکاح کے مجوز بن کر فتویٰ بازی اور اشتہار بازی سے کام لے رہے ہیں اور علمائے اہل حق،

محرمین نکاح شغار کو چیلنج کر رہے ہیں کہ ہر شخص جس وقت چاہے ہمارے ساتھ تحریری یا تقریری بحث ومناظرہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ ان مجوزین نکاح .ٹہ میں سے ایک صاحب ابن مہتاب ہیں' جو مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ کے مدرس ہیں' انہوں نے اپنے اشتہار متعلقہ شغار میں اظہار کیا ہے کہ ان کے استاد مولانا سلطان محمود صاحب جلال پوری ہیں۔

بندہ عارف حصاری نے مولانا سلطان محمود صاحب کی تعلیمی سرگرمیوں کا یہ تجربہ کیا ہے کہ ان سے فیض یافتہ حضرات مروجہ نکاح تبادلہ وشغار کا بہت زیادہ چرچا کرتے ہیں۔ ان کے بعض شاگردوں سے راقم کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے اسی حرام نکاح کے حلال ہونے پر گفتگو کی جس کا انجام یہ ہوا کہ انہوں نے سلف صالحین اہل مدینہ کے عظیم المراتب خاندانوں (بنو ہاشم وبنو امیہ) کو خصوصاً اور تمام علمائے سلف اہل مدینہ کو عموماً اس جاہلیت کے نکاح شغار کا شکار بتایا جس کی حرمت اور نکاح جاہلیت ہونے کا ان کو اعتراف تھا اور اس مسئلہ میں ان سب بزرگان سلف کو جاہل اور جاہلیت کی طرف مائل قرار دیا اور ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اور اپنے استاد مولانا سلطان محمود کو عالم جید تصور کیا۔ خانیوال کے مدرس ابن مہتاب بھی انہی مولانا سلطان محمود کے شاگرد ہیں۔ یہ صاحب مسئلہ نکاح شغار سے لوگوں کو شکار بنانے کے لیے اشتہار دے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی تازہ تعلیم کے فخر سے موجودہ حکومت کی اصلاح بذریعہ تبلیغ شرعی کرنے اور گمراہ فرقوں' مرزائیوں' رافضیوں' منکرین حدیث' پرویزیوں' سوشلزم کے حامیوں اور بریلویوں کی اعتقادی اور عملی اصلاح کرنے کی ٹھانی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک حرام اور پر مفاسد رسم نکاح .ٹہ کی ترویج اور اشاعت پر کمر باندھ رکھی ہے۔

بندہ مشتہر ابن المہتاب کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ ؎

الجھ پڑنے کی خو اچھی نہیں ہے

فسادی گفتگو اچھی نہیں ہے

اس وقت ملک ایک نازک دور سے گذر رہا ہے۔ اکثر اہل علم ملک کے شدید خرابیوں' غیر ملکی غاصبوں کی ظالمانہ کارستانیوں کی پریشانیوں میں مبتلا ہیں اور اپنے بھائیوں (اسیران ہند) کے غم میں دل گرفتہ ہیں۔ جنگ کے بادل سروں پر منڈلا رہے ہیں' لیکن خانیوال کی درس گاہ دارالحدیث کے مجاہدین ان سب مصائب وآلام سے بے فکر ہو کر مسئلہ شغار کو محاذ جنگ

بنا رہے ہیں اور علمائے حق سے برسرپیکار ہیں' راقم ان کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہے کہ :

> اگر آپ کو علمی فخر ہے اور آپ دلی اخلاص سے شغار کی تحقیق کے لیے تیار ہیں۔ اگر آپ اپنے علمی ہتھیاروں سے لیس ہو چکے ہیں تو آپ کے اشتہار اور چیلنج سے پہلے بندہ عارف حصاری کا ایک اشتہار (آج سے بارہ سال قبل) شائع ہو چکا ہے' پہلے آپ اس کا جواب دیں۔ (یہ اشتہار بندہ کے رسالہ فیصلہ سید الابرار در حرمت نکاح شغار کے آخری صفحہ پر درج ہے)

انعامی چیلنج : گذشتہ شمارہ میں آج سے بارہ سال قبل شائع شدہ جس اشتہار کا ذکر کیا گیا تھا' اس کا مضمون دوبارہ یہاں درج کیا جاتا ہے :

انعامی چیلنج : کمترین' خادم الاسلام والمسلمین ان علماء مجوزین کو جو نکاح .ٹہ مروجہ کو حلال کہتے ہیں' یہ چیلنج کرتا ہے کہ کسی دلیل شرعیہ سے وہ .ٹہ مروجہ کا ثبوت دے کر اس کا عہد نبوی یا عہد صحابہ کرام میں ہونا اور اس کا جائز رکھا جانا بسند صحیح و عبارت صریح ثابت کر دیں تو ان کو مبلغ یک صد روپیہ انعام دیا جائے گا۔ .ٹہ مروجہ سے وہی شغار مراد ہے جس کی اس رسالہ میں تشریح کی گئی ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ بغیر قرآن مجید وحدیث مرفوع صحیح کے کسی امام یا عالم کا قول اور فتویٰ اثبات دعویٰ کے لیے کافی نہ ہو گا۔ انعام کا استحقاق دلیل شرعی صحیح پیش کرنے پر حاصل ہو گا۔ فتفکروا ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

رسالہ فیصلہ سید الابرار کے ص۔ے پر لفظ شغار کی تعریف اور اس کی اقسام یوں ذکر کیے گئے ہیں : "شغار سے مراد نکاح تبادلہ ہے جس کو .ٹہ کا نکاح کہتے ہیں یعنی باہم ایک لڑکی دوسری لڑکی کے بدلہ میں دے کر باہم نکاح کرنا' مثلاً ایک مرد دوسرے مرد سے یوں کہے کہ تو اپنی لڑکی مجھے یا میرے لڑکے کو نکاح میں دے دے' میں تجھ کو یا تیرے لڑکے کو اپنی لڑکی کا نکاح دے دوں گا' یا یوں کہے کہ تو مجھے اپنی بہن نکاح میں دے دے' میں اپنی بہن تجھ کو نکاح میں دے دوں گا۔"

حقیقت شغار کی صرف اتنی ہے کہ لڑکی کے عوض لڑکی کی شرط کر کے نکاح میں دینا' خواہ دختر ہو یا ہمشیرہ یا کوئی اور رشتہ دار لڑکی ہو' لیکن بدلہ میں دینا ایسا مشروط ہو کہ بغیر اس کے دوسرا نکاح نہ ہو (ایک کا نکاح دوسری کے نکاح پر معلق ہو) اگر ہو جائے تو اس کو صحیح

تصور نہ کیا جائے۔ بس یہ نکاح بٹہ ہے جو شرعاً حرام ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔
(۱) یہ کہ جانبین سے نکاح میں مہر مقرر کیا جائے' صرف لڑکی عوض لڑکی نکاح دی جائے۔
(۲) لڑکی کے عوض لڑکی دینی بھی شرط کی جائے اور نکاح کے وقت طرفین میں مہر بھی مقرر ہو۔ یہ دونوں قسمیں حرام ہیں۔

حدیث شریف : لا شغار فی الاسلام اپنے اطلاق سے دونوں قسموں کو شامل ہے۔ آپ کا چیلنج ہم کو منظور ہے لیکن آپ پہلے ہمارے چیلنج انعامی کا جواب دیں' بعد میں آپ سے تبادلہ خیالات کیا جائے گا (انشاء اللہ)۔

دیگر عرض ہے کہ بخاری شریف جلد۔۲' ص۔۷۶۹ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے' اس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ جاہلیت میں چار قسم کے نکاح مروج تھے : منها نكاح الناس اليوم يخطب الرجل الى الرجل وليته او بنته ــــــ پھر بعض جاہلیت کے نکاحوں کا ذکر کر کے یہ فرمایا : فلما بعث محمد صلى الله عليه وسلم بالحق هدم نكاح الجاهلية كله الا نكاح الناس اليوم۔

یہ حدیث امام الدنیا فی الحدیث امام بخاری نے باب لا نکاح الا بولی کے تحت ذکر کی ہے' جس سے ایک تو یہ ثابت ہوا کہ بغیر ولی کے نکاح باطل ہے' دوسرا یہ ثابت ہوا کہ نکاح تبادلہ (کسی عورت کا نکاح دوسری عورت کے عوض میں دینا) اس نکاح میں داخل نہیں' لہذا یہ اس نکاح مشروعہ کے علاوہ نکاح جاہلیت کی ایک قسم ہے۔

اگر نکاح شغار' نکاح مشروعہ کی قسم ہے تو اس کا وجود شرع سے اور صحابہ کرام کے تعامل سے ثابت کریں' کیونکہ ہماری تحقیق میں قرون ثلاثہ مشهود لها بالخیر میں نکاح تبادلہ کا وجود مفقود ہے۔ حدیث قرون ثلاثہ کے ذکر میں بعد انقراض ازمنہ خیر کے یہ جملہ مذکور ہے : ثم يفشو الكذب کہ ان زمانوں کے بعد جھوٹ پھیل جاء گا۔

چنانچہ اسلام میں فرقہ بندی شروع ہو کر اعتقادی اور عملی گمراہیاں پھیلی ہیں تو انہی میں سے نکاح تبادلہ ہے جو نکاح مشروعہ کی تعریف سے خارج ہے۔ پس آپ کا فرض ہے کہ اس نکاح تبادلہ کو کسی شرعی دلیل سے مشروع ثابت کریں' فقط۔

کتبہ عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور' مورخہ ۱۲' ۱۹ و ۲۶/ مئی و ۲/ جون سنہ۔ ۱۹۷۲ء

مسئلہ نکاح شغار (بٹہ)

مولانا سید محمد داؤد غزنوی صاحب کا فیصلہ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ' مقصود بالاظہار یہ ہے کہ کچھ دنوں سے ایک رسالہ بنام "سبیل الرشاد فی تفریق التبادلہ والشغار" جمعیت اہلحدیث میانوالی کی طرف سے شائع ہوا ہے' جس میں نکاح بٹہ مروجہ کو باوجود شرط تبادلہ قائم رہنے کے جائز اور حلال تسلیم کرتے ہوئے اس کو صراط مستقیم قرار دیا گیا ہے جس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ حرمت بٹہ مروجہ کا حکم سراسر گمراہی ہے۔

چونکہ فیصلہ سنام اور فتویٰ مندرجہ الاعتصام میں صریح تضاد اور تعارض ہے' جس کا آنجناب کی حیات والاصفات میں اعلانیہ مظاہرہ ہو رہا ہے' اس لیے درخواست اور اپیل یہ ہے کہ اس تضاد اور تعارض کو رفع فرما کر راجح حکم کو بیان کیا جائے' اگرچہ مسئلہ مختلف فیہ ہے لیکن حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ جبکہ فیصلہ کن ہے جس سے آپ نے آخری فتویٰ میں استدلال کیا ہے تو فیصلہ سنام اس فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے جس پر اجماع سکوتی بتایا گیا ہے' صاف منسوخ ہے۔

اہل اصول میں صحیح اور راجح یہ بات ہے کہ اگر صحابی فقیہ اور امام اور حاکم ہو اس کا فتویٰ اور حکم عوام میں منتشر ہو جائے اور پھر اس کی مخالفت اس عہد میں نہ پائی جائے تو وہ حجت ہے اور اجماع ہے' خصوصاً جب اس فیصلہ کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کیا گیا ہو تو پھر اس کے راجح ہونے میں کلام ہی کیا ہے' لیکن لوگوں کی نکتہ چینی اور جرح سے نہ اللہ تعالیٰ اور اس کا کلام قرآن بچ سکے اور نہ انبیاء اور ان کی احادیث بچ سکیں تو پھر فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ اس چودھویں صدی کے مولویوں کی نکتہ چینی سے کس طرح بچ سکتا ہے' حالانکہ بنو ہاشم اور بنو امیہ اس فیصلہ کو تسلیم کر چکے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک بار دعا فرمائی تھی کہ اے خداوند عالم بنی اسرائیل کی زبان سے میرا پیچھا چھوڑا دے تو وحی آئی کہ جب میں نے مخلوق کی زبان اپنے نفس سے بند نہیں کی تو تم سے کیسے بند کر دوں۔ (جامع بیان العلم)

جب جناب والا کی زندگی میں آپ کے یہ متعارض فیصلے باعث نزاع بن رہے ہیں تو آنجناب کے اس جہاں سے رحلت فرمانے کے بعد تو مزید جھگڑے اور اختلاف کا موجب ہوں

گے' لہٰذا اپیل یہ ہے کہ آپ اپنی تحقیق سے راجح فیصلہ اخبار میں شائع فرما دیں کہ نکاح تبادلہ موجبہ جس میں شرط تبادلہ ملحوظ رہے' حرام ہے یا حلال ہے؟

علامہ ابن حزم نے تمام احادیث شغار کو جمع کر کے شغار کی دو نوع بیان فرماتے ہوئے یہ مطابقت دی ہے کہ شغار ہر دو قسم حرام ہے اور اس میں وجہ حرمت اشتراط فریقین ہے۔ ھکذا قال ناظم الجمعیۃ مولانا اسماعیل شیخ الحدیث مدظلہ العالی فتواہ' آنجناب کے اخلاق اور علمی شان سے یہ توقع ہے کہ فیصلہ سابق سے رجوع کرنے میں عار نہیں فرمائیں گے' کیونکہ سلف صالحین اور ائمہ متقدمین ہمیشہ حق کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں اور ان کو عار مانع نہیں ہوئی۔

چنانچہ کتب ائمہ میں صدہا مقام پر یہ لکھا ہے کہ والیہ رجع الامام حضرت عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے یہ منقول ہے' اگر جنبی کو پانی غسل کے لیے نہ ملے تو وہ نماز نہ پڑھے لیکن پھر انہوں نے رجوع کر لیا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنے خطبہ میں مہر کی زیادتی کی تردید کی تو ایک عورت نے اس غلطی پر تنبیہہ کر دی' اس پر آپ نے فرمایا کہ اللّٰھم اغفرا کل الناس افقہ من عمر ثم رجع فرکب المنبر فقال انی نھیتکم ان تزیدوا فی المھر ھذا خطاء منی فانی ارجع عنہ والقول فمن شاء ان یعطی من مالہ ما احب فلیفعل او کما قال بسندہ جید "یعنی اے اللہ! میں بخشش مانگتا ہوں' سب لوگ ہی عمر سے سمجھدار ہیں' پھر اپنے حکم سے رجوع کر لیا اور منبر پر یہ اعلان کیا کہ میں نے تم کو مہر زیادہ باندھنے سے منع کیا تھا' یہ میری خطا تھی جس سے میں رجوع کرتا ہوں اور اب یہ کہتا ہوں جو شخص اپنی خوشی سے اپنا مال مہر میں دینا چاہے تو وہ دے سکتا ہے۔"

مولانا سید نذیر حسین مرحوم المعروف میاں صاحب نے تقلید شخصی کو مباح کہہ کر پھر بدعت اور ناجائز قرار دے دیا اور اباحت سے رجوع کیا۔ چنانچہ اخبار اہلحدیث کے کسی نمبر میں اس کی تفصیل کر دی گئی تھی۔

اسی طرح الحیاۃ بعد المماۃ ص ۱۵۷' ۱۸۷ میں ہے کہ میاں صاحب اپنے شاگرد مولانا سید عبدالعزیز عرف عزیز احمد کو لکھتے ہیں کہ "تم نے مجھ سے سنن ابوداؤد پر شدید بحث کی اور میرا کہنا نہ مانا' تیسری مرتبہ مجھے تم کو راضی کرنا پڑا' اس لیے کہ تم حق پر تھے اور تم نے بات بھی سلف صالحین کے مطابق کہی تھی۔ یااللہ تو میری اس تحریر کو درجہ قبولیت کا دے' یعنی

میرے رجوع کو قبول فرما اور میری خطا بخش دے' آمین۔

اسی طرح ہمارے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد علی صاحب محدث مدنی متع اللہ المسلمین بطول حیاتہم نے مسئلہ نکاح .ثہ میں حلت سے حرمت کی طرف رجوع کیا جس کا تذکرہ الاعتصام میں ہو چکا ہے۔ اسی طرح حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب فاضل امرتسری سردار اہل حدیث نے نکاح .ثہ میں جواز سے حرمت کی طرف رجوع کیا' چنانچہ آخری فتویٰ ان کا حرمت کا تھا۔ اسی طرح مولانا حافظ زکریا صاحب غزنوی مدظلہ کا فتویٰ بھی حرمت نکاح .ثہ کا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اب وہ اپنے فیصلہ سنام سے رجعت کر چکے ہیں۔ اسی طرح مولانا عبدالوہاب صاحب محدث دہلوی اپنے فتویٰ سے جو فتاویٰ نذیریہ کے ضمیمہ میں بابت نکاح .ثہ درج ہے' حرمت کی طرف رجوع کر چکے ہیں۔

بہرکیف علماء اہل حق اپنی خطا پر اصرار نہیں کرتے' جب ان کو حق مل جاتا ہے' تب وہ فوراً رجوع کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ائمہ اربعہ کے اقوال مختلفہ قدیم اور جدید کتب فقہ میں بکثرت موجود ہیں۔ کما لا یخفی علی اھل العلم۔

مولانا عبدالستار صاحب امام جماعت غرباء کا یہ دعویٰ ہے کہ "میرا دعویٰ ہے اور مجھ کو فخر ہے کہ میرے بتائے مسئلے سب سچے ہیں' نہ آج تک کوئی غلط ثابت کر سکا' نہ آئندہ کر سکتا ہے۔ انہوں نے بھی اپنے چچا مولانا احمد مرحوم مدنی اور مولانا سامرودی مدظلہ کے تنبیہہ کرنے پر جادو منتر سے عند الضرورت دم جھاڑا کرنے سے رجوع کر لیا تھا' جیسا کہ علماء میں مشہور ہے۔ نیز انہوں نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ مسافر اگر مقیم امام کی دو آخری رکعتوں میں اقتداء کر لے تو ساتھ ہی سلام پھیر سکتا ہے۔ بندہ نے سنن بیہقی کبریٰ سے ایک حدیث اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کا فتویٰ دکھایا کہ نماز پوری کرنی چاہیے تو انہوں نے رجوع کر لیا تھا اور فالنکا میں جمعہ کے روز عام اعلان کیا کہ آئندہ مسافر مقیم کی اقتدا میں قصر نہ کرے' بس ٹھیک اسی طرح آپ بھی صاف لفظوں میں فیصلہ سنام سے رجوع کا اظہار فرمائیں تاکہ اہل شغار ملا اور مولوی اس فیصلہ سے استناد کر کے نکاح .ثہ کا ارتکاب نہ کریں یا کریں تو آپ پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہو۔ والسلام

عبدالقادر عارف حصاری

اہلحدیث سوہدرہ جلد ۱۱' شمارہ ۱۸' مورخہ ۸/ مئی سنہ ۱۹۵۹ء

نکاح ۔ٹہ کے فیصلہ کے بارے میں ثالث کا تقرر

حضرات! نکاح ۔ٹہ اور لڑکیوں کی شادی بطور تبادلہ جاہلیت کی رسم ہے۔ اسلام میں کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ یہ حرام ہے۔ صحیح حدیث میں اس کی قطعی طور سے نفی کی گئی ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ کا فرمان ذی شان ہے : لا شغار فی الاسلام۔ یعنی اسلام میں اولاً بدلی اور ۔ٹہ سے نکاح کرنے کا وجود نہیں ہے۔

حضرت امیر المومنین' کاتب الوحی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عہد صحابہ میں نکاح ۔ٹہ مروجہ کو ممنوع قرار دے کر اس میں تفریق نافذ کر دی تھی اور اپنے حکم نامہ میں فرمایا تھا : ھٰذا الشغار الذی نھی عنه رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم۔ یعنی "یہی شغار ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔" اس فیصلہ کو بلااجماع تسلیم کیا گیا' کسی کا انکار ثابت نہیں ہوا۔

باوجودیکہ اس کی حرمت وبطلان ظاہر ہے اور اس کے مفاسد شہرہ آفاق ہیں لیکن پھر بھی اہل رائے وقیاس نے دیگر رسومات مروجہ کی طرح اس کو بھی حیلے وبہانے سے رواج دے کر اس کو اسلام میں داخل کر لیا ہے' چونکہ اہل رائے کی اکثریت ہے اور اہل سنت کی اقلیت ہے' اس لیے نکاح ۔ٹہ کا عام رواج ہو گیا ہے اور اس عام رواج سے بعض اہلحدیث بھی نکاح شغار کا شکار ہو رہے ہیں' حتیٰ کہ اس کے کثرت رواج سے متاثر ہو کر بعض ملا مولویوں نے اپنی قوم میں اس رواج کو پختہ کرنے کے لیے نکاح ۔ٹہ کے جائز ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے اور اس کے گناہ کی ذمہ داری لے لی ہے۔ چنانچہ مولوی نور محمد اوڈ اور مولوی عبدالرحمٰن اوڈ صاحبان اس نکاح ممنوعہ کے مروج ومجوز ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نکاح ۔ٹہ حلال ہے۔

اس خادم العلم والعلماء نے ان کی تردید اور نکاح ۔ٹہ کی حرمت کے بارے میں ایک رسالہ بنام فیصلہ سید الابرار ﷺ شائع کیا ہے جس کی تائید محققین علماء اہلحدیث نے بھی فرمائی ہے۔ اس رسالہ کے آخر میں ایک انعامی اشتہار بھی دیا گیا ہے جس کا جواب علماء اہل شغار سے آج تک نہیں ہو سکا لیکن پھر بھی قوم اوڈ کے بعض ملا مولوی اپنی قوم میں اس نکاح کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں اور خود بھی اس پر عمل درآمد کر کے حرام کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ مولوی نور محمد اود اس مسئلہ کی اشاعت کرتے ہوئے حاجی عبدالرحمٰن

صاحب کے پاس پہنچے جو قوم اوڈ کے ایک مشہور قبیلہ کے چودھری ہیں۔ ان سے اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی اور سلسلہ بحث مولانا محمد علی صاحب محدث لکھوی مدنی کے فتویٰ پر پہنچا کہ حضرت مولانا محمد علی صاحب مدظلہ العالی کا جو فتویٰ اس نکاح مبادلہ پر ہو' اس کو فریقین تسلیم کر کے عمل درآمد کر لیں۔ چنانچہ فریقین نے اقرار نامہ لکھ کر اس پر اپنی تصدیق کر دی۔ مولوی نور محمد صاحب نے اقرار نامہ پر دستخط کر کے جو اقرار کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :

"اگر مولوی محمد علی صاحب سے مہر والا .ٹہ منع اور حرام ثابت ہو جائے تو بندہ نور محمد پہلے فتویٰ سے رجوع کر کے منع مان لوں گا۔" نور محمد بقلم خود

تاریخ مقرر فیصلہ نکاح .ٹہ ۱۸/ جون سنہ۔ ۱۹۵۴ء مقام منٹگمری (ساہیوال)

تاریخ مقررہ سے ایک روز پہلے میرے پاس چودھری حاجی عبدالرحمٰن صاحب مسلم راجپوت اوڈ تشریف لائے اور تمام قصہ بیان کر کے درخواست کرنے لگے کہ آپ کے پاس جو فتویٰ مولانا محمد علی صاحب لکھوی ثم مدنی کا ہے' وہ ہمراہ لے کر میرے ساتھ منٹگمری (ساہیوال) چلیں۔

کمترین حاجی صاحب کی فرمائش پر منٹگمری (ساہیوال) پہنچا اور مولوی نور محمد صاحب سے بات چیت کی اور فیصلہ کا امر طے کر کے جناب محترم المقام مولانا عبدالجلیل صاحب خطیب جامع مسجد اہلحدیث منٹگمری دام اقبالہ کو ثالث تجویز کیا اور ان کو لے کر ہم مولوی نور محمد صاحب کے مکان پر پہنچے۔ مختصر بحث و تمحیص کے بعد حسب فرمان حضرت ثالث صاحب' میں نے نکاح .ٹہ کے متعلق مولانا محمد علی صاحب مدظلہ' شیخ الحدیث مسجد نبوی مقیم مدینہ منورہ کا عربی فتویٰ پیش کیا جس کو مولانا عبدالجلیل صاحب جج ثالث نے ملاحظہ فرما کر صحیح تسلیم کیا۔ پھر حضرت مولانا موصوف نے مولوی نور محمد صاحب سے فرمایا کہ آپ کے پاس بھی کوئی فتویٰ ہو تو پیش کریں۔

میں نے عرض کیا کہ اگر اس مسئلہ پر مولانا شیخ الحدیث کے دو فتوے متضاد ہوں گے تو بموجب اصول محدثین وفقہاء ان کا متاخر فتویٰ معتبر اور مقبول ہو گا اور اس سے متقدم منسوخ متصور ہو گا۔ مولوی نور محمد نے بوجہ کم علمی اس اصول بدیہی کے ماننے سے انکار کیا اور کمترین نے اس پر اصرار کیا تو حضرت مولانا ثالث نے اس اصول کو صحیح فرماتے ہوئے میری تائید کی۔ مولوی نور محمد اس پر بہت شرمسار ہوئے اور اپنا فتویٰ پیش کرنے میں حیلہ بہانہ کرتے رہے۔

بالآخر ثالث صاحب کے اصرار پر انہوں نے ایک بڑا قرطاس پیش کیا' جس کو وہ ہندوستانی عہد کا لکھا ہوا بتلاتے ہیں۔ اس پر مختلف علماء کے ناموں سے فتوے لکھے ہوئے تھے' لیکن وہ ایک ہی قلم اور ایک ہی قسم کی سیاہی کے معلوم ہوتے تھے اور وہ سب اردو زبان میں تھے۔ مولانا خطیب جامع اہلحدیث دام فیضہ نے اس فتویٰ اور میرے پیش کردہ عربی فتویٰ کو بغور ملاحظہ فرما کر جو فیصلہ بطور ثالث صادر فرمایا ہے وہ درج ذیل ہے :

نکاح .ٹہ کے متعلق ثالث کا فیصلہ: آج مورخہ ۱۷/ جون سنہ ۱۹۵۴ء کو ایک نزاع متعلقہ مسئلہ نکاح .ٹہ مروجہ جو مابین مولوی نور محمد صاحب قوم اوڈ منٹگمری وحاجی عبدالرحمٰن صاحب ولد حاجی چندہ قوم اوڈ سکنہ چک نمبر ۳۲۷ بوریوالا کے تھا۔ میرے رُوبرو پیش ہوا۔ فریقین کا متفقہ اقرار نامہ یہ تھا کہ مولانا مولوی محمد علی صاحب لکھوی حال مقیم مدینہ منورہ کا جو فتویٰ نکاح .ٹہ کے متعلق ہو گا وہ ہم مان لیں گے اور جو نہ مانے گا وہ جھوٹا متصور ہو گا۔ اس اقرار نامہ میں مولوی عبدالقادر صاحب حصاری کا نام بھی بغیر ان کے اقرار درج کیا گیا تھا۔ جب ان سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے بھی یہی اقرار نامہ لکھ دیا' لیکن ساتھ ہی یہ لکھا کہ اگر مولانا مولوی محمد علی صاحب کے اس مسئلہ مذکورہ پر دو فتوے ہوئے تو ان کا آخری فتویٰ تسلیم کیا جائے گا' کیونکہ متاخر متقدم کا ناسخ ہوتا ہے۔ چنانچہ فتوے میرے سامنے پیش ہوئے۔ پہلے مولوی عبدالقادر صاحب نے مولانا محمد علی صاحب کا ایک عربی فتویٰ پیش کیا جو ان کے رسالہ نکاح شغار میں بمعہ ترجمہ مطبوعہ تھا اور ساتھ ہی مولانا موصوف کا قلمی فتویٰ بھی دکھایا جو مدینہ منورہ سے ۲۵۔۱۱۔۱۳۷۰ ہجری کا لکھا ہوا تھا جس کا خلاصہ ترجمہ یہ ہے کہ :

نکاح .ٹہ بروئے صحیح حدیث کے ممنوع ہے' جس میں کسی کو شک اور انکار کی مجال نہیں ہے اور اس .ٹہ میں مہر کے ذکر کا کوئی اعتبار نہیں ہے' کیونکہ احکام شرعیہ کا مدار علت پر ہے جیسا کہ قاعدہ مقرر ہے۔ شغار (.ٹہ) کے عدم جواز کا مدار شرط معلوم پر ہے۔ جب شرط پائی گئی تو حکم ممانعت موجود ہو گا۔ ذکر مہر کا لغو ہے' کیونکہ حکم کی علت شرط کرنا موجود ہے۔ بعض فقہاء کی عبارتیں جواز شغار کا وہم ڈالتی ہیں جو حقیقت میں قلت فہم پر مبنی ہیں۔ ہاں مقصود وہ جواز ہے جو مہر مقرر کرنے اور شرط مفسد کے نہ ہونے پر مبنی ہے۔ اہل سنت اور اہل حق پر یہ خیال کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے حدیث نبی مصطفیٰ ﷺ کا خلاف کیا ہے' انتھی ملخصًا۔

اس فتوے پر مولانا محمد علی صاحب شیخ الحدیث مدینہ منورہ دام فیضہ کے قلمی دستخط ثبت تھے جو میں نے بغور دیکھے ہیں۔ اس کے خلاف ایک فتویٰ اردو زبان میں لکھا ہوا مولوی نور محمد صاحب اوڈ نے پیش کیا جو .ٹہ مروجہ کے جواز پر تھا۔ اس میں نفس مسئلہ کے علاوہ دیگر امور ومسائل جن میں کسی خاص ذات پر حملہ تھا' بھی درج تھے اور یہ فتویٰ ایک بہت بڑے قرطاس پر لکھا ہوا تھا جس پر بعض دیگر علماء اہلحدیث اور احناف کے نام سے بھی فتوے درج تھے' لیکن وہ سب ایک ہی سیاہی اور ایک ہی قلم کے ظاہر ہوتے تھے۔ مولوی محمد علی کے نام سے جو فتویٰ درج تھا' اس پر کوئی تاریخ نہ تھی۔

مولوی عبدالقادر صاحب حصاری نے کہا کہ یہ تحریر ان کی نہیں ہے۔ اگر مولوی نور محمد صاحب سچے ہیں تو مولانا کے صاحبزادگان مولوی محی الدین اور مولوی معین الدین صاحبان سکنہ اوکاڑہ سے ان کے فتویٰ اور خط کی تصدیق کرائی جائے۔

مولوی نور محمد نے اس بات سے انکار کر دیا۔

سو اول تو یہ فتویٰ اردو بابت جواز نکاح .ٹہ مخدوش ہے۔ اس بارہ میں تسلی بخش ثبوت نہیں ہے کہ یہ مولانا محمد علی صاحب کا ہے۔ دوم اگر مان لیا جائے کہ یہ ان کا ہی فتویٰ ہے تو یہ پہلے کا معلوم ہوتا ہے جبکہ مولانا ہند میں مقیم تھے۔ اس کے برخلاف جو فتویٰ نکاح .ٹہ کا مولوی عبدالقادر صاحب حصاری نے پیش کیا ہے' وہ تسلی بخش ہے' جو مدینہ منورہ سے لکھا ہوا ہے اور اس پر تاریخ ۲۵۔۱۲۔۱۳۷۰ھ درج ہے' جس کو دو سال سے زائد عرصہ گذر چکا ہے۔ یہ متاخر ہے' اس لیے فریقین کے مابین میں یہ فیصلہ دیتا ہوں کہ مولانا محمد علی صاحب شیخ الحدیث مدینہ منورہ مہاجر لکھوی دام فیضہ کا عربی فتویٰ جس سے نکاح .ٹہ کا حرام ہونا ثابت ہے' صحیح ہے اور حدیث نبوی کے مطابق ہے۔ فریقین کو اس پر پابند ہونا لازم ہے اور فریقین کو چاہیے کہ باہم مل کر اپنی قوم سے نکاح .ٹہ مروجہ کی رسم کو مٹائیں' کیونکہ یہ نکاح حرام ہے اور اس میں بہت مفاسد ہیں جو اہل علم اور تجربہ کار لوگوں پر مخفی نہیں ہیں۔ وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین○

(مولانا) عبدالجلیل (صاحب) بقلم خود

خطیب جامع اہلحدیث منٹگمری (ساہیوال)

۱۸۔۶۔۱۹۵۴ء

ثالث کے فیصلہ سے ایک فریق کا اِنکار: اس فیصلہ سے حاجی عبدالرحمٰن صاحب اپنے مسئلہ میں سچے ثابت ہوئے اور مولوی نور محمد صاحب جھوٹے ظاہر ہوئے۔ لیکن جب مولوی نور محمد صاحب پر ڈگری ہو گئی تو وہ فیصلہ حقہ صحیحہ کے تسلیم کرنے سے انکاری ہو گئے اور مخبوط الحواس ہو کر بہکی بہکی باتیں کرنے لگے اور حسب اپنے اقرار نامہ کے انہوں نے فیصلہ کو مان کر اپنے عقیدہ باطلہ اور قول فاسد سے رجوع نہ کیا۔ فقط والسلام

واٰخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ رب العالمین○

المشتھر : --- خادم الاسلام والمسلمین ابو الشکور (مولوی) عبدالقادر (صاحب) حصاری غفرلہ الباری' مقیم دارالاقامہ چک نمبر-۷۱' ۵-ایل منٹگمری۔

صحیفہ اہل حدیث کراچی مورخہ یکم و ۱۵/ صفر سنہ ۔۷۴ ۱۳ھ

احادیث شغار میں

روایت باللفظ اور روایت بالمعنیٰ کی بحث

ایک پمفلٹ "سبیل الرشاد فی تفریق التبادلۃ والشغار" کے نام سے مولوی فضل حق صاحب کلرک محکمہ بہبودی حیوانات میانوالی نے شائع کیا ہے جس کا مستقل جواب تو علیحدہ مکتوب ہے' یہاں یہ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ مؤلف نے احادیث شغار میں روایت باللفظ اور روایت بالمعنیٰ کی بے جا بحث چھیڑ دی ہے جو دُور از کار ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

"چونکہ صحیحین کی حدیث متعلقہ شغار باللفظ سے ہے اور ابوداوٗد شریف کی نہیں' لہٰذا ان میں فرق مراتب کا ویسے بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔"

صحیحین کی جس حدیث کو مؤلف روایت باللفظ قرار دیتے ہیں' وہ یہ ہے : عن نافع عن ابن عمر قال نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن الشغار۔

مرفوع روایت صرف ان لفظوں تک ہے' باقی اس سے آگے جو عبارت والشغار سے

لے کر لیس بینھما صداق تک ہے' یہ قول نافع راوی کا ہے۔ چنانچہ ان کے رسالہ کے ص۔۲۰ میں مولانا فاضل گوندلوی مدظلہ العالی کے الفاظ "اگرچہ راوی کا قول ہے" اور مولانا شرف الدین صاحب دام فیضہ کی اس صراحت سے کہ "شیخین متفق ہیں کہ شغار کی تفسیر کلام نافع سے ہے۔" (ص۔۴۹) ثابت ہے۔

جس تفسیری کلام پر مؤلف کے مذہب کا دارومدار ہے وہ تو حدیث نبوی نہیں ہے بلکہ قول راوی ہے۔ قول راوی کو روایت باللفظ قرار دے کر حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ پر ترجیح دینا تو علم ودانش کے علاوہ دیانت کے بھی خلاف ہے' کیونکہ آنجناب نے روایت باللفظ کے اثبات میں ص۔۱۱ پر حدیث نضر اللہ عبدا سمع مقالتی پیش کی ہے جس سے الفاظ نبوی بعینہ روایت کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ قول راوی کا نہیں۔ اس دعویٰ اور دلیل میں تقریب تام نہیں ہے۔

عقل سے جب گتھیاں ہستی کی سلجھاتا ہوں میں
اپنے ہی دامن کے تاروں میں الجھ جاتا ہوں میں

حدیث ابوداؤد سے مراد آپ کی حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ ہے' جس کے آخری الفاظ جو مرفوع کا حکم رکھتے ہیں' یہ ہیں : قال فی کتابہ ھذا الشغار الذی نھی عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ صحیحین کی روایت میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں۔ چنانچہ لفظ "قال" اس پر دال ہے اور ابوداؤد کی روایت میں امیرالمومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں۔ اس پر بھی وہی لفظ "قال" دلالت کر رہا ہے۔ دونوں احادیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہیں' اس لحاظ سے مرفوع ہیں۔ دونوں کا حاصل معنی یہ ہے کہ شغار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

اب بتایا جائے کہ ان روایتوں میں کون سی روایت بالفاظ نبوی ہے اور کون سی نہیں ہے؟

مؤلف نے لکھا ہے کہ "بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے روایت کے وہی الفاظ بیان کیے جائیں جو پڑھتے وقت شیخ سے سنے ہوں' صرف مفہوم ادا کر دینے پر اکتفا بہتر نہیں۔ (ص۔۱۰)"

اس عبارت میں الفاظ سے مراد کس کے الفاظ ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یا صحابہ کرام کے؟ اگر حضور علیہ السلام کے الفاظ مراد ہیں تو وہ دونوں میں نہیں۔ دونوں صحابی یہ بتاتے ہیں کہ شغار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا لیکن کن لفظوں کے ساتھ منع فرمایا تھا؟ وہ یہاں مذکور

نہیں۔ وہ "لا شغار فی الاسلام" الفاظ تھے' یا "لا تشاغروا" تھے' یا اسی قسم کے تھے؟ خبر نہیں۔

ہاں ان لفظوں سے شغار کا ممنوع ہونا ثابت ہو گیا' کیونکہ نہی کی نسبت حضور ﷺ کی طرف ہے لیکن یہ لفظ رسول اللہ ﷺ نے نہیں فرمائے کہ "نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الشغار" کیونکہ اول تو اس طرح کلام غیر موزوں ہے۔ دوم اس سے پہلے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہونے چاہییے تھے۔

اگر شیخ سے مراد صحابی ہے اور الفاظ سے مراد صحابی کے الفاظ ہیں تو پھر حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ بھی روایت باللفظ ہے کیونکہ عبدالرحمٰن بن ہرمز اعرج تابعی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ قال فی کتابہ اس پر دال ہے۔ جس طرح نافع تابعی نے نقل کئے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الشغار' صورت ایک ہی ہے۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ نافع کی تفسیر کے الفاظ روایت باللفظ ہیں کہ راویوں نے نافع سے اس طرح نقل کیا ہے تو یہ ہم بھی کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے جس طرح بیان کیا اس طرح راویوں نے نقل کیا۔ ما هو جوابكم فهو جوابنا۔

اگر یہ مطلب ہے کہ شغار کی تفسیر نافع والی ابن عمر رضی اللہ عنہ سے باللفظ ہے تو یہ غلط ہے۔ اس کا ثبوت نہیں ہے اور ایسا کہنے والا شیخین کا مخالف ہے اور رسالہ میں شیخین کی مخالفت اجماع کی مخالفت قرار دی گئی ہے۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ تفسیر نافع لفظوں کے ساتھ حدیث میں ہے اور حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ میں لفظوں میں نہیں ہے بلکہ ایک واقعہ ہے جس کو اپنے لفظوں میں عبدالرحمٰن اعرج نے ذکر کیا ہے جو بالمعنیٰ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ :

روایت باللفظ کی ضرورت صرف حضور علیہ السلام کے کلمات اور احادیث قولیہ تک محدود ہے۔ حضور ﷺ کے افعال' واقعات' احوال اور صحابہ کرام' تابعین عظام کے واقعات اور افعال میں روایت باللفظ نہیں ہوا کرتی' خواہ وہ افعال' واقعات صحیحین کی روایتوں میں ہوں یا دیگر روایات کتب حدیث میں' کیونکہ حضور ﷺ یا خلفاء وغیرہم کے واقعہ اور حال اور افعال کو ہمیشہ راوی صحابی ہو یا تابعی اپنے لفظوں سے ذکر کرے گا۔ یہ بدیہی بات ہے کہ اقوال تو نقل ہو سکتے ہیں' افعال اور واقعات کوئی لفظ نہیں کہ ان کو یاد کیا جائے۔ دس شخص اگر کسی واقعہ یا عمل کو بیان کریں گے تو ان سب کے الفاظ مختلف ہوں گے' واقعہ ایک ہی ہو گا۔

پس حکایت میں روایت باللفظ کا خیال غلط ہے۔

باقی رہا تفسیر کے مفہوم کا سوال' تو جیسے نافع نے اپنی طرف سے ایک محاورہ سمجھ کر بیان کر دیا اور اس کو راویوں نے نقل کر دیا ہے' اسی طرح جو واقعہ "شغار بالمہر" کا عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں ہوا' اس کی طرف اشارہ کر کے یہ کہہ دیا کہ یہ بھی وہی شغار ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ اس کو بھی راویوں نے نقل کر دیا ہے بلکہ یہ زیادہ معتبر ہوا' کیونکہ ایک بیان کرنے والا صحابی ہے اور دوم اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جس کو مرفوع کا درجہ حاصل ہے۔ نافع نے نہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف تفسیر کو منسوب کیا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف' تو یہ قول تابعی ہوا جو صحابی کا معارض نہیں ہو سکتا۔

<u>روایت باللفظ پر فیصلہ</u>: مؤلف نے ص۔۱۲ میں ایک عنوان "روایت باللفظ پر فیصلہ نبوی" لکھا ہے۔ پھر اس کے ثبوت میں یہ روایت پیش کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت براء صحابی رضی اللہ عنہ کو یہ دعا سکھلائی : اللّٰھم اٰمنت بکتابک الذی انزلت ونبیک الذی ارسلت۔ صحابی نے بجائے نبیک کے رسولک پڑھا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' ونبیک پڑھو۔

اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ روایت بالمعنی غیر معتبر ہے۔ یہ استدلال سراسر غلط اور احادیث نبویہ میں خواہ مخواہ کی وسوسہ اندازی کا سامان ہے۔ مؤلف اصول حدیث سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ اذکار اور ادعیہ میں روایت باللفظ اس لیے ضروری ہے کہ یہ توقیفیہ ہیں کہ ان کو دوسرے لفظوں سے بدلنا کسی صورت بھی جائز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم احادیث کے معانی اور مطالب کو اپنے لفظوں سے ذکر کر سکتے ہیں۔ اذان' اقامت' تشہد' ادعیہ ماثورہ کو ان کے معانی سے نہیں پڑھ سکتے ہیں۔ الفاظ ماثورہ ہی سے پڑھیں گے۔

نیل الاوطار جلد۔۱' ص۔۲۱۴ میں ہے کہ :لان الفاظ الاذکار توقیفیة فی تعیین اللفظ وتقدیر الثواب فربما کان فی اللفظ سر لیس فی الاخر ولو کان یرادفه فی الظاهر یعنی "اذکار توقیفیہ ہیں' ان کو انہی الفاظ میں مقرر رکھا جائے گا اور ثواب بھی انہی لفظوں پر مقدر ہے۔ بسا اوقات ان لفظوں میں ایسا راز ہوتا ہے جو دوسرے لفظوں میں جو ان کے مترادف ہوں' نہیں ہوتا۔"

صحابہ کرام نے حضور ﷺ کی مراد سمجھ کر اس کو اپنے الفاظ میں بیان کیا' جو مستند اور تمام علماء اہل حق کے نزدیک معتبر اور مقبول ہے لیکن ادعیہ اذکار کی مراد اپنے لفظوں سے بیان کر کے نہیں پڑھ سکتا اور نہ کسی نے پڑھا ہے یعنی قرون ثلاثہ میں۔

پھر اس دلیل سے استدلال اس لیے بھی غلط ہے کہ لفظ رسول لفظ نبی کا ہم معنی نہیں ہے۔ کما هو الظاهر۔ لفظ رسول تو ارسلت سے مفہوم ہے۔ اس لیے رسولک کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ لفظ نبیک کہنے سے دو صفتوں کی یہ دعا جامع ہو گئی' اس لیے ابدال ناجائز ہوا۔

نیل الاوطار میں ہے: ليس فيه حجة على منع ذالک لان لفظ الرسول ليس بمعنى لفظ النبي ولا خلاف في المنع اذا اختلف المعنى فكانه اراد ان يجمع الوصفين صريحا الخ۔ یعنی "روایت بالمعنی کو منع کرنے والوں کے لیے اس حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے' کیونکہ لفظ رسول' نبی کے معنی میں نہیں آتا۔ جب معنی ایک نہ ہوا تو اس کا بدلنا ناجائز ہوا۔"

اور محدثین کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب دو لفظ مترادف اور ہم معنی نہ ہوں تو ان میں روایت بالمعنی کی غرض سے ابدال جائز نہیں ہے۔ اس دعا میں مراد نبی اکرم ﷺ کی یہ تھی کہ یہ دعا دو وصفوں کی جامع رہے' صریح طور پر اور وہ رسالت اور نبوت ہیں' فتذکر۔

روایت بالمعنی وہی مقبول اور معتبر ہے جس کا راوی الفاظ کے مدلول کو معانی اور مفہوم کو خوب جانتا ہو اور یہ بھی خوب سمجھتا ہو کہ اگر اس لفظ کے بجائے دوسرا لفظ رکھ دیا گیا تو مفہوم میں کتنا تغیر پیدا ہو جائے گا اور جو راوی ان باتوں کو نہ سمجھتا ہو' اس کی روایت بالمعنی مقبول نہیں ہے۔

مقدمہ مسلم للامام نووی میں ہے: وقال جمهور السلف والخلف من الطوائف المذكورة يجوز في الجميع اذا جزم بانه ادى المعنى وهذا هو الصواب الذي تقتضيه احوال الصحابة فمن بعدهم رضي الله عنهم في رواياتهم القضية الواحدة بالفاظ مختلفة (ص۔۱۹) یعنی "جمہور سلف وخلف نے کہا ہے کہ راوی معنی کو ٹھیک ادا کر سکے تو یہ روایت درست ہے۔ صحابہ اور تابعین کی روایتیں ایک ہی واقعہ میں مختلف الفاظ سے وارد

ہونا اس جواز پر دال ہیں۔"

حضرت ابن عمر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں صحابی مجتہد ہیں اور اہل لسان ہیں۔ انہوں نے جو کچھ اوامر ونواہی شارع علیہ السلام سے سمجھا اور ان کو اپنے لفظوں سے بیان کیا' وہ عین حق اور صواب ہے۔ پس کسی روایت کو بالمعنی کہہ کر ٹھکرا دینا عالم بالحدیث کی شان نہیں ہے۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر عمل کرنا چاہیے۔

علامہ طحاوی شرح معانی الآثار جلد-۲' ص-۴۸ میں فرماتے ہیں : ان اولی الاشیاء بنا اذا جاء ت الاثار ھٰکذا فوجدنا السبیل الی ان نحملھا علی غیر طریق التضاد ان نحملھا علی ذالک ولا نحملھا علی التضاد التکاذب۔ یعنی "تمام باتوں سے بہترین طریق یہ ہے کہ جب احادیث بہ ظاہر متعارض وارد ہوں تو ہمیں ایسا طریق اختیار کرنا چاہیے جس میں کوئی تضاد نہ ہو اور ایسا طریق اختیار نہ کریں کہ احادیث کو باہم لڑا کر ایک دوسری کی تکذیب پیدا کریں۔" یہ ناجائز ہے' یہی اصول تمام محدثین کا ہے۔

پس مسئلہ نکاح بٹہ میں ہمارا طریق یہ ہے کہ تبادلہ نکاح بالنکاح مطلقاً حرام ہے۔ بلا مہر ہو' جیسے نافع تابعی نے ذکر کیا' یا بامہر ہو جیسے حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ میں ذکر ہوا' دونوں ممنوع ہیں۔

لیکن مؤلف اور اس کے مفتی حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر نصوص کی ایسی توجیہات کرتے ہیں کہ اس سے حدیث میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں شدید خطرہ ہے کہ لوگ اس مذموم رسم پر پختہ ہو جائیں گے۔

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری

الاعتصام لاہور جلد-۱۰' شمارہ-۴۸' مورخہ ۲۶/ جون سنہ-۱۹۵۹ء

نکاح شغار (بٹہ کی شادی) حرام ہے

سوال : ایک شخص کے والدین اس کی شادی نکاح بٹہ پر کرنا چاہتے ہیں' وہ نیا نیا اہلحدیث ہوا ہے' اس نے سنا ہے کہ بٹے پر نکاح کرنا جائز نہیں' اس لیے اس کی خواہش ہے کہ اسے ٹھوس دلائل کے ساتھ بتایا جائے۔ اگر جواز ہے تو اپنے والدین کو ناراض نہ کرے اور اگر ناجائز اور حرام ہے تو قرآن وحدیث کی روشنی میں تحریر فرمایا جائے تاکہ وہ والدین کو سمجھا سکے' بینوا توجروا۔

(نصیر اللہ خاں عابد کوئٹہ چھاؤنی)

جواب : واضح ہو کہ نکاح بٹہ کو عربی لغت میں شغار کہتے ہیں۔ یہ نکاح اسلام سے پہلے زمانہ کفر میں دیگر رسومات قبیحہ وعادات شنیعہ کی طرح مروج تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اور ملک عرب کی اصلاح فرمائی اور رسوم جاہلیت کو مٹایا تو جاہلیت کے حرام نکاح بھی مٹا دیئے' صرف ایک نکاح باقی رکھا جو عہد نبوی سے لے کر آج تک ممالک اسلامیہ میں رائج چلا آرہا ہے۔

چنانچہ جامع صحیح بخاری جلد۔۲' ص۔۷۶۹ باب من قال لا نکاح الا بولی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے جس کے آخر میں ہے : فلما بعث محمد صلی اللہ علیہ وسلم بالحق هدم نکاح الجاهلیة کله الانکاح الناس الیوم یعنی "جب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو آنجناب نے جاہلیت کے تمام نکاح مٹا دیئے' صرف ایک نکاح باقی رکھا جو آج تک مسلمانوں میں مروج ہے۔"

پھر اس کی کیفیت بیان فرمائی : نکاح الناس الیوم یخطب الرجل الی الرجل ولیه او ابنته فیصدقها ثم ینکحها یعنی "شرعی نکاح جو آج مسلمانوں میں عام مروج ہے' وہ یوں ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اس کی بیٹی یا اس کی کسی رشتہ دار عورت کی بابت پیغام نکاح کا دے اور وہ منظور کر کے مہر ملی کے ساتھ ایجاب قبول سے نکاح کر دے۔" بس یہ شرعی نکاح ہے۔ اس نکاح میں نہ عورت کا کسی عورت سے تبادلہ اور بٹہ ہے اور نہ اور کسی قسم کا نکاح ہے۔ یہ بالاتفاق جائز اور حلال ہے۔

اب جو ادلا بدلی کا نکاح ہے' جس کو بٹہ اور تبادلہ کا نکاح کہتے ہیں' یہ قطعاً حرام ہے۔ صحیح مسلم جلد۔۱' ص۔۴۵۴ میں حدیث ہے : عن ابی هریرة قال نهی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عن الشغار والشغار ان یقول الرجل للرجل زوجنی ابنتک وازوجک ابنتی وزوجنی اختک وازوجک اختی یعنی "ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے باہم نکاح بٹہ کرنے سے منع کر دیا اور روک دیا اور اس کو شغار کہتے ہیں کہ ایک شخص دوسرے سے یہ کہتا ہے کہ تو اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کر دے' میں اپنی بیٹی کا نکاح تجھ سے کر دوں گا یا یوں کہے کہ تو اپنی بہن میرے نکاح میں دے دے' میں تجھ سے اپنی بہن کا نکاح کر دوں گا۔" اس نکاح تبادلہ کو پنجاب میں نکاح بٹہ کہتے ہیں۔ اس سے

جناب رسول اللہ ﷺ نے منع فرما دیا۔

دوسری حدیث صحیح مسلم کے اسی صفحہ پر ہے: عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا شغار فی الاسلام۔ یعنی "ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام میں نکاح بٹہ درست نہیں ہے۔" یعنی زمانہ کفر کی رسم ہے، اسلام میں اس کا وجود نہیں ہے۔ اسی طرح حدیث کی کتابوں میں اور بھی احادیث ہیں لیکن مومن کے لیے ایک فرمان رسول ہی کافی ہے۔

مسلم شریف میں ان احادیث پر یوں باب منعقد کیا گیا ہے: "باب تحریم الشغار وبطلانہ" یعنی "یہ باب نکاح تبادلہ کے حرام ہونے اور باطل ہونے کے بیان میں ہے۔" پھر ان مذکورہ احادیث سے اس نکاح کا حرام اور باطل ہونا ثابت کیا ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ نے یہ نکاح حرام اور منع کر دیا تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسا نکاح نہ کیا۔ عہد نبوی اور عہد صدیقی اور عہد فاروقی اور عہد عثمانی اور عہد علوی خلافت کے زمانے گزر گئے، کسی مسلمان نے یہ نکاح نہ کیا۔ جب امارت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو بنو ہاشم اور بنو امیہ کے دو بڑے شخصوں نے لڑکی کے بدلہ لڑکی کی شرط کے علاوہ مہر مالی مقرر کر کے دونوں کا نکاح کر دیا۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ زمانہ جاہلیت میں بغیر مالی مہر کے عورت کا عورت سے تبادلہ کرتے تھے۔ ہم مالی مہر مقرر کر دیتے ہیں پھر یہ جائز ہو جائے گا۔ جب ملک شام میں امیر الوقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع دی گئی تو انہوں نے اپنے ماتحت گورنر مروان کے نام حکم نامہ لکھا کہ اس نکاح میں فوراً تفریق کرا دو۔ یہ نکاح ممنوع ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرما دیا تھا۔ بس اس حکم کی تعمیل کی گئی اور بغیر طلاق کے دونوں نکاحوں میں تفریق کرا دی گئی۔

چنانچہ سنن ابی داؤد، جلد-۱، ص-۲۸۳ باب فی الشغار میں یہ واقعہ درج ہے: عن عبدالرحمٰن بن هرمز الاعرج ان العباس بن عبداللہ بن عباس انکح عبدالرحمٰن بن الحکم ابنته وکانا قد جعلا صداقا فکتب معاویة بن ابی سفیان الی مروان یامره بالتفریق بینهما وقال فی کتابه هذا الشغار الذی نهی عنه رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی "عبدالرحمٰن بن ہرمز اعرج نے بیان کیا کہ عباس بن عبداللہ بن عباس نے اپنی لڑکی کا نکاح عبدالرحمٰن بن حکم سے کر دیا اور عبدالرحمٰن نے اپنی لڑکی کا نکاح عباس کو دے

دیا اور دونوں نے درمیان میں مہر مقرر کر دیا۔ پس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان بن حکم کو حکم لکھا کہ ان دونوں نکاحوں میں تفریق کی جائے اور یہ لکھا کہ یہ وہی نکاح شغار ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس نکاح تبادلہ میں ہر دو فریق مالی مہر مقرر کر لیں تب بھی وہی شغار ہو گا جو حرام ہے۔ کیونکہ وٹہ دراصل دونوں طرف سے لڑکی کے بدلے لڑکی کے نکاح کرنے کو کہا جاتا ہے۔ ایسے نکاح میں مہر ہو یا نہ ہو' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر مالی مہر کا اس میں اعتبار ہوتا تو نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کو شغار کہتے اور نہ عرف عام میں اس کو وٹہ کا نکاح کہا جاتا۔ نکاح وٹہ لڑکی کے بدلہ لڑکی لینے دینے کا نام ہے۔ پس شغار یعنی نکاح وٹہ دو قسم کا ہوا۔ ایک یہ کہ درمیان میں مہر مقرر نہ کرنا۔ یہ حضرت نافع تابعی رحمہ اللہ سے منقول ہے اور دوسرا یہ کہ درمیان میں مہر مقرر کر دینا' جس کی صراحت حضرت معاویہ صحابی رضی اللہ عنہ نے کر دی۔ پس دونوں قسم کا وٹہ حرام ہے' کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کر دیا کہ نکاح صرف ایک ہی قسم کا ہے جو شرع میں جائز رکھا گیا ہے۔ اس میں لڑکی کے بدلہ لڑکی دینے کا ذکر نہیں ہے' جس نکاح میں کوئی بات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیان کردہ نکاح میں بڑھائی گئی' وہ نکاح حرام ہو گیا۔ پس نکاح متعہ اور نکاح حلالہ وغیرہ سب حرام ہیں۔ شیعوں میں نکاح متعہ کا رواج ہے' جو سراسر زناکاری ہے اور حنفیوں میں نکاح وٹہ اور نکاح حلالہ کا رواج ہے جو سراسر حرام اور ناجائز ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ وٹہ حرام ہے۔ یہودیوں کی طرح حیلے بہانے بنا کر بعض مولویوں نے اس کو رواج دے رکھا ہے۔ کمترین نے اس بارہ میں رسالہ شغار لکھا ہے جس میں اس مسئلے کی خوب تفصیل کر دی ہے۔ رسالہ آج کل نایاب ہے' کوئی صاحب خیر اس کو چھپوا دے تو یقیناً ایک دینی خدمت ہو گی۔

عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام لاہور جلد ۳۰' شمارہ ۱۷' ۱۸' مورخہ ۲۴/ نومبر و یکم دسمبر سنہ ۱۹۷۸ء

نکاح شغار جائز ہے یا نہیں؟

سوال : ایک آدمی کی شادی دو طرفی رشتہ کی شادی (یعنی وٹہ کی شادی ہے) اور تین

سال عرصہ گذر چکا ہے۔ ان دونوں میں سے ایک آدمی نہ ہی اپنی بیوی کو گھر لا کر بساتا ہے اور نہ ہی طلاق دیتا ہے اور ان رشتہ داروں کو کہتا ہے کہ ہماری بہن کو لے جاؤ اور اپنا گھر بساؤ اور اپنی بیوی کو نہ طلاق دیتا ہے' نہ بساتا ہے اور گھر والے اور اس کی بیوی بہت مجبور ہیں اور اس مسئلے کا جواب تحریر فرمائیں کہ کیا کیا جا سکتا ہے اور کیا ہونا چاہیے اور عورت فیصلہ کرانا چاہتی ہے' ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب : یہ نکاح بٹہ ہے' اس کو عربی میں شغار کہتے ہیں۔ یہ شادی جاہلیت کی ہے جو حرام ہے۔ حدیث میں ہے : لا شغار فی الاسلام کہ اسلام میں نکاح بٹہ کا وجود نہیں ہے' یہ نکاح جاہلیت کا ہے۔ دونوں طرف کے نکاح فسخ ہیں' اپنی اپنی لڑکی کو دوسری جگہ بغیر بٹہ کے بیاہ دیں' یہ نکاح جائز ہو گا۔ هذا ما عندی واللّٰه اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری۔

الجواب صحیح ابو محمد عبدالستار دہلوی

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص-۱۵۸

کیا نکاح شغار فسخ ہو سکتا ہے؟

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں بینوا توجروا' زید نے ایک عورت سے بٹہ پر نکاح کیا۔ ایک سال کے بعد خاوند اور بیوی کو آپس میں ناچاقی ہو گئی جس کی وجہ سے عورت اپنے والدین کے گھر چلی گئی۔ تقریباً تین سال کے عرصہ کے بعد ناچاقی کے دوران میں' زید کا کسی دیگر عورت سے ناجائز تعلق ہو گیا' اسی عورت کو اغوا کر کے لے گیا۔ اب وہ اغوا شدہ عورت کو بخوشی بسا رہا ہے' تقریباً دو سال ہو گئے ہیں۔

اب زید کی پہلی بیوی کو اپنے والدین کے گھر اُجڑی بیٹھے ہوئے پانچ سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ زید نہ اس کو بساتا ہے اور نہ ہی اس کو خرچ دیتا ہے اور نہ ہی طلاق دیتا ہے۔ اب اس عورت کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے' کیا بغیر طلاق دیگر نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟

(العبد : تحریر کنندہ مختار احمد عفی عنہ ساکن مونی میاں عبدالحق صاحب

گواہ شد : حاکم علی ولد مستقیم چک شیر محمد (نشان انگوٹھا)

گواہ شد : کمال دین ولد عاشق سکنہ چک شیر محمد (نشان انگوٹھا)

منجانب مختار احمد عفی عنہ

جواب سے جلدی نوازیں' بڑی مہربانی ہو گی۔

جواب : نکاح بٹہ حرام ہے۔ حدیث میں ہے کہ لا شغار فی الاسلام یعنی "اسلام میں نکاح تبادلہ نہیں ہے۔" حضرت امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ سے نکاح بٹہ جو مدینہ میں ہوا تھا' اس میں بلا طلاق تفریق کرا دی تھی' ملاحظہ ہو ابوداؤد۔

اس عورت کا نکاح دوسری جگہ جائز ہے مگر موجودہ حکومت کے قانون کی گرفت سے بچنا چاہیے۔ کسی وکیل سے مشورہ کر کے نکاح بذریعہ عدالت فسخ کرائیں۔ خاوند بدکار اور ظالم ہو اور وہ عورت کو آباد نہ کرے تو اس کو فسخ نکاح کا اختیار ہے۔ عورت چار پانچ سال کے خرچہ کا مطالبہ قانوناً کر سکتی ہے۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری

الجواب صحیح ابو محمد عبدالستار دہلوی

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم' ص۔۱۴۴

جمعیتہ میانوالی کے رسالہ "شغار" پر تبصرہ

مسئلہ شغار جس کو عام طور پر نکاح بٹہ وتبادلہ کہا جاتا ہے' علمائے اہلحدیث میں معرکتہ الآراء رہا ہے۔ متحدہ ہندوستان کے زمانہ سے اس پر فتویٰ نویسی اور بحث ہوتی چلی آرہی ہے۔ حضرت العلام الفاضل المحدث ومجتہد العصر رئیس المحققین مولانا حافظ عبداللہ صاحب روپڑی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک جامع رسالہ لکھ کر اسلامی دنیا پر احسان فرمایا۔ جس سے شغار کی تمام شاخوں پر محققانہ بحث فرما کر مجوزین شغار کے تمام مقالات فاسدہ کا قلع قمع کرتے ہوئے نزاع کا فیصلہ کر دیا کہ "شغار کی تمام قسمیں اور صورتیں حرام ہیں۔"

وہ رسالہ تقسیم ملک کے بعد نایاب ہو گیا تو بندہ نے ایک مختصر رسالہ بنام "فیصلہ سید الابرار در حرمت نکاح شغار" شائع کیا' جس کو حضرت مفتی عرب وعجم مجتہد العصر محدث روپڑی رحمہ اللہ نے ملاحظہ فرما کر اس کی تصدیق وتائید کی اور فرمایا کہ اس رسالہ میں گویا' کوزہ میں دریا بند کر دیا ہے۔

علاوہ ان کے دیگر علمائے اہلحدیث نے بھی اس رسالہ کی تصدیق وتائید فرمائی' جن کی

تقریظات رسالہ شغار حصہ دوم میں درج ہیں۔ الحمد للہ! ان رسالوں کی اشاعت و تبلیغ حقہ کا یہ اثر ہوا کہ یہ بد رسم بعض قوموں میں متروک ہوئی اور بعض نے .ٹہ کے نکاح فسخ کئے اور بعض نے توبہ کی کہ ہم آئندہ .ٹہ ہرگز نہ کریں گے اور گروہ مجوزین کے مفتیان دین جو .ٹہ مروجہ کے جائز ہونے کے فتوے دے چکے تھے' اپنے غلط فتووں سے رجوع کر کے نکاح تبادلہ کے حرام ہونے کے قائل ہو گئے اور دوبارہ انہوں نے نکاح .ٹہ کے حرام ہونے کے فتوے صادر کئے۔

یہ حق کا اثر اور عین فتح ہوئی : جآء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا○ "حق ظاہر ہوا اور باطل کافور کی طرح اُڑ گیا۔"

لیکن قوم قریش کا ایک خاندان جو میانوالی میں آباد ہے' ان کی جمعیتہ میں راقم الحروف کے رسالہ حرمت شغار نے ہل چل مچا دی کہ وہ اس رسم کے مجوز اور عادی تھے اور اس مسئلہ کی حقیقت سے ناواقف اور قوم قریش کے دو خاندانوں بنو ہاشم اور بنو امیہ میں جو نکاح .ٹہ ہو کر بحکم حضرت امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ قائد حجاز وشام وعراق وغیرہ تفریق بلا طلاق کی گئی تھی' ناآشنا تھے۔ میرا رسالہ پڑھ کر مبہوت ہو گئے۔ لیکن وہ کتاب وسنت کے علم میں ماہر نہ تھے' اس لیے انہوں نے مولوی عبدالرحمٰن اوڈ ساکن بہاولنگر کی پناہ لی جو پہلے اس مسئلہ میں ہم سے مقابلہ کر کے شکست کھا چکے تھے کہ ان کے مفتیان ان کا ساتھ چھوڑ کر ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔

لیکن انہوں نے جمعیتہ میانوالی کو تسلی دی اور واقعہ شہر سنام کا ایک غلط اشتہار مطبوعہ خود ان کو دے دیا جس کو انہوں نے مائدہ آسمانی تصور کر کے تناول کرنا شروع کیا اور اس میں جن علماء کے اسماء گرامی دیکھے اور مسمیان سے جو زندہ تھے' ان کو درخواستیں دے کر چند فتوے حاصل کئے اور بعض مضامین اخبار الاعتصام اور صحیفہ سے نقل کئے۔ جن کے مجموعہ مضامین پر کچھ ملمع سازی کر کے ایک رسالہ لکھ مارا۔ جس کا نام مقلدین کے ایک رسالہ "سبیل الرشاد" سے مستعار لیا۔ کیونکہ مسلک میں ان کے قریب اور مشابہ اور تعامل .ٹہ میں ان سے متفق ہیں۔ اس لیے انہوں نے رسالہ کا نام "سبیل الرشاد فی تفریق التبادلہ والشغار" رکھا اور اس رسالہ کے اندر بھی اپنے مضمون کا خلاصہ یہ لکھا کہ "سبیل الرشاد یا صراط مستقیم یہی ہے کہ اس نکاح کو جائز ہی کہا جائے۔ (ص۔۲۶)

پھر جب سب مفتیان، شغار سے نکاح بٹہ مروجہ کا ثبوت نہ ہو سکا تو ص-۱۱ کے حاشیہ پر ایک عجیب دلیل لکھ ماری۔ چنانچہ لکھا ہے : "اور حضرت آدم علیہ السلام نے بھی ہابیل قابیل کے نکاح میں باوجود نکاح شرعی بحکم الٰہی تبادلہ بنات ہی بصورت مروجہ کیا تھا اور تبادلہ بنات سنت حضرت آدم ہے۔"

یہ عجیب وغریب حاشیہ کتاب کی جس عبارت پر دیا گیا ہے' وہ بھی ذیل میں ملاحظہ فرمایئے : "دراصل صداق کا معنی بضع با بضع بانفس ہے۔"

اب اس عبارت کے ساتھ حاشیہ ملایئے تو مطلب یہ ہوا کہ "تبادلہ بنات سنت حضرت آدم علیہ السلام بضع با بضع تھا۔" یہ عین شغار جاہلیت ہے جس کو بٹہ کے مجوزین بھی حرام کہتے ہیں۔ تو یہ سنت آدم علیہ السلام کسی کے نزدیک بھی نہیں ہے۔ ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لا شغار فی الاسلام نہ فرماتے۔ کیونکہ اسلام حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا ہے مگر میانوالی جمعیت اس کو سنت آدم علیہ السلام تصور کر رہی ہے ۔

نئے گل کھلیں گے تری انجمن میں
اگر رنگ باران محفل یہی ہے

سنت آدم علیہ السلام پر <u>تفصیلی تبصرہ -- ایک سو روپیہ انعام :</u> راقم الحروف عارف حصاری نے اپنے رسالہ حرمت شغار کے آخر میں یہ انعامی چیلنج دیا تھا کہ جو شخص کسی صریح صحیح مرفوع حدیث سے بٹہ مروجہ کا ثبوت دے کر اس کا عہد نبوی یا عہد صحابہ کرام میں ہونا اور اس کا جائز رکھا جانا بسند صحیح و بعبارت صریح ثابت کر دے تو اس کو مبلغ یک صد روپیہ انعام دیا جائے گا۔

اس پر جمعیت میانوالی نے پاک وہند کے تمام علماء سے جو مجوزن نکاح تبادلہ تھے' استداد کی کہ کہیں سے اس چیلنج کے مطابق ثبوت اور کوئی واقعہ نکاح بٹہ کا مل جائے' تو انعام حاصل کریں لیکن کہیں سے ثبوت نہ مل سکا تو آخر جنگلی قوم کے ایک مولوی مسمی عبدالرحمٰن اوڈ نے ایک دلیل تراشی ہوئی تلاش کر کے دی' جس کو جمعیت میانوالی نے اپنے رسالہ "سبیل الرشاد" میں پیش کر دی جو اوپر درج ہو چکی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نکاح بٹہ کیا کرتے تھے' جیسا ہابیل قابیل کا نکاح بٹہ ہوا' یہ سنت آدم ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ استدلال کئی وجہ سے باطل ہے : اول یہ کہ ہابیل قابیل کی مناکحت

وقوع میں نہیں آئی تھی کہ باہمی فساد ہو گیا تھا۔ اس قصہ میں یہ لکھا ہے : کانت اخت هابیل ذمیمة واخت قابیل جمیلة یعنی "ہابیل کی بہن بدصورت تھی اور قابیل کی بہن خوبصورت تھی۔" قابیل نے اس مناکحت سے انکار کر دیا تھا پھر قربانی کا حکم ہوا' دونوں نے قربانی کی تو قابیل کی قربانی نامنظور ہوئی۔ آخر قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔ جب مناکحت نہ ہوئی بلکہ موجب فساد ہوئی تو استدلال باطل ہوا۔

دوم یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کے عہد میں حرام وحلال وغیرہ احکام کی شریعت ہی مقرر نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ حاشیہ جامع البیان میں فتح الباری سے منقول ہے کہ "نہ اس وقت فرائض تھے اور نہ محارم۔ صرف توحید اور چند امور ضروریہ تھے جو معاش کے متعلق تھے۔ جب حضرت نوح علیہ السلام مبعوث ہوئے تو شریعت مقرر ہوئی یعنی تحریم امہات وبنات واخوات کا سلسلہ اور احکام واجبات اور آداب کی شریعت مقرر ہو گئی۔ پس یہ استدلال اوڈا شاہی' بریلوی قسم کا ہے کہ وہ سجدہ تعظیمی کا ثبوت سنت آدم علیہ السلام سے لاتے ہیں کہ ملائیکہ نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ یہ دونوں استدلال فقیہانہ نہیں ہیں بلکہ سفیہانہ اور باطل ہیں۔ مگر جمعیت میانوالی کو یہ غنیمت مل گئی۔

تیسری وجہ یہ کہ اگر تسلیم کیا جائے کہ ایسی مناکحت بالمقابل حضرت آدم علیہ السلام کے وقت بطور شرع مقرر تھی' تب بھی استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ شریعت محمدیہ اس کی ناسخ ہے۔ اسی وجہ سے بہنیں اب حرام ہیں' اُس وقت حرام نہ تھیں۔ پس سنت آدم علیہ السلام ہمارے دلیل شرعی نہیں بن سکتی۔

نووی شرح مسلم جلد ۲' ص ۲۵۷ میں ہے : ان شرع لنا مالم یرد شرعنا بحلانه یعنی "سابقہ شریعت ہمارے لیے تب شرع بن سکتی ہے کہ ہماری شریعت اس کے خلاف وارد نہ ہو۔"

پس ہماری شریعت بغیر اشتراط مبادلہ نکاح بالنکاح کے مقرر ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث مروی ہے کہ : "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو جاہلیت کے سب نکاح مٹا دیئے۔" صرف ایک نکاح باقی رکھا جس کا آج اہل اسلام میں رواج ہے اور وہ یہ ہے کہ : نکاح الناس الیوم بخطب الرجلل ای الرجل ولیته او ابنته فیصدقها ثم ینکحها۔ یعنی "آج عہد نبوی میں نکاح مشروع یہ رائج ہے کہ کوئی شخص

کسی دوسرے شخص سے اس کی رشتہ دار عورت مثلاً بہن یا بیٹی وغیرہ کی بابت پیغام نکاح دے، وہ منظور کر لے اور مہر مقرر کر کے اس کے ساتھ نکاح کر دے۔" بس یہ ایک ہی صورت کا نکاح ہے، باقی سب حرام ہیں۔

نکاح متعہ، نکاح حلالہ، نکاح شغار ہر دو قسم بغیر ولی کے نکاح وغیرہ سب حرام ہیں کہ یہ عہد نبوی میں مشروع ہو کر رائج نہ ہوئے۔ عہد آدم علیہ السلام کی مناکحت اس کے خلاف تھی۔ وہ ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش بھی عجیب ہے اور ان کی اپنی مناکحت بھی عجیب ہے اور اولاد کی مناکحت بھی عجیب ہے، جس سے ہم لوگ کسی صورت میں استدلال نہیں کر سکتے۔

ہاں ملحد اور بے دین لوگ اس سے دلیل لیتے ہیں۔ چنانچہ فتح الباری میں ایک قصہ مذکور ہے کہ مجوسیوں کے ایک بادشاہ اور مقتدا نے شراب سے بدمست ہو کر اپنی بہن سے بدکاری کی۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کیا تو اس نے بہن سے مناکحت جائز قرار دی۔ اور بہاولنگری مولوی میانوالی جماعت قریشی کی طرح اس نے یہ دلیل پیش کی : ان اٰدم کان ینکح اولادہ بناتہ۔ "آدم علیہ السلام اپنی اولاد میں بہن بھائیوں کی شادی کر دیا کرتے تھے" یہ سنت آدم علیہ السلام ہے۔

اس دلیل کو بعض لوگ مان گئے اور اہل شغار کی طرح بہت خوش ہوئے اور بعض نے انکار کر دیا کہ یہ اس وقت کا معاملہ تھا، اب جائز نہیں۔ پس مجوسی دلیل اور میانوالی کی دلیل میں اتحاد ہو گیا۔

میرے پہلو سے گیا پالا ستمگر سے پڑا
مل گئی ظالم تجھے کفران نعمت کی سزا

چوتھی وجہ یہ کہ اگر بنات آدم کا تبادلہ سنت آدم علیہ السلام ہے تو پھر اس سنت کو اسی ہیئت اور شکل سے معمول بہا بنانا چاہیے جس شکل سے سنت آدم وقوع میں آئی تھی کہ سنت کی ہیئت بدلنی منع ہے۔ اب قریشی اور اوڈ خاندان میں جب جڑواں بہن بھائی پیدا ہوں تو ان کی مناکحت دوسرے جڑواں بہن بھائیوں سے کرا دیا کریں۔ کیا جمعیت میانوالی، سنت آدم علیہ السلام کی عاشق اس پر عمل کرے گی؟ دیدہ باید۔

پانچویں وجہ یہ کہ مناکحت اولاد آدم میں اس کی کیفیت کہاں لکھی ہے کہ اس میں

فریقین اشتراط علت حرمت تھی یا نہیں؟ اور مہرملی مقرر تھا یا نہیں؟ اگر کوئی تفصیل نہیں ہے تو اس صورت محتملہ ومجہولہ سے استدلال ہی باطل ہوا' کیونکہ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال قاعدہ مسلمہ ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ اس میں اشتراط نہ تھا کہ اپنی اولاد کے حضرت آدم علیہ السلام ولی تھے۔ وہ کسی سے اشتراط نہ کرتے تھے' خود ہی اپنے اختیار سے ایک لڑکی دوسرے لڑکے سے اور دوسری لڑکی پہلے لڑکے سے نکاح کر دیتے تھے۔ یہ بلااتفاق جائز ہے۔

میرے رسالہ میں شغار کی تعریف میں اس کی تشریح کی گئی ہے اور علت حرمت اشتراط ہے' اسی کا نام تبادلہ ہے۔ نیز احتمال ہے کہ اس وقت مہرمال مقرر نہ ہوتا ہو' کیونکہ اس وقت روپیہ وغیرہ میں نقدی نہ تھا۔ اگر یہ درست ہے تو پھر تبادلہ مہر کا شغار ہونا اوڈ کمیٹی اور قریشی کی سوسائٹی کو بھی مسلم ہے' ماھو جوابکم فھو جوابنا۔

چھٹی وجہ یہ دلیل دعویٰ کے مطابق نہیں ہے' کیونکہ نزاع اس تبادلہ میں ہے جو دو ولی اپنی لڑکیوں بہنوں کا ایک دوسرے سے شرط کے ساتھ کرتے ہیں اور سنت آدم علیہ السلام میں صرف ایک ولی اپنے لڑکے لڑکیوں کی مناکحت اپنے اختیار سے بلا شرط کرتا رہے تو یہ تبادلہ متنازعہ فیہ نہیں ہے' استدلال باطل ہوا۔

ساتویں وجہ یہ کہ اس زمانہ من حالات ہی ایسے ناگزیر تھے کہ بہن بھائیوں کی مناکحت بھی روا تھی جو شغار سے بھی بدترین ہے۔ قاعدہ یہ ہے : الضرورات یبیح المحظورات "وقتی ضرورتیں ممنوع کام کو بھی جائز کر دیتی ہیں۔"

جیسے متعہ کی صورت مجبوری کی' مولانا مودودی نے پیدا کر کے فتویٰ مشہور کر دیا تھا کہ جائز ہے۔ اگر ایسی صورت اضطراری کی مولوی عبدالرحمٰن اوڈ اور جمعیت قریشی میانوالی کو پیش آجائے تو وہ باہم مناکحت تبادلہ سے کرلیں۔ لیکن تمام اسلامی دنیا کو اس کے جواز کا فتویٰ نہ دیں کہ یہ سراسر ظلم ہے!

خلاصہ بحث یہ ہے کہ نکاح بٹہ مروجہ سنت آدم علیہ السلام ہرگز نہیں ہے' بلکہ یہ رسم جاہلیت ہے جو قطعاً حرام ہے۔ بعد علم ادلہ شرعیہ جو شخص اس رسم کفر کو سنت آدم قرار دے کر حلال کہے گا وہ اپنے ایمان کی خیر منائے۔ خصوصاً جو شخص اس حرام کو سبیل الرشاد اور صراط مستقیم ہونے پر اعتقاد رکھے۔ اس کے کفر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج

تا ثریا مے رود دیوار کج!

مؤلف نے نکاح بٹہ کو صراط مستقیم بتایا ہے اور قرآن کریم میں صراط مستقیم سے مراد عبادت الٰہی کا وہ راستہ ہے جس پر منعم علیہم کے چار گروہ گذر چکے ہیں۔ انبیاء' صدیقین' شہداء' صالحین اولیاء اللہ۔ ان چار مقدس گروہ میں بٹہ مروجہ کا نام ونشان نہ تھا۔ نکاح وہ عبادت ہے جو بہشت میں بھی جاری رہے گی اور وہ اسی صورت سے ہوئی اور ہے اور ہو گی جو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بیان صادقہ ذکر ہو چکی ہے۔ قرآن مجید میں ہے : وان اعبدونی هذا صراط مستقیم۔ "تم میرے غلام بن کر خالص میری عبادت اور غلامی کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اور نبی ﷺ نے نکاح تبادلہ کو مشروع نہیں ٹھہرایا اور اس کو عبادت نہیں بنایا اور اس پر تعامل انبیاء کرام اور سلف صالحین عظام نہیں ہوا۔ لہٰذا یہ نہ عبادت ہے اور نہ صراط مستقیم ہے بلکہ شریعت الٰہی پر افتراء ہے۔

مصنف کی بددیانتیاں: اس رسالہ میں صراط مستقیم اور سبیل الرشاد کا ثبوت تو کیا دینا تھا' اس میں شراب دھوکہ کی بھر کر اوپر سبیل الرشاد کے شربت کا لیبل لگا دیا' جو شرعاً یہ حرکت بالکل ناجائز ہے۔ چنانچہ اس میں کئی بد دیانتیاں کی ہیں جو شرعی مسئلہ کے بیان میں سخت جرم ہیں' ان کی تفصیل یہ ہے :

(۱) اس رسالہ میں جناب حضرت مولانا سید عبدالواحد صاحب غزنوی مرحوم کا سناہی فیصلہ نقل کیا ہے' جس میں اوڈ شاہی کاٹ کر دی۔ اس کا وہ حصہ جس سے بٹہ مروجہ کا ممنوع ہونا ثابت ہوتا تھا' نکال دیا اور اپنے مطلب کی عبارت رکھ کر شائع کر دی۔ چنانچہ اس یہودیانہ تحریف کا مع ثبوت رسالہ صحیفہ وغیرہ میں اعلاج کر دیا گیا تھا' جس کی اصلاح جمعیت میانوالی نے اب تک نہیں کی۔

(۲) رسالہ میں جن علماء کے فتووں سے بٹہ مروجہ استناد کیا گیا ہے' ان میں سے کئی ایک علماء مفتیان دین' اپنے فتوے سے رجوع کر چکے ہیں۔ ان کا سابقہ فتویٰ ان کی تحریروں سے منسوخ ہو چکا ہے' جس کا جمعیت کو علم کرایا گیا اور اخبار تنظیم اہلحدیث کی گذشتہ اشاعتوں میں اس کی تفصیل ہو چکی ہے۔ لیکن تاہم منسوخ شدہ فتووں کی اشاعت سے اسلامی دنیا کو

دھوکہ دیا جا رہا ہے کہ یہ علماء اہلحدیث نکاح .ٹہ مروجہ کو جائز لکھتے ہیں۔ حالانکہ وہ حرام لکھتے تھے۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی شریعت کے منسوخ احکام کی اشاعت کرے اور ناسخ حکم سے چشم پوشی کر جائے یا ائمہ دین کے اقوال قدیمہ پر فتویٰ دے۔ حالانکہ وہ اقوال جدیدہ میں اس سے رجوع کر چکے ہیں' تو یہ صریح بددیانتی ہے جو شریعت الٰہی میں کسی طرح روا نہیں مگر جمعیت میانوالی کو اس کی کچھ پرواہ نہیں۔

(۴) حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ جو جمعیت اہلحدیث مغربی پاکستان کے صدر اور امیر تھے' ان کی بابت پبلک کو یہ دھوکہ دیا گیا ہے کہ وہ خود .ٹہ مروجہ یا مروجہ نکاح تبادلہ کے جواز کے قائل تھے۔ حالانکہ وہ زمانہ فیصلہ سنام میں قائل تھے لیکن عہد پاکستان میں انہوں نے اپنا فتویٰ "الاعتصام" میں شائع کیا جبکہ سائل نے صاف یہ سوال کیا کہ :

زید و عمرو دونوں اپنے بچوں کا نکاح نابالغی کے زمانہ میں .ٹہ کا کرتے ہیں الخ۔

اس کے جواب میں مولانا غزنوی مرحوم یہ فرماتے ہیں کہ "حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے .ٹہ کا نکاح ناجائز قرار دیا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ .ٹہ کا نکاح ممنوع ہے۔"

یہ فتویٰ ۲۷/ ذی قعدہ سنہ۔۷۰ ۱۳ھ کا ہے اور فیصلہ سنامی سنہ۔۱۳۴۳ھ کا ہے۔ پس یہ منسوخ ہے اور فتویٰ سنہ۔۷۰ ۱۳ھ کا جو مؤخر ہے' اس کا ناسخ ہے۔

مولانا نے اپنے فتویٰ میں حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ سے استناد کیا ہے کہ یہ مناکحت مدینہ .ٹہ پر مہر کے ساتھ ہوئی تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو ناجائز قرار دیا اور نکاح فسخ کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو نکاح تبادلہ کی شکل میں ہو' اس میں مہر کا ذکر ہو یا نہ ہو' وہ ناجائز ہے' صورت مسئولہ میں نکاح ہی صحیح نہیں۔ (الاعتصام ۲۷/ ذیقعدہ ۷۰ ۱۳ھ)

اس فتویٰ نے فیصلہ سنامی کو منسوخ اور رسالہ جمعیت میانوالی کو سبیل الضلال ثابت کر دیا۔ میں نے جمعیت میانوالی کو مولانا غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں آگاہ کر دیا تھا کہ آپ کی جمعیت امیر کے ماتحت ہے' ان کا فتویٰ آخری تسلیم کرو یا مولانا سے جواب حاصل کرو۔

پھر بندہ نے خود مولانا غزنوی مرحوم کو بھی توجہ دلائی کہ آپ کا سابقہ فیصلہ یہ ہے اور پاکستانی فیصلہ یہ ہے۔ پہلا منسوخ اور دوسرا اس کا ناسخ ہے' لیکن جمعیت میانوالی بحیثیت امیر ہونے کے آپ کے ماتحت ہے (وہ سابقہ فیصلہ کو لے رہی ہے)۔ آپ ہمارے اس نزاع میں

فیصلہ کریں ورنہ قیامت کو آپ ذمہ دار ہوں گے۔ لیکن مولانا..... اپنے سابق فیصلہ پر نہایت نادم تھے اور آخری فتوے سے انکار نہ کر سکتے تھے تو آخر خاموشی میں ہی وقت گذار گئے اور میری گرفت کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرے۔

فتویٰ جو بعد از تحقیقات علمیہ صادر ہوا ہے وہ صحیح ہے۔ حضرت العلام محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ "حرمت نکاح شغار" نے بہت سے علمائے اہلحدیث کو رجوع کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ آج تک اس رسالہ کا کوئی شخص جواب نہ دے سکا۔ پس فیصلہ غزنوی آخری نے میانوالی کے رسالہ کو قلم زن کر دیا۔ جب ان کے گھر کا منصف ثالث بدل کر ہمارے ساتھ ہو گیا تو اس مقدمہ میں کامیابی ہماری ہوئی اور جمعیت میانوالی شکست کھا گئی' فللّٰہ الحمد۔

(۴) رسالہ سبیل الرشاد کے ص-۷۰ پر سنام کے نزاع میں جو ثالثین کا فیصلہ درج ہے' اس کے آخر میں یہ فیصلہ درج ہے کہ : "ایسے نکاح کو جس میں مہر مقرر ہو' اگرچہ اس میں ایک لڑکی کا عقد مشروط' دوسری لڑکی کے عقد سے ہو تو .ٹہ نہ کہا جائے اور سختی سے اس کا انتظام کیا جائے کہ ایسے نکاح کا نام .ٹہ نہ رکھا جائے۔

جمعیت میانوالی اور جمعیت اوڈ بہاولنگر اور ان کے مفتیان برابر اپنے رسالہ اور مضامین میں اس مناکحت مشروط کو نکاح .ٹہ اور تبادلہ کہہ رہے ہیں بلکہ لوگوں کو یہ دھوکہ دے رہے ہیں کہ مولانا غزنوی اور دیگر ثالثین نکاح .ٹہ کو جائز کہتے ہیں' حالانکہ وہ حرام کہتے ہیں۔

اب ان میں اور ان کے مفتیان مولوی یونس دہلوی وغیرہ اور ثالثین فیصلہ سنام میں سخت اختلاف ہے کہ ثالثین کا فیصلہ یہ ہے کہ لڑکیوں کے باہمی مشروط عقد مہر والے کو نکاح .ٹہ نہ کہا جائے' کیونکہ .ٹہ شغار کو کہتے ہیں اور شغار حرام ہے اور جمعیت میانوالی اور بہاولنگر کی اوڈ کمیٹی کہتی ہے کہ مروجہ مناکحت کا نام نکاح تبادلہ اور .ٹہ ہے۔ تمام لوگ اس باہمی مناکحت کا نام .ٹہ اور تبادلہ رکھ رہے ہیں۔ یہ اور چیز ہے' یہ شغار ممنوعہ نہیں ہے' ہاں .ٹہ ضرور ہے۔

یہ دونوں فریق سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نکاح .ٹہ میں باوجود مہر کے لڑکی عوض لڑکی کے شرط ہوتی ہے۔ اسی کا نام عرف عام میں .ٹہ اور تبادلہ ہے کہ اس کی علت اشتراط ہے۔ اس لیے یہ عرف باوجود کوشش اور منع کرنے کے بدل نہ سکا۔ کیونکہ حقیقت اصلیہ بدلا نہیں کرتی۔ ان میں سے مولانا غزنوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ تو اصل حقیقت کو پا گئے

کہ فی الواقع یہ .ٹہ اور لڑکیوں کا باہمی تبادلہ' مہر کا اس میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ وہ تو خود اس کو .ٹہ کہنے لگے اور یہ سمجھ گئے کہ حضرت معاویہ صحابی رضی اللہ عنہ سچے تھے۔ یہ مہر والا تبادلہ بھی شغار ہی کی دوسری قسم ہے۔ انہی میں سے مولانا ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فاضل امرتسری بھی ہیں جو مناظر اسلام تھے' انہوں نے بھی رجوع کیا تو صاف لکھ دیا کہ یہ .ٹہ شغار ہے۔ لیکن جمعیت میانوالی اور اوڈ کمیٹی بہلولنگری اس ضد اور تعصب کے سمندر میں ڈوگ گئی کہ یہ مناکحت ہے تو .ٹہ اور تبادلہ مگر شغار نہیں ہے۔ یہ سب سے بدترین ہے' جس میں حماقت بھری ہوئی ہے۔ کیونکہ شغار میں بھی اشتراط اور لڑکیوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ ہوتا ہے۔ نکاح .ٹہ میں بھی اشتراط اور لڑکیوں کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے۔ یہی علت حرمت ہے کہ اسلام میں لڑکیوں کا .ٹہ اور تبادلہ کرنا ثابت نہیں اور یہ ایک قسم شغار ہے جو حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر دلائل سے ثابت ہے۔

(۵) رسالہ کے ص۔۵ سے لے کر ص۔۱۰ تک بددیانتی سے کام لے کر میرے متعلق غلط بیانی کی ہے کہ یہاں اپنے مضمون میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیث کی صحت' برتری و اولیت کی تردید بھی کریں اور صحیحین کی صحت پر امت کا اجماع واتفاق خود مولانا حصاری نے بھی تسلیم کر لیا۔ نیز لکھا ہے کہ مولانا حصاری صاحب خود ہی اضاحۃ الحق ص۔۵۲ میں فرماتے ہیں کہ "صحیحین کی احادیث کو تلقی بالقبول حاصل ہے اور اس پر اہل حق کا اجماع ہے۔

واضح ہو کہ صحیحین کے متعلق میرا وہی عقیدہ ہے جو اضاحۃ الحق میں اور سبیل الرشاد میں درج ہے۔ میں نے کسی جگہ صحیحین کی مرفوع حدیث کی صحت اور برتری کی تردید نہیں کی۔ یہ صریح فریب کاری ہے' بہتان طرازی ہے اور افترا بازی سے کام لیا گیا ہے۔ میں نے اخبار "الاعتصام" میں ان کی اس فریب دہی کی تردید کر دی تھی کہ محدثین کا اصول اور میرا عقیدہ اور حجتہ اللہ البالغہ کی عبارت سب اس امر پر متفق ہیں کہ صحیحین کی احادیث مرفوعہ سب پر مقدم ہیں اور ان کی صحت پر امت کا اجماع ہے لیکن شغار کی بابت صحیحین میں صاف یہ تشریح ہے اور محدثین نے بھی صراحت کر دی ہے کہ اس کی تعریف میں جو عبارت صحیحین میں ہے' وہ حدیث مرفوع متصل نہیں ہے بلکہ مدرج ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ نافع کا قول ہے۔ چنانچہ خود ان کے مفتی مولانا گوندلوی نے یہ تسلیم کیا ہے کہ

رسالہ سبیل الرشاد فی تفریق التبادلتہ والشغار کے نام پر تبصرہ: نکاح بٹہ

وتبادلہ کے حلال ہونے پر جمعیت اہلحدیث قریشی میانوالی نے جو رسالہ شائع کیا ہے' وہ اردو زبان میں ہے' لیکن اپنی علمیت ظاہر کرنے کے لیے اس کا عربی زبان میں نام رکھا ہے جو لفظی اور معنوی لحاظ سے بالکل غلط ہے اور شرعی نقطہ نگاہ سے باطل ہے۔ اسم اور مسمی دونوں ہی غلط ہیں۔ تبادلہ اور شغار سے مراد نکاح تبادلہ اور نکاح شغار ہے۔ اب ترجمہ اس نام کا یہ ہے: "راستہ راستی کا نکاح تبادلہ اور نکاح شغار کی تفریق میں" جس کا مطلب یہ ہو گا کہ "جو نکاح تبادلہ اور شغار کا ہو' اس میں تفریق کر دینا راستی کا راستہ ہے۔"

اب یہ نام مسمی کے خلاف ہوا' کیونکہ رسالہ میں نکاح تبادلہ کو سبیل الرشاد بتایا گیا ہے۔ اگر مؤلف رسالہ کہے کہ میری مراد اس نام سے یہ ہے کہ راستہ راستی کا درمیان فرق کرنے نکاح تبادلہ اور نکاح شغار کے کہ دونوں نکاحوں میں فرق ہے۔ ایک حلال ہے' دوسرا حرام ہے۔

تو میں کہتا ہوں کہ پھر عبارت یہ ہونی چاہیے تھی: "سبیل الرشاد فی التفریق بین المبادلتہ والشغار" بلکہ تفریق کا لفظ بھی ٹھیک نہیں "فی الفرق" ہونا چاہیے اور لفظ تبادلہ عربی لغات اور محاورہ میں کوئی مصدر نہیں ہے۔ یہ جنگلی عربی صحرائی قوم اود سے جمعیت میانوالی نے حاصل کی ہے۔ یہاں لفظ "مبادلہ" موزوں تھا جس کے معنی بٹہ اور تبادلہ کرنے کے ہیں۔

دراصل اس رسالہ کے مؤلف میاں فضل حق صاحب سے میری خط وکتابت عرصہ تک رہی ہے۔ مجھے ان سے پورا تعارف ہے' وہ کوئی محقق عالم دین نہیں ہیں' وہ محکمہ بہبودی حیوات میانوالی کے کلرک ہیں۔ جب بندہ نے ان کو رسالہ حرمت شغار بطور ہدیہ ارسال کیا تو ان کے خاندان میں اس سے اضطراب پیدا ہو گیا' کیونکہ اس میں نکاح بٹہ مروجہ کو حرام اور موجب زناکاری قرار دیا گیا تھا۔ چونکہ میانوالی کے خاندان قریش میں نکاح تبادلہ پر عمل تھا' وہ اس کو زناکاری ٹھہرانے پر آگ بگولہ ہو گئے اور فوراً انہوں نے علمائے مجوزین نکاح بٹہ کے دروازوں سے دریوزہ گری شروع کر دی۔ چنانچہ رسالہ میں انہی علماء کے فتوے درج ہیں اور خود انہوں نے اس میں کوئی علمی تحقیق نہیں کی اور نہ کر سکتے ہیں کہ علم اور مادہ تحقیق ندارد۔ اس لیے انہوں نے رسالہ کا نام غلط رکھا تو رسالہ میں بھی غلطیوں کا ارتکاب کیا۔

اگرچہ راوی کا قول ہے مگر لغت کے اثبات کے لیے کافی ہے۔ (رسالہ ص-۲۰)

اور رسالہ کے ص-۲۱ پر صاف یہ لکھا ہے کہ "دوسری وجہ سے شیخین بخاری مسلم متفق ہیں کہ شغار کی تفسیر کلام نافع سے ہے۔"

جب یہ ثابت ہوا کہ صحیحین کی کسی روایت مرفوعہ سے تعریف شغار کی ثابت نہیں ہے بلکہ یہ نافع کا قول ہے' جیسا کہ فتح الباری وغیرہ میں اس کی بحث موجود ہے اور بخاری و مسلم کی روایت میں دوسری جگہ صاف صراحت آگئی ہے کہ یہ نافع کا قول ہے اور بخاری و مسلم دونوں فرماتے ہیں کہ یہ نافع کا قول ہے اور نافع کے قول سے ہم ایک قسم کے شغار کو مان بھی رہے ہیں تو پھر کیوں ناحق یہ الزام دیا گیا ہے کہ مولانا حصاری یہاں بحث شغار میں صحیحین کی تردید کر رہے ہیں۔

میانوالی کی جمعیت کو یہ اصول سمجھ لینا چاہیے کہ صحیحین کی احادیث مرفوعہ تو علمائے اہل حق کے نزدیک مسلم ہیں جن کا انکار گمراہی ہے مگر بخاری' مسلم میں جو آثار سلف ہیں یا راویوں کے اقوال ہیں وہ دیگر کتب حدیث کی روایتوں کے مقابلہ میں حجت نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ ان میں بحث کی جائے گی۔ چنانچہ روایت ابن عمر رضی اللہ عنہ میں ہم تعریف شغار کو نافع کا قول قرار دے کر حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں اس کو ہیچ سمجھتے ہیں اور اس کو صرف اتنا درجہ دیتے ہیں کہ یہ صرف ایک قسم شغار پر محمول ہے' اس پر حصر نہیں ہے اور مولانا گوندلوی نے جو اس کو مثبت لغت ٹھہرایا اور حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ سے اعراض کیا ہے' یہ ان کی علمی شان کے سراسر خلاف ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عربی الاصل ہیں' وہ نافع سے زیادہ لغت جانتے ہیں اور نافع عجمی الاصل ہے' اس کا درجہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے بہت کم ہے' فتذکر۔

میں نے اپنے رسالہ شغار حصہ دوم میں مولانا گوندلوی اور دیگر مفتیان کی تحقیق کا تمام راز طشت ازبام کر دیا ہے مگر افسوس ہے کہ وہ تاحال طبع نہیں ہوا۔

میانوالی کے رسالہ میں ص-۳۹ پر لکھا ہے کہ "اکثر شراح صحیح بخاری وغیرہ نے اس کو مرفوع اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی بتائے ہوئے الفاظ تسلیم کیا ہے۔" پھر ابو الوسید الباجی سے بحوالہ فتح الباری نقل کیا ہے کہ "شغار کی جو تفسیر حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ میں ہے' وہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تفسیر کردہ ہے۔ نیز اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ یہ نافع کا قول

نہیں۔"

میں کہتا ہوں کہ اس نقل میں صریح بددیانتی اور ترجمہ میں تحریف کی گئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ ابو الوسید باجی کی عبارت یہ ہے : الظهار من جملة الحديث وعليه حتى تبين انه من قول الراوى وهو نافع۔

رسالہ میانوالی میں اس عبارت کا ترجمہ غلط کیا گیا ہے' صحیح ترجمہ یوں ہے کہ : "ظاہر میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ تعریف شغار کی حدیث کا ہے اور اسی بات پر محمول ہو گا' جب تک یہ ظاہر نہ ہو جائے کہ یہ قول راوی نافع کا ہے۔" یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث شغار دو جگہ نقل کی ہے۔

ایک بار باب الشغار میں۔ اس میں شغار کی تعریف حدیث مرفوع کے ساتھ ملا دی گئی ہے' اس کو اصول حدیث میں مدرج کہتے ہیں۔ ابو الولید نے کہا ہے کہ جب تک کسی دوسری دلیل سے یہ ظاہر نہ ہو جائے کہ یہ راوی نافع کا قول ہے تو اس حدیث میں ظاہراً یہ جملہ حدیث نبوی میں شمار ہو گا۔

دوسری جگہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ کو کتاب الحیل میں ذکر کیا ہے تو وہاں صاف ظاہر کر دیا کہ یہ نافع راوی کا قول ہے۔ چنانچہ وہاں حدیث میں عبارت صاف یوں ذکر ہے : "عن عبدالله ان رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن الشغار قلت لنافع ما الشغار قال ينكح۔"

اس میں صاف صراحت ہے کہ راوی نے نافع سے دریافت کیا ہے کہ شغار کیا ہے؟ تو انہوں نے تفسر کر کے بتائی بقاعدہ الاحادیث يفسر بعضها بعضا۔

کتاب الحیل نے روایت باب الشغار کی بابت یہ ظاہر کر دیا کہ یہ راوی نافع کی ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ابن عمر رضی اللہ عنہ کی نہیں ہے تمام شراح نے یہی لکھا ہے۔

میانوالی کی جمعیت نے یہ صریح جھوٹ بولا ہے کہ اکثر شراح بخاری نے اس تفسیر کو مرفوع اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بتلائے ہیں۔ حالانکہ سب نے بعد از تحقیق یہ لکھا ہے کہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ میں یہ تفسیر نافع کا قول ہے۔ چنانچہ عون المعبود میں بحوالہ فتح الباری و تلخیص یہ نقل کیا ہے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : قلت مالك انما تلقاه عن نافع بدليل رواية مسدد هذه قال القرطبى فى المفهم التفسير فى حديث ابن

عمر جاء عن نافع۔ یعنی "خطیب وغیرہ جو اس تفسیر کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے نافع سے یہ تفسیر لی ہے اور علامہ قرطبی نے مفہم میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ میں یہ تفسیر قول نافع کا ہے۔"

تلخیص کے ص۔۲۹۴ میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے صاف وضاحت کر دی ہے کہ یہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ میں یہ قول نافع کا ہے: بدلیل ما فی الصحیحین من طریق عبیداللّٰہ بن عمر قلت منافع ما الشغار فذکرہ۔ یعنی "قول نافع ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ صحیحین میں نافع کے نام سے اس تفسیر کا ذکر آگیا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ اسی طرح تمام شروح حدیث میں یہ ذکر ہے کہ یہ تفسیر نافع کی ہے۔ چنانچہ مسند احمد کی شرح بلوغ الامانی جلد۔۱۶، ص۔۱۹۵ میں ہے: قال العلماء تفسیر الشغار لیس من کلام النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وانما ھو من کلام الرواۃ۔ یعنی "علماء محدثین نے یہ کہا ہے کہ شغار کی تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں، یہ راویوں کا کلام ہے۔"

پس جمعیت میانوالی کا یہ کہنا کہ یہ تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ یہ افتراء علی الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو شخص میرے ذمے ایسی بات کہے جو میں نے نہیں کہی، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں سمجھ لے۔"

اسی لیے میں میانوالی کی جمعیت کو آگاہ کرتا ہوں کہ وہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ میں تفسیر شغار کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر اور بخاری و مسلم کی حدیث مرفوع نہ بنائے کہ یہ کذب اور افتراء علی الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ خود بخاری و مسلم نے کہہ دیا ہے کہ یہ نافع کا قول ہے۔ اب کوئی اس کو تفسیر کلام الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کہے تو بخاری و مسلم کے مقابلہ میں اس کا قول مردود ہے۔ یہ ہے بخاری و مسلم کا ماننا اور جمعیت نے مجھ پر جو یہ الزام لگایا ہے کہ مسئلہ شغار میں صحیحین کو رد کر دیا، صریح بہتان ہے۔ ہاں ہم بخاری و مسلم میں اُن اقوال کو، جو کسی کے ہیں، حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں نہیں مانتے۔ صحیحین کی احادیث مرفوعہ کو دیگر کتب حدیث کی احادیث پر ترجیح ہے لیکن ان کے نقل کردہ اقوال کو نہیں۔

میں میانوالی کے رسالہ کے حوالہ سے یہ ثابت کر چکا ہوں کہ ان کے مفتیوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ تفسیر نافع کی ہے۔ جمعیت کے رسالہ ص۔۴۴ پر ایک اوڈا شاہی فتویٰ عربی درج ہے۔ اس میں حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ نقل کی گئی ہے اور اس کی تعریف بھی ذکر کی گئی

ہے۔ پھر یہ لکھا ہے کہ وفی الروایۃ الاخر ان تفسیر الشغار من کلام نافع۔ یعنی "بخاری کی دوسری روایت سے یہ ثابت ہے کہ یہ تفسیر نافع کا کلام ہے۔"

اب جو لوگ اس کو سینہ زوری سے تفسیر نبوی بنا کر حدیث صحیحین کی قرار دیتے ہیں' وہ مفتری علی الرسول (ﷺ) ہیں اور جمعیت کی یہ چھٹی بددیانتی ہے۔

چیلنج مناظرہ: راقم الحروف' جمعیت اہل حدیث میانوالی اور بہلولنگر کی جماعت اوڈ کو یہ چیلنج کرتا ہے کہ وہ تاریخ مقرر کر کے بہلولنگر یا میانوالی میں میرے ساتھ اس موضوع پر مناظرہ کر لے کہ "صحیحین کی حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ میں تفسیر شغار نبی کریم ﷺ کا کلام ہے یا نافع کا؟"

میں یہ ثابت کروں گا کہ یہ کلام نافع کا ہے اور جمعیت والوں نے یہ ثابت کرنا ہو گا کہ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ جمعیت اگر اسے اصول حدیث اور اکثر شراح بخاری کے اقوال سے 'کلام رسول اللہ ثابت کر دے تو "مبلغ دو سو روپے نقد انعام" پیش کیا جائے گا۔

لیکن اگر وہ یہ ثابت نہ کر سکے تو پھر جمعیت کے صدر اور تمام ارکان جمعیت کو اس افترا علی الرسول سے توبہ کرنی چاہیے۔ الغرض رسالہ سبیل الرشاد اسی قسم کی بد دیانتوں سے پر ہے۔ (فقط)

از عاجز عبدالقادر عارف الحصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور' جلد-۲۰' شمارہ-۱'۳'۴'۵'۶'۷'۸

مورخہ ۱۹/ مئی' ۲'۹ و ۱۶/ جون و ۷/ جولائی سنہ-۱۹۶۷ء

مسئلہ نکاح شغار کے نزاع میں انعامی چیلنج

کے استحقاق کا فیصلہ مندرجہ ذیل اکابر علماء اہلحدیث صادر فرمائیں

(۱) حافظ الحاج شیخ الحدیث مولانا حافظ عبداللہ روپڑی صاحب لاہور۔

(۲) الحاج مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی صدر جمعیت اہلحدیث لاہور۔

(۳) حافظ الحاج مفسر قرآن مولانا عبدالستار صاحب امام جماعت غرباء اہلحدیث کراچی۔

(۴) الحاج مولانا محی الدین صاحب امیر جماعت اہلحدیث دیپالپور۔

(۵) الحاج مولانا محمد اسماعیل صاحب ناظم اعلیٰ جمعیت اہلحدیث گوجرانوالہ۔

حضرات علمائے عظام وفضلائے کرام! لا زال شموس فیوضکم لامعۃ' السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مقصود بلااظہار آنکہ اس خادم المسلمین نے اصلاح عام کی غرض سے تبلیغ احکام اسلام کرتے ہوئے ملک میں دیگر رسومات قبیحہ وعادات شنیعہ کی طرح ایک رسم نکاح ۔ٹہ کو بھی دیکھا۔ اس کی حقیقت واقعیہ اور نتائج مذمومہ کا بھی مشاہدہ کیا تو ایک پمفلٹ بنام "فیصلہ شرعیہ بتشریح رئیس المحدثین امام المناظرین علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ درج کیا گیا تھا۔ الحمد للہ میرے اس مسلک حقہ کی تائید وتصدیق چالیس اکابر علمائے اہلحدیث ادام اللہ فیوضہم نے فرمائی جن کی تحریرات رسالہ نکاح شغار کے حصہ دوم میں درج ہیں جو بنام فیصلہ علمائے اخیار در حرمت نکاح شغار تیار کیا گیا ہے اور طبع ہو چکا ہے۔

حصہ اول کے آخر میں ایک انعامی چیلنج مشتہر کیا گیا تھا جس کے الفاظ یہ ہیں "انعامی چیلنج"۔ کمترین خادم الاسلام والمسلمین ان علماء مجوزین کو جو نکاح ۔ٹہ مروجہ کو جائز اور حلال کہتے ہیں' یہ چیلنج کرتا ہے کہ کسی دلیل شرعی سے ۔ٹہ مروجہ کا ثبوت دے کر اس کا عہد نبوی یا عہد صحابہ میں ہونا اور اس کا جائز رکھا جانا بسند صحیح و۔عبارت صریح ثابت کر دیں تو ان کو مبلغ ایک صد روپیہ انعام دیا جائے گا۔ ۔ٹہ مروجہ سے مراد وہی شغار ہے جس کی اس رسالہ میں تشریح کی گئی ہے لیکن یہ یاد رہے کہ بغیر قرآن مجید وحدیث مرفوع صحیح کے کسی امام یا عالم کا قول اور فتویٰ اثبات دعویٰ کے لیے کافی نہیں سمجھا جائے گا۔ انعام کا استحقاق دلیل شرعی صحیح پیش کرنے پر حاصل ہو گا۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

اس چیلنج کو شائع ہوئے چھ سات برس گذر چکے' کسی عالم مجوز ۔ٹہ کو جرأت نہ ہو سکی کہ اس چیلنج کی رُو سے کوئی دلیل شرعی پیش کر کے انعام مشتہرہ حاصل کر لیتا۔ الاعتصام ۵۔۱۲/ جولائی سنہ۔۱۹۵۷ء میں ایک مضمون مولوی فضل حق صاحب میانوالی کی طرف سے ۔ٹہ مروجہ کے جواز پر شائع ہوا' جس کا جواب میری طرف سے ۲۰۔۲۷/ دسمبر سنہ۔۱۹۵۷ء و ۳/ جنوری سنہ۔۱۹۵۸ء میں شائع ہوا اور اس کی آخری قسط میانوالی کے مضمون نگار کو براہ راست ارسال کر دی گئی۔ اب ایک رسالہ مولوی فضل حق صاحب نے نکاح ۔ٹہ مروجہ کی حمایت میں شائع کیا ہے' جس میں میرے تعاقب کو نظرانداز کر کے اپنا مضمون درج کیا ہے اور ایک پرانا فیصلہ منسوخ شدہ لکھا ہے اور مولانا محمد یونس صاحب دہلوی مدظلہ اور مولانا شرف الدین صاحب محدث دہلوی کے فتوے درج کئے ہیں اور خاتمہ کرتے ہوئے آخر ٹریکٹ کے مولانا

عبدالجلیل صاحب محدث سامرودی دام فیضہ کا فتویٰ اور مضمون مطبوعہ صحیفہ کراچی درج کیا ہے۔

مئولف کلرک محکمہ بہبودی حیوانات میانوالی میرے دوست ہیں جن سے خط وکتابت رہتی ہے۔ ان کے مکتوبات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود کوئی محقق عالم نہیں ہیں۔ اپنے خاندانی اور دیگر علمائے اہلحدیث سے دریوزہ گری کرتے ہوئے انہوں نے نکاح ٹہ کی اشاعت کی ہے اور ایک پمفلٹ بنام سبیل الرشاد فی تفریق التبادلۃ والشغار تالیف کر کے شائع کیا ہے جس کے نام سے بھی ان کی علمی قابلیت ظاہر ہے' کیونکہ تبادلہ عربی زبان میں کوئی مصدر نہیں ہے اور معنوی طور پر بھی یہ بدیہی بات ہے کہ مئولف نکاح ٹہ کو نکاح تبادلہ تسلیم کر رہے ہیں کہ ٹھیک اس نکاح میں لڑکی کا عوض لڑکی ہوتی ہے اور رسالہ کے ص ۱۷ پر ثالثین نے یہ تاکید کی ہے کہ "سختی سے اس کا انتظام کیا جائے کہ ایسے نکاح کا نام ٹہ نہ رکھا جائے لیکن مئولف رسالہ نے اس فیصلہ سے استناد کرتے ہوئے ان علماء کی سخت نافرمانی کی ہے کہ اس کو جابجا ٹہ اور تبادلہ لکھتے ہیں۔ اسی طرح ان کے مفتیان بھی لکھتے ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک لڑکی کا لڑکی سے نکاح تبادلہ کرنا کچھ مہر کے ساتھ درست ہے اور یہ لوگ اس کو شغار نہیں کہتے۔

اسی طرح ان لوگوں کے نزدیک اگر آج فریقین لڑکیوں کا تبادلہ باہم پختہ کر کے دو سرے دن اسی بنا پر مناکحت کرلیں تو یہ جائز ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ عقد سے پہلے کی شرط کا اعتبار نہیں۔ عقد کے وقت کی شرط کا اعتبار ہے' جس سے یہ لازم آیا کہ اگر نکاح حلالہ میں ایک دن پہلے شرط حلالہ کی طے کر کے دوسرے دن اسی شرط کی بنا پر نکاح کر کے ملاپ کیا جائے اور پھر طلاق دی جائے تو یہ درست ہے جس کا کوئی بھی عالم بالحدیث قائل نہیں ہے۔ الا من سفہ نفسہ۔

مئولف رسالہ سبیل الرشاد نے ایک نسخہ راقم الحروف کے نام بھیج کر خط میں انعام لینے کی تمنا ظاہر کی ہے' اس لیے اکابر علمائے اہلحدیث کی خدمت عالیہ میں یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرا رسالہ فیصلہ سید الابرار اور رسالہ سبیل الرشاد دونوں ملاحظہ فرما کر یہ فیصلہ صادر کریں کہ کیا یہ چیلنج کی شرائط کے مطابق مئولف رسالہ نے نکاح ٹہ کا ثبوت کسی دلیل شرعی اور تعامل صحابہ سے پیش کر دیا ہے یا نہیں؟ میں نے تو نہایت غور سے پڑھا ہے اور بار

بار مطالعہ کیا ہے۔ سوائے غلطیوں' خامیوں کے کچھ ظاہر نہیں ہوا۔ بددیانتی' خیانت اور امام ہمام' علامہ ابن حزم کے حق میں گستاخی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی توہین اور نافع تابعی کی رفعت اور حدیث امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر پرویزی شبہات وجروح ظاہر کرنے کے کچھ بھی نہیں ہے اور اس رسالہ میں جن علماء کے فتووں سے استناد کیا گیا ہے' ان میں سے اکثر اپنے مسلک سے رجوع کر چکے ہیں اور بعض کے فتوے میری تائید وتصدیق کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مؤلف رسالہ نے مندرجہ ذیل علمائے اہل حدیث کے فتووں سے نکاح تبادلہ کے جواز پر اور اس کے صراط مستقیم ہونے پر استدلال کیا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

(۱) جناب مولانا سید محمد داؤد صاحب محدث غزنوی (۲) جناب مولانا سید عبدالواحد صاحب محدث غزنوی مرحوم (۳) جناب مولانا حافظ سید ذکریا صاحب غزنوی (۴) جناب مولانا ثناء اللہ صاحب فاضل امرتسری مرحوم (۵) جناب مولانا عبدالوہاب صاحب مرحوم دہلوی (۶) جناب مولانا عبدالجلیل صاحب محدث سامروری۔

اب ان حضرات سادات علماء کی تحریریں ملاحظہ فرمائیں جو نمبروار لکھتا ہوں۔

جناب مولانا سید محمد داؤد صاحب صدر جمعیت اہلحدیث کا فتویٰ

اخبار الاعتصام مطبوعہ ۲۷/ ذیقعدہ سنہ۔۱۳۷۰ھ میں یہ فتویٰ شائع ہوا ہے جو بالفاظہ درج ذیل ہے۔ اقول وباللہ التوفیق۔ حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بٹہ کا نکاح ناجائز قرار دیا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بٹہ کا نکاح ممنوع ہے لیکن اگر کوئی بٹہ کا نکاح کر لے تو اکثر ائمہ دین کے نزدیک یہ نکاح صحیح نہ ہو گا۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ عباس بن عبداللہ بن عباس نے اپنی بیٹی کا نکاح عبدالرحمٰن بن حکم سے کیا اور عبدالرحمٰن بن حکم نے اپنی بیٹی عباس بن عبداللہ سے بیاہ دی اور دونوں نے مہر بھی مقرر کیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان کو لکھا (جو اس وقت حاکم حجاز ومدینہ تھے) کہ اس نکاح کو ناجائز قرار دیا جائے اور اس کو فسخ کر دیا جائے اور اپنے حکم نامہ میں لکھا کہ یہی وہ شغار ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

معلوم ہوا کہ جو نکاح تبادلہ کی شکل میں ہو' اس میں مہر کا ذکر ہو یا نہ ہو' وہ ناجائز ہے۔ اس لیے صورت مسئولہ میں نکاح ہی صحیح نہیں۔ مؤلف رسالہ نے ص۔۲۴۳ پر لکھا ہے کہ

اس نکاح کے بعد اگر وہ اپنی لڑکی دینے سے انکار کر دے تو کیا یہ پہلا نکاح خود بخود فسخ ہو جائے گا۔ نہ اب تک کہیں ایسا ہوا ہے کہ اس صورت میں نکاح کالعدم قرار پائے اور بغیر ایسا نکاح فسخ کرائے کسی نے اپنی لڑکی دوسری جگہ بیاہنی ہو اور علماء نے اس کو صحیح قرار دیا ہو۔" تو وہ اس واقعہ اور فتویٰ سے سبق حاصل کرلیں کہ مولانا نے فیصلہ کیا ہے اور بغیر طلاق کے نکاح .ٹہ کی لڑکیوں کا نکاح دوسری جگہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ فتویٰ مندرجہ ذیل نکاح .ٹہ پر صادر ہوا ہے جو الاعتصام مذکورہ میں شائع ہوا ہے۔

(سوال) علمائے کرام کا اس مسئلہ میں شریعت کی رُو سے کیا خیال ہے کہ زید وعمرو دونوں اپنے بچوں کا نکاح نابالغی کے زمانے میں .ٹہ کرتے ہیں۔ کچھ زمانے کے بعد ناراضگی کی وجہ سے زید بلا کسی فیصلے یعنی طلاق حاصل کئے بغیر اپنی لڑکی' لڑکے کا نکاح کسی دوسری جگہ کر دیتا ہے۔ عمرو پانچ سال تک خاموش بیٹھا رہا یعنی اپنی لڑکی کا رشتہ اور کسی جگہ نہ کیا۔ وہ فیصلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن زید فیصلہ کرنے میں دلچسپی نہیں لیتا بلکہ انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اپنے بچوں کے نکاح اور جگہ کر لیے ہیں' تم بھی کر لو! کیا اب عمرو اپنی لڑکی کا نکاح ازروئے شرع کر سکتا ہے یا نہیں؟ (کمترین محمد عالم)

مولوی فضل حق صاحب مجھ سے کوئی نظیر طلب کرتے تھے کہ کوئی واقعہ ایسا پیش کرو جس میں .ٹہ والوں نے بغیر طلاق کے فیصلہ کر لیا ہو اور علماء نے اس کو جائز رکھا ہو۔ سو یہ نظیر موجود ہے' اس سے عبرت حاصل کر لیں لیکن بجائے عبرت حاصل کرنے کے آپ نے ضد اور تعصب سے کام لے کر اس فتوے کی مقلدانہ تاویل اور ہیر پھیر سے جان بچائی ہے۔ چنانچہ ص۔۱۴ پر لکھتے ہیں کہ یہ فتویٰ بالکل دوسری نوعیت کا ہے۔

اُلٹی سمجھ خدا کسی کو نہ دے

دے آدمی کو موت پر یہ بد ادا نہ دے

فتویٰ میں شغار کا معنی .ٹہ کیا گیا ہے' جس سے مئولف انکاری ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فیصلے سے استناد کیا گیا ہے' جس سے مئولف انکاری ہے۔ حدیث کو صحیح قرار دیا گیا ہے' مئولف اس سے انکاری ہے۔ بغیر طلاق کے نکاح کو فسخ قرار دیا گیا ہے' جس سے مئولف انکاری ہے۔ مہر مقرر ہو تب بھی شغار ہے' مئولف اس سے انکاری ہے لیکن پھر بھی مئولف اس فتوے کو غلط نہیں کہتا بلکہ یہ کہتا ہے کہ یہ دوسری نوعیت کا ہے۔ اب مئولف کو اس

نوعیت کی وضاحت کرنی چاہیے ورنہ میانوالی کی جمعیت اہلحدیث صدر اعلیٰ کے ماتحت ہے۔ ان پر حضرت مفتی اعظم مدظلہ کا فیصلہ ناطق ہو گا اور ان کو اس فتوے کے سامنے سر خم کرنا پڑے گا۔ دیگر جن مفتیوں پر وہ ناز کرتے ہیں' میانوالی کی جمعیت ان کے ماتحت نہیں ہے۔ وہ اس جمعیت سے خارج ہیں۔

جناب مولانا حافظ ذکریا صاحب غزنوی کا فتویٰ

مولانا کا قلمی فتویٰ ایسی صورت کی بابت لکھا ہوا ہمارے پاس موجود ہے جس کی نقل بمطابق اصل یہ ہے۔ صورت مذکورہ بالا میں نکاح صحیح نہیں ہوتا' خواہ مہر ہو یا نہ ہو۔ اس لیے کہ حدیث مرفوع کے مقابلے میں اقوال کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ھذا ما عندی واللّٰہ اعلم۔ تحریر ۲۷/ شوال سنہ۔ ۱۳۷۴ھ (محمد ذکریا غزنوی)

مئولف جس فیصلہ کو اُٹھائے پھرتے ہیں وہ ماہ ذی قعدہ سنہ۔ ۱۳۴۳ھ کا ہے' جبکہ ان علماء کو بٹہ مروجہ کی حقیقت کا علم نہ تھا۔ جب واقعات ان کے سامنے آئے اور بٹہ کے انجام دیکھے اور حالات مشاہدہ کیے تو اپنے مسلک سے انہوں نے رجوع کر لیا' تو اب ان کے فتوے جو سنہ۔ ۱۳۷۰ھ سنہ۔ ۷۴ھ میں صادر ہوئے ہیں' ان کی پہلی تحریر کے ناسخ ہیں۔

جناب مولانا سید عبدالواحد صاحب مرحوم غزنوی کا فتویٰ

مئولف رسالہ نے ص۔ ۲۷ پر حضرت مولانا محدث غزنوی رئیس المتقین مرحوم کا فتویٰ اور مولوی عبداللہ اور مولوی عبدالرحمٰن اوڈ کے نزاع کا فیصلہ نقل کیا ہے لیکن نہایت ہی تحریف سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اصل فیصلہ بعینہٖ رسالہ شغار مئولفہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب محدث روپڑی متعنا اللّٰہ بطول بقآئہ کے ص۔ ۵۳ سے نقل کیا جاتا ہے اور مئولف کے معاون مولوی عبدالرحمٰن اوڈ کا اصل اشتہار بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں بھی یہ فیصلہ ہماری نقل کے مطابق ہے۔

مولانا سید عبدالواحد صاحب مرحوم محدث غزنوی کا فیصلہ

میرے فہم میں نکاح کے درمیان لازم بلکہ شرط صحت ہے کہ لڑکی کو امانت الٰہی جان کر وہاں نکاح کر دینا چاہیے جہاں اس کو دینی آرام بھی ہو اور دنیوی بھی اور اپنے فائدے کے

لیے ہرگز ہرگز نہ نکاح کر کے دیوے۔ چنانچہ نکاح شغار (نکاح .ٹہ) میں لڑکی، لڑکی کے بدلے اور عوض میں دیتے ہیں اور لڑکی کی خیر خواہی کے لیے نہیں دیتے بلکہ صرف اپنی خود غرضی اور اپنی خانہ آبادی کی نیت پر دیتے ہیں۔ اگرچہ جانبین سے مہر مقرر ہو جائے لیکن مہر کے عوض نہیں دیتے، بلکہ لڑکی ہی کی عوض دیتے ہیں تاکہ ہمارا خانہ آباد ہو جائے۔ جب نیت خیر خواہی لڑکی نہیں، تب یہ نکاح شغار ناجائز بلکہ باطل ہے۔ کما قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات وانما لکل امری ما نویٰ الحدیث وقال لا شغار فی الاسلام۔ عمل صرف نیتوں کے ساتھ ہیں اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی اور فرمایا اسلام میں شغار نہیں۔ اور اگر لڑکی دیتا ہے، اسی کی خیر خواہی دینی ودنیوی کے لیے اور یہ بات ٹھہرائے کہ تم اپنی لڑکی دے دو! میں اپنی لڑکی دے دوں گا! اور مہر مقرر کر لیں اور یہ شرط نہ کریں کہ میں اپنی لڑکی بایں شرط دیتا ہوں کہ تم اپنی لڑکی دے دو! نہ دو تو میں بھی نہ دوں گا۔ اذا فات الشرط فات المشروط وکما قال امیر المؤمنین مقاطع الحقوق عند الشروط "جب شرط فوت ہو جائے تو مشروط بھی فوت ہو جاتا ہے اور حقوق کے فیصلے شرائط کے موافق ہوتے ہیں" تب جائز ہو گا۔ لیکن چونکہ آج کل نکاح شغار (نکاح .ٹہ) کا برا رواج ہے حتیٰ کہ بہت جگہوں میں بغیر نکاح .ٹہ کے نکاح ہوتا ہی نہیں۔ لہٰذا میرے فہم میں علماء کو چاہیے کہ سد الذریعہ نکاح مبادلہ کو بالکل بند کرنا چاہیے۔ کل امرءٍ یتذرع بہٖ الٰی محظور فھو محظور۔ (مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ) "جو شے حرام کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہو، وہ بھی حرام ہے۔ ھذا واللّٰہ اعلم الفقیر الی اللّٰہ الغنی عبدالواحد بن عبداللّٰہ الغزنوی۔

یہ فتویٰ آب زر سے لکھنے کے قابل تھا جو نہایت تقویٰ اور احتیاط اور صداقت پر مبنی ہے جس نے انعام کے دیگر ثالثوں کے فیصلے پر بھی پانی پھیر دیا۔ جس سے متاثر ہو کر دو مفتی تو اس سیلاب سے نکل گئے اور باقی پھنسے رہے۔ اللّٰھم اخرجھم منھا! مئولف کے مفتیوں کو یہ اخلاص اور تقویٰ ملحوظ نہیں ہے، وہ مصلحت پرستی سے کام لے کر .ٹہ کرنے والوں کی حمایت کر رہے ہیں یہاں تک کہ ایک نے تو ایسی شرطوں کو درست اور پورا کرنا واجب قرار دیا ہے جس سے لازم آتا ہے کہ لڑکی والے اپنے مفاد کے لیے روپیہ پیسہ گائے بھینس وغیرہ لڑکے والوں سے لے کر کھالیں تو یہ سب جائز ہے۔ حالانکہ فتاویٰ نذیریہ میں اس کو حرام

لکھا ہے لیکن مئولف کے مفتی شاید اس کو جائز تصور کرتے ہوں گے کہ المسلمون علی شروطھم۔ اگر ناجائز سمجھتے ہیں تو پھر لڑکی لینا' شرط کرنا کسی طرح جائز ہوا؟ "یک من علم را دہ من عقل باید۔"

الغرض مولانا مرحوم کا فتویٰ فیصلہ کن ہے اور اس سے مئولف نے استدلال کیا ہے مگر عمل کرنے کو تیار نہیں ہے' اس لیے اس میں خیانت سے کام لے کر کتر بیونت کی ہے کہ اپنے مخالف عبارت کو حذف کر کے اپنے موافق کی چند سطور شائع کر دی ہیں۔ ایسا ہی اہل کتاب نے اپنی کتابوں میں کیا جن پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں لعنت فرمائی ہے۔ اعاذنا اللّٰہ تعالٰی منھا۔

جناب مولانا ثناء اللہ صاحب فاضل امرتسری کا فتویٰ

رسالہ نکاح شغار روپڑی ص۔ ۵۳ میں یہ فتویٰ درج ہے کہ "زمان رواں میں نکاح تبادلہ (شغار) میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان پر نظر کر کے یہی فتویٰ ہونا چاہیے کہ شغار کسی طرح کا جائز نہیں۔ ہاں بلا شرط' ایک طرف کا رشتہ ہو جائے تو اس کے بعد دوسری طرف سے تحریک ہو جو فریقین کی مرضی سے ہو تو جائز ہے۔ (ابو الوفا ثناء اللہ کفاہ اللہ)

دوسرا فتویٰ اخبار اہلحدیث امرتسر جلد۔ ۴۳' نمبر۔ ۲۳ مطبوعہ ۶/ رجب سنہ۔ ۱۳۶۵ھ میں مندرجہ ذیل ہے۔

(سوال نمبر۔ ۱۰۱) بٹے کا نکاح شریعت محمدیہ میں حلال ہے یا حرام؟ اور جو ملا اس قسم کا نکاح کرے وہ گنہگار ہو سکتا ہے یا نہیں؟ (محمد سلطان فیروز پوری)

(جواب) بٹے کا نکاح بحکم حدیث لا شغار فی الاسلام منع آیا ہے۔ حدیث شریف کے خلاف کرنے والا گنہگار ہے' چاہے کوئی ہو۔

اور تیسرا فتویٰ مولانا مرحوم کا مندرجہ ذیل ہے۔

<u>نکاح بٹہ زناکاری ہے:</u> (سوال نمبر۔ ۳) ہمارے یہاں ایک مولوی صاحب شغار (نکاح بٹہ) کے جواز کے متعلق حدیث عن ابن عمر ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نھی عن الشغار والشغار ان یزوج الرجل ابنة علی ان یزوجہ الاخر بنتہ ولیس بینھما صداق۔ (متفق علیہ) بیان کرتے ہیں کہ مہر کے بغیر شغار ناجائز ہے' مہر مقرر کر لیا جائے تو

جائز ہے۔ میں یہ حدیث پیش کرتا ہوں کہ لا شغار فی الاسلام ”شغار اسلام میں مطلق جائز نہیں“ کیونکہ جب نکرہ نفی کے بعد واقع ہوتا ہے تو فائدہ عموم کا دیتا ہے۔ میں تو شغار کو سول میرج کی طرح دائمی زنا سمجھتا ہوں' کیا یہ صحیح ہے؟ (عبدالجید اکاؤنٹنٹ صادق اسٹیٹ حیدر آباد سندھ)

(جواب) شغار کے متعلق آپ کی رائے صحیح ہے "لیس بینھما صداق" یہ فقرہ اتفاقیہ ہے' قید احترازی نہیں ہے۔ اس مسئلہ کی مفصل بحث نیل الاوطار میں ملاحظہ ہو' اللہ اعلم۔
(اخبار اہل حدیث مطبوعہ ۹/ صفر سنہ۔۱۳۶۶ھ بہ مطابق ۳/ جنوری سنہ۔۱۹۴۷ء)

واضح ہو کہ مولانا کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے' آپ شہرۂ آفاق تھے۔ رئیس المناظرین اور جامع الفنون تھے۔ مولوی فضل حق صاحب کے تمام مفتی ان کے مقابلے میں بہت کم درجے کے ہیں۔ وہ سردار اہلحدیث تھے' یہ مفتی ان کی سرداری کے ماتحت رہ چکے ہیں۔ یہ مولانا کا آخری فتویٰ تھا' ان فتووں سے پہلے کوئی فتویٰ ان کا بٹے کے جواز کا ہو تو وہ منسوخ ہے۔ مولانا کے نزدیک نکاح بٹہ کی حرمت شرط کی بنا پر ہے' عدم مہر کی بنا پر نہیں ہے۔ وہ اس قید کو احترازی قرار نہیں دیتے۔ یہی حق اور درست ہے' اس لیے نکاح بٹہ حرام ہے اور اس کا پڑھنا گناہ عظیم ہے اور یہ تمام عمر زناکاری ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مولوی فضل حق صاحب میانوالی کے کلرک محکمہ بہبودی حیوانات اس نکاح کو صراط مستقیم قرار دے رہے ہیں۔

ہوا نہ تھا کبھی سر قلم قاصدوں کا
یہ تیرے زمانے میں دستور نکلا

اسی طرح چالیس اکابر علماء کے فتوے میرے پاس موجود ہیں کہ نکاح بٹہ حرام ہے لیکن مولوی فضل حق کلرک سب کو صراط مستقیم کے خلاف ظاہر کر رہے ہیں' وہ اپنے محکمہ سے متاثر ہو کر انسانوں کا معاملہ بھی حیوانوں کی طرح سمجھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت کرے' آمین۔ مولانا موصوف اور دیگر تمام مفتی خواہ وہ ہمارے مسلک کے موافق ہوں یا مخالف' نکاح بٹہ کو نکاح تبادلہ ہی کہہ رہے ہیں' جس سے اجماعی طور پر زبان خلق نقارہ خدا کے مطابق یہ ثابت ہو گیا کہ اس نکاح مروجہ میں ٹھیک لڑکی کا تبادلہ لڑکی سے ہوتا ہے۔ یہ نکاح محض مہر ملی کے عوض نہیں ہوتا' مہر رواجاً ہوتا ہے۔ مقصود بالذات لڑکی کا لڑکی سے

تبادلہ ہوتا ہے جو شرط میں طے کر لیا جاتا ہے۔ پس انما الاعمال بالنیات قانون شرعی کی رُو سے اعتبار قصد' ارادہ' زبان کے مطابق عمل کرنے کا ہے' وہ تبادلہ ہے۔

حامیان .ٹہ ہزار بار دنیا کو روکیں کہ اس کو .ٹہ' تبادلہ نہ کہو' اہل دنیا رُک نہیں سکتے' .ٹہ ہی کہیں گے۔ لاکھ بار کہیں کہ یہ نکاح اپنی اپنی جگہ مہر کے عوض ہے مگر لوگ لڑکی کے بدلے میں لڑکی کا نکاح کہیں گے۔ پس ؎

بنتی نہیں ہے بات بناوٹ کی بال بھر
کھل جاتی ہے اخیر کو رنگت خضاب کی

جناب مولانا عبدالوہاب صاحب رئیس المحدثین دہلوی مرحوم کا مسلک رسالہ کے مؤلف مولوی فضل حق صاحب نے اپنے رسالے میں فتاویٰ نذیریہ کے ایک فتوے سے استناد کیا ہے' وہ بھی غلط ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ مولانا عبدالوہاب صاحب مرحوم سے مراد مولانا عبدالوہاب صاحب امام جماعت غرباء اہلحدیث دہلوی مرحوم ہیں جو اس فتوے کے اصل مفتی ہیں۔ یہ فتویٰ اول تو مخدوش ہے جیسا کہ ایک کتاب راحتہ الدارین محافظ حقوق زوجین میں اس کی تفصیل کی گئی ہے۔ اگر یہ نسبت ان کی طرف صحیح ہو تو پھر یہ فتویٰ ان کا زمانہ طالب العلمی یا ابتدائی تحقیق کا ہے۔ اس کے بعد وہ نکاح .ٹہ مروجہ کو حرام کہتے تھے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ ان کے خلف الرشید جناب مولانا عبدالستار صاحب امام ثانی جماعت غرباء اہلحدیث کراچی مدظلہ العالی جنہوں نے تمام تعلیم کتاب وسنت کی اپنے والد مرحوم سے حاصل کی ہے اور مسئلہ شغار کو انہوں نے مرحوم سے سمجھا ہے۔ وہ اس نکاح کو حرام کہتے ہیں اور یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ مولانا مرحوم کا مسلک یہی تھا۔ الولد سر لابیہ۔ ابوداوٗد میں ہے : ولد الرجل واھلہ اعلم اور صاحب البیت ادریٰ بما فیہ کی بناء پر ان کی شہادت اور مسلک کا اعتبار کیا جائے گا۔ وہ تمام مسائل میں اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ چنانچہ ان کا فتویٰ مندرجہ ذیل ہے۔

نکاح .ٹہ مروجہ اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ لقولہ علیہ السلام لا شغار فی الاسلام۔ یہ نکاح بالمعاوضہ جس میں لڑکی کے بدلے لڑکی دینے کی شرط ہوتی ہے جس کی تشریح جلی مولانا عبدالجلیل صاحب مدیر صحیفہ اہلحدیث نے اپنی تحریر میں کی ہے (یہ تحریر رسالہ شغار فیصلہ علماء اخیار کے شروع میں درج ہے) قطعاً ناجائز وناردرست ہے۔ اگر فرضی طور پر برائے نام مہر

بھی مقرر کر لیا جائے اور باقی شروط و رسوم کی پابندی لازمی قرار دی جائے تب بھی ناجائز ہے۔ جس پر معاویہ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ناطق ہے۔ (فقط حررہ العاجز محمد کفاہ اللہ الدہلوی سنہ۔۲۱۔۸۔۷۷ ۱۳ھ)

میں نے مولانا عبدالستار صاحب کو خط بھیج کر دریافت کیا کہ مولانا مرحوم کا نکاح .ٹہ میں کیا مسلک تھا؟ تو وہ تحریر فرماتے ہیں : نکاح شغار مروجہ قطعاً حرام ہے' یہی مولانا کا عقیدہ تھا۔ نیز دیگر خط نمبر۔۱۵۶۰میں فرماتے ہیں کہ والدی ماجدی نور اللہ مرقدہ جواز شغار کے ہرگز قائل نہ تھے بلکہ درس وتدریس وغیرہ میں اکثر اس کی تردید کرتے تھے۔ فتاویٰ نذیریہ کی عبارت سے اس کے جواز پر استدلال کرنا بالکل غلط اور خلاف ہے۔

پس مولانا عبدالجلیل سامرودی کا اس فتوے کو اپنانا اور ان کے مسلک کی تائید کرنا غلط ہو گیا۔ اس لیے صحیفہ کے حاشیہ پر مولانا عبدالجلیل صاحب مدیر صحیفہ نے جو مولانا مرحوم کے خاص الخاص بلکہ اخص شاگردوں میں سے ہیں' مولانا سامرودی کا یہ کہنا کہ یہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے ہے' غلط ہے۔ حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ ابوداؤد کی ہے جو صحاح کی معتبر کتابوں سے ہے۔ مولانا مرحوم اس کو رائے کہہ کر مسترد نہیں کرتے تھے بلکہ وہ تمام روایات میں تطبیق دیتے تھے کہ شغار ہر دو صورت حرام ہے۔ نافع نے جس تعریف کو ذکر کیا ہے' وہ بھی حرام ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مہر والی کی صورت کو شغار قرار دیا ہے' وہ بھی حرام ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ صحابی بلکہ خلیفہ اہل لسان اور اعلم بالمقال ہے۔ ان کے مقابلے میں کسی صحابی کا قول نہیں ہے جو ان کی تردید یا معارضہ کرتا ہو۔ ہاں نافع کے مقابلے میں حضرت عطاء تابعی ہیں جو ان کا معارضہ کرتے ہیں۔

چنانچہ محلّی ابن حزم جلد۔۹' صل۔۵۱۶ میں مذکور ہے کہ عن ابن جریج قال سئل عطاء عن رجلین انکح کل واحد منهما اخته بان یجهز کل واحد منهما بجهاز یسیر لوشآء اخذلها اکثر من ذالک فقال لا نهی عن الشغار فقلت له انه قد اصدقها کلاهما قال لا قد ارخص کل واحد منهما علی صاحبه من اجل نفسه۔ یعنی "ابن جریج نے کہا کہ حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ دو شخص اپنی بہنوں کی یوں مناکحت کرتے ہیں کہ کچھ مہر مقرر کر کے اشتراط سے نکاح کرتے ہیں۔ حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ ناجائز ہے' کیونکہ شغار ممنوع ہے۔ ابن جریج نے کہا کہ دونوں نے مہر تو مقرر کیا

ہے۔ عطاء نے فرمایا کہ انہوں نے نفسانیت سے ایک دوسرے پر آسانی کی ہے۔ لڑکیوں کی خیر خواہی مدنظر نہیں رکھی ہے۔ ہاں اگر بلا شرط ہو اور مہر علیحدہ علیحدہ مقرر کرلیں پھر خواہ کسی پر اپنی طرف سے آسانی کر دیں' یہ جائز ہے اور اگر شرط کریں کہ جھز واجھز فلا ذالک الشغار یعنی اگر تو مہر دے گا تو میں بھی مہر دوں گا' یہ شغار ہے جو جائز نہیں۔ ابن جریج نے کہا فان فرض ھذا وفرض ھذا؟ قال لا! اس نے بھی مقرر کیا اور اس نے بھی مقرر کیا تو پھر؟ عطاء نے فرمایا یہ جائز نہیں ہے۔ اس پر علامہ ابن حزم فرماتے ہیں : ففرق عطاء بین النکاحین یوخذ احدھما بالاخر ذکرا صداقا اولم یذکرا فابطلہ کہ حضرت عطاء نے دونوں نکاحوں میں فرق کر دیا ہے کہ ایک نکاح دوسرے کا عوض ہو تو صداق مقرر کریں یا نہ کریں' نکاح باطل ہے ورنہ نہیں۔

(ائمہ ثلاثہ کا فیصلہ) : مولانا حافظ محمد صاحب فاضل گوندلوی مدظلہ العالی نے اپنے دوسرے فتوے میں اماموں کے اقوال پر مدار رکھا ہے کہ اگر اشتراط ہو اور مہر بھی مقرر ہو تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کو شغار کہتے ہیں اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری روایت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے مطابق ہے۔ رسالہ کے ص-۲۱ پر یہ ذکر ہے۔ اس پر عرض یہ ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ اب امام مالک کا فیصلہ سنئے :

مدونہ جلد-۴' ص-۴ میں ہے کہ ابن قاسم کہتے ہیں ہم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ ایک شخص دوسرے کو اپنی بیٹی سو دینار میں نکاح دے' اس شرط پر کہ دوسرا اپنی بیٹی پچاس دینار میں اس کو بیاہ دے تو کیا یہ درست ہے؟ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں خیر نہیں ہے اور اس کو شغار کی ایک صورت قرار دیا۔

امام خرقی جو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردان شاگردوں سے ہیں اور ان کے خاندانی ہیں۔ یہ فرماتے ہیں : قال الخرقی لا یصح وان سموا مھرا علی حدیث معاویۃ (زادالمعاد) یعنی "خرقی نے فرمایا کہ نکاح شغار صحیح نہیں ہے' خواہ مہر بھی مقرر کرلیں جیسے حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ میں اس کا ثبوت ہے۔"

اب ان تمام اماموں کا ایک مسلک ہو گیا جو حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کے موافق ہے۔ پس یہ کہنا کہ حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ ناقابل عمل ہے اور لغت اور احادیث کے خلاف ہے' صریح باطل

ہے اور یہ کہنا کہ یہ روایت منقطع ہے' صریح جھوٹ ہے۔ علامہ ابن حزم نے اس کو صحیح فرمایا ہے۔ امام ابوداؤد نے صالح وحسن ٹھہرایا ہے۔ منذری نے سکوت کیا۔ شارح ابوداؤد مولانا شرف الحق مرحوم اور مولانا خلیل احمد انبیٹھوی مرحوم نے شرح ابوداؤد میں اور دیگر شراح نے حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ پر کوئی جرح نہیں کی۔ اب چودھویں صدی کے ایک مفتی نے یہ بڑ ہانک دی کہ یہ حدیث منقطع ہے' یہ مودودی روش ہے۔

مولانا عبدالجلیل صاحب سامرودی کا فتویٰ

مؤلف رسالہ سبیل الرشاد نے ص۔۷۶' ۷۷ میں مولانا عبدالجلیل صاحب سامرودی کا مضمون نقل کیا ہے جو انہوں نے میرے جواب میں لکھا ہے۔ مولانا نے توڑ مروڑ کر دلائل کا کچھ کا کچھ کیا ہو' آخر قدرت نے صحیح بات بھی ان کے قلم سے لکھوا دی جو ہمارے موافق ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں شغار کی دو صورتیں ہیں (مجوزین بٹہ ایک ہی مانتے ہیں) ابن حزم بھی ان ہی دو صورتوں کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ (مؤلف نے رسالے میں جائز نقل کیا ہے جو غلطی یا خیانت سے ہے' دیکھو صحیفہ یکم رمضان سنہ۔۷۰ ۱۳ھ) نیز لکھا ہے' "ابن حزم کہتے ہیں دو عورتوں کے والیوں میں سے اس کی مولیہ کی منگنی کی۔ اس نے بلا چون وچرا نکاح کر دیا' اس کے بعد دوسرے نے منگنی کی' اس نے بھی نکاح اپنی مولیہ کا کر دیا' یہ جائز ہے۔ ہاں ایک دوسرے سے شرط نہ ہو۔ اگر شرط ہے بس یہی وہ شغار حرام وباطل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ گو شرط کا ذکر صراحتاً احادیث میں نہیں ہے (یہ غلط ہے شغار کی تمام تعریفوں میں جملے شرطیہ وارد ہیں۔ ان سے شرط ثابت ہے) مگر لفظ لا صداق بینھما اور بغیر صداق اس پر دال ہے (یہ جملہ شرطیہ نہیں) اگر ہر دو جانب سے اشتراط عقد ہے تو بٹہ بالاتفاق درست نہیں اور اگر یہ اشتراط نہیں مگر اڑا دیا گیا (شرط کر کے یا بم مار کے) طرفین سے تو یہ بھی جائز نہیں' حرام ہے۔ البتہ ہر دو جانب سے عقد مشروط نہیں۔ ہر دو جانب سے مہر بھی تقرر میں آیا ہو اور کوئی نفسانیت کو اس میں دخل نہیں۔ اس کے درست اور جواز میں کون سی چیز مانع ہے؟ (کوئی مانع نہیں' ہمارا بھی اس پر صاد ہے)

پھر ص۔۷۸ میں لکھا ہے کہ مجرد عدم ذکر صداق بھی مانع عقد نہیں بلکہ فرج کا فرج سے تبادلہ یہی ایک شے مانع عقد ہے۔ ایک فرج کا حصول ومدار ثانی فرج پر ہونا مانع نکاح ہے۔ اگر اس طرح نہیں ہے تو پھر منع کی کوئی وجہ نہیں۔ ابن حزم کا بھی یہی خلاصۃ المرام ہے۔ اس سے امام ابن حزم کی تائید

ہو گئی اور مولانا سامرودی نے مئولف کے رسالے اور ان کے مفتی کی تردید کردی' جنہوں نے امام ابن حزم پر گستاخانہ حملہ کیا ہے۔ مئولف رسالہ نے ص-۱۵ پر مولانا سامرودی کے مضمون کو اس موضوع پر فیصلہ کن قرار دیا ہے۔ پس جب یہ فیصلہ کن ہے تو جس مفتی نے علامہ ابن حزم پر گستاخانہ طریق سے تنقید کی ہے' وہ سب باطل ہے اور رسالہ کے آخری حصہ اور ابتدائی حصہ کو ملانے سے مئولف کا تمام رسالہ بھی مردود ہو گیا۔ چنانچہ مولانا سامرودی لکھتے ہیں: "قوم اوڈ ہو یا جس قوم میں مقصود بالذات فرج کا لینا اور فرج کا دینا ہو (عورت کے بدلے میں عورت نکاح کرنا' فرج کے بدلے میں فرج کہلاتی ہے) اور اس پر مدار نکاح ہو اور مہر کالعدم یا برائے نام ہو' وہ بھی دینے کی نیت نہ ہو تو یہ بھی وہی شغار منہی عنہ ہے۔"

ناظرین اہل علم غور فرمائیں کہ حامیان ۔ٹہ جو شغار کی تعریف کی کنہ عدم مہر بتلاتے ہیں' یہ صورت اس کے علاوہ دوسری نوعیت کی ہے یا نہیں۔ اگر اس تعریف میں عدم مہر کی قید احترازی ہے تو یہ صورت غلط ہے اور اگر عدم مہر کی قید اکثری ہے' اس میں حصر نہیں تو یہ صورت درست اور حامیان ۔ٹہ کے بیانات سب مردود ہیں۔ واقف کار لوگ اور اہل تجربہ یہ خوب جانتے ہیں کہ بٹے میں مدار نکاح عورت کا لینا' عورت کا دینا ہوتا ہے اور دونوں طرف مہر مقصود بالذات نہیں ہوتا جس طرح بغیر تبادلہ کے نکاح میں ہوتا ہے۔ کچھ اس میں لڑکی کی خیر خواہی مدنظر رکھ کر مہر کو اہمیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ مولانا سامرودی مزید وضاحت فرماتے ہیں: "جس قوم میں یہ باتیں نہ ہوں اور ایک دوسرے کی لڑکی آپس میں لین دین اور مہر شرعی نقطہ نظر سے مقرر کیا جائے اور کسی قسم کی بیجا شرائط نہ ہوں (ٹھیک' آمنا وصدقنا!) عورتیں اپنے مہر سے مستفید ہوتی ہوں تو یہ نکاح' نکاح شغار شرعاً نہیں کہلا سکتا۔" یہ ہمارے عین مطابق ہے' اس سے ۔ٹہ مروجہ کا رد ہوا۔ اب ناظرین اہل علم یہاں میرے رسالے فیصلہ سید الابرار کی عبارت ملاحظہ فرمائیں جس کی تردید کے لیے مئولف رسالہ سبیل الرشاد نے مفتیوں کی دریوزہ گری کر کے رسالہ شائع کیا ہے۔

میں نے لکھا ہے کہ اب بٹے میں جو شرط لڑکی بدلہ لڑکی کے ہے اور ایک لڑکی دے کر دوسری لڑکی حلال کی ہے' یہ حرام ہے کیونکہ فرج کے عوض فرج اور شرمگاہ کے بدلے شرمگاہ بنتی ہے۔ یہی بے غیرتی اور بے حیائی جاہلیت میں تھی جس کو اسلام نے حرام کیا اور اگر شرط پوری نہ کی تو ۔ٹہ خود ہی نہ رہے گا' ہر صورت ۔ٹہ باطل ہے۔ حقیقت شغار کی

صرف اتنی ہے کہ لڑکی عوض لڑکی کے شرط کر کے نکاح میں دینا..... بدلے میں دینا ایسا مشروط ہو کہ بغیر اس کے دوسرا نکاح نہ ہو۔ اگر ہو تو اس کو معتبر تصور نہ کیا جائے۔ بس یہ نکاح بٹہ ہے جو شرعاً حرام ہے۔ مہر مقرر ہونے سے اس وقت نکاح جائز ہو گا جبکہ لڑکی کے بدلے لڑکی کی شرط نہ ہو اور بغیر شرط کے ایک شخص نے اپنی لڑکی دوسرے کو دے دی اور دوسرے نے اپنی خوشی سے اپنی لڑکی اس کو دے دی' نہ زبان سے بٹہ لینا کیا اور نہ دل میں قصد اور ارادہ کیا اور ہر دو کا نکاح مہر کے عوض ہوا۔ جس طرح عام طور پر نکاح ہوتے ہیں' سو یہ جائز ہے اور مہر کی نفی کا مطلب یہ ہے کہ مہر کے عوض نکاح نہ ہو۔ مقصد لڑکی بدلے لڑکی کے ہو' سو بٹہ مروجہ کی حقیقت بھی یہی کہ اس میں مہر برائے نام ہوتا ہے اور رواج کے طور پر باندھا جاتا ہے (لڑکیاں مستفید نہیں ہوتیں) اصل مقصد لڑکی عوض لڑکی ہوتی ہے۔ زبان سے بھی یہی کہا جاتا ہے کہ لڑکی کے بٹے میں لڑکی دے دو! شرط بھی ایسی پکی ہوتی ہے کہ اگر ایک نہ دے تو دوسرا نہیں دیتا۔" ص-۷۶'۷۷)

میری ان عبارت اور مفتیان کرام کی عبارات اور مولانا سامرودی کے اقتباسات کو ملا کر انصاف کیا جائے کہ مآل ایک ہی ہے یا فرق اور تباین ہے۔ اگر فرق ہے تو کس طرح؟ اور اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو مؤلف کا رسالہ مردود ہو کر بیکار ہوا' اور جن مفتیوں سے انہوں نے استناد کیا تھا' انہوں نے ہی میرے حق میں فیصلہ کر دیا تو اب وہ انعام کے کس طرح مستحق ہو سکتے ہیں؟ یہ انعام کوئی کلرکوں کی فیس نہیں ہے کہ منہ مانگی فوراً مل جائے یہاں تو علمی میدان کارزار میں لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔

نہ رکھ بٹے کی کچھ بھی سند پھر اس پر یہ اڑتے ہیں!
عجب بٹے کہ حامی ہیں کہ بے ہتھیار لڑتے ہیں!

حامیان بٹہ کی عقل پر نوحہ: حامیاں بٹہ ہمارے اخوان اہلحدیث ہیں' مجھے ان کی عقل و علم پر افسوس آتا ہے کہ یہ لڑکیوں کے نکاح تبادلہ کو شغار نہیں سمجھتے' حالانکہ مسلم شریف کی صحیح حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں نکاح تبادلہ کو شغار علی الاطلاق کہا گیا ہے۔ یہ حدیث مرفوع ہو یا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہو' بہرصورت نافع رحمہ اللہ سے فائق ہے' کیونکہ وہ قول تابعی ہے۔ حافظ ابن حجر تلخیص جلد-۲' ص-۲۹۴ میں فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں احتمال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعریف کی ہے یا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے لیکن ظاہر یہ ہے کہ نبی

ﷺ کی کلام ہے۔ اگر بالفرض ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہو تو بھی مقبول ہے' کیونکہ جو کچھ انہوں نے آنحضور ﷺ سے سنا' اس کے زیادہ عالم ہیں اور اہل زبان بھی ہیں۔ اس تعریف میں عدم صداق کی قید نہیں ہے' مطلق ہے اور حدیث لا شغار فی الاسلام بھی اطلاق پر دال ہے' کیونکہ لانفی جنس ہے' جو شغار کی تمام فردوں کی نفی کرتا ہے۔ ایک فرد نافع نے ظاہر کر دی اور دوسری حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے' تو دونوں حرام ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی صحابی اور اہل لسان ہیں۔ پھر افسوس ہے کہ صحابیوں کی تعریف کو جو صحاح میں وارد ہے' تابعی کے قول کے مقابلہ میں اور طبقہ ثالثہ کی ضعیف روایتوں کے مقابلہ میں غیر معتبر ٹھہرانا اور ان مرجوح کو معتبر بنانا صریح ہٹ دھرمی ہے۔

دوسرا انعامی چیلنج : رسالہ سبیل الرشاد کے مؤلف اور ان کے مفتیوں نے مسلمان پبلک کو یہ سخت دھوکہ دیا ہے کہ شغار کی تعریف جس میں لیس بینھما صداق وارد ہے' یہ حدیث صحیحین بلکہ صحاح کی ہے۔ جس سے عوام یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حدیث نبوی ہے جو حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ مرفوع پر راجح ہے بلکہ اس پر مزید تعجب ہے کہ اس کو روایت باللفظ قرار دے کر حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کو بالمعنی بتلایا گیا ہے۔ میں اس کو سخت جہالت اور نادانی کا اندھیر سمجھتا ہوں اور یہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ تمام صحاح میں شغار کی تعریف حدیث نبوی باللفظ سے ہرگز ہرگز ثابت نہیں ہے جو حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ سے تعریف ثابت ہے' ان میں عدم مہر کی قید مذکور نہیں ہے۔ جو شخص اجلاس علماء ثالثین مسلمہ میں تعریف شغار کی حدیث نبوی باللفظ سے ثابت کر دے' اس کو مبلغ یک صد روپیہ انعام اسی اجلاس میں ادا کر دیا جائے گا' انشاء اللہ تعالیٰ۔ ہاں صحاح سے باہر کتب طبقہ ثالثہ کی بعض مخدوش روایتوں میں اس کا ذکر ہے مگر وہ سب ناقابل احتجاج ہیں اور وہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کا معارضہ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ حدیث لا شغار فی الاسلام کے بغیر کتب صحاح ستہ میں کوئی روایت باللفظ شغار کے متعلق نہیں ہے۔ مرفوع حدیث یا ان لفظوں سے ہے : عن ابی ھریرۃ قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الشغار۔ یا ان لفظوں سے ہے : عن عبداللہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن الشغار۔ ایسی روایتیں مرفوع تو ہیں مگر ان کو بالفاظ نبوی تصور کر کے روایت باللفظ نہیں کہا جا سکتا' یہ الفاظ ابو ہریرہ

اور عبداللہ رضی اللہ عنہما کے ہیں۔ وہ اپنے لفظوں میں یہ بیان کر رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شغار سے منع کیا ہے۔ باقی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو کن لفظوں سے منع کیا' کہا کہ لا شغار فی الاسلام یا یہ کہا کہ لا تشاغروا یہ کچھ پتہ نہیں ہے۔ صرف رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت ہونے کی وجہ سے ان احادیث کو مرفوع کہا جاتا ہے۔ یہ بات نہیں کہ جس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم نے نھی رسول اللہ عن الشغار اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ الفاظ کہے' یہ بالکل غلط ہے اور اگر مؤلف اور ان کے مفتیوں کا یہ مطلب ہے کہ صحابہ کے الفاظ کو تابعی اور دیگر رواۃ نقل کر دیں تو وہ روایت باللفظ ہے۔

اس اعتبار سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی روایت باللفظ ہے کہ تابعی یہ کہہ رہا ہے : قال فی کتابہ ھذا الشغار الذی نھی عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایک ثقہ عادل راوی تابعی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ ان کے حکمنامہ سے نقل کیے' یہ روایت باللفظ اسی طرح ہے جس طرح ابن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی ہے اور سب ہی رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت ہونے کے باعث مرفوع ہیں۔ صحابہ سب عدول ہیں' کوئی صحابی اپنی رائے کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب نہیں کر سکتا۔ جو ایسا کہے کہ کر سکتا ہے تو وہ صحابہ پر تہمت دھرتا ہے۔ مؤلف رسالہ سبیل الرشاد کو چاہیے کہ پہلے روایت باللفظ اور روایت بالمعنی کی تعریف کرے پھر ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کو باللفظ اور حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کو روایت بالمعنی ثابت کرے ودونہ خرط القتاد۔

مندرجہ بالا اکابر علمائے اہلحدیث کی خدمت میں گذارش ہے کہ میرا رسالہ بنام "سید الابرار در حرمت نکاح شغار" میں مجوزین نکاح شغار بصورت اثبات جواز نکاح شغار مبلغ یک صد روپیہ کا انعامی چیلنج درج ہے' چنانچہ میں اس پر قائم ہوں۔ یہ انعام حاصل کرنے کے لیے مولوی فضل الرحمٰن صاحب میانوالی نے تقریباً سات آٹھ سال کے بعد باسی کڑھی کی طرح اُبال کھاتے ہوئے نکاح شغار کے جواز میں ایک رسالہ "سبیل الرشاد فی تفریق التبادلۃ والشغار" لکھ کر مجھ سے انعام کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کے متعلق میں آپ حضرات کی خدمت میں اپنا رسالہ "سید الابرار" اور اس محاکمہ کی مطبوعہ تحریر پیش کرتا ہوں اور جناب مولوی فضل حق صاحب میانوالی مؤلف رسالہ "سبیل الرشاد" کی خدمت میں بھی گذارش کرتا ہوں کہ وہ بھی اپنا رسالہ ان اکابرین حضرات کے پاس پندرہ شوال سنہ ۷۸ ۱۳ھ تک پہنچا

دیں تاکہ آپ کے استحقاق انعام کا فیصلہ صادر فرما سکیں۔

چونکہ مولوی فضل حق صاحب نے اکثر انہیں علماء سے استفتاء کیا ہے' لہٰذا مجھے یہی حضرات محاکمہ کے لیے منظور ہیں :

(۱) جناب الحاج مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی صدر جمعیت اہلحدیث لاہور۔ (۲) اور جناب الحاج مولانا محمد اسماعیل صاحب ناظم جمعیت اہلحدیث گوجرانوالہ اخبار گوہر بار الاعتصام میں فیصلہ رقم فرما دیں۔ (۳) جناب حافظ الحاج شیخ الحدیث مولانا حافظ عبداللہ صاحب روپڑی ماڈل ٹاؤن لاہور (۴) اور جناب الحاج مولانا محی الدین صاحب امیر جماعت اہلحدیث اخبار المنہاج میں فیصلہ درج فرما دیں۔ (۵) جناب حافظ الحاج مفسر قرآن مولانا عبدالستار صاحب امیر جماعت غرباء اہلحدیث کراچی پاکستان صحیفہ میں فیصلہ تحریر فرما دیں۔ فیصلہ آخر ماہ شوال یا زیادہ سے زیادہ ماہ ذیقعدہ سنہ ۷۸-۱۳ھ کے پہلے ہفتہ میں آنا ضروری ہے۔

تیسرا چیلنج مولوی فضل حق صاحب اور آپ کے مددگار و معاون مولوی عبدالرحمٰن اوڈ بہاولنگر کی خدمت میں گذارش ہے کہ آیئے اس مسئلہ پر بصورت مناظرہ تحقیق کر لیں۔ اگر قبول فرمائیں تو بہتر ہو گا کہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب اوڈ کی قیام گاہ بہاولنگر میں ۱۵' ۲۰ ذیقعدہ سنہ ۷۸-۱۳ھ کو جمع ہو جائیں۔ صرف آپ کا اور آپ کے ہمراہ دو اور مددگار مولویوں کا سفر خرچ بھی دیا جائے گا' انشاء اللہ۔ بصورت جیت آپ ہر تین چیلنج میں تین سو روپیہ حاصل کریں گے۔ دیدہ باید اگر منظور ہو تو اخبارات کے علاوہ اپنی قلمی تحریر دستخطی مولوی عبدالرحمٰن اوڈ بہاولنگر میرے پتہ پر ۲۵/ شوال المکرم سنہ ۷۸-۱۳ھ تک آنی ضروری ہے تاکہ تقرری ثالثان مسلمہ فریقین کا فیصلہ کر لیا جائے۔ مختصر شرائط مناظرہ میرے رسالہ میں پہلے ہی درج ہیں۔ اگر مزید کسی بات کی ضرورت ہو تو آپ کے قریب بمقام جوہر آباد مسجد اہلحدیث میں مولانا محمد عبداللہ صاحب امیر جماعت قوم اوڈ ہیں' ان کے ساتھ مناظرہ کے متعلق طے کر لیجئے۔ اگر کسی وجہ سے آپ کو بہاولنگر منظور نہ ہو تو مسجد چینیاں والی لاہور مناظرہ کے لیے موزوں ہو سکتی ہے' بشرطیکہ آپ کے مددگار مولوی عبدالرحمٰن اوڈ بہاولنگر شریک مناظرہ ہوں ورنہ برعکس اس کے پھر بہاولنگر ہی ٹھیک ہے۔

خادم جماعت : عبدالقادر حصاری غفرلہ الباری

چک نمبرا' ۵-ایل ڈاک خانہ براستہ منٹگمری

اہل شغار کی نکاح بٹہ پر عجیب دلیل

میانوالی کی جمعیت اہلحدیث نے ایک رسالہ شائع کیا ہے جس میں نکاح بٹہ مروجہ پر از مفاسد کو حلال قرار دے کر صراط مستقیم اور سبیل الرشاد بنایا ہے۔ چنانچہ الفاظ ان کے یہ ہیں کہ اور سبیل الرشاد یا صراط مستقیم بھی ہے کہ اس نکاح کو جائز ہی کہا جائے۔ جمعیت اہلحدیث نے اپنے دعویٰ پر کوئی شرعی دلیل اور تعامل صحابہ پیش کر کے اس بٹہ کا کوئی ایسا ثبوت نہیں دیا ہے کہ جس سے یہ بٹہ نکاح صراط مستقیم ثابت ہوتا اور اہل ایمان اس پر عمل کرتے۔ صراط مستقیم وہ مسئلہ ہوتا ہے جو شرع سے ثابت ہو۔ ہل شغار نے ایک دلیل نہایت عجیب پیش کی ہے جو اہل علم کی ضیافت طبع کے لیے یہاں درج کر کے اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

سبیل الرشاد کے حاشیہ ص۔۱۱ پر یہ لکھا ہے : حضرت آدم علیہ السلام نے بھی ہابیل قابیل کے نکاح میں باوجود نکاح شرعی بحکم الٰہی تبادلہ بنات ہی بصورت مروجہ کیا تھا اور تبادلہ بنات سنت آدم علیہ السلام ہے۔ اس عبارت میں کئی جھوٹے دعوے تخمیناً کئے گئے ہیں جن کا کوئی ثبوت کسی کتاب شرع میں پایا نہیں گیا ہے' من اوعی فعلیه البیان۔ ایک دعویٰ یہ کہ یہ مناکحت بحکم الٰہی ہوئی۔ دوم یہ مناکحت تبادلہ بصورت مروجہ ہوئی۔ سوم تبادلہ بنات سنت آدم علیہ السلام ہے' کیونکہ سنت وہ کام ہے جو شرعاً مقصود اور تعبدی ہو اور جو کسی مجبوری اور وقتی ضرورت کی بنا پر ہو اور پھر اس پر تعامل ثابت نہ ہو تو وہ سنت قرار نہیں پاتا۔ اگر سنت آدم علیہ السلام ہے تو اہل شغار کو سنت کی یہ ہیئت بدلنی نہیں چاہیے پھر اپنے گھروں میں اسی طرح عمل کریں جس طرح حضرت آدم علیہ السلام نے کیا تھا۔

الٹی سمجھ ایسی خدا کسی کو نہ دے
دے آدمی کو موت پر یہ بد ادا نہ دے

حضرت آدم علیہ السلام کے اس معاملہ سے سند پکڑنا شقی اماموں کا شیوہ ہے۔ چنانچہ عبد بن حمید' عبدالرزاق' شافعی' فتح الباری میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجوسیوں کے اشقی امام نے شراب سے مخمور ہو کر اپنی بہن ..... یا لڑکی سے بدی کا ارتکاب کیا (فشرب امیرهم الخمر فوقع علی اخته وفی روایة علی ابنته) اس پر لوگوں نے اعتراض کر کے

امیر کے خلاف برائی کا پروپیگنڈہ کیا تو اس امام نے یہ جواب دیا کہ ان آدم کان ینکح اولادہ بناتہ۔ یعنی "آدم علیہ السلام نے اپنی لڑکیاں اپنے بیٹوں کو بیاہ دی تھیں" اور وہ بہن بھائی ملاپ کرتے رہے تھے۔ اس نے یہ ظاہر کیا کہ یہ سنت آدم ہے' اس پر ایمان فروشوں نے تو اپنے امیر کی اطاعت کی (اطاعوہ) اور دوسرے حق پسند یہ پکار اُٹھے کہ فقال الناس جماعتهم معاذ اللّٰہ ان نؤمن بهذا او نقر به او جآء نا به نبی او نزل علینا کتاب۔ یعنی "ہم لوگ یہ ثبوت ہرگز تسلیم نہیں کرتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کسی نبی نے یہ نہیں بتایا اور نہ ہم پر کسی کتاب میں یہ مسئلہ نازل ہوا ہے۔ ہم تو ایسے حرام کام سے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے ہیں۔"

پس جیسے اس امیر قوم کا اپنی اس حرام کاری پر حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ سے استدلال کرنا ضلال تھا' ایسے ہی نکاح .ٹہ پر اس واقعہ سے دلیل لانا نادانی اور کار جہال ہے' اللہ تعالیٰ ایسی سوء فہمی سے بچائے' آمین۔

ان لوگوں کی عقل و علم پر افسوس ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹو کی مناکحت کو مروجہ تبادلہ بتا رہے ہیں اور بڑی دلیری سے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ نکاح بصورت تبادلہ مروجہ کیا تھا حالانکہ یہ سفید جھوٹ ہے۔ ان لوگوں نے جو رسالہ لکھا ہے' اس میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ نکاح .ٹہ مروجہ میں جہاں باقاعدہ مہر بھی مقرر ہوا ہے' وہاں عند النکاح شرط بھی نہیں ہوتی۔

میں کہتا ہوں کہ جہاں طرفین نے ویسے ایک دوسرے کو حسب دستور مہر باندھ کر نکاح دیئے اور شرط نہ کی تو یہ .ٹہ مروجہ نہیں اور نہ یہ منہی عنہ ہے۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام نے اس طرح مناکحت کی تو یہ تبادلہ نہیں تھا۔ لہٰذا نکاح درست ہے اور یہ اب تک درست چلا آتا ہے اور رسالہ اس کا جواز مذکورہ ہے۔ ہاں اگر طرفین نے باہم شرط کی اور ایک لڑکی دوسری کے عوض میں دی اور دو ولیوں نے اپنی لڑکیوں کا یہ معاملہ کیا تو یہ نکاح تبادلہ ہے جو حرام ہے' جس کو ص-۰۷ پر اہل شغار کے ثالثوں نے یوں لکھا ہے: "ہاں جو نکاح اس طرح کا ہو کہ زید اپنی لڑکی کا نکاح عمرو کے لڑکے سے کرے اور اسی طرح عمرو اپنی لڑکی کا نکاح زید کے لڑکے عمرو سے کرے اور دونوں جانب سے علیحدہ علیحدہ مہر مقرر ہو تو یہ نکاح جائز و صحیح ہو گا' اگرچہ فریقین نے یہ شرط کی کہ میں اپنی لڑکی کا نکاح تمہارے لڑکے سے تب کروں گا کہ تم اپنی لڑکی کا نکاح میرے لڑکے سے کرو اور اس قسم کا نکاح شغار نہ ہو گا' اس

کا نام نکاح بٹہ رکھنا غلط ہے' الخ۔" (فیصلہ انعام)

رسالہ سبیل الرشاد کی جمعیت تو بلا شرط محض ایک دوسرے کو نکاح مہر کے ساتھ دے دینے کو نکاح بٹہ کہہ رہے ہیں اور ان کے ثالثوں نے شرط والے نکاح بٹہ کو بھی بٹہ کہنا غلط قرار دیا ہے۔

ایں چہ ابو العجبی است

اہل شغار سے یہ پوچھتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی مناکحت کرنے میں ہابیل اور قابیل نے اپنی بہنیں دینے کے وقت شرط کی تھی یا نہیں؟ اگر نہیں تو تبادلہ نہ ہوا اور تمہارا گمان باطل ہرا' اور اگر شرط کی تھی تو اول اس کو ثابت کرو۔ دوم جب باہم رضامندی سے شرط کی تھی تو پھر قابیل نے ہابیل کو قتل کیونکر کر دیا تھا؟ فوراً جواب دیجئے۔

مگر تم نے جواب کیا دینا تھا' میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اکثر مفسران ہابیل قابیل کے واقعہ نقل کرنے پر یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے اہل بیت کو جوڑا بچوں کا پیدا ہوتا تھا۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوتی تھی۔ وہ اور جنس انسان نہ ہونے کے باعث مجبوراً ایک جوڑے کی لڑکی دوسرے جوڑے کے لڑکے سے نکاح کرا دیتے تھے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تب بھی یہ بٹہ نہیں ہے' کیونکہ سب لڑکے اور لڑکیوں کے ولی مختار حضرت آدم علیہ السلام تھے' وہ اپنے اختیار سے ایک اپنی لڑکی کا نکاح اپنے دوسرے جوڑے کے بیٹے سے اور دوسری بیٹی کا نکاح پہلے جوڑے کے لڑکے سے پڑھا دیتے تھے۔ اس صورت میں نہ شرط تھی اور نہ دو ولی تھے پھر اس کو کون بیوقوف تبادلہ کہے گا؟ تبادلہ میں تو دو شخص ہوتے ہیں' جو ایک دوسرے سے شرائط طے کرتے ہیں اور واقعہ زیر بحث میں باپ ایک ہی ولی ہے جو کسی ولی سے شرط نہیں کرتا بلکہ خود ہی اپنی بیٹیاں اپنے ہی بیٹوں کو نکاح کر دیتا ہے۔

ہابیل کی بہن وسیمہ کا نکاح جب قابیل سے کرنے لگے اور قابیل کی بہن جمیلہ کا نکاح ہابیل سے کرنا چاہا تو قابیل نے وسیمہ کو بدشکل جان کر نکاح میں لینا منظور نہ کیا اور یہ چاہا کہ خود جمیلہ سے نکاح کرے۔ فابی آدم ذالک "حضرت آدم علیہ السلام نے اس نکاح سے انکار کر دیا۔" تب حضرت آدم علیہ السلام نے دونوں کو قربانی کرنے کا حکم دیا کہ جس کی قربانی منظور ہو جائے گی' وہ سچا سمجھا جائے گا' اس کو جمیلہ کا نکاح مل جائے گا۔ جب قربانی ہر دو بھائیوں نے کی تو ہابیل کی قربانی منظور ہو گئی۔ اس پر حسد سے قابیل آگ بگولہ ہو گیا اور اس نے اس کو

قتل کر دیا۔ نکاح کی نوبت ہی نہ آئی۔ پھر کس طرح کہا جاتا ہے کہ ہابیل قابیل کا نکاح آدم علیہ السلام نے تبادلہ سے کر دیا تھا' جس سے نکاح ۔ثہ ثابت ہو گیا جو ہر طرح غلط ہے۔ نہ ۔ثہ تھا اور نہ مناکحت ہوئی تھی' من ادعی فعلیه البرهان۔

اچھا اگر یہ ۔ثہ ہے تو پھر بھی ہمارے لیے دلیل نہیں' کیونکہ یہ اس وقت اسی مجبوری سے ہوا جس مجبوری سے بہن بھائیوں کا نکاح باہم ہوا اور جائز رکھا گیا تھا پھر بہنیں بھی حرام ہو گئیں اور لڑکیوں کا تبادلہ بھی حرام ہو گیا۔ اب شرع محمدی کے موجودہ قانون کے ہوتے ہوئے مناکحت آدم سے استدلال کرنا ایسا ہی ہے جیسے فرشتوں کے سجدہ آدم سے استدلال کر کے بزرگوں کے سجدہ تعظیمی کو جائز بنانا ہے۔ وہ بھی حماقت ہے اور یہ بھی جہالت ہے۔ فقط والسلام

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہلحدیث جلد۔۴۲' شمارہ۔۳' مورخہ یکم صفر سنہ۔۱۳۸۱ھ

معاشرہ کی ایک عظیم خرابی

زانی زانیہ کے نکاح کا حکم؟

کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا اندریں صورت کہ ایک مولوی صاحب نے زانیہ عورت کا (جو کہ حاملہ تھی) اسی زانی شخص سے نکاح کر دیا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ نکاح جائز ہے۔ اس لیے یہ استفتاء ہے کہ شرعاً یہ نکاح درست ہے یا باطل اور حرام؟ کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیا جائے' کیونکہ ہمارے حلقہ میں اس نکاح پر سخت اختلاف ہو رہا ہے۔

سائل : میاں عبداللہ (مبلغ اسلام) ڈھنگ شاہ ضلع لاہور

الجواب بعون الوهاب۔ الحمد للہ رب العالمین اما بعد فاقول وباللہ التوفیق۔

نکاح مذکورہ دو وجہ سے حرام اور باطل ہے : اول یہ کہ یہ نکاح زانی زانیہ کا آپس میں ہوا ہے۔ زانیہ کا نکاح عفیف (زانی) سے حرام ہے کیونکہ قرآن نے مرد وعورت کے نکاح میں دو قیدیں ذکر کی ہیں : محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان۔ (پارہ۔۶) یعنی "بھلے مانس' پاک دامن رہنے والے ہوں' شہوت رانی کرنے والے اور خفیہ آشنائی رکھنے والے نہ ہوں۔"

عورتوں کے متعلق بھی پہلی دو قیدیں قرآن مجید پارہ۔۵ میں مذکور ہیں : محصنٰت غیر مسافحات ولا متخذات اخدان۔ یعنی "پاک دامن' اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والیاں ہوں' زناکار اور خفیہ یارانہ رکھنے والیاں نہ ہوں۔"

شیخ الاسلام حضرت الامام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے فتاویٰ جلد۔۲' ص۔۶۸ میں ان دو آیتوں کو نقل کر کے رقمطراز ہیں : ففی هاتين الایتين اشترط ان الرجال محصنين غير مسافحين۔ یعنی ان آیتوں میں یہ شرط ہے کہ "مرد پاک دامن ہوں' زانی نہ ہوں۔ اسی طرح عورتیں بھی ایسی ہی ہوں۔"

اسی جلد کے ص۔۶۰ میں یہ لکھتے ہیں کہ : والبغايا لسن محصنات فلم يبح نكاحهن۔ "زانیہ عورتیں' پاک دامنہ نہیں ہیں تو ان کا نکاح کرنا مباح نہ ہوا۔" نیز لکھا ہے کہ : فشرط فی الحل ان يكون الرجل غير مسافح ولا متخذ خدن (الی قوله) انما اباح النكاح اذا كان الرجال محصنين غير مسافحين۔ یعنی "نکاح کی حلت میں یہ شرط ہے کہ مرد زانی نہ ہو اور نہ خفیہ آشنائی رکھنے والا ہو کہ نکاح صرف اسی صورت میں مباح ہے کہ وہ پاک دامن غیر زانی ہو۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ زانی جو زانیہ سے آشنائی رکھتا ہے' ان کی مناکحت حرام ہے۔ قرآن مجید اس پر صاف ناطق ہے : الزانی لا ينكح الا زانية او مشركة والزانية لا ينكحها الا زان او مشرك وحرم ذالك على المؤمنين○ یعنی "زانی' زانیہ یا مشرکہ سے ہی نکاح کرتا ہے مگر مومنوں پر یہ مناکحت حرام ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے زانی زانیہ کی عادات سے خبر دی ہے کہ وہ ہم جنس ہیں' جو ایک دوسرے کی طرف راغب ہیں۔ جیسا کہ جامع البیان میں ہے : هو خبر الی الغالب انه لا يرغب الجنس الا الی مثله۔ "یعنی غالب عادت یہ ہے کہ جنس اپنی جنس ہی کی طرف مائل اور راغب ہوتی ہے۔" اس عادت عامہ کے ارشاد کے بعد فرمایا : وحرم ذالك على المومنين۔ "یعنی مومنوں پر یہ مناکحت حرام ہے۔"

تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی میں اس آیت کی مراد میں پانچ قول لکھے ہیں۔ پانچویں کو ذکر کرنے کے بعد یہ لکھا ہے : هذا القول الخامس هو الظاهر الراجح وقال الامام احمد وغيره۔ "یعنی پانچواں قول راجح ہے اور یہی مذہب امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہی مذہب تھا۔ چنانچہ قرآن مترجم ثنائی کے ص ۴۱۹ حاشیہ نمبر ۴ پر یہ لکھا ہے کہ "اب اس میں اختلاف ہے کہ اگر مرد کسی عورت سے زنا کرے تو پھر اس سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟" امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کر سکتا ہے اور ابن مسعود اور حضرت ابن عباس اور حضرت عمر اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم کا یہ قول ہے کہ "نکاح نہیں کر سکتا۔ اگر کیا تو ساری عمر گویا زنا کرتا رہا" امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حاشیہ کا بیان تفسیر فتح البیان سے منقول ہے اور یہی بیان تحفۃ الاحوذی جزء رابع ص ۱۵۳ میں درج ہے۔

محلّٰی ابن حزم جلد ۹، ص ۴۷۵ میں حضرت براء بن عازب صحابی رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مذہب منقول ہے:

عن البراء بن عازب فی الرجل یفجر بالمرأۃ ثم یرید نکاحھا قال لا یزالان زانیین ابدا۔ "یعنی جس شخص نے کسی عورت سے زنا کیا پھر اس کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ کر لیا تو اس کے بارے میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نکاح کیا تو مرد عورت ہمیشہ زانی رہیں گے یعنی نکاح نہ ہوگا۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے کہ "آپ کے پاس ایک شخص آیا جس نے بیان کیا کہ میرے چچا کی لڑکی ہے جس سے میں نکاح کا خواہش مند ہوں مگر میں اس پر پہلے دست اندازی کر چکا ہوں۔" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان کان شیئا باطنا یعنی الجماع فلا وان کان شیئا ظاهرا یعنی القبلة فلا باس۔ "یعنی اگر تو نے اس سے جماع کیا ہے تو نکاح جائز نہیں اور اگر بوس و کنار کیا ہے تو پھر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

ہمارے مناظر اسلام فاضل روپڑی مدظلہ العالی کا ایک فتویٰ بوس و کنار کرنے والے کے بارے میں شائع ہو چکا ہے کہ اس کا اس عورت سے نکاح درست ہے یعنی وہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موافق پڑا۔ جزاہ اللہ خیرا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہ مروی ہے کہ زانی زانیہ کا باہمی نکاح حرام ہے۔ چنانچہ محلّٰی ابن حزم کے مذکورہ حوالہ میں ہے کہ: قالت عائشة ام المومنين رضی اللہ عنها لا یزالان زانیین ما اصطحبا یعنی الرجل یتزوج امراۃ زنی بھا۔

<u>امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ:</u> امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جن کی بابت مولانا سرفراز گکھڑوی حاشیہ احسن الکلام جلد ۱، ص ۲۰ میں رقم طراز ہیں: "وہ شیخ الاسلام، علامہ، حافظ، ناقد، مفسر، مجتہد، عالی قدر، بحر العلوم، مخالف اور موافق سب ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ امام الائمہ، مجتہد، امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم پایہ کوئی امام پیدا نہ ہوا۔"

وہ فرماتے ہیں کہ : ”زانی اور زانیہ کا نکاح حرام ہے۔“

چنانچہ تفسیر سورہ نور ص-۴۲ میں فرماتے ہیں کہ : وکذالک المراۃ التی زنٰی بھا الرجل فانہ لا یتزوج بھا الا بعد التوبۃ فی اصح القولین کما دل علیہ الکتاب والسنۃ والاٰثار۔ یعنی ”زانیہ (عورت) کا نکاح زانی سے بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح عفیف سے' مگر بعد توبہ صحیحہ کے' اصح مذہب یہی ہے' اسی پر کتاب وسنت سے وآثار سلف دلالت کرتے ہیں۔“

فتاویٰ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جلد ثانی ص-۶۰ میں ہے : نکاح الزانیۃ حرام حتی تتوب سواء کان زنٰی بھا ھو او غیرہ ھذا ھو الصواب بلا ریب وھو مذھب طائفہ من السلف والخلف۔ ”نکاح زانیہ کا خواہ زانی سے ہو یا عفیف سے حرام ہے' جب تک توبہ خالص نہ کرے۔ یہی مسلک حق اور صواب ہے اور یہی مذہب ایک طائفہ سلف' خلف کا ہے۔“

امام موفق الدین ابن قدیمہ رحمۃ اللہ علیہ : کی بابت مولانا سرفراز گکھڑوی احسن الکلام جلد-۱' ص-۹ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں : ”حدیث' فقہ' تفسیر اور طبقات رواۃ کے معتبر اور بے مثل عالم تھے۔ شیخ الاسلام' احد الاعلام تھے' ثقہ' حجت' کامل العقل' شدید التثبت تھے۔ علوم قرآن وحدیث وفقہ وعلم خلاف کے امام اور یکتائے روزگار تھے۔“ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ امام اوزاعی کے بعد ملک شام میں ان سے بڑا کوئی امام داخل نہیں ہوا۔“

علامہ عزالدین بن عبدالسلام فرماتے ہیں کہ : ”میں نے اسلام پر دو کتابوں کی مثال نہیں دیکھی۔ ایک محلّٰی ابن حزم' دوسری مغنی ابن قدامہ جو فرقہ حنبلی کی بلند پایہ اور معتمد کتاب ہے۔“

ابن امام ابن قدامہ کا فتویٰ سنئے جس سے حنفی مذہب کا رد ہو جاتا ہے۔ علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : واذا زنت المرأۃ لم یحل لمن یعلم ذالک نکاحھا ”یعنی جب عورت نے زنا کیا تو جس کو اس کے زنا کا علم ہے' اس سے اس کا نکاح حرام ہے۔“ (مغنی مع شرح کبیر جلد-۷' ص-۵۱۵) اور محلّٰی ابن حزم میں ہے کہ نکاح زانیہ کا زانی اور غیر زانی سے حرام ہے جب تک خالص توبہ نہ کرے۔ (جلد-۹' ص-۴۷۴)

یہ سب ائمہ اور علماء محرمین آیت سورہ نور سے استدلال کر کے نکاح کو حرام کہتے ہیں' کیونکہ اس کے آخر میں صاف یہ ارشاد ہے کہ وحرم ذالک علی المومنین ”کہ زانی اور زانیہ کی مناکحت مومنوں پر حرام ہے۔“

نیل الاوطار میں ہے : **فانه صريح في التحريم** "کہ یہ جملہ صریح نکاح کی حرمت پر دال ہے۔"

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم رحمۃ اللہ علیہ : ترجمہ قرآن مترجم ثنائی سے سنئے' لکھتے ہیں : "زانی جب تک زنا سے تائب نہیں ہوتا' زانیہ یا مشرکہ عورت ہی سے نکاح کرے تاکہ کوئی بھلی عورت اس کی صحبت میں خراب نہ ہو' اسی طرح عورت زانیہ سے بحالت اجرائے زنا' زانی یا مشرک ہی نکاح کرے اور مسلمانوں پر یہ نکاح حرام ہے۔"

یہ ترجمہ بالکل غلط ہے' اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ زانیہ سے (جو ایمان دار ہے) مشرک بھی نکاح کر سکتا ہے اور زانیہ کسی مشرک شخص سے بھی نکاح کر سکتی ہے' حالانکہ یہ بالاجماع باطل ہے اور آخری جملہ اس ترجمہ کی تردید کرتا ہے۔ یہ ترجمہ ائمہ محدثین اور سلف صالحین کے بالکل خلاف ہے۔

شیخ الاسلام تفسیر سورہ نور میں فرماتے ہیں' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ زانی مرد کا نکاح جائز نہیں جب تک توبہ نہ کرے۔ توبہ سے شرط احصان کی موافقت ہو جاتی ہے۔ اگر زانیہ عورت سے مرد نکاح کرے گا تو وہ بصورت زنا اپنی عصمت نہ بچا سکے گی بلکہ اس زانیہ سے وطی کرنے میں کئی مرد شریک ہوں گے جیسے عام طور پر زانی لوگوں کی عادت ہے پس جو شخص زانیہ سے نکاح کرتا ہے' وہ زانی ہے اور جو عورت زانی سے نکاح کرتی ہے وہ زانیہ ہے۔ بہت سے زانی (لوگ) زانیہ (عورت) ہی سے نکاح کرتے ہیں۔ پس وہ عورت ان کی معشوقہ ہوتی ہے۔ (ص۔۳۳)

میں کہتا ہوں کہ جب زانی اور زانیہ کو باہم نکاح کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دے دیا تو گویا معاذ اللہ دونوں کو دیوث رہنے کا حکم دے دیا' حالانکہ دیوث پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ یہ بدیہی بات ہے کہ جب زانی نے زانیہ سے نکاح کیا تو وہ عورت زنا کی عادت کی وجہ سے کسی دوسرے سے بھی زنا کرے گی۔ اسی طرح وہ زانی' زنا کا عادی ہونے کی وجہ سے کسی عورت سے زنا کرنے سے باز نہیں آئے گا تو دونوں زنا پیشہ ' اپنے اپنے پیشہ بدکاری پر راضی ہوئے۔

یہ شرم وحیا کے سراسر خلاف اور صریحاً دیوثی ہے جس پر برقرار رہنے کا حکم اللہ تعالیٰ نہیں دیتا بلکہ فرمایا ہے : **محصنين غير مسافحين** اور **محصنات غير مسافحات** کہ نکاح میں دو شرطیں ہیں۔ (۱) پاک دامن رہنے والے ہوں۔ (۲) زناکار نہ ہوں اور نہ ہی خفیہ

یاری اور ایک دوسرے سے آشنائی قائم کرنے والے ہوں۔

پھر زانی زانیہ جو ایک دوسرے کے آشنا ہیں اور احصان کی صفت ان میں نہیں ہے' ان کو باہم نکاح کرنے کا حکم کس طرح ہو سکتا ہے؟ پس ثنائی ترجمہ غلط ہے۔ ولھم نصوص قصروا فی فھمھا فاتوا من التقصیر فیا للعرفان۔

اسی طرح فتاویٰ ثنائیہ میں نکاح زانیہ کی بابت کئی غلط فتوے درج ہیں جن سے غیر محقق مولوی صاحبان دھوکہ کھا کر زانی زانیہ اور حاملہ من الزنا کا نکاح پڑھ پڑھا رہے ہیں جو سراسر حرام ہے۔

فتاویٰ ثنائیہ جلد۔۲' ص۔۱۳۱ میں ایک سوال ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ زید نے ایک باکرہ سے نکاح کیا۔ اس کا حمل نمایاں ہو گیا' حمل ساقط کرایا گیا۔ کیا اب دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اس کا جواب مولانا امرتسری مرحوم نے اخبار اہلحدیث میں یوں شائع کیا کہ صورت مرقومہ میں نکاح جائز ہے۔ حمل کے ظاہر ہونے سے یا اس کے اسقاط سے نکاح فسخ نہیں ہوا۔ (زادالمعاد)

یہ فتویٰ اور حوالہ دونوں غلط ہیں' کیونکہ زاد المعاد میں فتویٰ ہذا کے برعکس اس نکاح کو حرام قرار دے کر زوجین میں تفریق کا حکم درج ہے۔ چنانچہ زاد المعاد جلد۔۲' ص۔۲۱۰ میں ہے : فی حکمه صلی الله علیه وسلم فیمن تزوج امراة فوجدها فی الحبل فی السنن والمصنف سعید بن مسیب عن بصرة ابن اکثم قال تزوجت امراة بكرا فی سترها فدخلت علیها فاذا هی حبلی فقال النبی صلی الله علیه وسلم لها الصداق بما استحللت من فرجها والولد عبد لک واذا ولدت فاجلدوها وفرق بینهما وقد تضمن بطلان نکاح الحمل من زنا وهو قول اهل المدینة والامام احمد وجمهور الفقها ووجوب المهر المسمٰی فی نکاح الفاسد وهذا هو الصحیح من الاقوال الثلاثة۔ "یعنی حاملہ من زنا کا حکم یہ ہے کہ ایک شخص بصرہ نامی دربار رسالت میں حاضر ہوا۔ اس نے بیان کیا کہ میں نے ایک باکرہ حاملہ عورت سے بے خبری میں نکاح کر لیا۔ جب اس سے ملاپ کیا تو اس کو حاملہ پایا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا بوجہ استحلال فرج اس کو مہر دے دو اور جب بچہ جنے تو اس پر حد لگا دو پھر آنحضرت ﷺ نے ان دونوں کے درمیان

تفریق کرا دی۔"

اس حدیث سے حاملہ زانیہ کا نکاح باطل ثابت ہوا۔ یہی اہل مدینہ اور امام احمد اور جمہور فقہاء کا مذہب ہے۔ یہی قول تین اقوال میں سے صحیح ہے لیکن ایسے نکاح فاسد کا مہر دینا پڑے گا۔

مولانا شرف الدین مرحوم دہلوی نے بھی اس فتویٰ ثنائی پر تعاقب کرتے ہوئے ایسے نکاح کو ناجائز قرار دیا ہے مگر اس پر دلیل دوسری پیش کی ہے کہ آیت اولات الاحمال کی رُو سے باکرہ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے۔ چونکہ یہ نکاح عدت کے اندر ہوا ہے' اس لیے صحیح نہیں' دوبارہ نکاح کرنا لازم ہے۔

لیکن زانی زانیہ کے نکاح میں مولانا دہلوی سے بھی ذہول ہی ہوا۔ چنانچہ فتاویٰ ثنائیہ جلد۔۲' ص۔۱۷ میں نکاح زانیہ حاملہ کی دو صورتیں ذکر فرمائی ہیں : ایک یہ کہ خود زانی سے نکاح ہو۔ دوسری یہ کہ غیر زانی سے ہو۔ پس صورت اولیٰ میں جواز ہو سکتا ہے' ثانیہ میں نہیں۔

یہ فتویٰ بھی صاف غلط ہے جس کا بطلان علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ سے ظاہر ہے اور خود مولانا دہلوی کے فتویٰ سے بھی ظاہر ہے کہ وہ بروئے آیت اولات الاحمال باکرہ حاملہ کی عدت وضع حمل قرار دے چکے ہیں۔ جب عدت وضع حمل بعموم آیت سے ٹھہر چکی تو عدت کے اندر زانی اور غیر زانی کا نکاح یکساں ہے' جائز نہیں ہے۔ بعض علماء زانی زانیہ کے نکاح کا جواز آیت : الخبیثات للخبیثین سے ثابت کرتے ہیں جو سراسر غلط ہے' جیسا کہ فتاویٰ ثنائیہ وغیرہ میں درج ہے۔ کیونکہ خبیثات سے مراد اقوال خبیثہ ہیں جو خبیث لوگوں کے منہ سے نکلتے ہیں' جیسا کہ اس آیت کے دوسرے جملہ اولئک مبراؤن مما یقولون سے صاف ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی یہی تفسیر کی ہے۔

پھر اس آیت میں : الخبیثات للخبیثین جملہ خبریہ ہے' جس میں خبیثوں کی علاوت کا ذکر ہے' نکاح کا حکم نہیں' وہ مسکوت عنہ ہے۔ اس کی حرمت : وحرم ذالک علی المومنین سے ثابت ہے۔ اگر اس سے زانی زانیہ مرد عورت مراد ہیں تو انکا نکاح بھی جائز نہ ہو گا بلکہ وہ دونوں نکاح کے بعد بھی خبیث ہی رہیں گے' پھر نکاح سے فائدہ کیا؟

شیخ الاسلام حضرت الامام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کو دوسری آیت : الزانی لا ینکح

الا زانیہ کے موافق بتایا ہے کہ : فلا تنکح الزانیۃ الخبیثۃ الا زانیا خبیثا۔

یہ کفار' فساق اور زوانی کی عادات قبیحہ کا ذکر ہے۔ باقی رہا اصل نکاح کا حکم تو وہ اہل ایمان پر حرام ہے۔ کما تقدم۔

سنن نسائی جلد-۲' ص-۲۳ میں ہے : تزویج الزانیہ "یعنی زانیہ کے نکاح کا بیان۔"

پھر مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کی ایک معشوقہ عہد جاہلیت سے تھی۔ اس سے نکاح کرنے کی بابت مرثد غنوی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جواب دینے سے خاموش رہے۔ تب آیت : الزانیۃ لا ینکحھا الا زان نازل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کو بلا کر یہ آیت پڑھ کر سنائی اور فرمایا : لا تنکحھا "کہ اس کو مت نکاح کرو۔"

دیگر حدیث میں ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "ایک شخص نے ایک زانیہ عورت سے نکاح کرنے کا اذن مانگا جس کا نام ام مہزول تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی سورہ نور کی آیت پڑھ کر سنا دی۔"

ان دونوں احادیث سے اس آیت کی وضاحت اور تفسیر ہو گئی کہ زانیہ کا کسی سے نکاح کرنا حرام ہے' خواہ اس سے نکاح کرنے والا زانی ہو یا غیر کہ : خرم ذالک علی المومنین حکم عام ہے جو ہر ایمان والے پر زانیہ سے نکاح حرام ٹھہراتا ہے۔ باقی رہا زانی زانیہ کی توبہ کا مسئلہ' سو یہ بھی غور طلب ہے۔

آج کل یہ عام وبا پھیلی ہوئی ہے۔ عورت مرد کا ناجائز تعلق ہو جاتا ہے' بعض باکرہ سے ناجائز تعلق پیدا کر لیتے ہیں اور پھر اس کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور اس کا نکاح کسی حنفی ملا یا مولوی سے پڑھوا لیتے ہیں توبہ بھی نہیں کرتے کیونکہ حنفی مذہب میں زانی زانیہ کا نکاح درست ہے اور نہ انہیں استبراء رحم کی ضرورت ہے کہ حنفی مذہب میں زانی کا نکاح اپنی مزنیہ سے خواہ وہ حاملہ ہو درست ہے۔ نہ ولی کی ضرورت ہے کہ حنفی مذہب میں عورت بالغہ خود مختار ہے۔ نہ دین اور تقویٰ کی ضرورت ہے کہ کلمہ گو حنفی مذہب میں مسلمان ہے۔ پس ان لوگوں نے ایسے حرام نکاح کو حلال کر دیا تو باکرہ اور ثیبہ عورتیں غیروں سے آشنائی پیدا کر کے اغوا ہونے لگیں اور جہاں زنا کا حمل ظاہر ہوا فوراً نکاح کر دیا' ان کو توبہ کی ضرورت نہیں ہے۔ بعض مطلقہ اور متوفیہ عورتوں کے ساتھ عدت میں تعلقات قائم کر کے ان سے زنا کرتے ہیں پھر عدت ختم ہونے پر

نکاح پڑھا لیتے ہیں، بعض عدت ہی میں نکاح کرا لیتے ہیں۔

بعض منکوحہ عورتوں سے تعلق اور آشنائی پیدا کر کے ان کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں، پھر ان کے خاوندوں کو کچھ روپے دے کر طلاق لے لیتے ہیں پھر ان سے بعض تو عدت ہی میں اور بعض عدت گذار کر نکاح کر لیتے ہیں لیکن عدت کے دنوں میں بھی اس عورت (یعنی اپنی مطلوبہ) کو اپنے استعمال میں رکھتے ہیں، جدا کر کے استبراء رحم نہیں کرتے۔ ایسے لوگ نہ خود توبہ خالص کرتے ہیں اور نہ ہی حنفی ملا مولوی اپنے مذہب کی رُو سے ان سے توبہ کرواتے ہیں۔ ہاں بعض اہلحدیث اپنا اُلو سیدھا کرنے کی خاطر نکاح کے وقت زانی اور زانیہ سے زبانی توبہ کرا لیتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے زبانی کلمے پڑھا کر نکاح کرنے کا رواج ہے کہ کلمہ پڑھنے والا زبانی کلمہ پڑھ کر مسلمان بن جاتا ہے، کلمہ کی حقیقت اور اس کے ترجمہ سے ناواقف ہوتا ہے۔ ایسا ہی توبہ کرنے والا خالص توبہ کر کے نکاح نہیں کرتا کراتا بلکہ زبانی طور سے کہہ لیتا ہے اور نہ ہی یہ استبراء رحم کراتے ہیں، پھر نکاح کیسے درست ہو سکتا ہے؟

توبہ قبول ہونے کی کئی شرطیں ہیں : اول یہ کہ توبہ خوف الٰہی سے ہو، نکاح جائز کرنے کی غرض سے نہ ہو۔ دوم یہ کہ اپنے گناہ پر ندامت ہو۔ سوم یہ کہ اس سے استغفار اور بخشش طلب کی جائے۔ چہارم یہ کہ پھر گناہ کرنے کا ارادہ نہ ہو۔ پنجم یہ کہ جس عورت سے مل کر گناہ کرتا رہا ہے، اس کو اپنے سے الگ کر کے اس سے آشنائی توڑ دے اور اس پر اپنا کوئی حق نہ سمجھے۔ اگر وہ عورت اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے سے نکاح کرنا چاہے تو اس سے کوئی تعرض نہ کرے۔ ایسی توبہ ثابت ہو جائے تو زانی زانیہ کا نکاح باہم درست ہو سکتا ہے، ورنہ نہیں۔

عبدالقادر عارف الحصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور

بابت ۲۹ ستمبر ۱۳ و ۲۷ اکتوبر سنہ ۱۹۶۷ء

نکاح حاملہ بالزنا کی تحقیق

زنا عام، زانیوں سے نکاح، عورتیں ہیں بے حجاب
نہ جانئے منظور ہے قدرت کو اب کیا انقلاب

اخبار اہلحدیث دہلی مطبوعہ ۲۱/ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء کے ص ۸ پر مذاکرہ علمیہ کے تحت زیر

عنوان "حاملہ بازنا کا نکاح" ایک فتویٰ شائع ہوا ہے جس کو مولانا محمد اسماعیل صاحب قاسمی فاضل دیوبند مدظلہ نے تحریر فرمایا ہے جس میں نکاح بازنا کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ مسئلہ گو مختلف فیہا ہے مگر اختلاف سے کون سا مسئلہ خالی ہے؟ اکثر مسائل میں علماء کا اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اختلافی مسئلہ خواہ کوئی ہو' اس میں حق ایک ہی طرف ہوتا ہے۔ جب دونوں میں تعارض اور تضاد ہو تو دونوں حق نہیں ہو سکتے کہ قرآن اس پر ناطق ہے : فما ذا بعد الحق الا الضلال "یعنی حق کے بعد صرف گمراہی باقی رہ جاتی ہے۔"

مسلک محدثین کا اس مسئلہ میں یہ ہے کہ نکاح زانیہ حاملہ کا حرام ہے اور علماء اہل الرائے کا مسلک یہ ہے کہ یہ نکاح جائز اور حلال ہے۔ اہل رائے کا یہ مسلک بالکل باطل ہے۔ جیسے دیگر مسائل ان کے باطل ہیں۔ مثلاً نکاح حلالہ' نکاح بغیر ولی' کسی کنواری لڑکی کی بابت عدالت میں جھوٹے گواہ پیش کر کے اس سے نکاح ثابت کرتے ہوئے عدالت سے حاکم کا فیصلہ لینے سے عورت کا نکاح قائم سمجھنا' اگرچہ اس دوشیزہ کا ولی انکاری ہو اور لڑکی ناراض ہو اور صاف انکاری ہو' تب بھی اس عورت کے نکاح کو درست اور عنداللہ حلال سمجھ لینا وغیرہ' عقود باطلہ ہیں۔ احناف اہل رائے ان کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ایسے یہ نکاح زانیہ کا باطل ہے اور مقلدین اہل رائے اس کو جائز کہتے ہیں۔

فاضل دیوبند نے اپنے مذہب سے الزام دور کرنے کی غرض سے فتویٰ میں سب سے پہلے فتاویٰ نذیریہ کا حوالہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ حاملہ زانیہ سے زانی نکاح کرے تو وطی حلال ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اہلحدیث کا مسلک تقلید نہیں ہے بلکہ کتاب وسنت سے دلائل لے کر مسئلہ کی تحقیق کرنا اور تمام محققین کے پیش کردہ دلائل پر غور کر کے حق بات کو ترجیح دے کر قبول کرنا اہلحدیث کا مسلک ہے۔ چنانچہ فتاویٰ نذیریہ میں حضرت میاں صاحب محدث دہلوی مرحوم نے کئی ایک مسائل کتب فقہ حنفیہ سے نقل کر کے فتوے لکھ دیئے کہ اس زمانہ میں فقہ حنفیہ پر اکثر عمل جاری تھا۔ پھر بعد از تحقیق حضرت مولانا مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نے "وھو الموفق" کے عنوان سے ان پر کئی جگہ تعاقب کر کے مسئلہ درست لکھا ہے اور حضرت میاں صاحب کی باوجود ان کے شاگرد رشید ہونے کے تقلید ہرگز نہیں کی۔

فتاویٰ نذیریہ میں حاملہ بازنا کے نکاح حلال ہونے پر کتاب وسنت سے کوئی دلیل پیش

نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے دیگر علماء اہلحدیث اس فتویٰ کو تسلیم نہیں کرتے۔

دوسرا حوالہ جناب فاضل دیوبند نے فتاویٰ ثنائیہ کا دیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فتاویٰ ثنائیہ میں اس مسئلہ پر متضاد فتوے درج ہیں۔ ان میں سے جو دلائل ناطقہ کے مطابق ہے' وہ صحیح ہے باقی غلط ہے۔ جیسے آپ کا فتویٰ غلط ہے۔

اب اس مسئلہ کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔ نکاح حاملہ بالزنا کا دو وجہ سے حرام ہے۔ ایک یہ کہ وہ زانیہ ہے۔ زانیہ کا نکاح زانی اور عفیف (پاکدامن) ہر دو سے قطعاً حرام ہے اور دوسری وجہ یہ کہ وہ حاملہ ہے اور حاملہ کی عدت وضع حمل ہے اور وضع حمل سے پہلے عدت میں نکاح کرنا حرام ہے۔ اب ہر دو وجہ کا نمبروار ثبوت سنئے۔

<u>زانیہ سے نکاح کرنا حرام ہے:</u> (ا) نکاح میں زوجین کے لیے شرائط ہیں۔ مثلاً اذن اور تراضی طرفین' ولی کا اذن دینا' گواہوں کا ہونا وغیرہ۔ ایسے ہی ناکح اور منکوحہ کا نکاح کے وقت عفیف اور عفیفہ ہونا شرط ہے اور نکاح میں عفت کا شرط ہونا اہل حق کا مذہب ہے جو کتاب اللہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ عورت کے نکاح کے ذکر میں یہ الفاظ وارد ہیں: محصنات غیر مسافحات ولا متخذات اخدان "یعنی پاک دامن عورتیں ہوں' نہ زانیہ اور خفیہ دوست رکھنے والیاں ہوں۔" (پارہ۔۵' سورہ نساء) اور مردوں کے لیے پارہ۔۶' سورہ مائدہ میں بسلسلہ نکاح یہ الفاظ وارد ہیں: محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان "یعنی بھلے مانس پاک دامن رہنے والے ہوں' نہ زنا کرنے والے اور نہ خفیہ یارانہ رکھنے والے ہوں۔"

احصان کا معنی یہ ہے' حفاظت رکھنا شرف ذاتی اور جبلت اخلاقی کی وجہ سے' اسی کا نام عفت ہے۔ تفسیر ابن کثیر جلد اول' ص۔۴۷۵ میں لفظ محصنات کی تفسیر میں یہ لکھا ہے: ای عفائف عن الزنا لا یتعا طینه۔ "یعنی پاک دامن ہوں زنا نہ کرتی ہوں۔" اور الفاظ "غیر مسافحات" کی تفسیر میں یہ لکھا ہے: وهن الزوانی اللاتی لا یمنعن من ارادهن بالفاحشة۔ "یعنی مسافحات سے مراد زانیہ عورتیں ہیں' جن سے کوئی زنا کا ارادہ کرے تو اس کو نہیں روکتیں" اور "متخذات اخدان" کی تفسیر میں یہ لکھا ہے: ذات الخلیل الواحد المقرخ به نهی الله عن ذالک یعنی تزویجها ما دامت کذالک۔ "یعنی متخذات اخدان وہ عورتیں ہیں جو ایک ہی اپنا یار دوست رکھتی ہیں اور اس سے زنا کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

ایسی عورتوں سے نکاح کرنا منع کر دیا ہے' جب تک وہ زناکار ہیں۔"

اور سورہ مائدہ پارہ ۶ میں ہے: "والمحصنات من المومنات" کی تفسیر میں ہے: ای واحل لکم نکاح الحرائر العفائف من النسآء المؤمنات۔ "یعنی تمہارے لیے آزاد عورتیں ایمان والیاں جو زنا سے بچنے والی ہیں' حلال کی گئی ہیں۔ (ابن کثیر جلد دوم' ص ۲۰) اور ص ۲۱ میں محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان کی تفسیر میں یہ لکھا ہے: فلما شرط الاحصان فی النسآء وھی العفۃ عن الزنا کذالک شرطھا فی الرجال وھو ان یکون الرجل محصنا عفیفا۔ "یعنی جیسے عورتوں کے لیے نکاح میں زنا سے پاک دامن ہونا شرط ہے' اسی طرح مردوں کا زنا سے پاک دامن ہونا بھی شرط ہے۔ پھر لکھا ہے کہ اسی شرط کی وجہ سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ زانیہ عورت کا نکاح عفیف سے اور عفیفہ کا زانی مرد سے جائز اور صحیح نہیں ہے' جب تک توبہ خالص کر کے عفیف نہ بن جائے۔

تفسیر فتح القدیر جلد دوم' ص ۱۴ میں لکھا ہے: ای لم یتخذوا معشوقات فقد شرط اللہ فی الرجال العفۃ وعدم المجاھرۃ بالزنا وعدم اتخاذ اخدان کما شرط فی النسآء ان یکن محصنات۔ "یعنی مرد معشوق بنانے والے نہ ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے مردوں میں نکاح کے لیے عفت شرط کی ہے کہ وہ زانی نہ ہوں اور عورتوں سے خفیہ یارانہ رکھنے والے نہ ہوں' جیسے عورتوں کی عفت شرط کی ہے۔"

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے فتویٰ جلد ثانی' ص ۶۰ میں فرماتے ہیں: والبغایا لسن محصنات لم یبح اللہ نکاحھن۔ "یعنی زناکار عورتیں پاک دامن نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا نکاح مباح نہیں کیا۔" اور یہ فرمایا ہے: فشرط فی الحل ان یکون الرجل غیر مسافح ولا متخذ خدن۔ نکاح حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ مرد زانی نہ ہو اور خفیہ دوستی رکھنے والا نہ ہو۔

خلاصہ ان تمام عبارتوں کا یہ ہے کہ کتاب اللہ سے مرد اور عورت کے نکاح میں عفت ثابت ہے۔ پس زانی کا عفیفہ سے اور عفیف کا زانیہ سے اور زانی زانیہ کا نکاح باہم حرام ہے کہ شرط عفت کی مفقود ہے اور یہ اصول مسلمہ اہل علم ہے: اذا فات الشرط فات المشروط۔

(۲) دوسری دلیل' قرآن میں یہ آیت مشہور ہے جو سورہ نور میں ہے: الزانی لا ینکح

الا زانیۃ او مشرکۃ والزانیۃ لا ینکحھا الا زان او مشرک وحرم ذالک علی المومنین۔ "یعنی زانی نہیں نکاح کرتا مگر زانیہ سے یا مشرکہ سے اور زانیہ سے نہیں نکاح کرتا مگر زانی یا مرد مشرک اور حرام کیا گیا ہے یہ نکاح مومنوں پر۔"

تفسیر ابن کثیر سورہ نور میں ہے : ھذا خبر من اللّٰہ تعالٰی۔ "یعنی اللہ تعالٰی نے اس آیت زانی زانیہ' مشرک اور مشرکہ کے حالات اور ان کی عادات کی خبر دی ہے۔" یعنی یہ بطور حکایت کے بیان ہے کہ زانی اپنی ہم جنس زانیہ کی طرف رغبت کرتا ہے جبکہ عاصی ہے اور اگر مشرک زانی ہے تو مشرکہ زانیہ کی طرف رغبت کرتا ہے۔ آیت کے آخری جملہ میں اس کا اصل حکم بیان کیا گیا ہے کہ مومنوں پر یہ مناکحت حرام ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ زانی اور زانیہ کا نکاح حرام ہے جبکہ وہ اہل ایمان ہوں۔

تحفۃ الاحوذی ربع۔۴' ص۔۱۵۳ میں ہے : فیہ دلیل علی انہ لا یحل للرجل ان یتزوج بالزوانی ویدل علی ذالک الایۃ المذکورۃ فی الحدیث لان فی اٰخرھا وحرم ذالک علی المومنین فانہ صریح فی التحریم۔ "یعنی اس حدیث ترمذی میں اس بات پر دلیل ہے کہ مرد کے لیے زانیہ عورتوں سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے اور اس پر سورہ نور کی آیت بھی دلیل ہے جو حدیث میں ذکر کی گئی ہے اور اس کے آخری جملہ سے اس نکاح کی صریح حرمت ثابت ہوتی ہے۔"

اصل میں زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ زانی زانیہ اور مشرکہ عورتوں سے نکاح کرتے تھے۔ اللہ تعالٰی نے مومنوں پر یہ نکاح حرام کر کے اسلامی قانون یہ نافذ فرمایا کہ زانی زانیہ سے یا مشرکہ سے نکاح نہ کرے۔ اس سے بے غیرتی اور دیوثی پیدا ہوتی ہے کہ زنا کے عادی مرد عورت جیسے آپس میں زنا کرتے رہے' پھر غیروں سے بھی زنا کریں گے اور وہ ایک دوسرے کو روک نہ سکیں گے' تو یہ صریح دیوث ہے۔

حدیث میں آیا ہے : لا یدخل الجنۃ دیوث "کہ کوئی دیوث اور بے غیرت شخص جنت میں داخل نہ ہو گا۔" دیوث کی تعریف حدیث میں یہ آئی ہے : والذی یقر فی اھلہ الخبث "یعنی دیوث وہ ہے جو اپنی بیوی میں بدکاری ہونے کو برقرار رکھے۔ دیوث زانی چونکہ خود زنا کا عادی ہے اور اس کی عورت بھی عادیہ ہے تو وہ ایک دوسرے کو زنا سے روک کر عفیف نہ بنا سکیں گے۔ اس لیے اللہ تعالٰی نے ایسے بے غیرتی کے نکاح کو اہل

ایمان پر حرام کر دیا ہے تاکہ حرام کاری اور بے غیرتی نہ پھیلے۔

افسوس ان مولویوں پر جو اس نکاح زانیہ کی حلت کا فتویٰ دیتے ہیں پھر اگر علماء حنفیہ اور رافضیہ اس قسم کا فتویٰ دیتے ہیں تو دیا کریں' ان کے مذہبوں میں ایسے بے حیائی کے کئی نکاح رائج ہیں۔ مثلاً حلالہ' متعہ' اغواہ شدہ کنواری عورتوں کا نکاح' بغیر اذن ولی۔ آج ایسا معاشرہ خراب ہوا ہے کہ بدمعاش زانی لوگ کنواری بالغہ عورتوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور ان سے منہ کالا کرتے رہتے ہیں پھر کسی حنفی مفتی سے فتویٰ لے کر حنفی ملا سے نکاح پڑھا لیتے ہیں جو صریح حرام کاری ہے۔

لیکن تعجب بعض علماء اہلحدیث پر ہے کہ وہ خلاف قرآن وحدیث ایسے نکاح کو کیوں حلال کہتے ہیں' حالانکہ اکثر محدثین نے کتب حدیث میں نکاح زانیہ پر باب باندھ کر اس کو حرام ثابت کیا ہے۔ چنانچہ منتقیٰ میں ہے' "باب نکاح الزانی والزانیة" پھر اس کے تحت حدیث ام مہزول ذکر کی ہے کہ وہ زانیہ تھی۔ اس سے کسی مسلمان نے نکاح کرنا چاہا تو آنحضرت ﷺ نے آیت سورہ نور پڑھ کر حکم فرمایا کہ نکاح مت کرو۔ پھر حدیث مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کی ذکر کی ہے کہ وہ اپنی معشوقہ سے نکاح کرنا چاہتے تھے تو آنحضرت ﷺ نے آیت سورہ نور پڑھ کر فرمایا لا تنکحھا "کہ اس سے نکاح مت کرو۔"

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع ترمذی میں سورہ نور کی تفسیر میں آیت "الزانی" کی تفسیر بیان کرنے کی غرض سے مرثد بن ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ذکر کیا ہے کہ اس نے اپنی صدیقہ سے نکاح کرنا چاہا تو آنحضور ﷺ نے سورہ نور کی آیت پڑھ کر اس کو زانیہ سے نکاح کرنے سے روک دیا۔

سنن نسائی جلد دوم' ص۔۷۳ میں امام نسائی نے "تزویج الزانیة" کا عنوان قائم کر کے اس کے تحت مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کا واقعہ پیش کیا ہے' جس میں زانیہ سے نکاح کی حرمت وارد ہے اور دوسرا باب "کراھیة تزویج الزناة" قائم کیا ہے یعنی زانیہ عورتوں سے نکاح کرنا برا ہے۔ پھر اس کے تحت ایک حدیث ذکر کی ہے جس میں یہ حکم ہے کہ نکاح کے لیے کوئی دین والی صالحہ عورت لازم پکڑو۔

امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں یوں باب باندھا ہے: "باب فی قوله الزانی لا ینکح الا زانیة" پھر اس کی تصدیق اور تفسیر کے لیے مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کا واقعہ پیش کیا ہے جس میں

آخری حکم نبوی یہ ہے : لا ینکحھا کہ تم زانیہ سے نکاح نہ کرو۔

مسند احمد جزء نمبر۔۱۶ میں انکحہ منھی عنھا کے ماتحت یہ باب منعقد کیا گیا ہے : "ماجاء فی نکاح الزانی والزانیة" پھراس کی ممانعت حدیث واقعہ ام مہزول سے ثابت کی گئی ہے، جس میں آنحضرت ﷺ نے آیت سورہ نور پڑھ کر نکاح کا حرام ہونا ظاہر کیا ہے۔

اسی طرح سنن بیہقی وسنن دار قطنی وغیرہ کتب حدیث میں یہ مسئلہ ذکر کیا گیا ہے۔ محلیٰ ابن حزم نمبر۔۹، ص۔۴۷۴ میں مسئلہ۔۱۸۳۹ کے ماتحت یہ لکھا ہے : ولا یحل للزانی المسلم ان یتزوج مسلمة لا زانیة ولا عفیفة حتّٰی تتوب۔ "یعنی زانی مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے کہ کسی مسلمان عورت سے نکاح کرے، وہ عورت زانیہ ہو یا عفیفہ (پاک دامن) جب تک توبہ نصوح نہ کرے۔" پھر امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی نکاح کے حرام ہونے پر آیت سورہ نور پیش کی ہے کہ اس آیت سے یہ حرمت بالیقین ثابت ہے اور واقعہ ام مہزول زانیہ کا پیش کیا ہے کہ اس سے کوئی مسلمان نکاح کرنا چاہتا تھا تو آیت سورہ نور نازل ہوئی، جس سے اس نکاح کی حرمت ظاہر ہوئی اور یہ حدیث پیش کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا : مھر البغی خبیث "کہ زانیہ کا مہر حرام ہے۔" مہر نکاح کا ہوتا ہے، سفاح کا نہیں۔ تو جس شخص نے زانیہ سے نکاح کیا اور اس کو مہر دیا وہ حرام ہے، کیونکہ نکاح حرام ہے تو اس کا عوض بھی حرام ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نکاح زانیہ کی حدیث صحیح میں صاف ممانعت آئی ہے۔ خواہ زانی سے ہو یا عفیف سے۔ چنانچہ وہ حدیث یہ ہے :

(۳) مجمع الزوائد جلد چہارم نمبر۔۸۶ میں ہے : عن عبد اللّٰہ قال نھانا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن صومین وعن صلاتین وعن لباسین وعن مطعمین وعن نکاحین وعن بیعتین (الحدیث بطولہ) "یعنی عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو دو قسم کے روزوں سے اور دو قسم کی نمازوں سے اور دو قسم کے لباسوں سے اور دو قسم کے کھانوں سے اور دو قسم کے نکاحوں سے اور دو قسم کی بیعوں سے منع فرمایا ہے۔" پھر نکاحوں کی تفصیل اس طویل حدیث میں یہ ہے : فنکاح البغی ونکاح علی الخالة والعمة۔ (رواہ الطبرانی ورجالہ رجال الصحیح) "یعنی ممنوع نکاح یہ ہیں، زانیہ سے نکاح کرنا اور کسی عورت سے اس کی خالہ یا پھوپھی پر نکاح کرنا۔" پس اس حدیث سے زانیہ سے نکاح

کرنا حرام ثابت ہوا' جیسے کسی عورت کو اس کی خالہ یا پھوپھی پر نکاح کرنا حرام ہے۔ اس حدیث کے راوی عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں' جن کی شان میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس چیز کو تمہارے لیے ابن مسعود رضی اللہ عنہ پسند نہ کریں میں بھی اس کو تمہارے لیے پسند نہیں کروں گا۔ (الاستیعاب جلد اول' ص-۳۵۹)

اب ان کا فتویٰ سنیئے' محلّٰی ابن حزم جلد-۹' ص-۴۷۵ میں ہے : عن ابن مسعود فی الذی یتزوج المرأۃ بعد ان زنٰی بھا قال ابن مسعود لا یزالان زانیین۔ "یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی عورت نے زنا کیا اور پھر اس سے نکاح کر لیا تو وہ ناکح اور منکوحہ دونوں ہمیشہ زانی ہی رہیں گے یعنی نکاح نہ ہو گا' زنا ہی ہوتا رہے گا۔"

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو صحابہ کرام میں مفتیہ مشہور تھیں' وہ بھی یہی فتویٰ دیا کرتی تھیں۔ چنانچہ محلّٰی کے اسی صفحہ میں ہے : عن الشعبی قال قالت عائشۃ ام المومنین لا یزالان زانیین ما اصطحبا یعنی الرجل یتزوج امرأۃ زنٰی بھا۔ "یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ دو زانیوں نے آپس میں نکاح کیا تو جب تک وہ صحبت کریں گے زانی ہی رہیں گے۔"

حضرت براء بن عازب صحابی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ محلّٰی کے اسی صفحہ پر یوں ہے : عن براء ابن عازب فی الرجل یفجر بالمراۃ ثم یرید نکاحھا قال لا یزالان زانیین ابدا۔ "یعنی براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے اس شخص کے بارے میں جو کسی عورت سے زنا کرتا ہے پھر اس سے نکاح کرنا چاہے یہ فرمایا کہ وہ دونوں ہمیشہ زانی ہی رہیں گے۔"

ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ زانی اور زانیہ کا نکاح حرام ہے۔ مقلدین حنفیہ پر نہایت افسوس ہے کہ وہ یہ دعویٰ بڑے فخر سے کیا کرتے ہیں کہ ہماری فقہ حنفی کی تخم ریزی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کی ہے اور ہمارے مذہب کا دارومدار ان کی احادیث پر ہے حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ چنانچہ مسئلہ مابہ النزاع میں وہ ان کے مخالف ہو کر اپنے امام کی تقلید میں مستغرق ہیں' جس سے ظاہر ہے کہ مقلدین کا نصب العین تقلید محض واحد یعنی امام رائے ابوحنیفہ کی ہے' اتباع احادیث اور صحابہ ہرگز نہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ جلد دوم ص-۶۰ میں فرماتے ہیں : نکاح الزانیۃ حرام حتّٰی تتوب سواء کان زنٰی بھا ھو او غیرہ ھذا ھو الصواب بلا ریب وھو مذھب

طائفة من السلف والخلف۔ "یعنی نکاح زانیہ کا حرام ہے' جب تک توبہ کر کے عفیفہ نہ ہو' خواہ زانی اس سے نکاح کرے یا غیر زانی بہرحال بلاشبہ حرام ہے۔ یہی مذہب حق اور صواب ہے اور ایک طائفہ سلف وخلف کا یہی مذہب ہے۔"

امام ابن القیم رئیس المحققین زاد المعاد جزء رابع ص۔۲۳۳ مطبوعہ مصر میں فرماتے ہیں:
ومن محاسن مذهب الامام احمد رحمه الله وقدس الله روحه ان حرم نكاحها بالكلية حتّٰى تتوب ويرتفع عنها اسم الزانية والبغي والفاجرة فهو رحمه الله لا يجوز ان تكون الرجل زوج بغي ومنازعوه يجوزون ذالک وهو اسعد منهم في هذه المسئلة المدللة بالدلائل من النصوص والاثار والقياس والمصلحة والحكمة وتحريم ما راٰه المسلمون قبيحا الخ۔ "یعنی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی خوبیوں میں یہ ایک عمدہ خوبی ہے کہ وہ زانیہ عورت کے نکاح کو مطلقاً حرام قرار دیتے ہیں جب تک وہ توبہ کر کے صالحہ نہ بنے اور اس سے زانیہ اور بدکار ہونے کا نام زائل نہ ہو جائے۔ وہ ایسے غیور تھے کہ کسی مرد کے لیے زانیہ عورت کا خاوند ہونا جائز اور پسند نہ کرتے تھے۔ ان کے مخالفین یہ بات جائز رکھتے تھے۔ حضرت الامام اس مسئلہ میں ان سب سے زیادہ متقی تھے۔ ان کا یہ مسلک ہر طرح کے دلائل سے مدلل ہے' نصوص شرعیہ اور آثار سلف اور قیاس صحیح اور مصلحت شرعی اور عقلی اور جس چیز کو اہل اسلام ابرار برا سمجھیں' اس کا حرام ہونا ان کے مسلک پر ناطق ہیں۔

امام شوکانی' امام حسن بصری تابعی سے جنہوں نے پانچ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے شرف لقاء حاصل کیا ہے' یہ نقل کرتے ہیں: انه يحرم على الرجل نكاح من زنى بها واستدل بالاية۔ "یعنی امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اس مرد کا نکاح جس نے اس منکوحہ سے زنا کیا ہے' حرام قرار دیتے تھے اور آیت سورہ نور سے استدلال فرماتے تھے۔"

بعض فاضلوں نے آیت سورہ نور کا یہ ترجمہ کیا ہے۔ "زانی جب تک زنا سے تائب نہیں ہوتا' زانیہ یا مشرکہ عورت ہی سے نکاح کرے تاکہ کوئی بھلی عورت اس کی صحبت میں خراب نہ ہو۔ اسی طرح عورت زانیہ بحالت اجرائے زنا سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرے اور مسلمانوں پر یہ نکاح حرام ہے۔" (ترجمہ ثنائی) یہ ترجمہ بالکل غلط ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زانی زانیہ کا نکاح بحالت زنا خود کرا رہا ہے کہ وہ زنا کا سلسلہ بھی جاری

رکھیں اور نکاح بھی کرلیں اور یہ کہ زانی مشرکہ عورت سے بھی نکاح کر سکتا ہے' حالانکہ یہ بالاجماع حرام اور قرآن کی نص صریح "ولا تنکحوا المشرکات حتّٰی یومن" کے سراسر خلاف ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "مسلمانوں کو چاہییے کہ مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کریں جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔"

اگر کہا جائے کہ زانی اور زانیہ سے مراد اس آیت نور میں کافر مرد عورت ہیں' کیونکہ آیت کے آخری جملہ میں مسلمانوں پر یہ نکاح حرام ہے' پس مسلمان زانی' مشرکہ اور زانیہ سے نکاح نہ کرے۔

میں کہتا ہوں کہ پھر زانی اور مشرک اور زانیہ اور مشرکہ کا عطف ڈال کر لانا فضول ہو جاتا ہے۔ کلام الٰہی اس سے پاک ہے' کیونکہ زانی اور زانیہ سے مراد مشرک ہوئے تو پھر مشرک مشرکہ کا الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ دیگر یہ کہ یہ مسلک کہ مسلمان زانی کا نکاح مسلمان عورت سے خواہ زانیہ ہو یا عفیفہ حرام ہے' تو یہ عین ہمارا مسلک ہے۔ لیکن پھر ترجمہ بہرحال غلط ہو گا کہ لفظ زانی مطلق وارد ہے جو مسلمان زانی کو بھی شامل ہے تو پھر اس سے مشرکہ سے نکاح کا جواز لازم آتا ہے جو بالاجماع حرام ہے۔

بعض اس سے مراد وطی لیتے ہیں کہ زانی زانیہ یا مشرکہ سے وطی کرے گا اور مومنوں پر یہ وطی حرام ہے' یہ معنی بھی غلط ہے۔ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : وھذا لا یحل فی دین اللہ عزوجل مع انہ تفسیر کاذب بیقین۔ "یعنی یہ ترجمہ سراسر باطل ہے اور دین الٰہی ایسا حکم دینے سے پاک ہے۔"

علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ یہ ترجمہ ذکر کر کے فرماتے ہیں : وھذا مما ینبغی ان یصان عنہ القران۔ "یعنی یہ ترجمہ قرآن کی شان کے خلاف ہے۔"

شیخ الاسلام اپنے فتاویٰ جلد دوم' ص۔۱۱۴ میں لکھتے ہیں کہ : ھذا کلام منزہ عنہ کلام اللہ۔ "یعنی یہ ایسا مفہوم ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا کلام پاک ہے۔" مزید فرماتے ہیں : ان دعوی نسخ بھذہ الایۃ ضعیف جداً۔ "یعنی اس آیت سے زانی زانیہ کے نکاح کی حرمت کے نسخ کا دعویٰ نہایت ہی کمزور ہے' جو قابل التفات نہیں ہے۔"

تحفۃ الاحوذی جز رابع ص۔۱۵۳ میں ہے کہ جس شخص نے کسی عورت سے زنا کیا ہے' اس کے نکاح میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جائز کہتے ہیں اور ابن

عباس اور حضرت عمر اور ابن مسعود اور جابر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ یہ نکاح جائز نہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی کہتے ہیں۔ قال ابن مسعود اذا زنی الرجل بالمرأۃ ثم نکحھا بعد ذالک فھما زانیان ابدا۔ ''یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب کسی مرد نے کسی عورت سے زنا کیا پھر اس سے نکاح کر لیا تو دونوں ہمیشہ زانی رہیں گے۔''

میں کہتا ہوں کہ اختلاف تو اکثر مسائل میں ہے لیکن اختلافی امور میں یہ حکم ہے کہ صرف قرآن وحدیث پر دارومدار رکھا جائے اور اقوال سلف وخلف میں سے ان علماء کی (بطور تائید) بات لینی چاہیے جو ظاہر نصوص کے مطابق ہو' باقی کو متروک ومردود کر دینا چاہیے۔ اس مسئلہ میں مسلک امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح اور حق ہے کہ موافق نصوص اور مطابق غیرت اسلامی ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی غیور ہے کہ اس نے تمام فواحش ظاہرہ اور باطنہ حرام ٹھہرا کر ان کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سزا مقرر کر دی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بڑے غیور تھے' وہ کب زانی اور زانیہ کو اسلام میں نکاح کے ساتھ پناہ دے سکتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی جو غیرت میں سب سے بڑھے ہوئے تھے' ایسے خبیث نکاح کو کب جائز رکھ سکتے تھے۔ یہی ائمہ اہل تقویٰ کا حال ہے کہ انہوں نے بھی اس نکاح کو حرام قرار دیا' تو جن علماء کے اقوال ظاہر نصوص کے خلاف ہیں' وہ قابل التفات نہیں ہیں۔ ہمارے میاں نذیر حسین صاحب مرحوم بھی اپنے عہد کی مصلحت کے پیش نظر اکثر کتب فقہ کے مطابق فتوے دیتے رہے۔ فتاویٰ نذیریہ بھی جابجا کتب فقہ کی عبارتوں سے بھرا پڑا ہے۔ اسی وجہ سے علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری نے اس پر تعاقب کر کے ان کی اصلاح کی طرف توجہ دی ہے اور بعض جگہ وہ بھی خاموش رہے ہیں۔ فتاویٰ نذیریہ کی طرح فتاویٰ ثنائیہ بھی مسلک اہلحدیث کے موافق ہے مگر اس میں بھی بعض فتوے غلط ہیں۔ اہلحدیث کا نصب العین یہ ہے کہ کوئی اپنا عالم ہو یا غیر' اس کے بیان کردہ مسئلہ کی کتاب وسنت کی روشنی میں تحقیق کی جائے۔ محض حسن ظن کی بنا پر مکھی پر مکھی نہ ماری جائے' کیونکہ اس سے پھر وہی تقلید پلید دلوں میں داخل ہو جائے گی جو تحقیق کے لیے زہر ہے۔

زانی اور زانیہ کی خالص توبہ کا امتحان: فتاویٰ ثنائیہ جلد دوم میں اس مسئلہ پر علماء اہلحدیث کے متعدد فتوے درج ہیں۔ اکثر زانی وزانیہ کے نکاح کی ممانعت پر دال ہیں۔ چنانچہ خود حضرت مولانا فاضل امرتسری سردار اہلحدیث کا ایک فتویٰ ص۔۱۲۴ پر نقل کیا گیا ہے۔

اس سوال کے جواب میں کیا زانی کا اپنی مزنیہ کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے؟ یہ لکھا ہے کہ :
"توبہ خالص کریں اور کم سے کم ایک مہینہ علیحدہ رہیں پھر نکاح کر لیں تو جائز ہے۔ التائب من اللذنب کمن لا ذنب له۔ توبہ خالص سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔"

اس فتویٰ میں دو شرطوں سے نکاح جائز رکھا گیا ہے۔ ایک توبہ خالص' دوم ایک ماہ تک علیحدگی۔ یہ علیحدگی استبراء رحم کے لیے ہے کہ رحم ناپاک ہے۔ حیض سے وہ صاف ہو جائے گا اور توبہ سے گناہ معاف ہو گیا لیکن توبہ خالص کی شرط ہے کہ قرائن سے یہ ظاہر ہو جائے کہ اب یہ عورت پارسا ہو گئی ہے۔ آج کل زانی اور زانیہ محض نکاح کرانے کی غرض سے زبانی توبہ کر لیتے ہیں اور پھر اسی طرح زنا کے عادی رہتے ہیں۔ اس لیے خالص توبہ کا امتحان ضروری ہے۔ شیخ الاسلام نے اپنے فتاویٰ میں ابن عمر رضی اللہ عنہ اور امام احمد رحمہ اللہ سے یہ نقل کیا ہے کہ زانیہ کا امتحان اس طرح ہو کہ زانی اس کو زنا کی طرف بلا کر آزمائے۔ اگر وہ آمادہ ہو تو "توبہ کاذب" ہے اور اگر انکار کر کے خوف الٰہی ظاہر کرے تو "توبہ خالص" ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ والذین اشترطوا امتحانها قالوا لا يعرف صدق توبتها بمجرد القول۔ یعنی جو علماء زانی اور زانیہ کی توبہ کی بابت امتحان شرط کرتے ہیں' وہ یہ کہتے ہیں کہ ان بدکاروں کی زبانی توبہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس کا عملی ثبوت ہونا چاہیے کہ کچھ عرصہ تک ایک دوسرے سے الگ الگ ہو کر زنا کی علامت چھوڑ دیں اور نیک عملوں کی طرف راغب ہو کر عفیف اور پارسا بن جائیں۔

چنانچہ حضرت شیخ الاسلام فرماتے ہیں : فصار لقوله تعالٰى اذا جآء كم المؤمنات مهاجرات فامتحنوهن۔ "یعنی زانیہ عورت توبہ کرے تو اس کا معاملہ کفار کی ان عورتوں کی طرح ہوا جو ایمان لانے کے بعد ہجرت کر کے مسلمانوں میں آجائیں تو ان کا امتحان کر لو۔ اسی طرح زانی اور زانیہ کا بھی امتحان کرنا ضروری ہے۔"

پھر فرماتے ہیں : والمهاجر يتناول التائب قال النبى صلى الله عليه وسلم المهاجر من هجر ما نهى الله عنه والمهاجر من هجر السوء فهذه اذا دعت الها هجرت السوء امتحنت على ذالك۔ "یعنی مہاجر کا لفظ تائب کو بھی شامل ہے' کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مہاجر وہ ہے جو ان برے کاموں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے' پس اصل مہاجر وہی ہے جو برائی کو چھوڑ دے۔"

زانیہ عورت جب دعویٰ کرتی ہے کہ میں نے بدکاری چھوڑ دی ہے اور توبہ کرلی ہے تو اس بات پر اس کا امتحان کرنا چاہیے۔ جب وہ اس دعویٰ میں سچی ثابت ہو تو اس کا کسی عفیف وپاک دامن سے نکاح کیا جائے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب فاضل امرتسری کا فتویٰ اس لحاظ سے درست تھا لیکن تاہم اس پر متعاقب نے یہ تعاقب فرمایا کہ زانی چونکہ چاہتا ہے کہ اپنی ہی مزنیہ سے نکاح کرے' لہٰذا جب توبہ کرلیں' مومن ہو جائیں تو وہ آپس میں نکاح نہیں کر سکتے' کیونکہ قرآن میں ہے : وحرم ذالک علی المومنین فافهم۔ "یعنی مومنوں پر یہ مناکحت حرام ہے۔" پھر اس پر حدیث ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کی پیش کی ہے کہ اُس نے اپنی صدیقہ مزنیہ سے نکاح کرنا چاہا تو آیت سورہ نور نازل ہوئی۔ پھر یہ لکھتے ہیں کہ "یہی وجہ ہے کہ ہم نے قرآن وحدیث پر عمل چھوڑ دیا ہے اور ہم میں زنا پھیل گیا ہے۔ زانی ومزنیہ آپس میں زنا کرتے رہتے ہیں۔ جب انگشت نمائی شروع ہوتی ہے تو فوراً نکاح کر لیتے ہیں۔

اسلام نے زانی ومزنیہ پر بہ موجودگی چار گواہ رجم یا سو کوڑے سزا رکھی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو کم از کم ان کا آپس میں تعلق قطع کر دینا چاہیے اور یہی ان کی توبہ ہے اور توبہ کے بعد وہ مومن ہیں اور حرم ذالک علی المومنین کے مطابق وہ آپس میں نکاح نہیں کر سکتے۔ (فتاویٰ ثنائیہ جلد دوم' ص-۱۲۵)

میں کہتا ہوں کہ جب زانی اور زانیہ پر سو دروں کی سزا لگائی گئی یا سزا ناممکن ہوئی اور انہوں نے خالص توبہ کرلی اور ان کا تعلق منقطع ہوا' باہمی یارانہ نہ رہا تو نکاح بالاجماع جائز ہے۔ چنانچہ فتاویٰ ثنائیہ کے اسی صفحہ پر جناب حضرت مولانا نیک محمد صاحب محدث امرتسری کا فتویٰ درج ہے۔ وہ زانی وزانیہ حاملہ کے مسئلہ پر یہ جواب تحریر فرماتے ہیں : "امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ نکاح حرام ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس لیے کہ زانی کو حد لگانی واجب ہے۔ جب تک حد نہ لگائی جائے اور توبہ صحیح نہ ہو تب تک نکاح صحیح نہیں' الخ۔"

میں کہتا ہوں کہ مولانا کا یہ فتویٰ بالکل صحیح ہے۔ چنانچہ محلّی ابن حزم جز-۹' ص-۴۷۵ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے یہ ارشاد فرمایا : لقد هممت ان لا ادع احدا اصاب فاحشة فی الاسلام یتزوج محصنة۔ "یعنی میں نے یہ عزم کر رکھا ہے کہ جس شخص نے مسلمان ہو کر زنا کیا ہے اور پھر کسی عفیفہ وپاک دامن سے شادی کرتا

ہے تو میں اس کو سزا دیئے بغیر ہرگز نہ چھوڑوں گا۔" (یہ غیرت فاروقی تھی) اس پر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یاامیر المؤمنین! الشرک اعظم من ذالک فقد یقبل عنه اذا تاب۔ "یعنی اے امیرالمومنین! شرک' زنا سے زیادہ برا ہے' جب اس سے توبہ قابل قبول ہے تو زانی بھی جب خالص توبہ کر لے تو قبول کی جائے گی۔"

پھر ص۔۲۷۶ پر ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ آپ کے پاس ایک نہایت پریشان کن مقدمہ آیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ آپ ان کے بیانات سنیں۔ ایک شخص نے بیان کیا کہ میرے گھر میں ایک مہمان آیا تھا' اس نے میری بیٹی کے ساتھ زنا کیا ہے' اب کیا حکم ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے سینہ پر مارا اور کہا کہ تو عدالت میں کیوں آیا؟ کیا اپنی بیٹی کے گناہ پر پردہ نہیں ڈال سکتا تھا؟ تب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے جرم کی تصدیق فرما کر ان دونوں (زانی اور زانیہ) کو کوڑوں کی سزا لگا دی اور پھر دونوں کا نکاح کر دیا اور یہ حکم دیا کہ ان دونوں کو جلا وطن کر دو۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ "حد" گناہ کا کفارہ ہے۔ اس سے وہ پاک ہو گئے اور جلا وطن اس لیے کیا کہ ان کو مزید عبرت حاصل ہو جائے اور آئندہ زنا نہ کریں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ زانی اور زانیہ کا نکاح بغیر سزا شرعی یا خالص توبہ کے حرام ہے۔

جناب دیوبندی مفتی صاحب نے حاملہ بالزنا کا نکاح زانی سے جائز ہونے پر تین دلیلیں پیش کی ہیں۔ تینوں مخدوش اور دعوے سے غیر متعلق ہیں' کیونکہ ان میں حاملہ بالزنا کے نکاح کا ذکر تک نہیں ہے۔ ان کا جواب میرے ایک دوسرے مضمون میں جو اسی مضمون کا ایک حصہ ہے' دیا گیا ہے۔ وہ انشاء اللہ اگلے صفحات پر آرہا ہے اور اس کا عنوان ہے "حاملہ بالزنا کا نکاح حرام ہے۔"

یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مفتی دیوبندی نے جو حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی پہلی دلیل میں بیان کی ہے' اس سے دو وجہ سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ اول یہ کہ یہ روایت ضعیف ہے' جو ازروئے اصول حدیث احکام حلت وحرمت میں قابل بحث نہیں ہے۔

اللالی المصنوعه جلد دوم ص۔۱۷۳ میں ہے : "سئل عنه احمد فیما حکاه الحلال فقال لیس له اصل ولا یثبت عن النبی صلی الله علیه وسلم۔ "یعنی امام احمد

رحمۃ اللہ علیہ سے اس حدیث کی بابت دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔"

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے اور آخر میں یہ فرمایا ہے : ھٰذا الحدیث لیس بثابت وعبد الکریم لیس بالقوی۔ "یعنی یہ حدیث ثابت نہیں ہے اور اس کی سند میں جو راوی عبدالکریم نامی ہے' وہ حدیث میں قوی نہیں ہے۔"

مفتی صاحب دیوبندی کو پہلے اس حدیث کی سند بیان کرنی چاہیے تاکہ اس کی تنقید کی جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کی درائت مخدوش ہے' حدیث کے یہ الفاظ "لا تدفع ید لامس" کے کئی مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ یہ حدیث ملبہ النزاع میں نص نہیں ہے۔ بعض نے اس سے مراد جماع لیا ہے لیکن یہ مخدوش ہے اور حدیث "لا یدخل الجنۃ دیوث" کے خلاف ہے۔ اسی لیے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا : لم یکن لیامرہ بامساکھا وھی تفجر۔ "یعنی یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زانیہ عورت کو گھر میں رکھنے کا حکم دیں کہ وہ زنا کرتی رہے۔" ایسا غیور نبی کبھی اس طرح حکم نہیں دے سکتا۔

بعض نے کہا کہ اس سے مراد جماع نہیں ہے' ورنہ زانیہ عورت سے لعان کرنے کا حکم ہوتا یا سزا عائد کی جاتی بلکہ اس سے دواعی زنا مراد ہیں یعنی لوگوں سے میل جول رکھتی ہے اور اس طرح تلذذ حاصل کرتی ہے اور اس سے زنا کے واقع ہو جانے کا خطرہ ہے۔

سوم یہ کہ اس سے مراد سخاوت ہے۔ کسی کو دینے سے انکار نہیں کرتی۔ تعلیقات سلفیہ بر نسائی جلد دوم ص۔۶۴ میں ہے : ان الحدیث محتمل "کہ اس حدیث کے مطلب میں کئی احتمال ہیں۔" جب کئی احتمال ہوئے تو استدلال صحیح نہ رہا۔ چنانچہ مفتی دیوبندی نے خود ہی یہ لکھا ہے کہ "جب حدیث کے معنی میں کئی احتمال ہیں تو پھر یہ استدلال کے قابل نہیں رہی۔ (بحوالہ اخبار اہلحدیث ص۔۹' کالم۔۱ مطبوعہ ۲۱/ اکتوبر سنہ۔۱۹۶۶ء) مولانا!

ع آنچہ خود نہ پسندی دیگراں را پسند

باقی بحث دوسرے مضمون میں ہو گی' انشاء اللہ العزیز۔ فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔

عبدالقادر عارف الحصاری

اہلحدیث دہلی جلد۔۲۰' شمارہ۔۱۳'۱۴ مورخہ ۲۱/ دسمبر' ۷/ جنوری سنہ۔۱۹۶۷ء

زانی زانیہ کے نکاح کا کیا حکم ہے؟

سوال : کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا دریں مسئلہ کہ زانی زانیہ کا نکاح آپس میں یا کسی دوسرے غیر زانی غیر زانیہ سے درست ہے یا نہیں؟ آج اس دور فساد و شر میں زانی زانیہ کی مناکحت بکثرت ہو رہی ہے۔ کسی جگہ کوئی شخص کسی کنواری لڑکی کو اغواء کر کے لے جاتا ہے اور اس سے زنا کر کے پھر نکاح کر لیتا ہے اور کسی جگہ بیوہ عورتوں سے ناجائز تعلق پیدا کر کے پھر اس سے نکاح کر لیا جاتا ہے اور بعض منکوحہ عورت کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور اس سے زنا کرتے ہیں پھر اس کے خاوند کو کچھ پیسے دے کر طلاق لے لیتے ہیں اور پھر اس کو پاس رکھ کر عدت گزارتے ہیں اور پھر نکاح کر لیتے ہیں اور ملا مولویوں کی یہ عادت ہے کہ نکاح کے وقت ان سے توبہ کرا لیتے ہیں اور وہ نکاح کی غرض سے ظاہر میں توبہ کر لیتے ہیں اور عادت زناکاری کی رکھتے ہیں۔ اس کے متعلق قرآن وحدیث سے تحقیق کر کے یہ بتلایا جائے کہ یہ نکاح جائز ہے یا حرام ہے؟ بعض مولوی تو جائز کہتے ہیں اور لوگ دھڑا دھڑ نکاح کر رہے ہیں اور بعض حرام کہتے ہیں۔ صحیح فیصلہ کیا ہے؟

السائل : عبدالغفار راجپوت دوکاندار ساکن موضع پنج کوسی ریاست بہاولپور پنجاب

جواب : الجواب وھو الموفق للصواب۔ الحمد للّٰہ رب العالمین○ اما بعد فاقول وباللّٰہ التوفیق۔ واضح ہو کہ زانی زانیہ کا نکاح دو صورتوں میں عام طور پر رائج ہے۔ ایک یہ کہ زانی کسی عفیفہ عورت سے یا عفیف کسی زانیہ سے نکاح کرے۔ دوم یہ کہ زانی زانیہ کا آپس میں نکاح کیا جائے۔ اکثر علماء پہلی صورت سے تو منع کرتے ہیں اور دوسری صورت کو جائز کہتے ہیں اور بعض دونوں صورتوں کو حرام کہتے ہیں۔ میری تحقیق یہ ہے کہ نکاح دونوں صورتوں میں حرام ہے۔

چنانچہ تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مرد عورت کے نکاح میں دو قیدیں ذکر کی ہیں۔ مردوں کے حق میں فرمایا ہے : محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان۔ "نکاح کرنے والے ہوں، نہ زانی ہوں اور نہ خفیہ یارانہ رکھنے والے ہوں۔" عورتوں کے حق میں بھی اسی طرح فرمایا ہے : محصنٰت غیر مسافحات ولا متخذات اخدان (سورہ نساء، پارہ ۵) "پاک دامن ہوں، زناکار اور خفیہ دوستی رکھنے والیاں نہ ہوں۔"

یہ قیدیں حکم نکاح میں بمنزلہ شرط ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ سورہ نور کی تفسیر ص۔۳۲ میں فرماتے ہیں: واللّٰہ سبحانہ وتعالٰی شرط فی الرجال ان یکونوا محصنین غیر مسافحین۔ "یعنی اللہ تعالٰی نے مردوں کے بارے میں یہ شرط کی ہے کہ وہ عفیف ہوں، زانی نہ ہوں۔"

فتاویٰ جلد۔۲، ص۔۶۸ میں فرماتے ہیں: ففی ھاتین الایتین اشترط ان یکون الرجال محصنین غیر مسافحین۔ "یعنی اللہ تعالٰی نے ان آیتوں میں یہ شرط کی ہے کہ مرد نکاح کرنے والے پاک دامن ہوں، زانی اور بدکار نہ ہوں۔ یہی شرط عورتوں کے بارے میں ہے۔ فتاویٰ ص۔۶۰ میں فرمایا: والبغایا لسن محصنات فلم یبح نکاحھن۔ "زانیہ عورتیں پاک دامن نہیں ہیں، ان کا نکاح مباح نہیں ہے۔"

پھر لکھا ہے: والمسافح الزانی الذی یسفح ماء ہ مع ھذہ وھذہ وکذالک المسافحة والمتخلة الخدن الذی تکون لہ صدیقة یزنی بھا دون غیرہ فشرط فی الحل ان یکون الرجل غیر مسافح ولا متخذ خدن (الی قولہ) واللّٰہ انما اباح النکاح اذا کان الرجال محصنین غیر مسافحین۔ "یعنی مسافح زانی ہے جو ناجائز طور پر عورتوں سے تعلق پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح مسافحہ وہ زانیہ عورت ہے جو خفیہ دوستی رکھ کر بدکاری کا ارتکاب کرتی ہے اور زانی کی معشوقہ بنی ہوئی ہے۔ پس نکاح کے حلال ہونے میں شرط یہ ہے کہ مرد محصن ہو زانی نہ ہو جو خفیہ سازباز رکھتا ہو اور اللہ تعالٰی نے نکاح اسی شرط سے مباح کیا ہے۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ نکاح سے پہلے مرد عورت کا پاکباز ہونا ضروری ہے۔ جب تک ان کی پاکیزگی کا یقین نہ ہو جائے، نکاح کرنا مباح نہیں ہے۔ پس زانی زانیہ کا نکاح باطل ہے، کیونکہ نکاح کو شریعت نے ایک مقدس تعلق قرار دیا ہے جس سے غرض عصمت اور پاکیزگی ہے۔ زناکاری کی گندگی میں نکاح کیا جائے تو نکاح کے تقدس میں اور نسب کی صحت میں بڑا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے جو "ارحام" ماء فاسد (حرام نطفہ) سے پر ہو چکے ہیں۔ اب ان میں ماء حلال ڈالنا حلال اور حرام کو ملا کر فاسد کرنا ہے۔ اس سے نسب مخدوش ہو جاتا ہے۔ شیخ الاسلام نے اپنے فتاوے میں ان آیتوں کے تحت میں بڑی بسیط بحث کی ہے اور زانی زانیہ کے نکاح کی بڑی صراحت بیان کی ہے کہ یہ حرام ہے۔ من شاء البسط فلیرجع الیہ۔

(۴) قرآن مجید میں وارد ہے: الزانی لا ینکح الا زانیة او مشرکة والزانیة لا ینکحھا

الا زان او مشرک وحرم ذلک علی المومنین۔ "یعنی زانی زانیہ اور مشرکہ ہی سے نکاح کرے گا اور زانیہ سے زانی اور مشرک ہی نکاح کرے گا لیکن مومنوں پر یہ مناکحت (نکاح) حرام ہے۔" (سورہ نور)

تفسیر جامع البیان میں ہے : ھو خبر ای الغالب انہ لا یرغب الجنس الا الٰی مثلہ۔ "یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ عام عادت اور اکثر رواج یہ ہے کہ ہر جنس اپنی جیسی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے۔" زانی زانیہ اور مشرکہ عورت کی طرف ہی مائل ہوتا ہے لیکن مومنوں پر یہ نکاح حرام ہے۔

تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی ربع۔ ۴' ص۔ ۱۵۳ میں اس آیت پر پانچ قول لکھے ہیں۔ پھر لکھا ہے : قلت ھٰذا القول الخامس ھو الظاھر الراجع وبہ قال الامام احمد وغیرہ قال الحافظ ابن کثیر قال الامام احمد لا یصح العقد من الرجل العفیف علی المرأۃ البغی ما دامت کذٰلک حتّٰی تستاب فان تابت صح العقد علیھا والا فلا وکذالک لاٗ یصح تزویج المراۃ الحرۃ العفیفۃ بالرجل الفاجر المسافح حتّٰی یتوب توبۃ صحیحۃ لقولہ تعالٰی وحرم ذٰلک علی المؤمنین○ "یعنی پانچواں قول ظاہر آیت کے موافق اور راجح ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عفیف مرد کا زانیہ عورت سے اور عفیفہ پاک دامن عورت کا زانی مرد سے نکاح صحیح نہیں' جب تک پختہ طور پر سچی خالص توبہ نہ کرلیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ نکاح مومنوں پر حرام ہے۔"

نیز تحفۃ الاحوذی حوالہ مذکور میں یہ لکھا ہے : فیہ دلیل علی انہ لا یحل للرجل ان یتزوج بالزوانی ویدل علی ذلک الایۃ المذکورۃ فی الحدیث لان فی اٰخرھا وحرم ذٰلک علی المؤمنین فانہ صریح فی التحریم۔ "اس میں دلالت ہے اس مسئلہ پر کہ کسی مرد کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زانیہ عورتوں سے نکاح کرے جیسے اس پر آیت مذکورہ دلالت کرتی ہے جس کے آخر میں یہ ہے کہ مومنوں پر یہ نکاح حرام ہے' یہ حکم حرام کرنے میں صاف صریح ہے۔"

نیز تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی میں فتح البیان سے نقل کیا ہے کہ قد اختلف فی جواز تزوج الرجل بامراۃ قد زنٰی ھو بھا فقال الشافعی وابو حنیفۃ بجواز ذٰلک وروی عن ابن عباس

وعمر وابن مسعود وجابر انه لا يجوز قال ابن عباس اذا زنى الرجل بالمراة ثم نكحها بعد ذٰلک فهما زانيان ابدا وبه قال مالک انتهٰى "کہ جس مرد نے کسی عورت سے زنا کیا تو ان کے باہمی نکاح میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو جائز کہتے ہیں اور حضرات صحابہ کرام ابن عباس اور عمرِ فاروق اور ابن مسعود اور جابر رضی اللہ عنہم یہ کہتے ہیں کہ یہ نکاح جائز نہیں ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی مرد نے کسی عورت سے زنا کرکے پھر اس سے نکاح کرلیا تو وہ دونوں ہمیشہ کے لیے زانی رہیں گے۔ یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔" زاد المعاد میں علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی لکھا ہے۔

نیل الاوطار جلد۔۶' ص۔۱۴۵ میں لکھا ہے: قال ابن القيم واما نكاح الزانية فقد صرح الله بتحريمه في سورة النور واخبر ان من نكحها فهو زان او مشرک۔ "یعنی علامہ ابن القیم نے فرمایا کہ زانیہ کا نکاح حرام ہونے کی اللہ تعالیٰ نے سورہ نور میں صراحت فرمائی ہے کہ جو شخص زانیہ سے نکاح کرتا ہے' وہ زانی ہے یا مشرک ہے۔"

نیل الاوطار میں ہے کہ حكي عن الحسن البصری انه يحرم على الرجل نكاح من زنى بها واستدل بالاية۔ "امام حسن بصری تابعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ منقول ہے کہ وہ اس آیت سے استدلال کرکے اس مرد پر اس زانیہ عورت کا نکاح حرام کرتے ہیں جس نے اس سے زنا کیا ہے۔"

نیل الاوطار میں اس آیت پر لکھا ہے کہ فانه صريح في التحريم "کہ زانی زانیہ کا نکاح حرام کرنے میں یہ آیت صاف صریح ہے۔"

شیخ الاسلام سورہ نور ص۔۳۱ پر فرماتے ہیں: وذلک اخبر انه لا ينكح الا زانية او مشركة ثم قال تعالٰى وحرم ذٰلک على المؤمنين فعلم ان الايمان يمنع من ذلک ويزجر وان فاعله اما مشرک واما زان ليس من المومنين الذين يمنعهم ايمانهم من ذلک۔ "اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے حال سے یہ خبر دی ہے کہ زانی زانیہ یا مشرکہ ہی سے نکاح کرے گا پھر فرمایا کہ مومنوں پر یہ نکاح حرام کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان اس نکاح سے روکتا اور جھڑکتا ہے کہ یہ نکاح کرنے والا یا مشرک ہو گا یا زانی ہو گا۔ ان ایمانداروں میں سے نہیں ہو گا جن کو ایمان روکتا ہے۔"

پھر ص۔۳۳ پر لکھا ہے کہ فمن نكح زانية فهو زان اى تزوجها ومن نكحت زانيا

فھی زانیۃ ای تزوجتہ فان کثیرا من الزناۃ قصروا انفسھم علی الزوانی فتکون المراۃ خدنا وخلیلا لہ لا یاتی غیرھا فالرجل اذا کان زانیا لا یعف امراتہ واذا لم یعفھا تشوقت ھی الی غیرہ فزنت بہ کما ھو الغالب علی نساء الزوانی' انتھی۔ "یعنی جس شخص نے زانیہ عورت سے نکاح کیا' وہ زانی ہے اور جس عورت نے زانی مرد سے نکاح کیا وہ زانیہ ہے کیونکہ بہت سے زانی مرد اپنے نفسوں کو زانیہ عورتوں پر ہی مرکوز رکھتے ہیں۔ پس وہ زانیہ عورت اس زانی مرد کی معشوقہ اور محبوبہ بن جاتی ہے جس کے سبب سے وہ غیر عورت کی طرف نہیں جا سکتا۔ جب وہ خود ہی زانیہ پسند ہے تو اپنی عورت کو پاک دامن نہیں بنا سکتا۔ جب وہ پاک دامن نہ رہے گی تو اپنی عادت کے مطابق وہ غیر مرد کی طرف شوق کرے گی۔ اکثر زانیہ عورتوں کی حالت اسی طرح ہوتی ہے۔"

شیخ الاسلام نے فتاویٰ میں مزید تشریح فرمائی ہے :قد عرف بالعادات والتجارب ان المراۃ اذا کانت لھا ارادۃ فی غیر الزوج احتالت الی ذلک بطرق کثیرۃ وتخفی علی الزوج وربما افسدت عقل الزوج بما تطعمہ وربما سحرتہ ایضا وھذا کثیر موجود (الی اخر قول) فلا یبقی محصنالھا قواما علیھا بل تبقی ھی الحاکمۃ والحکایات فی ھذا الباب کثیرۃ۔ "یعنی عام عادتوں اور تجربوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا ارادہ غیر مرد کی جانب جب ہو جائے تو کئی طرح کے مکر' فریب اور حیلہ سازیاں کرتی ہے جو خاوند سے مخفی ہوتی ہیں بلکہ خاوند کی عقل کو مسحور کر کے خراب کر دیتی ہے اور زمانہ میں ایسے حالات اور واقعات بہت گزر رہے ہیں کہ مرد عورتوں کے محافظ نہیں رہے اور خاوندوں کی بیویوں پر حکومت نہیں رہی بلکہ عورتیں مردوں پر حاکم ہو گئی ہیں اور اپنے اختیارات سے جو چاہتی ہیں' کرتی ہیں۔ مرد ان کے مسحور ہو کر مجبور ہو جاتے ہیں اور ان کے فعلوں پر راضی ہو جاتے ہیں۔

تفسیر کے ص۔ ۳۳ پر لکھا ہے کہ ومن رضی الزنا کان بمنزلۃ الزانی فان اصل الفعل ھو الارادۃ "یعنی جب راضی ہوئے تو وہ زانی قرار پائے' کیونکہ اصل فعل ارادہ اور رضاء کا نام ہے۔" جیسے حدیث میں ہے کہ کسی ناجائز فعل پر راضی ہونے والا مثل فاعل کے ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ زانی زانیہ سے نکاح کرنے والا تو سرے سے محصن ہے ہی نہیں اور جو زانی نہیں لیکن زانیہ سے باوجود علم کے نکاح کرتا ہے تو وہ بھی زانی قرار پاتا ہے' کیونکہ عورت اس کو اپنا زیر اثر کر کے مسحور کر لیتی ہے اور اس پر حکمران ہو جاتی ہے اور مرد کو

اس کی آوارگی پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ پس وہ بھی زانی ہو جاتا ہے' اس لیے شریعت نے محصن کی قید لگائی کہ زانی زانیہ کا نکاح باہم عفیف سے حرام ہے۔

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ مجدد قرن خامس محلّٰی جلد۔۹' ص۔۴۷۴ میں فرماتے ہیں : ولا یحل للزانیة ان تنکح احدا لا زانیا ولا عفیفا حتّٰی تتوب فاذا تابت حل لها الزوج من عفیف حینئذ ولا یحل للزانی المسلم ان یتزوج مسلمة لا زانیة ولا عفیفة حتّٰی یتوب فاذا تاب حل له نکاح العفیفة المسلمة حینئذ۔ "یعنی زانیہ عورت کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ کسی شخص سے نکاح کرے' نہ زانی مرد سے نکاح کر سکتی ہے اور نہ عفیف سے جب تک کہ خالص توبہ نہ کرے۔ اسی طرح زانی مسلمان کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ کسی عورت سے نکاح کرے' نہ زانیہ عورت سے نہ عفیفہ سے جب تک کہ وہ بھی پکی توبہ نہ کرے۔"

پھر ص۔۴۷۶ پر فرماتے ہیں : والحجة لقولنا هو قول اللّٰه عزوجل الزانی لا ینکح الا زانیة۔ "یعنی ہمارے دعویٰ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ آیت ہے الزانی لا ینکح الا زانیة کہ زانیہ سے وہی نکاح کرے گا جو زانی ہے۔" اور مومنوں پر یہ نکاح حرام ہے۔ الغرض آیت الزانی سے علماء محدثین اور سلف صالحین نے زانی زانیہ کا نکاح حرام ثابت کیا ہے۔

(۳) منتقی الاخبار میں باب منعقد کیا گیا ہے : باب نکاح الزانی والزانیة "کہ یہ باب زانی زانیہ کے نکاح کے بارے میں ہے۔" پھر وہ دلائل ذکر کئے ہیں کہ جن سے ان کا نکاح حرام ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ تین روایتیں ذکر کی ہیں۔

اول حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زانی مجلود اپنے جیسے کسی سے ہی نکاح کرے گا۔ (ابوداؤد' احمد)

دوسری حدیث عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی' کہ مسلمانوں میں سے ایک مرد نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اذن مانگا کہ وہ ایک عورت ام مہزول نامی سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ وہ زانیہ ہے اور اس نے شرط کی ہے کہ تیرا خرچ بھی میرے ذمہ ہو گا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو آیت والزانیة لا ینکحها الا زان پڑھ کر سنائی۔ (مسند احمد)

تیسری حدیث عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ کی ہے کہ مرثد بن ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ مکہ شریف

سے قیدی مسلمانوں کو اٹھا کر لایا کرتے تھے مکہ میں ایک عورت زانیہ تھی جس کو عناق کے نام سے پکارا جاتا تھا' وہ ان کی محبوبہ رہ چکی تھی تو اس کے متعلق مرثد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا کہ کیا میں اس عورت سے نکاح کر سکتا ہوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے تو یہ آیت نازل ہوئی والزانیة لا ینکحھا الا زان او مشرک تب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر فرمایا کہ تم اس سے نکاح مت کرو اور آیت مذکورہ پڑھ کر سنائی۔ (ابوداؤد' نسائی' ترمذی)

میں کہتا ہوں کہ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ احادیث بھی ذکر کی ہیں جو منتقی سے نقل ہو چکی ہیں اور مزید دلائل بھی بیان کئے ہیں۔ صفحہ ۴۷۷ پر فرماتے ہیں : عن رافع ابن خدیج ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال فی حدیث ومھر البغی خبیث۔ "یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زانیہ کا مہر پلید ہے۔ قال ابو محمد لا یسمّٰی فی الدیانة ولا فی اللغة اُجرة الزنا مھرا انما المھر فی الزواج فاذا حرم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مھرھا فقد حرم زواجھا اذلا بد فی الزواج من مھر ضرورة ھذا لا اشکال فیہ۔ "یعنی دینداری' محاورہ اور عام عربی بولی میں زنا کی مزدوری کو مہر نہیں کہا جاتا۔ مہر تو وہ ہوتا ہے جو نکاح میں مقرر کیا جاتا ہے۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زانیہ کا مہر حرام کر دیا تو نکاح بھی حرام کر دیا کیونکہ مہر نکاح ہی کا عوض ہوتا ہے جس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔"

عن علی ابن ابی طالب رضی اللّٰہ عنہ ان رجلا اتی الیہ فقال ان لی ابنة عم اھواھا وقد کنت نلت منھا فقال لہ علی ان کان شیئا باطنا یعنی الجماع فلا وان کان شیئا ظاھرا یعنی القبلة فلا باس۔ "یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میرے چچا کی بیٹی تھی جس پر میں فریفتہ ہوا اور اس پر کامیاب ہوا (کیا اس سے نکاح کر سکتا ہوں؟) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر جماع کر لیا ہے تو نکاح جائز نہیں ہے اور اگر صرف بوس وکنار کیا ہے تو نکاح میں کوئی ڈر نہیں ہے۔"

عن ابن مسعود فی الذی یتزوج المراۃ بعد ان زنٰی بھا قال ابن مسعود ولا یزالان زانیین۔ "ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی عورت سے زنا کر کے پھر اس سے نکاح کر لیا تو وہ دونوں مرد عورت ہمیشہ زانی رہیں گے۔"

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ ایسے مرد عورت ہمیشہ زانی رہیں

گے۔ پھر حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے : فی الرجل یفجر بالمرأۃ ثم یرید نکاحھا قال لا یزالان زانیین ابدا۔ ”اگر کسی مرد نے کسی عورت سے زنا کیا اور پھر اس سے نکاح کا ارادہ کرتا ہے تو کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ وہ دونوں ہمیشہ زانی رہیں گے۔“

اسی طرح جابر بن عبداللہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اگر خالص توبہ کر کے اپنی اصلاح کرلیں تب درست ہے ورنہ نہیں۔ ملاحظہ ہو (محلّی ابن حزم ص۔۴۷۵) شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ جلد ثانی ص۔۴۰ میں فرماتے ہیں کہ نکاح الزانیۃ حرام حتٰی تتوب سواء کان زنٰی بھا ھو او غیرہ ھذا ھو الصواب بلا ریب وھو مذھب طائفۃ من السلف والخلف۔ ”کہ زانیہ کا نکاح حرام ہے جب تک کہ خالص توبہ نہ کرے، خواہ وہ اس شخص سے نکاح کرے جس سے زنا کیا ہے یا غیر سے کرے بہرصورت حرام ہے۔ یہی مذہب بلاشبہ صحیح اور درست ہے اور یہی مذہب سلف اور خلف کے ایک گروہ کا ہے۔“

مجمع الزوائد جلد۔۴، ص۔۸۶ میں ہے کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو روزوں اور دو قسم کی نمازوں اور دو قسم کے لباسوں اور دو قسم کے کھانوں اور دو قسم کے نکاحوں اور دو قسم کی بیعوں سے منع فرمایا (پھر تفصیل کرتے ہوئے آخر میں ہے : واما النکاحان فنکاح البغی ونکاح علی الخالۃ والعمۃ رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجالہ رجال الصحیح۔ کہ دو نکاح یہ ہیں، ایک زانیہ کا نکاح اور دوسرا کسی عورت کو اس کی خالہ یا پھوپھی پر نکاح کرنا یعنی یہ دونوں نکاح منع ہیں اور ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کردیا ہے۔ یہ نہی تحریمی ہے، پس زانیہ کا نکاح حرام ہے۔

المغنی والشرح الکبیر جلد۔۷، ص۔۵۱۵ میں ہے : واذا زنت المراۃ لم یحل لمن یعلم ذٰلک نکاحھا۔ ”یعنی زانیہ عورت کا نکاح حرام ہے، یہ اس کے لیے ہے جو جانتا ہے کہ یہ زانیہ ہے۔“

میں کہتا ہوں کہ اگر نکاح سے پہلے نہ جانتا ہو لیکن بعد میں اس کو علم ہوگیا تو پھر نکاح فسخ کردیا جائے گا۔ چنانچہ منتقی کے ”باب ما یذکر فی رد المنکوحۃ بالعیب“ کے تحت عیوب کی وجہ سے فسخ نکاح کی تفصیل ہے۔ اگر دخول سے قبل اور نکاح کے بعد زنا کیا گیا تب بھی نکاح فسخ کیا جائے گا۔ چنانچہ محلّی جلد۔۹، ص۔۴۷۸ میں حضرت علی اور حضرت جابر

رضی اللہ عنہما کا فتویٰ بالسناد موجود ہے کہ کنوارا مرد یا کنواری عورت زنا کر لیں قبل دخول تو ان میں تفریق کر دی جائے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ شیخ الاسلام نے اپنے فتاویٰ میں نقل کیا ہے کہ کسی شخص کا نکاح کسی عورت سے تھا' اس نے ابھی دخول نہ کیا تھا کہ کسی دوسری غیر منکوحہ عورت سے زنا کر لیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی بیوی سے اس کا نکاح توڑ دیا یعنی بلا طلاق تفریق کر دی۔

خلاصہ تمام مضمون کا یہ ہے کہ زانی زانیہ کا نکاح حرام ہے' خواہ اس سے زنا کیا ہو یا غیر سے' بہرصورت نکاح حرام ہے۔ اگرچہ اس میں علماء اور ائمہ کا اختلاف ہے لیکن صواب اور صحیح مذہب جس میں احتیاط اور تقویٰ یہی ہے کہ نکاح صحیح نہیں ہے۔ ہاں اگر توبہ خالص کر جائیں تو نکاح بالاتفاق صحیح ہو جاتا ہے مگر اس کے لیے دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ استبراء رحم کیا جائے اور زانیہ عورت کو زانی مرد سے یا دوسرے سے الگ رکھا جائے۔ دوم توبہ کروا کر یا ممکن ہو تو حد یا کم از کم تعزیر لگا کر ان کا امتحان کیا جائے کہ وہ زنا کی عادت چھوڑ کر عفت اختیار کر چکے ہیں یا نہیں' کیونکہ اکثر نکاح کرانے کی غرض سے اور اپنی بدنامی مٹانے کو بظاہر توبہ کر جاتے ہیں لیکن حقیقت میں ویسے ہی زنا کے عادی رہتے ہیں۔ اس لیے شیخ الاسلام نے اپنے فتاویٰ میں زانی زانیہ کا امتحان لینا ضروری قرار دیا ہے' کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما نے زانی زانیہ کے نکاح کے لیے یہ شرط ذکر کی ہے کہ ان تابا واصلحا "کہ اگر دونوں توبہ کر جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں تب نکاح کریں۔"

فتاویٰ جلد۔۲' ص۔۶۹ میں ہے : فقال ابن عمر واحمد ابن حنبل یراودھا علی نفسھا فان اجابتہ کما کانت تجیبہ لم تتبْ "یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ زانی زانیہ کو (یا دوسرا شخص) دعوت زنا دے کر دیکھے۔ اگر وہ قبول کرے تو توبہ صحیح نہیں ہے۔ پس ان کی زبانی بات کا اعتبار نہیں جب تک کہ امتحان نہ لیا جائے۔ اگر زانیہ عورت کو زنا کا حمل قرار پا جائے تو پھر استبراء رحم وضع حمل سے ہو گا' اس سے قبل نکاح جائز نہیں۔ والسلام

عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری

صحیفہ اہلحدیث کراچی جلد۔۳۴' شمارہ نمبر۱۱' ۱۲' ۱۳ بابت یکم و ۱۵/ جمادی الثانی و یکم رجب سنہ۔ ۱۳۷۳ھ

مذہبی زناکاری

عہد حاضرہ میں معاشرہ کی خرابی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جس کا انسداد سوائے سیاسی قوت کے کسی طرح نہیں ہو سکتا مگر ہماری حکومت اس طرف پوری توجہ نہیں دیتی۔ ان خرابیوں میں بڑی خرابی زناکاری کی ہے۔

ایک زناکاری تو وہ ہے جو ذرا آنکھ بچا کر خفیہ کی جاتی ہے؟ یہ اگرچہ بہت پھیل رہی ہے لیکن اس کو عام طور پر گناہ اور عیب سمجھا جاتا ہے' سوائے دہریہ کے' کوئی مذہبی شخص شرعاً یا اخلاقاً اس کو جائز یا اچھا نہیں سمجھتا ہے۔ ہاں بوجہ طمع نفسانی جس قوم نے اس کو اپنا پیشہ اور ذریعہ معاش بنا رکھا ہے' ان کی فطرت چونکہ مسخ ہو چکی ہے' اس لیے وہ اس کو جائز کہتے بلکہ بڑا فخر سمجھ کر کرتے ہیں اور جس قدر زناکار' بدکار ان کے پاس جائیں وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور اس پر تعجب اور حیرت یہ ہے کہ وہ اسلام کے مدعی ہیں' حالانکہ اسلام نے زناکاری کو سخت جرم قرار دے کر اس پر سنگین سزا مقرر کی ہے کہ اگر کنوارا مرد یا کنواری عورت زنا کرے تو اس کو سو درے مار کر جلا وطن کیا جائے اور اگر شادی شدہ زنا کرے تو اس کو سنگسار کر کے بالکل ختم کر دیا جائے۔

دوسری مذہبی زناکاری ہے' جس کو بعض لوگ جائز اور حلال تصور کر رہے ہیں۔ اگرچہ وہ مذہب اسلام میں زناکاری ہے مثلاً آریہ میں نیوگ کا مسئلہ ہے کہ جب کوئی شخص دائمی مریض ہو کہ عورت سے ملاپ نہ کر سکتا ہو' وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہا ہو یا ضعیف العمر ہو کر لاولد ہو گیا ہو تو وہ اپنی بیوی کو یہ کہہ دے گا کہ کسی جوان شخص سے تعلق پیدا کر کے ملاپ کیا کر تاکہ تیرے ہاں کوئی بچہ پیدا ہو جائے اور میری طرف منسوب ہو کر وہ میری نسل قائم کرے اور جائیداد کا مالک ہو جائے۔ یہ نیوگ ہے' یہ آریہ دھرم کا مشہور مسئلہ ہے اور لوگ اس پر عمل درآمد کرتے ہیں' یہ مذہبی زناکاری ہے۔

اسی طرح مدعیان اسلام غصہ میں آکر دیوانے ہو جاتے ہیں اور جوش میں آکر اپنی بیوی کو ایک ہی بار تین طلاقیں دے دیتے ہیں اور وہ حنفی مذہب رکھتے ہوں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عورت ہم پر قطعاً حرام ہو گئی ہے۔ پھر وہ اپنے مفتیوں کی طرف دوڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غصہ میں آکر ہم نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں ایک ہی مجلس میں اکٹھی دے دی ہیں' کیا وہ

کسی صورت سے ہم پر حلال ہو سکتی ہے؟ کیونکہ طلاق دینے والا اس عورت مطلقہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا یا اس وجہ سے کہ دوسری شادی کرنا مشکل ہے یا اس وجہ سے کہ وہ صاحب اولاد ہے۔ اگر عورت کو گھر سے نکال دے تو خانہ خراب ہو کر اسی کے سر پر اولاد کی مصیبت پڑ جاتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے مفتیوں سے اس حرام شدہ عورت کو حلال بنانے کی تجویزیں دریافت کرتا ہے۔ تب حنفی مفتی صاحبان اس کو یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ اس کا حلالہ نکالو یعنی اس طلاق کی عدت گزار کر کسی معتبر شخص سے اس کا نکاح کرا دو اور اس سے عہد لے لو کہ اس سے جماع کر کے اس کو طلاق دے دے۔ جب وہ اس عورت سے صحبت کر کے طلاق دے دے تو پھر اس طلاق کی عدت گزار کر تم اس عورت سے دوبارہ نکاح کر لو۔ یہ حلالہ ہے' جس سے حرام عورت حلال ہو جاتی ہے۔ یہ مذہبی زناکاری ہے جو شرعاً حرام ہے۔

حدیث میں نکاح حلالہ کرنے اور کرانے والے پر لعنت آئی ہے اور محلل کو سانڈ مستعار قرار دیا گیا ہے۔ اس نکاح سے نہ محلل پر وہ عورت حلال ہوتی ہے اور نہ محلل لہ کے لیے بلکہ بدستور حرام رہتی ہے اور وہ ہمیشہ زنا کرتے رہتے ہیں اور یہ زناکاری بعض مقلدین میں جاری ہے جس سے خوف پیدا نہیں ہوتا بلکہ فقہ کے فتووں میں اس کو کارثواب تصور کیا گیا ہے۔ نعوذ باللہ من ھذا المذھب۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت کہلاتے ہیں' حالانکہ سنت اور جماعت صحابہ میں اس حرام نکاح کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔

تیسری مذہبی زناکاری بذریعہ متعہ ہو رہی ہے جو رافضی اور شیعہ مذہب میں جاری ہے اور اس کو بڑی عبادت سمجھا جاتا ہے۔ نکاح متعہ یہ ہے کہ اپنی شہوت رانی اور خواہش کو پورا کرنے کے لیے کسی پسندیدہ عورت سے خاص معینہ مدت تک عقد متعہ کرنا اور اس پر اجرت ٹھہرا لینا اور مدت مقررہ پوری ہونے پر اس عورت کو چھوڑ دینا اور اس کی اُجرت ادا کرنا' اس کا نام متعہ ہے۔ ابتداء اسلام میں عند الضرورت اس کو جائز رکھ کر پھر قیامت تک اس کو قطعاً حرام کر دیا گیا۔ اب نکاح متعہ کرنا عین زناکاری ہے اور یہ مذہبی زناکاری شیعہ فرقے میں جاری ہے اور اس کو بہترین عبادت قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ ان کی بعض کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ ایک بار متعہ کر لے تو اس کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے درجے کے برابر درجہ ملتا ہے اور جو دو بار کرے تو اس کو درجہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا

سا ملتا ہے اور جو تین بار متعہ کرے اس کو درجہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسا ملتا ہے اور جو چار بار متعہ کرے' اس کا درجہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں ثواب بیان کرنے والوں نے کچھ کمی رکھی ہے۔ اگر وہ یہ کہہ دیتا کہ جو پانچ بار متعہ کرے وہ خدائی درجہ کو پہنچ جاتا ہے تو کون اس کا منہ یا قلم پکڑ سکتا تھا؟ مگر یہ سب شریعت محمدیہ پر بہتان اور جھوٹا الزام ہے۔ متعہ حرام ہے اور اس کے جائز ہونے کی کوئی دلیل شرعی موجود نہیں ہے بلکہ بعض کتابوں میں متعہ دوریہ بھی لکھا ہے کہ ایک عورت سے ایک پارٹی متعہ کرلیتی ہے اور ان میں سے ہرایک اپنی اپنی باری مقرر کرلیتا ہے اور ہرایک اپنی باری میں اس عورت کی طرف دورہ کر کے جماع کرتا ہے۔ اسی طرح متعہ کی کئی صورتیں ہیں اور مدت سب میں معین ہوتی ہے اور مدت کی کوئی حد نہیں ہے۔ ایک عورت ایک سال میں کئی بار' ایک مہینہ میں کئی بار' ایک ہفتہ میں کئی بار بلکہ ایک دن رات میں کئی بار متعہ کرسکتی ہے۔ اب یہ ایک پیشہ بن گیا ہے۔ عورتیں متعہ کے ذریعے زنا کاری کر کے شہروں میں بہت روپیہ کما رہی ہیں' مگر اسلام میں یہ زناکاری اور بدترین جرم ہے مگر فرقہ شیعہ میں اس کو عبادت قرار دیا گیا ہے جیسے ہندو دین کے ایک فرقے میں فرج کی پوجا عبادت سمجھی گئی ہے۔

چوتھی مذہبی زناکاری یہ ہے کہ پیر اپنی مریدنی سے خفیہ تن بخشی کرا کر نکاح تصور کرلیتا ہے اور اس سے جماع کرلیتا ہے پھراس سے بہت سے پیر پیدا ہونے لگتے ہیں جو زنا کی پیداوار ہو کر یہ ولد الزنا یہی کام مریدوں میں کرتے رہتے ہیں اور زنا سے یہ پیدا شدہ اولاد ان پیروں کی بڑی کرامات تصور کی جاتی ہے۔

پانچویں مذہبی زناکاری یہ ہے کہ بعض لوگ کنواری یا بیوہ عورتوں سے خفیہ یارانہ قائم کر کے زناکاری کرتے رہتے ہیں اور پھر اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ جب وہ حاملہ ہو جاتی ہے تو اس سے نکاح کرلیتے ہیں۔ زانی زانیہ کا اور حاملہ بالزنا کا نکاح بروئے کتاب وسنت حرام ہے جس پر راقم الحروف نے اخبار اہلحدیث دہلی میں بڑی مفصل بحث کی ہے۔[1] کئی ایک ملا مولوی اس کا شکار ہو رہے ہیں اور اس کو جائز قرار دیتے ہیں' یہ حرام کاری اور مذہبی زناکاری ہے جس سے ہر مسلمان کو بچنا واجب ہے۔ اسلام میں ایسے زناکاروں کے لیے سخت سزا

---

(1) آئندہ صفحات میں بعنوان "نکاح حاملہ بالزنا کی تحقیق" آرہا ہے۔ (خلیل)

مقرر ہے اور ان کو جلا وطن کرنے کا حکم ہے اور عہد حاضر کے مولوی ایسے بدکاروں کے نکاح پڑھا کر لوگوں کو زناکاری اور اغوا کرنے پر دلیر کر رہے ہیں۔

چھٹی زناکاری مذہبی طور پر نکاح شغار کی جاری ہے۔ یہ نکاح تبادلہ وٹہ کا نام ہے کہ ایک شخص اپنی دختر دے کر اپنے لڑکے کے لیے کسی کی لڑکی نکاح میں لیتا ہے۔ اس میں ایک لڑکی دوسرے کے عوض اور وٹہ میں دینی شرط ہوتی ہے' یہ بھی حرام ہے اور زناکاری ہے۔ حدیث میں آیا ہے: لا شغار فی الاسلام "کہ اسلام میں نکاح وٹہ کا وجود نہیں۔"

اس لیے ایسا نکاح نہ عہد نبوی میں مسلمانوں نے کیا اور نہ عہد صحابہ میں کسی نے کیا' صرف عہد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں ایک مناکحت قریشی قوم کے دو قبیلوں بنو ہاشم اور بنو امیہ میں ہوئی تھی اور انہوں نے ہر دو طرف سے لڑکیوں کے مہر بھی مقرر کئے تھے' جس کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حرام قرار دے کر فریقین میں تفریق کرا دی کہ نکاح منعقد نہ سمجھا گیا۔ لیکن اس بد رسم کا آج کل بڑا رواج ہے۔ نکاح وٹہ کثرت سے ہو رہا ہے اور مذہبی ملا' مولوی اس کو جائز بتا کر نکاح پڑھا رہے ہیں جو صریح حرام اور زناکاری کا باعث ہے۔

چنانچہ اخبار تنظیم لاہور (۱) میں اس نکاح پر مفصل بحث کرتے ہوئے علماء اکابر کے فتوے درج کئے گئے ہیں اور اس موضوع پر ایک رسالہ بنام فیصلہ علماء ابرار در حرمت نکاح شغار لکھ کر شائع کیا گیا ہے' جس میں اس نکاح کی حرمت ثابت کر کے اس کو زناکاری قرار دیا گیا ہے اور آخر میں یہ چیلنج دیا گیا ہے کہ جو شخص اس نکاح کا ثبوت کسی دلیل شرعی سے دے کر اس کا عہد نبوی اور عہد صحابہ کرام میں ہونا ثابت کر دے تو اس کو ایک سو روپیہ انعام دیا جائے گا۔ اس انعام لینے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی کیونکہ شرائط مرقومہ در چیلنج کے مطابق کسی کے پاس ثبوت نہ تھا لیکن قوم اوڈ کا ایک بہت بوسیدہ مقامی فیصلہ جمعیت میانوالی قوم قریشی کے ہاتھ آگیا۔ انہوں نے اس فیصلہ اور بعض ناعاقبت اندیش مفتیوں کی تحریروں کا جوڑ میل کر کے ایک رسالہ بنام سبیل الرشاد لکھ مارا' جس طرح مولانا رشید احمد گنگوہی دیوبندی نے اسی نام سے ایک رسالہ تقلید شخصی کے ثبوت میں لکھ کر شائع کیا تھا اور اس میں تقلید شخصی مروجہ کو آسمانی حکم قرار دے کر لوگوں کو گمراہ کیا۔ ایسے ہی جمعیت میانوالی نے وٹہ مروجہ کو آسمانی حکم قرار دے کر اس کو سبیل الرشاد اور صراط مستقیم بتایا اور رسم مردودہ کی

---

(۱) بعنوان "زانی زانیہ کے نکاح کا حکم" (خلیل)

تائید کی، دونوں رسالے ضلالت اور علمی فریب کاری پر مبنی ہیں۔

جمعیت میانوالی نے بندہ سے انعام چیلنج کا شوق ظاہر کیا تو راقم الحروف نے بذریعہ ایک پمفلٹ ان کو ایسا دندان شکن جواب دیا کہ وہ کھسیانی بلی کی طرح کھمبہ نوچنے میں مصروف ہو گئے۔ اب اخبار تنظیم میں راقم السطور نے .ٹہ مروجہ کی تردید سدید کرتے ہوءِ رسالہ سبیل الرشاد کے اکابر مفتیوں کا اپنے فتووں سے رجوع کرنا ثابت کر دیا جس سے جمعیت میانوالی کا قلعہ شغار مسمار ہو گیا، فللّٰہ الحمد۔

اب بندہ راقم الحروف تمام آنکحہ محرمہ کے قائلین کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ شرع میں صرف ایک ہی نکاح مشروع اور حلال رکھا گیا ہے، اس کے ماسوا باقی مروجہ آنکحہ سب حرام ہیں اور موجب زناکاری ہیں اور وہ نکاح بخاری شریف میں حسب بیان حضرت عائشہ صدیقہ ام المومنین رضی اللہ عنہا بایں تعریف درج ہے : نکاح الناس الیوم یخطب الرجل الی الرجل ولیتہ او ابنتہ فیصدقھا ثم ینکحھا۔ "یعنی نکاح لوگوں کا آج کے دن یہ ہے کہ ایک مرد دوسرے مرد کو اس کی رشتہ دار عورت یا اس کی بیٹی سے نکاح کا پیغام دیتا ہے اور وہ مہرمال ٹھہرا کر اس سے نکاح کر دیتا ہے۔"

جاہلیت کے بعض نکاحوں کا ذکر کر کے آخر میں بطور کلیہ کے یہ ارشاد فرمایا : فلما بعث محمد صلی اللہ علیہ وسلم ھدم نکاح الجاھلیۃ کلہ الا نکاح الناس الیوم۔ "یعنی جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کے تمام نکاح بند کر دیئے اور ان کو مسلمانوں سے مٹا دیا اور صرف ایک نکاح باقی رکھا جو لوگوں میں آج مروج ہے۔" (اور وہ اوپر ذکر ہوا)

میں کہتا ہوں کہ یہی نکاح عہد نبوی سے آج تک معمول بہ چلا آرہا ہے اور اسی میں عزت اور شرافت اور تہذیب پائی جاتی ہے اور باقی سب آنکحہ مردودہ میں خباثت اور رذالت ہے۔ نکاح متعہ اور نکاح .ٹہ، نکاح حلالہ سب حرام کر دیئے گئے ہیں۔ نکاح .ٹہ قطعاً حرام ہے لیکن اس کا عام رواج ہے اور جس حرام کا عام رواج ہو جائے، وہ حرام اور گناہ محسوس نہیں ہوا کرتا۔ جیسے بنک کا سود عام رائج ہے جس کو عوام بلکہ بعض خواص بھی حرام نہیں سمجھتے، حالانکہ یہ قطعاً حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ ایسا ہی نکاح تبادلہ کو سمجھ لیں کہ یہ حرام ہے جو عام مروج ہے۔

بعض ناعاقبت اندیش مفتیانِ دین نے جو یہ سمجھ رکھا ہے کہ نکاح تبادلہ میں ہر عورت کا نکاح مہر ملی کے عوض ہوتا ہے' لڑکی کے عوض لڑکی نہیں ہوتا تو یہ سراسر باطل اور بالکل واقعہ کے خلاف ہے۔ عرف عام میں اس کو .ٹہ اور تبادلہ کہتے ہیں اور زبان سے بھی لڑکی کے عوض لڑکی شرط کرتے ہیں اور تمام عمر اس کو .ٹہ سمجھتے ہیں اور معاملات اور باہمی مقابلہ کے وقت اس میں .ٹہ کے تاثرات لے کر کارروائی کرتے ہیں۔ چنانچہ تین واقعات میرے سامنے پیش ہوئے ہیں۔

ایک واقعہ چک نمبر ۱۷' ۵۔ایل متصل منٹگمری کا واقعہ ہے کہ قوم ارائیں میں ایک مناکحت .ٹہ پر ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک لڑکی کو کوئی شخص اغوا کر کے لے گیا تو اس کے سسرال سے نا کح وغیرہ اس مغویہ کے باپ کے پاس گئے کہ تمہاری لڑکی اغوا ہو گئی' تم اس کے عوض ہم کو دوسری لڑکی دے دو ورنہ ہم اپنی لڑکی کو تمہارے پاس سے لے جاتے ہیں کہ یہ .ٹہ ہے۔ جب تمہاری لڑکی ہمارے گھر نہ رہی تو ہم اپنی لڑکی تمہارے گھر میں کیوں چھوڑیں۔ تب انہوں نے کہا کہ ہم اپنی لڑکی کو تلاش کر کے تم کو لا کر دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تمہاری لڑکی بدکار ہے اور ناپاک ہو چکی' وہ ہم واپس نہیں لیں گے' ہماری لڑکی پارسا اور بے عیب ہے' ہم تم سے دوسری لڑکی جو بے داغ اور پارسا ہے نکاح .ٹہ میں لیں گے۔ تب وہ لاچار ہو گئے اور انہوں نے اپنی دوسری لڑکی کا نکاح بادل نخواستہ دے دیا۔ یہ مجبوری تبادلہ سے لاحق ہوئی ورنہ کسی کے گھر سے عورت اغوا ہو جائے تو اس کے عوض کوئی شخص لڑکی نہیں دیتا۔

اس سے حقیقت صاف منکشف ہو گئی کہ .ٹہ میں ایک لڑکی دوسری کا عوض ہوتی ہے اور انہی شرائط پر نکاح ہوتا ہے اور یہی آخری عمر تک ملحوظ رہتی ہے۔ پس عورت کا عورت سے تبادلہ بالبداہت حرام ہے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ قبولہ کے قریب ایک گاؤں ہے' وہاں .ٹہ پر مناکحت ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد فریقین میں ناچاقی اور مخالفت پیدا ہو گئی تب ایک فریق ناراض ہو کر اپنی لڑکی کو لے گیا اور اس کو دوسری جگہ بیاہ دیا۔ اس پر دوسرے فریق نے بذریعہ پنچائت مطالبہ کیا کہ یہ لڑکی ہماری منکوحہ تھی' تم نے دوسری جگہ کیوں بیاہ دیا؟ انہوں نے کہا کہ ہم نے .ٹہ توڑ دیا ہے' تم اپنی لڑکی دوسری جگہ بیاہ دو۔ طلاق کسی فریق نے نہیں دی' لڑکیاں ایک دوسرے سے واپس کر کے دوسری جگہ نکاح کر دیا۔ اس سے خوب ظاہر ہے کہ .ٹہ مروجہ میں ایک لڑکی دوسری کا عوض سمجھی جاتی ہے اور اسی بناء پر معاملہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ سودا حرام ہے اور نکاح منعقد نہیں

ہوتا اور تمام عمر زناکاری ہوتی رہتی ہے' یہ مذہبی زناکاری ہے۔

تیسرا واقعہ ضلع ملتان کے ایک گاؤں کا ہے کہ دو شخصوں نے اپنی لڑکیوں کی مناکحت .ٹہ اور تبادلہ پر طے کی۔ چنانچہ اس بنا پر ایک شخص نے اپنی لڑکی دوسرے شخص کے لڑکے کو بیاہ دی اور وہ اس لڑکی کو اپنے گھر لے گئے۔ جب کچھ دن گذر گئے تو پہلے شخص نے اپنے لڑکے کے لیے دوسرے سے اس کی لڑکی کا نکاح طلب کیا تو اس نے نکاح دینے سے انکار کر دیا۔ تب پہلے شخص نے اپنی لڑکی ان کے گھر سے لے جا کر اپنے گھر بٹھالی اور ان کے گھر بھیجنے سے انکار کر دیا۔ ہرچند انہوں نے عرضی' مقدمہ عدالت میں دائر کر کے لڑکی منکوحہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے لڑکی بھیجنے سے صاف انکار کر دیا اور عدالت میں بھی جواب دہی کے وقت یہی کہا کہ ہم نے اپنی لڑکی کے معاوضہ میں ان سے لڑکی لینی کی تھی' انہوں نے ہم سے نکاح لے کر اپنی لڑکی کا نکاح دینے سے انکار کر دیا ہے' اس لیے ہم بھی اپنی لڑکی نہیں دیتے کہ ہم کو شرط کے مطابق .ٹہ میں لڑکی نہیں ملی تو ہم مفت میں اپنی لڑکی کیوں دیں؟ اب یہ شخص اپنی لڑکی کا نکاح دوسری جگہ کرنے پر فتوے حاصل کر رہا ہے۔

اس متعارف .ٹہ سے صاف ثابت ہوا کہ یہ مناکحت ایک لڑکی کی دوسری کے نکاح ملنے کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔ اسی کا نام .ٹہ اور تبادلہ ہے جو شغار ممنوعہ محرمہ کی ایک قسم ہے' جو علماء اس کو ایک عورت کا تبادلہ دوسری عورت سے جائز قرار دے کر ایک کو دوسری کا عوض نہیں سمجھتے' وہ فقہاء نہیں ہیں' سفہاء ہیں جو لوگوں کی نیتوں اور مشروط معاملوں اور باہمی برتاؤ اور عرف عام کو نظر انداز کر کے عقد نکاح کے وقت کے لفظوں کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ اس وقت ایجاب قبول مہر ملی کے عوض ہوا ہے' اس لیے جائز ہے۔ حالانکہ جو شرطیں عموماً جاری ہیں اور ان کی بناپر معاملات نکاح اور لین دین ہو رہے ہیں' ان پر بھی یہ حکم نافذ ہو گا۔ اگر شرط باطل ہے اور بحکم اس پر معلق تھا جو شرط بیکار ہونے پر معدوم سمجھا گیا تو یہ نکاح باطل ہے جو شرط پہلے طے ہو اور پھر فریقین اسی پر دارومدار رکھ کر عقد کریں اور پھر بعد عقد بھی اسی کا ذکر اور لحاظ ہوتا رہے تو وہ ایسا ہی ہے کہ جب عقد میں اس کا ذکر ہو۔ اعلام الموقعین میں علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : قد اجری العرف مجری النطق فی اکثر من مائة موضع۔ "یعنی جو چیز لوگوں کی عام عادت بن کر رائج ہو جائے' وہ ہر معاملہ میں بول کر شرط کر لینے کی جگہ ہو جاتی ہے۔ شرع میں سو مقامات سے زائد صورتوں میں یہ

قاعدہ معمول بہا ہے۔"

پھر علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے بطور مثال ان صورتوں کا ذکر کیا ہے مثلاً کسی نے مہمان کے آنے پر کسی سے چارپائی بستر طلب کیا' اس نے دے دیا لیکن فریقین نے واپس دینے کا یعنی کوئی ذکر نہ کیا تو مہمان کے وداع ہونے پر وہ چارپائی اور بستر واپس کرنا واجب ہو گا۔ اب اگر وہ ہمیشہ کے لیے اس کا مالک بننا چاہے اور واپس نہ دے تو وہ ظالم تصور کیا جائے گا اور ایسا کرنا حرام ہے کیونکہ لینے دینے کے وقت گو اس کا ذکر نہیں ہوا' تاہم عام عادت اور رواج واپس کرنے اور وقتی طور پر فائدہ اٹھانے کا ہے' اس لیے اسی عرف عام پر فیصلہ ہو گا۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ زادالمعاد میں فرماتے ہیں: ان العقود معتبرة والشروط عرفا کالمشروط لفظا فیبطل العقد بشرط ذالک والتواطی علیه ونیۃ۔ "یعنی عقدوں میں ارادے اور نیتیں معتبر ہیں اور جو چیز عرف عام میں شرط ہے' وہ ایسی ہے جیسے لفظوں میں شرط ہے شرط باطل کے ساتھ جو نیت اور عادت میں معروف ہے عقد بھی باطل ہو جائے گا۔"

اس قاعدہ کی رُو سے بھی نکاح بٹہ باطل ہے کہ نیت اور عرف میں لڑکی عوض لڑکی ہوتی ہے۔ مجوزین بٹہ میں سے ایک بہت بڑے مفتی نے اپنے ایک مضمون بابت ہبہ میں یہ لکھا ہے کہ جو چیز ذریعہ حرام ہو' وہ حرام ہوتی ہے۔ اس قاعد کی رُو سے بھی حرام ہے کہ یہ مناکحت ذریعہ مفاسد محرمہ کا ہے جو کسی علم ودانش والے پر مخفی نہیں ہے۔ نیز مفتی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ الفاظ کا اعتبار نہیں ہوتا' معانی کو دیکھا جاتا ہے۔ اس اصول سے بھی بٹہ حرام ہے۔ کیونکہ عقد میں گو الفاظ مہر کے عوض نکاح ہوتا ہے مگر قصد بٹہ ہوتا ہے جس کی شرط پہلے ہو چکی ہے۔ اس لیے یہ عمل اسی نیت پر کیا جاتا ہے چونکہ یہ شرط اور نیت باطل ہے' اس لیے نکاح باطل ہوا۔ اگر یہ قاعدہ ان مفتیوں کا لیا جائے کہ شرط بٹہ کی پہلے ہوتی ہے جو عقد میں موثر نہیں ہے' عقد میں وہ شرط موثر ہے جو عقد کے وقت ہو تو نکاح متعہ اور حلالہ بھی حلال ہونے چاہئیں کیونکہ ان کی شرطیں بھی عقد سے پہلے ہوتی ہیں۔ حالانکہ ان کو یہ مفتیان دین حرام کہتے ہیں تو پھر نکاح بٹہ بھی حرام مان لینا چاہیے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم۔

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری

صحیفہ اہلحدیث جلد ۴۸' شمارہ ۱۳۔۱۴ مورخہ یکم و ۱۶/ رجب المرجب سنہ ۱۳۸۷ھ

تائب کی توبہ؟

بشرف نگاہ محقق اسلام حضرت مولانا عبدالقادر صاحب حصاری مدظلہ الباری۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

(سوال) کیا فرماتے ہیں؟ علمائے دین اس مسئلہ میں زید شادی شدہ سے زنا ہو گیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپ رہا ہے' دل سے سچی توبہ کرتا ہے۔ بکر کہتا ہے کہ توبہ حد لگنے پر قبول ہو گی' استغفار کے ساتھ یہ گناہ نہیں معاف ہو گا' جہنم میں سزا ملے گی۔ سورہ یوسف میں ہے ''زنا' ظلم اور ظالم کبھی بھی خلاصی نہیں پائے گا'' تو یہ کس طرح قبول ہو گی جس پر یقینی نجات ہو جائے۔ پاکستان میں زنا کی شرعی حد نہیں لگائی جاتی' حد کے بغیر کوئی عمل قرآن وحدیث میں ایسا ہے جس کے کرنے سے رب راضی خوش ہو کر قبر اور جہنم کا عذاب آنکھوں تک نہ دکھائے' نجات یقینی ہو جائے اور آئندہ تمام کبیرے گناہوں سے اللہ کریم کی توفیق سے بچے گا۔ انشاء اللہ سچی توبہ کرتا ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان فرما کر آجر دارین حاصل کریں۔

سائل نذیر احمد بھکروی' حال راجووال مورخہ ۱۱/ نومبر سنہ ۱۹۶۷ء

الجواب بعون الوهاب وهو الموفق للصواب' الحمد للّٰہ رب العالمین اما بعد! فاقول وباللّٰہ التوفیق۔ صورت مذکورہ بالا کا جواب یہ ہے کہ زید جبکہ توبہ نصوح خوف الٰہی سے کر چکا ہے تو اس کا جرم زنا معاف ہو چکا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ خطاب فرمایا ہے : توبوا الی اللّٰہ توبة نصوحا عسٰی ربکم ان یکفر عنکم سیأتکم الایة۔ ''یعنی تم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور اپنے گناہوں سے خالص توبہ کرو' اللہ غفور رحیم ہے' تمہاری برائیوں کو دور فرما کر جنت میں داخل کر دے گا۔''

سورہ فرقان میں مرسل قرآن نے عباد الرحمٰن کے اوصاف بیان فرمائے ہیں' جن میں سے ایک وصف یہ ہے کہ ولا یزنون ''یعنی وہ زنا نہیں کرتے۔'' پھر فرمایا جو شخص یہ کام کرے گا وہ گنہگار ہو کر جہنم رسید ہو گا۔ اس کے بعد یہ ارشاد ہے : الا من تاب وأمن وعمل عملا صالحا فاولئک یبدل اللّٰہ سیئاتھم حسنات وکان اللّٰہ غفورا رحیما○ ''یعنی مگر یہ کہ جو لوگ اپنے گناہوں سے توبہ کر گئے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا اور وہ بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔''

اس آیت سے ثابت ہوا کہ زانی اگر توبہ خالص کرے تو اس کا گناہ بخشا جائے گا۔ قرآن ناطق ہے : ومن یعمل سوء او یظلم نفسه ثم یستغفر اللّٰہ یجد اللّٰہ غفورا رحیماO "یعنی جو شخص کام کرے برا' وہ ظلم کرے اپنی جان پر پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ تعالیٰ کو غفور رحیم پائے گا یعنی اللہ تعالیٰ اس کو رحم فرما کر بخش دے گا۔"

مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غیبت کا زنا سے سخت گناہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ غیبت کا گناہ زنا سے کیسے سخت ہے؟ تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا : ان الرجل لیزنی فیتوب اللّٰہ علیه وفی روایة فیتوب فیغفر اللّٰہ له۔ "یعنی کوئی آدمی زنا کرتا ہے پھر توبہ کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر کے اس کو بخش دیتا ہے اور غیبت والے کی توبہ نہیں ہے جب تک اس شخص سے معافی نہ مانگے جس کی غیبت کی ہے۔"

اس کے علاوہ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضور ﷺ ہم سے ویسے ہی بیعت کے وقت عہد لئے جیسے عورتوں سے لئے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور چوری نہ کریں' زنا نہ کریں' اپنی اولاد کو قتل نہ کریں اور نافرمانی نہ کریں۔ پس جو اس عہد کو نبھائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور جو ان میں سے کسی گناہ کے ساتھ آلودہ ہو جائے پھر اگر اس کو سزا ہو گئی تو وہ سزا کفارہ بن جائے گی اور اگر اللہ تعالیٰ نے پردہ پوشی کی تو اس کا امر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اگر چاہے عذاب کرے اور اگر چاہے چھوڑ دے۔

اس حدیث سے یہ ظاہر ہے کہ اگر عدالت اسلامی میں کسی جرم کا مقدمہ نہ جائے اور مجرم اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان لگایا گیا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے عائشہ! اگر گناہ ہو گیا ہے تو توبہ کر لے۔

قرآن مجید میں ہے کہ ڈاکہ زنی' قتل و غارت اور فساد فی الارض وغیرہ کرنے والے اگر تمہارے قابو پانے سے پہلے پہلے توبہ کرلیں تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ چنانچہ آیت یہ ہے : الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیهم فاعلموا ان اللّٰہ غفور رحیمO

زنا کا گناہ ڈاکہ زنی' قتل وغارت سے چھوٹا ہے۔ جب یہ بڑے گناہ توبہ سے معاف ہو گئے اور دنیا کی سزا ان سے ٹل گئی تو زنا سے ضرور سزا معاف ہو جائے گی بشرطیکہ خالص توبہ کرے۔ مشکوٰۃ کتاب الحدود میں حدیث ہے کہ ایک شخص عدالت نبوی میں حاضر ہوا اور

اس نے درخواست کی کہ "طھرنی" یعنی آپ حد لگا کر مجھے گناہ سے پاک کریں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا : ارجع فاستغفر اللّٰہ وتب الیہ۔ "یعنی واپس لوٹ جا اور اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگ لے اور توبہ کر لے۔" وہ واپس گیا اور جلدی واپس آکر کہنے لگا کہ مجھے گناہ سے پاک کیجئے۔ آپ نے پھر اسی طرح ارشاد فرمایا کہ واپس چلے جاؤ اور توبہ کرو' وہ واپس جا کر تیسری دفعہ پھر آیا تو آپ نے پھر وہی ارشاد فرمایا کہ توبہ کرو۔ آخر چوتھی بار آیا تو آپ نے فرمایا کون سے گناہ سے پاک کروں؟ اس نے کہا کہ زنا سے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تجھے جنون تو نہیں ہو گیا؟ (کہ میرے بار بار توبہ کا کہہ دینے سے حد پر اصرار کر رہا ہے) اس نے کہا کہ حضور مجنون نہیں ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تو نشہ میں ہے کہ شراب پی رکھی ہے؟ اس نے کہا کہ شراب تو نہیں پی' زنا کیا ہے۔ تب آپ نے اس کو رجم کرا دیا۔

اسی طرح ایک عورت زنا کا ارتکاب کر کے آئی تو اس کو آپ نے یہ کہا کہ ویحک ارجعی فاستغفری اللّٰہ وتوبی الیہ۔ "کہ افسوس تجھ پر واپس جا اور توبہ واستغفار کر۔" دیگر حدیث میں آیا ہے جو مشکوٰۃ میں ہے کہ ایک شخص کو حد زنا میں سنگسار کرنے لگے تو وہ موت کے ڈر سے ادھر ادھر بھاگنے لگا' آخر سنگساری سے مر گیا۔ اس کا ذکر آنحضور ﷺ سے ہوا تو آپ نے فرمایا : ھلا ترکتموہ لعلہ ان یتوب فیتوب اللّٰہ علیہ۔ "یعنی تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا کہ وہ توبہ کر لیتا تو اللہ اس کو بخش دیتا۔"

ان دلائل سے یہ ثابت ہوا کہ زنا وغیرہ گناہ توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں۔ جرائم کی حدود تعزیرات سیاسی احکام ہیں کہ جب خلافت اسلامی قائم ہو اور قوانین شرعیہ نافذ کئے جائیں تو رعایا میں جرائم کے اعلانیہ ہونے کا انسداد کیا جائے کہ عدالتوں میں مجرم پیش کئے جائیں اور جرموں کا ثبوت دیا جائے تو پھر ان پر شرعی حکام سزا عائد کریں۔ تب حد لگانی اور سزا پانا درست ہے تاکہ جرموں کا عام طور پر انسداد ہو جائے۔ اگر عدالت شرعی میں مقدمہ نہ جائے یا جانے پر ثابت نہ ہو تو حدود کا نفاذ ضروری نہیں' پھر صرف خالص توبہ ہی کافی ہے۔ ھذا ما عندی واللّٰہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری۔

صحیفہ اہلحدیث جلد ۴۹' شمارہ ۶' مورخہ ۱۶/ ربیع الاول سنہ ۱۳۸۸ھ

نیز الاعتصام جلد ۱۹' شمارہ ۲۹' مورخہ ۱۶/ فروری سنہ ۱۹۶۸ء

کیا ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ کو زنا کی حد لگائی گئی تھی

سوال : کیا ابو شحمہ عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ ثانی کے بیٹے کو زنا کی غرض سے حد ماری گئی' جس سے ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ فوت ہوئے۔

(سائل ابو عبدالوکیل عبدالحمید قریشی بلول والے)

جواب : ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ کی بابت زنا اور حد کا قصہ محض غلط ہے' اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہ واعظوں نے وعظ کی کتابوں میں غلط لکھ دیا ہے۔ ہاں انہوں نے نبیذ تمر نوش کیا تھا' اس سے نشہ آگیا تو ان پر حد لگائی گئی' یہ ذکر ثابت ہے۔ واللہ اعلم۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم' ص ۱۴۹

زانی زانیہ کی مناکحت میں

حنفیہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا معارضہ

مذہب حنفیہ کے علماء اپنے مذہب حنفی کی بنیاد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مسلک پر بتلاتے ہیں۔ کتب فقہ درمختار وغیرہ میں بھی یہی لکھا ہے لیکن یہ بات سراسر غلط ہے۔ مذہب حنفی کی بنیاد اہل رائے کوفہ کے مسلک پر ہے۔ چنانچہ راقم الحروف ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مسائل اور اہل رائے کوفہ اور ان کے مقلدین کے مسائل کا تقابل بیان کر کے ان کے دعویٰ کو غلط ثابت کر رہا ہے۔ مناکحت زانی زانیہ میں حنفیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی ہے۔ ہدایہ ص ۳۲۲ میں ہے : وان تزوج حبلی من زناء جاز النکاح۔ "یعنی اگر کسی نے حاملہ من الزنا سے نکاح کر لیا تو یہ نکاح جائز ہے۔" یہ بھی لکھا کہ جب کسی شخص نے کسی عورت کو دیکھا کہ وہ زنا کرتی ہے پھر اس نے اس زانیہ سے نکاح کر لیا تو استبراء رحم سے پہلے ہی اس کو اس زانیہ سے وطی کرنی حلال ہے لیکن اغاثۃ اللھفان جلد ۱' ص ۸۲ میں ہے : فمن محاسن الشریعۃ تحریم نکاح الزانیۃ حتی تتوب

وتتبرا۔ "یعنی شریعت الٰہی کے محاسن اور خوبیوں میں سے یہ ہے کہ نکاح زانیہ سے کرنا حرام ہے' جب تک وہ توبہ واستبراء رحم نہ کر لے۔"

مجمع الزوائد نمبر۔۴' ص۔۲۶۹ میں حدیث ہے جو ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ زانی زانیہ آپس میں نکاح کریں گے تو ہمیشہ زانی ہی رہیں گے (کیونکہ یہ نکاح حرام ہے) قرآن بھی اس مسلک کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ زانی زانیہ کی مناکحت کا ذکر فرما کر پھر یہ ارشاد ہے : وحرم ذالک علی المومنین۔ "یعنی مومنوں پر یہ نکاح حرام کیا گیا ہے۔" ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے دو روایتیں آئی ہیں۔ ایک منقطع ہے' دوسری صحیح ہے۔ رواہ باسناد صحیح الی ابن مسعود رضی اللہ عنہ علاوہ ان کے دو روایتیں اور ہیں۔ ایک منقطع ہے' دوسری متصل ہے جو متصل ہے۔ وہ صحیح نہیں' ضعیف ہے۔ لیکن پہلی دو روایتوں کی موید ہیں۔ پھر حکم قرآنی سے ان سب کو تقویت حاصل ہے تو صحیح یہ مسلک ہے کہ زانیہ سے زانی اور غیر زانی کی مناکحت حرام ہے۔ یہاں حنفیہ کا موقف قرآن وحدیث کے علاوہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بھی خلاف ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جب زانی زانیہ کا باہم نکاح کیا گیا تو وہ منعقد نہ ہو گا۔ ناکح اور منکوحہ دونوں ہی ہمیشہ زانی رہیں گے۔

تفسیر سورہ نور میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے زانی زانیہ کی مناکحت کو حرام قرار دیا ہے اور لکھا ہے : فمن وطئی زانیه او مشرکة بنکاح فهو زان۔ "یعنی جس شخص نے کسی زانیہ عورت یا مشرکہ سے نکاح کر کے وطی کی تو وہ زانی ہے۔" پھر اس مناکحت میں اختلاف فقہاء کا ذکر کر کے یہ فرمایا ہے : ولیس مع من اباحه ما یعتمد علیه۔ "یعنی جو لوگ اہل علم میں سے زانی زانیہ کی مناکحت کو مباح کہتے ہیں' ان کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جا سکے۔"

فتح القدیر جلد۔۴' ص۔۵ پر امام شوکانی مناکحت زانی زانیہ میں اختلاف ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ حضرت عمر' ابن مسعود اور جابر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ زانی زانیہ کی مناکحت جائز نہیں ہے۔ پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے : قال ابن مسعود اذا زنی الرجل بالمراة ثم نکحها بعد ذالک فهما زانیان ابدا۔ "یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی عورت سے زنا کیا' پھر اس سے نکاح کر لیا تو وہ دونوں ہمیشہ زانی رہیں گے۔" (جب تک اس نکاح پر قائم رہے)

پھر امام شوکانی عالم ربانی فقیہ الحدیث لاثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تحقیق کا لب لباب یہ لکھتے ہیں :
والمقصود زجر المومنین عن نکاح الزوانی بعد زجرھم عن الزنا وھذا ارجح الاقوال وسبب النزول یشھد لہ۔ "اور اس سے مقصود یہ ہے کہ زانیہ سے نکاح حرام ہے جس پر آیت کے نزول کا سبب اس پر دلالت کرتا ہے۔" یہاں اس مسئلہ کی تفصیل مقصود نہیں۔

عبدالقادر عارف حصاری

الاسلام لاہور جلد۔۲، شمارہ۔۴۶، مورخہ ۱۴ جنوری سنہ۔۷۷ء

نکاح حبلٰی بالزنا

جریدہ اہل حدیث مطبوعہ یکم مئی سنہ۔۱۹۵۸ جلد۔۱۰، نمبر۔۱۷ کے عنوان فتاویٰ کے تحت ایک فتویٰ شائع ہوا ہے جس کے آخری حصہ سے مجھے اختلاف ہے، دیگر علماء اہلحدیث کو بھی اس طرف ضرور توجہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس زمانہ پرآشوب فساد میں ایسے حرام نکاح بہت ہو رہے ہیں۔ بعض لوگ اپنی لڑکیوں کو بالغہ ہو جانے کے بعد طویل عمر تک بٹھائے رکھتے ہیں اور ان کا جلد نکاح نہیں کرتے، حالانکہ حدیث میں ہے کہ تین چیزوں میں دیر کرنی جائز نہیں۔ ایک یہ کہ نماز کا وقت آجائے تو اس کو فوراً پڑھنے کی کوشش کریں، دوم جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو جلد کفن دفن کرنا چاہیے، سوم لڑکی بالغہ ہو جائے تو اس کا فوراً نکاح کر دینا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اس کا موید ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لڑکیوں کا نکاح بالغہ ہو جانے کے بعد ہی کر دیا تھا۔ اسی طرح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کا نکاح سات برس کی عمر میں کر کے نو سال کے بعد رخصتی کر دی تھی۔

بعض لوگ اپنی بیوہ عورتوں کا دوبارہ نکاح نہیں کرتے، اگرچہ وہ صاحب اولاد نہ ہوں اور حالت شباب میں ہوں تب بھی نکاح دوبارہ عار تصور کرتے ہیں۔ پھر ان بالغہ عورتوں کو بغیر نکاح کے گھروں میں رکھنے اور ان کو بے پردہ آزاد چھوڑنے سے جو نتائج بد ظاہر ہوتے ہیں، وہ اہل علم پر سے مخفی نہیں ہیں۔

راقم الحروف ایک گاؤں میں گیا تو وہاں ایک تھانیدار بمع عملہ پولیس آیا ہوا تھا کہ کسی نے نوزائیدہ بچہ کو مار کر جوہڑ میں ڈال دیا تھا جس کی تفتیش ہو رہی تھی۔ تمام گاؤں کی

مستورات اور گردونواح کی دائیہ عورتوں کو بلا کر بے عزت کیا جا رہا تھا۔ ایسا ہی ایک بیوہ عورت کو حمل زنا کا ہوا تو اس کو کسی دوسری جگہ بچہ ساقط کرانے کے لیے لے گئے تھے۔ بعض لوگ کنواری لڑکی یا بیوہ عورتوں کا نکاح حمل ہو جانے کے بعد کسی عفیف شخص یا اسی زانی سے فوراً کر دیتے ہیں تاکہ اس گناہ پر پردہ پڑ جائے اور بچہ محفوظ رہے۔ حالانکہ یہ نکاح دو وجہ سے حرام ہے۔ ایک یہ کہ وہ عورت منکوحہ زانیہ ہوتی ہے اور زانیہ کا نکاح عفیف سے ہو یا زانی سے حرام ہے۔ دوم حاملہ کا نکاح بغیر وضع حمل حرام ہے لیکن ہمارے مفتی مدظلہ العالی نے یہ فرمایا ہے کہ "اگر باکرہ تھی اور حمل زنا سے تھا تو حبلیٰ من الزنا سے نکاح تو جائز ہے مگر وطی (مباشرت) قبل از وضع حمل جائز نہیں۔"

پھر اس پر مزید افسوس یہ ہے کہ آپ نے آخر میں یہ فرما دیا کہ "یہی محدثین کا مذہب ہے۔" حالانکہ یہ بالکل غلط ہے' محدثین محققین کا ہرگز یہ مذہب نہیں بلکہ فقہاء حنفیہ کا مذہب ہے۔ چنانچہ لکھا ہے : وان تزوج حبلیٰ من الزنا جاز النکاح کذا فی الھدایۃ وھکذا فی الدر المختار وغیرہ۔ "یعنی حاملہ بالزنا کا نکاح جائز ہے' ہدایہ وغیرہ کتب فقہ میں اسی طرح لکھا ہے۔" لیکن محدثین کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

عون المعبود میں ہے : وھو قول سفیان الثوری وابی یوسف واحمد واسحاق۔ "یعنی یہی مذہب امام سفیان اور امام ابو یوسف اور امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے۔"

زاد المعاد میں ہے : وھو قول اھل المدینۃ والامام احمد وجمھور الفقھاء۔ "یعنی یہی مذہب مدینہ والوں کا اور امام احمد اور جمہور فقہاء محدثین کا ہے۔" پس آپ کا مطلق محدثین کی طرف یہ نسبت کرنا کہ وہ حبلیٰ من الزناء کے نکاح کو جائز کہتے ہیں' سراسر غلط ہے۔ آپ ضرور اس پر نظر ثانی فرمائیں۔

محلّی جلد۔۱۰' ص۔۲۶۳' مسئلہ نمبر۔۱۹۹۱ میں ہے : انہ ان طلقھا وعدتھا بالاقراء او بالشھور ثم حملت قبل تمام العدۃ منہ او من غیرہ بزنا او باکراہ فانھا تنتقل عدتھا الی وضع ذالک الحمل فاذا وضعت فقد تمت عدتھا وکذالک لو مات فحملت فی عدتھا من وفاتہ من زنا او اکراہ فان عدتھا تنتقل الی عدۃ الحامل بوضع الحمل لان کل ذالک داخل فی عموم قولہ تعالیٰ واولات الاحمال۔ "یعنی اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور اس کی عدت طہروں یا مہینوں سے جاری تھی' پھر عدت پوری ہونے

سے پہلے اس عورت کو اس شخص یا غیر شخص سے زنا کا حمل ہوا' یا کسی نے اس سے بالجبر زنا کیا اور حمل قرار پا گیا تو اس عورت کی عدت وضع حمل کی طرف منتقل ہو جائے گی' جب حمل وضع ہو گا تب عدت پوری ہو گی۔ اسی طرح اگر کسی عورت کا خاوند مر گیا اور وہ عدت وفات میں زنا بالجبر سے حاملہ ہو گئی تو اس کی عدت بھی وضع حمل ہو گی۔ یہ سب صورتیں اللہ تعالیٰ کے عام فرمان کہ اولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن (یعنی حمل والیوں کی عدت وضع حمل ہے) میں داخل ہیں۔"

اس سے ظاہر ہے کہ فرمان الٰہی اولات الاحمال عام ہے۔ اس میں باکرہ' ثیبہ عورت حبلیٰ بالزنا بھی داخل ہے۔ یہ آیت گو مطلقہ کی بابت وارد ہے مگر اپنے عموم سے عورت متوفی عنھا کو بھی شامل ہے' حالانکہ اس کے لیے علیحدہ عدت معین تھی لیکن بحالت حمل مطلقاً نکاح حرام تھا۔ اس لیے متوفی عنھا کو بھی اس میں شامل کیا گیا' ورنہ ضرورت نہ تھی۔ اسی طرح حمل کی دیگر صورتیں بھی شامل رہیں گی اور آیت کو عام رکھا جائے گا۔

چنانچہ کتاب الام جزء رابع ص۔۲۰۳ میں ہے : واذا اعتدت المراة من الطلاق والمنکوحة نکاحا فاسدا بالفرقة فعدتھا سواء لا یختلفان فی موضع الحمل والاقراء والشھور الخ۔ "یعنی جس عورت منکوحہ کا نکاح فاسد تھا جس کی تفریق کی گئی تو اگر اس کو حمل ہو' اس کی عدت بھی وضع حمل ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اولات احمال عام ہے۔"

پس حبلیٰ بالزنا کو بھی اس آیت کے عموم میں داخل سمجھیں اور جب تک کہ وضع حمل نہ ہو اس کا نکاح حرام تصور کریں۔

زادالمعاد جلد۔۲' ص۔۲۱۰ میں ہے : فی حکمه صلی اللہ علیه وسلم فیمن تزوج امراة فوجدھا فی الحبل فی السنن والمصنف لسعید بن المسیب عن بصرة بن اکثم قال تزوجت امراة بکرا فی سترھا فدخلت علیھا فاذا ھی حبلیٰ فقال النبی صلی اللہ علیه وسلم الصداق بما استحللت من فرجھا والولد عبد لک واذا ولدت فاجلدوھا وفرق بینھما وقد تضمن بطلان نکاح الحاصل من زنا۔ "یعنی جس شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا اور پھر اس کو حاملہ من الزنا پایا تو اس کا حکم سنن ابوداؤد وغیرہ میں یہ ہے کہ بصرہ بن اکثم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے ایک باکرہ عورت سے اس کے پردہ میں نکاح کیا' جب اس پر داخل ہوا تو میں نے اس کو حاملہ پایا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا قصہ معلوم کر کے

ارشاد فرمایا کہ اس عورت کے لیے تو مہر ہے کیونکہ تو نے اس کی فرج کو حلال جان کر استعمال کیا ہے اور جو بچہ اس سے پیدا ہو گا وہ تیرا خادم ہے اور آنحضورؐ ﷺ نے دونوں کے درمیان تفریق کردی' اس سے ظاہر ہوا کہ نکاح حاملہ من الزنا کا باطل ہے۔"

سعید بن مسیب کی روایت پر امام ابن حزم نے جرح کی ہے مگر وہ مضر نہیں ہے' کیونکہ ایک تو امام سعید بن مسیب اوسع العلم تابعین سے ہیں جن کی مرسلات کے اصح ہونے پر اجماع ہے۔ تقریب میں ہے : اتفقوا علی ان مرسلاته اصح المراسیل۔

دوم عمل اہل مدینہ سے یہ روایت قوی ہو گئی ہے۔ نیل الاوطار میں ہے : واذا روی علماء المدینة شیئا وعملوا به فهو اصح۔ "یعنی علماء مدینہ کسی شے کو روایت کریں اور اس پر بھی عمل کریں تو وہ اصح ہے۔" کیونکہ مدینہ مرکز علوم نبویہ تھا اور تمام بلاد اسلامیہ کا روح تھا۔ تمام علوم اہل مدینہ کے نزدیک منتج تھے۔ فقہاء مدینہ کو دیگر تمام فقہاء پر فوقیت حاصل ہے۔ خصوصاً امام سعید بن مسیب تو رئیس فقہاء مدینہ ہیں جن کی مرسل روایت بھی معتبر ہے۔

سوم آیت اولات الاحمال اس کی موید ہے' جس سے یہ دلیل قوی ہو گئی اور اس سے استدلال صحیح ہوا۔ عون المعبود میں ہے : قال الامام الخطابی فی المعالم فی الحدیث حجة ان ثبت لمن رای الحمل من الفجور یمنع عقد النکاح۔ "یعنی اگر یہ حدیث ثابت ہو جائے تو یہ اس شخص کی دلیل ہے جو حمل زنا سے عقد نکاح کو منع کرتا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ اگر اس حدیث کو مرسل بھی تسلیم کیا جاتا تب بھی حجت ہے' کیونکہ محدثین میں سے بعض کا یہ اصول صحیح ہے کہ ان لم یوجد فی الباب حدیث سوی المرسل قبلناہ ولا سیما اذا کان دالا علی محظوریة شیئی۔ (کتاب المراسل) "یعنی اگر کسی مسئلہ میں مرسل حدیث کے سوا کوئی حدیث وارد نہ ہو' تو ہم (محدثین) اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ کسی چیز کے ممنوع ہونے پر دال ہو۔" سو مسئلہ ماتحت فیہ اسی قبیل سے ہے کہ حبلیٰ بالزنا کے عقد جائز ہونے پر کوئی دلیل ناطق نہیں ہے اور حرمت کے لیے حدیث سعید بن مسیب ہے' جو کافی ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

اہلحدیث سوہدرہ جلد۔۱۰' شمارہ۔۴۱' مورخہ یکم نومبر سنہ۔۱۹۵۸ء

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک صاحبزادہ اور کوڑوں کی سزا

واقعہ کی اصل حقیقت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک صاحبزادے حضرت (عبدالرحمٰن) ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ ان پر کسی نامحرم عورت نے زناکاری کا الزام لگایا اور اس کے ثبوت میں اس نے بر سر اجلاس (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عدالت میں بچہ بھی پیش کیا' جس پر ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ کو دروں کی سزا دی گئی۔ ابھی انہیں درے پورے نہ لگ پائے تھے کہ ان کی موت واقع ہو گئی' لیکن اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بقایا درے معاف نہیں کئے بلکہ ان کی قبر پر لگائے گئے۔ پھر ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ کو رات خواب میں دیکھا گیا کہ وہ جنت میں قرآن شریف پڑھ رہے ہیں اور اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے ابا جی! اگر آپ بقیہ درے نہ مارتے تو مجھ کو ہرگز یہ مقام نصیب نہ ہوتا۔

لیکن یہ سراسر باطل ہے' یہ قصہ جس روایت کی بنا پر زبان زد عوام ہوا ہے' وہ موضوع اور بناوٹی ہے۔ چنانچہ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب اللالی المصنوعة فی الاحادیث الموضوعة کے ص۔۱۹۴' جلد۔۲ میں اس قصہ کی روایت نقل کر کے فرماتے ہیں: موضوع وضعه القصاص۔ "اس قصہ کی روایت من گھڑت ہے جس کو واعظوں نے گھڑ لیا ہے۔" پھر امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کئی سندوں سے نقل کر کے اس کے راویوں پر جرح کی ہے اور اس قصہ کا موضوع ہونا ثابت کیا ہے۔

تنزیة الشریعة جلد۔۲' ص۔۲۲۰ میں بھی اس قصہ کو جس میں زنا کا ذکر ہے' بناوٹی اور من گھڑت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے: هو مما وضعه القصاص۔ "اس قصہ کو واعظوں' قصہ گوؤں نے گھڑا ہے۔" نیز لکھا ہے: موضوع فيه مجاهيل۔ "یہ روایت موضوع ہے' اس میں لاپتہ راوی ہیں۔"

اسی انداز کا ایک قصہ اخبار اہلحدیث لاہور (۲۰/ اگست سنہ۔۱۹۷۱ء) میں "کوڑوں کی سزا" عنوان کے مضمون میں پروفیسر محمد حسین صاحب آزاد کے قلم سے شائع ہوا ہے۔ جہاں تک نفس موضوع کا تعلق ہے' مضمون صحیح وصواب اور مبنی برحق ہے لیکن موصوف کی بیان

کردہ درج ذیل کہانی "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے نے نوعمری کی حالت میں شراب پی لی تھی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے پر کوڑے برسائے۔ کہتے ہیں کہ مقررہ کوڑوں کی تعداد ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ چیف جسٹس نے تجویز کیا کہ مزید کوڑے نہ لگائے جائیں' کیونکہ سزا کا منشاء پورا ہو گیا ہے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے لخت جگر کی لاش پر بقیہ کوڑوں کی تعداد پوری کرتے ہوئے فرمایا کہ کل کو جب اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی ہو گئی تو وہ یہ نہ فرمائیں کہ اے عمر! تو نے اپنے بیٹے کو پوری سزا نہیں دی تھی۔" بھی اس تفصیل کے ساتھ بالکل غلط مشہور ہو گئی اور بے علم واعظوں کی بدولت شہرت پا گئی ہے۔

اصل واقعہ: اس سلسلے میں اصل واقعہ اسی قدر ہے جسے امام سیوطی اور تنزیہ الشریعۃ کے مؤلف نے بیان کیا ہے' جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

> "واقعہ اتنا ہے جس کو زبیر بن بکار اور ابن سعد نے طبقات میں اور دیگر مورخین نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ایک شخص عبدالرحمٰن نامی تھا جس کی کنیت ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ تھی' وہ مصر کی فوج کا سپاہی تھا۔ انہوں نے ایک رات نبیذ پی لی تھی' جس سے نشہ آگیا تو وہ خود ہی حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی عدالت میں پیش ہوا (جو مصر کے گورنر تھے اور یہ درخواست کی کہ میں نے رات کو نبیذ پی لی تھی جس سے مجھے نشہ آگیا' آپ مجھ پر حد شراب جاری کر دیں۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے توقف کیا (کہ وہ نبیذ تھی جو شراب میں داخل نہیں) ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اگر آپ نے حد نہ لگائی تو میں اپنے باپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع دے دوں گا کہ میں نے شراب پی تھی اور اپنے جرم کا اعتراف اور سزا منظور کر لی تھی لیکن حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے مجھ پر حد قائم نہ کی تو پھر آپ کو جواب دہ ہونا پڑے گا۔ یہ سن کر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر جا کر حد لگا دی اور اس کو عام ملزموں کی طرح برسرعام حد نہ لگائی کہ اس سے خلیفہ کی توہین تھی لیکن جب حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے خط لکھا جس میں گورنر صاحب کو سخت ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ' زجر وتوبیخ کی کہ آپ نے ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیگر عام

ملزموں کی طرح لوگوں کے سامنے اعلانیہ سزا کیوں نہ دی اور گھر میں خفیہ کارروائی کیوں کی؟ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مصر کے دورہ پر آئے تو آپ نے اس کو کوڑوں کی سزا عام لوگوں کے سامنے لگائی۔ اس کے بعد ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ کئی دن اتفاقیہ بیمار رہ کر فوت ہو گیا۔"

اس کے بعد حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ "مصنف عبدالرزاق" ایک روایت ذکر کی ہے جس میں صاف صراحت ہے کہ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سزا دینے کے بعد ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ ایک ماہ تک صحیح سالم زندہ رہا' پھر وہ اس کے بعد بیمار ہوا اور فوت ہو گیا۔ عام لوگوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سزا دینے سے مرا تھا۔ یہ افواہ غلط تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سزا دینے سے فوت نہ ہوا تھا۔ اس کے بعد اتفاقیہ بیمار ہوا اور پھر فوت ہو گیا۔" وفی مصنف عبدالرزاق انه لبث بعد ما جلده ابوه شهرا صحيحا فمات فحسب عامة الناس انه مات من جلد عمر ولم يمت من جلد عمر۔

اس صحیح واقعہ سے دونوں زبان زد عام و خاص قصوں کی تغلیط ثابت ہو گئی۔ نہ انہوں نے زناکاری کا ارتکاب کیا' نہ شراب نوشی کا' نہ ان کی موت کوڑوں سے واقعہ ہوئی اور نہ بقایا درے ان کی قبر پر لگائے گئے۔ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے کہ سزا کے دوران اس طرح اگر مجرم کی موت واقع ہو جائے تو بقیہ سزا اس کی قبر پر پوری کی جائے۔

بات اتنی ہوئی کہ انہوں نے نبیذ پی تھی۔ نبیذ عرب میں اس مشروب کو کہتے تھے جو پانی میں کھجور یا انگور کو بھگو کر بنایا جاتا تھا۔ پھر اس کا نقوع نوش کرتے تھے جس کا عرب میں عام دستور تھا کہ شوقیہ اس کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کو عربی میں انتباذ کہتے ہیں یعنی نبیذ بنانا۔

بہرحال ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ نے ارادہ سے خمر نہیں بلکہ نبیذ پی تھی' ایک مروجہ مشروب کے طور پر لیکن چونکہ نبیذ اگر دیر تک پڑی رہے تو بعض اوقات اس میں سکر پیدا ہو جاتا ہے ورنہ محض سرور حاصل کرنے کو پی جاتی تھی۔ لہٰذا جب اس میں سکر پیدا ہو گا تو بحکم حدیث کل مسکر حرام وہ حرام ہو جائے گی۔ اس لیے ابو شحمہ رحمۃ اللہ علیہ نے نشہ آنے پر اس کو نشہ دینے والی شراب تصور کر لیا اور اپنے افسر کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر کے سزا منظور کر لی۔ تب دو دفعہ کوڑوں کی سزا لگائی گئی۔ پہلی خفیہ ہونے کی وجہ سے نامنظور ہوئی تو دوسری بروئے شرع اعلانیہ لگائی گئی تاکہ اس میں رعایت کا تصور نہ آئے۔

اس سے ہماری حکومت اور رعایا کو عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ پاکستان کی بنیاد اسلام پر رکھ کر پھر اسلامی قوانین سے انحراف اور گریز کیا جا رہا ہے اور قوانین شرعیہ کی اپنی رائے فاسدہ اور قیاس باطل سے تکذیب کی جا رہی ہے۔ وہ ایسے سچے مسلمان تھے کہ اپنے جرم کا عذاب اخروی سے ڈر کر دنیا میں خود ہی اقبال کر کے سزا منظور کر لیتے تھے تاکہ گناہ سے پاکیزگی حاصل کریں۔ ایک ہمارے دور کے نام کے مسلمان جرائم پیشہ ہیں کہ اپنے جرائم کا صاف انکار کر جاتے ہیں اور وکیل تجویز کر لیتے ہیں جو مجرموں کو رہا کرانے کا ذمہ لے لیتے ہیں یا رشوتوں اور سفارشوں سے کام لے کر حکام سے سزاؤں کا بچاؤ حاصل کر لیتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صحیح واقعہ صرف اتنا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ باقی جو قصہ اور باتیں زبان زد عوام ہیں، وہ سراسر غلط ہیں۔ واعظوں اور مضمون نگاروں کو ان کے بیان سے بچنا واجب ہے۔ وما علینا الا البلاغ

کتبہ عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام لاہور جلد۔۲۳، شمارہ۔۷، مورخہ ۱۷/ ستمبر سنہ۔۱۹۷۱ء

<u>استدراک:</u> حافظ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب "سیرۃ عمر بن الخطاب" میں صرف قصہ نبیذ ہی ذکر کیا ہے جس کے بعد لکھتے ہیں : قلت لا ینبغی ان یظن بعبد الرحمٰن بن عمر انه شرب الخمر وانما شرب النبیذ متاولا ان الشرب منه لا یسکر (الی قوله) واما کون عمر اقام الحد علی ولده؟ فلیس ذالک حداً وانما ضربه غضبا وتادیبا والا فالحد لا یکرر وقد اخذ هذا الحدیث قوم من القصاص فابدلوا فیه واعادوا فتارة یجعلون هذا مضروبا علی شرب الخمر وتارة علی الزنا ویذکرون کلاما ملفقا یبکی العوام لا یجوز ان یصدر عن مثل (عمر) انتهی۔ (سیرت عمر بن الخطاب ص۔۲۶۸ طبع مصر)

"یعنی یہ بات نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے نے شراب پی تھی۔ دراصل انہوں نے کھجور کا نقوع (نبیذ) ایک مشروب سمجھ کر پیا، ان کو اندازہ نہ ہو گا کہ وہ نشہ آور ہے۔ تاہم کو ارادے سے نشہ نہیں لایا گیا تھا۔ اب صرف ندامت اور افسوس ہی کافی تھا مگر انہوں نے خیال کیا کہ حد کے ذریعے ہی تطہیر ہو تو بہتر ہو گا، اس لیے احتیاطاً حد کے لیے خود کو پیش کر دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ سزا جو دی تھی تو وہ بطور ڈانٹ ڈپٹ تھی نہ کہ بطور حد۔ کیونکہ دو دفعہ حد لگانے کا تو کوئی جواز نہیں۔ (افسوس) رنگ محفل کے لیے لوگوں نے

اس واقعے میں عوام کو رلانے والی ایسی باتیں ملا ڈالیں جن کا صدور حضرت عمرؓ جیسی ہستی سے ممکن نہیں۔"

(محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی لاہور)

مسئلہ نکاح زانیہ

"الاعتصام" کے ایک فتویٰ پر ایک نظر!

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ الاعتصام کے مفتی صاحب نے حاملہ زانیہ کا نکاح بوجہ حمل ناجائز لکھا ہے۔ حالانکہ اس نکاح کے حرام ہونے کی دوسری وجہ اس عورت کا زانیہ ہونا ہے کہ زانیہ کا نکاح کتاب وسنت کی رُو سے حرام ہے۔ چنانچہ "الاعتصام" اور "تنظیم اہلحدیث" میں اسی موضوع پر میرا مفصل مضمون شائع ہو چکا ہے۔ مگر الاعتصام کے مفتی صاحب نے اس کی وجہ حرمت کو بیان نہیں کیا' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زانیہ اور زانی کی مناکحت جائز سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ایک فتویٰ اخبار الاعتصام مطبوعہ ۱۳/ ستمبر سنہ۔۱۹۶۸ء میں شائع ہوا ہے جس کا سوال مع جواب ذیل میں درج ہے۔

سوال : ایک شخص کے متعلق عام افواہ مورخہ ۶۔۹۔۱۹۶۱ء تک رہی کہ اس کا تعلق ناجائز ایک کنواری لڑکی کے ساتھ ہے اور رات کو اس کے ساتھ سوتا ہے۔ چنانچہ مورخہ ۶۔۹۔۱۹۶۱ء زانی کو اس شخص مذکور نے ایک شخص کے پاس ذکر کیا کہ اس کا نکاح مسماۃ فلانۃ اس کی مزنیہ سے ہو گیا ہے۔ اس کے متعلق مولوی سعید احمد سے دریافت کیا گیا تو مورخہ ۷۔۹۔۱۹۶۱ء کو مولوی سعید احمد نے بتلایا کہ مورخہ ۲۵ یا ۲۶/ اگست سنہ۔ ۱۹۶۱ کو زانی مذکور ان کو بلا کر والد کے گھر لے گیا کہ نکاح پڑھوانا ہے۔ شام کا وقت تھا' والد کے گھر جا کر مسماۃ فلانۃ کی اجازت طلب کی گئی۔ والد ولی مقرر ہوا اور فلانۃ کے دو حقیقی بھائی گواہ مقرر ہوئے اور کوئی تیسرا شخص موجود نہ تھا۔ والد اور دونوں بھائیوں کے روبرو مطابق شریعت نکاح پڑھلیا گیا۔ اس کے بعد نکاح کا ذکر یا اطلاع نہ ہی مولوی صاحب اور نہ ہی ناکح نے اور نہ ہی لڑکی کے والد نے اور بھائیوں نے کسی کو دی۔

تمام مرد مان دید ۶۔۹۔۱۹۶۱ء تک یہ سمجھتے رہے کہ یہ ناجائز فعل ہو رہا ہے۔ اس کے

متعلق شریعت کیا فیصلہ کرتی ہے اور اگر کوئی عمل خلاف شریعت ہوا ہے تو اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟

جواب : یہ نکاح درست ہے' ولی' والد موجود ہے اور دو گواہ بھی موجود ہیں۔ بھائی گواہ بن سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے : کونوا قوامین بالقسط شھداء اللّٰہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین۔ مگر اب اعلان کر دینا ضروری ہے۔

یہ فتویٰ دو وجہ سے غلط ہے۔ اول یہ کہ یہ نکاح زانی اور زانیہ کا ہے جو از روئے کتاب وسنت حرام ہے۔ سورہ نور میں نکاح زانیہ کا جس آیت میں ذکر ہے' اس کے آخر میں صریح طور پر یہ حکم ہے : وحرم ذالک علی المؤمنین۔ "مومنوں پر یہ مناکحت حرام ہے۔" جس مرد اور عورت کا یہ نکاح ہوا ہے' ان میں دوستی اور آشنائی تھی جو بہت عرصہ تک رہی۔ یہاں تک کہ عام افواہ پھیل گئی والدین اور بھائیوں نے جب بدنامی ہوتی دیکھی تو ان کا نکاح کر دیا۔ اسی شرمساری کی بنا پر اس نکاح کو خفیہ کیا اور اعلان نہ کیا' حالانکہ بحکم اعلنوا النکاح' اعلان کرنا ضروری تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ نکاح خفیہ ہوا ہے۔ اس میں صرف لڑکی کے اولیاء قریب وبعید حاضر تھے' اہل بیت کے ماسوا کوئی خارجی گواہ نہ تھا۔ نکاح میں علاوہ ولی کے دو گواہ ہونے ضروری ہیں۔ حدیث میں آیا ہے : لا نکاح الا بولی وشاھدی عدل۔ "یعنی ولی اور دو گواہوں کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہے۔"

لڑکی کے دو بھائی اس کے ولی ہیں' باپ بھی ولی ہے۔ ولی گواہ نہیں بن سکتا' کیونکہ اگر کسی وقت نزاع ہو جائے جس کی نوبت عدالت تک پہنچے' جیسے عموماً آج کل عدالتوں میں مقدمات جاری ہیں۔ کہیں نکاح پر نزاع ہو کر مقدمہ جاری ہے' کہیں مہر پر دعویٰ دائر ہے تو ایسی صورت میں گواہی عدالت میں ایسے شخص کی معتبر سمجھی جاتی ہے جو کسی کا قریبی اور رشتہ دار نہ ہو بلکہ غیر جانبدار ہو۔ اگر بیوی یہ دعویٰ کرے کہ میرا مہر خاوند کے ذمہ ہزار روپیہ ہے اور خاوند کہے کہ کل پچاس روپیہ ہیں۔ پھر بیوی کہے کہ جو زیور میرے پاس ہے قیمتی' ایک ہزار روپیہ کا یہ میری ملک ہے۔ میرے باپ نے اس شرط پر نکاح کیا تھا کہ ایک ہزار نقد اور ایک ہزار کا زیور دینا ہو گا' سو زیور تو مل گیا ہے اب ہزار روپیہ ناکح کو ادا کرنا چاہیے۔ اس پر ناکح کا جواب دعویٰ یہ ہے کہ زیور میرا ہے' میں نے صرف پہننے کے لیے

دیا ہے اور مہر صرف پچاس روپے ہے' یہ میں ادا کر سکتا ہوں۔ اس اختلاف پر نزاع ہو کر عدالت میں جائے تو حاکم عدالت فریقین سے گواہ طلب کرے گا' تب لڑکی منکوحہ کا باپ اور دو بھائی گواہ پیش ہوں گے۔ باپ اپنی بیٹی اور بھائی اپنی بہن کی طرفداری کریں گے تو ناکح ان پر یہ جرح کرے گا کہ یہ منکوحہ کے حقیقی رشتہ دار ہیں۔ قرابت کی وجہ سے جھوٹ بول کر یہ منکوحہ کی طرفداری کرتے ہیں اور میری حق تلفی کرتے ہیں تو حاکم عدالت ان شہادتوں کو بوجہ طرف داری اور قرابت کے مسترد کر کے دعویٰ خارج کر دے گا بلکہ منکوحہ کوئی غیر جانب دار گواہ پیش نہ کرے گی۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ تواریخ وسیر میں درج ہے۔ تاریخ خلفاء سیوطی وغیرہ میں دیکھا گیا کہ :

"حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ کسی یہودی کے قبضہ میں تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو پہچان لیا اور یہودی سے فرمایا کہ یہ زرہ میری ہے۔ یہودی نے کہا میری ہے' میرے قبضہ میں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود خلیفۃ المسلمین تھے اور قوامین بالقسط میں داخل تھے۔ انہوں نے عدالتی کارروائی کے بغیر زرہ لینی درست نہ سمجھی' خود عدالت نہ کی کہ فریق مقدمہ تھے۔ آپ نے اس زرہ کا دعویٰ قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ کی عدالت میں دائر کر دیا۔ قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ نے فریقین کے بیانات سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر المومنین کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کریں کہ یہ زرہ آپ کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دو گواہ پیش کیے۔ ایک حسن رضی اللہ عنہ کو اور دوسرا اپنے قنبر غلام کو' دونوں گواہ ہیں کہ یہ زرہ میری ہے۔ قاضی نے امیر المومنین کے دونوں گواہ مسترد کر دیئے اور کہا کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں اور غلام کی آقا کے حق میں قبول نہیں کی جا سکتی۔ یہودی اس منصفانہ فیصلہ سے بہت متاثر ہوا اور وہ کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ کہے : لا تجوز شهادة الابن للاب۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر مفتی صاحب والی آیت پیش نہیں کی اور نہ اس مسئلہ کے ماننے سے انکار کیا' صرف حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان کرنے لگے جس کو اصول

عدالت و شہادت سے تعلق نہ تھا۔

قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ نے فیصلہ یہودی کے حق میں دے دیا' وہ مسلمان ہو گیا اور زرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو واپس کر دی لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو مسلمان ہو جانے کی وجہ سے بخش دی۔

اس کے علاوہ تخریج الہدایہ کے ص-۲۹۵ میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اپنے ماتحت افسر کو ایک حکم نامہ لکھا جس میں چند ہدایات اور احکام شہادت درج کئے جو یہ ہیں : المسلمون عدول بعضھم علی بعض الا مجلودًا فی حد ومجربا فی شھادۃ زور او ظنینا فی ولاء وقرابۃ بھم کذا فی المحلی لابن حزم۔ یعنی "سب مسلمان عادل ہیں۔ بعض ان کا بعض پر گواہی دے سکتا ہے مگر وہ شخص جس پر کسی جرم کی وجہ سے حد لگائی گئی ہو اور وہ شخص جس کا جھوٹی گواہی میں تجربہ کیا گیا ہو یا ایسا شخص ہو جس پر یہ جرح کی گئی ہو کہ جس کے حق میں گواہی دے رہا ہے' اس کا آزاد کردہ غلام ہے یا اس کا رشتہ دار ہے۔"

اس کی تائید ابوداؤد کی اس روایت سے ہوتی ہے جو باب من ترد شھادتہ کے تحت درج ہے' جس میں یہ الفاظ ہیں : ورد شھادۃ القانع لاھل البیت واجاز لغیرھم۔ یعنی "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی گواہی رد فرما دی جو گھر والوں کے لیے قانع ہے اور گھر والوں کے علاوہ کسی اور پر گواہی دے تو ان کے لیے جائز ہے۔"

قانع کا معنی ہے قناعت کرنے والا۔ مراد اس سے وہ شخص ہے جو گھر والوں کا خادم' نوکر یا غلام ہو جس کا کھانا پینا اور کپڑا وغیرہ گھر والوں کے ذمہ ہو' وہ گھر والوں کے فائدہ کے لیے گواہی دے تو اس کی گواہی مردود ہے۔ اسی طرح ایک ضعیف روایت ترمذی میں ہے جو مشکوۃ میں درج ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خائن اور خائنہ کی گواہی جائز نہیں ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں : ولا قرابۃ "اور نہ رشتہ دار کی رشتہ دار کے حق میں درست ہے۔" اس حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے کہ قریبی کی گواہی قریبی کے حق میں جبکہ غیر سے مقابلہ ہو جائز نہیں ہے۔ یہ اصول تمام عدالتوں میں مسلم ہے' جس سے مفتی صاحب کا فتویٰ غلط ہو رہا ہے۔

مفتی صاحب نے جو آیت پیش کی ہے' اس میں تو یہ عام حکم ہے کہ تم سب اہل ایمان

اللہ کے گواہ ہو۔ جب بات کہو تو انصاف سے کہو، گواہی ہو یا فیصلہ کرنا ہو تو انصاف سے کرو۔ خواہ کسی قریبی کے حق میں ہو یا اپنے نفس پر ہو، اس کی نظیر یہ آیت ہے : ولا یجرمنکم شنان قوم ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی۔ "تم کو کسی قوم کی عداوت اس کے حق میں ناانصافی کرنے پر آمادہ اور برانگیختہ نہ کر دے، انصاف کرو کہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔"

اب اس سے کوئی یہ استدلال کرے کہ دشمن کی دشمنی کے حق میں جائز ہے تو یہ باطل ہے۔ حدیث میں صاف آیا ہے کہ خصم کی خصم کے حق میں گواہی مردود ہے۔ اچھا اگر مفتی الاعتصام آیت پیش کردہ سے عدالتی شہادت کا ثبوت پیش کرتے ہیں تو اس میں پہلا لفظ ولو علٰی انفسکم یعنی "اگرچہ تم کو اپنے نفسوں پر گواہی دینی پڑے" اس سے خفیہ نکاح جس کو نکاح السر کہتے ہیں، جائز ہو جائے گا؟ ناکح منکوحہ خود ہی اپنے نفسوں پر گواہی گواہ ہو کر تن بخشی کر لیں گے۔

اس فتویٰ سے پیروں کو بہت فائدہ پہنچے گا کہ وہ اپنی مریدنیوں سے فرشتوں اور اپنے نفسوں کو گواہ کر لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ :

میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی

خلاصہ کلام یہ کہ مفتی الاعتصام کا یہ فتویٰ غلط ہے، ان کو اس سے رجوع کر لینا چاہیے۔

کتبہ عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور جلد۔۲۱، شمارہ۔۳۰ و ۳۷، مورخہ ۱۵/ نومبر سنہ۔۱۹۶۸ و ۳/ جنوری سنہ۔۱۹۶۹ء

طلاق کے مسائل

شوہر مفقود الخبر کی بیوی کے متعلق سوال

سوال: میری لڑکی قدرت بیگم جس کا نکاح سولہ سال کی عمر میں روشن شاہ ساکن ٹنڈو آدم کے ساتھ اکتوبر سنہ-۱۹۵۳ء میں ہوا اور لڑکی کو اس کے سسرال بھیج دیا- پندرہ بیس دن سسرال میں رہنے کے بعد جب لڑکی کو والدین کے مکان پر لائے تو لڑکی نے اپنے شوہر کے پاگل ہو جانے کا بیان کیا اور بتلایا کہ لڑکا قرآن مجید کی آیات کی بے حرمتی کرتا ہے اور گھر میں آٹا وغیرہ دوسری چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتا ہے- خیر ہم نے یہ حالات سن کر صبر کیا اور لڑکی کو تسلی تشفی دی- لڑکی کے والدین کے گھر آجانے کے بعد لڑکا نمعلوم کہاں چلا گیا' جس کو تقریباً چار سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہے- لڑکے کی کافی تلاش کی مگر آج تک کوئی پتہ نہیں اور لڑکے کے والدین بھی زندہ نہیں ہیں- لڑکی اپنے باپ کے پاس ہے اور میری یعنی لڑکی کے والد کی عمر تقریباً ستر سال ہے- اللہ نہ کرے میرے بعد لڑکی کا کیا حشر ہو- لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ میری لڑکی کو کہیں نکاح پڑھا دوں- اس لیے یہ سوال لکھ کر جناب سے جواب طلب کر رہا ہوں کہ از روئے قرآن و سنت ایسی حالت میں میری لڑکی کے بارے میں کیا حکم ہے؟ جواب عنایت فرمائیں' فقط-

سائل وزیر محمد ساکن حیدر آباد ۱۰- جنوری سنہ-۱۹۵۸ء

جواب: سوال سے ظاہر ہے کہ لڑکی منکوحہ کا شوہر پاگل ہو کر عرصہ چار برس سے مفقود الخبر ہے اور اس کا کوئی ایسا وارث نہیں جو اس کا پتہ دے سکے- اندریں حالات حضرت عمر فاروق خلیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ ہے کہ چار برس کے بعد وہ عورت جس کا خاوند مفقود الخبر ہے' دس دن اور چار ماہ عدت اس کی وفات کی گذار کر کسی دوسری جگہ نکاح کرے اور اس کو فوت شدہ تصور کرے-

علمائے حنفیہ نے بھی بر وقت ضرورت اس فیصلہ فاروقی پر فتویٰ دیا ہے- ملاحظہ ہو جامع الرموز' شرح مختصر وقایہ' طحطاوی' شامی شرح در مختار وغیرہ- علماء دیوبند نے بھی ضرورت کی بنا

پر اس کا فتویٰ دیا ہے۔ اس لیے یہ فیصلہ قابل عمل ہے۔ ہاں قانونی گرفت سے خطرہ دور کرنے کے لیے حکومت وقت کے حاکم سے درخواست دے کر اجازت حاصل کرنی ضروری ہے۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری بالقلم۔

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص۴۲

عدت گذر جانے پر بیوی زوجیت میں رہتی ہے یا نہیں

سوال: اہلحدیث مسلک کے مطابق مجلس واحدہ کی تین طلاقیں ایک طلاق کے حکم میں ہیں اور قبل از انقضائے عدت رجوع کیا جا سکتا ہے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے زید عدت میں رجوع نہیں کرتا اور عدت گذر جاتی ہے۔ اس کے بعد آیا اس کی زوجہ اس کی زوجیت میں رہ سکتی ہے یا نہیں؟ اگر رہ سکتی ہے تو اس کی دلیل بمطابق کتاب اللہ و سنت رسول اللہ مطلوب ہے۔ اگر نہیں رہ سکتی تو اس کی بھی دلیل مطلوب ہے۔ بینوا توجروا۔

نذیر حسین مدرسہ تعلیم القرآن ضلع سرگودھا۔

جواب: یہ مسلک جب آپ کو مسلم ہے کہ مجلس واحدہ کی تین طلاق ایک طلاق رجعی شمار ہیں جس میں عدت کے اندر رجوع ممکن ہے۔ اگر رجوع پایا گیا تو سابقہ نکاح بحال رہے گا۔ اگر رجوع نہ کیا اور عدت گذر گئی تو نکاح فسخ ہو گا۔ تب یہ مسلک بھی آپ کو ماننا لازم ہو گیا کہ طلاق رجعی کی عدت گذر جائے تو پھر نکاح جدید سے وہ عورت مطلقہ زید پر حلال ہے۔ ہاں اگر تین طلاق نافذ سمجھی جائیں تو پھر حرمت مغلظہ ہو گی اور زید پر عورت حرام ہو گئی۔ جب تک کسی دوسرے سے نکاح کرنے کے بعد اس کے فوت ہونے پر یا بلا حیلہ خود اختیاری سے طلاق ملنے پر زید پر حلال ہو سکتی تھی مگر مسلک بروئے حدیث صحیح و حسن طلاق رجعی کا راجح ہے۔ لہٰذا آپ اس پر عمل درآمد کر لیں۔ ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری بالقلم

فتاویٰ ستاریہ جلد رابع ص۱۵۶

فتویٰ بابت طلاق ثلاثہ

سوال : ایک شخص نے بحالت سفر اپنی بیوی کی طرف خط لکھ کر بھیج دیا اور اس کے اندر طلاق نامہ (تم کو تین طلاق ہیں) بایں شکل تحریر کر کے ارسال کر دیا اور عدت کے اندر پھر نادم ہوا اور اس وقت وہ شخص اپنی بیوی کو رجوع کرنا چاہتا ہے اور اس وقت عدت زوجہ مطلقہ گذر چکی ہے۔ کیا یہ رجعت جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو تجدید کی ضرورت ہے یا نہیں؟

الراقم حاجی محبت اسٹیشن تھل پوسٹ میرپور

جواب : اگر عدت کے اندر نادم ہو کر اس نے یہ کہہ دیا کہ میں نے طلاق دینے میں غلطی کی' اب رجوع کرتا ہوں تو رجوع ہو گیا۔ اب دوبارہ نکاح کی ضرورت نہ ہو گی اور اگر صرف نادم ہوا لیکن طلاق سے رجوع نہ کیا اور عدت گذر گئی تو اب عورت اس سے جدا ہو گئی' نکاح نہ رہا۔ اب اگر عورت سے صلح اور رجوع چاہے تو اس کی رضامندی سے دوبارہ نیا نکاح پڑھا سکتا ہے' نکاح سے وہ جائز ہو جائے گی۔

تین طلاق ایک بار کی تحریری ہوں یا تقریری ایک شمار ہوتی ہیں۔ جس میں عدت کے اندر رجوع ممکن ہے اور بعد گذرنے عدت کے نیا نکاح پڑھانا پڑتا ہے۔ تین طلاق کا ایک ہونے کا فتویٰ درکار ہو تو دفتر صحیفہ اہلحدیث کراچی سے رسالہ "طلاق ثلاثہ" منگوا کر پڑھیں وہ بہت صحیح ہے اور اس میں فیصلہ حق ہے۔ ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری۔

فتاویٰ ستاریہ جلد رابع ص-۱۵۶

دھوکے کی طلاق

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسمی غلام ولد حلیم محمد برادران نے مسمی محمد شفیع ولد محمد صدیق سکنہ گدڑ پورا تحصیل پاک پتن ضلع ساہیوال سے کہا یہ ایک رسید ہے اس پر اپنا انگوٹھا لگا دو۔ جب محمد شفیع نے انگوٹھا لگا دیا تو دونوں برادران نے کہا کہ

مسماۃ سکینہ کو تم طلاق نہیں دیتے تھے' ہم نے ایک ترکیب سے تم سے طلاق لکھوا لی ہے۔ محمد شفیع مذکور نے اسی وقت کہا کہ تم کتنی ترکیبیں کر لو' میں قیامت تک طلاق نہیں دوں گا۔ مسمی محمد شفیع نے مسماۃ سکینہ کو نہ تو کبھی زبانی طور پر طلاق دی ہے اور نہ تحریری۔ کیا اس حالت میں اگر یہ لوگ بناوٹی جعلی طلاق نامہ بنا کر مسماۃ سکینہ کا نکاح کسی دوسری جگہ کر دیں تو جائز ہو گا یا حرام ہے؟ بینوا توجروا۔ کیا یہ طلاق واقع ہو گئی یا نہیں؟ اگر ہو گئی تو کیا ایک طلاق ہو گی یا جتنی انہوں نے لکھی ہیں' وہ سب واقع ہو گئیں ہیں۔ از روئے شریعت محمدیہ فتویٰ صادر فرمایا جائے' بینوا توجروا۔

السائل محمد صدیق گدڑ پور تحصیل پاک پٹن ضلع ساہیوال۔

الجواب بعون الوهاب۔ الحمد لله رب العالمين۔ امابعد فاقول وبالله التوفيق۔ واضح ہو کہ بشرط صدق سوال و صحت صورت مسئولہ جواب یہ ہے کہ یہ طلاق نامہ فریبی و جعلی کارنامہ ہے۔ اس سے نہ شرعاً طلاق ہوتی ہے نہ قانوناً کیونکہ سکینہ کے خاوند مسمی محمد شفیع نے سکینہ کو اپنی زبان سے طلاق دی ہے نہ ارادہ سے لکھ کر دی ہے۔ طلاق کے دینے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ خاوند اپنی زوجہ کو طہر میں ایک طلاق زبان سے کہے یا لکھ کر دے دے پھر دوسرے مہینے میں طہر کی حالت میں دوسری طلاق دے۔ اس دوران میں خاوند رجوع کر کے مصالحت کر لے تو نکاح بحال رہتا ہے۔ اگر رجوع نہ کرے تو تیسرے طہر میں تیسری طلاق دے تو یہ طلاق مغلظہ بائنہ ہو گئی۔ اب یہ عورت خاوند طلاق دہندہ پر قطعاً حرام ہو گئی۔ نکاح ختم ہو چکا۔

لیکن محمد شفیع نے نہ سکینہ کو اس طرح طلاق زبانی دی اور نہ تحریری دی ہے۔ سکینہ کے وارثوں نے جعلی طلاق نامہ لکھ کر اس پر رسید کی گواہی کا چکمہ دے کر انگوٹھا لگوا لیا تاکہ یہ طلاق نامہ محمد شفیع کی طرف سے بن جائے۔ جب یہ فریب کاری کی تو اس جعلی طلاق نامہ کو محمد شفیع کی طرف منسوب کر دیا' جس سے وہ اسی وقت انکار کر گیا تو یہ طلاق کسی صورت اور کسی مذہب میں واقع نہیں ہوئی۔ مسماۃ سکینہ بدستور اس کے نکاح میں ہے جس کا دوسری جگہ کسی شخص سے نکاح کرنا قطعاً حرام ہے بلکہ اس کا نکاح کرنے والے سخت مجرم اور سخت گنہگار ہوں گے اور یہ نکاح زنا قرار پائے گا اور ہمیشہ تاحیات یہ زناکاری ہوتی رہے گی اور فریب کاری کرنے والے اور باوجود علم ہونے کے دوسرا نکاح کرنے اور کرانے والے سب

سزا شرعی اور قانونی تعزیر کے مستوجب ہوں گے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "من غشنا فلیس منا" کہ جس شخص نے کسی مسلمان سے فریب کیا وہ ہماری امت سے نہیں ہے۔

دھوکہ کی بیع' دھوکہ کی طلاق' دھوکہ کا نکاح منعقد نہ ہو گا۔ مسلم شریف میں حدیث ہے: عن ابی هریرة رضی اللّٰہ عنہ قال نهی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم عن بیع الحصاة وعن بیع الغرر۔ یعنی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جناب رسول کریم ﷺ نے کنکری پھینک کر بیع کرنے اور دھوکہ کی بیع سے منع فرمایا۔ عقد نکاح اور طلاق معاملات میں داخل ہیں اور بیع کی نوعیت رکھتے ہیں۔ اس لیئے ان میں بھی دھوکہ کرنا حرام ہے۔ اگر کیا تو اس کا کچھ اعتبار نہ کیا جائے گا۔

زاد المعاد مصری ربع نمبر۔۴' ص۔۳۸ میں ہے: ان العمل مع النیته هو المعتبر یعنی جو کام ارادہ اور نیت سے کیا جائے اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ پھر یہ لکھا ہے: واما العتاق والطلاق فاسمان لمسمیین قائمین باللسان اوناب عنه من اشارة او کنایة یعنی غلام آزاد کرنا اور اپنی بیوی کو طلاق دینا یہ دو نام ایسے مسمیان کے لیے ہیں جو زبان کے ساتھ قائم ہیں یا جو زبان کے قائم مقام ہو جیسے ہاتھ یا سر سے اشارہ کرنا (یہ بہرہ کے لیے ہے) یا ہاتھ سے لکھنا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ طلاق کی نیت کر کے لفظ طلاق کا بولے یا ہاتھ سے لکھے یا بول کر کسی سے لکھوائے تب طلاق واقع ہو گی۔ پس محمد شفیع نے طلاق کا لفظ سکینہ کو مخاطب کر کے نہ بولا نہ لکھا اور نہ بول کر لکھوایا بلکہ کسی نے اپنی طرف سے لکھ کر اس کا دھوکہ سے انگوٹھا لگوا لیا تو یہ طلاق اور طلاق نامہ جعلی ہے' جس کا کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ فریب کاری کرنے والے مستوجب سزا ہیں۔

زاد المعاد جزء رابع نمبر۔۳۹ میں یہ لکھا ہے: وقد روی وکیع عن ابن ابی یعلٰی عن الحکم عتیبه عن خیثمة بن عبدالرحمٰن قال قالت امراة لزوجها سمنی فسماها الظبیة فقالت ما قلت شیئا قال فهات ما اسمیک به قالت سمنی خلیة طالقا قال انت خلیة طالق فاتت عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنه فقالت ان زوجی طلقنی فجاء زوجها فقص علیه القصه فارجع عمر رضی اللّٰہ عنه راسها وقال لزوجها خذ بیدها وا

وجع راسھا یعنی خیثمہ بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا کہ ایک عورت نے اپنے خاوند سے جو اس کو طلاق دینا نہیں چاہتا تھا یہ فریب کیا کہ ان کو کہا کہ تم میرا کوئی نام رکھو۔ خاوند نے کہا کہ تیرا نام ظبیہ ہے (ہرنی)۔ عورت نے کہا کہ میں نے تجھے یہ نام نہیں کہا۔ خاوند نے کہا کہ پھر تم بتاؤ کہ تمہارا کیا نام مقرر کروں؟ عورت نے کہا تم میرا نام یہ رکھو "خلیہ طالق" خاوند نے کہا کہ اچھا تیرا نام ہے۔ خلیہ طالق عورت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں جا کر یہ دعویٰ کیا کہ میرے خاوند نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ میرا فیصلہ صادر فرمایئے۔ خاوند بھی موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا اور اپنا سارا قصہ اور عورت کی فریب کاری بیان کر دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو سزا دی اور خاوند کو کہا کہ اس کو پکڑ لے اور لے جا اور اس کے سر پر سزا دے کہ دماغ ٹھیک ہو جائے۔

اس واقعہ کو لکھ کر امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "فھذا محکم من امیر المؤمنین بعدم الوقوع ای لم یقصد الزوج اللفظ التی یقع بہ الطلاق بل قصد لفظا لا یرید بہ الطلاق" یعنی یہ حکم اور فیصلہ امیرالمومنین عمرفاروق رضی اللہ عنہ کا ہے کہ طلاق اس فریب کاری سے واقع نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس شخص نے طلاق کا قصد کر کے یہ الفاظ نہ کہے تھے۔ بلکہ یہ بطور نام الفاظ کہے۔ طلاق کے ارادے سے یہ الفاظ نہیں کہے۔ میں کہتا ہوں کہ خلیہ طالق کا معنی یہ ہے کہ لفظ خلیہ کا معنی ہے کہ تجھے چھوڑ دیا اور طالق کا معنی ہے کہ تجھ پر طلاق ہے تو طلاق والی ہے۔ یہ الفاظ تو ٹھیک طلاق کے لیے ہیں لیکن اس عورت نے فریب کاری سے کہا کہ میرا نام یہ مقرر کر دو۔ طلاق کی نیت نہ تھی' اس لیے طلاق شمار نہ ہوئی بلکہ اس عورت کو فریب کاری کی سزا دی گئی۔ محمد شفیع نے تو ایسا کوئی لفظ بھی نہیں بولا اور نہ اس کو خبر تھی تو یہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔ اب عدالت یا پنچائت یا یونین کونسل کے صدر چیئرمین کو چاہیے کہ سکینہ محمد شفیع کے حوالہ کر دیں اور فریب کنندگان کو مناسب سزا لگا دیں۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

صحیفہ اہل حدیث جلد ۵۷' شمارہ ۴' مورخہ ۲۹ صفر سنہ ۱۳۹۶ھ

مظلومہ بیوی کے متعلق سوال

سوال : کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید کا نکاح مسماۃ ہندہ سے عرصہ بارہ سال کا ہوا ہے لیکن زید اور ہندہ کا باہمی اتفاق صرف چند ماہ رہا بعد ازاں زید کا اپنی منکوحہ بیوی سے کوئی سلوک نہیں۔ جب زید ہندہ کو اپنے گھر لے جاتا ہے چند یوم گذرے مار پیٹ کر نکال دیتا ہے۔ مار پیٹ کر گھر سے نکال دینے کا معاملہ کئی دفعہ ہو چکا ہے۔ چونکہ ہندہ کے والدین وفات پا چکے ہیں' ہندہ کا چچا بھیج دیتا ہے۔ اب لڑکی نے زید کے گھر جانے سے تنگ آکر کہہ دیا ہے کہ میں جانے کے لیے تیار نہیں۔ اگر بھیجو گے تو میں پھر کوئی اور ذریعہ اختیار کروں گی۔ چونکہ میں زید کے ظلم و ستم سے تنگ آگئی ہوں' لہٰذا میں جانے کے لیے تیار نہیں۔ بینوا توجروا۔

سائلہ بسم اللہ

جواب : زید ظالم اور سخت گنہگار ہے۔ ہندہ مظلومہ اور متضررہ ہے۔ اس کو چاہیے کہ بحکم قرآن حکما من اهله وحکما من اهلها اپنے قریبیوں میں سے کسی کو حکم بنا کر اپنا فیصلہ کرا لے۔ حکم' پنچ زید کو ظلم سے روکے۔ اگر نہ رکے تو اس کو طلاق کا حکم دے۔ اگر وہ طلاق نہ دے تو حکم نکاح فسخ کر دے۔ پھر ہندہ کسی دوسری جگہ اپنا نکاح کر لے۔ اب جو پنچایتیں حکومت بنا رہی ہے' وہ ایسے مرضوں کا علاج کریں گی۔ ہندہ کسی پنچایت کے ذریعہ اپنا فیصلہ کرا لے۔ اگر امیر اور جماعت کا سلسلہ قائم ہے تو بذریعہ امیر فیصلہ کرا لے۔ اگر کوئی صورت نہ ہو تو عدالت میں فسخ نکاح کی درخواست دے کر اپنا حال ظاہر کرے پھر حاکم نکاح فسخ کر دے گا یا طلاق دے گا یا خرچہ دلوا دے گا۔ حکومت کے پاس ایسے جھگڑوں کا علاج ہے۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص-۱۸۶

فتویٰ بابت طلاق ثلاثہ

سوال : بخدمت جناب امام جماعت غرباء اہلحدیث مولانا عبدالستار صاحب بعد سلام کے

گزارش ہے کہ ایک مجلس اور ایک وقت میں ایک ساتھ شوہر اپنی عورت کو تین یا چار بار طلاق کہہ دے تو شرع محمدی کے بموجب تین طلاق ہو گی یا ایک طلاق؟ جواب صرف قرآن و حدیث سے ہو۔

سائل آپ کا تابعدار ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول چک-۱۴۰ ضلع تھرپارکر سندھ۔

جواب: ایک طہر میں تین طلاق دینا حرام اور بدعت ہے۔ اس سے بچنا واجب ہے پھر اس میں اختلاف کرنا درست نہیں۔ صحیح و راجح مذہب یہ ہے کہ ایک طہر ایک طلاق کا محل ہے۔ لہٰذا ایک واقع ہو گی' دو لغو ہو جائیں گی۔

مسند احمد میں حدیث ہے کہ عہد نبوی میں کسی شخص نے ایک مجلس میں تین طلاق دیں تو آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ راجعها فانها واحدة یعنی تم طلاق سے رجوع کر لو یہ تین ایک ہی ہیں۔

مسلم شریف میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: كان الطلاق على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وابى بكر وسنتين من خلافة عمر طلاق الثلث واحدة یعنی عہد نبوی اور زمانہ خلافت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ خلافت فاروقی رضی اللہ عنہ میں دو سال تک یہی قانون نافذ رہا ہے۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ عام طور پر تین طلاق دیتے ہیں' یہ گناہ ہے۔ اس گناہ کو روکنے کے لیے تعزیر کے طور پر تین جاری کر دیں۔ اصل حکم شرعی وہی ہے جو عہد نبوی میں تھا۔ پھر وحی بند ہو گئی تو حکم یہی قائم رہا لیکن گناہ روکنے کو خلیفہ نے سیاسی طور پر ایسا کیا تھا۔ خلیفہ ایسی تدبیر کر سکتا ہے مگر شرع میں تین ایک مجلس کی ایک ہیں۔ تین طلاق تین ماہ میں دینا مشروع ہے۔ اس سے عورت قطعاً حرام ہو جاتی ہے۔ ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری۔

فتاویٰ ستاریہ جلد رابع ص-۱۵۱

فتویٰ بابت طلاق ثلاثہ

بخدمت جنابت مولانا عبدالستار صاحب محدث دہلوی جماعت غرباء اہلحدیث کراچی۔۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ- مزاج شریف' امید ہے کہ آپ ہر طرح خیریت سے ہوں گے' اس جگہ خیریت ہے- عرض یہ ہے کہ ایک مسئلہ درپیش ہے- براہ مہربانی سوال مسئلہ جو کہ مندرجہ ذیل ہے کا صحیح جواب بمعہ حوالہ قرآن حکیم و حدیث مکمل طریقہ پر لکھ کر بھیج دیں' بڑی مہربانی ہو گی- ہمارا یہ مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے- اس خط کے ساتھ ایک خالی لفافہ بھی ارسال خدمت ہے-

سوال : ایک شخص کی شادی کو تقریباً ۱۳' ۱۴ سال کا عرصہ ہو گیا ہے- دونوں میاں بیوی کی آپس میں بہت محبت تھی اور بخوشی اپنی زندگی گذار رہے تھے- عرصہ تقریباً ایک ماہ کا ہوا کہ اس شخص کی بیوی اپنے والدین کو ملنے کے لیے گئی- اس کے چند دن بعد یہ شخص اپنی بیوی کو لینے کے لیے اپنے سسرال گیا- وہاں پر دو تین روز قیام کرنے کے بعد آپس میں میاں بیوی اور اس شخص کی سسرال والوں کا اس کے ساتھ جھگڑا ہو گیا اور معاملہ طوا پکڑ گیا- نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس شخص نے اپنی منکوحہ بیوی کو باضابطہ طور پر اسٹامپ پر لکھ کر طلاق نامہ دے دیا- طلاق نامہ کے درمیان تین دفعہ لکھ دیا کہ میں نے طلاق دیا- لفظ طلاق تین دفعہ لکھ چکا ہے- جب یہ شخص طلاق دے کر یہاں پر آیا- چند دن گذرنے کے بعد اس شخص کو بہت زبردست احساس ہوا- یہ اپنی جگہ بہت پریشان ہوا اور اس کی بیوی اپنی جگہ بہت پریشان اور بعد میں بہت پچھتا رہے ہیں- پھر اس شخص اور اس کے سسرال والوں نے علماء کی طرف رجوع کیا- بیچ میں چند مولوی صاحبان کہتے ہیں کہ طلاق واقع ہو چکی ہے اور چند مولوی صاحبان کہتے ہیں کہ طلاق واقع نہیں ہوئی- ہم بڑی شش و پنج میں ہیں- براہ مہربانی آپ مکمل طریقہ پر بمعہ حوالہ حدیث و قرآن مجید سے فتویٰ لکھ کر بھیج دیں- آپ کی بڑی مہربانی ہو گی-

نوٹ : حالات اس معاملہ کے متعلق یہاں تک پہنچ چکے ہیں کہ اگر یہ طلاق واقع ہو گئی تو ان دونوں میاں بیوی میں سے ممکن ہو سکتا ہے کہ خود کشی کر لیں کیونکہ محبت بہت زیادہ تھی-

احقر عبدالشکور بقلم خود ۲۶- فروری سنہ ۱۹۵۷ء

جواب : واضح ہو کہ جس شخص نے ایک طہر میں ایک مجلس کے اندر تین بار طلاق اپنی عورت کو کہہ دی یا کاغذ پر لکھ دی تو وہ بروئے حدیث صحیح ایک طلاق شمار ہو گی- مسلم

شریف میں حدیث ہے کہ آنحضور ﷺ کے عہد مبارک میں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تین بار کی طلاق (جو ایک مجلس کی تھی) وہ ایک شمار ہوتی تھی۔ پس اس شخص نے اگر عدت تین حیض کے اندر اندر اپنی عورت کی طرف رجوع کر لیا تو نکاح سابق قائم رہا اور اگر رجوع نہیں کیا شش و پنج یا مولویوں کے دھوکہ میں رہا تو پھر عدت گذرنے پر پہلا نکاح نہ رہا۔ اب دوبارہ نکاح پڑھا کر آباد ہو سکتے ہیں۔ تین طلاق جن سے عورت قطعاً حرام ہو جاتی ہے وہ تین طلاقیں ہیں جو ہر مہینہ میں حیض آنے کے بعد دی جائے اور تین ماہ تک دیتا رہے۔ ایک مجلس کی تین طلاق ایک شمار ہیں۔ مسلم شریف' مسند احمد' نیل الاوطار' زاد المعاد اور اعلام الموقعین میں اس مسئلہ کی پوری بحث ہے یا آپ اردو میں ایک کتاب نکاح محمدی ہے' وہ کراچی بنس روڈ مکتبہ سعودیہ سے منگوا لیں۔ یہ مسئلہ اس میں مفصل مذکور ہے' والسلام۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری۔

فتاویٰ ستاریہ جلد رابع ص-۱۷۵

منکوحہ لونڈی کا بیچنا طلاق ہے یا نہیں؟

ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حنفیہ میں مخالفت

کتاب الآثار امام محمد مترجم کے ص-۱۷۲ میں ہے کہ امام محمد نے کہا کہ ہم کو ابوحنیفہ نے خبر دی کہ حماد سے روایت ہے' وہ ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں' ابراہیم نخعی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا' انہوں نے یہ کہا کہ لونڈی خاوند والی بیچی جائے تو یہ بیچنا طلاق ہے۔

لیکن ہم ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ مسئلہ نہیں لیتے لیکن ہم رسول اللہ ﷺ کی حدیث لیں گے۔ جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریرہ لونڈی خریدی اور اس کو آزاد کیا اور آنحضرت ﷺ نے بریرہ کو اختیار دے دیا کہ خواہ اپنے خاوند کے پاس رہے یا اپنی جان کو اختیار کرے یعنی اس سے جدا ہو۔ امام محمد فرماتے کہ اگر محض بیع سے طلاق واقع ہو جاتی تو بریرہ کو رہنے یا نہ رہنے کا اختیار نہ دیا جاتا۔ فوراً خاوند سے علیحدہ ہو جاتی۔ یہی مذہب ہے عمر' علی'

عبدالرحمٰن، سعد بن ابی وقاص اور حذیفہ رضی اللہ عنہم کا کہ لونڈی کی بیع طلاق نہیں ہے۔
حنفیہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مذہب ترک کر دیا۔ پس یہ کہنا کہ ہمارے مذہب کا دارومدار ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مذہب پر ہے، سراسر غلط ہے۔ امام ابوحنیفہ کو یہ معلوم تھا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مذہب یہ ہے کہ منکوحہ لونڈی کی بیع ہی طلاق ہے لیکن عمداً ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے خلاف کیا۔ مولانا عبدالرشید نعمانی لغات القرآن جلد۔۴، ص۔۲۴۲ میں یہ لکھتے ہیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ عام طور پر مسائل فقہیہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی کا مسلک ہی اختیار فرماتے ہیں۔
میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ میں تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی کی حنفیہ نے خلاف ورزی کی ہے۔ اسی طرح اور مسائل میں بھی مخالفت ہے۔ چنانچہ ہم نے ان کی مخالفت کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اس سے معلوم کر لیں کہ مذہب حنفی اور مذہب ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں بعد المشرقین ہے۔

عبدالقادر عارف الحصاری

الاسلام لاہور جلد۔۲، شمارہ۔۴۵، مورخہ ۷۔جنوری سنہ۔۱۹۶۷ء

فتویٰ بابت خلع

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ایسی عورت کے بارہ میں جو کہ اس کا اپنے خاوند کے ساتھ چند ایسے امور میں جھگڑا ہوا ہے جو اس کے خاوند سے صادر ہوئے اور اس کے متعلق چند ایسے اقوال کہہ دیئے جو آپس کی ناچاقی اور موجب طلاق بن سکتے ہیں اور وہ عورت خاوند کو شرعی ثالث کی طرف دعوت دیتی ہے اور خاوند شرعی ثالث کو مانتا نہیں ہے بلکہ اس نے ایک اور عورت سے نکاح کر لیا ہے اور وہ اپنے والد کے گھر معلقہ ہو کر بیٹھ گئی ہے۔ اور اس کا خاوند نہ اس کو خرچ دیتا ہے اور نہ طلاق دیتا ہے اور نہ شرعی ثالث تسلیم کرتا ہے۔ کیا ایسی صورت میں عورت خلع کا مطالبہ کرے تو جائز ہو گا اور کیا خاوند کو خلع واجب ہو جائے گا۔ اور ایسی صورت میں عورت سے مال لے کر طلاق دینا اور شرعی ثالث نہ ماننا یا معلق بٹھا دینا اور خلع نہ کرنا اور نہ اس کو خرچ دینا اور اس حال پر چھوڑ دینا خاوند کے لیے جائز ہے۔ کیا ایسی صورت میں عورت اگر قانونی عدالت کی طرف رجوع کر کے اپنی گلو خلاصی کروا

لے یا کسی نیک عالم سے فسخ نکاح کا فتویٰ حاصل کر لے تو شرعاً جائز ہو گا؟

(۱) کیا صورت مرقومہ میں خلع کا مطالبہ درست ہے؟

(۲) کیا خاوند پر اس صورت میں خلع واجب ہے یا نہیں؟

(۳) کیا اگر خاوند خلع پر راضی نہ ہو تو حاکم وقت سے یا کسی دیندار سے فسخ نکاح کا فتویٰ حاصل کر لے تو شرعاً جائز ہو گا؟

(۴) کیا فسخ نکاح کی صورت میں مہر واپس کرنا پڑے گا یا بوجہ ظلم خاوند اور انکار فیصلہ شرعی کے مہر بھی واپس نہ کیا جائے گا کیونکہ خلع تو ہوا نہیں بلکہ جبرا تنسیخ نکاح ہوا ہے۔

(۵) کیا مال جہیز جو خاوند کے گھر ہو' وہ خاوند کے لیے جائز الاستعمال ہے یا خاوند کو شرعاً حلال نہیں؟

(۶) کیا اس صورت میں عورت مظلومہ ہے اور اس کی مدد ضروری ہے؟

از روئے شریعت مقدسہ بحوالہ کتب معتبرہ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیے۔

جواب : (۱) اگر صورت سوال صحیح ہے تو خاوند ظالم ہے' اس کو طلاق شرعی طریقہ سے دینے کا حکم ہے۔ اگر طلاق نہ دے تو حکومت کی طرف رجوع کر کے اس سے طلاق حاصل کر لیں۔ خلع تو تب ہو سکتا ہے کہ عورت نشوز کرے اور عورت کا ظلم ہو تو وہ مہر اور خرچ شادی واپس کر کے طلاق حاصل کر لے۔ لیکن یہاں خاوند کا ظلم ہے۔ اب اگر عورت خلع کرے گی تو اس مظلومہ کو مہر وغیرہ ناحق واپس کرنا پڑے گا' یہ دوسرا ظلم ہو گا۔ ہاں اگر خاوند بغیر خلع طلاق نہ دے یا حکومت بغیر خلع عورت کا نکاح فسخ نہ کرے تب خلع کی صورت تجویز کریں۔ بہرصورت عورت متفردہ مظلومہ کی رہائی اس سے جلدی کرائیں' معلقہ رکھنا جرم پر جرم ہے۔

(۲) خلع کا مطالبہ اس شرط سے درست ہے کہ بغیر خلع کے خاوند طلاق نہ دے ورنہ اس کو بغیر خلع کے خود طلاق دینا واجب ہے یا آباد کرنا ضروری ہے۔

(۳) اگر خاوند راضی نہ ہو تو حاکم عدالت کی طرف رجوع کر لیں۔ اگر کوئی عالم فیصلہ کرے گا تو خاوند ظالم ہے اور مقدمہ بازی کرے گا جس سے فساد ہو گا' اس لیے حاکم سے فیصلہ کرا لیں' قانون نکاح فسخ کا حکومت میں موجود ہے۔ یہ فتویٰ درخواست سے منسلک کر کے نکاح فسخ کی درخواست دیں۔

(۴) خاوند ظالم ہے تو مہر واپس لے کر طلاق دینے کا حکم نہیں ہے۔ بغیر واپس مہر خاوند کو طلاق دینے کا حکم ہے۔ ہاں اگر اس کے ظلم سے رہائی ممکن نہ ہو تو پھر مجبورا مہر وغیرہ واپس دے کر نکاح فسخ کرالیں۔ خلع عورت کا نافرمانی پر ہوا کرتا ہے۔

(۵) خاوند کے گھر میں جو جہیز عورت کا حق ہے وہ خاوند کو استعمال کرنا ناجائز بہتر یہ ہے کہ عورت کو واپس کر دے۔ ہاں اگر خلع میں واپسی کی شرط سے طلاق واقع کی ہو تو پھر خاوند کا حق ہو جائے گا۔

(۶) بلاشبہ عورت مظلومہ ہے اس کی مدد نہایت ضروری ہے ورنہ تمام اقرباء و اہل محلہ اور خاوند اور اس کے خاندان کے لوگ مجرم ہوں گے اور قیامت کے دن پکڑے جائیں گے ظلم کے ہاتھ۔ اگر خاوند فیصلہ نہ کرے تو عدالت میں عورت کی امداد کرنا واجب ہے۔

عبدالقادر حصاری

فتاویٰ ستاریہ جلد۔ چہارم ص۔۱۸، ۱۹

قاصر حق زوجیت سے بیوی شرعاً کیونکر چھٹکارا پا سکتی ہے؟

سوال: زید نے ہندہ سے اس حالت میں نکاح کیا کہ وہ حق زوجیت ادا کرنے سے قاصر تھا۔ ہندہ اس کے ساتھ ڈیڑھ سال میں مختلف وقفوں کے ساتھ چار پانچ مہینے رہی۔ جب بھی وہ میکے آئی' اس نے جانے سے انکار کیا اور زید یہ جھوٹا یقین دلا کر لے گیا کہ اب وہ تندرست ہو گیا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ہندہ زید کے ساتھ قید نکاح میں بندھے رہنے سے صاف طور پر انکار کر چکی ہے۔ عرصہ چھ ماہ سے اپنے میکے میں ہے اور زید سے طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے لیکن زید طلاق دینے پر اس شرط کے سوا آمادہ نہیں ہے کہ ہندہ فدیہ میں (مہر کے علاوہ جو زیورات کی صورت میں تھا اور زید ہندہ سے چھین چکا ہے) ایک ہزار روپیہ مزید زید کو دے جو اس کے کہنے کے مطابق شادی پر خرچ ہوئے تھے۔ اس رقم کی ادائیگی ہندہ اور اس کے وارثوں کے بس سے باہر ہے۔ ہندہ میں مالی لحاظ سے اتنی سکت بھی نہیں کہ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا کر اس ناکارہ انسان سے چھٹکارا پا سکے۔ دوسری طرف وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ موجودہ حالت میں زندگی حدود اللہ میں رہ کر نہیں گذار سکتی۔ اس پر طرہ یہ کہ زید اس پاک دامن لڑکی پر یہ تہمت لگا چکا ہے کہ تو مجھے بدکار عورت معلوم ہوتی

ہے، تبھی میرے ہاں خاموشی کے ساتھ رہ رہی ہے۔ ہندہ کی زید سے نفرت اور توحش کا یہ عالم ہے کہ زید ہندہ کے والد کے انتقال پر تعزیت کے لیے گیا تو اسے دیکھتے ہی ہندہ کو اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ زید کی یہ ضد ہندہ کی صحت پر بری طرح اثر انداز ہو رہی ہے اور خطرہ ہے کہ اس کے لیے جان لیوا ثابت نہ ہو۔ ہندہ کی روایت کے مطابق زید کے والد کو جس نے خود نکاح کا خطبہ پڑھا تھا، اس بات کا علم تھا کہ اس کا لڑکا حق زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ ہندہ کو یہ رشتہ ناپسند تھا اور اس خوف سے مبادا وہ انکار نہ کرے، اس سے نکاح کے وقت پوچھا بھی نہیں گیا تھا۔ ان تمام امور کے پیش نظر دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) از روئے شریعت ہندہ کا زید کے ساتھ نکاح ہوا یا نہیں؟

(۲) اگر نہیں ہوا تو کیا وہ دوسرا نکاح کر سکتی ہے؟ اور اس کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

(۳) اگر از روئے شریعت نکاح ہو چکا ہے تو مظلوم ہندہ کے چھٹکارے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

(۴) کیا زید کتاب و سنت کی رو سے فدیہ میں مہر سے زیادہ مال کا مطالبہ کر سکتا ہے؟ اگر کر سکتا ہے تو کیا اس سے وہ مقصد فوت نہیں ہو جاتا جس کے پیش نظر شریعت نے عورت کو خلع کا حق دیا ہے کیونکہ مرد اتنی زائد رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے جس کی ادائیگی عورت کے بس سے باہر ہو۔

سائل خورشید الزماں معرفت راجہ عبدالحمید صاحب نیوز ایڈیٹر لاہور۔

جواب: بشرط صدق سوال جواب یہ ہے کہ ہندہ کو زید سے الگ کر کے مصیبت سے رہائی دلانے کی کئی صورتیں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ عدالت میں درخواست دے کر تمام حالات ظاہر کریں تاکہ عدالت نکاح فسخ کر کے دوسرے نکاح کی اجازت دے۔ جب حکومت فیصلہ کے لیے موجود ہے تو فتویٰ نزاع میں کارآمد نہیں ہو سکتا۔ ہم اگر کوئی فتویٰ دیں اور فریق مخالف نہ مانے تو وہ عدالتی کارروائی کر کے ہندہ کو کسی دوسری مصیبت میں ڈال دے گا۔ پھر عدالت محض فتوے کو تسلیم نہ کرے گی، وہ اپنے قانون پر عمل کرے گی۔

(۲) بذریعہ پنچایت زید سے طلاق حاصل کی جائے۔ اگر طلاق نہ دے تو پنچایت اس کو ایک سال علاج کرانے کی مہلت دے۔ اگر کسی ڈاکٹر یا طبیب کی شہادت سے یہ واضح ہو جائے کہ یہ شخص صحت یاب ہو گیا ہے تو ہندہ کو سمجھا کر اس کے گھر بھیج دیا جائے۔ فتاویٰ نذیریہ اور زاد المعاد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ جماعت بعض صحابہ کا یہی فیصلہ درج ہے۔ موطا امام مالک میں بھی یہی لکھا ہے۔

(۳) اگر سال بھر انتظار مشکل ہو تو کسی عالم یا مقامی امام مسجد کو ثالث بنا کر ایک پنچایت میں صورت خلع پیش کریں کہ ہندہ سے مہر اور زیور جو کچھ شادی میں دیا ہے وہ لے کر زید کے حوالہ کر دیں اور نکاح فسخ کر دیں۔ اگر زید طلاق دے دے اور اپنا مال دیا ہوا واپس لے لے تو اچھا ہے ورنہ مال پنچایت میں امانت رکھا جائے اور نکاح فسخ کر دیا جائے اور لڑکی کو ایک حیض عدت گذار کر دوسری جگہ نکاح کی اجازت دی جائے۔ عہد نبوی کا واقعہ ہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی عورت حبیبہ رضی اللہ عنہا صبح سویرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور بیان کیا کہ میرے خاوند نے مجھ کو مارا' جس سے کہ میری ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں اس کے پاس رہنا نہیں چاہتی۔ اس پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت رضی اللہ عنہ کو بلوا کر کہا کہ تو اس سے کچھ مال لے لے اور اس کو چھوڑ دے۔ ثابت رضی اللہ عنہ نے دبی زبان سے کہا کہ یا رسول اللہ! کیا مناسب اور درست اسی طرح ہے؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اسی طرح ٹھیک ہے۔ پس ثابت رضی اللہ عنہ نے وہ دو باغ جو مہر میں دیئے تھے اور حبیبہ رضی اللہ عنہا کے قبضہ میں تھے' واپس لے کر اس کو چھوڑ دیا۔ (ابوداؤد بمع عون المعبود)

مہر سے زیادہ خلع میں لینا جائز نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ ہندہ کو اس کی وسعت نہیں ہے۔ دار قطنی میں حدیث ہے کہ اما الزیادۃ فلا یعنی مہر سے زیادہ لینا جائز نہیں ہے۔ زیور وغیرہ شادی کا عطیہ سب مہر میں شمار ہے۔ حکومت نے پنچایتوں کا انتظام کیا ہے۔ پس ایسی پنچایتوں میں ایسی مظلومہ عورتوں کی حق رسی ضروری ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری۔

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص۱۴۱ تا ۱۴۳

مظلومہ بیوی کے متعلق استفسار

سوال : زید کا نکاح مسماۃ ہندہ سے عرصہ آٹھ سال ہوا لیکن زید اپنی منکوحہ بیوی ہندہ کو گھر لے جا کر چار پانچ روز کے بعد زدوکوب کر کے واپس میکے بھیج دیتا ہے۔ (ہندہ بوجہ ستم) اپنے چچا کے پاس رہتی ہے۔ زید آکر پھر ہندہ کے چچا سے وعدہ وعید کر کے لے جاتا ہے۔ لیکن جب ہندہ گھر جاتی ہے تو پھر مار پیٹ کر نکال دیتا ہے۔ اب ہندہ نے تنگ آکر جواب دے دیا ہے کہ میں زید کے گھر نہیں جاؤں گی۔ اگر مجھے جبراً بھیجو گے تو میں کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔ اس کے متعلق شرعی فیصلہ تحریر فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

سائل عبدالرحمٰن

جواب : اگر زید اپنی بیوی پر ایسا ظلم کرتا ہے کہ نہ اس کو طلاق دیتا ہے اور نہ آباد کر کے اس کا حق پورا کرتا ہے بلکہ بلا وجہ مارتا ہے تو موجودہ عدالت میں درخواست دے کر نکاح فسخ کرالیں پھر کسی دوسری جگہ اس عورت کا نکاح کر دیں۔ یا اب پنچایتوں کا دستور قائم ہو گا وہاں درخواست دے کر بذیعہ پنچایت فیصلہ کرالیں۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص-۱۷۶

مفقود الخبر کی بیوی اور اس کے ترکہ کے متعلق سوالات

سوال : بخدمت جناب مولانا صاحب مفتی پاکستان کراچی۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین:

(۱) ایک شخص اب سے پانچ سال پہلے حج کے لیے سعودی عرب گیا تھا جو اب تک لاپتہ ہے۔ کیا اب اس شخص کی بیوی نکاح ثانی کر سکتی ہے یا نہیں؟

(۲) لاپتہ شخص کی دو لڑکیاں ہیں۔ ان لڑکیوں کی وراثت کے بارہ میں ان کی نانی اور پھوپھی کے درمیان تنازعہ ہے۔ کیا ان لڑکیوں کی وارث نانی ہو سکتی ہے یا پھوپھی؟

ایک سائل از جھڈو

جواب: (۱) لاپتہ شخص جس کو شرعاً مفقود الخبر کہتے ہیں، اس کی بابت فیصلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ ہے کہ چار سال انتظار کر کے پھر اس کو فوت شدہ تصور کر کے چار ماہ دس دن عدت گذارے پھر کسی شخص سے عقد ثانی کرے۔ یہ نکاح درست ہو گا۔ پھر وہ اگر آجائے تو اس کو عورت نہیں مل سکتی۔ نکاح فسخ ہو چکا ہے، اس کی سزا بھی ہے کیونکہ اس نے نہ اپنی اطلاع بھیجی اور نہ عورت کو خرچہ دیا۔ تب عورت کو دوسری جگہ نکاح کرنے کا اختیار ہو گیا اور خاوند اول کا کچھ حق نہ رہا۔

(۲) جب وہ شخص فوت شدہ سمجھا گیا تو اس کی وراثت اس طرح تقسیم ہو گی کہ عورت کو آٹھواں حصہ اور لڑکیوں کو دو ثلث اور چھٹا حصہ نانی کو اور باقی بن کو ورثہ ملے گا کہ وہی بطور عصبہ باقی ہے۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص ۱۷۱

دھوکے سے فسخ نکاح کا فیصلہ کالعدم سمجھا جائے گا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ زید کی لڑکی ہندہ کا نکاح مورخہ ۲۸-۳-۱۹۶۶ کو عمر کے لڑکے بکر سے ہوا۔ پھر چند ماہ کے بعد ہندہ کا گھر کے افراد سے جھگڑا ہو گیا، اس پر ہندہ کے والدین کہنے لگے کہ بس ہم نے تو طلاق لینی ہے۔ بکر کے والدین کہنے لگے کہ ایسا نہ کرو۔ ہم ان میاں بیوی کو علیحدہ کر دیتے ہیں، ان کا تو آپس میں اتفاق ہے۔ لڑکی کے والدین نے ضد سے کام لیا اور ۲۶-۳-۱۹۶۸ کو یونین کونسل میں تنسیخ نکاح کا کیس کر دیا۔ کونسل نے فریقین کے بیان لیے اور پوری تحقیق کے بعد لڑکے (بکر) کے حق میں فیصلہ دے دیا اور یہ ثابت کیا کہ نہ لڑکے کا قصور ہے نہ لڑکے کے والدین کا، صرف یہ جہیز کا سامان دبانا چاہتے ہیں۔ پھر کچھ دنوں کے بعد لڑکی کے والدین نے عدالت میں کیس کر دیا۔

عدالت نے پوری کوشش کر کے یہ ثابت کیا کہ نہ لڑکی کا قصور ہے، نہ لڑکے کا۔ صرف لڑکی کے والدین کا قصور ہے۔ لہٰذا عدالت نے بھی ڈگری لڑکے کے حق میں دی پھر سیشن جج کی عدالت میں چلے گئے، سیشن جج نے بھی ڈگری لڑکے کی طرف دے دی پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھر عدالت میں چلے گئے اور لڑکی کو کسی اور گاؤں میں لے جا کر لڑکے

کی غیر سکونت لکھوا دی- لڑکے کو کوئی اطلاع وغیرہ نہیں دی' نہ لڑکے کے بیان وغیرہ لیے اور یہ کہہ دیا کہ لڑکا عمداً حاضر نہیں ہوتا اور اس نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا ہے-

حقیقت میں لڑکے کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ میرے خلاف تنسیخ نکاح کا دعوئی ہو چکا ہے- آخر عدالت نے یک طرفہ فیصلہ کر دیا- اب لڑکی کے والدین نے لڑکی کا نکاح دوسرے ایک شخص عبدالستار نامی سے کر دیا- صرف تین دن گذرنے کے بعد عبدالستار کو معلوم ہوا کہ مجھ سے دھوکہ کیا گیا ہے' پہلے خاوند سے طلاق حاصل نہیں کی- عبدالستار نے یہ کہہ کر لڑکی کو بھیج دیا کہ جب تک پہلے خاوند سے طلاق حاصل نہ کرے' اس وقت تک میں آباد نہیں کروں گا- اب لڑکی کے والدین نے بکر جو پہلا خاوند ہے' اس کو بھی چھوڑا اور عبدالستار کو بھی' کسی تیسری جگہ تیاری کر دی ہے- یہ ہیں تمام حالات اب سوال یہ ہے کہ:

(۱) لڑکی کا جو والد ہے وہ جماعت بھی کرا دیتا ہے- کیا اس امام کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

(۲) اب پھر لڑکی کے والدین بکر سے طلاق مانگتے ہیں- کیا بکر طلاق دینے کا حقدار ہے یا نہیں؟

(۳) اگر ہے تو کیا بکر صرف حق مہر واپس لے سکتا ہے یا جہیز کا سامان بھی-

(محمد ادریس نعیم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جواب: الحمد للہ رب العالمین اما بعد فاقول وباللہ التوفیق- بشرط صدق سوال و صحت صورت مسئلہ جواب اس کا یہ ہے کہ مسمی بکر کا نکاح مسمات ہندہ سے بدستور قائم ہے- کونسل کی عدالت اور دیگر حکام کی عدالتوں میں جو فیصلہ لڑکے کی حاضری میں ہوا' وہ بالکل صحیح اور درست اور عین حق ہے اور بکر کی غیر حاضری میں جو فیصلہ ہوا اور اس میں فریب کاری کی گئی اور حاکم نے بغیر حاضری خاوند کے کیا ہے' وہ سراسر باطل اور شرع محمدی کے خلاف ہے اور بکر کا نکاح بدستور قائم ہے- غیر شرعی فیصلہ کے بعد جو نکاح دوسرا' تیسرا ہوا وہ بالکل باطل ہے اور زناکاری ہے جو ہندہ اور اس کے والدین کے ذمہ ہے- سب قیامت کو ماخوذ ہوں گے اور جنہوں نے ہندہ سے نکاح پڑھا اور پڑھوایا اور گواہ سب کبیرے گناہوں کے مرتکب فاسق فاجر اور ظالم قرار پائے' بشرطیکہ ان کو علم ہو- ورنہ بعد علم کے اس نکاح کو

رد کر کے ہندہ کو جدا کیا جائے ورنہ سب جہنم کا ایندھن بنیں گے اور بکر ان سب پر مدعی ہو گا۔ ہندہ کے والدین نہایت ظالم ہیں جنہوں نے اتباع ہوی یعنی نفسانیت میں آکر کئی گناہوں کا ارتکاب کیا ہے جو جہنم کے عذاب کا موجب ہیں۔

اول یہ کہ ہندہ کا جب پہلا نکاح کر دیا تھا تو وہ بکر کے ملک ہو گئی تھی اور وہ اس کا تابعدار بن گئی۔ اب ہندہ پر والدین کے مقابلہ میں خاوند کی اطاعت فرض ہے۔ ایک بات کا حکم والدین کریں اور اس کے خلاف خاوند حکم کرے تو خاوند کا حکم ماننا فرض ہے اور والدین کی اطاعت خاوند کے مقابلہ میں ساقط ہے۔ جب ہندہ کا خاوند اس کو لینے گیا تھا تو ہندہ پر فرض تھا کہ وہ ماں باپ کی نافرمانی کر کے خاوند کے گھر چلی جاتی تو اس کو بہت ثواب اور اجر ملتا۔ والدین ظالموں نے اس کو روک لیا اور اس نے والدین کی اطاعت کی تو وہ سخت گنہگار ہو گئی۔ اس کی کوئی عبادت قبول نہیں ہے۔ اگر اسی حال پر مر گئی تو جہنمی ہے اور دنیا میں اس پر لعنت برستی ہے۔ والدین نے ہندہ کو بہکا کر خاوند سے جدا کیا۔ حدیث میں ہے من فرق فلیس منا یعنی جس شخص نے کسی میں تفرقہ ڈال دیا' وہ میری امت اجابت سے خارج ہے۔ دوسری حدیث میں ہے: لیس منا من خبب امراۃ علی زوجھا او عبدا علی سیدہ یعنی جو شخص عورت کو خاوند سے بد راہ اور گمراہ کرے یا غلام کو اس کے مالک سے گمراہ کرے' وہ میری جماعت سے نہیں ہے۔

دوسرا گناہ یہ کہ نکاح کو فسخ کرانے کے لیے عدالت طاغوتی میں گیا۔ آیت "یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت" میں اس کی ممانعت ہے۔

تیسرا یہ کہ دو تین بار مقدمہ کیا تو ناکام و فیل ہوا پھر بھی خاوند کے اس کی بیوی حوالے نہ کی۔

چوتھا یہ کہ مقدمہ میں فریب کاری کی۔ حدیث میں من غشنا فلیس منا کہ جو ہمارے ساتھ فریب کاری کرے وہ میری جماعت سے نہیں ہے۔ یعنی جو ہم مسلمانوں کے ساتھ دغا کرے۔

پانچواں گناہ یہ کہ عدالت میں جھوٹے بیانات دیئے۔ جھوٹوں پر لعنت ہے۔ چھٹا گناہ یہ ہے کہ حاکم سے ناجائز فیصلہ کروایا جو خلاف قانون شرع ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب تک دوسرے فریق کا بیان نہ لو' اس وقت تک فیصلہ نہ کرو۔ ساتواں گناہ یہ کہ عدت میں نکاح

پڑھلیا' فسخ نکاح کی عدت ایک ماہ ہے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ نکاح فسخ ہو۔ ہندہ کا نکاح فسخ نہ ہوا تو یہ نکاح پر نکاح ہے جو حرام ہے اور حرام کو حلال بنانا کفر ہے۔ پس جس نے باوجود علم کے نکاح پڑھا' وہ کافر ہوا۔

آٹھواں گناہ یہ ہے کہ بکر سے قطع رحمی کی۔ حدیث ہے: لا یدخل الجنة قاطع یعنی اپنے رشتہ دار سے قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہ ہو گا۔

نواں گناہ یہ کہ بکر کے سامان دیئے ہوئے اور مہر پر قابض ہے جو بیوی کا حق ہے۔ دسواں گناہ یہ کہ بغیر طلاق لینے کے پھر تیسری جگہ حرام نکاح کی تیاری کر رہا ہے۔

تلک عشر کاملہ۔ یعنی یہ دس گناہ بکر کے خسر اور ہندہ میں پائے گئے ہیں۔ جب خوف الٰہی نہیں کرتے اور ان گناہوں کو گناہ نہیں سمجھتے تو وہ کافر ہو گئے۔ لہٰذا حکم شرعی یہ ہے کہ ہندہ زانیہ اور اس کے والدین زنا کرانے والوں سے بائیکاٹ کیا جائے اور مسلمانوں کی پنچایت ان کو تعزیر لگائے اور جب تک بکر طلاق نہ دے' ہندہ کا نکاح کسی جگہ ہرگز نہ کیا جائے۔ جب تک بکر رضامندی سے طلاق نہ دے گا کوئی شخص خواہ حاکم ہو' نکاح فسخ نہیں کر سکتا۔ لڑکی کا والد ظالم فاسق بلکہ کافر ہے۔ اس کو امام نہ بنائیں اور نہ اس کے پیچھے نماز پڑھیں جو شخص پڑھے گا اس کی نماز باطل ہو گی۔ ہندہ کے والد نے حرام کو حلال کیا ہے' لہٰذا وہ کافر ہے۔ عدالت غیر شرعی طاغوتی ہے' اس کا فیصلہ ایک تو فریب کاری سے کرایا گیا' دوسرا فیصلہ خلاف شرع ہے جو مردود ہے۔ بکر کا نکاح بدستور قائم ہے۔ جب تک مہر اور شادی کا تمام سامان بکر کو دے کر طلاق حاصل نہ کی جائے' نکاح دوسری جگہ حرام ہے اور بلا وجہ شرعی طلاق لینے والی عورت جنت کی خوشبو نہ پائے گی۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

۲۔ حافظ عبدالقادر روپڑی: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مولانا عبدالقادر حصاری نے جواب فتویٰ بالکل صحیح فرمایا ہے' میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ فقط حافظ عبدالقادر روپڑی جامع قدس نزد چوک دالگراں لاہور۔ ۳۰۔ ربیع الاول سنہ۔ ۱۳۹۴ھ ۲۴۔ اپریل سنہ۔ ۱۹۷۴ء

۳۔ مولانا عطاء اللہ حنیف: مولانا عارف حصاری صاحب نے بشرط صحت سوال کے جو فتویٰ لکھا ہے' اس سے نتیجے میں مجھے اتفاق ہے۔ دھوکے اور فریب سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ وہ بناء فاسد علی الفاسد ہوتی ہے۔ ایسے دھوکے بازوں کے لیے عدالتی چارہ جوئی ہونی چاہیے تاکہ اصل بات نکھر کر سامنے آجائے۔ (محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی ۱۱۔ مئی

(سنہ-۴ے۱۹ء)

عبدالقادر عارف حصاری

الاعتصام لاہور جلد-۲۹' شمارہ-۲۸' مورخہ ۱۰ فروری سنہ-۷۸ء

مسئلہ طلاق ثلاثہ اور اس کی صحیح پوزیشن

دیگر بری رسموں اور عادتوں کی طرح ہمارے زمانہ میں ایک یہ بری عادت اور رسم عام ہو گئی ہے کہ جب کسی عورت کا طلاق نامہ لکھواتے ہیں تو اس پر تین دفعہ طلاق لکھتے اور لکھواتے ہیں- اور اسی طرح اس عورت کے خاوند کی زبان سے بھی تین دفعہ طلاق کہلواتے ہیں- اور اکثر لوگ کبھی فوری جذبہ کے تحت اپنی بیویوں کو تین طلاقیں کہہ دیتے ہیں- چنانچہ یہ طریقہ عام ہے کہ خاوند بیوی کی باہم لڑائی ہو جاتی ہے تو خاوند غصہ سے جوش میں آجاتا ہے اور وہ اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیتا ہے- پھر بعد میں نادم اور پشیمان ہوتا ہے- جب لوگ اس کو مطعون کرتے ہیں اور یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ تیری بیوی تو تجھ پر حرام ہو گئی ہے- کیونکہ تو نے اس کو تین طلاقیں دے دی ہیں تو وہ جھوٹی قسمیں کھانے لگتا ہے کہ میں نے تو طلاق دی ہی نہیں ہے- یا یہ کہتا ہے کہ صرف ایک ہی طلاق دی ہے' تین نہیں دی ہیں- کوئی کہتا ہے کہ غصہ میں پتہ نہیں رہا- میرا ارادہ طلاق کا نہ تھا- کوئی مان لیتا ہے کہ ہاں واقعی میں نے تین طلاقیں دی ہیں لیکن اب مجھے بتلاؤ کہ میں کیا کروں؟ لوگ کہتے ہیں کہ اب تو حلالہ کرلے- یعنی اس طلاق کی عدت گذارنے پر کسی شخص سے عارضی طور پر ایک دن رات کے لیے نکاح کر دے- جب وہ جماع کر لے اور صحبت کر چکے تو پھر اس سے طلاق حاصل کر لے- جب وہ طلاق دے دے تو پھر یہ عورت مطلقہ عدت گذارے- تب یہ تیرے لیے حلال ہو گی-

چنانچہ وہ مولویوں کے پاس جاتا ہے تو اکثر حنفی مولوی ملتے ہیں جو اسے حلالہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں- تب وہ حلالہ کرانے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی معاملہ کو مخفی رکھ کر اپنی بیوی کے ساتھ بدستور تعلقات قائم رکھتا ہے- آخرکار کسی دن پر راز منکشف ہو جاتا ہے تو لوگ اسے بدنام کرنے لگ جاتے ہیں کہ یہ شخص زنا کر رہا ہے- کیونکہ اس نے تین طلاقیں دے دی ہیں اور عورت اس پر قطعاً حرام ہو گئی ہے پھر وہ لوگ اس کا حقہ پانی بند کر دیتے

ہیں۔ جس سے آپس میں فتنہ اور فساد شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دو پارٹیاں ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ علماء کی طرف دوڑتے ہیں اور علماء بھی کئی مذہب کے ملتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ تین طلاقیں واقع ہو گئی ہیں اور تیری بیوی تجھ پر قطعی حرام ہو گئی ہے۔ جب تک وہ حلالہ نہ کرائے تجھ پر حلال نہ ہو گی۔ اور اگر تو بغیر حلالہ کے گھر میں رکھے گا تو یہ حرام ہے۔ کیونکہ تین طلاق سے عورت تجھ سے جدا ہو گئی ہے۔ اب تو اس سے صحبت کرے گا تو یہ زناکاری ہو گی' جو سخت گناہ ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ تو نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دی ہیں' یہ ایک ہی واقع ہوئی ہے تو اس سے رجوع کر لے' وہ بدستور تیری بیوی رہ جائے گی اور ملاپ جائز ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اکٹھی تین طلاقیں دینا بدعت ہے۔ تیری یہ طلاقیں سرے سے واقع نہیں ہوئی ہیں۔ وہ بدستور تیری بیوی ہے۔ الغرض ایک مجلس میں تین طلاق دے کر عوام الناس متعدد گناہوں کا ارتقاب کر رہے ہیں اور کچھ اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں کرتے۔ لہٰذا ان خرابیوں کو دفع کرنے کے لیے اور اس گناہ کی اصلاح کے لیے کمترین خادم الاسلام یہ مضمون ہدیہ ناظرین کر رہا ہے کہ اس پر غور فرما کر ناواقف لوگوں کو جو ان گناہوں میں مبتلا ہو رہے ہیں' آپ سن کر آگاہ کر دیں اور اس مسئلہ کو کثرت سے شائع کریں تاکہ لوگوں کو اس کا پورا پورا علم ہو جائے اور وہ ایسے گناہوں سے بچیں' وباللہ التوفیق۔

ایک ہی بار تین طلاق گناہ کبیرہ ہے: یہ طریقہ جو عام ہو گیا ہے کہ لوگ ایک طہر میں ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیتے ہیں اور جوش میں آکر یہ کہہ دیتے ہیں کہ تجھ پر طلاق' طلاق' طلاق۔ یا یہ کہ تجھ پر تین طلاقیں ہیں۔ یہ کہنا گناہ ہے اور جمہور علماء اسلام اس پر متفق ہیں کہ یہ اکٹھی تین طلاقیں دینی حرام ہیں اور بدعت ہیں اور اس طریقہ کے سراسر خلاف ہیں جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے طلاق کے لیے مقرر فرمایا ہے اور اس کے لیے قانون مقرر کیا ہے۔ لیکن آج کل بے دینی کا دور دورہ ہے اور بدعملی زوروں پر ہے۔ گناہوں سے بچنا اور دین پر قائم رہنا حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق ایسا مشکل ہے جیسا کہ انگارے کو ہاتھ میں تھامنا۔

افسوس تو یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو اس کا علم ہی نہیں ہے کہ جو کام ہم کر رہے ہیں یہ گناہ ہے یا ثواب؟ حلال ہے یا حرام؟ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے یا ناراض؟ اس پر

طرہ یہ کہ اپنی بے اعتنائی اور لاپرواہی کو کام میں لاتے ہوئے یہ کہنے لگتے ہیں کہ اسلام اور شریعت محمدیہ نہایت آسان ہے۔ حدیث میں ہے الدین یسر کہ دین تو آسان ہے۔ لیکن ہم نے اپنے گندے رواجوں اور باطل عقیدوں اور اپنی بد اعمالیوں سے خود اس میں دشواریاں پیدا کولی ہیں اور یہ سب تنگی اور دشواری ہماری غفلتوں اور لاپرواہیوں کا نتیجہ ہے۔

اگر ہم کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی حدود اور قیود کے پابند ہو کر رہیں تو کوئی تنگی اور دشواری نہیں ہوتی' سب کچھ سہل ہے۔ ایمان مضبوط اور قلب سلیم کی ضرورت ہے۔ سنیئے! اول تو غصہ حد سے زیادہ کرنا گناہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا ہے لا تغضب کہ غصہ نہ کرو اور فرمایا ہے کہ غصہ کا اصل شیطان سے ہے۔ پس اگر بیوی سے لڑائی ہو جائے تو انسان کو مغلوب الغضب نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ بحکم الرجال قوامون علی النساء یعنی مرد عورتوں پر حاکمانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حکام کو رعایا پر رحم و شفقت کرنے کا حکم ہے۔ اس واسطے حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ بہتر سلوک کرتا ہے اور اچھا برتاؤ رکھتا ہے' اگر بیوی سے کوئی ناشائستہ حرکت ہو گئی یا وہ کسی ناجائز قول و فعل اور عادت قبیحہ کی رو سے نکاح میں رکھنے کے قابل نہیں رہ گئی ہے تو پھر اس کی حالت پر غور کرے کہ وہ حائضہ تو نہیں ہے۔ اگر حائضہ ہے تو پھر اس کو طلاق نہ دے۔ کیونکہ حیض کی حالت میں طلاق دینی حرام ہے اور اگر حائضہ تو نہیں ہے لیکن اس طہر میں اس سے جماع ہو چکا ہے تو پھر بھی طلاق دینی ممنوع ہے۔

چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے۔ نیل الاوطار جلد ۶' ص ۲۲۲ میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ طلاق چار قسم پر ہے۔ یعنی عورت کی حالت کے لحاظ سے۔ دو قسم حلال ہیں اور دو قسم حرام ہیں۔ حلال کی ایک صورت یہ کہ عورت کو اس طہر کی حالت میں طلاق دے جبکہ اس سے جماع نہ کیا ہو۔ دوسری صورت یہ کہ عورت کو اس حال میں طلاق دے کہ وہ حاملہ ہو اور اس کا حمل ظاہر اور نمایاں ہو چکا ہو۔ ان دونوں حالتوں میں طلاق دینی حلال اور جائز ہے۔ اور جو حرام ہیں' ان کی ایک صورت یہ کہ عورت حالت حیض میں ہو پھر اس کو طلاق دے تو یہ گناہ ہے اور حرام ہے اور دوسری صورت یہ کہ عورت حالت طہر میں ہو اور اس سے جماع کیا گیا ہو پھر اس کو خاوند طلاق دے تو یہ بھی حرام ہے اور گناہ ہے۔ اگر کوئی شخص ان دونوں حالتوں میں طلاق دے بیٹھے تو اپنی اس غلطی سے رجوع کر کے توبہ

کرے اور اس طلاق کو شمار نہ کرے۔ یہ طلاق ناقابل اعتبار ہے۔ کیونکہ قرآن و حدیث کے خلاف طلاق دی گئی ہے جو بالکل مردود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدلتھن کہ تم جب عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے وقت دو۔ طلاق تو عدت یا حمل سے شروع ہوتی ہے نہ حیض سے اور نہ اس طہر سے جس میں جماع کیا گیا ہو۔ پس یہ مشروع اور مامور بہ ہے۔ اس کے خلاف جو طلاق ہے وہ مردود ہے۔ حدیث میں ہے: من عمل عملا لیس علیہ امرنا فھو رد کہ جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا حکم نہ تھا وہ مردود ہے۔ پس حالت حیض اور طہر جماع کی طلاق مردود اور ناقابل اعتبار ہے۔ اس غلطی سے رجوع اور توبہ کرنا واجب ہے۔ اگر کسی نے طلاق دیدی ہو تو دوسرا حیض آنے کے بعد عورت کے پاک ہو جانے پر بغیر جماع کرنے کے طلاق دے' تب وہ طلاق درست ہو گی۔ چنانچہ آنحضور ﷺ کا یہ حکم ہے کہ ثم یطلقھا طاھرا او حاملا۔ پھر طلاق دے اس کو ایسی حالت میں جبکہ وہ پاک ہو یا حاملہ ہو۔

لیکن اب سنئے! تعداد اور وقت کے لحاظ سے طلاق تین قسم ہے۔ ایک جائز' دوم سنی۔ سوم حرام۔ جائز یہ ہے کہ عورت کو ایسے طہر میں ایک طلاق دے دے کہ جس میں جماع نہ کیا ہو یا حالت حمل میں دے اور پھر عدت گذر جائے تو یہ طلاق جائز اور مشروع ہے۔ اس کی عدت تین حیض ہے۔ جب یہ عدت گذر گئی تو عورت اپنے خاوند سے جدا ہو گئی اور حرام ہو گئی۔ اب اس سے صحبت کرنی حلال نہیں ہے۔ ہاں اگر عدت کے اندر اندر اس سے رجوع کر لیتا اور صلح کر لیتا تو وہ بدستور اس کی بیوی رہتی اور صحبت حلال ہوتی لیکن جب عدت گذر گئی تو اب نکاح باقی نہ رہا۔ عورت اس سے جدا ہو گئی۔ اب اس کو اختیار ہے کہ جس جگہ چاہے نکاح کر لے۔ ہاں اگر کسی اور سے نکاح کرنے سے پہلے پہلے اسی طلاق دینے والے خاوند سے صلح ہو جائے تو وہ پھر ملنا چاہیں اور خاوند بیوی بن کر رہنا چاہیں تو ان کو چاہیے کہ دوبارہ نکاح پڑھا لیں پھر ان کو آپس میں رہنا اور جماع کرنا جائز و درست ہے اور وہ بدستور خاوند بیوی بن سکتے ہیں۔

سنی طلاق یہ ہے کہ ایسے طہر میں ایک طلاق دے جس میں جماع نہ کیا ہو پھر وہ عورت حائضہ ہو گئی تو جب وہ نہا کر پاک ہوئی تو بغیر جماع کئے دوسری طلاق دے دے۔ پھر وہ حائضہ ہو گی اور حیض سے پاک ہو گئی تو تیسری طلاق پھر دے دے۔ پھر وہ عدت گذار لے اور

پوری کر لے۔ اب یہ عورت مطلقہ ثلاثہ اپنے طلاق دینے والے خاوند پر قطعاً حرام ہو گئی ہے۔ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد اس کو اختیار تھا کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کر لیتا اور صلح صفائی کے بعد بدستور اس کو اپنی زوجیت میں رکھ لیتا۔ لیکن جب تیسری طلاق اس نے دے دی تو اب یہ طلاق مغلظہ ہو گئی اور وہ عورت اس پر قطعاً حرام ہے۔ اب عدت گذر جانے کے بعد نئے نکاح پڑھانے سے بھی جائز نہ ہو گی۔ اب یہ عورت عدت پوری کر کے جس جگہ چاہے نکاح کر لے۔ اس خاوند کی کوئی امید نہ رکھے اور نہ کوئی خیال کرے۔ ہاں اگر اس عورت نے کسی شخص سے نکاح کر لیا اور اس کے گھر آباد ہو گئی اور اس نے بدستور بیوی بنا کر اس کو رکھا اور صحبت کرتا رہا پھر قضا الٰہی سے یہ شخص مر گیا یا اس نے کسی سبب سے ناراض ہو کر یا کراہت کر کے اس عورت کو طلاق دے دی' جس سے وہ عدت گذار کر بالکل آزاد ہو گئی تو اب اس کو اختیار ہے کہ جس جگہ چاہے نکاح کر لے۔ اب اگر پہلے خاوند طلاق دینے والے سے بھی نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے' کچھ حرج اور گناہ نہیں ہے۔ اب نئے نکاح سے یہ جائز ہو سکتی ہے۔

یہ حلالہ مشروعہ ہے جو آیت حتی تنکح زوجا غیرہ سے مراد ہے۔ اور یہ طلاق ثلاثہ مشروع ہے۔ جہاں احادیث میں مطلق طلاق ثلاثہ کا ذکر آتا ہے کہ فلاں صحابی نے تین طلاقیں دیں تو اس سے بھی مشروع اور مسنون طلاقیں مراد ہوتی ہیں' ظنوا المئومنین خیرا۔

نیز طلاق ثلاثہ مشروع کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو بحالت حمل یا طہر بغیر جماع کئے طلاق دے دے اور پھر رجوع کر لے اور اس کے ساتھ آباد رہے پھر کئی مہینوں یا سالوں کے بعد ایسے ہی طہر یا حمل میں پھر طلاق دے دے اور پھر رجوع کر لے اور آباد رکھے پھر عرصہ دراز کے بعد ناچاقی ہو جانے پر ایسے ہی طہر یا حمل میں پھر طلاق دے دے تو اب یہ عورت قطعاً حرام ہو گئی اور یہ طلاق مغلظہ بن گئی۔ بغیر حلالہ مشروعہ کے یہ جائز نہیں ہو سکتی کہ اس کی بیوی بن جائے۔ کیونکہ اب بالکل بائن ہو گئی ہے۔ اس صورت سے بعض نادانی سے انکار کرتے ہیں اور اس طرح طلاق ثلاثہ کو مغلظہ نہیں سمجھتے اور تیسری طلاق کے بعد بھی رجوع کر کے بغیر نکاح یا جدید نکاح سے اس کو اپنی بیوی بنا لیتے ہیں جو قطعاً حرام ہے۔ حالانکہ اس کا حکم بھی اس پہلی طلاق ثلاثہ ہی کا حکم ہے۔ دونوں طرح یہ

طلاق متفرقہ ثلاثہ مغلظہ کہلائے گی اور عورت ایسے خاوند پر قطعاً حرام رہے گی- دونوں کا آباد ہونا کسی صورت ممکن نہیں ہے- ہاں حلالہ مشروع طریق سے ہو جس کی یہ تفصیل پہلے ہو چکی ہے تو پھر جائز ہو سکتی ہے' والا فلا-

تیسری قسم حرام ہے اور وہ یہ کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو ایسے طہر میں کہ جس میں اس نے جماع نہیں کیا' تین طلاقیں اکٹھی دے دے خواہ یوں دے کہ تجھ پر طلاق' طلاق' طلاق یا یوں کہے کہ تجھ پر تین طلاق ہیں- بہرکیف اس عورت پر ایک طلاق پڑے گی اور دو لغو جائیں گی- کیونکہ بحکم شریعت وہ طہر ایک طلاق کا محل ہے- دو یا تین کا نہیں ہے- پس جو لوگ تین طلاقیں اکٹھی دے دیتے ہیں یا لکھ دیتے ہیں یا لکھتے اور لکھواتے ہیں اور بعض اس کے گواہ بنتے ہیں- یہ گناہ ہے اور کرنے کرانے والے سب گنہگار ہیں- اس سے ہر ایک مسلمان کو بچنا واجب ہے-

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ عن محمود بن لبید رضی اللہ عنہ قال اخبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن رجل طلق امراتہ ثلاث تطلیقات جمیعا فقام غضبان ثم قال ایلعب بکتاب اللہ وانابین اظھرکم حتی قام رجل فقال یارسول اللہ الا اقتلہ رواہ النسائی و رواۃ موثوقون (بلوغ المرام) یعنی محمود بن لبید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرد کے حال سے خبر دیئے گئے کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں اکٹھی دے دی ہیں تو آپ غصے میں آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ کیا وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیل کرتا ہے اور میں تمہارے درمیان میں موجود ہوں- یہاں تک کہ ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے عرض کیا کہ کیا یارسول اللہ میں اسے قتل نہ کر ڈالوں؟

اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے اور راوی اس حدیث کے ثقہ ہیں- نیل الاوطار جلد ۶' ص-۲۲۷ مصری میں ہے کہ قال ابن کثیر اسنادہ جید کہ اس کی اسناد کھری ہے- اور حافظ نے بلوغ المرام میں کہا ہے کہ راوی اس کے معتبر ہیں- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اکٹھی تین طلاقیں دینا بدعت اور حرام ہیں اور یہ کتاب الٰہی سے کھیل اور مذاق ہے- چنانچہ کتاب اللہ میں ہے: الطلاق مرتان (تا) ولا تتخذوا آیات اللہ ھزوا یعنی طلاق شرعی طلاق کے بعد متفرق طلاق ہے- دوبار (تا آخر) اور تم اللہ کی آیتوں کو استہزا نہ کرو- یعنی شرعی حکم کے مطابق کام کرو- اور نافرمانی کر کے احکام الٰہی سے ٹھٹھا نہ کرو-

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ طلاقیں متفرق ہونی چاہییے' اکٹھی نہ ہوں اور حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ اکٹھی طلاقیں دینا گناہ ہے کیونکہ آنحضور ﷺ بغیر گناہ کے کسی پر خفا نہیں ہوتے تھے۔ سبل الاسلام وغیرہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت آئی ہے کہ ان کے پاس جو شخص ایک مجلس میں تین طلاق دے دیتا تھا تو وہ اس کو درّے (بطور تعزیر) لگاتے تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایسا گناہ کبیرہ ہے کہ اس پر تعزیر لگائی جا سکتی ہے۔ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس گناہ کے انسداد کی دوسری سیاسی تجویز یہ پاس کی کہ جو لوگ ایک وقت میں تین طلاق اپنی عورتوں کو دیں گے تو تینوں کو نافذ کر کے عورتیں ان سے جدا کی جائیں گی۔ چنانچہ مسلم شریف میں ہے کہ ان الناس قد استعجلوا فی امر قد کانت لھم فیہ اناۃ فلوا مضیناہ علیھم فامضاۃ علیھم وفی روایۃ فلما کان فی عھد عمر تتابع الناس فی الطلاق فاجازہ علیھم یعنی عہد نبوی اور عہد صدیقی میں ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہی شمار کی جاتی تھیں۔ جب عہد فاروق آیا تو لوگ پے درپے لگاتار ایک وقت میں تین طلاق دیتے۔ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگوں نے اس امر میں جلد بازی سے کام لیا ہے جس میں ان کے لیے وسعت اور آسانی تھی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم ایسی طلاق کو ان پر جاری ہی کر دیں۔ پس حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو ان پر نافذ کر دیا۔

ان لفظوں سے صاف ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ منبع تعزیزی اور سیاسی ہے کہ لوگوں نے ایک وقت میں تین طلاق کو غلط طور پر بکثرت استعمال کرنا شروع کر دیا تھا جو گناہ عظیم تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چاہتے ہیں اور آرزو کرتے ہیں کہ ان پر کوئی سزا ڈالیں جس سے متاثر ہو کر اور جس کے دباؤ سے وہ تین طلاق ایک ساتھ دینا چھوڑ دیں اور بمطابق سنت طلاق دیا کریں۔

پس یہ حکم زجر اور توبیخ پر مبنی ہے' بطور شرعی حکم کے نہیں ہے۔ ورنہ وہ عہد نبوی اور عہد صدیقی ہی سے جاری ہوتا اور اس پر فلوا میضناہ علیھم کہہ کر تجویز پیش کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ چنانچہ محققین علماء نے بھی تصریح کی ہے۔ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ جو اکابر اولیاء اللہ سے ہیں' اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں کہ راعی امیر المومنین ان الناس استھانوا بامر الطلاق وکثر منھم ایقاعہ جملۃ واحدۃ فرائی من مصلحۃ عقوبتھم بامضائہ علیھم فرائی عمر ان ھذا مصلحۃ لھم فی زمانہ یعنی حضرت عمر امیر المومنین

رضی اللہ عنہ نے اپنی رعایا میں غور کیا کہ وہ تین طلاق کو ایک حقیر اور خفیف امر سمجھنے لگی اور تین طلاق کا بکثرت استعمال کر دیا ہے تو ان کے لیے یہ مصلحت سمجھی کہ بطور سزا ان پر تینوں کو ہی نافذ کر دیا جائے۔ ان کے زمانہ میں ان کے لیے یہی مصلحت تھی۔

طحطاوی جو حنفی مذہب کی معتبر کتاب ہے' اس میں یہ لکھا ہے کہ انه کان فی صدر الاول اذا ارسل الثلاث جملة لم یحکم الا بوقوع واحدة الی زمن عمر ثم حکم بوقوع الثلاث سیاسته لکثرة من الناس۔ اسی طرح فقہ کی اعلیٰ کتاب مجمع الانھر شرح ملتقی الابحر میں ہے۔ خلاصہ سب عبارتوں کا یہ ہے کہ تین طلاقیں شروع اسلام کے پاک زمانوں میں ایک ہی شمار کی جاتی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک یہی دستور رہا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے کثرت فعل پر نگاہ ڈال کر از روئے سیاست اور حکومت کے تینوں کے واقع ہونے کا حکم دے دیا۔

پس ثابت ہوا کہ ایک ہی طہر میں تین طلاق دینا گناہ ہے اور قابل تعزیر ہے۔ اس سے بچنا واجب ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ اس پر دروں کی سزا مقرر کر دے اور عدالتوں اور کچہریوں میں اس کے انسداد کی سختی سے کوشش کرے۔

ایک واقعہ : میرے گاؤں کا ایک واقعہ ہے کہ کچہری منٹگمری (ساہیوال) میں فریقین (فریق مرد اور فریق عورت) طلاق نامہ لکھوانے کے لیے گئے۔ کمترین بھی اراضی کے سلسلہ میں ایک کام کے لیے وہاں گیا تو انہوں نے اشٹام خرید کر عرائض نویس سے طلاق نامہ لکھوانا شروع کیا۔ عرائض نویس نے طلاق کا مضمون لکھتے ہوئے تین طلاق لکھ دیں۔ میں نے وہ مضمون پڑھ کر اسے منع کیا کہ یہ تو شرعاً ناجائز ہے۔ آپ اس طرح نہ لکھیں' صرف ایک طلاق بائنہ بصورت خلع لکھ دیں کیونکہ عورت کی طرف سے روپے دے کر طلاق حاصل کی جا رہی ہے۔ عرائض نویس جاہل اس مسئلہ کو سمجھتا نہ تھا اور وہ تین طلاق تحریر کرنے پر مصر تھا اور تین ہی پر اس شخص طلاق دہندہ سے لفظ طلاق زبان سے کہلوانا چاہتا تھا اور اس مسئلہ کو مانتا نہ تھا اور کہتا تھا کہ عدالتی دستور ہی یہی ہے کہ طلاق نامہ تین طلاق کے لفظ سے لکھا جاتا ہے تاکہ قطعی فیصلہ ہو جائے۔

میں نے کہا کہ یہ تو گناہ کبیرہ ہے کیونکہ حرام ہے۔ اس لیے میں تو جاتا ہوں اور آپ کے پاس کھڑا ہونا نہیں چاہتا۔ فریقین اس طلاق نامہ پر مجھے گواہ لکھوانا چاہتے تھے تاکہ میں اس کی

تصدیق کروں- اس لیے انہوں نے عرائض نویس کو مجبور کیا کہ آپ صرف ایک طلاق بائنہ لکھ دیں- تب اس نے ایک طلاق بائنہ لکھی جس پر میں نے بطور شہادت دستخط کر دیئے-

الغرض بعض لوگ ناواقفی کی وجہ سے بعض لوگ قانون وقتی کا لحاظ رکھتے ہوئے بعض نفس پرستی کی بنا پر کہ اس مرد اور عورت کا تعلق ہمیشہ کے لیئے منقطع ہو جائے' بعض غصہ کی بناء پر فوری جذبہ کے ماتحت تین طلاق ایک وقت میں دے دیتے ہیں جس کی بابت ہم اپنے مضمون میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ جرم عظیم ہے-

سبل السلام شرح بلوغ المرام جز ثالث ص-۱۷۰ میں ہے کہ الحدیث دلیل علی ان جمع الثلاث التطلیقات بدعة کہ حدیث محمود بن لبید کی اس پر دلیل ہے کہ اکٹھی تین طلاق دینا بدعت ہے- اور ص-۱۶۴ میں ہے کہ ان الطلاق البدعی منھی عنه محرم کہ بدعی طلاق جس سے منع کیا گیا ہے حرام ہے-

کتب فقہ میں بھی اس طلاق کو بدعت اور حرام لکھا ہے- جب اس کا بدعت اور حرام ہونا مسلم ہے تو بحکم حدیث کل بدعة ضلالة کہ ہر بدعت گمراہی ہے- اکٹھی تین طلاق دینے والے گمراہ ہیں- پھر آج کل اس میں کئی گناہ ظاہر ہو رہے ہیں اور یہ ناجائز فعل کئی گناہوں کا مجموعہ بن رہا ہے-

(۱) مجلس میں تین طلاق دینا جو خود گناہ ہے کمامر- (۲) پھر حرام ہو جانے کے خوف سے جھوٹ بولنا کہ میں نے تین طلاق نہیں دیں- (۳) بعض کا طلاق سے انکار کر کے پھر اس پر جھوٹی قسم کھانا- (۴) طلاق کو مخفی رکھ کر بدستور سابق تعلقات قائم رکھنا اور عقیدہ یہ رکھنا کہ تین طلاق اکٹھی سے عورت حرام ہو جاتی ہے- (۵) حیلہ سازی کرنا' کبھی نکاح حلالہ کرانا اور کبھی باندی بنا کر رکھنا- (۶) اس نکاح کو جائز بنانے اور طلاق ثلاثہ کی زد سے بچنے کی نیت سے فقہی مسلک تبدیل کرنا- مقلد سے غیر مقلد ہو جانا- (۷) ایک مجلس کی تین طلاق کو جائز سمجھنا- (۸) ایک ساتھ کی تین طلاق کو شریعت کی رو سے تین شمار کرنا اور عورت کو شرعاً قطعی طور پر حرام سمجھنا- (۹) نکاح حلالہ میں دوسرا شخص طلاق نہ دے تو اس سے جبرا تین طلاق لینا- (۱۰) باوجود طلاق کے عورت کو بالکل آزاد نہ کرنا اور اس پر اپنا قبضہ رکھنا-

پس ایک مجلس کی تین طلاقوں میں اس طرح کے متعدد گناہ ہو رہے ہیں جن کا انسداد ضروری ہے- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایسا شخص لایا جاتا تو آپ اس کو درے لگاتے- چنانچہ

سبل الاسلام جز-۳ ص-۲۷۰ میں ہے کہ اخرجه --- سعید بن منصور بسند صحیح عن انس ان عمر كان اذا اتی برجل طلق امراته ثلاثا اوجع ظهره کہ حضرت عمرؓ کے پاس جب ایسا شخص لایا جاتا جس نے اپنی عورت کو تین طلاق دی ہیں تو اس کی پیٹھ پر دردناک سزا دیتے۔

افسوس ہے کہ ہماری حکومت آئینِ اسلام نافذ نہیں کرتی ورنہ ایک ساتھ تین طلاق دینے والے پر تعزیر مقرر کر دی جاتی تاکہ پھر کوئی اس طرح طلاقیں نہ دے۔ میرے خیال میں اس امر میں سب فسادوں کی اصل جڑ تین اکٹھی طلاقوں کو تین شمار کرنا اور عورت کو شرعاً قطعاً حرام سمجھنا ہے۔ اگر یہ ظاہر کر دیا جائے کہ اکٹھی تین طلاق سے عورت حرام نہیں ہوتی' یہ صرف کتاب اللہ سے کھیل اور تماشا ہے اور محض گناہ ہے تو پھر یا لوگ اس گناہ سے باز رہیں یا صرف اتنا ہی کریں اور اس سے آگے جھوٹ' حیلہ سازی وغیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کریں۔ وہ اکثر گناہ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ عورت ہمارے قبضہ سے نہ چلی جائے۔ سو اس مسئلہ کو ہم کتاب و سنت کی رو سے واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہے جن کے بعد خاوند کو رجوع کرنا جائز ہے۔ عورت قطعاً حرام نہیں ہوتی اور اس سے حلالہ وغیرہ گناہوں کے کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

(ا) قرآن کریم میں وارد ہے کہ الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان یعنی طلاق ایک بار ہے پھر دوسری بار ہے' پس اس دوسری طلاق کے بعد رجوع کرنا ہو تو بہترین طریقہ سے بسانا اور نباہ کرنا ہو گا۔ اور اگر چھوڑنا ہو تو بھلائی اور عمدگی سے چھوڑ دینا ہو گا۔ اس آیت میں "الطلاق" مسند الیہ پر لام تعریف جنسی وارد ہے۔ جس سے حصر کا فائدہ حاصل ہے اور اس سے وہ طلاقیں بالتفریق مراد ہیں جو شرعاً ماذون ہیں۔ وہی وارد ہوں گی۔ ان کے علاوہ طلاق شرعی نہیں ہے۔ تو وہ وارد بھی نہ ہو گی۔

نیل الاوطار جزء-۶' ص-۲۲۶ میں ہے کہ ولم یرد الا الماذون فدل ان ماعداه لیس بطلاق یعنی اس آیت میں طلاق ماذون مراد ہے' وہی وارد ہو گی اور غیر شرعی مراد ہی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ طلاق ہی نہیں ہے۔ تفسیر نیشاپوری میں ہے کہ ان التطلیق الشرعی تطلیقة بعد تطلیقة علی التفریق دون الجمع والارسال دفعة واحدة یعنی طلاق شرعی یہ ہے کہ

ایک طلاق بعد ایک طلاق دی جائے- الگ الگ اپنے طہر میں- نہ سب کو ایک طہر میں جمع کرنا اور نہ ایک ساتھ ہی زبان سے کہہ دینا-

امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ فثبت ان ھذہ الایۃ دالۃ علی الامر بالتفریق بالتطلیقات کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ طلاقیں الگ الگ دینی چاہئیں- اس آیت کے تحت قاضی ثناء اللہ صاحب حنفی پانی پتی فرماتے ہیں کہ وفی ما قال مرتان دون اثنتان دلالۃ علی کراھۃ الطلقتین وبالاشارۃ علی العدد واللام للجنس ولیس وراء الجنس شئی فکان القیاس ان لا یکون الطلقتان المجتمعان معتبرۃ شرعا واذا لم یکن الطلقتان معتبرہ لم یکن الثلاث مجتمعۃ معتبرۃ بالطریق الاولی لوجودھا فیھا مع زیادۃ- یعنی آیت میں لفظ مرتان سے اثنتان نہیں ہے- اس سے تفریق تو لفظ سے عبارۃ النص ثابت ہوئی اور اشارۃ النص سے عدد معلوم ہوا- لام اس میں جنس کے لیے ہے اور جنس کے سوا کوئی چیز نہیں ہے- پس قیاس یہ ہے کہ دو طلاقیں اکٹھی معتبر نہیں ہیں- اور جب دو طلاقیں شرعاً معتبر نہیں تو تین اکٹھی بطریق اولی معتبر نہ ہوں گی- کیونکہ دو تین میں زیادت کے ساتھ شامل ہیں-

نیل الاوطار میں ہے کہ ان ھذہ الایۃ من ادلۃ عدم التتابع لان ظاھرھا ان الطلاق المشروع لا یکون بالثلاث دفعۃ بل علی الترتیب المذکور وھذا طھر- اس تصریح سے یہ ثابت ہوا کہ طلاق مشروع یہ ہے کہ ایک کے بعد دوسری طلاق تفریق کے ساتھ یعنی دوسرے طہر میں دینی چاہیے- جس نے اس کا خلاف کیا' اس کا کام اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا دیا جائے گا- یعنی دو کو لغو کر کے ایک کو باقی رکھا جائے گا' جس کا وقت ہے- اگر اکٹھی دو کو یا تین کو وارد کر دیں تو یہ قرآن کے خلاف ہو گا اور منشاء الٰہی پورا نہ ہو گا- جس سے ثابت ہوا کہ اکٹھی تین طلاق وارد اور واقع نہ ہوں گی- کیونکہ غیر ماذون ہیں-

قرآن میں ہے: ام لھم شرکاء شرعوالھم من الدین مالم یاذن بہ اللہ- کیا ان کے لیے ایسے شریک ہیں جو ان کے لیے ایسی چیزیں دین میں مشروع کرتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اذن نہیں دیا-

امام رازی زیر آیت الطلاق مرتان تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ لان النھی یدل علی اشتمال المنھی عنہ علی مفسدۃ راجحۃ والقول بالوقوع سعی فی ادخال تلک

المفسدہ فی الوجود وھو غیر جائز فوجب ان یحکم بعدم الوقوع۔ یعنی نہی ممنوع چیز کے فساد اور بیگاڑ پر دلالت کرتی ہے۔ اب اگر تین طلاق کے واقع ہونے کا قول درست ہو تو یہ اس فساد کو وجود میں لانے کی کوشش ہے جو شرعاً ناجائز ہے۔ پس واجب ہے کہ اس طلاق کے نہ واقع ہونے کا حکم کیا جائے۔

(۲) قرآن مجید سورۃ طلاق میں ہے کہ یاایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن واحصوا العدۃ یعنی اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کو شمار کرو۔ پس ایک طہر ایک طلاق کا وقت ہے۔ جس سے اس کی عدت شروع ہو گی اور دوسری اور تیسری کا وقت نہیں ہے۔ اس واسطے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ ان الطلاق علی عدم طھر کہ طلاق ہر طہر میں ہے۔ اب جو طہر میں دو یا تین طلاق اس آیت کے خلاف دے تو وہ ناقابل اعتبار ہیں۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابو رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر مدینہ کی ایک عورت سے نکاح کر لیا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اپنی بیوی ام رکانہ سے رجوع کر لے۔ اس پر ابو رکانہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یارسول اللہ! میں تو اسے تین طلاق دے چکا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے جاؤ رجوع کر لو۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی یاایھا النبی اذا طلقتم النسآء الایۃ ......

چنانچہ نیل الاوطار اور محلی وغیرہ میں یہ قانون مذکور ہے جو بہت سے مسائل پر پیش کیا گیا ہے۔ علامہ ابن حزم نے اس قاعدہ سے بہت کام لیا ہے اور بہت سے مسائل پر اس کو پیش کیا ہے اور اس کو قرآنی اور حدیثی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ محلی اور اصول الاحکام ملاحظہ ہوں۔

تفسیر نیشاپوری میں ہے کہ وھذا التفسیر قول من قال الجمع بین الثلاث حرام وزعم ابو یزید الا بوسی فی الاسرا وان ھذا ھو قول عمر وعثمان وعلی وابن عباس وابن عمر وعمران بن الحصین وابی موسیٰ الاشعری وابی الدرداء وحذیفہ ثم من ھولاء من قال لوطلقھا ثنتین او ثلاثا لا یقع الا واحدۃ وھذا ھو الا قیس و اختارہ کثیر من علماء اھل البیت ان النھی یدل علی اشتمال المنھی عنہ علی مفسدۃ راجحۃ والقول بالوقوع سعی فی ادخال تلک المفسدۃ فی الوجود۔ یعنی آیت الطلاق مرتان کی

تفسیر کو سامنے رکھ کر کئی بزرگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تین طلاقیں اکٹھی دینی حرام ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر اور عثمان' علی' ابن عباس' ابن عمرؓ عمران بن حصین' ابو موسیٰ اشعری' ابوالدرداء اور حذیفہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ پھر ان میں وہ بھی ہیں جو یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر دو یا تین طلاق دیں تو صرف ایک واقع ہو گی۔ یہی عقل کے مطابق ہے اور اسی کو اکثر علماء اہل بیت نے اختیار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک ساتھ دی ہوئی تین طلاق ایک ہی ہوتی ہیں۔ کیونکہ نہی منہی عنہ کے فساد پر دلالت کرتی ہے۔ جب تین طلاق کے واقع ہونے کو مان لیا جائے تو یہ اس فساد میں واقع ہونے کی سعی ہے۔

عہد نبوی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ عبداللہ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی ہے' اس کا کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یراجعها فردها وقال اذا اطهرت فلیطلق او لیمسک قال ابن عمر وقرا النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یا ایها النبی اذا طلقتم النساء فطلقوهن لعدتهن کہ عبداللہ کو چاہیے کہ اس عورت سے پہلی حالت کی طرف رجوع کر لے۔

پس اس عورت کو لوٹا دیا اور فرمایا کہ جب طہر میں ہو تو خواہ طلاق دے یا اپنے پاس رکھ لے' ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی یاایها النبی اذا طلقتم النساء کہ عورتوں کو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو۔ (مسلم شریف جلد ۱' ص-۴۷۷)

یہ آیت تھی' آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی طلاق پر پیش فرمائی جو خلاف شرع تھی اور اس سے رجوع کرنے کا حکم دیا اور اس طلاق کو قائم نہ رکھا۔ رجوع کا لغوی معنی مراد ہے کہ اپنے اس کہنے سے رجوع کر لے کہ اپنے کہنے سے پھر کر پہلی حالت پر آجائے اور اس کو اپنی بیوی تصور کر لے پھر اگر چاہے تو حالت طہر میں طلاق دے ورنہ روک لے۔

اگر طلاق ہو جاتی تو صرف منع کا حکم سنا کر طلاق کو برقرار رکھا جاتا لیکن وہ غیر ماذون اور غیر مشروع تھی' اس لیے اس کو قائم نہ رکھا اور واپس کر دیا۔ ایک روایت میں ہے: ولم یراها شیئا کہ اس کو کوئی شے تصور نہ کیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ لیس ذالک بشئی کہ یہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ تیسری روایت میں ہے: لا یعتد بذالک کہ اس کا شمار ہی نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ غیر مشروع اور غیر مسنون اور غیر ماذون طلاق ناقابل اعتبار ہے۔

پس اسی طرح تین طلاق اکٹھی حرام اور بدعت ہیں- ان میں سے دو کو واپس کرنا چاہیے' وہ ناقابل اعتبار ہیں- صرف ایک شمار کرنی ہو گی- بعض روایتوں میں حالت حیض کی طلاق کو شمار کرنا ظاہر ہوتا ہے لیکن علامہ شوکانی عالم ربانی نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا ہے کہ ولا شک ان روایة عدم الاعتداد بتلک الطلقة ارجح من روایة الا عتداد المقدمة فاذا رجعنا الی الترجیح بناء علی تعذر الجمع فروایة عدم الاعتداد ارجح لما سلف یعنی اس بارہ میں کوئی شک نہیں ہے حائضہ کی طلاق نہ شمار کرنے کی روایت اس روایت سے بہت راجح ہے- جو طلاق شمار کرنے کے بارے میں ہے- جب موافقت کے منعقد ہونے کی وجہ سے ہم ترجیح کی طرف پھرتے ہیں تو روایت نہ شمار کرنے کی شمار والی سے بہت راجح ہے- اس وجہ سے جو گذر چکی ہے-

(۳) تین طلاق اکٹھی دینا حرام ہیں اور عورت کا نکاح میں رکھنا اور ایک دو کے بعد رجوع کرنا حلال ہے- تو حدیث میں ہے کہ لا یحرم الحرام الحلال کہ حرام کسی حلال کو حرام نہیں کرتا- پس تین طلاق اکٹھی حرام اس عورت حلال اور اس کی طرف رجوع حلال کو حرام نہیں کرتی ہیں- جو شخص کسی آیت یا حدیث سے حرام ثابت کر دے تو ہم اس کو ماننے کے لیے تیار ہیں- ورنہ یہ حدیث عمدہ دلیل ہے کہ کسی کے حرام فعل اور حرام قول سے حلال حرام نہیں ہوتا- فتذکر ولا تکن من الغافلین-

(۴) بخاری و مسلم کی متفقہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد کہ جو شخص ہمارے دین میں کوئی نئی چیز پیدا کرے جو اس دین میں سے نہیں ہے تو وہ چیز مردود ہے-

مسلم کی روایت میں ہے کہ من عمل عملا لیس علیه امرنا فھو رد کہ جس نے کوئی ایسا عمل کیا کہ جس پر ہمارا حکم نہ تھا تو وہ مردود ہے-

تنقیح الرواۃ جلد ۱' ص-۳۵ میں ہے کہ ای فھو باطل لا یعتد به یعنی وہ کام بالکل باطل ہے جو شمار نہ کیا جائے گا- پھر اس حدیث پر لکھا ہے کہ جو شمار نہ کیا جائے گا پھر اس حدیث پر لکھا ہے کہ ھذا الحدیث قاعدة عظیمة من قواعد الاسلام وھو من جوامع کلمه صلی اللہ علیه وسلم فانه صریح فی رد کل البدع والمخترعات سواء احدثھا فاعل البدعة او سبق باحداثھا احد غیرہ وھذا الحدیث مما یقنی بحفظه واستعماله فی

ابطال المنکرات واشاعة الاستدلال به۔ (بحوالہ فتح الباری' نووی' شرح کنز) یعنی یہ حدیث اسلام کے کلیہ قواعد اور اصول سے بڑا قاعدہ اور اصول ہے جو آنحضرت ﷺ کے جامع کلموں سے ہے جو کہ تمام بدعات اور افتراعی چیزوں کے رد کرنے میں صریح دلیل ہے۔ خواہ کسی بدعتی نے خود اس بدعت کو رواج دیا ہو یا کسی بدعتی کی جاری کردہ بدعت کو اس نے کیا ہو۔ بہرکیف وہ اس حدیث سے مردود ثابت ہے۔ اور یہ حدیث نہایت توجہ سے یاد کرنے کے قابل ہے اور اس سے استدلال کی اشاعت اس قدر ہو کہ جملہ منکرات کو اس سے باطل قرار دیا جائے۔

نیل الاوطار جلد-۶' ص-۲۲۶ میں حدیث من عمل عملا لکھ کر پھر یہ لکھا ہے کہ وھو حدیث صحیح شامل لکل مسئلة مخالفة لما علیه امر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ومسئلة النزاع من ھذالقبیل فان اللّٰہ لم یشرع ھذا الطلاق ولا اذن فیه فلیس من شرعه وامره یعنی یہ حدیث صحیح ہر اس مسئلہ کو شامل ہے جو شریعت محمدیہ کے احکام کے مخالف ہے۔ چنانچہ مسئلہ طلاق ثلاثہ در مجلس واحدہ اسی قبیل سے ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نہ اس طلاق کو مشروع کیا ہے اور نہ اس کا حکم دیا ہے۔ پس یہ طلاق مردود ہے۔ اور مردود باطل ہوا کرتا ہے۔ اب اگر اس طلاق کو نافذ کیا جائے تو پھر یہ معتبر ہو جاتی ہے' مردود نہیں ہوتی۔ اس لیے تین طلاق ہونے کا مذہب مردود ہے۔ اور ایک جاری ہونے کا مذہب صحیح اور مقبول ہے۔ نیل الاوطار میں ہے: واستدلوا ایضا بحدیث من عمل عملا الحدیث وھذا الطلاق لیس علیه امر النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم۔

(۵) صحیح مسلم میں ہے کہ ان ابا الصھباء قال لابن عباس اتعلم انما کانت الثلاث تجعل واحدة علی عھد النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم وابی بکر وثلاثا من امارة عمر فقال ابن عباس نعم (ص-۴۷۸) یعنی ابو الصھباء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کیا آپ کو یہ مسئلہ معلوم ہے کہ تین طلاقیں زمانہ نبوی اور زمانہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور زمانہ خلافت عمر رضی اللہ عنہ کے تین سال تک ایک ہی شمار کی جاتی تھیں تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں اس طرح ہے۔ اس حدیث صحیح سے بھی ثابت ہوا کہ عہد رسول اللہ ﷺ اور عہد صدیق رضی اللہ عنہ میں جبکہ اسلام کامل اور مکمل ہو چکا تھا' تین طلاق اکٹھی ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ پھر خلافت حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے تین سال تک بھی یہی قانون جاری رہا' یہی اصل شریعت تھا۔

اس حدیث میں عہد نبی اور عہد ابی بکر رضی اللہ عنہ کے الفاظ قابل غور ہیں۔ عہد نبوی سے تمام وہ زمانہ مراد ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منصب نبوت پر فائز المرام ہو کر زندہ رہے اور اس میں آپ پر احکام الٰہی نازل ہوتے رہے اور وحی اترتی رہی۔ پس جو کام اس زمانہ میں ہوا وہ مشروع ہے اور جس حدیث میں کوئی صحابی یہ کہہ دے کہ فلاں کام عہد نبوی میں اس طرح ہوتا رہا وہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔

مقدمہ اصول حدیث ملحقہ مشکوٰۃ میں ہے: او یخبر الصحابی بانهم کانوا یفعلون کذا فی زمان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لان الظاهر اطلاعه صلی اللہ علیہ وسلم بذلک ونزول الوحی به یعنی یہ حدیث بھی حکمی مرفوع ہے کہ صحابی خبر دے کہ زمانہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابہ فلاں کام کرتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کام کی اطلاع آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا کرتی تھی اور اس کے جواز پر وحی اتری تھی۔

اگر یہ بات نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر الزام آتا ہے کہ لوگ گناہ اور ناجائز کام کرتے رہے اور شارع نے لوگوں کو اس گناہ پر برقرار رکھا۔ نعوذ باللہ من ہذا الظن۔ ایسے مسائل بکثرت ہیں جن کا عہد نبوی میں ہونا بیان کر کے ان کا مشروع ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ مثلاً چند مسائل یہ ہیں:

(۱) فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے: انه طلقها زوجها فی عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ عہد نبوی میں اس کے خاوند نے اس کو طلاق دی۔ (۲) کنا فی زمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاخذ الارض بالثلث والربع۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں زمین کو تیسرے یا چوتھے حصہ پر بٹائی پر لیا کرتے تھے۔ (۳) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کنا ناکل علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن نمشی ونشرب ونحن قیام (مشکوٰۃ) ہم عہد رسول میں چلتے ہوئے کھاتے اور کھڑے ہوئے پانی پیتے تھے۔ (۴) استکرهت امراة علی عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وزراء عنها الحد کہ عہد نبوی میں ایک عورت سے جبراً زنا کیا گیا تو اس سے حد گرا دی۔ (مشکوٰۃ) اسی طرح بہت سی احادیث میں مسائل آتے ہیں جو عہد نبوی میں ہونے سے مشروع ہوئے ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ عہد نبوی میں تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھیں کیونکہ ایک طہر میں

ایک طلاق مشروع ہے۔ عہد ابوبکر رضی اللہ عنہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا تمام زمانہ مراد ہے کہ آپ کے عہد میں جس قدر صحابہ کرام تھے' وہ سب بمع دیگر مسلمانوں کے اکٹھی تین طلاقوں کے ایک ہونے پر متفق تھے۔ چنانچہ اعلام الموقعین جلد-۲' ص-۱۱۶ میں ہے: والثالث انها واحدة وهذا قول ابى بكر الصديق وجميع الصحابة فى زمانه یعنی تیسرا مذہب یہ ہے کہ ایک وقت کی تین طلاق ایک شمار ہیں۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق افضل الامتہ و اول المومنین رضی اللہ عنہ کا اور آپ کے زمانہ کے تمام صحابہ کا عمل تھا۔

مغار متن نور الانوار میں ہے: فالا قوى اجماع الصحابة نصا فانه مثل الاية والخبر المتواتر یعنی سب سے زیادہ قوی صحابہ کا اجماع ہے جو مثل آیت اور حدیث متواتر کے ہے۔

حدیث مسلم سے عہد نبوی اور عہد ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کا ایک طلاق ہونے پر متفق ہونا روز روشن کی طرح ثابت ہے۔ پس یہ مثل آیت اور خبر متواتر کے ہوا کیونکہ ان میں دو عہد میں صحابہ کی اکثریت تھی۔ اب بعد میں جو اجماع اس کے خلاف ہو گا وہ اس اجماع کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ وہ ضرور مسئوول ہو گا۔ یہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کی نہایت قوی دلیل ہے جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے کہ تین طلاق ایک شمار ہیں۔ اب اس کے خلاف کوئی دلیل قابل سماعت نہیں ہے۔

ہمارے مخالفین اس پر بیسیوں اعتراضات کرتے ہیں اور بیسیوں تاویلیں کرتے ہیں جو سب مردود اور باطل ہیں۔ چنانچہ علامہ نووی جو طلاق ثلاثہ کے قائلین سے ہیں' اپنی شرح میں لکھتے ہیں کہ وهو معدود من الاحاديث المشكلة کہ یہ حدیث مشکل احادیث سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مشکل ان کے لیے ہے جو قید تقلید شخصی میں مقید ہیں اور جو اہل سنت اور پختہ اہلحدیث ہیں' وہ اس پر آمنا وصدقنا کہہ کر عمل درآمد کر رہے ہیں۔

اس حدیث میں جو یہ خبر دی گئی ہے کہ عہد نبوی میں تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھیں' وہ کون سی تین طلاقیں تھیں؟ اور کس طرح ایک شمار ہوتی تھیں۔ یہ مندرجہ ذیل حدیث سے واضح ہے۔

(۶) مسند احمد وغیرہ میں انہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: عن ابن عباس قال طلق ركانة بن عبد يزيد اخو بنى مطلب امراته ثلاثا فى مجلس واحد فحزن عليها

جزنا شدیدا قال نساله رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم کیف طلقتها قال طلقتها ثلاثا قال فقال فی مجلس واحد قال نعم قال فانما تلک واحدة فارجعها ان شئت قال فراجعها۔ کہ رکانہ بن عبد یزید بنی المطلب کے بھائی نے اپنی بیوی کو تین طلاق ایک مجلس میں دے دیں۔ پھر اس پر بہت غمگین ہوئے اور پچھتائے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اپنی بیوی کو کس طرح طلاق دی ہے؟ اس نے عرض کیا کہ حضور! میں نے اسے تین طلاقیں دی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ایک ہی مجلس میں؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں جی ایک ہی مجلس میں۔ تب آپ نے فرمایا کہ جاؤ اس سے رجوع کر لو۔ اگر تم چاہو' کیونکہ وہ ایک طلاق شمار ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رکانہ رضی اللہ عنہ نے اس عورت کی طرف رجوع کر لیا۔

اس حدیث کو امام الآئمہ احمد رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح کہا ہے اور امام ابویعلیٰ نے بھی صحیح کہا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں اس حدیث کو نقل فرما کر لکھتے ہیں کہ هذا الحدیث نص فی المسئلة لا یقبل التاویل الذی فی غیره من الروایات کہ یہ حدیث مسئلہ طلاق ثلاثہ مجلس واحدہ میں صریح دلیل ہے کہ وہ ایک طلاق شمار ہو گی۔ یہ حدیث مخالفین کی کسی تاویل کو قبول نہیں کرتی۔ جیسے دیگر روایتوں میں تاویلیں کرتے ہیں۔ یہ حدیث عین دعویٰ کے مطابق ہے اور صریح ناطق ہے کہ عہد نبوی میں ایک مجلس کی تین طلاق ایک طلاق رجعی کے حکم میں تھی جس میں رجوع کرنا جائز تھا۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی فتویٰ ہے۔

چنانچہ ابوداؤد میں ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اذا قال انت طالق ثلاثا بضم واحد فهی واحدة کہ جب کسی نے اپنی بیوی کو ایک ہی بار کہہ دیا کہ تجھے تین طلاق ہیں تو یہ ایک ہی واقع ہو گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ابوالجوزا دریافت کرتے ہیں کہ العلم ثلاثا کن یردون الی واحدة قال نعم۔ کیا آپ کو یہ مسئلہ معلوم ہے کہ اکٹھی تین طلاق ایک طلاق کی طرف لوٹائی جاتی ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں معلوم ہے۔ حضرت طاؤس رضی اللہ عنہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے خاص شاگردوں میں سے ہیں' ان کے سامنے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک مخالف فتویٰ ذکر ہوا جیسے اب بھی ہمارے مخالفین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے حدیث کے مخالف روایت لاتے ہیں۔ تب انہوں نے پورے یقین سے دونوں ہاتھ اٹھا کر

یہ فرمایا کہ واللہ ما کان ابن عباس یجعلھا الا واحدۃ کہ اللہ کی قسم میرے محترم استاد تو اس طرح کی تین طلاق کو ایک ہی شمار کیا کرتے تھے۔ (عون المعبود)

اب ہمارے مخالف کوئی روایت ان کی اس کے خلاف ذکر کریں تو وہ قابل سماعت نہیں ہے۔ نیل الاوطار میں ہے کہ وردبان المعتبر روایۃ لا رایہ کہ معتبر راوی کی روایت ہوتی ہے اس کی اپنی رائے معتبر نہیں ہوتی۔ ہاں حدیث کے مطابق ہو تو وہ معتبر ہے۔ کیونکہ حدیث سے مدلل ہے۔ مثلاً مقلدین حنفیہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد عصر کی نماز لیتے ہیں اور ثبوت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں کہ آیت میں صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد صلوٰۃ عصر ہے۔ لیکن اس کے خلاف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ یہ ہے کہ صلوۃ وسطی سے مراد نماز فجر ہے۔ لیکن حنفیہ اس روایت کو مانتے ہیں اور ان کے فتویٰ کو نہیں مانتے۔ پس اسی طرح اس مسئلہ میں مخالف روایت کا حال ہو گا۔ صحیح وہ ہے جو موافق حدیث ہے' فتذکر فانہ نفیس۔

الغرض حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عہد نبوی کا دستور العمل اور رواج واضح ہو گیا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک کے حکم میں ہیں۔ جب اس کے ساتھ حدیث صحیح مسلم ملا دی جائے تو یہ دلیل سد سکندری سے بھی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے جس کو مقلدین کا لشکر توڑنا چاہے تو کبھی نہیں توڑ سکتا۔ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔ آج تک مقلدین نے جس قدر اس حدیث پر حملے کئے ہیں وہ تعسف سے خالی نہیں ہیں۔ چنانچہ امام شوکانی فقیہ ربانی نیل الاوطار جلد۔۸' ص۔۲۳۴ میں فرماتے ہیں: ان القائلین بالتتابع قد استکثروا من الا جوبۃ علی حدیث ابن عباس وکلھا غیر خارجۃ عن دائرۃ التعسف والحق احق بالاتباع یعنی جو لوگ لگاتار اکٹھی تین طلاق واقع ہو جانے کے قائل ہیں وہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بہت سے جوابات پیش کرتے ہیں جو سب کے سب دائرہ ظلم میں داخل ہیں۔ حق ہی زیادہ حقدار ہے کہ اس کی اتباع کی جائے پھر اس حدیث پر سوالات جرح لکھ کر جوابات دیئے ہیں اور پھر لکھا ہے کہ والحدیث نص فی محل النزاع کہ مسئلہ متنازعہ میں یہ حدیث صریح دلیل فیصلہ کن ہے۔

اب جو شخص ان صریح دلائل کتاب و سنت کے ہوتے ہوئے کسی کی تقلید کی وجہ سے یا اپنی نفسانیت یا مذہبی حمایت کے سبب سے ایک وقت کی تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر

عورت کو خاوند طلاق دہندہ پر قطعاً حرام سمجھے گا اور اس کو حق رجوع سے رد کرے گا تو وہ گمراہ اور سخت مجرم ہے۔ کیونکہ اصول ہو یا فروع اختلاف کے وقت حق ایک طرف ہوتا ہے' سب کی طرف نہیں۔ فماذا بعد الحق الا الضلال - ایک فریق کہتا ہے کہ ایک وقت کی تین طلاقیں ایک رجعی کے حکم میں ہیں' رجوع کرنا جائز ہے۔ عورت قطعاً طلاق مغلظہ سے حرام نہیں ہے اور دوسرا فریق کہتا ہے کہ تین طلاق ایک مجلس کی تین ہیں اور تینوں نافذ ہیں اور عورت مطلقہ بالکل بائن ہو چکی ہے اور حرام ہے تا نکاح ثانی اس کا نکاح اس کے خاوند سے نہیں ہو سکتا' حلالہ کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اور اختلاف بھی ہے تو پھر ان متضاد قولوں اور مذہبوں میں حق ایک طرف ہے' باقی گمراہی ہے۔ کیونکہ حق کے مقابلہ میں گمراہی ہوتی ہے۔ اب ہم کہتے ہیں کہ مسئلہ طلاق ثلاثہ میں ہم نے جو بحث کی ہے اور ایک وقت کی تین طلاق کا ایک ہونا صریح دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اب جو شخص ہماری طرح صحیح اور صریح دلائل پیش کر دے تب تو وہ فائز المرام ہو سکتا ہے ورنہ ضعیف اور کمزور دلائل قابل التفات نہیں ہیں۔

اختلاف اور تنازع کے وقت اصول شرعی یہ ہے کہ اس مسئلہ مابہ النزاع کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دیا جائے۔ چنانچہ ارشاد ہے: فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللّٰہ والرسول کہ جب تم کسی مسئلہ میں جھگڑا کرو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔

اللہ اور رسول کی طرف لوٹانا یہ ہے کہ اس کا فیصلہ کلام الٰہی اور حدیث رسول سے کرو۔ اس لیے ہم نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹا کر قرآن اور حدیث صحیح سے فیصلہ کر دیا ہے۔ اب اس کے خلاف کسی کا عذر مسموع نہیں ہے۔ جیسے مدیر رسالہ ماہواری المفتی دیوبند مطبوعہ ماہ صفر سنہ ۱۹۵۷ھ میں لکھا ہے کہ عوام کے لیے مسائل کی علت فقہاء کا فتویٰ ہے۔ سو فیصلہ عہد نبوی کے مقابلہ میں نہ ہم فقہاء کی سنتے ہیں اور نہ مقلدین سفہا کی' نہ ان کی علتوں کو مانتے ہیں اور نہ تقلیدی ذلتوں کو؎

ہوتے ہوئے مصطفیٰ کی گفتار
مت دیکھ کسی کا قول و کردار

اجماع صحابہ کا غلط دعویٰ: رسالہ المفتی دیوبند اور دیگر مقلدین مذاہب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں اس کے فسخ کا عام طور پر اعلان

فرمایا اور ہزارہا صحابہ کرام کی جماعت میں سے کسی ایک نے بھی اس پر انکار نہ فرمایا بلکہ سب نے تسلیم کر کے اس پر انعقاد اجماع کی حجت قائم کر دی۔ سو یہ دعویٰ سراسر باطل ہے۔ حسب روایت صحیحہ عہد نبوی سے لے کر خلافت فاروقی کے تین برس تک جو کل عرصہ ۲۵ سال کے قریب ہوتا ہے، تین طلاق کے ایک ہونے پر اجماع رہا تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فسخ کا کیا اختیار تھا اور جو اتنا عرصہ حکم جاری رہا پھر اس کو اٹھا دینے کا حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو کیا منصب تھا؟

علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ یقال این الاجماع الذی جعلته معارضا للسنة الصحیحة کہ وہ اجماع ہے کہاں؟ جو کہ حدیث صحیح کے معارض ہے۔ پھر لکھا ہے کہ وان کانت لاجل عمر بن الخطاب فاین یقع المسکین من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ثم ای مسلم من المسلمین یستحسن عقله وعلمه ترجیح قول صحابی علی قول المصطفی یعنی اگر یہ بات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تنفیذ حکم کے سبب سے کہی جاتی ہے تو اس مسکین کی رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں کیا وقعت اور کیا قدر و منزلت ہے؟ وہ کون سا مسلمان ہے جو قول صحابی کو قول مصطفیٰ ﷺ پر ترجیح دیتا ہے اور کس کی عقل یہ مستحسن سمجھتی ہے کہ کسی صحابی کے قول کو حدیث نبوی پر فوقیت دے؟[۲]

دعوا کل قول عند قول محمد

فما آمن من دینه کمخاطر

عبدالقادر عارف الحصاری غفرلہ الباری۔

الاہلحدیث سوہدرہ جلد۔۴، شمارہ ۱۹، ۲۰، ۲۳، ۲۵، ۲۶ مورخہ ۱۶، ۲۶۔ مئی و ۹۔ جون یکم و ۸ جولائی سنہ ۱۹۵۲ء

مذاکرہ علمیہ

سوالات علمیہ کے جوابات

اخبار اہلحدیث سوہدرہ مطبوعہ ۲۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۷۶ھ جلد ۸، نمبر ۴۴ میں چند علمی سوالات شائع ہوئے ہیں۔ جن میں اکابر علماء محققین سے خطاب کیا گیا ہے کہ وہ ان کے جوابات تحریر فرما کر سائل کی تسلی کریں۔ لیکن ساتھ ہی عام علما کو بھی اپنے خیالات ظاہر کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور اپنے حسن ظن کی بناء پر دفتر اہل حدیث نے اس راقم خادم العلماء کو بھی جوابات لکھنے پر توجہ دلائی ہے۔ حالانکہ بندہ محققین علماء میں شمار نہیں ہے۔ "من آنم کہ من دانم" ہاں محققین علماء سے صحبت و مصاحبت رکھنے والا اور فیض یافتہ ضرور ہے ؎

احب الصالحین ولست منهم
لعل اللہ یرزقنی صلاحا

کمترین کو مذہبی سوالات اور جوابات اور مذاکرہ علمیہ کا بڑا ذوق و شوق رہا ہے لیکن اس مشہور انقلاب کے بعد پریشانیوں سے دماغ بھی پریشان ہو گیا۔ نہ اب وہ فہم سلیم رہا نہ سامان کتب علمیہ ؎

ہم کو ماحول کے صدمات سے فرصت نہیں
آپ رنگینیٔ افکار طلب کرتے ہیں

لیکن ہمارے محترم بھائی حضرت السائل دام اقبالہ کے سوالات کا تاہنوز کسی نے احساس نہیں کیا اور ان کا یہ افسوس بجا ہے کہ ہمارے موجودہ علماء مذاکرات علمیہ میں بہت کم حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے یہ خادم العلماء علما محققین مرقومہ اخبار دام ظلالہم علی رؤس المسترشدین کی خدمت عالیہ میں سائل کی سفارش کرتا ہے ...... کہ ضرور اس کے سوالات مشکلہ کے جوابات تحریر فرما کر اخبار میں شائع کریں۔

اگرچہ موجودہ فرقہ بندی کے اندھیر میں اور فتنہ اختلاف کے طوفان میں ان سوالات کے جوابات محققانہ تو مشکل ہیں لیکن ؎

خدارا جو ہو جائے ذرا سی توجہ
تو مشکل کا حل کوئی مشکل نہیں ہے

اب کمترین راقم السطور قلیل البضاعت اپنی بضاعت علمیہ کے مطابق سوالات مطبوعہ کے جوابات نمبروار عرض کرتا ہے۔ فاقول مستعینا باللّٰہ وطالبا منہ التوفیق لا صابة الصواب فی الجواب۔

مسئلہ تحریم زوجہ: (ا) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ حدیث حرمت شہد کو کتاب الطلاق میں اس لیے لائے ہیں کہ طعام ہو یا عورت کسی چیز کو حرام کر لینے پر کفارہ یمین ہے۔ چنانچہ حدیث واقعہ عسل سے پہلے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ انہ قال کان یقول فی الحرام یمین یکفرھا وقال ابن عباس لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوة حسنة یعنی کسی چیز کو حرام کہنے پر کفارہ قسم ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ تمہارے لیے دینی مسائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسوہ حسنہ ہیں۔ اس آیت کو اس مسئلہ میں پیش کرنے کا یہی مقصد ہے کہ آپ نے شہد کو حرام کیا تو اس کا کفارہ دیا تھا۔ اس لیے تم بھی کسی چیز کو خواہ وہ طعام ہو یا عورت ہو حرام کہو تو کفارہ دو۔

چنانچہ دوسرے طریق میں صاف اس کی وضاحت کر دی ہے: قال اذا حرم الرجل علیه امراته فھی یمین یکفرھا یعنی جب کوئی شخص اپنے پر اپنی بیوی حرام کرے تو یہ قسم ہے' اس کا کفارہ دے۔ پس اس پر امام نووی نے مختلف اقوال نقل کرتے ہوئے تیرھواں مذہب یہ لکھا ہے کہ ھی یمین فیھا کفارة الیمین یعنی اپنی زوجہ کو حرام کرنے میں ..... تیرھواں مذہب یہ ہے کہ یہ قسم ہے جس میں کفارہ قسم کا ہے۔ قال ابن عباس وبعض التابعین۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور بعض تابعین نے یہی فرمایا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہی مذہب محدثین امام بخاری اور امام مسلم وغیرہما کا ہے۔ امام مسلم کا مذہب تو حدیث حضرت ابن عباس و حدیث عائشہ رضی اللہ عنہما واقعہ عسل سے ظاہر ہے اور امام بخاری کا مذہب صحیح بخاری کی کتاب الطلاق کے باب لم تحرم ما احل اللّٰہ لک سے صاف ظاہر ہے کیونکہ انہوں نے بھی پہلے باب میں حدیث مطلقہ بالطلاق الثلاث بیان فرما کر حرمت عورت کا مسئلہ بلفظ حرام شروع کر دیا اور اس بارہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کی ہے کہ اذا حرم امواته لیس بشئی یعنی جس شخص نے عورت کو اپنے پر

انت علی حرام کہہ کر حرام کیا تو یہ کوئی شے نہیں ہے یعنی طلاق واقع نہ ہو گی اور پھر اس پر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا واقعہ عسل لا کر یہ ظاہر کیا ہے کہ طعام اور عورت کو اپنے پر حرام کہنے کا ایک ہی حکم ہے کہ وہ حرام ہوں گے اور اس پر کفارہ یمین ہے- اور آیت لقد کان لکم فی رسول اللہ پیش کر کے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو مرفوع بنا دیا ہے کہ اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد کو اور ماریہ قبطیہ کو حرام کیا تھا تو وہ حرام نہ ہوئی- آپ نے کفارہ دے دیا تھا-

منتقی معہ نیل جزو ۶ ص-۲۴۳ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت یوں ذکر کی گئی ہے: انه اتاه رجل فقال انی جعلت امواتی علی حراما فقال کذبت لیست علیک بحرام ثم قال یاایھا النبی لم تحرم ما احل اللّٰہ لک (الایۃ) یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے یہ کہا کہ میں نے اپنی عورت اپنے پر حرام کر لی ہے- (اس کا کیا حکم ہے؟) تب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تو نے جھوٹ بولا' وہ تجھ پر حرام نہیں ہے- پھر یہ آیت سورہ تحریم کی پڑھی: یاایھا النبی الایۃ- پھر منتقی میں "باب من حرم زوجۃ واسۃ" ذکر کر کے اس حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے استدلال کیا ہے اور حدیث ان کی بروایت نسائی ذکر کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک لونڈی سے وطی کیا کرتے تھے- حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر معترض رہیں- یہاں تک کہ آپ نے اس کو اپنے پر حرام کر لیا- تب اللہ تعالیٰ نے یاایھا النبی آیت نازل فرمائی- ان دلائل سے ظاہر ہے کہ طعام' عورت' لونڈی اپنے پر حرام کرنے کا ایک ہی حکم ہے اور اسی بناء پر امام مسلم اور امام بخاری وغیرہ نے حدیث عسل لکھ کر یہ مسئلہ واضح کر دیا ہے جو بالکل صحیح ہے- اور علامہ شوکانی نے ابن حزم کی روایت سے زید بن ثابت اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی فتویٰ ظاہر کیا ہے-

اور علامہ شوکانی نے حافظ ابن القیم سے اس مسئلہ کی بحث نقل کی ہے اور علماء کے مختلف مذاہب بیان کئے ہیں- پہلا مذہب یہ لکھا ہے کہ اپنی بیوی کو یہ کہنا انت علی حرام یہ لغو اور باطل ہے- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت اسی طرح آئی ہے- یہی مذہب مسروق' ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن' عطاء' شعبی' داؤد تمام اہل ظاہر اور اکثر اہل حدیث کا ہے اور مالکی مذہب کا بھی ایک قول یہی ہے' جس کو اصبغ بن خرج مالکی نے پسند کیا ہے- ان

سب علماء کا استدلال اس آیت سے ہے: "ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال وھذا حرام" یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم اپنی زبانوں سے یوں ہی نہ کہہ دیا کرو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام ہے۔ یعنی کسی حلال چیز کو حرام اور حرام کو حلال کرنے اور کہنے کا تم کو کوئی اختیار نہیں ہے اور اسی آیت سے استدلال کیا ہے: یاایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک۔ کہ اے نبی! آپ نے اس چیز کو کیوں حرام کر لیا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے؟ یعنی آپ کا حلال کو حرام کرنا ناقابل قبول ہے اور ان علماء مذکورین نے اس حدیث صحیح سے بھی استدلال کیا ہے۔ جو فرمایا آنحضرت ﷺ نے کہ من عمل عملا لیس علیہ امرنا فھو رد۔ یعنی جس شخص نے ایسا عمل کیا کہ اس پر ہمارا کوئی حکم وارد نہیں ہے' وہ مردود ہے۔ چونکہ قرآن و حدیث میں اپنی منکوحہ عورت کو حرام کے لفظ سے حرام کرنے پر کوئی حکم وارد نہیں ہے۔ لہٰذا یہ طریقہ حرام کرنے کا غیر مشروع ہے۔

امام شوکانی نے نیل جلد-۶' ص-۲۶۵' ۲۶۶ پر بحث کر کے اس مذہب اول کو راجح قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اعلم انہ قد رجح المذھب الاول من ھذالمذاھب جماعۃ من العلماء المتاخرین وھذا المذھب ھو الراجح عندی۔ یعنی یہ بات جان لو کہ تحریم عورت کے بارہ میں جس قدر مذاہب ہیں' ان میں سے پہلے مذہب کو علماء متاخرین کی ایک جماعت نے ترجیح دی ہے اور میرے نزدیک بھی یہی مذہب راجح ہے۔

حضرت السائل کا حرمت شہد پر حرمت زوجہ کو قیاس قرار دینا غلط ہے بلکہ حرمت زوجہ تحریم کی ایک فرد ہے۔ حرمت شہد بھی تحریم کی ایک فرد ہے۔ اسی طرح تحریم لونڈی بھی یعنی تحریم ایک کلی ہے جس کی کئی جزئیات ہیں۔ حرمت زوجہ بھی حرمت شہد کی طرح اس کی ایک جزئی ہے۔ حدیث حرمت شہد میں صرف ایک واقعہ کا ذکر ہے لیکن آیت لم تحرم ما احل اللہ لک میں عموم شے کا ذکر ہے' تحریم کی نوعیت اگرچہ الگ ہے' آخر میں عرض یہ ہے کہ اس مسئلہ میں فتح الباری' محلی ابن حزم کا مطالعہ کر لیا جائے' میرے پاس یہ کتابیں نہیں ہیں۔

عبدالقادر عارف حصاری

اہلحدیث سوہدرہ جلد-۹' شمارہ-۸' مورخہ ۲۴- فروری سنہ-۱۹۵۷ء

مسئلہ خیار البلوغ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عمر نے اپنی دختر نابالغہ کا نکاح بحالت عدم بلوغ کفو میں بکر کے ساتھ کر دیا۔ اب بعد بلوغ کے دختر مذکورہ راضی نہیں ہے۔ شرع کی رو سے اس کو اختیار فسخ نکاح کا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

سائل عبدالعلیم

جواب: الحمدللہ رب العالمین اما بعد فاقول وباللہ التوفیق۔ بشرط صدق سوال و صحت صورت مسئلہ جواب اس کا یہ ہے کہ جب باپ یا کوئی ولی کسی نابالغہ کا نکاح کسی شخص سے کر دے اور وہ لڑکی بالغہ ہونے کے بعد جب اس کو علم اور رشد حاصل ہو' اس نکاح سے ناراضگی ظاہر کر کے اس شخص کے گھر جانے اور آباد ہونے سے انکار کر دے تو نکاح فسخ ہو جائے گا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:
ان جاریۃ بکرا اتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فذکرت ان اباھا زوجھا وھی کارھۃ فخیرھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (اخرجہ ابوداؤد ونسائی وابن ماجہ) یعنی ایک لڑکی کنواری جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں حاضر ہوئی اور اس نے یہ فریاد کی کہ میرے باپ نے میرا نکاح کر دیا ہے اور جس شخص سے نکاح کیا ہے' میں اس کو پسند نہیں کرتی۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکی کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار دے دیا۔

اس حدیث سے یہ حکم ثابت ہوا کہ جس نابالغہ لڑکی کا نکاح باپ یا کوئی دیگر ولی کر دے اور لڑکی علم و رشد حاصل ہونے پر اس نکاح پر راضی نہ ہو اور وہ نکاح کو فسخ کر دے تو نکاح قائم نہ رہے گا' فسخ ہو جائے گا۔ کیونکہ نکاح میں منکوحہ کی رضامندی شرط ہے۔ چونکہ بحالت نابالغی لڑکی کو علم اور رشد حاصل نہیں ہوتا' اس لیے نکاح کا حکم اس کی بلوغت تک معلق و موقوف رہتا ہے۔ اگر بالغہ ہونے پر وہ اس نکاح پر راضی ہو کہ اس شخص (ناکح) کے گھر چلی جائے اور خلوت صحیحہ ہو جائے تو نکاح پختہ اور مضبوط ہو جاتا ہے پھر اس کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہتا اور اگر بالغہ ہوتے ہی اس نکاح سے ناراض ہو اور اپنے خاوند ناکح کے گھر آباد ہونے سے انکار کر دے تو نکاح فسخ ہو جاتا ہے اور اس کو دوسری جگہ نکاح کرنا جائز ہوتا ہے۔ اس میں طلاق لینے کی ضرورت نہیں ہوتی' صرف لڑکی کی ناراضگی اور ناکح کے گھر اس

کی زوجیت میں رہنے سے انکار ہی کافی ہوتا ہے۔ نکاح تو صرف لڑکی کے اظہار ناراضگی سے ہی فسخ ہو جاتا ہے لیکن فسادات اور عدالتی تکلیفات سے بچنے کی غرض سے بذریعہ مقامی یونین کونسل یا حاکم عدالت کے ذریعہ تنسیخ نکاح کا فیصلہ حاصل کرانا ضروری ہے۔

خیار البلوغ ہر ایک نابالغہ لڑکی کا ذاتی حق ہے۔ اگر وہ چاہے تو اسے استعمال کر سکتی ہے۔ در عدالت کو یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ اس میں لڑکی کا فائدہ ہے یا نہیں۔ چنانچہ قرار دیا گیا کہ اگر لڑکی چاہے تو حق خیار بلوغ کو استعمال کر سکتی ہے اور اس بات کا کچھ لحاظ نہیں ہے کہ اس میں اس کا کچھ فائدہ ہے یا نہیں۔ (۵ انڈین کیسز ص-۲۷۰)

دیگر یہ کہ جس عورت کو بلوغ شرعی حاصل ہونے تک اپنے نکاح کا علم نہ ہو تو اس کو حق خیار بلوغ اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ اس کو ایسا علم ہو جائے کہ میرا نکاح فلاں شخص سے ہوا ہے اور یہ حق اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اس کو یہ علم نہ ہو کہ وہ اس اختیار کے ذریعہ اپنا نکاح فسخ کرا سکتی ہے۔ (۹۶ انڈین کیسز ص-۱۰۰۹) لڑکی کو ضروری ہے کہ حیض آنے کے بعد وہ اس امر کا اعلان کر دے کہ اسے یہ نکاح منظور نہیں ہے اور اس اعلان کی اطلاع بذریعہ چند آدمیوں کے یا بذریعہ وکیل رجسٹری نوٹس بھجوا دے کہ اس نے اپنے نکاح کو نامنظور کر دیا ہے۔ (قانون مارچ سنہ-۱۹۲۴)

باپ کا نکاح پڑھلیا ہوا مذہب اہل سنت میں ناقابل انفساخ ہے لیکن اگر باپ نے لاپرواہی سے کام لیا جیسے غیر کفو میں نکاح کر دیا ہو تو تمام مقننین کا اس پر اتفاق ہے کہ ایسا نکاح ناقابل انفساخ ہے۔ (شرع محمدی سید امیر علی جلد-۲، ص-۳۲۵)

سوال میں غیر کفو سے نکاح کرنا درج ہے تو لڑکی کو بلااتفاق فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہے۔ اگر والد نے لڑکی نابالغہ کی شادی اپنی ولایت سے کر دی ہو تو اگر وہ شادی لڑکی کے مفاد کے خلاف ہو تو لڑکی کو خیار بلوغ حاصل ہے۔ (بحوالہ امیر علی محمڈن لا ایڈیشن نمبر-۵، ص-۳۴۳، ۳۴۵ فیصلہ سر جسٹس لال جے لال صاحب جج ہائی کورٹ پنجاب- انڈین کیسز نمبر-۴، ص-۱۳۰، سنہ-۱۹۳۱ء پنجاب لاء رپورٹر ص-۹۴۸ انڈین رولنگ لاہور ص-۵۱۶، سنہ-۱۹۳۱ء-

خلاصہ کلام یہ ہے کہ لڑکی نابالغہ کو بروئے حکم شرعی و قانون ملکی بالغہ ہو جانے کے بعد پورا علم ہونے پر فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہے اور اس کو گواہان کے سامنے اپنی ناراضگی کا اظہار اور اعلان کر کے اپنے ناکح کو اطلاع پہنچا دینی ضروری ہے اور عدالت میں بھی اطلاعی

درخواست کر دینی لازم ہے تاکہ پھر کوئی قانونی چارہ جوئی نہ کر سکے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر العارف الحصاری غفرلہ المباری ۔بقلمہ

الاعتصام لاہور جلد ۱۹، شمارہ ۱۳ مورخہ ۲۷-اکتوبر سنہ ۱۹۶۷ء

طلاق مکرہ کا حکم

مکرہ اس شخص کو کہتے ہیں جس پر اکراہ اور زبردستی اور جبر کیا جائے۔ یہ اکراہ دو قسم ہے، ایک شرعی اصولی اور دوم طبعی۔ جب کسی شخص کو اکراہ اصولی شرعی کیا جائے تاکہ وہ اپنی زوجہ کو طلاق دے دے تو یہ طلاق واقع نہ ہو گی۔ دلائل اس کے یہ ہیں:

(۱) جریدہ اہلحدیث جلد ۶، نمبر ۲۶ کے شروع میں ابن ماجہ اور بیہقی کی حدیث مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ان اللہ تجاوز لی عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرھوا علیہ یعنی میری وجہ سے اللہ تعالیٰ نے میری امت کو خطا اور بھول اور وہ چیز جس پر زبردستی کی جائے معاف کر دیا ہے۔

(۲) منتقی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق (رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجہ) یعنی طلاق اور آزاد کرنا زبردستی کی حالت میں صحیح نہیں ہے۔ نیل الاوطار میں بحوالہ تلخیص ابن حجر امام ابن قتیبہ اور خطابی اور ابن السید وغیرہم سے اغلاق کا معنی اکرام منقول ہے۔ اور یہ لکھا ہے: وقد استدل بھذا الحدیث من قال انہ لا یصح طلاق المکرہ یعنی اس حدیث سے ان علماء نے استدلال کیا ہے جو مکرہ کی طلاق کو صحیح نہیں کہتے۔

چنانچہ حضرت علی وعمروابن عباس وابن عمروزبیروحسن بن صلح وقاسمیہ وناصرومویدباللہ ومالک وشافعی رحمہم اللہ سے بھی یہی حکایت کیا گیا ہے۔

(۳) حدیث میں ہے: انما الاعمال بالنیۃ یعنی عملوں کا اعتبار نیت پر ہے۔ مکرہ کی نیت اور ارادہ طلاق کا نہیں ہوتا، وہ صرف بوجہ اکرہ اور زبردستی کے منہ سے طلاق کا لفظ نکل دیتا ہے جو قابل اعتبار نہیں ہے۔

(۴) بخاری کتاب الاکراہ میں ہے: وقال ابن عباس فیمن یکرھہ اللصوص فیطلق

لیس بشئی وبه قال ابن عمر وابن الزبیر والشعبی والحسن یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس شخص پر کسی نے اکراہ کیا کہ اپنی عورت کو طلاق دے' اس نے طلاق دی تو اس کا کچھ اعتبار نہیں اور یہ طلاق کوئی شے نہیں ہے۔ یہی حضرت ابن عمر اور ابن الزبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے اور یہی امام شعبی اور امام حسن بصری کا فرمان ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی مذہب راجح اور عین انصاف ہے۔

(۵) نیل الاوطار جلد-۶' ص-۲۳۶ میں ہے کہ حضرت عطاء نے آیت اکراہ "الا من اکرہ وقلبه مطمئن بالایمان" یعنی جو شخص ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے لیکن جس پر اکراہ کیا گیا اور اس کا دل مطمئن تھا تو اس کے کفری کلمہ کہنے سے اللہ کا غضب نہیں ہے۔ اس کی بناء پر یہ کہا کہ الشرک اعظم من الطلاق یعنی شرک طلاق سے بہت بڑا ہے۔ جب بصورت اکراہ شرک جیسی بڑی چیز ناقابل اعتبار ہے تو طلاق کا کیا اعتبار ہے۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے بحالت اکراہ کفر بولا جو معاف ہوا۔

(۶) منتقی میں ایک روایت ہے کہ عہد فاروقی میں ایک شخص نے رسی سے لٹک کر شہد نکالنا شروع کیا تو اس کی عورت رسی پر بیٹھ گئی اور کہا کہ یا تو مجھے طلاق دے دے ورنہ میں رسی کو کاٹتی ہوں۔ اس نے اللہ اور اسلام کا واسطہ دیا مگر وہ نہ مانی' تب اس نے تین طلاق دے دیں۔ بعدہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور اس نے اپنا قصہ سنایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنی بیوی کی طرف رجوع کر لے' فلیس هذا بطلاق یعنی وہ طلاق نہیں ہے۔ (رواہ سعید بن منصور)

(۷) مکرہ کا نکاح بھی جائز نہیں ہے' کما فی البخاری۔

(۸) مکرہ کا ہبہ اور بیع بھی جائز نہیں ہے۔ (بخاری)

(۹) مکرہ عورت سے زنا کیا گیا تو اس پر حد نہیں ہے۔ (بخاری)

(۱۰) مکرہ نے قسم کھائی اور پھر خلاف کیا تو حانث نہیں ہے۔ (بخاری)

ایسا اکراہ دو قسم ہے۔ ایک اکراہ قولی اور دوم اکراہ فعلی۔ اکراہ قولی پر کوئی شے واجب نہیں ہوتی جیسے کفر' اقرار بالنکاح' طلاق' رجعت' بیع' ہبہ وغیرہ اور اکراہ فعلی پھر دو قسم ہے۔ ایک یہ کہ ضرورت اس کو اس کام کا کرنا مباح کر دے' جیسے اکراہ کیا گیا کہ مردار کھائے یا شراب پیئے تو یہ چیزیں اس کے لیے مباح ہو گئیں اور اس کو ظاہر چیز گناہ وغیرہ لازم نہیں ہے۔ دوم

یہ کہ اس کو اس کام کا کرنا مباح نہ کرے جیسے کسی کو قتل کرنا یا مارنا یا فساد کرنا اور زخمی کرنا یا مال خراب کرنا وغیرہ تو یہ اکراہ اس پر ان چیزوں کا کرنا لازم نہیں کرتا۔ (عینی شرح بخاری)

اس اکراہ کی صورتیں یہ ہیں کہ زبردستی اور جبر کرنے والے' اس کو مارنے' زخمی کرنے یا کسی عضو کے بیکار کرنے یا حبس بے جا میں رکھنے یا مال نقصان کر دینے کا یقین دلائیں تو وہ مکرہ ہے جس کو قولاً فعلاً کسی کام پر کوئی گناہ نہیں ہے اور حکم مرتب نہیں ہے۔ دوم طبعی ہے کہ ماں' باپ یا استاد یا حاکم یا برادری یا یار دوست اس کو نکاح یا طلاق کا حکم دیتے ہیں جس کا ماننا دل میں مکروہ تصور کرتا ہے مگر ان کا لحاظ رکھتا ہوا دلی ارادہ سے نکاح یا طلاق قبول کر لیتا ہے تو یہ اکراہ طبعی ہے۔ جس میں طلاق اور نکاح اور عتاق معتبر اور صحیح تصور ہوں گے۔

دلائل اس کے یہ ہیں:

(۱) مشکوۃ باب البر والصلۃ فصل ثانی میں حدیث ہے کہ ایک شخص حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میرے پاس ایک بیوی ہے اور میری ماں اس کے طلاق دینے کا حکم کرتی ہے۔ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے' فرماتے تھے کہ جننے والی جنت کے دروازوں میں درمیان والا دروازہ ہے۔ پس اگر تو چاہے اس کی حفاظت کر اور چاہے اس دروازہ کو ضائع کر۔

(۲) باب البر والصلہ کی فصل تیسری میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے نکاح میں ایک عورت تھی جس کو میں محبوب رکھتا تھا اور میرے باپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو برا جانتے تھے۔ مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم اس کو طلاق دے دو۔ میں نے انکار کر دیا تو عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور یہ قصہ ذکر کیا تو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو طلاق دے دے۔

دیگر روایت میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرنی چاہتا تو اس روز کرتا لیکن میں نے نافرمانی نہ کی اور اپنی محبوب بیوی کو طلاق دے دی۔ ان دو احادیث سے یہ ظاہر ہے کہ اگرچہ دل نہ چاہے لیکن والدین مجبور کریں تو بیٹے کو طلاق دینی پڑے گی اور یہ طلاق واقع ہو جائے گی اور یہ اکراہ شرعی ممنوعہ نہیں ہے بلکہ اکراہ اور جبر طبعی ہے۔

(۳) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ خلافت فاروقی میں مدائن کے گورنر تھے۔ وہاں آپ نے ایک

یہودیہ عورت سے نکاح کر لیا (بروئے قرآن اہل کتاب عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے) اس پر فرمان خلافت سرزد ہوا کہ خل سبیلها یعنی اس عورت کو تم طلاق دے دو۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کچھ تامل کیا' جس پر خلافت کا حکم دوبارہ سختی سے گیا کہ اعزم علیک ان لا تضع کتابی حتّٰی تخلّی سبیلها (تلخیص و کنزالعمال) میں تمہیں بحیثیت حاکم حکم دیتا ہوں کہ میرے اس فرمان کو پڑھتے ہی اس بیوی کو طلاق دے دو۔ یہ امیر شریعت کا حکم تھا جس کو مانا گیا اور کراہت طبعی رکھتے ہوئے طلاق دے دی گئی۔ یہ اکراہ شرعی اصولی نہیں ہے' طبعی ہے۔ جس میں انسان اپنی طبیعت پر زور ڈال کر عمل کرتا ہے لیکن دل نہیں چاہتا' ہاں عمل صحیح ہے۔

(۴) منتقی میں حدیث ہے کہ ایک جوان عورت دربار رسالت میں حاضر ہو کر کہنے لگی کہ میرے باپ نے میرا نکاح اپنے بھتیجا سے کر دیا ہے تاکہ وہ میرے ذریعہ اپنا کمینہ پن رفع کرے۔ آپ نے اس کو اختیار دے دیا کہ نکاح رکھے یا نہ رکھے۔ اس نے کہا کہ قد اجزت ما صنع ابی یعنی جو کچھ میرے باپ نے کر دیا ہے' اب میں اس کو جائز کرتی ہوں لیکن عام عورتوں کو یہ معلوم کرانا چاہتی ہوں کہ باپوں کو نکاح کا کلی اختیار حاصل نہیں ہے یعنی یہ اختیار نہیں ہے کہ جوان لڑکی سے اذن اور رضا حاصل کئے بغیر وہ نکاح کر دے' یہ جائز نہیں ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی ظاہر ہے کہ باپ کے نکاح کو باوجود اس پر جرح قدح کرنے کے منظور کر لیا۔ اگرچہ طبیعت نے نفرت کی مگر باپ کا لحاظ کیا یہ جبر طبعی ہے۔

پس اب آپ سوال کو مکرر پڑھیں کہ زید نے اپنی منکوحہ نابالغہ کو برادری کی مجبوری سے طلاق لکھ دی۔ سیاق عبارت اور زمانہ کے حالات سے یہ ظاہر ہے کہ یہ مجبوری طبعی ہے۔ اکراہ اور جبر اصولی شرعی نہیں ہے کہ برادری نے اس کو کسی مکان میں بند کر لیا تھا کہ تجھ کو قتل کر دیں گے یا تیری آنکھ نکال دیں گے یا تیرا مال ضائع کر دیں گے بلکہ برادری نے اس کو نابالغہ کے نکاح رکھنے کے نقصانات یا کوئی خرابی کے اسباب بیان کر کے متفقہ طور پر اس کو کہا ہو گا۔ اس نے برادری کا لحاظ اور دباؤ سمجھتے ہوئے بادل نخواستہ بیوی کو طلاق دے دی تو یہ طبعی مجبوری ہے کہ دل تو نہ چاہتا تھا لیکن برادری کی وجہ سے دل پر زور ڈال کر اس نے عمل کر لیا تو یہ عمل نیت اور اختیار سے ہوئی ہے۔ اس لیے نافذ ہے اور طلاق واقع ہو گئی ہے۔ ہاں اگر برادری نے اس طرح مجبور کیا ہے کہ ظالم بن کر اس کو گھیر لیا اور ڈرا دھمکا کر

اس پر زبردستی کی اور اس کو نقصان دینے کا خوف دلایا تب اس نے مجبور ہو کر طلاق دی تب یہ طلاق واقع نہ ہو گی۔

عبدالقادر عارف الحصاری

اہلحدیث سوہدرہ جلد۔ ۷، شمارہ۔ ۴۵، ۴۶ مورخہ یکم و ۸ دسمبر سنہ۔ ۱۹۵۵ء

مشروط طلاق

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور پھر رجوع کر لیا۔ اس کے کئی سال بعد پھر طلاق دے دی اور پھر رجوع کر لیا۔ پھر زید کا بکر کے ساتھ کسی معاملہ میں نزاع ہو گیا تو زید نے قسم کھائی کہ اے بکر! اگر میں نے آج کے بعد تیرے ساتھ راضی نامہ کیا تو میری بیوی کو طلاق ہو گی۔ اب زید بکر کے ساتھ راضی ہونا چاہتا ہے۔ اگر قسم کا کفارہ دے دے تو کیا اس کا نکاح اپنی بیوی کے ساتھ بدستور قائم رہتا ہے یا نہیں یا کوئی اور صورت ہو گی؟ اور شرح محمدی کی رو سے اس کو کس طرح درست کیا جا سکے گا۔

(السائل حاجی جان محمد یوسف منڈی بہاؤالدین)

الحمد للّٰہ رب العالمین حمد ایوا فی نعمہ ویکافی مزیدہ۔ اما بعد فاقول وباللّٰہ التوفیق۔ سائل کے سوال پر غور کیا گیا تو اس میں یہ جملہ غور طلب پایا گیا کہ تیرے ساتھ راضی نامہ کیا تو میری بیوی کو طلاق ہو گی۔ اگر وہ یہ کہتا کہ اگر میں تجھ سے راضی نامہ کروں تو میری بیوی پر طلاق ہے۔ پھر تو طلاق ہونے کا امکان تھا کہ جب راضی نامہ کرتا طلاق واقع ہو جاتی لیکن اس نے یہ کہا کہ راضی نامہ کیا تو طلاق واقع ہو گی۔ "لفظ ہو گی" آئندہ زمانہ میں جو راضی نامہ کے بعد آئے گا طلاق ہونے کا ذکر کر رہا ہے۔ اب وہ طلاق دے گا تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ ورنہ اس کی یہ خبر غلط ہو جائے گی۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ اگر تو فلاں کے گھر گیا تو لڑائی ہو گی۔ اب وہ چلا گیا تو لڑائی نہ ہوئی کہ گھر والوں نے صبر و تحمل سے کام لیا یا کسی نے روک دیا تو کہنے والے کی خبر غلط ہو گئی۔

الغرض لفظ "ہو گی" نہایت مخدوش ہے۔ اگر یہ کہنے والے کی تعبیر غلط ہے اور اس نے یہ کہا ہے کہ اگر میں اس سے راضی نامہ کروں تو میری بیوی پر طلاق ہے تو پھر اس پر بحث

ہے کہ فقہاء مذاہب اس مسئلہ میں مختلف الآراء ہیں۔ فقہاء حنفیہ کہتے ہیں کہ طلاق راضی نامہ کرنے پر واقع ہو جائے گی۔ چنانچہ قدوری میں ہے: "واذا اضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط" یعنی جب طلاق کو شرط کی طرف نسبت کرے گا تو شرط پوری ہونے پر طلاق واقع ہو جائے گی جیسے کسی نے اپنی عورت سے کہا "ان دخلت الدار فانت طالق" کہ اگر تو اس گھر میں داخل ہوئی تو تجھ پر طلاق ہے۔ پس جب گھر میں عورت داخل ہوئی تو اس پر طلاق ہو گئی کیونکہ طلاق شرط کے وجود پر معلق تھی۔ جب شرط پائی گئی تو اس کی جزاء جو طلاق تھی، وہ بھی پائی گئی کہ محل طلاق قابل للجزاء ہے۔ شرط وہ ہوتی ہے جس کے ساتھ جزاء معلق ہو اور شرط میں افعال کا ذکر ہوتا ہے کہ جب وہ فعل پایا جائے گا تو جزا پائی جائے گی۔ پس جب راضی نامہ ہوا تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ یہ فقہاء حنفیہ کا مسلک ہے اور مصنف ہدایہ لکھتے ہیں کہ وھذا بالاتفاق کہ اس مسئلہ پر علماء مذاہب کا اتفاق ہے مگر یہ غلط ہے۔ صورت مسئولہ میں زید نے جو یہ حلف کھائی ہے کہ بکر کے ساتھ راضی نامہ کروں تو میری بیوی پر طلاق ہے۔ سلف صالحین فقہا کا جن کی فقہ کا کتاب و سنت پر دارومدار ہے' مسلک یہ ہے کہ ایسی حلفیہ شرط کے ظاہر ہونے پر طلاق واقع نہ ہو گی اور اس کا کلام لغو جائے گا اور قسم کا کفارہ دینا پڑے گا۔

چنانچہ اعلام الموقعین جلد چہارم ص-۹۷ میں ہے: (المخرج السابع) اخذه بقول اشهب من اصحاب مالک بل هو افقههم علی الاطلاق فانه قال اذ قال الرجل لامراته ان کلمت زیدا او خرجت من بیتی بغیر اذنی ونحو ذالک مما یکون من فعلها فانت طلق وکلمت زید او اخرجت من بیته تقصد ان یقع علیها الطلاق لم تطلق یعنی ساتواں مخرج یہ ہے کہ امام اشہب کا قول لیا جائے کہ فقہاء مالکی مذہب میں وہ بہت بڑے فقیہ ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو یہ کہا کہ اگر تو نے زید سے کلام کیا یا میرے گھر سے بغیر میرے اذن کے باہر نکلی تو تجھ پر طلاق ہے۔ پھر اس نے زید سے کلام کیا اور اس کے اذن کے بغیر گھر سے نکلی اور اس نے ارادہ کیا کہ مجھ پر اس شرط کے واقع ہونے پر طلاق ہو جائے گی تو طلاق واقع نہ ہو گی۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ اس پر فرماتے ہیں: ولا ریب ان هذا الذی قال اشهب افقه من القول بوقوع الطلاق یعنی اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو فقہا وقوع طلاق کے

قائل ہیں' ان سے امام اشہب کا قول زیادہ فقاہت پر مبنی ہے کیونکہ زوج کا ارادہ دراصل طلاق وارد کرنے کا نہیں ہے بلکہ عورت کو اس گھر سے اور اس شخص سے کلام کرنے سے روکنا مقصود ہے۔ امام اشہب کا علم اور امامت میں بہت بلند درجہ ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے بڑے مشہور فقیہ ہیں۔ ان کی تعریف کے بعد امام ابن القیم فرماتے ہیں: (المخرج الثامن) اخذ بقول من یقول ان الحلف بالطلاق لا یلزم ولا یقع علی الحانث بہ طلاق ولا یلزمہ کفارۃ ولا غیرھا وھذا مذھب خلق من السلف والخلف صح ذالک عن امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللّٰہ وجھہ۔ (جلد۔۴' ص۔۹۸) یعنی حیلہ باطلہ سے نکلنے کا آٹھواں مخرج یہ ہے کہ اس شخص کا قول لیا جائے۔ جو یہ کہتا ہے کہ حلف بالطلاق میں نہ طلاق واقع ہو گی اور نہ اس پر کفارہ لازم ہو گا۔ یہ مذہب اس خلقت الٰہی کا ہے جو سلف و خلف میں سے گذر چکی ہے اور امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بھی یہی فتویٰ صحیح سند سے ثابت ہے۔ اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ حالف بالطلاق کی طلاق واقع کرنے کی نیت نہیں تھی بلکہ اس کا قصد اپنے نفس کو ایسی چیز سے روکنے کا تھا جس میں وہ واقع ہونا نہیں چاہتا۔ مثلاً صورت مسئولہ میں زید کا ارادہ عورت کو طلاق دینے کا نہیں تھا بلکہ اپنے آپ کو بکر سے راضی نامہ کرنے سے روکنا مقصود تھا اور طلاق میں نیت شرط ہے کہ عورت کو اپنی زوجیت سے خارج کرنا مقصود ہو' تب طلاق وارد ہوتی ہے ورنہ نہیں۔

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ باسنادہ نقل کیا ہے کہ کسی شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا اور پھر اس نے سفر کا ارادہ کر لیا تو اس عورت منکوحہ کے وارثوں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا کہ خرچہ کا انتظام کرو۔ اس نے کہا اگر ایک مہینہ تک خرچہ نہ بھیجوں تو اس پر طلاق ہے۔ اس نے ایک ماہ تک کوئی چیز ارسال نہ کی۔ جب وہ سفر سے واپس آیا تو عورت کے وارثوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عدالت میں مقدمہ پیش کیا اور فریقین نے بیانات دیئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ صادر فرمایا: وقد افتی امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام الحالف بالطلاق انما لا شئی علیہ ولم یعرف لہ فی الصحابۃ مخالف۔ یعنی امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ حالف بالطلاق پر کوئی چیز عائد نہیں ہوتی۔ نہ طلاق اور نہ کفارہ اور صحابہ کرام میں کوئی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف فتویٰ دینے والا یا ان کے فتویٰ پر انکار کرنے والا ثابت نہیں ہوا۔

اور جلد-۴، ص-۶۸ میں یہ لکھا ہے: وصح ذالک عن طاؤس اجل اصحاب ابن عباس کہ یہی فتویٰ حضرت طاؤس نے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ کے جلیل القدر شاگردوں میں سے ہیں، فتویٰ دیا ہے کہ الحلف بالطلاق لیس شیئا یعنی طلاق کے ساتھ قسم کھانی کوئی چیز نہیں ہے- پھر علامہ صاحب فرماتے ہیں: وقد وافقه اکثر من اربع ماة عالم من نبی فقهه علی نصوص الکتاب والسنة دون القیاس کہ امام طاؤس کی چار سو سے زیادہ فقہاء نے اس مسئلہ میں موافقت کی ہے جو اہل رائے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو اپنی فقاہت کا دارومدار کتاب و سنت پر رکھتے ہیں (یعنی اہل حدیث ہیں) پھر امام ابن حزم سے نقل کیا ہے- قال فی کتاب المحلّٰی: الیمین بالطلاق لا یلزم سواء براوحنث لا یقع به طلاق ولا عتاق الا کما امر اللّٰه تعالٰی ولا یمین الاکما شرع اللّٰه تعالٰی علی لسان رسوله ثم فرد ذالک وساق اختلاف الناس فی ذالک ثم قال فهولاء علی بن ابی طالب کرم اللّٰه وجه وطاؤس لا یقضون بالطلاق علی من حلف به فحنث ولا یعرف فی ذالک لعلی کرم اللّٰه وجهه مخالف من الصحابه رضی اللّٰه عنه یعنی امام ابن حزم اپنی کتاب محلی میں فرماتے ہیں کہ طلاق کے ساتھ قسم کھائی ہوئی لازم نہ ہو گی، خواہ قسم پوری کر کے پاک ہو یا توڑ دے، طلاق واقع نہ ہو گی- کیونکہ طلاق اور عتاق اسی طریقہ پر واقع ہوتے ہیں جس طریقہ پر واقع کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے پھر اس حکم کو برقرار رکھ کر لوگوں کا اختلاف ذکر کیا پھر فرمایا ہے کہ یہ سلف کے اکابر حضرت علی اور طاؤس اور شریح رضی اللہ عنہم بالطلاق سے حانث ہونے پر طلاق واقع ہونے کا فیصلہ نہیں کرتے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کوئی صحابی مخالف معلوم نہیں ہوا-

پھر ص-۱۰۰ پر فرماتے ہیں: ممن روی عنه عدم وقوع الطلاق علی الحالف اذا حنث عکرمة مولی ابن عباس یعنی حالف بالطلاق کے عدم وقوع طلاق کے بارے میں حضرت عکرمہ سے بھی روایت ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام اور شاگرد ہیں کہ اگر طلاق دہندہ حانث ہو گیا تو طلاق واقع نہ ہو گی- چنانچہ باسنادہ نقل فرمایا ہے: انه سئل عن رجل حلف بالطلاق انه لا یکلم اخاه فکلم فلم یر ذالک طلاقا ثم قراء ولا تتبعوا خطوات الشیطان- یعنی حضرت عکرمہ سے مسئلہ دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے حلف بالطلاق کھائی کہ اپنے بھائی سے کلام نہ کرے گا پھر کلام کیا تو فرمایا طلاق واقع نہ ہو گی پھر یہ آیت قرآنی

پڑھی کہ تم شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو (یعنی خلاف شرع طلاق نہ دیا کرو)

امام ابن القیم نے اعلام کی جلد-۳' ص-۶۸ میں ایک روایت نقل کی ہے جو کہ باسنادہ وہاں درج ہے کہ رفیع نے یہ واقعہ بیان کیا کہ میں اور میری بیوی دونوں ایک انصاریہ عورت کے مملوکہ غلام تھے- اس نے یہ قسم کھائی کہ میں تمہارے درمیان طلاق سے تفریق کروں گی- اگر نہ کر سکوں تو میرا سب مال راہ الہیٰ میں قربان ہے اور سب میرے غلام آزاد ہیں- میں نے یہ حلفیہ صورت آنحضور ﷺ کی زوجہ مطہرہ (عائشہ رضی اللہ عنہا) کے پاس پیش کی تو انہوں نے یہ سن کر فرمایا: کفری عن یمینک کہ اپنی قسم کا کفارہ دے دو کافی ہے- اس عورت نے یہ سن کر ماننے سے انکار کیا پھر میں حضرت زینب اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما کے پاس گیا اور یہ مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے اس عورت کو کہلا بھیجا کہ کفری عن یمینک - اس نے نہ مانا تو میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور یہ قصہ ذکر کیا تو انہوں نے بھی یہ فرمایا کہ ان کفری عن یمینک کہ تو اپنی قسم بالطلاق کا کفارہ دے دے- اس عورت نے انکار کیا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اس کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ تیری طرف ازواج النبی نے آدمی بھیجا کہ تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے اور زوجین مملوکین کی تفریق سے باز آ' تو نے نکار کر دیا- یہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا اے ابوعبدالرحمٰن (یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) میں نے تمام مال قربان کرنے اور غلاموں کے آزاد کرنے کی قسم کھائی ہوئی ہے- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وان کنت قد حلفت لھما اگرچہ تو نے دونوں باتوں کی قسم کھائی تب بھی کفارہ ادا کر دے-

پھر امام ابن القیم رحمہ اللہ ص-۱۰۰ میں یہ فرماتے ہیں: والادلة الدالة علی عدم الوقوع فی غایته القوة والکثرة وکثیر منها لا سبیل الی دفعه فکیف یجوز معارضتها بدعوی الاجماع قد علم بطلانه یعنی عدم وقوع طلاق پر ادلہ کثیرہ وارد ہیں جو نہایت قوت رکھتی ہیں اور بہت دلیلیں ایسی ہیں کہ ان کا جواب ممکن نہیں ہے- پس اس کا معارضہ اجماع کے دعویٰ سے کرنا سراسر باطل ہے-

پھر فرماتے ہیں فلیس باھدی الموقعین آیة من کتاب او سنة والاثر عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ولا عن اصحابه الا قیاس صحیح یعنی ایسی صورت میں طلاق واقع کرنے والوں کے ہاتھوں میں کتاب و سنت سے کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی صحابہ کرام

سے کوئی فیصلہ ان کے پاس ہے اور نہ قیاس صحیح ہے اور مخرج تاسع میں فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں اس شخص کا فتویٰ لینا چاہیے جو یہ کہتا ہے کہ ان الطلاق المعلق بالشرط لا یقع ولا یصح تعلیق الطلاق کما لا یصح تعلیق النکاح یعنی طلاق معلق بالشرط واقع نہیں ہوتی اور تعلیق طلاق صحیح نہیں ہے۔

الغرض امام ابن القیم رحمہ اللہ نے جلد۔۳‘ اور جلد۔۴ میں اس مسئلہ پر نقلی و عقلی دلائل سے بحث کی ہے کہ طلاق معلق بالشرط واقع نہیں ہوتی۔ اب میں کہتا ہوں کہ حالف نے جو قسم اٹھائی ہے کہ میں بکر سے راضی نامہ نہیں کروں گا‘ یہ قسم حرام ہے کیونکہ کسی مسلمان سے غصہ و کینہ رکھنا اور اس کو ناراض ہو کر چھوڑ دینا تین دن کے بعد حرام ہے۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہے: لا یحل لمسلم ان یھجر اخاہ فوق ثلاث فمن ھجر فوق ثلاث فمات دخل النار یعنی مسلمان کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ اپنے بھائی مسلمان کو تین دن سے زیادہ ناراض ہو کر چھوڑ دے۔ اگر تین دن سے زیادہ چھوڑے گا اور پھر اسی حالت میں مر جائے گا تو جہنم کی آگ میں داخل ہو گا۔

ایک حدیث میں یہ فرمایا: من ھجر اخاہ سنۃ فھو کسفک دمہ یعنی جس شخص نے اپنے بھائی کو سال بھر چھوڑے رکھا تو یہ ایسا ہے جیسا اس نے اس کا خون بہا دیا۔ یعنی اس کو قاتل کے برابر گناہ ہے۔ جب یہ حلف یہ بالطلاق ٹھہری تو اس کا ایفا حرام ہے۔ اس کو بکر سے صلح کر کے قسم توڑ کر حانث ہو جانا لازم ہے۔ حدیث میں ہے: من حلف علی یمین فرای خیرا منھا فلیکفر عن یمینہ ولیفعل (مشکوٰۃ) جو شخص کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھا لے اور پھر اس کے خلاف کوئی کام بہتر دیکھے تو وہ کر گزرے اور اپنی قسم کا کفارہ دے دے۔ بنابریں زید کو بکر سے صلح کرنا واجب ہے اور وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے۔ کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا ان کو کپڑے پہنا دے اور اگر ان چیزوں کی توفیق نہ ہو تو تین روزے رکھے۔ باقی یہ خیال نہ کرے کہ اس طرح کرنے سے میری عورت پر طلاق مغلظہ واقع ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ طلاق شرعی نہیں ہے بلکہ خلاف شرع ہے‘ جو واقع نہیں ہوتی بلکہ وہ شیطان کے قدموں کی پیروی ہے۔

ہاں حنفی مذہب میں طلاق واقع ہو جائے گی۔ اس سے بچنے کا حیلہ ہے کہ زید بکر سے عرفی صلح نہ کرے۔ صرف دل سے کینے کو نکال دے اور وہ سلام کہے تو اس کا جواب دے دیا

کرے۔ دیگر کوئی صورت نہیں لیکن عورت پر طلاق پڑ جائے تو گناہ نہیں بکر سے کینہ اور عداوت رکھنا گناہ ہے' بشرطیکہ وہ مسلمان ہو۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف الحصاری

الاعتصام لاہور جلد-۱۸' شمارہ-۲۷' مورخہ ۳-فروری سنہ-۱۹۶۷ء

مسئلہ طلاق

سوال : "الاعتصام" لاہور مطبوعہ ۶- ستمبر سنہ-۱۹۶۸ء کے باب الفتاویٰ میں ایک سوال ہے کہ "کسی شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق لکھ کر بذریعہ رجسٹری بھیج دی' وہ حاملہ تھی۔ کیا اب خاوند رجوع کر سکتا ہے؟"

اس کا جواب مفتی صاحب نے جو دیا ہے وہ درج ذیل ہے:

جواب : طلاق تو ہو جاتی ہے لیکن اگر تین طلاق لکھی ہوئی ہیں تو اس میں اختلاف ہے کہ تین ہوتی ہیں اور عورت حرام ہو جاتی ہے یا ایک۔ حنفیہ کے ہاں عورت حرام ہو جاتی ہے اور اہلحدیث کے نزدیک ایک طلاق ہوتی ہے' لہٰذا رجوع کر سکتا ہے۔ اگر حنفی ہے تو حنفیہ کے ہاں رجوع نہیں کر سکتا اور اگر اہلحدیث ہے تو اہلحدیث کے ہاں عورت حرام نہیں ہوتی' لہٰذا رجوع جائز ہے۔ اہلحدیث صحیح مسلم کی روایت پیش کرتے ہیں جس میں یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عہد اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں تین طلاق کو ایک ہی کہتے تھے۔

سوال : "الاعتصام" لاہور ۱۳- ستمبر سنہ-۱۹۶۸ء میں ایک سوال ہوا کہ "کسی عورت کو زناکاری کا حمل تھا۔ اس حالت میں اس کا نکاح ہوا' کیا یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟

اس کا جواب مندرجہ ذیل دیا گیا:

جواب : یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ بعض علماء اس نکاح کو جائز سمجھتے ہیں۔ یعنی حنفی' شافعی' مالکی اور بعض اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ناجائز کہنے والے مندرجہ ذیل دلیل پیش کرتے ہیں:

"ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا۔ اس کو معلوم ہوا کہ وہ حاملہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان دونوں میں تفریق کرا دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حمل کی حالت

میں نکاح نہیں ہوتا۔ اور یہ حمل زنا کا تھا۔ قرآن مجید کی آیت اولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن (الایہ) سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ اختلافی ہے۔ اس لیے مجلس نکاح پر کوئی کفارہ عائد نہیں ہوتا۔ وضع حمل کے بعد تجدید نکاح کی ضرورت ہے۔"

عارف الحصاری: یہ دونوں فتوے نفس مسئلہ کی رو سے صحیح ہیں لیکن یہ طریقہ خلاف شرع محمدی ہے کہ کسی مسئلہ میں اختلاف بنا کر سائل کو شک ڈالنا اور پھر ہر مذہب والے کو یہ بتانا کہ تمہارے مذہب میں یوں ہے' تم یوں کر لو اور فلاں مذہب والے کے لیے یہ مسئلہ ہے' وہ اس طرح عمل کر لے۔ یہ طریقہ شرعی نہیں ہے کیونکہ شریعت الٰہی صرف ایک ہے۔ جس کے حلال حرام وغیرہ کے احکام ایک ہیں اور حق مسلک بھی ایک ہے۔ اس کے ماسوا گمراہی ہے۔ شریعت میں حنفی' شافعی وغیرہ مذاہب موجود نہیں ہیں۔ یہ چہارم صدی میں شروع ہو کر بعد میں تیار ہوئے ہیں۔

فتویٰ یوں ہونا چاہیے تھا کہ ایک مجلس کی تین طلاق زبانی ہوں یا تحریری' ایک ہی شمار ہوتی ہیں۔ عدت کے اندر رجوع ہو سکتا ہے اور عدت گذرنے پر تجدید نکاح جائز ہے۔ چنانچہ حدیث مسلم میں یوں آیا ہے کہ:

> "عہد نبوی و عہد صدیقی و ابتدائی عہد فاروقی میں تین طلاق ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ یہ حکم شرعی تھا۔ جب لوگ پے درپے ایسی طلاقیں دینے لگے جو خلاف شرع تھیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس فعل کو روکنے کی غرض سے تین کو نافذ کر کے تعزیراً عورت کو طلاق دہندہ پر حرام کر دیا۔ پھر بعد میں پچھتائے کہ اس حلال کو حرام نہ کرنا چاہیے تھا۔"

پس اب ہر شخص اہلحدیث ہو یا حنفی اس حکم شرعی پر عامل ہو جاتا ہے۔ فقیہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تعزیری حکم کو شرعی حکم قرار دے کر تین کو نافذ کر کے عورت کو حرام بتا رہے ہیں' یہ سراسر باطل ہے۔ اس پر عمل کر کے حلال کو حرام نہ بنائیں ورنہ مجرم ہوں گے۔

اسی طرح دوسرے مسئلہ میں یوں کہنا چاہیے تھا کہ:

> "زانیہ حاملہ کا نکاح کرنا کرانا حرام ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں حاملہ کی عدت وضع حمل بتائی گئی ہے اور حدیث ابوداؤد کی اس آیت کے عموم کی تائید کرتی ہے۔ اس نکاح میں فوراً تفریق کرائی جائے اور جس مجلس میں نکاح ہوا ہے' اگر

ان کو علم تھا کہ یہ عورت حاملہ اور زانیہ ہے تو پھر نکاح اور اہل مجلس' نا کح اور منکوحہ سب کو تعزیر لگانی واجب ہے تاکہ اس عہد میں جس کا معاشرہ خراب ہے' لوگوں کو عبرت حاصل ہو- اور تعزیر سخت لگانی چاہیے- راقم الحروف اس گول مول مذہب کو پسند نہیں کرتا-

تحقیق مسائل میں میرا مسلک امام ابن حزم کی طرح ہے- جو ٹھیٹھ مذہب اہل حدیث رکھتے تھے- مقلد بالکل نہ تھے- مذاہب اور ائمہ کا اختلاف ذکر کر کے سب کی تردید کرتے ہیں- ایک صحیح اور حتمی بات معلوم کر کے اس کو ترجیح دینا ان کا مسلک ہے- یہ نہیں کہتے تھے کہ اگر اہلحدیث ہو تو یوں عمل کر لو اور اگر حنفی ہو تو اس طرح عمل کر لو-

اس طرح دو شریعتیں بن جاتی ہیں- حالانکہ شریعت ایک ہی ہے' جس کے خلاف گمراہی ہے- مفتی صاحب نے اپنے فتوے میں صاف طور سے لکھا ہے کہ تین طلاق کا ایک ہونا حکم شرعی ہے اور یہ صحیح ہے- اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ تین طلاق کو تین کہنا اور عورت کو حرام بنانا حکم غیر شرعی اور غلط ہے-

پھر یہ لکھنا کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اگر حنفی ہے تو اپنے مذہب پر عمل کر لے- بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ تین طلاق شرعاً ایک ہی ہے- تمام مسلمانوں کو اس حکم شرعی پر عمل کرنا چاہیے- اہلحدیث اور حنفی وغیرہ لوگوں کے لیے شرع محمدی یکساں ہے- لیکن مفتی صاحب دیگر فرقوں کے اختلاف کو وقعت دے کر سب کے لیے الگ الگ فتوے دے رہے ہیں-

مفتی صاحب حافظ قرآن ہیں' قرآن کریم میں آیت موجود ہے: ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ماجاء ھم البینات واولئک لھم عذاب عظیم○ یعنی اے خیر الامت تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جنہوں نے دلائل آجانے کے بعد اختلاف کیا- ان کے لیے عذاب عظیم مقرر ہو چکا ہے-" مسلک اہلحدیث صحیح اور حق ہے- اس مسلک کے دلائل کتاب و سنت سے ماخوذ ہوتے ہیں- جن میں کسی خاص شخص کی تقلید کو مقصود بالذات رکھ کر اخذ نہیں کیا جاتا- اور نہ کسی کی تقلید کی بناء پر کسی دلیل کو چھوڑا جاتا ہے- ہر چیز براہ راست کتاب و سنت کی روشنی میں حاصل کی جاتی ہے- اس لیے ہم لوگوں کا امتیازی نام اہلحدیث ہے- باقی فرقے ہمارے برعکس عمل و عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہر فرقہ اپنے امام غیر نبی اور غیر معصوم کی تقلید کرتا ہے اور اس کو واسطہ فی التفہیم قرار دے کر اس کی ماتحتی میں

کسی دلیل شرعی کو لیتا ہے۔ خواہ اس سے استدلال صحیح ہو یا غلط اور اس تقلید شخصی سے فرقہ بندی کرتے ہوئے اپنے مسلک کی ایسی ہیئت کذائیہ بنا لیتا ہے جس کا ثبوت اور وجود نہ تو کتاب و سنت میں ہے اور نہ تعامل قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر میں ہے۔

لہٰذا یہ فرقہ بندی حرام، گناہ اور موجب ضلالت ہے۔ اور اپنے نام حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی وغیرہ رکھنے بدعت ہیں۔ پھر ان کے اختلاف کو پیش نظر رکھ کر اپنانا مسلک اہلحدیث کے سراسر خلاف ہے اور مفتیان کے شان کے خلاف ہے۔ آگے مفتی صاحب کی مرضی ہے، وہ اگر اپنے اختیار سے تمام پاکستان کے مفتی بن جائیں اور ہر ایک کو ان کے مذہب کے مطابق فتوے دیا کریں مگر شرعاً یہ گناہ ہے۔

سائلین حکم شریعت کا دریافت کرتے ہیں! ان کو کتاب و سنت کے مطابق صحیح مسئلہ بتایا جائے، اختلافی کہہ کر اس میں شک اور تردد پیدا نہ کریں۔ جب ایک چیز آپ کے نزدیک حق ہے تو اس کے خلاف کو گمراہی سمجھیں اور حق کے ساتھ ملا کر لبس جدید کی صورت نہ بنائیں۔ ہاں تردید کی صورت میں یوں ذکر کر سکتے ہیں کہ:

> "حنفی یوں کہتے ہیں مگر ان کا یہ کہنا باطل ہے۔ ان کو چاہیے کہ تقلید کو قطع کر کے کتاب و سنت پر عمل کریں۔"

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور جلد ۲۱، شمارہ ۳۰، مورخہ ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۶۸ء

مسئلہ عدت

معلقہ عورت کو طلاق دی جائے تو اس کی عدت کیا ہے؟

معلقہ عورت کو اس کے خاوند نے کون سی طلاق دی ہے؟ طلاق خلع ہے یا دوسری قسم کی رجعی یا بائن؟ اگر طلاق خلع ہے تو اس پر کوئی عدت نہیں ہے۔

چنانچہ ابن ماجہ ص ۱۴۹ میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ وہ ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا[1] سے ان کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے اپنے خاوند سے خلع کیا اور پھر حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ خلیفۃ المسلمین کی عدالت میں حاضر ہوئی اور اپنی عدت کا فیصلہ طلب کیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فیصلہ دیا کہ لا عدۃ علیک الا ان یکون حدیث عھدک فتمکثین عندہ حتی تحیضین حیضۃ قالت انما تبع فی ذالک قضا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی مریم الغالیۃ وکانت تحت ثابت بن قیس فاختلعت منہ۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو عورت اپنے خاوند سے جدا ہو کر اپنے میکے یا کسی دوسری جگہ بیٹھی ہو اور پھر اس سے خلع ہو جائے تو اس پر عدت نہیں ہے۔ اگر خاوند کے پاس ہو تو پھر عدت ایک حیض ہے کیونکہ طلاق خلع دراصل فسخ نکاح بالعوض کا نام ہے۔ جس کا حکم دوسری طلاقوں سے جدا ہے۔

اور اگر معلقہ کو دوسری قسم کی طلاق دی گئی ہے تو اس میں وہی عدت ہو گی جو قرآن نے مطلقہ عورت کی بیان کی ہے بشرطیکہ خاوند سے نکاح کے بعد ملاپ اور خلوت صحیحہ ہو چکی ہے۔

طلاق رجعی میں عدت کے اندر خاوند رجوع کر سکتا ہے۔ طلاق خلع میں رجوع نہیں ہو سکتا۔ یہ فسخ نکاح ہے' اس لیے اس میں عدت نہیں ہے۔

جو علماء طلاق خلع میں عدت کہتے ہیں' وہ اس کو دیگر طلاقوں کے حکم میں ٹھہراتے ہیں۔ یہ غلط ہے' چنانچہ سبل السلام' نیل الاوطار اور عون المعبود وغیرہ شروح کتب احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ (فقط)

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور مورخہ ۴-جولائی سنہ ۱۹۶۹ء

بیوی کی نافرمانی پر طلاق دی جائے تو مہر کا کیا حکم ہے؟

ایسا ہی ایک فتویٰ مفتی صاحب بڈھیمالوی نے حلقہ اوکاڑہ میں دیا کہ کسی نے یہ سوال کیا کہ "ایک عورت جو بہت عرصہ تک خاوند کے گھر آباد رہی' اس کو اس کے بھائی آ کر لے گئے تاکہ اپنی بہن کی وراثت اپنے قبضہ میں کر کے اپنے نام انتقال کرا لیں۔ جب اس کو خاوند لینے گیا تو بھائیوں نے اسے بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اور اس کی بیوی نے بھی جانے سے انکار کر دیا اور بھائیوں کا ساتھ دیا۔ خاوند ناراض ہو کر اپنے گھر واپس آ گیا اور اس نے اپنی بیوی کو

طلاق لکھ کر بھیج دی۔ اس کی بیوی نے مہر کا مطالبہ کیا تو خاوند نے کہا کہ تو میری عاق اور نافرمان ہو کر گئی، اس لیے میں تجھے مہر نہیں دیتا اور تو مہر کی حقدار نہیں ہے۔ اگر مہر لینا ہے تو میرے گھر چلی آ، اور آباد ہو جا۔"

اس پر فریقین کا نزاع ہوا تو اس مسئلہ کا استفتاء مولانا عبداللہ صاحب (بڈھیمالوی) شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ لائل پور (فیصل آباد) کو بھیجا گیا۔ مولانا عبداللہ صاحب نے یہ فتویٰ دیا کہ:

"وہ عورت جو خاوند کی نافرمان ہو گئی اور نشوز کر کے اپنے بھائیوں کے پاس بیٹھ گئی ہے، مہر کی مستحق نہیں ہے۔ قرآن و حدیث اس پر ناطق ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے۔"

سائلوں کو اس فتویٰ سے تسلی نہ ہوئی تو انہوں نے یہ سوال اور مولانا موصوف کا فتویٰ میرے پاس بھیج دیا۔ میں نے مولانا موصوف کے فتویٰ پر تعاقب کیا اور یہ لکھا کہ:

"جب عورت سے خلوت صحیحہ ہو جائے تو مہر دینا واجب ہو جاتا ہے۔ وہ عورت تو بہت عرصہ تک آباد رہی ہے اور خاوند نے بغیر صورت خلع کے خود بخود اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے تو مہر دینا اس پر واجب ہے۔ بیوی کے حقوق اور نشوز سے نان و نفقہ تو ساقط ہو جاتا ہے، مہر ساقط نہیں ہوتا۔"

میں نے اس پر دلائل لکھ کر یہ لکھا تھا کہ: "مہر ساقط ہونے پر نہ کوئی قرآن و حدیث میں دلیل ہے اور نہ ہی اس پر علمائے اسلام کا اجماع ہے۔"

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور مورخہ ۱۱۔ اکتوبر سنہ۔۱۹۶۸ء

کیا مظلومہ بیوی بحالت مجبوری طلاق لے کر دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے؟

سوال: عرض ہے کہ میرا نکاح ہوئے کوئی عرصہ ڈیڑھ سال کے قریب ہو گیا ہے۔ میں تقریباً ایک ماہ اپنے خاوند کے گھر رہ آئی ہوں۔ میرا خاوند مجھے پسند نہیں کرتا۔ میری اور اس کی سخت مخالفت ہو گئی۔ اب مجھے اس نے صاف جواب دے دیا ہے کہ میں تجھے اپنے گھر بسانا

نہیں چاہتا اور میرے خاوند نے دوسری شادی کرا لی ہے اور مجھے خرچ خانگی بھی دینے سے انکاری ہے اور میں لاوارث عورت ہوں اور جواں عمر ہوں۔ میرا گذارہ نہیں ہوتا اور میرا خاوند مجھے طلاق دینے سے بھی انکاری ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں شادی اور کسی مسلمان آدمی سے کر لوں تاکہ میری گذران ہو سکے۔ عرض ہے کہ ثبوت قرآن و حدیث کا اگر مل جائے تو بہتر ہے تاکہ میرا غم' پریشانی رفع ہو سکے۔ جس شخص کے ساتھ میری شادی ہوئی ہے' وہ بے نماز اور غیر شرع ہے۔ شراب بھی اور بھنگ بھی پیتا ہے اور مجھے بھی اس کے ساتھ کھانے پینے سے سخت نفرت ہے۔ مہربانی کر کے جلد از جلد اجازت نکاح کرنے کی فرمائی جائے تاکہ میں اس غم سے آزاد ہو جاؤں' والسلام

سائلہ شہیداں بی بی دختر السید الدین (نشان انگوٹھا)

جواب : بشرط صدق سوال' جواب اس کا یہ ہے کہ اگر گواہان سے یہ ثابت ہو جائے کہ مسماۃ شہیداں کے خاوند نے یہ الفاظ کہے ہیں کہ میں تجھے اپنے گھر نہیں بسانا چاہتا اور نہ خرچ دیتا ہوں تو طلاق واقع ہو گئی ہے۔ اب اس کو دوسری جگہ نکاح کر لینا درست ہے۔ اور اگر یہ الفاظ ثابت نہ ہوں تو اگر وہ نہ طلاق دے اور نہ آباد کرے تو پھر عدالت سرکار میں شہیداں کو درخواست دے کر اپنا نکاح فسخ کرا لینا چاہیے۔ حکومت کا یہ قانون ہے کہ جو شخص نہ طلاق دے' نہ بسائے تو اس کا نکاح فسخ کر کے اس کو دوسری جگہ نکاح کی اجازت دے دیتی ہے۔ شہیدان کو بھی بیان عدالت میں دے کر اپنا نکاح فسخ کرا لینا چاہیے۔ معلقہ و متضررہ کا نکاح بلا طلاق حکم حاکم سے فسخ ہو جاتا ہے۔ صرف فتویٰ کام نہ دے گا۔ اگر فتویٰ پر شہیدان نے دوسری جگہ نکاح کر لیا تو اس کا خاوند ظالم قانونی کارروائی کر کے کہ اس نے نکاح پر نکاح کر لیا ہے شہیداں کو دوسری مصیبت میں ڈال دے گا اور حکومت فتویٰ نہ ماننے گی اور کہے گی کہ نکاح عدالت میں فسخ کرانا تھا' اس لیے عدالتی اور قانونی کارروائی ضروری ہے کہ ہم مجبور ہیں۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص-۱۸۶

زبانی طلاق

نواب ولد نہال صاحب ڈھپانوالی نے حضرت مولانا الحاج عبدالقادر حصاری صاحب سے مندرجہ ذیل سوال کیا ہے:

بکر کے لڑکے نے اپنی بیوی کو چار آدمیوں کے سامنے زبانی طلاق دی ہے۔ تحریر لکھ کر نہیں دیتا اور نہ ہی بساتا ہے۔ بیوی کو والدین کے گھر بیٹھے سال گذر گیا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ از روئے شریعت محمدیہ مسماۃ مذکور کا نکاح زبانی طلاق دینے سے فسخ ہو چکا ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث سے مدلل بیان فرمایا جائے۔

مولانا صاحب موصوف نے اس استفسار کا جو جواب دیا ہے' وہ درج ذیل ہے۔

الجواب بعون الوهاب۔ صورت مسئولہ کا جواب بشرط صحت و صدق یہ ہے کہ جس لڑکے نے گواہوں کے سامنے عقل و فکر صحیح رکھتے ہوئے بغیر کسی جبر و اکراہ زبانی طلاق دے دی ہے' یہ طلاق واقع ہو گئی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے: كل طلاق جائز الا طلاق المعتوه المغلوب على عقله۔ (مشکوۃ ص۔۲۸۴) یعنی ہر طلاق واقع ہو جاتی ہے مگر بے عقل پاگل اور مغلوب العقل کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

زبان سے طلاق دینے سے طلاق واقع ہو جانے پر تمام امت اسلامیہ کا اجماع ہے۔ طلاق لکھ دینا کوئی شرط نہیں ہے۔ طلاق نامہ یعنی طلاق لکھ کر دینا صرف قانونی' پنچائتی' عدالتی بندوبست ہے کہ اگر انکار کرے تو اس کا اقرار اور طلاق نامہ پیش کیا جائے۔

جب گواہ موجود ہیں تو طلاق ثابت ہے اور عدت اس کی گذرنے پر گذر چکی ہے اور نکاح اس کا دوسری جگہ جائز ہے۔ اگر پہلے خاوند سے صلح کرے تو اس سے نکاح جدید کیا جائے۔ سابقہ نکاح طلاق سے ختم ہو چکا ہے۔

لڑکی کے وارثوں کو عدالت سرکار میں گواہان پیش کر کے طلاق ثابت کر دینی چاہیے۔ حاکم عدالت طلاق ثابت ہونے پر اجازت نکاح ثانی کی دے دے گا۔ بشرطیکہ وہ قانونی اور شرعی فیصلہ نافذ کرے۔ کوئی شخص اگر تحریری طلاق دے دے اور زبان سے نہ کہے تو اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ مذکورہ صورت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے اور بعض علماء کہتے ہیں کہ جب تک زبان سے طلاق نہ دے' صرف انگوٹھا لگانے سے طلاق واقع نہیں

ہوتی۔ لیکن زبان سے طلاق دینے پر سب علمائے اسلام کے نزدیک طلاق واقع ہو جاتی ہے۔
ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔
از عبدالقادر عارف حصاری
صحیفہ اہلحدیث جلد۔۴۰، شمارہ۔۲۰ مورخہ ۱۶۔ شوال سنہ ۷۹ھ

ایک طہر کی متفرق طلاقیں

حضرات! طلاق ثلاثہ کا یہ مسئلہ تو آپ اسلامی اخبارات و رسائل خصوصاً اخبار اہلحدیث سوہدرہ کی گذشتہ اشاعتوں میں پڑھ چکے ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک کلمہ یا دو تین کلموں سے دینا بروئے احادیث صحیحہ صریحہ ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ عام طور پر نہیں سنا گیا کہ اگر ایک طہر کی مجالس متفرقہ میں طلاق دی جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ کچھ عرصہ ہوا مولانا عبداللہ صاحب اوڈ نے منٹگمری (ساہیوال) کی ایک درس گاہ کے شیخ الحدیث کی خدمت میں حاضر ہو کر پیش کیا کہ ایک شخص نے ایک ہی طہر کی مجالس متعددہ میں ایک، پھر دوسری طلاق دے دی ہے اور درمیان میں رجوع کر لیا ہے۔ اسی طرح تیسری بھی دے کر پھر رجوع کر سکتا ہے یا نہیں؟ مولانا مذہب اہلحدیث کے (منٹگمری، ساہیوال میں) مشہور عالم ہیں۔ انہوں نے زبانی یہ فتویٰ دے دیا کہ اگر ایک طہر کی مجالس متفرقہ میں طلاق متفرقہ دی گئی ہیں تو سب واقع ہو جائیں گی اور تیسری کے بعد عورت قطعاً حرام ہو جائے گی۔ ہاں اگر ایک مجلس میں دو یا تین کہی ہیں تو پھر ایک ہی طلاق رجعی شمار ہو گی۔

مولانا عبداللہ سائل نے راقم الحروف سے یہ مسئلہ بیان فرما کر استفسار کیا تو بندہ نے کہا کہ یہ فتویٰ غلط ہے۔ ایک طہر میں ایک ہی مجلس کی تین یا دو طلاق ہوں یا مجالس متفرقہ کی دو یا تین ہوں، وہ ایک ہی طلاق رجعی کے حکم میں ہیں۔ کیونکہ ایک طہر صرف ایک ہی طلاق کا محل ہے، دو یا تین کا نہیں ہے۔ پھر مولوی عبداللہ صاحب اس خادم کو ساتھ لے کر شیخ الحدیث موصوف الصدر کے پاس گئے تاکہ وہاں اس مسئلہ پر باہم مذاکرہ علمیہ کر کے متفقہ طور پر فیصلہ کریں کہ اصل حکم کیا ہے؟ یہ راقم درس گاہ میں جناب شیخ الحدیث کے پاس پہنچا تو وہاں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی اور ان سے اس پر دلیل شرعی کا مطالبہ کیا گیا۔ تب انہوں نے وہی آیت پیش کی جو عموماً حنفی علماء پیش کیا کرتے ہیں کہ الطلاق مرتان یعنی طلاق دو بار

ہے، جس میں رجعت کا حق ہے۔ پھر تیسری کے بعد کوئی رجوع نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ "مرة" سے کیا مراد ہے؟ اگر ایک کلمہ طلاق کے بعد دوسرا کلمہ طلاق بولنا مراد ہے، تب آپ کا یہ مسلک کہ ایک مجلس کی تین طلاق متفرق کلموں سے ایک طلاق رجعی ہے، غلط ہو جائے گا۔ حالانکہ دیگر علماء اہلحدیث کی طرح آپ اس کے قائل ہیں اور اگر اس مرة سے مراد دوسرا وقت طہر کا ہے تو پھر آپ کا موجودہ دعویٰ ثابت نہ ہو گا اور اگر اس سے مجلس بعد مجلس مراد ہے تو اس کا ثبوت مطلوب ہے۔

جناب شیخ الحدیث نے فرمایا کہ ایک مجلس کے بارہ میں تو حدیث میں صراحت آچکی ہے۔ اس لیے وہ صورت تو علیحدہ ہے، جب مجلس علیحدہ ہو گئی تو پھر لغوی لحاظ سے مرة کا معنیٰ پایا گیا۔ میں نے کہا کہ ایک طہر شرعاً ایک طلاق کا محل ہے، یا دو کا یا تین کا؟ تو فرمایا طہر شرعاً ایک ہی طلاق کا محل ہے لیکن جب خلاف شرع دو یا تین متفرق طلاق کہہ دے گا تو وہ واقع ہو جائیں گی۔ جیسے حالت حیض میں طلاق واقع ہو جاتی ہے حالانکہ وہ محل طلاق نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حیض کی طلاق پر آپ اس کو قیاس نہ کریں کیونکہ ایک تو وہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، دوم بندہ تو علامہ ابن حزم اور امام ابن القیم کا ہم خیال ہے۔ آپ اس مسئلہ میں ایک مجلس کی تین طلاق پر غور فرمائیں جو آپ کے اور ہمارے درمیان متفقہ مسلک ہے اور یہ اس کی نظیر بن سکتا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کو اس لیے تین شمار نہ کیا گیا کہ ایک طہر محل ایک طلاق کا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا ہے کہ قوله تعالٰی فطلقوهن لعدتهن قال فی الطهر من غیر جماع یعنی اللہ تعالٰی نے جو یہ فرمایا ہے کہ عورتوں کو ان کی عدت پر طلاق دو، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے طہر میں طلاق دو جس میں جماع نہ کیا گیا ہو اور یہ بھی فرمایا ہے کہ طلاق السنة ان یطلقها فی کل طهر تطلیقة فاذا کان اخر ذلک فتلک العدة التی امر اللہ بها (اسنادہ صحیح) یعنی شرعی طلاق یہ ہے کہ عورت کو ہر ایک طہر میں ایک طلاق دی جائے۔ جب آخری طلاق اس طرح ہو جائے گی تو اس عدت کا مقتضا بھی پورا ہو جائے گا، جس کا اللہ تعالٰی نے حکم دیا ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ اس لحاظ سے ایک طہر محل ایک ہی طلاق کا ہے لیکن اگر کسی نے شرع کا خلاف کیا اور ایک طہر میں دو یا تین طلاق دے دیں تو وہ وارد ہو جائیں گی۔ میں نے

عرض کیا کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ تو انہوں نے بار بار آیت الطلاق مرتان کی گردان شروع کر دی- میں نے کہا کہ مرتان کے درمیان تفریق ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ تفریق ہے- میں نے کہا کہ تفریق شرعی طہر بعد طہر ہے یا مجلس بعد مجلس؟ اگر طہر کی تفریق مراد ہے تو ہمارا مسلک صحیح ہے اور اگر مجلس بعد مجلس مراد ہے تو پھر ایک طہر کی کئی مجلسوں میں کئی طلاق مشروع ہو جائیں گی' ولم یقل بہ احد- اور یہ مسلک اہلحدیث کے خلاف ہے- اس پر مولانا کچھ جھنجلا گئے اور ناراض ہو کر کچھ تیز ہو گئے اور فرمایا کہ ہم علماء اہلحدیث کے مقلد نہیں ہیں- اگر وہ غلطی کریں گے اور آیت الطلاق مرتان کا علمی لحاظ سے خلاف لغت معنی کریں گے تو کیا میں بھی غلط کہہ دوں؟ میں نے عرض کیا کہ آپ ناراضگی نہ فرمائیں' اطمینان سے بات کریں- علماء اہلحدیث شرعی اصطلاحات اور لغت کو خوب جانتے ہیں- آپ اپنا بیان لکھ دیں اور یہ بندہ اپنا مسلک لکھ دیتا ہے اور پھر کسی محدث عالم و محقق فاضل کے پاس بھیج دیتے ہیں' وہ جو مسلک صحیح بتا کر محاکمہ فرمائیں گے' وہ قابل تسلیم ہو گا-

اس پر شیخ الحدیث نے فرمایا کہ مجھے تو فراغت نہیں ہے- مولانا عبداللہ صاحب امیر جماعت اوڈ نے فرمایا کہ میں آپ دونوں صاحبان کی بحث کا خلاصہ لکھ کر کسی جید عالم سے محاکمہ کراؤں گا- اس پر یہ مجلس برخواست ہو گئی- پھر بندہ آج تک انتظار کرتا رہا کہ مولانا عبداللہ صاحب کسی عالم مسلمہ سے اس نزاع کا محاکمہ کرا کر مسئلہ ظاہر کریں گے- مگر معلوم ہوا کہ وہ اپنی قوم کی آباد کاری کے سلسلہ میں الجھ گئے ہیں' فیصلہ نہیں کرا سکے- اس لیے راقم الحروف یہ نزاع علماء محققین اہلحدیث کی خدمت میں پیش کر رہا ہے اور ان سے یہ استدعا کرتا ہے کہ کتاب اور سنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی تحقیق فرما کر اس اختلاف کو رفع فرمائیں تاکہ علماء اہلحدیث کا مسلک متفق رہے' متضاد نہ ہونے پائے-

اس مسلک پر کہ ایک طہر کی دو یا تین طلاق خواہ مجلس واحدہ میں ہوں یا متفرقہ' ایک طلاق رجعی کا حکم رکھتی ہیں- بندہ کے دلائل حسب ذیل ہیں جن کو پیش کر کے اہل علم سے استصواب رائے کرتا ہوں اور اس سے پہلے جن علمائے کرام نے اس پر کچھ رائے دی ہے' ان کے بیانات اس مضمون کے خاتمہ پر نقل کر رہا ہوں تاکہ اس کی روشنی میں آپ بھی کوئی فیصلہ کر سکیں-

(ا) طلاق بلحاظ حکم شرعی تین قسم ہے- ایک سنی' دوم بدعی' سوم مباح- سنی تین طرح سے

ہے۔ ایک اس صورت سے کہ ایک طہر جس میں جماع نہ کیا ہو' ایک طلاق دے دے پھر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے کہ تین حیض اس کی عدت گذر جائے یا رجوع کر لے اور حسن سلوک سے رہنے لگے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ نے مغنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ان علیا قال لو ان الناس اخذوا بما امر اللّٰہ من الطلاق ما یتبع رجل نفسہ امراۃ ابدا یطلقھا تطلیقۃ ثم یدعھا ما بینھا وبین ان تحیض ثلاثا فمن فمتی شاء راجعھا (رواہ البخاری باسنادہ) یعنی اگر لوگ طلاق دینے کا وہ طریق اختیار کریں جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو کوئی مرد اپنے نفس کو عورت کے پیچھے کبھی نہ لگائے اور وہ طریق یہ ہے کہ ایک طلاق (ایک طہر میں) دے کر پھر اس کو تین حیض کی میعاد تک چھوڑ دے۔ پس جب چاہے اس سے رجوع کر لے (عدت میں بغیر نکاح کے یا عدت کے بعد نکاح جدید سے) دوسری صورت یہ ہے کہ ہر ایک طہر میں ایک طلاق دے اور اگر رجوع نہ ہو سکے تو تین طہروں میں تین پوری کر دے۔

نسائی شریف باب طلاق السنۃ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ طلاق السنہ تطلیقۃ وھی طاھر فی غیر جماع فاذا حاضت وطھرت طلقھا اخری فاذا حاضت وطھرت طلقھا اخری ثم تعتد بعد ذالک بحیضۃ یعنی مشروع طلاق یہ ہے کہ جس طہر میں جماع نہ کیا ہو' اس میں ایک طلاق دے' پھر جب حیض ہو کر طہر آئے تو دوسری طلاق دے دے (بشرطیکہ صلح یا رجوع نہ ہو سکے) پھر حائضہ ہو کر طاہرہ ہو تو تیسری طلاق دے دے اور اب وہ ایک حیض عدت گذارے (پھر قطعاً حرام ہو گئی' اب رجوع کا اس کو کوئی حق نہیں ہے) اس طلاق کو طلاق بائنہ مغلظہ کہتے ہیں۔ مغلظہ کی یہ ایک ہی صورت ہے' دیگر کوئی نہیں ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ بحالت حمل عورت کو ایک طلاق دے دے' یہ بھی مشروع ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے جب حیض میں طلاق دی (جو حرام تھی) تو پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ بتلایا کہ ثم لیطلقھا طاھرا او حاملا (ترمذی) یعنی عورت کو طلاق بحالت طہر میں دے یا حالت حمل میں دے۔

پس یہ تین صورتیں طلاق شرعی مامور بہا کی ہیں۔ اب جو شخص حالت حیض یا حالت نفاس یا ایک طہر میں دو یا تین طلاق یا ایسے طہر میں کہ جماع کیا ہو' طلاق دے تو وہ طلاق

بدعی ہو گی جو ناجائز ہے۔ جس کے متعلق شارع کا اصولی حکم یہ ہے کہ من عمل عملا لیس علیہ امرنا فھو رد یعنی جس شخص نے ایسا عمل کیا جس پر ہمارا حکم نہیں ہے' وہ مردود ہے۔ چونکہ بدعی طلاقوں سے متعلق شارع کا کوئی حکم وارد نہیں ہے۔ لہٰذا یہ مردود ہیں۔ مباح طلاق صغیرہ عورت' اور غیر مدخولہ اور آئسیہ کی ہے۔ ابن کثیر میں ہے: وطلاق ثالث لا سنة فیه ولا بدعة وھو لاق الصغیرة والایسة وغیر المدخول بھا۔

(۲) ایک طہر ایک طلاق کا محل ہے۔ دوسری اور تیسری طلاق اس میں نہیں سما سکتی ہیں۔ تین طلاق کے لیے شارع علیہ السلام نے تین طہر رکھے ہیں۔ اگر ایک طہر میں دو یا تین سما سکتیں تو ان کے لیے تین وقت نہ رکھے جاتے۔ چنانچہ مولانا محمد سلیمان صاحب کیلانی "بلوغ المرام مترجم" کے حاشیہ پر فرماتے ہیں کہ عقلی لحاظ سے بھی یہی صحیح معلوم ہوتا ہے' تین طلاقوں کے لیے آنحضرت ﷺ نے تین ماہ کی مدت رکھی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک آدمی صبح سویرے اٹھ کر پانچوں نمازیں ادا کر لے تو اس صورت میں یقیناً نماز ایک ہی ہو گی جس کا وقت ہے' باقی لغو ہوں گی۔ اسی طرح ایک طلاق تو واقع ہو جائے گی' باقی لغو ہوں گی۔ (حاشیہ صفحہ-۲۱۳)

(۳) ابو رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی ام رکانہ رضی اللہ عنہا کو تین طلاق دے دیں تھیں' جن کو آنحضور ﷺ نے سن کر فرمایا تھا کہ فانھا واحدة کہ یہ تین حقیقت میں ایک ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ ایک طہر ایک طلاق ہی کا مورود مقام ہے' تین کا نہیں ہے۔ پس دو یا تین لغو ہوں گی۔ لان المحل لا یقبل غیرھا (نیل)

(۴) ابو رکانہ رضی اللہ عنہ نے جب تین طلاقیں دیں تو آپ نے اس کو رجوع کرنے کا حکم نافذ فرمایا۔ اس نے تسلی حاصل کرنے کے لیے دو بار یہ کہہ دیا کہ انی طلقتھا ثلاثا یارسول اللّٰہ یعنی میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں ہیں' یارسول اللہ۔ اس پر آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ قد علمت راجعھا وتلایا ایھا النبی اذا طلقتموا النساء فطلقوھن لعدتھن یعنی مجھے معلوم ہے تو اس کی طرف رجوع کر لے اور آپ نے اپنے حکم کی تصدیق کے لیے آیت قرآن پڑھ دی' جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت میں دیا کرو یعنی ایک طہر میں ایک ہی طلاق دیا کرو تاکہ عدت کا فائدہ ظاہر ہو کہ اگر رجوع کا ارادہ ہو جائے تو رجوع کر سکو۔ اگر ایک طہر میں تین نافذ کر دی جائیں تو اس آیت میں جس

فائدہ کے پیش نظر طلاق کا حکم دیا گیا ہے' وہ بیکار ہو جاتا ہے۔ پس یہ آیت جس طرح ایک مجلس کی تین طلاق کو خلاف مقصد اللہ اور رسول ظاہر کر رہی ہے۔ اسی طرح ایک طہر کی دو تین متفرق طلاق کو بھی خلاف منشا اللہ اور رسول بتلا رہی ہے۔ کما لا یخفی علی اهل العلم۔

یہ آیت پڑھ کر آنحضور ﷺ نے یہ ظاہر کر دیا کہ ایک ہی بار تین طلاق دینا خلاف حکم الٰہی ہے۔ پس اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ ایک طہر میں دو تین طلاق دینا خواہ مجالس متفرقہ ہوں' خلاف حکم الٰہی ہے۔ اور خلاف حکم الٰہی ایک مجلس کی طلاق متفرقہ شمار کس طرح ہوں گی؟ جبکہ خلاف ہونا دونوں صورتوں میں پایا جاتا ہے' فتذکر!

(۵) ایک مجلس میں یا ایک طہر میں ایک بار یا متفرق تین طلاق دینا حدود اللہ سے تجاوز کرنا ہے اور یہ ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ومن یتعد حدود اللّٰہ فقد ظلم نفسه۔ ظالم کا ظلم شرعاً جاری نہیں ہو گا کیونکہ اس سے حکم شرعی کا ارتفاع لازم آتا ہے اور ظلم کا نافذ کرنا لازم آتا ہے بلکہ ظلم کا ارتفاع کیا جائے گا کہ تین کو ایک کر دیا جائے گا۔ تین نافذ کرنے سے خود اس کا حق رجعت اور عورت کا نان نفقہ و سکونتی حقوق فوت ہو جاتے ہیں' جو مرد عورت دونوں پر ظلم ہے۔ حدیث میں ہے: انصر اخاک ظالما او مظلوما کہ ظالم اور مظلوم دونوں کی مدد کرو۔ لیکن یہ دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعہ پر عائد نہ ہو گی۔ کیونکہ وہ ظلم کے انسداد کا ایک دوسرا طریقہ تعزیری تھا۔ نیز اس پر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ندامت ظاہر فرمائی تھی۔ ملاحظہ ہو اعلام الموقعین لابن القیم۔

(۶) ایک طہر میں ایک طلاق حلال ہے۔ جس سے رجوع کرنا حلال رہتا ہے اور تین طلاق دینا ایک طہر میں ناجائز ہے۔ پس یہ حرام حلال کو حرام نہیں کرے گا۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے لا یحرم الحرام الحلال کہ کوئی حرام فعل حلال کو حرام نہیں کرتا۔ پس رجعت حلال رہے گی اور اس کا تین کہنا لغو قرار دیا جائے گا۔ صرف ایک طلاق شمار ہو گی۔ اگر خلاف شرع فعل حرام کو نافذ کریں گے تو اس سے حلال کا حرام ہونا لازم آئے گا۔

(۷) الطلاق مرتان میں لفظ مرةً بعد مرةً علی التفریق مراد ہے۔ اور تفریق سے تفریق شرعی مراد ہو گی۔ وہ ایک ہی طہر ہے۔ اگر تفریق شرعی طہر مراد نہ ہو بلکہ مجلس بعد مجلس مراد ہو تو اس سے ایک طہر میں کئی طلاقیں مجلس متفرق میں دینا حکم شرعی بن جائے گا اور اس کا

کوئی اہل حدیث بھی قائل نہیں ہے' فیتفکر!

تفاسیر میں بھی الطلاق مرتان سے تطلیقة بعد تطلیقة علی التفریق الشرعی مراد لینا لکھا ہے۔ احکام القرآن للجصاص جلد اول ص-۴۴۹ میں ہے کہ طلاق مشروع کے دو وصف ہیں۔ ایک عدد طلاق' دوم وقت طلاق۔ عدد طلاق یہ ہے کہ ایک طہر میں صرف ایک طلاق ہو اور وقت طلاق یہ ہے کہ جب عورت حیض سے پاک ہو تو بغیر صحبت کئے اس کو طلاق دی جائے یا وہ حاملہ ہو تو حالت حمل میں کسی وقت ایک طلاق دی جائے پھر ایک طہر میں علیحدہ علیحدہ طلاق دینے کے متعلق تشریح کی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ مولانا عبدالحمید صاحب مدرس مدرسہ محمدیہ گوجرانوالہ کے مضمون مندرجہ اہلحدیث جلد-۹' نمبر-۴۸ کے ص-۲ سے وہ حصہ نقل کر دوں جو انہوں نے احکام القرآن سے اخذ کیا ہے اور میرے مضمون سے تعلق رکھتا ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مولانا موصوف اس مسلک میں راقم کے ساتھ متفق ہیں' فللّٰہ الحمد۔ مولانا رقمطراز ہیں کہ:

"رہا یہ سوال کہ اگر کوئی تین طلاق ایک طہر میں علیحدہ علیحدہ صورتوں میں دے دے تو تین ہی واقع ہوں گی یا ایک؟ اور آیا یہ بھی جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح کا ایک سوال علامہ جصاص احکام القرآن جلد اول ص-۴۵۴ میں نقل کر کے اس طرح جواب دیتے ہیں: "قیل له هذا غلط من قبل ان ذالک اعتبار یئودی الی اسقاط حکم اللفظ ورفعه راساً وازالته حکمه یعنی سائل کے لیے کہا جائے گا کہ ایک طہر میں بھی انفرادی صورت میں تین طلاق دینی ناجائز ہیں۔ کیونکہ ان کے جائز کرنے سے الطلاق مرتان کا حکم بالکل اٹھ جاتا ہے۔ اس لیے کہ جب ایک طہر میں تین طلاقیں متفرقہ دینی درست ہو جائیں تو اس سے لازم آتا ہے کہ ایک کلمہ میں بھی دینے سے کوئی قباحت نہیں ہے۔ لازم باطل ہے اور ملزوم بھی۔ اسی طرح باطل ہو گا۔ کیونکہ ایک طہر میں انفرادی صورت میں طلاقیں دینی اور ایک ہی دفعہ ایک کلمہ سے دینی دونوں کا انجام ایک ہی ہے۔ منشاء الٰہی ہر دو طریقوں میں پورا نہیں ہو سکتا۔ اور جب حکم الٰہی ایک طہر میں متفرق طلاقیں دینے سے پورا نہ ہو سکا تو یہ متفرق طلاقیں بھی ایک رجعی طلاق کی حیثیت رکھیں گی۔ جساس حنفی کے اقتباسات منقولہ بالاحکام القرآن سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:

(۱) ایک کلمہ میں دو یا تین طلاقیں دینے سے ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔

(۲) طلاق کا وقت طہر ہے۔

(۳) ایک طہر میں صرف ایک ہی طلاق واقع ہو گی۔

یہی طلاق دینے کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا قانون ہے اور اس کے علاوہ کہیں بھی قرآن سے طلاق مغلظہ کے واقع ہونے کا ثبوت نہیں ملتا اور حدیث نے بھی قرآن کے مفہوم کی پوری پوری تائید کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ عورتوں کو عدت کے اندر طلاق دی جائے' جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے' انتہی کلامہ بلفاظہ۔ مولانا دام فیضہ کے اس مضمون سے میرے مسلک کی پوری تائید ہو گئی۔

(۸) حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں امام ابن ابی حاتم سے بإسنادہ یہ حدیث نقل کی ہے:

عن انس قال طلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حفصة فاتت اھلھا فانزل اللہ تعالیٰ یاایھا النبی اذا طلقتم النسا فطلقوھن لعدتھن فقیل لہ راجعھا فانھا صوامة قوامة وھی من ازواجک ونسأک فی الجنة وقد ورد من غیر وجہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلق حفصة ثم راجعھا یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ آنحضور ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی تھی' جس کے باعث وہ اپنے میکے چلی گئی تھیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اے نبی! تم جب عورتوں کو طلاق دو تو عدت کے وقت طلاق دو' اب اپنی بیوی مطلقہ کی طلاق سے رجوع کر لیجئے کیونکہ وہ کثرت سے روزے رکھنے والی اور بہت تہجد گذار صالحہ ہے' اور وہ ہمارے تقدیری فیصلہ میں آپ کی جنت والی ازواج مطہرہ میں شمار ہو چکی ہے۔ تب آنحضور ﷺ نے حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف رجوع فرما لیا۔

حدیث میں طلاق نبوی کی کوئی کیفیت مذکور نہیں ہے۔ تو اب دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ طلاق کے متعلق کوئی دستور عرش الٰہی سے نازل نہ ہوا تھا اور آنحضرت ﷺ نے عام عادت کے مطابق طلاق دے دی ہو گی۔ اس پر ہدایت الٰہی نازل ہوئی کہ طلاق طہر میں اس طرح دیا کرو' عوام کی عادت غلط ہے۔ آپ شرعی دستور قائم کریں اور اس غلط دستور عامیانہ کو دور کر دیں اور اپنی بیوی کی طرف رجوع کر لیں۔ تو آپ نے اس کو طلاق دے کر زوجیت سے خارج کر دیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک وہ دنیا اور آخرت ہر دو جہان میں آپ کی دائمی زوجہ ہے۔

اس لیے رجوع کرنا ضروری ہے- دوم یہ کہ آپ نے ایک طلاق ایک ہی طہر میں دی تھی لیکن رجوع کرنے کا ارادہ نہ تھا' تب اللہ تعالیٰ نے حکم بھیج کر اس طلاق سے رجوع کرنے پر آمادہ کیا اور اس پر آپ نے رجوع فرما لیا- خواہ کوئی احتمال ہو' اس واقعہ سے بہرحال ہمارے مسلک کی تائید ظاہر ہے کیونکہ اگر احتمال اول ہے تو معلوم ہوا کہ خلاف قاعدہ طلاق اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں' وہ واپس لینی چاہیے- اگر احتمال ثانی ہے تو ظاہر ہوا کہ مسنون طریقہ یہی ہے کہ اس طرح طلاق دی جائے تاکہ رجعت کی ضرورت پڑے تو رجوع کیا جا سکے- پس اپنے خیال سے عورت کو خلاف دستور اس طرح طلاق دینا کہ آئندہ کوئی اس سے تعلق نہ رہ سکے' خلاف منشاء الٰہی ہے- اس کو توڑ کر شرعی دستور کی طرف آنا چاہیے- ورنہ رفع سنت اور نفاذ بدعت لازم آئے گا' جس سے شرعی قانون کا کوئی احترام نہ رہے گا-

زاد المعاد میں یہ لکھا ہے کہ انها لا تقع بل ترد لانها بدعة محرمة والبدعة مردودة لقوله صلی اللّٰه علیه وسلم من عمل عملا لیس علیه امرنا فهو رد یعنی ایک طہر کی مجموعی تین طلاق واقع نہ ہوں گی بلکہ رد کر دی جائیں گی- کیونکہ وہ بدعت اور حرام ہیں- آنحضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ جو شخص ایسا عمل کرے گا جس پر ہمارا حکم صادر نہیں ہوا تو وہ مردود ہے-

تفسیر مظہری میں ہے کہ جمع الطلقتین او ثلاث تطلیقات بلفظ واحد او بالفاظ مختلفه فی طهر واحد حرام وبدعة یعنی دو طلاق یا تین طلاق ایک ہی طہر میں دینا خواہ ایک ہی لفظ سے' یا مختلف لفظوں سے ہوں' بدعت اور حرام ہے-

(۹) عون المعبود ج ۲' ص ۲۲۵ میں ہے: واعلم ان نسخ المراجعة بعد التطلیقات الثلاث انما هو اذ كانت متفرقة فی ثلاث اطهار یعنی یہ بات جان لینی چاہیے کہ جاہلیت میں جو کئی کئی طلاقیں دے کر رجوع کرتے رہتے تھے' شارع نے ان میں سے ان تین طلاقوں کے بعد رجوع کرنا منسوخ کر دیا ہے جو تین طہروں میں تین طلاق دی جاتی ہیں یعنی باقی عادت عامہ کی تین طلاق لغو ہیں- ان کے بعد رجوع کرنا منسوخ نہیں ہوا ہے- وبعولتهن احق بردهن فی ذلک ان ارادوا اصلاحا یعنی اگر اصلاح کا ارادہ ہے تو ان مطلقہ کے خاوند انہی واپس کر لینے کے زیادہ حقدار ہیں-

(۱۰) زاد المعاد میں ایک طہر کی تین طلاق واقع نہ ہونے کی حکمت یہ لکھی ہے کہ وہ تین

اکٹھی وارد کرنے کا شرعاً حقدار اور مالک نہیں ہے۔ صرف ایک طلاق ایک طہر میں دینے کا مالک ہے۔ پس اس سے زائد غیر ماذون فیہ ہیں جن کو وہ استعمال نہیں کر سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی نظیر ایک اور مسئلہ طلاق کا ہے اور وہ یہ کہ غلام کی طلاق اور نکاح مالک کے ہاتھ میں ہے۔ غلام خود نہ نکاح کر سکتا ہے اور نہ طلاق دے سکتا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے۔ چنانچہ ان کا ایک غلام تھا جس کی بیوی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی لونڈی تھی' غلام نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور بتہ طلاق دی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے غلام کو فرمایا: لا طلاق لک فارجعها (زادالمعاد) یعنی تو طلاق دینے کا کوئی حقدار نہیں ہے اور تیری طلاق کوئی طلاق نہیں ہے۔ اپنی بیوی کی طرف رجوع کر لے۔

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ جس طلاق کا کوئی انسان حقدار نہ ہو' وہ طلاق شمار نہیں کی جاتی۔ پس میری طرف سے یہ دس دلائل اور وجوہ ہیں' کوئی عالم محقق ان کو مسترد کر کے کوئی صحیح صریح دلیل پیش کرے گا تو بندہ قبول کرنے کے لیے حاضر ہے۔ لیکن ہمارے شہر کے شیخ الحدیث نے صرف دو دلیلیں دی تھیں۔ ایک آیت الطلاق مرتان' جس کے متعلق زادالمعاد میں ہے: وقد قال اللّٰه تعالٰی "الطلاق مرتان" ومعلوم انه انما اراد الطلاق الماذون فيه وهو الطلاق العدة فدل علی ان ماعداه ليس من الطلاق یعنی مراد اس سے طلاق ماذون فیہ ہے اور وہ وہی ہے جو عدت کے وقت طہر میں دی جاتی ہے' اس میں اس بات پر دلالت پائی گئی ہے کہ طلاق ماذون فیہ کے بغیر کوئی طلاق معتبر نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ ایک طہر میں متفرق طلاق حرام تو ہیں مگر واقع ہو جائیں گی جیسے حیض وغیرہ کی طلاق حرام ہے مگر واقع ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حیض کی حالت تو اس دوسری قسم کی حالت ہے۔ آپ طہر کی حالت کو طہر کی حالت کے لیے نظیر کیوں نہیں بناتے۔ جو ایک دوسری کے ٹھیک مشابہ ہیں۔ وہ یہ کہ ایک مجلس کی تین طلاق بھی حرام ہیں مگر شارع صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا اعتبار نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ طہر میں حرام طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ خواہ متفرقہ کیوں نہ ہوں' فتدبر۔

یہ جواب اس صورت میں ہے کہ ہم حیض میں طلاق دینے کے جواز کا اقرار کر لیں' ورنہ ہمارا مسلک یہ ہے کہ بدعی طلاق حیض کی ہو یا نفاس کی' واقع نہیں ہوتی۔ خود عبداللہ

بن عمر رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت میں یہ صریح الفاظ مروی ہیں کہ فردھا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یرھا شیئا (اخرجہ احمد' ابوداؤد' نسائی) یعنی آنحضور ﷺ نے اس عورت کو جس کو میں نے حالت حیض میں طلاق دی تھی مجھ پر پھیر دیا اور اس طلاق کو شمار نہ کیا۔

علامہ ابن حزم نے محلی میں سند صحیح متصل سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ صاحب الواقعہ سے یہ روایت کیا ہے کہ لا یعتد بذالک یعنی حیض والی طلاق کا شمار نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے خلاف بھی روایات ہیں مگر علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ امام ربانی نے فریقین کے دلائل ذکر کر کے جو نیل الاوطار میں فیصلہ دیا ہے' وہ یہ ہے کہ: ولا شک ان روایۃ عدم الاعتداد بتلک الطلقۃ ارجح من روایۃ الاعتداد المتقدمۃ (جلد۔۶' ص۔۲۲۶ مصری) یعنی اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس طلاق حیض کے عدم اعتبار اور نہ شمار کرنے کی روایت بہت راجح ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ ترجیح دلالت کی رو سے ہے کہ عدم اعتبار کے بارہ میں نص صریح وارد ہے اور اعتداد کے بارہ میں روایات مختلفہ محتملہ وارد ہیں جو محل تاویل ہیں۔ پھر وہ قاعدہ عظیمہ کو من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھو رد کے خلاف ہیں۔

ان روایات میں اصل محل استدلال لفظ فلیرجعھا ہے کہ اس عورت پر رجوع کرلے۔ رجعت بعد وقوع طلاق ہوتی ہے۔ اس لیے طلاق کا واقع ہونا' اس سے ظاہر ہوا۔ میں کہتا ہوں یہ اقتضاء النص ہے اور ہماری دلیل عبارۃ النص ہے جو اقتضاء وغیرہ سب پر مقدم ہے پھر رجعت محتمل المعانی ہے جو ناجائز طلاق دی جائے' جس کا اعتبار نہ ہو۔ اس سے رجوع کرنے کو بھی لغوی لحاظ سے یا عرفی لحاظ سے رجعت کہہ لیتے ہیں۔ جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کو فرمایا: "فارجعھا" یعنی اپنی مطلقہ کی طرف رجوع کرلے اور ساتھ ہی یہ فرما رہے ہیں کہ لا طلاق لک یعنی تیرے لیے طلاق دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس غلام کی طلاق شمار نہیں کی لیکن عرف اور لغوی لحاظ سے فارجعھا کہہ دیا ہے۔ اس کو شرعی رجوع نہیں کہتے جو وقوع طلاق کے بعد ہوتا ہے۔

ایک شخص نے اپنے لڑکے کو بالخصوص غلام ہبہ کر دیا تھا اور باقی اولاد کو محروم رکھا تو آپ نے فرمایا: "ارجعہ" کہ اس ہبہ ناجائز سے رجوع کرلے۔ کیونکہ یہ ہبہ ظلم پر مبنی ہے' جس کا اعتبار ہی نہیں ہے۔ پس واقعہ ابن عمر رضی اللہ عنہ میں رجعت اسی قسم کی ہے۔ چنانچہ اس پر قرینہ یہ

ہے کہ آپ نے اس غلط طلاق سے رجوع کروا کر ابن عمر رضی اللہ عنہ کو صحیح طریقہ طلاق دینے کا بتلایا۔ اگر طلاق شمار ہو جاتی تو دوبارہ طلاق دینے کا حکم کرنے کا مطلب کیا؟ صرف مسئلہ بتلا دینا کافی تھا کہ حیض میں طلاق ناجائز ہے' آئندہ اس طرح طلاق نہ دینا۔ لیکن اس واقعہ میں تو رجوع کرنا واجب کر دیا ہے۔ ورنہ رجعت کرنا نہ کرنا طلاق دہندہ کا اختیاری حق ہے۔ اس رجعت کے ضروری قرار دینے کی وجہ یہی ہے کہ اس حالت میں طلاق دینا حرام ہے اور اس کا نافذ کرنا جائز نہیں ہے اور حرام پر حلال کا سا حکم مرتب نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس طلاق حرام سے رجوع کر کے پھر طہر بعد طہر میں طلاق دے جس طرح شریعت کا قاعدہ ہے۔ ہاں اگر بند رکھنا ہو تو اس کو قید نکاح میں بند رکھ لے۔

پس شیخ الحدیث کی دونوں دلیلیں کافور ہو گئیں۔ اب ان کو کوئی صحیح اور صریح دلیل پیش کرنی چاہیے ودونہ خرط القتاد۔

اب ہم یہاں تین ان علماء کرام کا محاکمہ پیش کرتے ہیں جو جماعت اہلحدیث میں مسلم اور شہرہ آفاق ہیں۔

(ا) مولانا عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی مدظلہ العالی جو دارالحدیث اوکاڑہ کے شیخ الحدیث ہیں اور پاک و ہند میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے فریقین کے خیالات معلوم کر کے جو فیصلہ صادر فرمایا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:

"ایک طہر محل ایک طلاق کا ہے جو طلاق مجالس متفرقہ میں دی جائیں اور وہ طہر واحد میں ہوں تو حکم میں ایک کے ہیں۔ جس حدیث میں طلاق ثلاثہ مجلس واحد کا ذکر آتا ہے' وہ باعتبار واقعہ حال کے ہے۔ و واقعة حال لا عموم لها' اور کسی روایت میں یہ نہیں آیا کہ ایک طہر میں تین طلاقیں متفرق دی جائیں تو تین واقع ہو جاتی ہیں یا وہ دی جاتیں تو دو واقع ہو جاتی ہیں۔ جب شرع نے محل طلاق ایک طہر کو قرار دیا ہے تو جیسے تین طلاق مجلس واحدہ کی ایک واقع ہوتی ہیں' ویسے ہی مجالس متفرقہ کی طہر واحد میں ایک شمار ہو گی۔ اس لیے کہ طہر واحد محل کئی طلاقوں کا نہیں ہے۔ چنانچہ عہد نبوی میں تین طلاقیں جو مجلس واحدہ میں دی جاتی تھیں' وہ ایک شمار ہوتی تھیں۔ اسی پر قیاس مجالس متفرقہ کا ہے۔ (قیاس حمل النظیر علی النظیر کو کہتے ہیں) کیونکہ وہ بھی ایک ہی طہر میں دی گئی ہیں' من ادعی خلافه فعليه البيان بالبرهان' طہر واحد کی طلاق شرعی کو نظر انداز کر کے لفظ مجلس واحدہ پر نظر کرتے

ہوئے مفہوم مخالف سے دلیل لینا اکثر اہل علم کا مذہب نہیں ہے اور جس طلاق ثلاثہ سے عورت خاوند پر بالکل حرام ہو جاتی ہے' وہ تین اطہار کی طلاق ثلاثہ مغلظہ ہیں اور قیاس کرنا طلاق حیض پر صحیح نہیں۔ کیونکہ حیض کی طلاق کا وقوع نص سے ثابت ہے اور مجالس متفرقہ میں تین طلاق دینا ایک طہر میں اس کا وقوع کسی روایت سے ثابت نہیں۔ ایک طہر محل ایک ہی طلاق کا ہے' کئی طلاقوں کا نہیں ہو سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث طلاق ثلاثہ مجلس واحدہ کے مفہوم سے جو شخص استدلال کرتا ہے وہ سخت غلطی میں مبتلا ہے کیونکہ مفہوم مخالف حجت نہیں ہے۔ اب مجلس واحدہ میں تین کے ایک ہونے کی علت معلوم کرنی چاہیے۔ سو آنحضور ﷺ کا تین کو ایک قرار دیتے وقت آیت **فطلقوھن لعدتھن** پڑھنا واضح کرتا ہے کہ اصل وجہ ایک طہر میں تین طلاق کو غیر معتبر بنا کر ایک طہر میں طلاق دینا مشروع بتانا تھا۔ اب یہ حدیث دلیل ہماری ہے' نہ ان کی' فتدبر۔

(۲) مولانا وحید الزمان کتب حدیث و فقہ کے ترجمان کو علمی دنیا خوب جانتی ہے کہ آپ مشہور محدث اور فقیہ تھے اور مصنف تصانیف کثیرہ اور علامتہ الدہر تھے۔ آپ نے مسئلہ طلاق پر جو کچھ لکھا ہے' وہ مندرجہ ذیل ہے:

"اہل حدیث کا راجح مذہب یہ ہے کہ طلاق اسی صورت میں پڑتی ہے' جب سنت کے موافق ایسے طہر میں طلاق دے' جس میں وطی نہ کی ہو اور جو شخص خلاف سنت طلاق دے یا تینوں طلاق ایک ہی بار دے دے یا سخت غصہ کی حالت میں' جس میں ہوش و حواس قائم نہ رہے ہوں یا مشروط طلاق دے مثلاً یوں کہے اگر تو ایسا کرے تو تجھ کو طلاق ہے۔ پھر عورت وہ کام کرے تو ان سب صورتوں میں طلاق واقع نہ ہو گی۔ اسی طرح اگر نشہ کی حالت میں یا زبردستی سے مجبور ہو کر طلاق دے یا سوتے میں (بڑبڑاتے ہوئے) تو بھی طلاق نہ پڑے گی۔

اہلحدیث کا یہ مذہب ہے کہ اگر تینوں طلاق ایک ہی بار دے' یا ایک ہی طہر میں دے دے تو صرف ایک ہی طلاق پڑے گی اور یہی قول مرجح ہے اور اسی کو محققین اہل حدیث نے اختیار کیا ہے۔" انتہی کلامہ۔

(۳) مولانا حافظ محمد صاحب فاضل گوندلوی جامعہ سلفیہ کے شیخ الحدیث اور پاکستان کے

مشہور عالم ہیں۔ ان کا تقریری فیصلہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ بیان کیا مجھ سے مولانا محمد اسحاق صاحب مولوی فاضل پٹیالوی مدرس مدرسہ دارالحدیث اوکاڑہ نے کہ مولانا محمد صاحب اوکاڑہ میں ہمارے مدرسہ کا امتحان لینے کے لیے اوائل ماہ شعبان سنہ ۷۷-۱۳ھ میں تشریف لائے تو میں نے ان سے ایک طہر میں مجالس متفرقہ میں دو یا تین طلاق دینے کا مسئلہ پوچھا۔ کیونکہ یہ مسئلہ میں نے مولانا عبدالجبار صاحب مدظلہ کے فتویٰ میں پڑھا تھا تو حافظ محمد صاحب نے اس مسئلہ میں مولانا عبدالجبار کی تائید فرمائی اور یہ بیان کیا کہ ایک طہر کی طلاق ثلاثہ ایک مجلس کی ہو یا مجالس متفرقہ کی طلاق واحدہ کا حکم رکھتی ہے۔ میں نے اس پر ایک رسالہ لکھا ہے جو لائل پور (فیصل آباد) کے فلاں طالب علم (نام راقم بھول گیا) کے پاس ہے' وہاں سے میرا مضمون نقل کر لو جو مدلل اور مشرح ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہمارے شہر منٹگمری (ساہیوال) کے شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد صاحب کے شاگرد رشید ہیں جو ان کے ذکر پر ان کی تعریف میں رطب اللسان نظر آیا کرتے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ اس مسئلہ اور اس روایت کی ان سے تصدیق کر لیں۔ شاید ان کو اس حق مسئلہ کے قبول کرنے کی توفیق میسر ہو ورنہ مولویوں کا کسی مسئلہ میں رجوع کرنا مشکل ہوتا ہے۔

(۴) جناب مولانا حافظ عبداللہ صاحب فاضل امرتسری محدث روپڑی شہرہ آفاق عالم ہیں۔ آپ سے اس صورت نزاعیہ کو پیش کر کے فیصلہ طلب کیا گیا فیصلہ صادر فرمایا جو درج ذیل ہے:

"اس واقعہ پر مصلحت استعمال کرنی چاہیے۔ اگر خاوند بیوی کے حالات اچھے ہوں اور تفریق میں نقصان ہو تو ملا دینا چاہیے (یعنی رجوع کرا دیں) اور اگر حالات خراب ہوں یا خاوند کی نیت محض تنگ کرنے کی ہو تو پھر جدائی اچھی ہے اور اس قسم کی مصلحت شریعت میں ثابت ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بوڑھے کو روزہ کی حالت میں بیوی کے بوسہ کی اجازت دے دی اور جوان کو منع فرما دیا کیونکہ بوڑھے کے متعلق روزہ ٹوٹنے کا خطرہ نہ تھا اور جوان کے متعلق خطرہ تھا کہ غلبہ شہوت کی وجہ سے اپنے نفس پر قابو نہ پا سکے گا اور روزہ توڑ بیٹھے گا۔ پس ایسے ہی صورت مذکورہ کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مسئلہ میں کسی مصلحت کی بناء پر دو جواب ہو سکتے ہیں۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ فیصلہ گو مصلحتی اور وجدانی ہے مگر ہمارے موافق ہے کہ جیسے نفس

بوسہ ناقض صوم نہیں ہے۔ ایسے ہی نفس طلاق ثلاثہ ایک طہر کی موجب حرمت نہیں ہے۔ اصل حکم سے مصلحت خارجی چیز ہے' والسلام۔ کتبہ عبدالقادر عارف حصاری

استفتاء (سوال) کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا اس مسئلہ میں کہ پنچائتوں میں عوام کا یہ دستور ہے کہ جب کسی سے قسم لینی ہو تو ہر شخص کے مذہب اور عقیدہ کے لحاظ سے یا اس کی قلبی محبت کی رو سے یا کسی کو خوف دلانے کے لیے ان قسموں کا رواج ہے' کوئی یہ کہتا ہے کہ اگر تو اس بات میں سچا ہے تو مسجد میں نہا کر داخل ہو اور سر پر قرآن رکھ کر یہ کہو کہ میں اس بات میں سچا ہوں' اگر جھوٹا ہوں تو اس قرآن کی شامت سے مارا جاؤں۔ کوئی یوں قسم لیتے ہیں کہ بابا فرید کے دروازہ کا کنڈا کھول دے' کوئی یوں حلف لیتے ہیں کہ اپنے لڑکے کو گود میں اٹھا کر مسجد میں داخل ہو جا اور اس کی قسم دے دے' کوئی کہتا ہے کہ قبرستان میں ایک گڑھا گہرا کھود کر اس میں نہا کر داخل ہو جا اور قرآن اٹھا دے۔ کوئی کہتا ہے کہ مسجد میں قرآن پر رقم یا چیز مسروقہ رکھ دے ہم اٹھا لیتے ہیں۔ کوئی کسی عیسائی سے کہتا ہے کہ تو گرجا گھر میں داخل ہو کر حضرت مسیحؑ کے نام کی قسم دے دے' کوئی کسی پیر پرست سے یہ کہتا ہے کہ گیارہویں والے پیر بغداد کی قسم دے دے۔

الغرض جیسے اس کے مدعا علیہ کا مذہب اور عندیہ معلوم کرتے ہیں ویسی اس سے قسم لیتے ہیں اور بعض منکر اور مدعا علیہ کی قسم نہیں لیتے اور اس کی برادری اور قریبیوں میں سے کسی معتبر شخص کی قسم طلب کرتے ہیں۔ اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ یہ سب قسمیں شرع محمدی کی رو سے درست اور صحیح ہیں اور اس طرح شرعاً حلف ہو جاتی ہے یا نہیں؟ بروے شرع محمدی اس کا جواب دیا جائے مہربانی ہو گی۔

السائل: عبدالرؤف خطیب جامع ہارون آباد ضلع بہاول نگر

(الجواب بتوفیق الوہاب) الحمدللہ رب العالمین! امابعد فاقول وباللہ التوفیق۔ واضح ہو کہ شریعت محمدیہ کا بیان کردہ دستور یہ ہے کہ حالف اسم ذات الٰہی کے ساتھ قسم کھائے۔ چنانچہ مشکوۃ باب الایمان والنذور ص ۲۹۶ میں یہ حدیث وارد ہے۔ "ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اللہ ینہاکم ان تحلفوا بابائکم من کان

حالفا فیحلف باللّٰہ اولیصمت" (متفق علیہ) یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے باپوں کے نام سے قسم کھانے سے منع فرما دیا ہے۔ پس جو شخص قسم کھانا چاہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھائے یا قسم کھانے سے خاموش رہے۔ مشکوۃ باب الاقضیہ ص-۳۲۸ میں حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص سے قسم لینی چاہی تو اس کو یوں قسم کھانے کی تعلیم دی احلف باللّٰہ الذی لا الہ الا ھو کہ قسم کے ساتھ نام اللہ کے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے چونکہ اس دور ضلالت میں لوگوں کے دلوں میں عظمت اور خشیت الٰہی نہیں رہی اور غیر اللہ کی دلوں میں محبت اور خشیت سما گئی ہے۔ اس لیے غیر اللہ کے ناموں پر قسمیں کھاتے ہیں۔ پس جس قدر قسمیں غیر اللہ کی سوال میں مذکور ہیں یہ سب حرام ہیں اور شرک ہیں۔ چنانچہ مشکوۃ ص-۲۹۶ میں ہے "عن ابن عمر قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول من حلف بغیر اللّٰہ فقد اشرک رواہ الترمذی" یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جس شخص نے ماسوا اللہ کے نام سے قسم کھائی وہ مشرک ہوا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا جس شخص نے لات و عزیٰ کی قسم کھائی وہ کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھے یعنی وہ مشرک ہوا' اس لیے تجدید ایمان کرے پس جس قدر غیر اللہ کی قسمیں کھانے اور کھلانے والے ہیں' سب مشرک ہیں۔ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے وما یومن اکثرھم باللّٰہ الا وھم مشرکون یعنی اکثر لوگ ایمان باللہ کا دعویٰ کرتے ہیں مگر وہ حقیقت میں مشرک ہیں۔ پس غیر اللہ کو تعظیم الٰہی میں شریک کرنے والے ان مشرکانہ قسموں سے توبہ کر کے تجدید ایمان کریں اور کلمہ دوبارہ پڑھ کر مسلمان ہوں اور ان قسموں سے شرعی قسم نہ ہو گی کیونکہ شریعت محمدیہ میں یہ حرام اور غیر متعارف ہیں۔ قدوری ص-۱۹۹ میں یہ لکھا ہے ومن حلف بغیر اللّٰہ عزوجل لم یکن حالفا کالنبی علیہ السلام والقرآن والکعبۃ یعنی جس شخص نے غیر اللہ کے نام سے یا ذات سے قسم کھائی وہ حالف شمار نہیں ہو گا۔ جیسے نبی کریم ﷺ کی ذات یا نام کی قسم کھائے یا قرآن کی قسم کھائے یا کعبہ کی قسم کھائے تو اس کی قسم معتبر نہ ہو گی کیونکہ متعارف نہیں بلکہ ممنوع ہے۔

اسی طرح مسجد میں داخل ہو کر منبر یا محراب کے قریب نام الٰہی سے قسم کھائے تو

یہ جائز ہے کہ عادت عہد نبوی میں اسی طرح تھی لیکن مسجد کی قسم کھانا یا خانقاہ کی قسم کھانا یا دروازہ کا کنڈا کھولنا یہ حرام اور گناہ کبیرہ از قسم شرک ہے اور قرآن پر روپے رکھنا اور اٹھانا ناجائز اور صریح ظلم ہے اور یہ شرعاً قسم نہ ہو گا بلکہ یہ اکل بالباطل ہے جو حرام ہے۔ نیل الاوطار جزء ثامن ص-۲۲۹ میں غیر اللہ کی قسموں کو ممنوع قرار دے کر یہ لکھا ہے: "ان الحلف بغیر اللّٰه لا ینعقد لان النهی یدل علٰی فساد المنهی عنه والیه ذهب الجمهور" یعنی غیر اللہ کے ساتھ قسم کھانا شرعاً انعقاد نہیں ہے کیونکہ یہ ممنوع ہے اور نہی فساد کو چاہتی ہے لہٰذا یہ قسم فاسد ہے۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔ ترمذی ج-۱، ص-۱۸۵ میں یہ حدیث ہے کہ ایک شخص نے والکعبۃ کہا یعنی مجھے کعبہ کی قسم ہے تو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ کے سوا کسی کی قسم مت کھاؤ' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ اپنے باپوں اور ماؤں کی قسمیں نہ کھاؤ اور نہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جن کو شریک بنایا گیا ہے ان کی قسم کھاؤ ولا تحلفوا الا باللّٰه ولا تحلفوا باللّٰه الا وانتم صادقون یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے نام کی قسم نہ کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی بھی تم قسم اس وقت کھاؤ کہ تم بالکل سچے ہو۔

قرآن مجید کی قسم بھی کتب فقہ کے متون میں منع لکھی ہے جیسا کہ قدوری کی عبارت پہلے گزر چکی ہے۔ وقایہ میں ہے لابغیر اللّٰه کالنبی والقرآن والکعبۃ یعنی اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کی قسم جائز نہیں ہے' حلف نہ ہو گی۔ عالمگیری میں ہے وقال محمد فی الاصل لو قال والقرآن لایکون مومنا ذکره مطلقا (یعنی امام محمد نے فرمایا کہ جس شخص نے قرآن کی قسم کھائی تو یہ قسم معتبر نہ ہو گی۔ بہشتی زیور حصہ تیسرا کے ص-۴۶ میں یہ لکھا ہے:

(مسئلہ) قرآن مجید کی قسم' کلام مجید کی قسم' کلام اللہ کی قسم کھا کر کوئی بات کہی تو قسم ہو گئی اور اگر کلام مجید کو ہاتھ میں لے کر یا اس پر ہاتھ رکھ کر کوئی بات کہی لیکن قسم کھائی تو قسم نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ کلام اللہ کی قسم اس لیے صحیح ہے کہ کلام اللہ' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اسماء و صفات الٰہی کی قسم جائز ہے اور صرف قرآن مجلد اوراق والا اٹھا کر قسم دے تو یہ ناجائز قسم ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے' پھر مولانا تھانوی بہشتی زیور کے اسی صفحہ میں لکھتے ہیں' خدا کے سوا کسی اور

دوسرے کی قسم کھانے سے قسم نہیں ہوتی جیسے رسول اللہ ﷺ کی قسم' کعبہ کی قسم' اپنی آنکھوں کی قسم اپنی جوانی کی قسم' اپنے ہاتھ پیر کی قسم' اپنے باپ کی قسم' اپنے بچہ کی قسم' اپنے پیاروں کی قسم' تمہارے سر کی قسم' تمہاری جان کی قسم' تمہاری قسم' اپنی قسم۔ اس طرح کی قسم کھا کر پھر اس کے خلاف کرے تو کفارہ نہ دینا پڑے گا لیکن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی قسم کھانا بڑا گناہ ہے۔ حدیث شریف میں اس کی بڑی ممانعت ہے۔ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور کسی کی قسم کھانا شرک کی بات ہے' اس لیے اس سے بہت بچنا چاہیے اور حصہ اول میں کفر اور شرک کی باتوں کا ذکر کیا ہے تو ان کا بیان کرتے ہوئے آخر میں یہ لکھا ہے' کسی کے نام یا سر کی قسم کھانا' پس قسم غیر اللہ کو شرک قرار دیا ہے اور یہ شرک آج کل بہت ہو رہا ہے۔ ان مشرکانہ قسموں کا کچھ اعتبار نہیں ہے' اسی طرح یہ رواج بھی باطل ہے کہ کسی جھگڑے اور مقدمے کے حقوق میں مجرم اور مدعا علیہ سے قسم نہیں لیتے اور اس کی برادری اور قریبوں میں سے کسی کی قسم مانگتے ہیں۔ یہ طریقہ خلاف شرع اور باطل ہے کیونکہ دستور شرعی یہ ہے جو حدیث میں آیا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا "**البینة علی المدعی والیمین علی من انکر**" کہ مدعی کے ذمے گواہ پیش کرنا ہے اور اس کے دعویٰ کے منکر کے ذمہ قسم کھانا ہے۔ مشکوۃ شریف میں حدیث ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے مدعی کے گواہ پیش نہ کرنے پر مدعا علیہ پر قسم ڈالی تو مدعی نے کہا کہ حضور! یہ تو جھوٹا شخص ہے جھوٹ سے پرواہ نہیں کرتا' جھوٹی قسم سے میرا حق لے جائے گا تو آنحضرت ﷺ نے اس مدعی سے یہ فرمایا: "**لیس لک منه الا ذالک**" (یعنی نہیں ہے تیرے واسطے فیصلہ کی کوئی صورت مگر یہی کہ یہ قسم دے)

اس حدیث نے ناقص علم والوں اور جہلا کے سب حیلے بہانے اور عذر چکنا چور کر دیئے۔ اب دوسرے شخصوں سے قسم لینی حرام ہے اور یہ قانون نبوی کو رواج کے مقابلہ میں ٹھکرا دینا ہے جو سخت گمراہی ہے۔ چنانچہ قرآن ناطق ہے کہ "**ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ماتولی ونصله جهنم وساءت مصیرا**" (یعنی جس شخص نے مخالفت کی رسول کی بعد ظاہر ہونے ہدایت کے اور پیروی کی اس نے سوائے مومنین کے رستہ کی (یعنی صحابہ کرام کی جو رسول کے

ساتھ تھے) تو ہم پھیر دیں گے اس کو جدھر وہ پھرا ہے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے جو بہت بڑا ٹھکانہ ہے۔ اعاذنا اللّٰہ منہا۔ اس مسئلہ کی تفصیل میرے دوسرے فتوے میں ہے جو علیحدہ شائع ہوا ہے۔ ھذا ماعندی واللّٰہ اعلم بالصواب۔

ضمیمہ مضمون قسم بغیر اللہ!

مضمون سابقہ میں یہ ذکر کیا تھا کہ قسم بغیر اللہ کفر و شرک ہے جبکہ تعظیم غیر اللہ کو تعظیم الٰہی میں شریک کیا جائے مثلاً جس شخص نے نبی کریم ﷺ کی ذات یا آپ کے اسماء سے حلف کھایا تو اس نے نبی کریم کو تعظیم الٰہی میں شریک کیا یا کعبہ یا مسجد کی قسم کھائی تو ان کو تعظیم الٰہی میں شریک کیا یا کسی خانقاہ کی یا خانقاہ کے دروازہ کھولنے کو قسم ٹھہرایا یا کسی ولی اللہ کے نام کی قسم کھائی تو ان کو حالف نے تعظیم الٰہی میں شریک کیا اور وہ کافر و مشرک ہوا۔

نیل الاوطار جز ثامن ص-۲۲۹ میں ہے "فان اعتقد فی المخلوق به مایعتقد فی اللّٰہ تعالٰی کان بذالک الاعتقاد کافرا" یعنی جس شخص نے اس چیز کے ساتھ جس کی قسم کھائی گئی ہے یہ عقیدہ رکھا جو ذات الٰہی سے عقیدہ رکھتا ہے مثلاً نافع اور ضار ہونے کا' مشکل کشا اور حاجت روا ہونے کا اور اس کی عظمت اور شان وغیرہ کا تو یہ مشرک ہے۔ چنانچہ منتقی بمع نیل الاوطار جزء ثامن کے ص-۲۲۷ میں یہ حدیث ہے کہ ایک یہودی نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر یہ کہا کہ تم مسلمان اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو اور شرک کرتے ہو اور یوں کہتے ہو کہ ماشاء اللّٰہ وشئت یعنی نبی کریم ﷺ سے خطاب کرتے ہو تو یہ کہتے ہو کہ جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں وہ کام ہو گا اور یہ کہتے ہو والکعبة کعبہ کی قسم تب آنحضرت ﷺ نے اس شرک سے منع کر دیا اور فرمایا یوں کہا کرو ورب الکعبة کہ کعبہ کے رب کی قسم اور یہ کہا کرو ماشاء اللّٰہ ثم شئت یعنی جو اللہ چاہے وہ کام ہو گا پھر آپ کا چاہنا کہ آپ بھی کوشش کریں۔ دوسری روایت میں ہے قل ماشاء اللّٰہ وحدہ (صیانۃ الانسان)

مصنف ابن ابی شیبہ کتاب الایمان والنذور ص-۱۷۹ میں یہ حدیث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک حلقہ میں تشریف فرما تھے تو کسی نے کہا لاوابی یعنی میرے باپ کی قسم یہ

بات یوں نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنا تو اس کو کنکری ماری اور یہ کہا کہ یہ پہلے زمانہ جاہلیت میں یمین تھی۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم سے منع فرمایا اور یہ کہا کہ قسم غیر اللہ کی شرک ہے۔ دیگر روایت اس صفحہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لو ان احدکم حلف بالمسیح لھلک والمسیح خیر من ابائکم یعنی اگر کسی نے تم میں سے حضرت مسیح علیہ السلام کی قسم کھائی تو وہ ہلاک ہوا حالانکہ مسیح تمہارے باپوں سے کئی درجے بہتر ہے، یعنی جب مسیح کے نام کی قسم سے ہلاک ہوا تو جو اپنے باپوں کی قسم کھاتے ہیں تو وہ اس سے بھی زیادہ ہلاک ہوئے، یہ ہلاکت بوجہ شرک کے ہے۔ دیگر روایت اسی کتاب میں ہے کہ کعب رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا انکم تشرکون کہ تم شرک کرتے ہو؟ لوگوں نے کہا اے ابواسحاق کیسے؟ تو کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم اپنے باپ کی، اپنی عمر کی، اپنی زندگی کی، حرمت مسجد کی قسمیں کھاتے ہو۔ دیگر روایت یہ ہے کہ مصعب بن سعد اپنے باپ سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے لات و عزیٰ جاہلیت کے بتوں کی حلف کھائی پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیان کیا کہ میں نے لات و عزیٰ کی قسم کھالی اب کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین بار لا الہ الا اللہ پڑھو اور تین بار بائیں طرف تھتکار اور اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھو اور آئندہ ایسا نہ کرنا۔ اس سے ثابت ہوا کہ غیر اللہ کی قسم شرک ہے۔ ان روایتوں سے حدیث من حلف بغیر اللہ فقد اشرک کہ جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی وہ مشرک ہوا، کی تائید ہو گئی اور تلخیص الحبیر ص-۳۹۹ میں اس حدیث کی تصحیح فرما کر یہ لکھا ہے وفی روایۃ لہ ایضا کل یمین یحلف بما دون اللہ شرک کہ ہر قسم غیر اللہ کی شرک ہے۔

قرآن کی قسم غیر اللہ کی قسم ہے یا نہیں؟

⇦ بخاری شریف ج-۲، ص-۹۸۵ میں امام الدنیا فی الحدیث نے یوں باب منعقد کیا ہے، باب الحلف بعزۃ اللہ وصفاتہ وکلامہ یعنی یہ باب اس بارہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عزۃ اور اللہ کی صفتوں کی قسم اور اللہ کی کلام کی قسم جائز ہے پھر قسم عزتک کی بابت احادیث لا کر ان سب کا جواز ثابت کیا ہے کہ جیسے عزت اللہ کی صفت ہے، ویسے کلام اور دیگر صفات ہیں کہ ان کی قسمیں جائز ہیں۔ محدثین کا اس بات پر اجماع ہے کہ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق

کہ قرآن اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے۔ جب قرآن کو کلام اللہ کہہ کر قسم کھائے گا تو یہ جائز ہے البتہ قرآن مطبوعہ بمع اوراق جلد اٹھا کر سر پر رکھنا قسم غیر مشروع ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ نے کتاب الایمان والنذور کے ص-۱۷۶ میں یہ عنوان لکھا ہے فی الرجل يحلف بالقرآن ماذا عليه في ذالك یعنی جو شخص قرآن کی حلف اٹھائے اس پر کیا حکم ہے؟ پھر اس کے تحت مجاہد کی مرسل روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "من حلف بسورة من القرآن فعليه بكل آية منها يمين صبر فمن شاء برو من شاء فجر" یعنی جس شخص نے قرآن کی کسی سورت کی قسم کھائی (مثلاً سورہ یاسین کی یا سورہ فاتحہ کی یا سورہ اخلاص کی) تو اس کی ہر آیت کی قسم ہو جائے گی۔ اب جو شخص چاہے سچا ہو جائے جھوٹی قسم اٹھائے یعنی اس کی قسم شمار ہو گی۔ اگر قسم غیر اللہ کی ہوتی یا ناجائز ہوتی تو قسم شرعاً شمار نہ ہوتی۔ جب قرآن کی سورت کا یہ حکم ہے تو کل قرآن کا بھی یہی حکم ہو گا۔ یہ روایت مرسل ہے جو اقسام ضعیف سے ہے لیکن اس کی تائید دیگر آثار سے ہوتی ہے۔

چنانچہ ابوکریب نے کہا کہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ دمشق کے بازار میں جا رہا تھا تو انہوں نے ایک شخص سے یہ سنا كلا وسورة البقرة کہ خبردار مجھے سورہ بقرہ کی قسم بات یوں ہے فقال عبدالله اما ان عليه بكل آيته منها يمين یعنی یہ قسم کھانے والا آگاہ رہے کہ اس پر سورہ بقرہ کی ہر آیت کی قسم عائد ہو گی۔ امام مجاہد تابعی سے منقول ہے من حلف بسورة من القرآن فعليه بكل ايته منها يمين ومن كفر بايته منه كفر به كله یعنی جس شخص نے قرآن کی سورت کی حلف اٹھائی تو اس پر ہر آیت کی قسم عائد ہو گی۔ جب ایک آیت کی قسم کا کفارہ دے تو سب سورت کا ادا کرے۔ اگر حانث ہوا اور کفارہ نہ دیا تو پھر جس قدر اس سورت کی آیتیں ہیں اسی قدر اس پر گناہ عائد ہوں گے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتویٰ یہ ہے من حلف بسورة من القرآن لقى الله بعدد ايها خطايا یعنی جس شخص نے قرآن کی کسی سورت کی قسم کھائی (اور پھر حانث ہوا اور کفارہ نہ دیا) تو جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو گا تو اس پر بقدر شمار آیتوں کے گناہ ہو گا۔ ان دلائل سے یہ ظاہر ہوا کہ قرآن کلام اللہ ہے' اس کی قسم جائز ہے خواہ کل قرآن کی یا کسی خاص سورۃ کی لیکن ہر

آیت کی قسم شمار ہو گی۔ اگر کسی سورہ کی پانچ سو آیتیں ہیں تو پانچ سو قسم ہو جائے گی اور پانچ سو قسم کا بصورت حانث ہونے کے کفارہ دینا پڑے گا۔ پس جس نے تمام قرآن کی قسم کھائی اور پھر حانث ہو گیا تو قرآن کے حروف کی گنتی کے حساب سے حانث ہونے پر کفارہ دینا پڑے گا۔ حجاج نے تمام قاریوں کو جمع کر کے یہ حکم دیا کہ تم شمار کر کے یہ بتاؤ کہ قرآن مجید کے تمام حروف کتنے ہیں؟ تو سب نے گن کر اتفاق کیا کہ تین لاکھ چالیس ہزار سات سو چالیس حرف ہیں۔ اب قسم بالقرآن کا اندازہ کر لو کہ جس شخص نے تمام قرآن کی قسم اٹھائی پھر حانث ہو گیا تو اس کے ذمہ تین لاکھ چالیس ہزار سات سو چالیس قسموں کا کفارہ پڑ گیا۔ اگر کفارہ نہ دیا تو پھر تین لاکھ چالیس ہزار سات سو چالیس گناہ لے کر عدالت الٰہی میں قیامت کو پیش ہو گا۔ اس لیے سب مسلمانوں کو میری یہ نصیحت اور وصیت ہے کہ کسی کام اور بات پر قرآن کی قسم نہ کھائیں' اگر کھائیں تو بالکل سچی قسم کھائیں ورنہ جھوٹی قسم سے گناہوں کا انبار لے کر قیامت کو پیش ہونا پڑے گا۔ **ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔**

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری غفرلہ الباری

ہفت روزہ اہل حدیث لاہور جلد۔۴' شمارہ۔۲۴' بمطابق ۱۵ جون سنہ۔۱۹۷۳ء

اگر مدعی کے پاس شہادت نہ ہو تو قسم صرف مدعا علیہ پر ہو گی' دوسرے کسی پر نہیں

سوال کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا اس مسئلہ میں کہ پنجاب کی پنچائتوں میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی شخص کسی پر کسی مال مقروضہ یا مسروقہ یا اغوا شدہ لڑکی یا لڑکے وغیرہ کا دعویٰ کرے اور اس کے پاس چشم دید گواہ موجود نہ ہوں تو پنچائت کے پنچ مدعا علیہ پر قسم ڈال دیتے ہیں۔ جب وہ قسم پر آمادہ ہوتا ہے تو مدعی اور پنچائت کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ مدعی علیہ اور مجرم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ چور جھوٹی قسم کھا کر مال ہضم کر لیتے ہیں۔ اس لیے تمہاری قوم اور برادری کا فلاں شخص بڑا صالح اور متقی ہے' اس کا سب کو اعتبار ہے' وہ تمہاری جگہ وضو غسل کر کے مسجد میں جا کر قرآن مجید سر پر

رکھ کر قسم دے دے تو مجرم بری ہو جاتا ہے ورنہ مدعی علیہ پر پنچائت ڈگری کر دیتی ہے اور عدالتوں میں بھی بعض موقعہ پر مدعی حاکم سے یہ کہہ دیتا ہے کہ اگر اس مدعی علیہ کی برادری کا فلاں شخص معتبر قسم دے دے تو میں دعویٰ سے دستبردار ہو جاتا ہوں۔ تب عدالت مدعی علیہ کو کہتی ہے کہ جاؤ اپنے کسی معتبر آدمی کی اس کو قسم دے دو' تمہارے ذمہ سے یہ دعویٰ خارج ہے ورنہ تم پر ڈگری ہو جائے گی۔ تب وہ شخص دوسرے شخص سے قسم دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرا شخص اس مدعی علیہ سے تسلی کر کے قسم دے دیتا ہے ورنہ اس پر ڈگری ہو جاتی ہے اور عام جہلا اور حکام یہ کہتے ہیں کہ چور اور ملزم کی قسم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اس لیے دوسرے کسی معتبر شخص کی قسم لینی چاہیے۔ اب استفسار یہ ہے کہ کیا حدیث شریف اور فقہ حنفی کا بھی یہی فیصلہ ہے یا لوگوں نے یہ رواج گھڑ لیا ہے۔ قرآن و حدیث سے اس مسئلہ کا جواب تحریر فرمایا جائے مہربانی ہو گی۔ **بینوا توجروا۔**

(السائل محمد حسین خوشتر ساکن پنج کوسی ضلع بہاول نگر)

جواب **الحمد للہ رب العالمین اما بعد فاقول وباللہ التوفیق۔** واضح ہو کہ آج کل لوگ اور حکومت آئین اسلام کے منکر ہو کر اپنے اختراعی آئین یا رواج عامہ کے پابند ہو رہے ہیں۔ حالانکہ یہ صریح کفر ہے۔ چنانچہ قرآن ناطق ہے۔ **ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الکافرون۔** یعنی "جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون اور حکم کے ساتھ فیصلہ نہ کریں گے وہ کافر ہیں۔ قانون الٰہی کے خلاف جو دستور ہے' خواہ حکومت ملکی کا ہو یا پنچائت رواجی کا سب دستور طاغوتی ہے جو لوگ آسمانی اور رحمانی قانون کو چھوڑ کر طاغوت کی طرف جاتے ہیں' وہ اس آیت کا مصداق ہیں۔ پارہ نمبر ۵' سورہ نساء میں ہے: **الم ترالی الذین یزعمون انهم امنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا به ویرید الشیطان ان یضلهم ضلالا بعیدا○** یعنی اے ہمارے نبی! کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بیشک ہم ایمان رکھتے ہیں۔ اس کتاب اور شریعت پر جو تیری طرف اتاری گئی ہے اور جو کچھ تجھ سے پہلے اتاری گئی۔ بایں ہمہ یہ ارادہ کرتے ہیں کہ اپنا جھگڑا طاغوت کی طرف لے جائیں۔ حالانکہ ان کو حکم یہ کیا گیا

تھا کہ اس کے ساتھ کفر اور نافرمانی کریں اور ارادہ شیطان کا یہ ہے کہ ان کو گمراہ کر دے۔"

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو تعجب دلایا ہے کہ آپ ان لوگوں کا حال ملاحظہ کریں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا قرآن اور کتب سابقہ پر ایمان ہے پھر اپنے مقدمات اور جھگڑے طاغوت کی طرف لے جاتے ہیں اور فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے خلاف کرانا چاہتے ہیں۔ یہ ان کے دعویٰ کا صریح بطلان ہے۔ سو یہ منافق ہیں جیسا اس سے اگلی آیت میں ذکر ہے۔ پس ثابت ہوا کہ شریعت محمدیہ کا قانون چھوڑ کر دوسری طرف جانا سراسر گمراہی ہے۔

اب صورت مسئولہ کے بارہ میں قانون شرعی ملاحظہ کیجئے جس کی تکذیب کی جا رہی ہے۔ مشکوۃ باب الاقضیہ والشہادات میں یہ حدیث ہے کہ روایت ہے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو محض دعویٰ کرنے سے حقوق دیئے جائیں تو لوگ آدمیوں کے خونوں اور مالوں کا دعویٰ کرنے لگیں۔ ولکن الیمین علی المدعی علیہ۔ (رواہ مسلم) لیکن اصول فیصلہ کا یہ ہے کہ "اگر مدعی کے پاس گواہ نہ ہوں تو مدعی علیہ پر قسم عائد ہوتی ہے" پس بمجرد دعویٰ مدعی پر فیصلہ نہ ہو گا۔ مدعی سے گواہ یا مدعی علیہ سے قسم لی جائے گی۔

چنانچہ مشکوۃ کی دوسری روایت میں ہے: لکن البینۃ علی المدعی والیمین علیٰ من انکر۔ یعنی "مدعی کے ذمہ گواہ پیش کرنا ہے اور جو دعویٰ مدعی سے انکار کرتا ہے اس پر قسم دینی آتی ہے۔" یہ قانون محمدی ہے کہ اگر کوئی کسی چیز کا کسی پر دعویٰ کرے تو اس سے شہادت طلب کی جائے۔ اگر وہ شہادت نہ پیش کر سکے تو مدعی علیہ سے قسم لی جائے۔ اب اس قانون شرعیہ پر عدالت نبویہ میں جو فیصلہ ہوا' وہ ملاحظہ کریئے۔

چنانچہ مشکوۃ کے اسی باب کی دوسری فصل میں اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میرے اور ایک یہودی کے درمیان زمین کا مقدمہ دائر ہو گیا۔ میں نے اس کو عدالت نبی کریم ﷺ میں پیش کر کے اپنا حق طلب کیا۔ "فقال الک بنیۃ قلت لا آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اے اشعث! کیا تمہارے پاس اس

دعویٰ زمین پر کوئی گواہ ہے۔" میں نے کہا کہ حضور! میرے پاس موقعہ پر اس چیز کا کوئی گواہ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا اس یہودی کو "احلف" کہ تم قسم کھاؤ کہ اس کا حق نہیں ہے میرا حق ہے۔ میں نے عرض کیا "یارسول اللّٰہ اذا یحلف یذھب بما لی" کہ "یارسول اللہ (ﷺ) یہ تو اس وقت جھوٹی قسم کھا کر میرا مال لے جائے گا۔" تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جو تیسرے پارہ کے رکوع-۱۶ میں ہے۔ ان الذین یشترون بعھد اللّٰہ وایمانھم ثمنا قلیلا اولٰئک لا خلاق لھم فی الاخرۃ ولا یکلمھم اللّٰہ ولا ینظر الیھم یوم القیامۃ ولا یزکیھم ولھم عذاب الیم○ یعنی فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ "تحقیق جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کا مول تھوڑا (اس دنیا میں) لے لیتے ہیں، ان لوگوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ ان سے شفقت سے کلام کرے گا (بلکہ سخت غضبناک ہو گا) اور نہ ان کو نظر رحمت سے دیکھے گا اور نہ ان کو اس گناہ سے پاک کرے گا (اپنے فضل سے) اور ان کے لیے سخت دردناک عذاب ہو گا۔" یہ آیت سن کر ظاہر کیا گیا کہ قانون تو اسی طرح رہے گا لیکن جھوٹی قسم کھانے والے کو قیامت کے دن اس جھوٹی قسم کھانے اور حق بیگانہ مار لینے پر سخت سزا دی جائے گی۔

دوسرا واقعہ عدالت نبوی کا مشکوٰۃ کے اسی باب کی فصل اول میں یوں مذکور ہے۔ علقمہ اپنے والد، وائل رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرموت سے (یمن کے ایک شہر سے) آیا اور ایک شخص کندی قبیلہ کا یمن سے آیا۔ دونوں عدالت نبوی میں پیش ہوئے۔ حضرمی نے یہ دعویٰ پیش کیا کہ یارسول اللہ ﷺ اس کندی نے میری زمین پر غلبہ اور ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اور وہ حق میرا ہے۔ کندی نے کہا حضور! وہ زمین میرے قبضہ میں ہے، اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ تب آنحضور ﷺ نے حضرمی سے فرمایا "الک بینۃ" (کیا تیرے پاس اس دعویٰ پر شہادت موجود ہے) حضرمی نے کہا کہ حضور! گواہ کوئی نہیں ہے۔ تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا "فلک یمینہ" پس تمہارے لیے اس سے قسم لینے کا حق ہے۔ حضرمی نے کہا کہ حضور! "ان الرجل فاجر لا یبالی علیٰ ما یحلف علیہ ولیس یتورع من شئی" یعنی یہ شخص جھوٹا اور فاجر ہے۔ یہ شخص جھوٹ بول کر چیز لینے میں کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ یہ قسم کھا کر زمین لے

جائے گا۔" آنحضور ﷺ نے فرمایا "لیس لک منه الا ذالک" یعنی تیرے لیے سوا اس فیصلہ قسم کے اور کوئی صورت فیصلہ نہیں ہے۔" جب وہ قسم کھانے کو چلا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا **لئن حلف علٰی ماله لیاکله ظلما لیلقین اللّٰه وھو عنه معرض** (رواہ مسلم) یعنی "اگر یہ شخص اس کی زمین پر جھوٹی قسم کھائے گا تاکہ ظلم سے اس کا مال کھائے تو قیامت کے دن جب اللہ سے ملے گا تو اس سے اللہ تعالیٰ سخت بیزار ہو گا۔"

مشکوۃ کی دوسری فصل میں اسی واقعہ حضرمی اور کندی میں ہے کہ کندی جب قسم دینے کو تیار ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "**لا یقطع احد مالا بیمین الا لقی اللّٰه وھو اجذم**" یعنی "نہیں لیتا کوئی مال کسی کا بدلے قسم کے مگر یہ کہ ملاقات کرے گا اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں کہ وہ کوڑھی ہو گا جس کا ہاتھ اور انگلیاں کٹی ہوئی ہوں گی۔ **فقال الکندی ھی ارضه** (یہ سن کر کندی نے کہا کہ) یارسول اللہ ﷺ میں اس زمین سے دست بردار ہوتا ہوں' یہ زمین حضرمی کی ہے' قسم نہ دی۔

اور مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ کندی نے کہا **ماذا لمن ترکھا یارسول اللّٰه فقال الجنة قال فاشھد له انی قد ترکتھا له کلھا**۔ (ابن کثیر جلد اول' ص-۳۷۵) یعنی کندی نے کہا کہ جو شخص قسم نہ دے اور حق چھوڑ دے تو اس کو قیامت کے دن کیا ملے گا یارسول اللہ! آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس کو جنت ملے گی۔ کندی نے کہا کہ آپ گواہ رہیں کہ میں نے اس کے لیے تمام زمین چھوڑ دی۔" ان واقعات سے یہ ثابت ہوا کہ مدعی علیہ مسلمان ہو خواہ کافر یہود ہو اور خواہ بدکار جھوٹا ہو قسم بہرحال اسی سے لی جائے گی۔ اس کو اپنے حال کا علم ہے دوسرا خواہ کتنا ہی معتبر اور پرہیزگار ہو' اس کو اصلی علم نہیں ہو سکتا۔

مشکوۃ میں بروایت ترمذی یہ حدیث ہے **البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیه** یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ گواہ مدعی کے ذمہ ہیں اور جو منکر اور مدعا علیہ ہے' اس کے اوپر قسم دینا ہے۔ امام ابن حزم اندلسی مجدد قرن خامس نے اپنی کتاب محلی ج-۹' ص-۳۷۲ میں حدیث وائل کی لکھ کر پھر یہ لکھا ہے "**فنص علیه الصلٰوۃ والسلام علی انه لیس الا احدھما لا کلاھما** یعنی نبی ﷺ نے صاف تصریح

کر دی ہے کہ مدعی کے لیے فیصلہ کی صرف دو ہی صورتیں ہیں کہ مدعی گواہ پیش کرے۔ اگر گواہ نہ ہوں تو مدعا علیہ قسم دے دے۔ یہ یقینی بات ہے کہ ان دو باتوں میں سے ایک ہونی ضروری ہے' تیسری صورت نہیں ہے۔

پھر لکھتے ہیں۔ **فان لم یکن للطالب بینة وابی المطلوب من الیمین اجبر علیها احب ام کره بالادب ولا یقضی علیه بنکر له فی شئی من الاشیاء اصلا۔** یعنی اگر مدعی کے پاس گواہ نہ ہوں تو پھر مدعا علیہ سے جبراً قسم لی جائے اور محض اس کے انکار پر کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔"

فقہ حنفیہ میں بھی اسی طرح ہے۔ چنانچہ ہدایہ ج۔۲' ص۔۲۰۳ میں ہے: **لقوله علیه السلام البینة علی المدعی والیمین علی من انکر قسم والقسمة تنافی الشرکة وجعل جنس الا یمان علی المنکرین ولیس وراء الجنس شئی۔** یعنی نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ مدعی کے ذمہ گواہ پیش کرنا ہے اور منکر کے ذمہ قسم ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فریقین میں فیصلہ کا معاملہ تقسیم کر دیا ہے کہ مدعی کے ذمہ شہادت ہے۔ اگر وہ نہ پیش کر سکے تو منکر کے ذمہ قسم ہے۔ اس تقسیم میں ان کا کوئی شریک نہیں ہے۔ جنس قسم کی منکرین پر ہے جنس کے بعد کوئی شئی باقی نہیں رہتی۔ الغرض اس مسئلہ میں کہ مدعی کے پاس کوئی شہادت نہ ہو تو منکر پر قسم لازم ہے۔ یہ حکم سب کا متفق علیہ ہے۔ اب جو شخص اس حکم کا انکار کر کے رواج کی پابندی کرے گا اور یہ اس پر اصرار کرے گا کہ منکر مدعا علیہ کی قسم کا کوئی اعتبار نہیں ہے' کوئی تیسرا شخص قسم دے تو یہ کفر ہے۔

چنانچہ محلی جلد اول' ص۔۱۲ میں یہ اصول درج ہے۔ **کل من کفر بما بلغه وصح عنده عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم او اجمع علیه المومنون جاء به النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فهو کافر کما قال اللّٰه تعالیٰ ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدی ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ماتولی ونصله جهنم وساءت مصیرا○** یعنی ہر وہ شخص جس نے اس حکم سے کفر کیا جو اس کو نبی کریم ﷺ کی طرف سے پہنچ گیا یا کسی امت کے اجماعی حکم سے انکاری ہوا تو وہ کافر ہوا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا کہ جس شخص نے مخالفت کی رسول کی بعد ظاہر دلیل کے اور

مومنوں کے رستہ اجماعی کے خلاف چلا تو وہ شخص جہنم رسید ہو گا۔ اسی طرح مسجد میں جا کر قرآن اٹھانے کی قسم دینا قسم رواجی ہے' شرعی نہیں۔ شرعی قسم اللہ کے نام ذاتی یا صفاتی سے ہوتی ہے۔

قدوری ص-۱۹۹ میں ہے: **من حلف بغیر اللّٰہ عزوجل لم یکن حالفا کالنبی علیہ السلام والقرآن والکعبۃ**۔ یعنی غیر اللہ کے نام سے قسم اٹھانا قسم نہیں ہے۔ جیسے نبی کے نام سے قسم اور قرآن اور کعبہ کی قسم۔ یہ قسم شرع میں شمار نہیں ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

ہفت روزہ الاعتصام لاہور جلد-۲۴' شمارہ-۴۸ مورخہ ۲۹ر جون سنہ-۱۹۷۳ء

کیا نبی اکرم ﷺ کا حلف اٹھانا ثابت ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ آنحضرت ﷺ نے جب اپنی بعض بیویوں کے منصوبے سے مغالطہ کھا کر شہد حرام کیا تھا تو اس وقت شہد نہ کھانے کا حلف اٹھایا تھا یا نہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے شہد تو حرام کر لیا تھا لیکن قسم نہیں کھائی تھی۔ قسم کھانے کا الزام آپ پر غلط ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ قرآن یا حدیث میں آپ کے قسم کھانے کی صراحت آتی ہے؟ اب آتی ہے تو وضاحت کر کے ممنون فرمائیں۔

(سائل حاجی میر حسن ساکن چک ای-بی/ای-۲ ضلع ساہیوال)

جواب شہد حرام کر لینے کے وقت رسول کریم ﷺ کا قسم کھانا قرآن حدیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ سورہ تحریم پارہ-۲۸ کے شروع میں جہاں شہد حرام کرنے کا ذکر ہے۔ **یاایھا النبی لم تحرم ماما احل اللّٰہ لک**۔ یعنی "اے نبی! جو چیز اللہ تعالٰی نے آپ کے لیے حلال کی ہے' اس کو آپ نے حرام کیوں کر لیا ہے؟ اس آیت کے بعد دوسری آیت میں ہے۔ **قد فرض اللّٰہ لکم تحلۃ ایمانکم**۔ یعنی "تحقیق فرض کر دیا ہے اللہ تعالٰی نے تمہارے لیے کھولنا قسموں تمہاری کا۔" اس آیت کی تفسیر صحیح بخاری میں درج ہے کہ وہ چیز شہد تھی جس کو آنحضرت ﷺ نے اپنی بیویوں کی خوشنودی کے

لیے اس میں بدبو کی خبر پا کر حرام کر لیا تھا اور حرام کرتے وقت قسم کھائی تھی جیسا کہ قرآن کے الفاظ میں صاف اس کا حکم ہے کہ اپنی قسم کھول دو۔

چنانچہ بخاری شریف میں وارد حدیث کے الفاظ ہیں: **لا ولکنی کنت اشرب عسلا عند زینب بنت جحش فلن اعود له وقد حلفت لا تخبری بذالک احدا**۔ یعنی "میں نے کوئی بدبودار چیز نہیں کھائی صرف زینب کے پاس شہد پیا ہے۔ اب میں قسم کھا کر یہ کہتا ہوں کہ آئندہ شہد نہ پیوں گا لیکن تم اس بات کو اپنے تک ہی مخفی رکھنا' کسی کو بتلانا نہیں۔" (ج-۲' ص-۷۲۹)

پس قرآن اور حدیث صحیح سے صاف ثابت ہوا کہ آنحضور ﷺ نے شہد نہ کھانے کی قسم کھائی تھی۔ تفسیر فتح القدیر شوکانی جلد پنجم ص-۲۴۴) میں بسند صحیح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ روایت ہے۔ **واللہ لا اشربه ابدا**۔ کہ واللہ! اب میں شہد کبھی نہ پیوں گا۔" نیز اس قسم کے کفارہ کا ذکر بھی ہے۔ **فاعتق رقبة** کہ آنحضرت ﷺ نے قسم کھول کر کفارہ میں ایک غلام آزاد کیا تھا۔" علاوہ ازیں ایک اور واقعہ میں بھی آپ کا قسم کھانا ثابت ہے۔ چنانچہ تفسیر فتح القدیر میں ہی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ماریہ لونڈی کے بارہ میں اس کو حرام کر کے قسم کھائی تھی۔ **انه حرم اولا ثم حلف ثانیا**۔ یعنی "پہلے حرام کیا پھر قسم کھائی۔"

امام شوکانی نے دونوں قصوں کا ذکر کر کے مطابقت یوں کی ہے: **والجمع ممکن بوقوع القعتین قصة العسل وقصة ماریة وان القرآن نزل فیهما جمیعا**۔ یعنی "یہ دونوں قصے واقع ہوئے اور قرآن دونوں کے بارہ میں نازل ہوا۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ دو قصے قریب قریب واقعہ ہوئے تو حکم ایک طرح کا آیا کہ حلال چیز کو حرام کر لے اور قسم کھا لے تو کفارہ دینا واجب ہے۔ لونڈی ماریہ کے بارہ میں بھی آپ نے فرمایا **فواللہ لا اقربها**۔ کہ "قسم بخدا میں اس لونڈی کے قریب نہ جاؤں گا" (ابن کثیر ج-۴' ص-۳۸۶) بہرحال آپ کا قسم کھانا ثابت ہے۔ جو شخص اس سے انکار کرتا ہے' وہ قرآن و حدیث سے جاہل ہے۔

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری

الاعتصام جلد-۲۵' شمارہ-۲۶ مورخہ ۲۵ر جنوری سنہ-۱۹۷۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خرید و فروخت کا بیان

کیا دینی تعلیم پر اُجرت جائز ہے؟

میرے ایک دوست مولوی عبداللہ صاحب نے تحقیق مسئلہ اُجرت تعلیم دینی قرآن وحدیث وغیرہ کی حلت وحرمت معلوم کرنے کی غرض سے چند دلائل لکھ کر راقم السطور کو مکلف کیا ہے کہ ان کا محققانہ جواب عرض کروں۔ حالانکہ یہ راقم اس مسئلہ پر دو سال کا عرصہ ہوا مفصل بحث کر چکا ہے۔ جس شخص میں عقل ودرائت ہے' اس کے لیے اس مضمون میں کفایت ہے۔

لیکن مولوی عبداللہ صاحب اہلحدیث ہیں' خصوصاً اور دیگر لوگوں میں عموماً تقریراً و تحریراً یہ تبلیغ کرتے رہتے ہیں کہ تعلیم قرآن وحدیث اور تبلیغ اسلام کی اُجرت اور تنخواہیں لینا دینا حرام ہیں اور تمام علماء جو دیتے لیتے ہیں یہ سب حرام خور ہیں۔ بنا بریں اس مسئلہ کے متعلق اپنی تحقیق عرض کرتا ہوں۔ مولوی عبداللہ صاحب اور دیگر اہل علم حضرات اس پر ضد وتعصب سے دور ہو کر بروئے انصاف غور فرمائیں کیونکہ ؎

تعصب میں تمیز حق وباطل ہو نہیں سکتی
تعصب میں کوئی مشکل آساں ہو نہیں سکتی

قبل ازیں کہ میں مولوی عبداللہ صاحب کے پیش کردہ دلائل پر تبصرہ کروں یہ عرض کرتا ہوں کہ عالموں' حافظوں' قاریوں' معلموں' حکام وامراء وعاملین ومجاہدین وغیرہم کے اُجرت اور دینی کاموں پر کوئی چیز لینے اور کھانے کی کئی صورتیں ہیں جن میں بعض حرام ہیں اور بعض حلال ہیں۔ چنانچہ تفصیل ان کی یہ ہے :

(ا) اپنے قرآن پڑھنے کا ثواب یا دیگر کسی طاعت الٰہی مثل روزہ' حج وغیرہ کو بعوض چند

پیسوں، روپوں کے کسی کے ہاتھ فروخت کرنا یہ باطل محض ہے جس پر علماء اُمت کا اجماع ہے۔ یہ معاملہ بعض شیعہ اور دیگر عوام اغنیا، جہلا میں متعارف ہے کہ وہ اس طرح کا سودا کرتے ہیں اور وجہ اس کے بطلان کی یہ ہے کہ بیع کی حقیقت مبادلہ مال بالمال ہے۔ ثواب وطاعات الٰہی مال نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ایسا حق ہے کہ جس کا اس شخص سے وعدہ الٰہی ہے کہ وہ آخرت کو پورا ہو گا۔ جس کی جزا بعد از حساب مرتب ہوتی ہے اور ان کی قبولیت اور عدم قبولیت کا یقینی علم نہیں ہے۔ لہٰذا شرع میں حقوق اُخروی، ثواب، جنت کے مکان وغیرہ کی بیع جائز نہیں ہے اور نہ شرع میں اس کا ثبوت ہے۔

(۲) عبادات محض اور معاصی پر اجارہ درست نہیں ہے۔ مثلاً کوئی کہے کہ آپ میری طرف سے فرض یا نفل پڑھ دیں یا قرآن خواں کو لائیں کہ وہ قرآن پڑھے تاکہ ثواب مستاجر کو ملے تو یہ معاملہ ناجائز ہے اور اس کے منع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ شخص فاعل طاعت الٰہی کا مباشر ہوا تو بموجب وعدہ الٰہی اجر اُخروی کا مستحق ہوا۔ پس اگر اجر دنیوی کو مخلوق سے طلب کرے تو اجتماع عوضین واجرین کا ایک فعل سے ایک شخص کے حق میں لازم آیا جو جائز نہیں ہے۔

اس کی مثال یوں ہے کہ ایک شخص کسی شخص کا کسی کام پر مزدور مقرر ہوا تو پھر اس کو اس وقت اسی کام پر کسی مزدوری پر کسی دوسرے کا مزدور ہونا جائز نہیں ہے۔ اگر لے گا تو درگاہ الٰہی سے ثواب نہ ملے گا، جب ثواب نہ ملا تو مستاجر کو اس کا حق نہ ملا۔ لہٰذا اجارہ فاسد ہوا۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا کہ اقراو القرآن ولا تاکلوا بہ "یعنی تم قرآن پڑھو تو اس قرآن خوانی کے عوض میں کوئی چیز نہ کھاؤ۔" اس لیے کتب فقہ میں یہ لکھا ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی قرآن خوان کو قبر پر بٹھلایا تاکہ وہ قرآن پڑھے اور اس کا ثواب میت کو بخشے اور اس سے مزدوری مقرر کر لی یا حسب مقدور کچھ دینے کا وعدہ کر لیا تو نہ قاری کو ثواب ملے گا اور نہ میت کو کچھ پہنچے گا۔ (کذا فی شرح الهدایة)

بعض جگہ مقرر نہیں کرتے لیکن دونوں جانب سے لینا دینا مقصود ہوتا ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ المعروف کالمشروط یعنی قاعدہ معاملات میں یہ ہے کہ جو مشہور رواج اور عرف عام ہو وہ مثل شرط ٹھہرانے کی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ متعارف طریقہ بھی اُجرت لینے دینے پر ہی محمول ہو گا اور ثواب نہ ملے گا۔

(۳) کسی شخص نے بغیر کسی رسم ورواج کے محض حسبنا اللہ قرآن پڑھنے کا یا کسی قربانی وغیرہ عبادت کا کسی میت کو ثواب بخش دیا یا بقصد ثواب کسی کی طرف سے پڑھنا شروع کیا اور اس کے معاوضہ کا خیال دل میں نہ لایا پھر بطریق مکافات بعد ازاں یا در اثنائے خواندن کسی شخص نے کوئی چیز اس کو دے دی یا کوئی شخص سالہا سال کسی پر دینی امور کا انعام واکرام کرتا رہا یا دنیوی فوائد (بغرض ثواب) پہنچاتا رہا۔ پھر کسی نے بطور مکافات اور احسان بدلہ احسان قرآن، کلمہ، تہلیل وغیرہ پڑھ کر اس کے مرنے کے بعد اس کو ایصال ثواب کر دیا تو یہ جائز ہے۔ بدلیل ھل جزاء الاحسان الا الاحسان "یعنی احسان کا بدلہ احسان کرنا ہوتا ہے۔" اور حدیث من صنع الیکم بمعروف فکافئوہ "یعنی تمہاری طرف کوئی بطور نیکی واحسان کام کرے تو تم اس کو بدلہ دو یعنی احسان کے عوض احسان کرو۔" یہ معاملہ اہل اسلام کا باہم ہوتا چلا آیا ہے۔

(۴) ایک شخص طلب علم دینی یا حفظ قرآن یا کسی طاعت میں اشتغال چاہتا ہے لیکن تنگ دستی اور فقدان وجہ معاش کے سبب ان امور میں مشغول نہیں ہو سکتا تب دوسرا شخص مالدار اس کی قوت کا تا فراغ ذمہ لے لیتا ہے اور خرچ کا بار اٹھا لیتا ہے تاکہ یہ مشغول طاعت رہے اور مجھے اس تعاون علی البر کا ثواب ملے تو یہ جائز ہے اور اس سے ہر دو کو اجر ملے گا۔ چنانچہ مسجدوں اور درسگاہوں میں غرباء اور فقراء سے متمول لوگ ایسا تعاون کر رہے ہیں اور رمضان میں معتکف کو طعام وغیرہ پہنچاتے رہتے ہیں، یہ جائز ہے۔ لقولہ تعالیٰ للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ "یعنی صدقات ان فقراء کو دینے چاہئیں جو اللہ تعالیٰ کے رستہ میں بند کئے جا چکے ہیں۔"

(۵) کوئی قاری خوش الحانی سے قرآن پڑھ کر لوگوں کو سناتا ہے اور کچھ لیتا ہے یا قرآن پڑھ کر سناتا ہے پھر لوگوں سے سوال کرتا ہے تو یہ اکل بالقرآن ہے۔ حدیث اقرأوا القرآن واعملوا بہ ولا تغلوا فیہ ولا تاکلوا بہ ولا تستکثروا بہ کا یہی محمل ہے یعنی تم قرآن پڑھو اور اس پر عمل کرو اور اس میں غلو نہ کرو اور اس کے ذریعہ سے لوگوں کا مال نہ کھاؤ اور دولت جمع نہ کرو۔ اور یہ حدیث بھی ایسی ہی صورت پر محمول ہے من قرا القرآن ان یتاکل بہ جاء یوم القیمۃ ووجھہ عظم لیس علیہ لحم "یعنی جس نے قرآن پڑھا اور اس کے ذریعہ سے کھایا وہ دن قیامت کو اس حال میں آئے گا کہ اس کا چہرہ محض ہڈیوں کا

بنجر ہو گا اور اس پر گوشت نہ ہو گا۔" چنانچہ سوال اور گداگری کے ذریعہ سے کھانے والوں کے حق میں بھی یہی وعید دوسری حدیث میں وارد ہے' فتفکر۔

اور اس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے : اقرأوا القرآن واسئلوا اللہ به سیجئی اقوام یقراون القران ویسئلون به الناس "یعنی تم قرآن پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے اس کے ذریعہ مانگو عنقریب ایسی قومیں ظاہر ہوں گی جو قرآن پڑھیں گی اور اس کے ذریعہ لوگوں سے بھیک مانگیں گی۔" چنانچہ اب بعض جگہ ایسا ہی ہو رہا ہے جو ناجائز ہے۔

(۶) ائمہ مساجد اور مؤذنین جو امامت نماز پر اور اذان پر مقرر کئے گئے اور وہ بروئے قرآن وحدیث اپنے فرائض منصبی کو بجا لاتے رہے اور ان کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے تو اگر جماعت کے لوگ یا امیر اور حاکم جماعتی بیت المال یا سرکاری خزانہ سے ان کی کچھ خدمت کریں اور ان کو کچھ دیں تو یہ جائز ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک لڑکا چھ سات برس کا امامت کرتا تھا تو اس کے پاس تہبند تنگ تھا جس سے وہ ننگا ہو جاتا تھا۔ عورتوں نے اس کے ننگے ہونے کی شکایت کی' تب مقتدیوں نے اپنے امام کو ایک قمیص خرید کر دی۔ وہ کہتے ہیں فکسونی قمیصا من معقد البحرین بستته دراهم او سبعة فما فرحت بشئی فرحی بذالک القمیص (قیام اللیل) "یعنی انہوں نے مجھے معقد البحرین سے ایک قمیص چھ سات درہموں سے خرید کر دی۔ اس قمیص سے میں اتنا خوش ہوا کہ اتنا کسی اور شے سے کبھی خوش نہ ہوا تھا۔"

نیز قیام اللیل میں ہے : عن عائشة کنا ناخذ الصبیان من الکتاب ونقدمهم یصلون لنا شهر رمضان فنعمل لهم القلیه والخشکار "یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' وہ فرماتی ہیں کہ ہم مکتبوں سے طالب علم لڑکوں کو پکڑ لاتی تھیں اور ان کو ماہ رمضان میں اپنے آگے امام بنا لیتی تھیں تاکہ وہ ہم کو نماز پڑھائیں اور ہم ان کے لیے گوشت روٹی تیار کر کے دیا کرتی تھیں۔"

حدیث ابو محذورہ رضی اللہ عنہ میں ہے کہ ان النبی صلی اللہ علیه وسلم دعاه حین فرغ من التاذین فاعطاه صرة فیها شیئی من فضة "یعنی جب ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے اذان دی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک ہمیانی دی جس میں چاندی کی قسم کی مالیت تھی۔"

سنن کبریٰ باب رزق المؤذن میں ہے : قد ارزق المؤذنین امام هدی عثمان بن عفان

"یعنی مؤذنوں کو امام ہدایت حضرت عثمان وظیفہ دیا کرتے تھے۔"

علامہ ابن الجوزی سیرۃ العمرین میں روایت لائے ہیں : ان عمر بن الخطاب وعثمان بن عفان کانا یرزقان المؤذنین والائمۃ (الفاروق شبلی نعمانی) "یعنی حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما مؤذنوں اور اماموں کو وظیفہ دیا کرتے تھے۔" جب خلفاء نے برملا ایسا عمل کیا تو کسی نے اس پر انکار نہیں کیا تو یہ بلااجماع جائز ہوا اور اس کو اجماع سکوتی کہتے ہیں۔

(۷) زکوۃ صدقات جمع کرنے پر عامل مقرر ہوں یا جنگ کے سپاہی مجاہدین فی سبیل اللہ ہوں یا جماعت کے خلفا اور امراء ہوں اور یہ دینی امور کو سرانجام دیں۔ اسی طرح حکام اور قضاۃ شرعی فیصلے عدالتوں میں کریں اور مفتی لوگ محکمہ افتاء میں مسائل کی تحقیقات کر کے فتوئی لکھیں تو ان سب کو جماعتی بیت المال یا سرکاری خزانہ سے مشاہرہ لینا جائز ہے۔ جیسا کہ عہد نبوی اور عہد خلفا میں اس کا معمول رہا اور کسی نے اس پر انکار نہیں کیا اور اس کے جواز کے دلائل کتاب وسنت میں موجود ہیں۔ جو اہل علم سے مخفی نہیں ہیں اور اس سے کوئی دینی عالم انکار نہیں کر سکتا۔ الا من نسفۃ نفسہ۔ فتذکر ولا تکن من المعاندین المتعصبین۔

(۸) ایک شخص قرآن مجید یا ادعیہ و اسماء الہی بروجہ عبادت وطاعت نہیں پڑھتا بلکہ بر بنائے حاجت مباح پڑھتا ہے کہ دوسرے کو کوئی فائدہ جسمانی یا روحانی پہنچے جیسے رقیہ وتعویذ کیا جاتا ہے تو اس کی اُجرت مقرر کر کے لینی یا بطور نذرانہ وتحفہ وصول کرنی جائز ہے۔ اسی طرح کوئی حاجت اور مطلب دنیوی ہو اور اس کے ارادہ سے پڑھے یا پڑھائے جیسے مقدمہ میں یا جنگ میں فتح کے لیے یا اولاد کے حصول کے لیے یا حصول نکاح کے لیے تو یہ جائز ہے اور اس کی فیس لینا بھی درست ہے۔ لیکن بعد از کامیابی لینا شرط کرے۔ جیسے صحابہ کرام میں سے بعض نے تیس یا چالیس بکریاں دم جھاڑا سورۃ فاتحہ سے کر کے وصول کی تھیں اور پھر آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے اپنا حصہ بھی لینا چاہا اور یہ فرمایا : ان احق ما اخذتم علیہ اجرا کتاب اللہ "یعنی تحقیق بہت ہی لائق وہ چیز جس پر تم مزدوری حاصل کرو' اللہ کی کتاب ہے۔" (اخرجہ البخاری)

(۹) درسگاہوں' مساجد' مدارس میں مدرسین اور معلمین کو مقرر کرنا اور ان کے ذمہ دینیات کی تعلیم ٹھہرا دینا کہ وہ قاعدہ' قرآن' کتب حدیث' کتب فقہ وغیرہ صبح وشام پابندی وقت سے

پڑھائیں اور ان کا مناسب طور پر مشاہرہ معین کریں تو یہ جائز ہے۔ اہل حدیث اور ائمہ محدثین کے نزدیک تو اس لئے جائز ہے کہ وہ تعلیم کی اُجرت لینا جائز کہتے ہیں اور فقہاء حنفیہ کے نزدیک اس لیے جائز ہے کہ جزاء احتباس ہے یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ معاوضہ نفس عبادت کا نہیں ہے بلکہ اُجرت اس لیے لی اور دی جاتی ہے کہ ان کو مخصوص مقام اور متعین وقت کا پابند کیا جاتا ہے اور یہ مسلم بات ہے کہ جگہ اور مخصوص وقت کی پابندی کوئی عبادت نہیں ہے بلکہ ایک خارج چیز ہے جس کی اُجرت لینا جائز ہے۔

اور ہماری دلیل ایک تو وہی حدیث بخاری کی ہے جو اوپر ذکر ہوئی جو فرمایا ان احق ما اخذتم علیہ اجرا کتاب اللہ۔ تعلیم لینا دینا بھی حاجت مشروع ہے۔ جس سے دینی فوائد بھی حاصل ہیں اور دنیوی بھی۔ اس لیے اس کے معاوضہ میں جانی' مالی فائدہ حاصل کرنا جائز ہے اور اُجرت لینی بھی جائز ہے اور دلیل اس کی وہ حدیث ہے جو بخاری و مسلم بلکہ تمام کتب حدیث میں ہے کہ آپ نے ایک صحابی کا نکاح قرآن کی تعلیم پر کیا اور یوں فرمایا اذھب فقد ملکتھا بما معک من القرآن ''یعنی جاؤ تحقیق مالک کیا میں نے تجھے اس عورت کا بدلہ میں اس چیز کو جو تیرے پاس ہے' قرآن سے۔''

مسلم کے باب الصداق وجواز کونہ تعلیم القرآن میں جو حدیث ہے اس کے آخری الفاظ یہ ہیں : فقد زوجنکھا فعلمھا من القرآن ''یعنی میں نے تیرا اس عورت کے ساتھ نکاح کر دیا تو اس کو قرآن کی تعلیم دے دے۔'' بعض احادیث میں یہ الفاظ وارد ہیں : زوج رجلا من اصحابہ امراۃ علی سورۃ من المفصل جعلھا مھر ادخلھا علیہ وقال علمھا ''یعنی رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ میں سے کسی شخص کا نکاح سورۃ مفصل کے عوض میں کر دیا اور اس کی تعلیم کو اس کا مہر مقرر کر دیا اور اس عورت کو اس پر داخل کر کے فرمایا کہ اس کو یہ صورت مفصل کی تعلیم دے دے۔''

ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ اس کو بیس آیات سکھا دے پس یہ تیری عورت ہے۔ بعض میں سورۃ بقرہ کا ذکر ہے اور بعض میں سورۃ انا اعطینا کا اور بعض میں قل ھو اللہ احد کا۔ جس کا سبب یہ ہے کہ ان القصص متعددۃ کہ یہ واقعات متعددہ ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ تعلیم قرآن سے منفعت حاصل کرنا جائز ہے اور لفظ یا اس میں عوضیہ ہے تو قرآن کی تعلیم کا معاوضہ لینا جائز ہے اور صریح نص سے جو سند صحیح ہو تعلیم کی اُجرت اور

منفعت لینا حرام اور منع ثابت نہیں ہے۔

رئیس المحققین علامہ ابن حزم محلّٰی جلد۔۸' صفحہ۔۱۹۳ میں فرماتے ہیں : "تعلیم قرآن اور دیگر علم کی تعلیم پر اُجرت لینی جائز ہے۔ ماہوار ہو یا اکٹھی' ایک بار ہو جب جائز ہے۔ نیز دم جھاڑ پر اور قرآن اور آسمانی کتابوں کی کتابت پر مزدوری لینا بھی درست ہے۔ کیونکہ اس کی مخالفت کی کوئی دلیل شریعت میں نہیں آئی' بلکہ اس کے درست ہونے پر بخاری کی حدیث ہے جو ہم نے روایت کی ہے۔" یعنی ان احق ما اخذتم علیه اجرا کتاب اللّٰہ والی حدیث۔

پھر دوسری دلیل تعلیم قرآن پر نکاح کرنے کی پیش فرمائی جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اور پھر اقوال سلف بعض صحابہ اور تابعین سے ثابت کیا ہے کہ مدینہ میں تین معلم تھے جو بچوں کو تعلیم دیتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو یعنی ہر ایک کو پندرہ درہم یا دینار مشاہرہ دیا کرتے تھے۔ اور حضرت حکم بن عینیہ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی اہل علم کو معلوم نہیں کیا جو معلم کی تنخواہ کو منع کہتا ہو اور حضرت عطاء اور ابوقلابہ بھی معلم کی اُجرت کو جائز کہتے ہیں اور جمہور علماء اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں۔

اور نیل الاوطار وغیرہ میں ہے کہ قاضی عیاض نے فرمایا کہ تمام علماء اسلام تعلیم قرآن کی اُجرت کے جائز ہونے کے قائل ہیں' سوائے حنفیہ کے۔ میں کہتا ہوں بلاآحزاب وہ بھی ان علماء کے ساتھ شامل ہو گئے تو اب قریباً سب علماء کا اس کے جواز پر اجماع ہے۔ کوئی شاذو نادر اس کے خلاف ہو گا۔ وہ قابل التفات نہیں ہے' فتذکر۔

آخر میں ہم امام المحققین ورئیس المناظرین مجدد قرن خامس رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ درج کرتے ہیں۔ محلّٰی جلد۔۸' صفحہ۔۱۹۳ میں علامہ ابن حزم رقمطراز ہیں : والاجارة جائزة علی تعلیم القرآن ولی تعلیم العلم مشاهرة وجملة وکل ذالک جائز وعلی الرقٰی وعلی نسخ المصاحف۔ "یعنی تعلیم قرآن' تعلیم دیگر علم پر مزدوری لینا ماہوار یا اکٹھی یکمشت سب طرح جائز ہے۔ اسی طرح دم جھاڑے پر اور قرآن مجید اور دیگر دینی کتابوں کے لکھنے پر اُجرت جائز ہے۔ کیونکہ شارع کی طرف سے اس کی ممانعت میں کوئی نص وارد نہیں ہوئی بلکہ اباحت آئی ہے جیسا کہ بخاری شریف میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زیادہ حقدار اس چیز کی کہ تم اس پر مزدوری لیتے ہو' اللہ کی کتاب ہے۔ اور حدیث مشہور

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کا نکاح ایک شخص سے اس چیز کے معاوضہ میں کیا تھا کہ وہ اس کو قرآن کی سورتیں سکھا دے۔"

پھر امام ابن حزم نے ان احادیث کی تضعیف کی ہے جو مولوی عبداللہ وغیرہ مانعین پیش کرتے ہیں اور ان کا صفایا کر کے کالعدم کر دیا ہے۔ علامہ محدث مبارک پوری مرحوم تحفۃ الاحوذی جلد۔۳، صفحہ۔۱۴۹ میں فرماتے ہیں کہ مانعین جو منع اُجرت تعلیم قرآن پر روایات پیش کرتے ہیں وہ سب ضعیف ہیں۔ دلیل لینے کے لائق نہیں ہیں۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ مجموعہ میں صلاحیت استدلال کی ہو جاتی ہے تو پھر بھی احادیث جواز اجرت کی اصح اور اقویٰ ہیں یعنی از روئے اصول اُن کو ترجیح دی جائے گی اور مرجوح متروک ہوں گی۔ قدرے تفصیل سے ہم دوسرے مضمون میں ان دلائل پر تبصرہ کریں گے، انشاء اللہ۔

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری

اہل حدیث سوہدرہ

جلد۔۶، شمارہ۔۲۵، ۲۶۔ مورخہ یکم و ۸ جولائی سنہ۔۱۹۵۴ء

تعلیم دین پر اُجرت

حضرات! مسئلہ یہ ہے کہ دینیات علم قرآن وحدیث وغیرہ کی تعلیم پر اُجرت، مشاہرہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ متقدمین میں گو کسی قدر اس میں اختلاف ہوا ہے لیکن متاخرین علماء میں تا این زمانہ اس کے جواز اور تعامل پر قریباً اجماع ہے۔ عرب و عجم کے مدارس اور مساجد میں تعلیم و تبلیغ وافتا وقضا شرعی پر مشاہرے لئے جا رہے ہیں۔ کسی کی تنخواہ بیت المال سے ہے، کسی کی انجمن یا جماعت کی طرف سے مقرر ہے، کسی جگہ کوئی ایک ہی متمول شخص کسی عالم یا حافظ قرآن کو مشاہرہ دے رہا ہے۔ اب تک کسی مذہب کے عالم، مفتی، قاضی، محدث، فقیہ یا خلیفہ وقت نے اس کے حرام ہونے کا حکم دے کر اس کے انسداد کی کوشش نہیں کی اور نہ کسی مشاہرہ لینے والے کو حرام خور کہا ہے بلکہ اب تک تمام اسلامی ممالک کی درس گاہوں میں اس پر تعامل مسلسل چلا آرہا ہے جو بحکم حدیث لا یجتمع امتی علی ضلالۃ "یعنی میری امت کبھی کسی گمراہی پر اجتماع نہیں کرے گی۔"

یہ گمراہی نہیں ہے، یہ عالمگیر تعامل علماء اسلام کا خود اس کے جواز کی دلیل بن سکتا ہے

چہ جائیکہ اس کے جواز پر ادلہ شرعیہ موجود ہیں۔ مذہب اہل حدیث بھی جس کو طائفہ ناجیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے یہی حکم دیتا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ نذیریہ وغیرہ کتب محققین علماء اہل حدیث سے ظاہر ہے۔ ہاں بربنائے قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ علماء حنفیہ نے محدثین سے اتفاق کر کے اس مسئلہ کو بالکل متروک کر دیا ہے اور اس کے خلاف تعامل ٹھہرا لیا ہے۔

فتاویٰ قاضی خاں میں فقیہ ابو اللیث سمرقندی معتمد علیہ علماء حنفیہ سے منقول ہے : قال کنت افتی بثلاثة اشیاء فرجعت عنها کنت افتی ان لا یحل للمعلم اخذ الاجرة علی تعلیم القرآن وکنت افتی ان لا ینبغی للعالم ان یدخل علی السطان وکنت افتی لا ینبغی لصاحب العلم ان یخرج الی القری فیذکرهم لیجمعوا له شیئا فرجعت عن ذلک کله الخ "یعنی میں نے تین چیزوں کی بابت فتویٰ دیا تھا جن سے اب رجوع کر لیا ہے۔ ایک تو میں یہ فتویٰ دیا کرتا تھا کہ معلم کے لیے تعلیم قرآن پر اُجرت لینا حلال نہیں ہے اور دوسرا یہ فتویٰ دیا کرتا تھا کہ دینی عالم کے لیے جائز نہیں کہ وہ بادشاہ کے پاس آمدورفت کرے اور تیسرا یہ فتویٰ تھا کہ عالم کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دیہات اور شہروں میں جا کر وعظ نصیحت کرے تاکہ لوگ اس کی مالی خدمت کریں۔ میں نے ان سب فتووں سے اب رجوع کر لیا ہے۔"

حنفی علماء تو رجوع کر کے اہل حق سے مل گئے ہیں لیکن بعض اہل حدیث اب ان کے پرانے مذہب کو فروغ دینے کا ذمہ لے رہے ہیں جن کا دعویٰ تو اہل حدیث ہونے کا ہے اور اشاعت مذہب حنفی کی کر رہے ہیں۔

اس مسئلہ کی بحث میں مندرجہ ذیل امور تنقیح طلب ہیں :

(۱) کیا کتاب اللہ کی مزدوری کسی جائز طریقہ سے لینی حلال ہے یا حرام؟

(۲) خلفائے راشدین کا اس بارہ میں کیا مسلک تھا؟

(۳) اہل حدیث علماء کا اس بارہ میں مذہب ہے؟

(۴) اگر کوئی کام محض لوجہ اللہ کیا جائے اور اس کام کی کوئی اُجرت مقرر نہ ہو پھر اس پر کوئی ہدیہ دے دے تو کیا وہ ہدیہ اُجرت متصور ہو گا؟ اور کیا وہ لینا حلال ہے؟ اور کیا عبادت الٰہی کی مزدوری لینی جائز ہے؟

(۵) اگر دلائل شرعیہ بظاہر متعارض ہوں تو دریں حال وجہ ترجیح اور طریق عمل کیا ہے؟

(۶) کیا ضعیف حدیث احکام میں حجت ہے؟ اور اس سے حلت یا حرمت ثابت ہو سکتی ہے؟

(۷) کیا کسی نیک کام کرنے والے شخص کو بغیر اس کے سوال اور حرص نفس کے کوئی چیز مل جائے تو لینی جائز ہے یا نہیں؟ بس اس مسئلہ کے یہ ہفت افلاک ہیں جو شخص دلائل شرعیہ کے ذریعہ ان کو عبور کر لے گا وہ معراج کمال حاصل کر کے عرش مقصود تک پہنچ جائے گا اور جو اس میں لغزش کھا کر فرش جہالت پر گرے گا وہ ضلالت کے گڑھے میں جا پڑے گا۔

اجرت کتاب اللہ پر بحث: قرآن وحدیث کی تعلیم دینا اور آیات قرآنی سے رقیہ کرنا اور قرآن کی کتابت کرنا وغیرہ جو جائز کام ہیں' ان پر اُجرت لینا حلال ہے۔ چنانچہ بلوغ المرام باب الاجارہ میں حدیث نبوی وارد ہے : عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہما ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ان احق ما اخذتم علیہ اجرا کتاب اللّٰہ (اخرجہ البخاری) "یعنی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زیادہ حقدار اور بہت لائق اس چیز سے کہ جس پر تم مزدوری لو اللہ کی کتاب ہے۔" یعنی زیادہ لائق اُجرت لینے کے ان چیزوں سے جو تم اُن پر اُجرت لیتے ہو اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم ہے' اس پر اُجرت لینی حلال ہے۔

اس حدیث میں لفظ "ما" الفاظ عامہ سے ہے جو اپنے عموم سے ان تمام افراد کو حاوی ہے جن کے ذریعہ مزدوری کمائی جاتی ہے خواہ وہ تعلیم کا کام ہو یا کتابت کا ہو رقیہ دم جھاڑ کا ہو یا کوئی جائز ذریعہ ہو جیسے آیت وما اھل لغیر اللّٰہ بہ "یعنی وہ چیز بھی حرام ہے جو غیراللہ کے لیے نامزد کی گئی ہے۔" پس ہر وہ چیز جو غیراللہ کے نام پر پکاری جائے گی حرام ہے۔ کیونکہ "ما" عام ہے' اس میں ذی روح چیزیں جیسے بکرا' مرغ وغیرہ اور غیر ذی روح مٹھائی چاول' دودھ وغیرہ سب داخل ہیں اور مفسرین نے اس کے مورد کی وجہ سے عند بحہ کی قید ذکر کی ہے جس سے اس کے موجب نزول کا معلوم کرانا مقصود ہے ورنہ قید عند ذبحہ سے اس عموم کا حصر نہیں ہو سکتا کیونکہ اعتبار عموم لفظ کا ہے۔

چنانچہ صیانتہ الانسان ص ۴۵۵ میں ہے : ان العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب ولو خصصت الایات بما نزلت فیہ لبطل معظم احکام الاسلام "یعنی اعتبار عموم لفظ کا

ہے سبب کی خصوصیت کا نہیں ہے۔ اگر آیات کو مورد اور سبب نزول سے مخصوص رکھا جائے تو اسلام کے بڑے بڑے احکام بیکار ہو جائیں گے۔"

یہی حال احادیث نبویہ کا ہے کہ اگرچہ ان میں مورد خاص ہے لیکن ان میں جو حکم وارد ہوا ہے اس پر غور کیا جائے گا کہ وہ خاص ہے یا عام ہے۔ اگر خاص ہے تو اس موقعہ کے ساتھ مخصوص رکھا جائے گا اور اگر وہ عام ہے تو اس موقعہ کو اس عام کا ایک فرد قرار دے کر باقی افراد کو اس عام کے تحت کیا جائے گا اور حکم سب کو یکساں شامل ہو گا جو لوگ عام حکم کو مورد سے خاص کرتے ہیں ان کی مثال ان بریلویوں کی ہے جو آیات تردید شرک کو بتوں سے مخصوص کر کے قبروں اور پیروں کو اُن سے خارج تصور رکھتے ہیں۔"

فسونہائے کج در دلہائے کج
مے رود چون کفش کج در پائے کج

حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مورد: اب اس حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مورد ملاحظہ ہو۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ کچھ صحابہ کسی قبیلہ کے پاس سے گذرے جو پانی پر مقیم تھے۔ ان میں سے ایک شخص کو سانپ نے ڈس لیا تو اُن کا ایک شخص صحابہ کرام کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ہم میں سے ایک شخص کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ کیا تمہارے میں کوئی دم جھاڑ کرنے والا ہے؟ پس ایک شخص صحابہ میں سے گیا اور اُس نے بکریاں لینی شرط کرلیں اور سورہ فاتحہ پڑھ کر اس پر دم کر دیا جس سے وہ صحت یاب ہو گیا۔ وہ صحابی ان سے بکریاں لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس آیا تو اس کے ساتھیوں نے اس معاوضہ کو برا سمجھا اور کہنے لگے کہ تو نے تو اللہ تعالیٰ کی کتاب پر مزدوری لی ہے حتیٰ کہ جب وہ مدینہ میں آئے تو انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر بیان کیا کہ اس شخص نے اللہ کی کتاب پر اس طرح مزدوری لی ہے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان احق ما اخذتم علیه کتاب اللّٰہ "یعنی بہت لائق اس چیز سے کہ تم اس پر مزدوری لیتے ہو اللہ کی کتاب ہے۔" (بخاری کتاب الاجارات باب ما یعطی فی الرقیه بفاتحة الکتاب)

غور فرمایئے! سورۃ فاتحہ پڑھ کر مریض پر دم کیا ہے اور اس سے اجرت میں بکریاں مقرر کرلی ہیں جو آرام ہونے پر وصول کیں۔ یہ صاف طور پر کتاب اللہ پڑھنے کی مزدوری ہے جس کو خود صحابہ کرام نے بھی کتاب اللہ کی مزدوری قرار دیا ہے پھر اس پر صحابہ میں نزاع

ہوا۔ بعض نے جائز جان کر مزدوری حاصل کی اور بعض نے اس کو ناجائز سمجھا۔ جب دونوں فریق مدینہ شریف میں آئے تو انہوں نے یہ معاملہ متنازعہ عدالت نبوی میں پیش کیا' تب آنحضرت ﷺ سرکار مدینہ نے یہ کلی فیصلہ فرما دیا کہ جن چیزوں پر تم مزدوریاں لیتے ہو اُن سے اللہ تعالیٰ کی کتاب زیادہ حقدار ہے کہ تم اس پر مزدوری لو۔ پس یہ نص قطعی ہے کہ کتاب اللہ پر مزدوری لینی حلال ہے۔

واقعہ اگرچہ رقیہ کا ہے لیکن اس پر جو حکم فرمایا گیا ہے وہ عام ہے کہ اللہ کی کتاب اجرت حاصل کرنے کے زیادہ لائق ہے یعنی اس سے اجرت حاصل کر لیا کرو جیسے اس واقعہ سے بکریاں اجرت میں لینی مخصوص نہیں' سانپ کاٹا ہوا مریض شرط نہیں' سورہ فاتحہ خاص نہیں' اسی طرح دم جھاڑا کرنا بھی خاص نہیں ہو گا بلکہ یہ قضیہ اتفاقیہ ہو گا اور کتاب اللہ کے ذریعہ اجرت لینا اصل حکم ہو گا کہ وہ حلال ہے کیونکہ جھگڑا دم جھاڑ کرنے پر نہیں ہوا تھا بلکہ کتاب اللہ پڑھ کر مزدوری لینے پر ہوا تھا جس کو سرکار مدینہ نے حلال قرار دیا بلکہ آئندہ کے لیے مزدوری حاصل کرنے کے لائق ٹھہرایا اور یہاں دم جھاڑا سے اس کو مخصوص کر کے باقی کسی طرح سے کتاب اللہ پر مزدوری لینے کو حرام نہیں بتایا۔

اگر رقیہ کے سوا کسی تعلیم وغیرہ امور میں اجرت کتاب اللہ پر لینی حرام ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اس طرح نہ فرماتے بلکہ یہ فرماتے کہ رقیہ کے طور پر تو جائز ہے لیکن اور کسی صورت سے کتاب اللہ پر مزدوری لینا حرام ہے۔ یہاں مسئلہ کتاب اللہ کی اجرت کا پیش تھا جس کی حاجت تھی کہ شارع اس موقعہ پر کتاب اللہ کی اجرت کے جائز اور ناجائز مواقع کو بیان کرے کیونکہ یہ شرعی اصول ہے۔ ان تاخیر البیان عن وقت الحاجة لایجوز (نیل جلد۔۵' ص۔۲۸۷) "یعنی وقت ضرورت کے مسئلہ اور حکم بیان کرنے میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے۔" پس آپ کا اس وقت حاجت میں اُجرت کتاب اللہ کو عام طور پر زیادہ حق دار ٹھہرانا اس امر کا مظہر ہے کہ کتاب اللہ کے ذریعہ پر جائز کام میں اجرت لینا حلال جس میں تعلیم' رقیہ' کتابت وغیرہ سب داخل ہیں۔ ہاں اگر کوئی صورت ایسی ہی ہے قطعی الصحت و قطعی الدلالت دلیل سے ممنوع ثابت ہو جائے گی تو اس کو ہم اس عموم سے مخصوص کر لیں گے ورنہ یہ حکم عام اور مطلق رہے گا' فتذکر۔

<u>امام بخاری کی شرح</u>: امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا وفور علم' وسعت

حافظہ، فہم عالی، سرعت ذہن، و دقت نظر شہرہ آفاق و مسلم کل ہے۔ آپ اپنی جامع صحیح میں ایک باب منعقد کرتے ہیں تو اس کے ضمن میں کئی مسائل ثابت کر دیتے ہیں اور کئی آثار ذکر کر کے متعدد مسائل بیان فرما دیتے ہیں اور مذاہب مختلفہ بھی ظاہر کر دیتے ہیں اور آیات قرآنی کی تفسیر بھی کر جاتے ہیں۔ چنانچہ بخاری کتاب الاجارات میں ایک باب یوں منعقد فرمایا ہے باب ما یعطی فی الرقیہ علی احیاء العرب بفاتحۃ الکتاب "یعنی یہ باب سورہ فاتحہ پڑھ کر عربوں پر پھونکنے اور اس کی اجرت لینے کے بیان میں ہے۔"

اس کے تحت پہلے یہی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ ذکر فرمائی ہے جس کا آخری جملہ احق ما اخذتم علیہ اجرا کتاب اللہ لائے ہیں جس سے وہ چیزیں ظاہر کر دیں۔ ایک یہ کہ واقعہ سے اور میرے اس باب سے فاتحہ کی خصوصیت نہ سمجھ لینا، قرآن تمام ہو یا اس کا کوئی جزو ہو، اس سے اُجرت حاصل کرنا جائز ہے۔ دوم یہ کہ واقعہ سے رقیہ کی خصوصیت تصور نہ کر لینا جیسا کہ حنفیہ کا خیال ہے بلکہ سب کاموں سے جن پر تم اجرت لیتے ہو اجرت لینے کے لائق اللہ کی کتاب ہے۔

پھر امام شعبی سے جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے استاد ہیں یہ نقل کیا ہے کہ معلم شرط نہ کرے، اگر بن مانگے اس کو کچھ دے دیں تو قبول کر لے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ امام شعبی رحمہ اللہ بغیر شرط کرنے کے قرآن کی تعلیم پر کچھ لینا جائز سمجھتے ہیں۔

پھر امام حکم رحمہ اللہ سے یہ نقل فرمایا ہے کہ میں نے کسی سے نہیں سنا کہ اس نے تعلیم دینے والے کی اجرت کو مکروہ کہا ہو۔ اس سے کئی باتیں ظاہر ہوئیں۔ ایک یہ کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ اور اس واقعہ میں صرف رقیہ کی اجرت کا جواز بھی ظاہر نہیں ہے بلکہ علماء نے اس کو عام سمجھ کر تعلیم کا جواز بھی لے لیا ہے۔ چنانچہ امام حکم رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے۔ دوم یہ کہ اس اجرت تعلیم کے مسئلہ پر علماء اسلام کا اتفاق ہے۔ کوئی شاذ و نادر اس کے خلاف ہو تو ہو۔

پھر امام حسن رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے خود معلم کو دس درہم دیئے۔ اس سے یہ بتلایا کہ تابعین کے عہد میں اس پر تعامل تھا کہ معلموں کو تعلیم کا صلہ دیتے تھے۔ پھر ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ تقسیم کرنے والے کی اجرت میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ پھر عام طور یہ تعامل ذکر کیا کہ اندازہ کرنے کی اجرت دی جاتی تھی۔ اب اہل علم غور فرمائیں کہ

باب تو باندھا تھا سورہ فاتحہ کے دم کرنے کی اجرت لینے کا اور ذکر کیا جا رہا ہے کہ معلم اور قسام اور خارص کی اجرت بھی جائز ہے۔ اب ان مسائل کی اس باب سے مناسبت کیا ہوئی؟

بس امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ میں یہی کمال ہے کہ وہ باب کے مسئلہ کے علاوہ دیگر متعلقہ امور کا ذکر بھی کر دیتے ہیں اور جس چیز کی ادنیٰ مناسبت بھی ہو' اس کا حکم بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن سے دم کر کے اُجرت لینے کا تو واقعہ میں صریح ذکر تھا' تعلیم قرآن کا ذکر نہیں تھا۔ اس کا جواز عموم حدیث اور تعامل سلف سے ثابت کیا اور اُجرت تعلیم اور اجرت رقیہ کو مساوی فی الحکم قرار دیا اور بالشرط ہو یا بغیر شرط ہر طرح جائز رکھا پھر اجرت قسام اور اجرت خارص کا ذکر کر کے یہ ظاہر کیا کہ جیسے ان پر مزدوری لینی دینی جائز ہے اسی طرح قرآن پر بھی جائز ہے۔ یہ لفظ ما اخذتم علیہ اجرا سے نمایاں ہوتا ہے اور قرآن سے اجرت لینا تقسیم اور خرص کی اجرت سے زیادہ لائق ہے۔

حاشیہ بخاری میں مولانا احمد علی صاحب حنفی حافظ ابن حجر ناقد الحدیث سے نقل کرتے ہیں : ذکر القسام والخارص المترجمة الاشتراک فی ان جنسھما او جنس تعلیم القرآن والرقية واحد کذا قاله ابن حجر یعنی قسام اور خارص کا ذکر اس باب میں اس مناسبت سے ہے کہ قسام اور خارص کی اجرت اور تعلیم قرآن اور دم جھاڑ کی اجرت کا حکم یکساں اور ایک ہی ہے۔" پھر یہ فرمایا کہ سُحت رشوة فی الحکم ہے یعنی قرآن کریم میں سحت کا ذکر ہے' وہ حرام ہے اور اس سے حاکم یا قاضی یا مفتی کا فیصلوں میں رشوت لینا مراد ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور نازل کردہ قانون سے کسی فریق سے رشوت لے کر ناحق فیصلہ کیا کرتے تھے یا کتمان حق سے کھاتے تھے' یہ بھی رشوت ہے۔

اس سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ظاہر کر دیا کہ سُحت کی تفسیر یہ صحیح ہے اور کتاب اللہ کی آیات سے جس ثمن قلیل لینے کی مخالفت اور برائی مذکور ہے اس سے ناجائز طریق سے مال کھانا مراد ہے' اس کو جائز طریق سے اجرت لینے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے' کیونکہ یہ شریعت میں جائز ہے۔ ان امور کو ذکر فرما کر امام بخاری نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جو رقیہ پر اجرت لینے کے بارے میں ہے ذکر فرمائی ہے جس سے کتاب اللہ سے اجرت لینے کا جواز ثابت کیا ہے' جزاہ اللہ منا وعن سائر المسلمین' کیسی وسعت علم اور محدثانہ ومجتہدانہ طرز استدلال ہے' اسی واسطے علماء محققین نے امام بخاری مرحوم ومغفور کو

مجتہد مطلق قرار دیا ہے جو بالکل صحیح ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ میں اجرت عموم پر محمول ہے جو رقیہ اور تعلیم وغیرہ سب کو شامل ہے اور امام بخاری نے اس کو عموم پر ہی محمول کر کے تعلیم اور معلم کی اجرت کا ذکر کیا ہے اور رقیہ کا ذکر خاص واقعہ کی وجہ سے ہے جیسے باب میں احیاء عرب کا خاص ذکر مواد کے لحاظ سے کیا ورنہ رقیہ ہر ملک اور ہر قوم پر کرنا بالاتفاق جائز ہے' اسی طرح اجرت کے عموم کو سمجھ لیں۔ چنانچہ جمہور علماء اسلام نے اسی طرح سمجھا ہے۔

نیل الاوطار میں ہے: استدل به الجمهور علی جواز اخذ الاجرة علی تعلیم القرآن "یعنی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جمہور نے یہ دلیل لی ہے کہ قرآن کی تعلیم پر اجرت لینی جائز ہے۔"

دوسری دلیل' منتقی میں ہے: باب جعل تعلیم القرآن صداقا "یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ قرآن کی تعلیم کو نکاح میں مہر مقرر کرنا جائز ہے۔" اس باب میں سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کرنے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا کہ کیا تمہارے پاس مہر دینے کے لیے کوئی چیز ہے؟ اس نے کہا کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تجھے قرآن میں سے کچھ یاد ہے؟ اس نے کہا فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں۔ تب آپ نے فرمایا قد زوجتکها بما معک من القرآن "یعنی میں نے یہ عورت تجھے اس قرآن کے عوض نکاح کر دی جو تجھے یاد ہے۔"

لفظ بما میں باء عوضیہ ہے یعنی تعلیم قرآن کے عوض میں نکاح کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کی تعلیم سے اجرت اور ہر قسم کی منفعت حاصل کرنا جائز ہے کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم قرآن کو نکاح کا عوض قرار دیا ہے۔

یہ حدیث بخاری و مسلم کی ہے جو قطعی الصحت ہے اور اس کی مسئلہ مابه النزاع یعنی جواز اجرت تعلیم قرآن پر دلالت یقینی ہے۔ چنانچہ مسلم کی بعض روایتوں میں یہ الفاظ وارد ہیں: فقد زوجتکها فعلمها من القرآن "یعنی تجھے یہ عورت نکاح کر دی تو اس کو قران سکھا دے۔" بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں: فقد ملکتها بما معک من القرآن "یعنی میں نے یہ عورت قرآن کے عوض تیرے ملک کر دی۔" پس یہ صریح نص ہے کہ قرآن کی

تعلیم کے عوض کسی چیز کا ملک کر دینا جائز ہے' خواہ عورت ہو یا بکریاں ہوں یا نقدی کوئی چیز ہو۔

نووی شرح مسلم میں ہے : وفی هذا الحدیث دلیل لجواز کون الصداق تعلیم القرآن وجوز الاستیجار لتعلیم القرآن وکلاهما جائز (انتھٰی) "یعنی اس حدیث میں اس مسئلہ پر دلیل ہے کہ تعلیم قرآن کو نکاح کا مہر بنانا اور اس سے اجرت حاصل کرنا جائز ہے۔"

نیل الاوطار میں ابن ابی شیبہ اور ترمذی سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ آپ نے ایک شخص سے پوچھا تو نے نکاح کر لیا ہے؟ اس نے کہا کہ لیس عندی ما اتزوج به "یعنی میرے پاس کوئی چیز ہے کہ جس کے عوض میں نکاح کروں۔" قال الیس معک قل هو الله احد "یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تیرے پاس قل هو الله احد نہیں ہے؟" ایک اور حدیث میں یہ ہے کہ ایک شخص سے آپ نے پوچھا تو قرآن میں سے کچھ پڑھا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں انا اعطیناک الکوثر جانتا ہوں۔ آپ نے اسے مہر بنا کر نکاح کر دیا۔ کسی حدیث میں بیس آیات کا ذکر ہے' کسی میں پانچ سورتوں کا ذکر ہے۔

الغرض عہد نبوی میں کئی بار اس طرح نکاح ہوئے ہیں۔ یہ قصے متعدد ہیں اور جملہ روایات فتح الباری ونیل وغیرہ میں منقول ہیں جس سے طحاوی وغیرہ حنفیہ کا رد ہو گیا کہ یہ صرف ایک ہی شخص سے مخصوص ہے جو خاص وجہ سے ہے' دیگر کے لیے جائز نہیں ہے۔ جن روایات سے یہ لوگ خصوصیت ثابت کرتے ہیں' وہ سب غیر ثابت ہیں۔ احادیث صحیحہ قطعیہ اس طرح نکاح کرنے کے جواز پر قطعی دلالت کرتی ہیں اور حجت تامہ ہیں۔ مؤطا میں امام مالک رحمہ اللہ نے باب منعقد کیا ہے۔ باب یصلح مهر اما یصلح ثمنا "یعنی جو چیز کسی چیز کا مول بن سکتی ہے وہ مہر بھی بن سکتی ہے۔" پھر اس باب میں سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے جس کے آخری جملہ کا ترجمہ جناب عالم ربانی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے مصفٰی میں اس طرح کیا ہے "پس فرمود رسول اللہ ﷺ ہر آئینہ بزنے دادم او را بتو بمقابلہ آنچہ باتست از قرآن یعنی بر تعلیم آن۔ ترجمہ وہی ہے جو اوپر گذر چکا ہے۔

پھر مسوی میں فرماتے ہیں : وفیه دلالة علی انه یجوز ان یجعل تعلیم القرآن صداقا "یعنی اس حدیث میں اس مسئلہ پر دلالت ہے کہ قرآن کی تعلیم کو مہر مقرر کرنا جائز ہے۔"

نیز یہ لکھا ہے کہ وجملته ان کل عمل جاز الاستیجار علیه جاز ان یجعله صداقا "یعنی حاصل کلام یہ ہے کہ ہر وہ کام جس پر مزدوری لینی جائز ہے اس کا نکاح میں مہر بنانا بھی جائز ہے۔" پھر حنفیہ کی تاویلوں کا ذکر کر کے فرمایا ہے: وفیه بُعد "یعنی یہ سب دور کی باتیں ہیں۔"

مانعین اُجرت تعلیم کے دلائل پر تبصرہ: ہم نے اپنے دعویٰ کو کہ تعلیم قرآن وحدیث وغیرہ پر اُجرت اور دیگر منافع حاصل کرنا جائز ہے' دو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت دلیلوں سے ثابت کر دیا ہے اور ایسی کتابوں سے کیا ہے جو طبقہ اولیٰ کی ہیں۔ لیکن مانعین جو ہمارے مقابلہ میں دلائل پیش کرتے ہیں' وہ مخدوش اور ضعیف اور بالکل کمزور ہیں جس کا اُن میں سے بعض علماء کو اعتراف ہے۔ چنانچہ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وان کان فی کل طریق من طرق هذه الاحادیث مقال بعضها یقویٰ بعضا "یعنی اگرچہ ان احادیث کی سندوں میں سے ہر سند میں کلام جرح ہے لیکن بعض کو بعض تقویت دیتی ہیں۔"

میں کہتا ہوں کہ سب سندوں کا ضعیف ہونا تو مسلم ہے۔ اب رہا ایک کا دوسری سے سہارا لینا تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ قاعدہ یہ ہے: ان لحوق الضعیف بالضعیف لا یفید قوة "یعنی ضعیف کا ضعیف سے ملانا قوت کو مفید نہیں ہے۔" اور جہاں سندوں میں معمولی ضعف ہوتا ہے وہ ایک دوسری سے مل کر قوت حاصل کر لیں تو وہ مجموعہ داخل حسن لغیرہ میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں بغیر کسی معارضہ کے تو وہ حجت ہوتی ہے لیکن صحیح یا اصح حدیث سے تعارض ہو تو حجت نہیں ہے' احادیث مانعین کی پیش کردہ اسی قسم کی ہیں۔

تحفۃ الاحوذی جلد۔۳' ص۔۱۴۹ میں ہے: قلت الروایات التی تدل علی منع اخذ الاجرة علی تعلیم القرآن ضعاف لا تصلح للاحتجاج ولو سلم انها لمجموعها تنتهض للاحتجاج فالاحادیث التی تدل علی الجواز اصح و اقویٰ "یعنی جو روایات تعلیم قرآن کی اجرت منع ہونے پر دال ہیں' وہ سب ضعیف ہیں جو لائق استدلال نہیں ہیں اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ان کا مجموعہ حجت کے لائق ہے تو پھر وہ احادیث جو جواز پر دلالت کرتی ہیں' وہ ان سے زیادہ صحیح اور بہت قوی ہیں۔" (اس لیے وہ مقدم ہیں)

فتح الباری میں ناقد فن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ پر بحث کرتے ہوئے

یہ فرمایا ہے : وبان الاحادیث المذکورۃ ایضا لیس فیہ ما تقوم بہ الحجۃ فلا تعارض الاحادیث الصحیحۃ (کتاب الاجارہ جزء رابع' ص-۳۰۴ مطبوعہ مصر) "یعنی احادیث منع اجرت کی دلیل پکڑنے کے قابل نہیں ہیں اور وہ احادیث صحیحہ جواز اجرت کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں۔"

تو یہ اجمالی جواب تھا' اب تفصیلی سنئے۔

(ا) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے' "وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو قرآن کی تعلیم دی' اس نے ہدیہ کے طور پر میرے پاس تیر کمان بھیجا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ کوئی مال تو ہے نہیں' چلو اللہ کے راستہ میں اس تیر کمان سے جہاد کروں گا مگر جب حضور رسول مقبول کے پاس آیا اور سارا واقعہ سنایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم آگ کا طوق پہننا پسند کرتے ہو تو اسے قبول کر لو۔"

اس حدیث پر دو طرح کی بحث ہے۔ اول روایت اور سند کے لحاظ سے' دوم درائت اور مطلب کے لحاظ سے۔ سند کے لحاظ سے تو یہ روایت ضعیف ہے۔ چنانچہ بعض حضرات نے اس حدیث کو صحیح ثابت کرنے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے ابوداؤد سے دو سندیں ذکر کی ہیں' ایک میں دو راوی ضعیف ہیں۔ ایک مغیرہ بن زیاد ہے جس کے متعلق نیل الاوطار جلد-۵' ص-۲۸۷ میں ہے : وتکلم فیہ جماعۃ وقال الامام احمد ضعیف الحدیث حدث باحادیث مناکیر وکل حدیث رفعہ فھو منکر وقال ابو زرعۃ الرازی لا یحتج بحدیثہ "یعنی مغیرہ پر ایک جماعت محدثین نے جرح کی ہے اور امام احمد نے اس کو ضعیف الحدیث قرار دیا ہے اور فرماتے تھے کہ یہ منکر احادیث بیان کرتا تھا پس ہر وہ حدیث جس کو یہ مرفوع بیان کرے وہ منکر ہے (حدیث عبادہ مرفوع بیان کی ہے لہٰذا منکر ہے) اور امام ابو زرعہ رازی نے فرمایا کہ اس کی بیان کردہ حدیث سے دلیل نہیں پکڑی جائے گی۔"

تنقیح الرواۃ تخریج مشکوٰۃ میں امام حاکم سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے مغیرہ کو متہم قرار دیا ہے کہ وہ عبادہ سے موضوع حدیث بیان کرتا تھا اور تقریب میں اس کو وہمی قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ راوی ضعیف ہوا۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ وکیع نے اس کو ثقہ کہا ہے تو اس سے معتبر اور مقبول ہونا ثابت نہ ہو گا کیونکہ اصول کے لحاظ سے جرح تعدیل پر مقدم ہے' اسے پیش نظر رکھا جائے۔

دوسرا راوی اس سند میں اسود بن ثعلبہ ہے' ان کی بابت محلّی ابن حزم جلد۔۸' ص۔۱۹۵ میں ہے : وهو مجهول لا يدرٰى قاله علي بن المديني "یعنی اسود کو مجہول علی بن مدینی وغیرہ ائمہ نے کہا ہے کہ اس کا حال معلوم نہیں۔" اور مجہول راوی کی حدیث ضعیف شمار ہوتی ہے۔ حافظ ابن حجر نے بھی تقریب میں اسود بن ثعلبہ کندی کو مجهول من الثالث لکھا ہے۔ جب دو راوی ایک سند میں ضعیف ہوئے تو یہ روایت ضعیف ثابت ہو گئی۔

(۲) دوسری دلیل حدیث ابوداؤد ہے جس میں قوس کا ذکر ہے' اس کی بابت امام بیہقی فرماتے ہیں : وروی عن وجه اخر ضعيف عن ابی الدرداء "یعنی ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے بھی ایک طریق ضعیف مروی ہے۔" پھر ح ہیں : حديث ابی الدرداء عن النبی صلی اللہ علیه وسلم من تقلد قوسا علی تعلیم القرآن لیس له اصل "یعنی حدیث ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی گئی ہے جس میں قرآن پر قوس لینے کا ذکر ہے اس کا کوئی اصل نہیں ہے۔"

(۳) تیسری حدیث اُبی (بن کعب رضی اللہ عنہ) ہے' جس کے متعلق محلّی جز۔۸' ص۔۱۹۵ میں ہے کہ اس کی سند میں ابو ادریس خولانی ہے جو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو قوس دینے کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ طریق منقطع ہے کیونکہ ابو ادریس کا ابی رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ ابی رضی اللہ عنہ کا ایک اور طریق ہے جس کے متعلق نیل الاوطار جلد۔۵' ص۔۲۸۷ مصری میں ہے کہ حدیث ابی رضی اللہ عنہ کو بیہقی نے روٗیانی سے مسند میں روایت کیا ہے۔ اس کے متعلق بیہقی اور حافظ ابن البر نے لکھا ہے کہ یہ منقطع ہے۔ اس میں عطیہ کلامی اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے۔

اسی طرح علامہ مزی نے کہا ہے' پھر اسی طریق میں عبدالرحمٰن بن مسلم، عطیہ راوی ہے' اس کی بابت یہ لکھا ہے : واعله ابن القطان بحال عبدالرحمٰن بن مسلم الراوی عن عطية "یعنی ابن القطان نے عبدالرحمٰن کے حال کی وجہ سے اس روایت کو معلول قرار دیا ہے۔" پھر لکھا ہے کہ ابی رضی اللہ عنہ کی حدیث کے اور بھی کئی طریق ہیں۔ لیکن ابن القطان نے کہا ہے : لا يثبت منها شئی "یعنی ان میں کوئی بھی ثابت نہیں۔" پھر امام ابن حزم نے ابی رضی اللہ عنہ کا ایک اور طریق ذکر کیا ہے جس میں ذکر ہے کہ اگر تجھے قرآن پڑھا کر کوئی تحفہ دے تو اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔

اس میں ابی رضی اللہ عنہ سے علی بن رباح راوی ہے' یہ بھی منقطع ہے۔ کیونکہ علی نے ابی رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا۔ نیل میں حافظ نے اور طریق بھی بتلائے ہیں لیکن کسی کو توثیق نہیں بتلائی اور یہ سب طبقہ ثالثہ کی کتابیں ہیں جب تک ان کی اسناد سامنے نہ ہوں کبھی تسلیم نہیں کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ عجالہ نافعہ ص ۔ ے میں ہے کہ اس طبقہ کی کتابوں میں ضعیف روایات بلکہ متہم بالوضع ہیں جن کے راوی مستور اور مجہول ہیں۔

نیز لکھا ہے : واکثر آن احادیث معمول بہ نزد فقہاء نشدہ اند بلکہ اجماع بر خلاف آنہا منعقد گشتہ "یعنی اس طبقہ کی روایتیں اکثر معمول بہ نہیں ہیں اور اجماع ان کے خلاف منعقد ہے۔" پھر اس طبقہ میں دار قطنی' مستدرک حاکم اور طبرانی' کتب بیہقی اور کتب طحاوی وغیرہ کا شمار کیا ہے۔

(۴) چہارم حدیث عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی ہے جس میں ذکر ہے کہ ایسی قومیں ظاہر ہوں گی جو قرآن پڑھ کر لوگوں سے بھیک مانگیں گی۔ اس کو امام ترمذی نے بیان کر کے آخر میں کہا ہے لیس اسنادہ بذاک "یعنی اس کی اسناد صحیح نہیں ہے۔" پھر یہ حدیث حسن ہو یا ضعیف اس کو مسئلہ مابہ النزاع سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

نیل الاوطار میں ہے : واما حدیث عمران بن حصین فلیس فیہ الا تحریم السئول بالقرن وھو غیر اتخاذ الاجر علی تعلیم "یعنی عمران رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تحریم سوال بالقرآن کا ذکر ہے اس کو تعلیم کی اجرت نہیں کہتے۔" بہرکیف اس مسئلہ کے بارہ میں جس قدر روایات ہیں وہ سب سخت ضعیف ہیں۔ عبادہ کا ایک طریق محلّٰی میں اسماعیل بن عیاش کا مذکور ہے جس کے متعلق محلّٰی میں ہے کہ اسماعیل ضعیف ہے پھر یہ طریق منقطع ہے۔ اسی طرح ابوداؤد کا ایک طریق دارمی میں ہے جو طبقہ ثالثہ کی کتاب ہے۔ اس کی بابت تنقیح الرواۃ میں ہے : قال رحیم حدیث ابی الدرداء ھذا لیس لہ اصل۔ کہ اس روایت کا کوئی اصل نہیں ہے۔

اس لیے علامہ شوکانی نے کہا ہے کہ اس بارہ میں جس قدر روایات ہیں سب میں جرح ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی سب کو ضعیف قرار دیا ہے جیسا کہ فتح الباری میں گذر چکا ہے۔ مدعی نے تو اپنے دعویٰ کا دارومدار حدیث عبادہ پر رکھا ہے جس کی تلخیص کی کتاب التفقات میں حافظ نے تضعیف کردی ہے۔

(۵) پھر یہ لوگ حدیث عثمان بن عاص رضی اللہ عنہ والی پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اُن کو مزدوری پر مؤذن رکھنے سے منع فرمایا ہے' اس کو مسئلہ مابہ النزاع سے تعلق نہیں ہے۔ نیل میں ہے : فالقیاس علیه فاسد الاعتبار "کہ تعلیم کی اجرت کو اس پر قیاس کرنا فاسد ہے۔"

میں کہتا ہوں امام بیہقی نے باب رزق المؤذن باندھ کر اس کا جواز ثابت کیا ہے۔ نیز امام بیہقی نے فرمایا ہے : قد ارزق المؤذنین امام هدی عثمان بن عفان "یعنی امام ہدایت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مؤذنوں کو وظیفہ دیا کرتے تھے۔" پھر لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو اذان کے بعد ایک ہمیانی دی تھی جس میں چاندی کا مال تھا۔ امام ابن حبان نے "اپنی صحیح" میں باب باندھا ہے کہ مؤذن کو اجرت لینے کی رخصت ہے پھر حدیث ابو محذورہ رضی اللہ عنہ اس کے تحت ذکر کر کے اس کا جواز ثابت کیا ہے۔

علامہ شبلی نے الفاروق ص-۹۵ میں علامہ ابن الجوزی کی سیرۃ العمرین سے نقل کیا ہے : ان عمر بن الخطاب وعثمان بن عفان کانا یرزقان المؤذنین والائمة "یعنی حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما مؤذنوں اور اماماں مساجد کو وظیفہ دیا کرتے تھے۔"

جب خلفاء کا تعامل ہوا اور اس پر کسی نے انکار نہیں کیا تو یہ اجماع سکوتی ہو گیا جو بالاتفاق حجت ہے۔ لہٰذا حدیث منع اجرت کی معنی تنزیہہ پر محمول ہو گی کہ قربت اور ایسی طاعت پر اجرت بہتر نہیں ہے لیکن معاش کی کوئی اور صورت نہ ہو تو ضرورت سے جائز ہے' حرمت کی کوئی قطعی دلیل موجود نہیں ہے۔

<u>صورت تطبیق</u> : دلائل جواز اجرت اور دلائل منع اجرت پر سیر حاصل بحث کر چکنے کے بعد اگر بنظر انصاف کوئی تطبیق ممکن ہو تو اس پر بھی پورا پورا غور و خوض کر لینا چاہیے۔ علامہ ابن کثیر نے ایک تطبیق یوں ذکر فرمائی ہے۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر جلد-۱' ص-۱۸۱ میں ہے :

فان صح اسناده فهو محمول عند کثیر من العلماء منهم ابو عمر ابن عبدالله علی انه لما علمه لِلّٰه لم یجز بعد هذا ان یعتاض عن ثواب الله بذالک القوس فاما اذا کان من اول الامر علی التعلیم بالاجرة فانه یصح کما فی حدیث اللدیغ وحدیث سهل فی المخطوبة۔ "یعنی اگر حدیث عبادہ اور حدیث ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کی اسناد

صحیح ثابت ہو جائے تو اکثر علماء کے نزدیک جن میں ایک ابو عمر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ ہیں اس صورت پر محمول ہیں کہ جب کسی شخص نے محض رضائے الٰہی کے لیے تعلیم دی ہو تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ بعد اس کے کسی متعلم سے اس ثواب الٰہی کے عوض میں کمان وغیرہ کوئی چیز لے لیکن جب شروع ہی سے اجرت پر تعلیم دینا مقرر کر لیا جائے تو یہ صحیح ہے جبکہ حدیث لدیغ (جو سانپ کے مریض پر دم جھاڑا کرنے کے بارہ میں ہے) اور حدیث سہل (جو تعلیم قرآن کے عوض عورت سے نکاح کرنے کے بارہ میں ہے) ہر دو سے ثابت ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ احادیث منع اجرت احوال محتملہ کے احوال واقعات پر دال ہیں جن سے علی الاطلاق اجرت تعلیم کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی۔ چنانچہ فتح الباری میں علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان الاحادیث لیس فیها تصریح بالمنع علی الاطلاق بل هی وقائع احوال محتملة للتاویل متوافق الاحادیث الصحیحة "یعنی عبادہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کی احادیث میں اجرت کی مطلق ممانعت کی صراحت نہیں ہے وہ خاص احوال کے واقعات ہیں جو تاویل کا احتمال رکھتے ہیں ان میں تاویل کرنی پڑے گی' تاکہ صحیح احادیث کے ساتھ وہ موافق ہو جائیں۔"

نیل الاوطار میں ایک احتمال یہ لکھا ہے: ان النبی صلی اللہ علیه وسلم علم انهما فعلا ذالک خالصا للّٰہ فکرہ اخذ العوض عنه "یعنی عبادہ اور ابی (رضی اللہ عنہما) کا حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم کر لیا تھا کہ انہوں نے یہ کام خالص لوجہ اللہ کیا ہے پس اب اس کا بدلہ لینا مکروہ ہے (اس لیے ان کو منع کر دیا تھا۔" پس اب بھی یہی صورت مراد رکھیں کہ جو اس طرح تعلیم دے کر کسی سے عوض لے تو اس کو منع کر دیں۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ حدیث عبادہ اور حدیث ابی رضی اللہ عنہما میں پہلے اجرت مقرر کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ صرف یہ ذکر ہے کہ ایک شخص کو قرآن پڑھایا تھا اس نے عبادہ رضی اللہ عنہ کو ایک کمان ہدیہ بھیجی تھی جس کے لینے سے ممانعت کر دی۔ سو ہدیہ اور چیز ہے اور اجرت مترر کرنا اور چیز ہے اور شروع سے بغیر اجرت مقرر کئے محض فی سبیل اللہ پڑھانا اور چیز ہے اور شروع سے کسی سے اجرت مقرر کر کے اس کو تعلیم دینا اور چیز ہے۔ کسی کو حصول ثواب کی نیت سے تعلیم دے کر پھر اس کا عوض لینا اور چیز ہے اور شروع سے اجرت پر تعلیم دینا اور چیز ہے۔ ان سب امور میں تفاوت ظاہر ہے۔

ہمارے دلائل سے شروع میں اجرت مقرر کر کے لینے کا جواز ثابت ہوتا ہے اور احادیث منع سے فی سبیل اللہ تعلیم دے کر پھر اس تعلیم کے سبب سے ہدیہ لینا ممنوع ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا مطابقت دلائل فریقین میں صاف ظاہر ہے اور سب احادیث اپنے اپنے موقعہ کی ہیں جن میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ پس نزاع رفع ہوا جو تطبیق بعض مانعین اجرت بیان کرتے ہیں کہ دلائل جواز سے دم جھاڑا کرنے پر اجرت لینا جائز ہے اور دلائل منع اجرت سے تعلیم قرآن پر اجرت لینا منع ہے۔ یہ مطابقت غلط اور باطل ہے کیونکہ ایک تو یہ تطبیق نص حدیث کے خلاف ہے۔ حدیث میں صاف تصریح ہے: ان احق ما اخذتم علیه اجرا کتاب اللہ "یعنی جس پر تم اپنے معاملات میں مزدوری لیتے ہو اس سے اللہ تعالیٰ کی کتاب مزدوری لینے کی زیادہ حقدار ہے۔

دوم حدیث سہل میں تعلیم قرآن کو مہر بنا کر نکاح اس کے عوض جائز رکھا گیا ہے جس سے دَم جھاڑا کی خصوصیت نہ رہی۔

سوم اکثر علماء اور جمہور علماء کی مطابقت کے خلاف ہے' لہٰذا ہماری تطبیق صحیح اور درست ہے۔

<u>صورت ترجیح:</u> اگر کوئی تطبیق قابل تسلیم اور مقبول نہ ہو گی تو پھر صورت ترجیح قائم ہو جائے گی' اس صورت میں بھی .بفضلہ تعالیٰ ہم کو کامیابی ہے۔ ہمارے دلائل جواز اجرت مانعین کے دلائل سے راجح ہیں اور ان کے مرجوح ہیں۔ چنانچہ وجوہات حسب ذیل ہیں۔

(۱) موجبات ترجیح میں چالیسویں صورت ترجیح یہ ہے کہ صحیحین کی احادیث دیگر کتب کی احادیث پر راجح اور مقدم ہیں۔ ہمارے دلائل صحیحین کی احادیث ہیں اس لیے راجح ہیں۔

(۲) روائت اوثق راویوں کی ثقہ پر مشتمل راویوں سے راجح ہے۔ (حصول المامول) ہماری پیش کردہ احادیث کے راوی صحیحین کے ہیں جو سب اوثق ہیں اور مانعین کے دلائل میں راوی متکلم فیہ ہیں' کما تقدم سابقًا۔

(۳) جن احادیث پر خلفاء راشدین نے عمل کیا ہو وہ ان احادیث پر مقدم ہیں جن پر خلفاء نے عمل نہیں کیا ہے۔ ہماری پیش کردہ احادیث پر خلفاء نے عمل کیا ہے چنانچہ محلّی جلد ۸' ص۔ ۱۹۰ میں ہے کہ مدینہ شریف میں تین معلم تھے جو بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہر ایک مدرس کو پندرہ درہم یا دینار ہر ماہ دیا کرتے تھے۔ جب حضرت عمر

رضی اللہ عنہ یہ کام کرتے تھے تو حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما جو اُن کے عہد میں موجود تھے انہوں نے اس سے انکار نہیں کیا تو ہر سہ حضرات کا اجتماعی حکم پایا گیا اور اجماع سکوتی ہو گیا کیونکہ کسی خلیفہ یا صحابی کا انکار ثابت نہیں ہے۔ پہلے یہ گذر چکا ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما مؤذنوں اور اماان مساجد کو وظیفہ دیا کرتے تھے۔ (بیہقی' الفاروق)

(۴) موجبات ترجیح سے ایک موجب یہ ہے کہ اکثر علماء دین اور جمہور کا اس پر عمل پایا جائے۔ حجتہ اللہ البالغہ مصری ص-۱۱۱ باب القضاء فی الاحادیث المختلفه میں شاہ صاحب فرماتے ہیں : او من خارج من کونه متمسکا اکثر اهل العلم اخذ بالراجح "یعنی یا خارجی وجہ ترجیح کی ہو جیسے اکثر اہل علم کا اس حدیث سے تمسک کرنا کہ یہ وجہ خارجی ترجیح کی ہے۔" پس راجح کو لیا جائے گا۔

تفسیر خازن جلد-۲' ص-۲۴۴ میں ہے کہ مصارف زکوٰۃ کا ایک مصرف فی سبیل اللہ ہے جس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ عام ہے۔ دوم یہ کہ اس سے مراد غازی ہیں۔ دوسرے کی بابت خازن میں ہے : والقول الاول هو الصحیح لاجماع الجمهور علیه "یعنی پہلا قول صحیح ہے کیونکہ اس پر جمہور کا اجماع ہے۔"

ہمارے دلائل سے جمہور نے استدلال کیا ہے چنانچہ تحفتہ الاحوذی میں حافظ ابن حجر سے نقل کیا گیا ہے : قال الحافظ استدل به الجمهور فی جواز اخذ الاجرة علی تعلیم القرآن وخالفه الحنفیة "یعنی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جمہور نے استدلال کیا ہے کہ تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز ہے اور حنفیہ نے مخالفت کی ہے۔"

مسلم کی شرح نووی میں ہے : ونقل القاضی عیاض جواز الاستیجار لتعلیم القرآن عن العلماء کافة سوی ابی حنیفة "یعنی قاضی عیاض نے نقل کیا ہے کہ تمام علماء قرآن کی تعلیم پر اجرت لینا جائز کہتے ہیں سوائے ابو حنیفہ کے کہ وہ منع کرتے ہیں۔"

جواز اجرت کے قائلین کی اس قدر اکثریت ہے کہ وہ کل کا حکم رکھتے ہیں اور کوئی شاذ ونادر مانع ہے جو کالعدم ہے۔ اس لیے محلّی میں حکم بن عیینہ سے منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں : ما علمت احد اکره اجر المعلم "یعنی مجھے کوئی معلوم نہیں ہوا جو تعلیم دینے والے کی اجرت کو مکروہ کہتا ہو۔"

تاویل حدیث: بعض لوگ احادیث جواز اجرت کی تاویلات کر کے احادیث منع کو ترجیح دیتے ہیں جو غلط ہے۔ کیونکہ تاویل کمزور جانب کی ہوتی ہے نہ کہ قوی اور اصح کی تاویل کی جاتی ہے۔ پھر یہاں تمام تاویلیں غیر مناسب ہیں مثلاً تعلیق صبیح میں مولانا محمد ادریس کاندھلوی حنفی نے یہ لکھا ہے کہ قلنا اراد به اجر الاخرة یعنی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ میں احق ما اخذتم علیه اجرا کتاب اللّٰہ سے اجر آخرت مراد ہے۔ یہ تاویل بالکل مردود اور باطل ہے کیونکہ عبارت حدیث کے سیاق وسباق کے سراسر خلاف ہے' مورد کے خلاف ہے۔

واقعہ پر غور فرمایئے کہ بکریاں مزدوری میں لی گئی ہیں' ان کے لینے کے جواز اور عدم جواز پر صحابہ میں اختلاف ہوا' دربار رسالت میں اس نزاع کا فیصلہ کرایا گیا' آنحضور ﷺ نے ان کو حلال قرار دے کر اپنا حصہ ٹھہرایا۔ اگر جواب اجر آخرت کا ہو تو سائلین کے سوال کا جواب کہاں گیا؟ اور اس حاصل کردہ اجرت کا حکم کہاں سے ظاہر ہوا؟ یہ تو سوال از آسماں جواب از ریسماں کی مثل ہوا' جو شان نبوت کے خلاف ہے۔

نیز اگر اجر آخرت مراد ہے تو صحابہ کا مزدوری میں بکریاں لینا حرام ہوا کیونکہ یہ اجر دنیا ہے' پھر صحابہ نے اس کو آپس میں کیوں تقسیم کیا؟ آنحضور ﷺ نے اُن میں اپنا حصہ کیوں ٹھہرایا؟

اول' یہ تاویل کہ اجر سے اجر رقیہ مراد ہے نہ کہ اجر تعلیم' اس کا جواب بھی پہلے ہو چکا ہے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہے۔

دوم' حدیث سہل رضی اللہ عنہ سے یہ تاویل باطل ہو جاتی ہے' دیگر یہ تاویل کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ عام ہے اور حدیث عبادہ وغیرہ خاص ہے' عام اور خاص کا مقابلہ ہو تو عام کی تخصیص کی جائے گی۔ یہ تاویل بھی مردود ہے کیونکہ عام اور خاص کا مقابلہ اس وقت صحیح ہو گا جس میں تخصیص کرنی پڑے' جس وقت دونوں یکساں قوی ہوں اگر خاص بہ نسبت عام ضعیف اور کمزور ہو تو مخصص عام نہیں بن سکتا۔ جب دس مردے ایک زندہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور دس بیمار ایک صحیح سالم قوی شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو چند ضعیف روایتیں دو تین اصح اور اقوی احادیث کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہیں۔ نیز حدیث نکاح بعوض تعلیم قرآن اس تخصیص کا مبطل ہے۔

سوم' تعامل جمہور اس تاویل کو رد کرتا ہے۔

چہارم' تعامل خلفاء بھی اس تاویل کو باطل کرنے والا ہے لہٰذا احادیث منع کو کسی صورت ترجیح نہیں ہو سکتی۔

اہل حدیث کا مذہب: اجرت تعلیم قرآن وحدیث پر لینا مذہب اہلحدیث میں جائز ہے۔ فتاویٰ نذیریہ جلد دوم میں اس کی تفصیل موجود ہے جو شیخ الحدیث مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی مرحوم کا مشہور فتاویٰ ہے اور اہل حدیث میں مسلم ہے۔ علاوہ ازیں فقہ محمدیہ وطریقہ احمدیہ حصہ چہارم باب اجارہ ص-۶۵ میں ہے : "اور جائز ہے مزدوری لینا قرآن مجید کی تعلیم اور پڑھانے پر برابر ہے کہ سیکھنے والا قرآن کا چھوٹا ہو یا بڑا اور اگرچہ اپنی تعلیم کو یک تعلیم پانے والے پر متعین کرے اور یہی مذہب ہے اکثر علماء کا اور حدیث عبادہ کی جس سے قرآن کی اجرت کا حرام ہونا معلوم ہوتا ہے ضعیف ہے پس یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو معارض نہ ہو گی الخ" یہی ائمہ اہل حدیث اور اکثر سلف وخلف کا مذہب ہے۔

چنانچہ امام نووی شرح مسلم میں اجرت تعلیم کے مسئلہ پر فرماتے ہیں : هذا مذهب الشافعي ومالك واحمد واسحاق وابي ثور وآخرين من السلف ومن بعدهم ومنعها ابو حنيفة "یعنی یہ مذہب امام شافعیؒ' امام مالک' امام احمدؒ' امام اسحاقؒ' امام ابوثور اور دیگر سلف اور خلف کا ہے اور امام ابوحنیفہ نے اس کو منع کیا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو خود حنفیہ نے بھی چھوڑ دیا ہے اور ائمہ اہل حدیث کی طرف رجوع کر لیا ہے۔ حاشیہ مشکوۃ میں لمعات سے منقول ہے : والمشهور من مذهب ابي حنيفة الحرمة والكراهة ورخص فيه المتاخرون "یعنی ابوحنیفہ کا مشہور مذہب منع اجرت کا ہے لیکن متاخرین حنفیہ نے رخصت دے دی ہے۔"

عرف الشذی علی جامع الترمذی ص-۴۵۵ میں ہے : لا يجوز اخذ الاجرة على تعليم القرآن عند ابي حنيفة وجوزه المشائخ "یعنی تعلیم قرآن پر اجرت لینا ابوحنیفہ کے نزدیک ناجائز ہے اور مشائخ حنفیہ نے اس کو جائز کہا ہے۔" پھر انور شاہ نے شاہ عبدالعزیز صاحب کی تفسیر سے نقل کیا ہے کہ "اگر ختم بخاری اور قرآن کا حاجت دینی کے لیے ہو تو اجرت جائز نہیں ہے اور اگر امر دنیوی کے لیے مکان اور زمان کی قید لگا کر ہو تو اجرت جائز ہے۔"

بہرکیف ہیر پھیر کر کے حنفیہ کے علماء بھی اہل حدیث کے ساتھ اس مسئلہ میں متفق ہو

گئے ہیں۔ عون المعبود جلد۔۳' ص۔۳۷۶ میں ہے کہ علماء محدثین نے حدیث عبادہ رضی اللہ عنہ کی یہ تفسیر کی ہے کہ انہوں نے کسی متعلم کو تبرعاً تعلیم دی تھی اور نیت محض ثواب حاصل کرنے کی تھی اور وقت تعلیم کے عوض اور نفع کا بالکل ارادہ نہ تھا اس لیے اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈرایا اور وعید سنائی کہ اب اس کا عوض لیا تو اجر باطل ہو جائے گا اور سزا ملے گی اور اس کی نظیر مسائل شرعیہ میں یہ مسئلہ ہے کہ کسی شخص نے کسی کی گم کردہ چیز یا حیوان گم شدہ واپس کر دیا یا دریا وغیرہ میں سامان غرق شدہ نکال دیا اور یہ کام تبرعاً اور ثواب حاصل کرنے کی نیت سے کیا تو اب اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس سے کوئی عوض اور مزدوری طلب کرے یا وہ دے تو یہ اس سے لے لے اور اگر اس نے پہلے سے ہی اجرت مقرر کر کے یہ کام کیا تو یہ جائز ہے۔

بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ تعلیم قرآن پر اجرت لینے کے کئی حالات ہیں۔ جب کسی جگہ مسلمانوں میں ایک ہی شخص عالم و معلم ہے اور اس کے سوا کوئی تعلیم یافتہ شخص موجود نہیں ہے اور وہاں تعلیم قرآن وحدیث کی دینی ضروری ہے تو پھر دریں حالات اس عالم کو مزدوری لینی جائز نہیں ہے کیونکہ خاص اس کے ذمہ یہ فرض ٹھہر گیا ہے جس کی اجرت نامناسب ہے اور اگر دیگر علماء بھی موجود ہیں تو پھر کوئی عالم مزدوری پر تعلیم قرآن دے تو یہ جائز ہے کیونکہ اس صورت میں خاص اس کے ذمہ یہ فرض متعین نہیں ہے۔ اہل صفہ فقراء لوگ تھے جو لوگوں کے صدقہ خیرات پر گذران کرتے تھے' اس لیے ان سے اجرت لینی مکروہ قرار دی گئی بلکہ ان کو کچھ نہ کچھ مستحق ٹھہرایا گیا تھا' انتہی

عون المعبود' تفسیر ابن کثیر جلد اول' ص۔۱۵۱ مصری میں ہے : ''اجرت پر علم پڑھانے کا حکم یہ ہے کہ اگر کسی کے ذمہ علم پڑھانا فرض ہو اور اس پر متعین ہو جائے تو پھر اس کو اجرت لینا جائز نہیں ہے (اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ اس جگہ سوائے اس کے کوئی دیگر خواندہ شخص نہ ہو) ہاں اس کے لیے یہ جائز ہے کہ بیت المال سے اس قدر خرچ حاصل کرے کہ اس کے اہل وعیال کی گذران ہو سکے اور اگر بیت المال سے کوئی چیز حاصل نہ ہو اور تعلیم کی مصروفیت اس کو دیگر کسب اور ذریعہ معاش سے مانع ہو جائے تو پھر وہ ایسا سمجھا جائے گا کہ گویا خاص تعلیم دینا اس کے ذمہ متعین نہیں۔ پس جب کسی کے ذمہ خاص تعین نہ ہو تو اس کو اجرت لینا جائز ہے۔ چنانچہ ائمہ' محدثین' امام شافعی' امام مالک' امام احمد اور

جمہور علماء کا یہی مذہب ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں حدیث ابو سعید رضی اللہ عنہ والی میں وارد ہے اور یہ فرمایا ہے : ان احق ما اخذتم علیه اجرا کتاب اللّٰہ اور قصہ مخطوبہ میں وارد ہے : زوجتکھا بما معک من القرآن انتھی مافی ابن کثیر"

فتح الباری اور تحفۃ الاحوذی میں بھی جمہور علماء کے مذہب کو ترجیح دی گئی ہے اور حدیث عبادہ رضی اللہ عنہ کی تضعیف و تاویل کی گئی ہے۔ پس خلاصہ کلام یہ ہے کہ اجرت تعلیم قرآن مطلقاً ممنوع نہیں ہے بلکہ عام طور پر جائز ہے اور کراہت اور ممانعت کی صورت خاص حالات میں ہے۔ وہ بھی اس بنا پر کہ حدیث عبادہ رضی اللہ عنہ کی صحت تسلیم کی جائے ورنہ حدیث عبادہ رضی اللہ عنہ کا ضعف واضح ہو چکا ہے جس سے استدلال جائز نہیں۔

عبدالقادر عارف حصاری

اہل حدیث سوہدرہ

جلد۔۸' شمارہ۔۴۴' ۴۵' ۴۶' ۴۷' ۴۸۔ مورخہ ۲۴ نومبر و یکم و ۸ و ۱۶ و ۲۴ دسمبر سنہ۔۱۹۵۶ء

تعلیم دینیات پر اُجرت

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس صورت میں کہ تعلیم دینیات وغیرہ علم قرآن و حدیث اور فقہ پر اجرت لینی حرام بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو ملاں مولوی تعلیم مذکورہ پر اجرت لیتا ہے' وہ حرام کھاتا ہے اور دلیل یہ فرمائی ہے جو کہ ابوداؤد میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے :

عن عبادہ بن الصامت قال قلت یارسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم رجل اھدیٰ الی قوسا ممن کنت اعلمه الکتاب والقرآن ولیست بمال فارمی علیھا فی سبیل اللّٰہ قال ان کنت تحب ان تطوق طوقا من النار فاقبلھا۔ (ابوداؤد۔ ابن ماجه)

اور بیہقی میں ہے :من اخذ قوسا علی تعلیم القرآن قلدہ اللّٰہ قوسا من نار۔

اب دریافت طلب سائل کی یہ ہے کہ تعلیم علم دینیات پر اجرت لینا حرام ہے یا حلال ہے اور اگر حلال ہو تو ان احادیث کا کیا جواب ہے؟ جواب سے تسلی فرمائیں۔

(سائل : کمال الدین مہاجر کرنالوی حالوارد ڈیرہ غازی خاں)

الجواب وهو الموفق للصواب

الحمد للّٰه رب العالمین○ والصلوٰة والسلام علیٰ سید المرسلین○ اما بعد فاقول وباللّٰہ التوفیق○

واضح ہو کہ مسئلہ مذکورہ بالا میں اہلحدیث اور حنفی حضرات کا اختلاف ہے۔ اہلحدیث اور جمہور علماء قرآن' حدیث اور دینیات کی تعلیم پر اجرت' مشاہرہ لینا جائز کہتے ہیں اور متقدمین احناف میں سے اس کو ناجائز کہتے ہیں اور متاخرین حنفیہ اہلحدیث کے ساتھ متفق ہو گئے ہیں۔ تفصیل اس کی فتاویٰ نذیریہ جلد دوم' کتاب الاجارہ میں ہے۔

اب تو مدت مدید سے اس کے جواز پر قریباً تمام امت محمدیہ کا اجماع ہو رہا ہے۔ عرب وعجم میں تمام مذاہب کے علماء تعلیم و تبلیغ بلکہ اذان اور امامت نماز پر تنخواہیں کھا رہے ہیں۔ کسی کی تنخواہ سرکاری بیت الاموال سے مقرر ہے اور کسی کی انجمن یا کسی جماعت کی طرف سے معین ہے۔ کسی کو کوئی ایک ہی شخص ملدار ماہوار تنخواہ دے رہا ہے۔

رمضان شریف میں نماز تراویح میں حفاظ قرآن مجید سناتے ہیں۔ جب اواخر رمضان میں ختم کرتے ہیں تو ان کو بہت کچھ دیا جاتا ہے۔ اہلحدیث اور حنفیہ کا اس پر عام طور پر تعامل موجود ہے' کوئی کسی کو حرام خور نہیں کہتا۔ اسی طرح مدارس عرب وعجم میں تعلیم و تبلیغ پر مشاہرے لئے جا رہے ہیں اور دیئے جا رہے ہیں۔ کسی عالم' محدث یا فقیہہ نے حرام کا فتویٰ دے کر اس کے انسداد کی کوشش نہیں کی۔

فرقہ ناجیہ' اہلحدیث کا تعامل بھی یہی چلا آرہا ہے بلکہ جماعت غرباء اہلحدیث جو گروہ ناجیہ سے تعلق رکھتے ہیں' بھی عمل درآمد کرتے چلے آرہے ہیں۔

اب مولوی صاحب مذکور کو کون سی وحی نازل ہو گئی' جس کی بنا پر وہ اس تمام سلسلہ کو حرام قرار دے رہے ہیں۔ نہ ان کو اتنی علمیت ہے کہ وہ تحقیق مسائل میں محدثین سابقین سے سبقت لے گئے ہوں اور نہ ان کا اتنا تقویٰ ہے کہ وہ ہر قسم کے مسائل مختلفہ میں احتیاط سے کام لے کر شبہات سے بچنے لگے ہوں۔

ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی شہرت کرانے کو تمام علماء دین کو حرام خور کہنے لگے ہوں ورنہ یہ مسئلہ قریباً اجماعی اور اتفاقی بن رہا ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ شاذ ہے۔

اس کی مختصر سی تحقیق سنئے! بلوغ المرام میں حدیث ہے : عن ابن عباس رضی اللّٰه

تعالٰی عنهما ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ان احق ما اخذتم علیه اجرا کتاب الله۔ (اخرجه البخاری) "یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تحقیق بہت ہی لائق چیز جس پر تم مزدوری حاصل کرو' اللہ کی کتاب ہے' تخریج کیا اس حدیث کو بخاری نے۔"

یہ حدیث نہایت درجہ کی صحیح ہے اور اس کتاب کی ہے جس کو کتاب اللہ کے بعد تمام روئے زمین کی کتابوں پر فوقیت حاصل ہے۔ لہٰذا یہ حدیث اس مسئلہ میں حجت قوی ہے کہ تعلیم قرآن وغیرہ پر اجرت لینی جائز ہے بلکہ اور ذریعہ سے اجرت لینے اور تنخواہ وغیرہ حاصل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تعلیم پر اجرت لینا زیادہ لائق ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم جلد-۲' ص-۲۲۴ میں فرماتے ہیں : هذا تصریح بجواز اخذ الاجرة علی الرقیة بالفاتحة والذکر وانها حلال لا کراهیة فیها وکذا الاجرة علٰی تعلیم القرآن وهذا مذهب الشافعی ومالک واحمد واسحاق وابی ثور وآخرین من السلف ومن بعلهم ومنعها ابو حنیفة فی تعلیم القرآن واجازها فی الرقیة "یعنی اس حدیث میں صاف صراحت ہے کہ فاتحہ اور ذکر الٰہی سے دم جھاڑا کر کے اجرت لینا جائز ہے اور وہ حلال ہے جس میں کوئی کراہت نہیں ہے اور اس طرح تعلیم قرآن پر اجرت لینا حلال ہے۔ یہی مذہب ائمہ دین' شافعی' مالک' احمد' اسحاق' ابو ثور اور دیگر علماء سلف وخلف کا ہے اور امام ابوحنیفہ تعلیم قرآن پر اجرت سے منع کرتے ہیں اور دم جھاڑا پر جائز کہتے ہیں۔"

اس تصریح سے واضح ہوا کہ اہل حق کا سواد اعظم اس اجرت کے جواز کا قائل ہے۔

رئیس المحققین علامہ ابن حزم محلّٰی جلد-۸' ص-۱۹۳ میں فرماتے ہیں : والاجارة جائزه علٰی تعلیم القرآن وعلٰی تعلیم العلم مشاهرة وجملة وکل ذالک جائزة وعلی الرقی وعلی نسخ المصاحف ونسخ کتب العلم لانه لم یات فی النهی عن ذالک نص بل قد جاءت الاباحة کما روینا من طریق البخاری الخ۔ "یعنی تعلیم قرآن اور دیگر علم کی تعلیم پر اُجرت لینی جائز ہے۔ ماہوار ہو' یا اکٹھی سب جائز ہے۔ نیز دم جھاڑا پر اور قرآن اور آسمانی کتابوں اور دیگر علم حدیث کی کتابوں کی کتابت پر مزدوری لینا بھی درست ہے۔ کیونکہ اس سے ممانعت کی کوئی دلیل شریعت میں نہیں آئی۔ (تو اصل اشیاء میں اباحت ہے) بلکہ اس کے درست ہونے کے متعلق بخاری کی حدیث ہے جس کو ہم نے روایت کیا ہے۔"

پھر علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث بخاری کو بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ نقل کر کے اس سے استدلال کیا ہے پھر دوسری دلیل یہ پیش کی ہے : والخبر المشھور ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زوج امراۃ من رجل بما معہ من القران ای یعلمھا ایاہ "یعنی یہ حدیث مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیم کے عوض میں ایک مرد سے ایک عورت کا نکاح کر دیا تھا۔"

میں کہتا ہوں کہ مسلم کے باب "الصداق وجواز النکاح علی تعلیم القرآن" میں وہ احادیث جن میں تعلیم قرآن کے عوض عورت کے نکاح کر دینے کا ذکر ہے' وارد ہیں۔ ان میں یہ الفاظ موجود ہیں : فقد زوجتکھا فعلمھا من القرآن "کہ تجھے یہ عورت نکاح کر دی تو اسے قرآن کی تعلیم دے۔"

نیز یہ الفاظ ہیں کہ فقد ملکتکھا بما معک من القرآن "کہ اس عورت کو اس قرآن کی تعلیم کے عوض تیرے ملک کیا جو تجھ کو یاد ہے۔"

ابوداؤد میں یہ الفاظ ہیں : علمھا عشرین ایۃ وھی امرأتک "کہ تو اس کو بیس آیات پڑھا دے' یہ تیری عورت ہے۔"

اب مولوی صاحب سے دریافت کریں کہ یہ نکاح ہو گیا تھا کہ نہیں؟ اور ان زوجین نے اس پر عمل کیا تھا یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو مدعی ہمارا ثابت ہوا کہ تعلیم قرآن پر اجرت لینی اور عورت سے نکاح کرنا اور دیگر منافع حاصل کرنے جائز ہیں۔ اور اگر یہ نکاح ناجائز ہے۔ کیونکہ اجرت اور مہر ناجائز چیز کا باندھ دیا گیا تو پھر یہ اللہ کے رسول اور اس کی شریعت پر حملہ ہے اور مولوی صاحب کے نزدیک سب ہی حرام کار بنتے ہیں۔ تو پھر ان کو اسلام کا دعویٰ چھوڑ دینا چاہیے اور کوئی مذہب پسند کر لینا چاہیے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

اب اس حدیث پر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان سنئے! وہ فرماتے ہیں کہ وفی ھذا الحدیث دلیل لجواز کون الصداق تعلیم القرآن وجواز الاستیجار لتعلیم القرآن وکلاھما جائز عند الشافعی وبہ قال عطاء والحسن بن صالح ومالک واسحاق وغیرھم ومنعہ جماعۃ منھم الزھری وابو حنیفۃ وھذا الحدیث مع الحدیث الصحیح "ان احق ما اخذتم علیہ اجرا کتاب اللہ" یرد ان قول من منع ذالک ونقل القاضی عیاض جواز الاستیجار لتعلیم القرآن عن العلماء کافۃ سوی ابی حنیفۃ انتھی (مسلم جلد اول'

ص-۴۵۸) "یعنی اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ تعلیم قرآن کا مہر ہونا جائز ہے اور تعلیم قرآن پر اجرت لینا بھی جائز ہے۔ امام شافعی اور عطاء اور حسن بن صلح اور امام مالک اور امام اسحاق وغیرہ کا یہی مذہب ہے۔ ایک شرذمہ قلیلہ اس سے روکتا ہے۔ جن میں سے زہری اور امام ابوحنیفہ ہیں۔ یہ حدیث بمع حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ مذکور منع کرنے والوں کی بات کو رد کرتی ہیں اور قاضی عیاض نے تو تعلیم قرآن پر اجرت لینا تمام علماء اسلام سے نقل کیا ہے' سوائے امام ابوحنیفہ کے۔"

محلّی ابن حزم میں ہے کہ عن الحکم بن عیینة قال ما علمت احدا کرہ اجرا لمعلمھم "کہ میں نے کسی اہل علم کو معلوم نہیں کیا جو مدرس کی تنخواہ کو مکروہ کہتا ہو۔"

نیز محلّی جلد-۸' ص-۱۹۰ میں ہے کہ عن الوضین بن عطاء قال کان بالمدینة ثلاثة معلمین یعلمون الصبیان فکان عمر بن الخطاب یرزق کل واحد خمسة عشر کل شھر "یعنی وضین بن عطاء سے روایت ہے کہ مدینہ میں تین معلم تھے جو بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہر ایک مدرس کو پندرہ (درہم یا دینار) ہر ماہ دیا کرتے تھے۔"

نیز لکھا ہے کہ وصح عن عطاء وابی قلابة اباحة اجر المعلم "یعنی حضرت عطاء اور ابو قلابہ سے بھی معلم کی اجرت جائز منقول ہے۔"

نیل الاوطار میں ہے کہ ذھب الجمھور الٰی انھا تحل الاجرة علٰی تعلیم القرأن "یعنی جمہور علماء اس طرف گئے ہیں کہ تعلیم قرآن پر مزدوری لینی حلال ہے۔"

تنقیح الرواة تخریج مشکٰوة میں ہے : استدل به الجمھور علٰی جواز اخذ الاجرة علٰی تعلیم القرأن "یعنی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جمہور علماء نے استدلال کیا ہے کہ تعلیم قرآن پر اجرت لینی روا ہے۔"

الغرض بخاری و مسلم کی صحیح احادیث سے تعلیم قرآن وغیرہ پر اجرت لینا جائز ثابت ہوا۔ چنانچہ الفاظ صاف ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کی کتاب سب سے زیادہ حق دار ہے کہ تم اس پر مزدوری حاصل کرو۔"

بخاری و مسلم صحیحین کہلاتی ہیں جو طبقہ اولیٰ کی کتابیں ہیں۔ ان کی احادیث سب کتابوں پر مقدم ہیں۔ ان کے خلاف اگر طبقہ ثانیہ (ابوداؤد' ترمذی' نسائی وغیرہ) یا طبقہ ثالثہ (سنن دارقطنی' بیہقی وغیرہ) کی احادیث آجائیں تو حتی الامکان ان کے درمیان تطبیق دی جائے گی

ورنہ توقف ہو گا۔

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ "صحیحین کی شان یہ ہے کہ تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ ان میں جو احادیث مرفوع متصل ہیں وہ سب یقیناً صحیح ہیں اور یہ دونوں کتابیں اپنے اپنے مضمون تک متواتر ہیں۔" (حجتہ اللہ البالغہ)

دیگر قاعدہ یہ ہے کہ احکام یعنی فرض' واجب' حلال' حرام میں صحیح حدیث قابل استدلال ہے اور ضعیف حدیث احکام میں حجت نہیں ہے' ہاں فضائل اعمال میں حجت ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم جلد اول' ص۔۲۱ کی شرح میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "ان کان یعرف ضعفه لم یحل له ان یحتج به فانهم متفقون علی انه لا یحتج بالضعیف فی الاحکام "یعنی روایت کا ضعیف اگر معلوم ہے تو اس سے حجت پکڑنا حلال نہیں ہے۔ کیونکہ اکثر ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ ضعیف حدیث احکام میں حجت نہیں ہے۔"

پس ان دو قاعدوں کو (ایک یہ کہ طبقہ اولیٰ کی احادیث دیگر طبقوں پر راجح ہیں۔ دوم ضعیف حدیث احکام میں حجت نہیں) ذہن نشین فرما کر اب تعلیم قرآن پر اجرت لینی حرام کہنے والوں کے دلائل کے جوابات سنئیے۔

ایک حدیث وہ ہے جو سائل نے لکھی ہے : عن عبادة بن الصامت قال قلت یارسول الله رجل اهدی الی قوسا ممن کنت اعلمه الکتاب والقرآن ولیست بمال فاومی علیها فی سبیل الله قال ان کنت تحب ان تطوق طوقا من نار فاقبلها۔ (رواه ابوداؤد' ابن ماجه) "یعنی عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ میں نے کہا کہ یارسول اللہ! ایک شخص نے ایک کمان ہدیہ بھیجی ہے اور یہ ان شخصوں میں سے ہے جن کو میں قرآن حدیث کی تعلیم دیا کرتا ہوں اور کمان کوئی مال نہیں ہے۔ میں اس کے ساتھ راہ الٰہی میں تیر اندازی کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تو یہ دوست رکھتا ہے کہ تجھ کو آگ کا طوق پہنایا جائے تو اس کو قبول کر لے (ورنہ نہیں)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔"

مانعین اجرت تعلیم اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں' پس اس کے تین جواب ہیں۔

(ا) یہ حدیث طبقہ ثانیہ کی ہے اور حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ صحیحین طبقہ اولیٰ کی ہے۔ لہٰذا اس کے مقابلہ میں وہ مقدم ہو گی۔

(۲) حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ صحیح بلکہ اصح ہے اور حدیث عبادہ رضی اللہ عنہ ضعیف ہے۔ چنانچہ تنقیح الرواۃ تخریج مشکوٰۃ جلد-۲، ص-۱۹۶ میں ہے کہ وفی اسناد الحدیث مغیرۃ بن زیاد مختلف فیه وثقه وکیع ویحی بن معین وتکلم فیه جماعة واستنکر احمد حدیثه وقال ابو زرعة لا یحتج بحدیثه وناقض الحاکم فصحح حدیثه فی المستدرک واتهمه فی موضع اٰخر فقال یقال انه حدث عن عبادة بن نسی بحدیث موضوع۔ "یعنی اس حدیث کی سند میں ایک راوی مغیرہ بن زیاد ہے جو مختلف فیہ ہے۔ وکیع اور یحیٰ نے تو اس کو ثقہ کہا ہے اور ایک جماعت نے اس میں کلام کی ہے یعنی جرح کی ہے۔ چنانچہ امام احمدؒ نے اس حدیث کو منکر کہا ہے اور ابو زرعہ نے کہا کہ اس کی حدیث سے دلیل نہیں لی جا سکتی۔ حاکم نے اس پر مناقضہ کیا ہے کہ مستدرک میں کہا ہے کہ اس کی حدیث صحیح ہے مگر دوسری جگہ اس کو متہم کیا ہے کہ وہ عبادہ رضی اللہ عنہ سے موضوع حدیث بیان کرتا تھا۔"

بہرکیف مغیرہ مختلف فیہ ہے اور جرح تعدیل پر مقدم ہے، لہٰذا مغیرہ ضعیف ہے۔

دوسرا راوی اس حدیث کی اسناد میں "اسود بن ثعلبہ" ہے۔ اس کے متعلق محلّٰی ابن حزم میں ہے کہ وهو مجهول لا یدری قاله علی بن المدینی وغیره "یعنی اسود بن ثعلبہ مجہول ہے اس کا حال معلوم نہیں ہوا۔ علی بن مدینی وغیرہ نے یہی کہا ہے۔"

مجہول راوی جس روایت میں ہو وہ ضعیف ہوتی ہے۔

تیسرا راوی بقیہ بن ولید ہے جس کے متعلق محلّٰی میں ہے کہ وهو ضعیف "کہ وہ ضعیف ہے۔"

پس جس روایت میں تین راوی یکے بعد دیگرے ضعیف ہیں، وہ قابل استدلال کس طرح ہو سکتی ہے؟

امام ابن حزم نے امام ابوحنیفہ کا مذہب نقل کر کے پھر لکھا ہے کہ واحتج له مقلدوه بخبر روینا "یعنی امام ابوحنیفہ کے مقلد اس کی حمایت کے لیے اس حدیث سے حجت لیتے ہیں جو ہم نے روایت کی ہے۔"

پھر "حدیث قوس" وغیرہ لکھ کر ان کی تضعیف کی ہے۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے۔ اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں ابو ادریس خولانی ہے جو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے لیکن اس کا سماع ثابت نہیں لہٰذا یہ روایت منقطع ہے۔

"لا یعرف لابی ادریس سماع من ابی۔"

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ایک اور طریق ہے جس کے متعلق نیل الاوطار میں ہے : اما حدیث ابی بن کعب فاخرجه ایضا البیهقی والرویانی فی مسنده قال البیهقی وابن عبدالبر هو منقطع "یعنی حدیث ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جس کو بیہقی اور رویانی نے مسند میں روایت کیا ہے' اس کے متعلق بیہقی اور ابن عبدالبر نے کہا کہ وہ منقطع ہے۔ اس میں عطیہ کلاعی اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے۔"

پھر اس میں عبدالرحمٰن بن مسلم نے عطیہ سے روایت کیا ہے۔ اس کے متعلق لکھا ہے : واعله ابن القطان بحال عبدالرحمٰن ابن مسلم الراوی عن عطیة "یعنی ابن القطان نے عبدالرحمٰن کے حال کی وجہ سے جو عطیہ سے راوی ہے' اس حدیث کو معلول کہا ہے۔"

پھر ابی رضی اللہ عنہ کی حدیث کے کئی طرق ہیں۔ "نیل" میں ہے کہ وله طرق عن ابی قال ابن القطان لا یثبت منها شئی "یعنی اُبی رضی اللہ عنہ کی حدیث کے کئی طرق ہیں۔ ابن القطان نے کہا کہ ان میں سے کوئی بھی ثابت نہیں ہے۔"

ایک حدیث عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی ترمذی میں ہے جس سے دلیل پکڑی جاتی ہے۔ امام ترمذی اس کے آخر میں فرماتے ہیں کہ لیس اسناده بذاک "کہ اس کی اسناد صحیح نہیں ہے۔"

عبادہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کا ایک طریق اسماعیل بن عیاش سے ہے۔ اس کے متعلق محلّی میں ہے کہ وهو ضعیف ثم هو منقطع ایضا "یہ راوی ضعیف ہے پھر منقطع بھی ہے۔" یعنی اس طریق میں دو ضعف ہیں۔

اسی طرح اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ایک طریق علی بن رباح سے آیا ہے۔ اس کے متعلق محلّی میں ہے کہ والاخر ایضا منقطع لان علی بن رباح لم یدرک ابی بن کعب۔

یہ روایت بھی منقطع ہے کیونکہ علی بن رباح نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا۔ اسی طرح بیہقی نے اور ابو نعیم نے ابو درداء رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث ذکر کی ہے۔ تنقیح الرواۃ میں ہے کہ وفی اسناده مقال "کہ اس کی سند میں جرح ہے۔"

پھر دارمی میں ابو درداء رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے۔ تنقیح الرواۃ میں ہے کہ قال دحیم

حدیث ابی الدرداء ھذا لیس لہ اصل "یعنی رحیم نے کہا ہے کہ حدیث ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی کوئی اصل نہیں ہے۔"

الغرض اجرت منع ہونے کے بارے میں جس قدر روایات پیش کی جاتی ہیں سب کی سب ضعیف ہیں۔ کوئی منکر ہے، کوئی منقطع ہے، کسی کے راوی ضعیف ہیں، کسی میں کوئی علت ہے، کسی میں کوئی علت ہے۔ لہٰذا مانعین کا دعویٰ حرمت دربارہ اجرت تعلیم قرآن وحدیث کئی وجوہ سے قابل قبول نہیں۔

(۱) یہ احادیث طبقہ ثانیہ یا ثالثہ کی ہیں جو طبقہ اولیٰ کی احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ طبقہ اولیٰ کو ترجیح ہے۔

(۲) یہ احادیث ضعیف ہیں اور جواز اجرت کی احادیث نہایت صحیح ہیں۔ ضعیف سے صحیح کا مقابلہ درست نہیں۔ (جب تطبیق ممکن ہو تو مقابلہ نہیں)

(۳) احادیث جواز اجرت مثبت ہیں اور احادیث منع اجرت نافی ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ اثبات نفی پر مقدم ہے۔

(۴) احادیث منع کی مؤول ہیں۔ مثلاً حدیث عبادہ رضی اللہ عنہ وغیرہ جس میں ذکر قوس ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے : ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اعلم انھما فعلا ذالک خالصا للہ فکرہ اخذ العوض عنہ۔ (نیل الاوطار) "یعنی عبادہ اور اُبی رضی اللہ عنہما کا حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم کر لیا تھا کہ انہوں نے یہ کام خالص لوجہ اللہ کیا ہے۔ پس اب اس کا بدلہ لینا مکروہ ہے۔"

پس اب بھی یہی صورت مراد ہے۔

ایک حدیث تحریم سوال بالقرآن پر دلالت کرتی ہے۔ اس کو مسئلہ ملبہ النزاع سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ (نیل الاوطار)

ایک اور حدیث میں تأکل بالقرآن کا ذکر ہے۔ اس کے متعلق نیل میں ہے : فھو اخص من محل النزاع لان المنع من التاکل بالقراٰن لا یستلزم المنع من قبول ما دفعہ المتعلم بطیبۃ من نفسہ "یعنی یہ حدیث دعویٰ اور مسئلہ متنازعہ سے بہت ہی خاص ہے۔ کیونکہ منع تاکل بالقرآن سے طالب العلم کا اپنی خوشی سے کوئی چیز دینے اور اس کے قبول کرنے سے منع ہونا یا منع کرنا لازم نہیں آتا۔ ہر دو مسئلے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ دعویٰ اور دلیل

میں تقریب تام کا ہونا ضروری ہے۔"

اُجرت اذان کی ممانعت سے استدلال کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ قیاس ہے اور قیاس بھی فاسد الاعتبار۔ اس لیے حجت نہیں ہے۔ نیل الاوطار میں ہے کہ فالقیاس لتعلیم علیه فاسد الاعتبار "پھر یہ قیاس بمقابلہ نص ہے جو مردود ہے۔"

خلاصہ یہ ہے کہ حدیث بخاری و مسلم سے مسئلہ جواز اجرت تعلیم کا صحیح ثابت ہوا۔ والعمل علیه عند اکثر اهل العلم۔

باقی تاویلات مانعین کی ناقابل قبول ہیں کیونکہ سب تاویلات بے دلیل ہیں۔ مثلاً یہ کہ حدیث "ان احق ما اخذتم علیه اجرا کتاب الله" کی تاویل بعض مقلدین نے یہ کی ہے کہ اس سے اجر اخروی یعنی ثواب آخرت مراد ہے۔ چنانچہ تعلیق صبیح شرح مشکوۃ میں مولوی ادریس کاندھلوی نے لکھا ہے کہ "قلنا ارادہ به اجو الاخرۃ۔"

سو یہ تاویل مردود اور تاویل بما لا یرضٰی به القائل کی مصداق ہے کیونکہ مورد کے خلاف ہے اور سیاق سباق کے خلاف ہے کیونکہ مزدوری موجود ہے اور سوال اسی کے متعلق ہے۔ اگر جواب اجر آخرت کا ہو تو سائل کے سوال کا جواب کہاں گیا؟ اور اس چیز کا حکم کیا ہوا؟ یہ تو سوال از آسمان جواب از ریسماں کی مثل ہو گا جو شان نبوت کے خلاف ہے۔

دوم یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد صرف رقیہ پر اجرت لینا ہے' تعلیم وغیرہ پر نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تاویل بھی مردود ہے۔ کیونکہ مورد اگرچہ خاص ہے لیکن جواب عام ہے۔ لفظ "ما" عموم کے لیے ہے اور یہ قاعدہ مسلم ہے کہ ان العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب "یعنی لفظوں کے عموم کا اعتبار ہے مورد اور سبب کا اعتبار نہیں ہے۔"

اگر صرف رقیہ مراد ہوتا تو حدیث میں خاص ہی لفظ بولا جاتا۔

سوم یہ کہا جاتا ہے کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ عام ہے اور حدیث عبادہ رضی اللہ عنہ خاص ہے۔ عام اور خاص کا مقابلہ ہو تو عام کی تخصیص کی جائے گی۔ پس حدیث عبادہ رضی اللہ عنہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مخصص ہے۔ چنانچہ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تاویل بھی مردود ہے جس کی کئی وجوہ ہیں۔

ایک یہ کہ عام اور خاص کا مقابلہ اس وقت صحیح ہو گا (جس سے تخصیص کرنی پڑتی ہو) جس وقت دونوں یکساں قوی ہوں۔ اگر خاص ضعیف اور کمزور ہو تو مخصص نہیں ہو سکتا۔

جب دس مردے ایک زندہ کا مقابلہ نہیں کرسکتے' دس بیمار ایک قوی صحیح سالم شخص کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ تب ضعیف حدیث صحیح کا مقابلہ کیسے کرسکتی ہیں۔

دوم حدیث نکاح بعوض تعلیم قرآن اس تخصیص کی تردید کرتی ہے۔

سوم امت محمدیہ کی اکثریت کا تعامل اور اکابر محدثین کا اس سے استدلال کرنا اس تاویل کو باطل کرتا ہے۔

چہارم تعامل خلیفہ دوم حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے خلاف ہے۔ کَمَا مَرَّ سَابِقًا

پنجم یہ کہا جاتا ہے کہ حدیث عبادہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کی منفردات روایتیں تو بیشک ضعیف ہیں لیکن تعدد طرق سے جو مجموعہ تیار ہو جاتا ہے وہ حسن لغیرہٖ کے مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے : ان لحوق الضعیف بالضعیف لا یفید قوۃ "یعنی ضعیف کو ضعیف سے ملانا قوت کو مفید نہیں ہے۔"

یہ اس وقت مفید ہوتا ہے جبکہ ضعف کم ہو۔ اگر زیادہ ہو تو مفید نہیں ہے۔ یہاں یہی معاملہ ہے۔ والسلام

عبدالقادر المہاجر الحصاری غفرلہ

صحیفہ اہل حدیث جلد۔۳۱' شمارہ۔۲۴' مورخہ ۱۵ ذوالحجہ سنہ۔۱۳۷۰ھ

چڑھاوے کا خرید کیا ہوا جانور پکا کر کھانا کھلانا کیسا ہے؟

سوال ایک بھینسا خرید کیا گیا ہے جس کا فروخت کنندہ خود کہتا ہے کہ یہ چڑھاوے کا ہے۔ ایک جاہل آدمی نے ذبح کر کے کھلانے کے لیے خرید کر لیا ہے جو بیس دن سے کھڑا ہے کیونکہ عالم کہتے ہیں کہ یہ حرام ہے اس کی پوری وضاحت فرمائیں' از حد ضروری ہے۔ (ایک سائل)

جواب سانڈ جو چھوڑا جاتا ہے یہ دو قسم کا ہے۔ ایک غیر اللہ کے نام چھوڑ دیتے ہیں۔ دوسرا ویسے چھوڑ دیتے ہیں کہ لوگ اس سے فائدہ حاصل کریں کہ مادی حیوانوں کو اس سے گابھن کرائیں۔

یہ دونوں قسم کے سانڈ حرام ہیں۔ پہلا اس وجہ سے کہ غیر اللہ کے نام پر چھوڑا گیا ہے اور وہ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں داخل ہے اس لیے حرام ہے۔ دوسرا اس وجہ سے کہ وہ

مالک کے ملک سے خارج نہیں ہوا۔ وہ اس کا مالک ہے' اس کے اذن کے بغیر کسی کو کھانا روا نہیں ہے۔ جو بھینسا سوال میں درج ہے وہ پہلی قسم میں داخل ہے کہ چڑھلاوے کا ہے جس کا خریدار نے اقرار کیا ہے تو اب اس کا ذبح کرنا حرام ہے اور کھانا بھی حرام ہے اور وہ مالک کے ملک سے خارج نہیں ہوا' اس لیے وہ بھی حرام ہے۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری

فتاویٰ ستاریہ جلد چہارم ص۔۱۸۱

اُدھار بیع کا مسئلہ

نقد اور اُدھار میں فرق جائز ہے

<u>عقلی دلائل</u>: (۱) کسی چیز کی حلت حرمت معلوم کرنے کے وقت یہ شرعی اصول مدنظر رکھنا چاہیے کہ او ما سکت عنه النبی صلی الله علیه وسلم فلم یامر به ولا عفی عنه فهو مباح (محلی جلد۔۱' ص۔۴۴) "یعنی ہر وہ چیز جس سے نبی اکرم ﷺ نے سکوت فرمایا ہے نہ اُس کے کرنے کا حکم دیا ہے اور نہ اس سے منع فرمایا ہے' وہ شرعاً مباح ہے۔"

چنانچہ آنحضور ﷺ نے ایک خطبہ میں فرمایا : ذرونی ما ترکتکم "یعنی جس چیز پر حکم لگانے میں میں تم کو چھوڑ دوں تم بھی مجھے چھوڑ دو۔" دوسری حدیث میں فرمایا کہ وما سکت عنه فهو عفو (دار قطنی) "یعنی جس چیز پر رسول اللہ ﷺ نے سکوت فرمایا ہے وہ مباح ہے۔" جب یہ اُصول آپ کو اور ہم کو مسلم ہے تو پھر مندرجہ ذیل اصول کے سامنے سے بھی کسی کو چارۂ کار نہیں ہے۔

(۲) قرآن میں ہے : قد فصل لکم ما حرم علیکم "یعنی اللہ تعالیٰ نے حرام چیزوں کو بذریعہ اپنے رسول ﷺ کے کھول کر بیان فرما دیا ہے۔" اس پر محلّی جلد۔۹' ص۔۱۱۱ میں لکھا ہے : فمن حرم ما لم یفصل لنا تحریمه رسول الله صلی الله علیه وسلم فقد شرع فی الدین ما لم یأذن به الله الخ' "یعنی جس شخص نے ایسی چیز کو حرام قرار دیا جس کو رسول اللہ ﷺ نے حرام نہیں فرمایا اُس نے بغیر اذن الٰہی دین میں نئی شریعت بنا لی ہے۔"

ان اصولوں کو مدنظر رکھ کر ہر مفتی کو بڑی احتیاط اور نہایت غور و فکر سے فتویٰ دینا چاہیے۔

(۴) عرف متعارف زمانہ قدیم سے سلسلہ معاملات میں یہ ہے کہ لوگ غلہ' کپاس' گڑ' چاول' کپڑا وغیرہ بلکہ حیوانات کو بھی نقد اور اُدھار کی قیمت میں فرق رکھ کر بیع کرتے ہیں جس کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ مشتری نقد بھاؤ سے گراں بصورت ادھار اس لیے لیتا ہے کہ اُس کو یہ سہولت ہے کہ اِس وقت اُس کے پاس نقد روپیہ اور قیمت موجود نہیں۔ اس لیے وہ اگر ادھار سودا کرلیتا ہے اس خیال سے کہ فصل وغیرہ کی آمد پر بآسانی ادا کرنا میسر ہو جائے گا اور بائع اس وجہ سے قیمت بڑھا کر اُدھار دیتا ہے' وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس چیز کا بھاؤ اور قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اگر فلاں مدت تک یہ چیز پڑی رہی تو مجھے اس وقت نفع کی اُمید ہے لیکن اگر کوئی شخص اب اس چیز کو خریدے اور قیمت آئندہ فصل کے موقع پر دے تو میں آئندہ کے حالات کے مطابق قیمت لوں گا پھر وہ حالیہ بھاؤ اور قیمت سے زیادہ قیمت لگا کر بیع کرتا ہے۔ اس میں بعض وقت بائع کو فائدہ ہو جاتا ہے اور بعض وقت مشتری کو بھی نفع ہو جاتا ہے۔ بلکہ مشتری کو ایک فائدہ بہرصورت حاصل رہتا ہے۔

وہ یہ کہ نقد قیمت اس کے پاس موجود نہیں ہوتی اور فصل وغیرہ کی آمد پر روپیہ پیسہ قیمت ادا کرنے کو آسانی سے مل جاتا ہے۔ پھر آئندہ قیمت کا انقلاب ہے کہ بعض وقت نقد بھاؤ دس روپے من ہوتا ہے اور بائع اُس غلہ کو بارہ روپے من فروخت کرتا ہے اور مہلت فصل کپاس کی برآمد تک دیتا ہے۔ لیکن غلہ کپاس سے پہلے فصل ربیع کاشت کے وقت ۱۴ روپے من ہو جاتا ہے اور کپاس نکلنے پر ۱۸ روپے من ہو جاتا ہے جس سے مشتری کو فائدہ رہتا ہے کہ غلہ اُدھار لے کر لگایا بھی اور فصل ہاڑ میں کاشت بھی کرلی اور آئندہ بھاؤ کی گرانی سے بھی بچ گیا ورنہ غریب کو جبکہ غلہ ارزاں تھا' قیمت نقد پر لینا مشکل تھا اب اور مشکل ہو جاتا۔ جب فصل ہوئی تو کپاس فروخت کر کے بجائے پوہ میں قیمت ادا کرنے کے ماگھ میں جا کر قیمت ادا کر دی جبکہ بائع کئی دن تقاضا کرتا ہوا پیچھے پیچھے پھرتا رہا اور وہ یہ کہتا رہا کہ کپاس کا بھاؤ چڑھ جانے دو پھر کپاس بیچ کر دوں گا۔ اب بتلایئے فائدہ کس کو رہا ہے؟

میرے گاؤں میں میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ ایک شخص نے دس روپے مَن اناج کے وقت ضرورت مندوں کو بارہ روپے مَن اناج دیا کہ فصل کپاس پر قیمت دے دینا۔ جب کپاس کا وقت آیا تو اٹھارہ روپے من اناج تھا۔ اگر وہ اُن کو اناج نہ دیتا اور اناج پڑا رہتا تو اٹھارہ روپے من فروخت کر کے نفع کثیر حاصل کرتا لیکن ضرورت مندوں نے اس کو تنگ کیا اور منت

سماجت کی اور قیمت کی ادائیگی کی ہر طرح ذمہ داریاں دیں تو پھر اس نے یہ سودا کیا۔ تاہم ادائیگی کے وعدہ سے بھی مہینہ بیس دن زائد گذار کر قیمت ادا کی تو اب اس کے حرام ہونے کی وجہ اور اضطرار کی وجہ بتلانی چاہیے کہ کون سی ہے؟ اور کس دلیل سے حرام ہے؟

یہ معاملہ تو دن بدن عام ہوتا چلا جا رہا ہے کیونکہ اس میں بیع اور مشتری سب کو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اگر اس کو حرام کر دیا جائے تو پھر کوئی بھی یہ معاملہ نہیں کرے گا اور لوگ نقد غلہ وغیرہ دیا کریں گے اور کوئی کرے گا تو غلہ قرض دے گا کہ یہی غلہ فلاں مدت کے بعد لے لوں گا پھر جب غلہ ادائیگی کے وقت لینے والے وقت سے زیادہ گراں ہو گیا مثلاً دس روپے من سے اٹھارہ روپے من ہو گیا تو اس غریب کو لاچاری ہو جائے گی۔ غلہ تو پیدا نہیں ہوا کپاس وغیرہ ہے وہ بیچ کر اب غلہ خریدے گا خواہ اٹھارہ روپے من ملے یا بیس روپے من۔ اب وہ نقصان میں رہا یا نہیں؟

آپ ذرا غور فرمایئے کہ ایک شخص کی صورت معاش محض تجارت ہے' اس کے پاس دو سو روپیہ ہے۔ ارزانی کے وقت اس نے دس روپے من غلہ لے لیا کہ گرانی کے وقت فروخت کر کے کچھ نفع کماؤں گا۔ حاجت مندوں نے اس سے ادھار مانگنا شروع کیا تو اس نے تیرہ روپے من ان کو ادھار دے دیا اور وعدہ کیا کہ قیمت فصل خریف پر لے لوں گا۔ جب ادائیگی کا وقت آیا تو وہی غلہ بیس روپے من ہو گیا۔

اب بتلایئے کہ اگر بائع دس روپے من کے حساب سے آپ کے فتویٰ پر لے کر سودا کے وقت کا حالیہ بھاؤ یہی تھا تو اس کو چھ ماہ تک بیکار بیٹھا رہنے کا کیا حاصل ہوا؟ اور اب وہ چھ ماہ تک کا خرچ کہاں سے نکالے؟ اور اب اٹھارہ یا بیس روپے من اناج کیسے خریدے؟ اور اس کا ذریعہ معاش کیا ہو؟ اگر ادھار نہ دے تو پھر غریبوں' مسکینوں اور ضرورت مند زمینداروں کے کام کیسے چلیں؟ آپ کو اضطرار سوجھ رہا ہے اور وہ سب خوشی سے یہ معاملات کر رہے ہیں۔ چیزوں کے بھاؤ گرنے اور چڑھنے سے کسی کو نفع اور کسی کو نقصان قدرتی طور پر اللہ باسط رازق کی طرف سے ہو رہا ہے' اس میں بائع اور مشتری کا کیا اختیار ہے؟

تو اب آپ یہ بتلائیں کہ اگر کسی چیز کی زیادہ قیمت بیاج (سود) ہے تو کون سے وقت کے بھاؤ پر زیادہ لینا بیاج (سود) ہے؟ نقد کے وقت کا بھاؤ یا وصولی کے وقت کا؟ اگر نقد کا وقت لیا

تو اس وقت قیمت وصول نہیں ہوئی بلکہ مدت کے بعد وصول ہو گی جس کے اندر اندر کئی بھاؤ بدلیں گے۔ پھر اس وقت کے بھاؤ سے زیادہ قیمت پر نقد یا ادھار بیچنا حرام کس دلیل سے ہے؟ مثلاً بعض وقت بازاری بھاؤ دس روپے نقد ہے لیکن ایک شخص بارہ روپے من نقد دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے میں املک بلملال ہوں جس طرح چاہوں اور جس قیمت پر چاہوں بیچوں گا' لینا ہے تو لو ورنہ آگے جاؤ۔ بتلایئے نقد بھاؤ سے زیادہ قیمت پر بیچنے والے کو آپ حرام کہہ کر روکیں گے؟

اور پھر یہ بھی بتلایئے کہ حالیہ بھاؤ اور بازاری بھاؤ سے کیا مراد ہے؟ اگر بائع مشتری کا مقام مراد ہے تو اس پر نص پیش کریں اور اگر عام شہروں سے مراد ہے تو کون سے شہروں کے بازار مراد ہیں؟ لاہور کے یا کراچی کے؟ ملتان کے یا راولپنڈی کے؟ قریب کے شہر مراد ہیں یا دور کے مراد ہیں۔ جو بھی مراد ہوں وہ محتاج دلیل ہیں اور اگر ادائیگی کے وقت کا بھاؤ مراد ہے تو اس کا علم نہیں ہے کہ وہ کیا ہو گا؟ پھر قیمت مجہول رہے گی اور قیمت مجہول باعث عذر ہے جو حرام ہے لیکن آپ اس کو جائز رکھتے ہیں جو باطل ہے جس کی تردید میں نے دوسرے تعاقب میں کر دی ہے۔ پھر آپ نے دوسرے فتویٰ میں یہ فرمایا ہے کہ اس میں دونوں طرف نفع ونقصان کا امکان ہے ایسی بیع جائز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں بھی دونوں طرف امکان ہے۔

<u>دلائل علمی</u>: (۱) بائع اپنی چیز کا مالک ہے وہ جس قیمت پر چاہے اپنی چیز کو نقد یا ادھار بیچے اس کو اختیار ہے۔ شریعت نے یا عرف عام نے کسی حالی یا استقبالی' دیہاتی یا شہری بھاؤ اور قیمت کا تقرر اور حد بندی اس کے لیے نہیں کی اور نہ مشتری کے لیے کی ہے۔ پس جو قیمت تراضی سے طے کر کے باہم عقد کر لیں گے جائز ہے۔ تراضی سے جو ایجاب وقبول عاقدین کر کے کسی چیز کی خرید وفروخت کریں گے وہ بیع ہے جو بروئے نص قرآن حلال ہے لقولہ تعالیٰ احل اللہ البیع "بیع اللہ تعالیٰ نے حلال کی ہے۔" بیع نقد قیمت سے بھی جائز ہے اور آسانی کے وقت تک اُدھار بھی جائز ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب منعقد کیا ہے باب شراء النبی بالنسیئۃ "یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُدھار سے خرید وفروخت کرنا" پھر یہ حدیث نقل فرمائی ہے: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشتری طعاما من رجل یھودی الی اجل "یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے

اُدھار پر غلہ خریدا۔"

نسائی وغیرہ میں حدیث ہے کہ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعث الی یھودی ابعث بثوبین الی المیسرۃ "کہ نبی اکرم ﷺ نے کسی کو ایک یہودی کی طرف بھیجا کہ وہ وقت آسانی تک مجھے دو کپڑے بھیج دے۔"

محلّٰی جلد۔۹، ص۔۱۰۵ میں ہے : والبیع یجوز بالدنانیر وبالدرھم حالا وفی النسیئۃ الی غیر اجل مسمی والی المیسرۃ "یعنی بیع نقد اور اُدھار کسی غیر معین مدت یا آسانی کے وقت تک کرلینی جائز ہے۔"

قیمت کی قید نقد یا اُدھار فرق کرنے یا نہ کرنے کا کوئی حکم قرآن یا حدیث میں وارد نہیں ہے۔ بائع اور مشتری مختار ہیں جو باہم تراضی سے طے کرلیں گے اسی سے بیع جائز ہے۔ کما لا یخفی علی اھل الرائے والبصر۔

(۲) اُدھار پر بیع کرنا قرآن سے ثابت ہے۔ قال اللّٰہ تعالٰی اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ۔ جس کے معنی جامع البیان میں یہ درج ہیں : ای تعاملتم بمعاملات موجلۃ فاکتبوھا "یعنی جب تم آپس میں اُدھار پر معاملات کرو تو ان کو لکھ لیا کرو۔" پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے : قال ابن عباس انزلت فی السلف حرم اللّٰہ الربٰو واباح السلف "یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت اُدھار کے سودا کرنے کے بارہ میں نازل ہوئی ہے، بیاج (سود) کو اللہ تعالٰی نے حرام کردیا ہے اور اُدھار کی بیع جائز رکھی ہے۔"

صورت مسئولہ میں اُدھار پر بیع ہوتی ہے جو جائز ہے۔ اُدھار کی جو صورتیں ربوی چیزوں میں حرام ہیں، وہ منع کردی گئی ہیں جو کتب حدیث میں موجود ہیں۔ صورت مسئولہ کی ممانعت کسی نص میں وارد نہیں ہے، لہٰذا یہ جائز ہے۔

(۳) بیع سلم اس وقت بالاتفاق جائز ہے اور اس کی صورت شرعی عرفی یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو نقد روپیہ دے کر یہ کہے کہ اتنی مدت (چھ ماہ یا سال) کے بعد اتنے من غلہ گیہوں یا جَو یا چنے (جو بھی مقرر کرلے) اتنے بھاؤ سے اتنی قیمت سے خریدتا ہوں۔ بائع کہے کہ میں اتنے روپے لوں گا بالآخر تراضی فریقین سے قیمت اور بھاؤ جو طے ہو جائے، بیع جائز ہے۔ خواہ بازاری بھاؤ سے زیادہ ہو یا کم۔ مثلاً حالیہ بھاؤ آٹھ روپے من ہے اور وہ دس

روپے من طے کرلیں اور گندم ادائیگی کے وقت بارہ روپے من ہو گئی ہو تو بھی یہ جائز ہے اور مسلم کل ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُدھار میں بازاری نرخ مشروط فی البیع نہیں ہے۔ اب جنس پہلے دے کر قیمت آئندہ بازاری بھاؤ سے بڑھا کر لینا جائز ہے کیونکہ قیمت پہلے دے کر جنس حالیہ بھاؤ سے کم یا زیادہ لینا جائز ہے۔ حقیقت میں کچھ فرق نہیں ہے۔

اسی لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب الرھن فی السلم باندھا ہے اور اس کے تحت حدیث یہودی والی ذکر کی ہے جو اُدھار اناج لینے والی اوپر بیان ہوئی ہے تو یہ بیع سلم عرفی نہیں ہے لیکن اس کی حقیقت ایک ہے۔ اس لیے اسے بیع سلم کہا گیا ہے۔

مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری حاشیہ بخاری پر فرماتے ہیں کہ اگر تو یہ کہے کہ حدیث میں بیع سلم کا تو ذکر نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ سلم سے مراد ادھار ہے خواہ نقد کی قسم ہو یا جنس کی قسم سے برابر ہے یعنی خواہ قیمت پہلے دے کر جنس بعد میں لی جائے یا جنس پہلے لے کر قیمت آئندہ دی جائے معاملہ یکساں ہے۔ فتفکر۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ سوداگروں نے آٹھ روپے من کے حساب سے موسم سرما میں بیع سلم کے طور پر غریب کسانوں کو رقمیں دیں اور فصل ربیعہ ماہ ہاڑ میں اناج لینا کرلیا۔ حالیہ بھاؤ سولہ' سترہ روپے من تھا اور جنس کی وصولی کے وقت بارہ روپے من ہوا۔ حاجت مندوں نے یہ سودے کئے اور نقد روپے لئے اور میعاد مقررہ پر اناج دیا اور اکثر تجار یہ کر رہے ہیں اور علماء اس کو جائز کہہ رہے ہیں۔ مفتی صاحب کے تمام دلائل اس صورت پر چسپاں ہیں مگر دارالافتاء شیش محل روڈ سے کوئی فتویٰ جاری نہیں ہوا حالانکہ حدیث کل قرض جر منفعة فھو ربًا یہاں صادق آرہی ہے اور مفتی صاحب خاموش ہیں۔

(۵) اس صورت مسئولہ میں زیادۃ ثمن لاجل الاجل عرف متعارف ہے جو تمام ملکوں میں رائج ہے۔ سوداگر چیزوں کو نقد ادھار میں فرق کر کے مول بیچ رہے ہیں اور سب اس کو برضا ورغبت قبول کر رہے ہیں اور اس سے بائع اور مشتری سب اپنا اپنا فائدہ سوچ لیتے ہیں' کما لا یخفی علی اھل الکسب تو یہ جائز ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ہر ملک کے دستور کے موافق خرید وفروخت وغیرہ میں حکم جاری کرنے کا باب منعقد کیا ہے اور پھر اس کو اقوال واحادیث سے صحیح ثابت کیا ہے' فتدبر۔

(۶) اس صورت مسئولہ میں جس بیع کا ذکر ہے اس کی ممانعت صریح کسی دلیل خاص یا

عام سے جو دعویٰ کے مطابق بتقریب تام ہو قرآن وحدیث میں پائی نہیں گئی۔ لہٰذا بروئے اصول شرعی (۱) یہ بیع جائز ہے اس کو حرام کہنا بروئے اصول (۲) ناجائز ہے۔

(۷) امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ پر خاص طور سے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام "شفأ الغلل فی حکم زیادۃ الثمن لمجرد الاجل" رکھا ہے جس میں تحقیق کے ساتھ اس بیع کو جائز ثابت کیا گیا ہے جیسا کہ ان کے طرز کلام سے ظاہر ہے۔ وہ نیل جلد۔۵' ص۔۱۵۲ پر رقمطراز ہیں: وقالت الشافعیة والحنفیة وزید بن علی والموید باللّٰه والجمهور انه یجوز لعموم الادلة القاضیة بجوازه وهو الظاهر "یعنی شافعی اور حنفی علماء اور زید بن علی اور موید باللہ اور جمہور علماء اسلام عموم دلائل کی بناء پر اس بیع کو جائز کہتے ہیں اور یہی غالب ہے۔"

اور ابن الرفعہ کی روایت ہے' قاضی سے نقل کیا گیا ہے کہ اگر مشتری یہ کہہ دے کہ میں نے ایک ہزار روپیہ نقد میں یہ چیز قبول کی یا کہے دو ہزار میں ادھار سے یہ چیز قبول کی تو صح ذاک "یہ بیع صحیح ہے۔" پھر جلد۔۵' ص۔۱۷۹ میں اس کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ وقد عرفت الکلام فی جواز بیع الشئی باکثر من سعر یوم لاجل النساء "یعنی تو نے گزشتہ بحث میں میرے کلام سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ اس دن کے موجودہ نرخ سے بوجہ ادھار کسی چیز کو زیادہ قیمت پر بیع کرنا جائز ہے۔" اسی طرح دیگر علماء محققین نے جو علم وفضل اور تحقیق مسائل میں ہم سب سے فائق ہیں اس صورت مسئولہ کو جائز قرار دے چکے ہیں کیا ان سب کو یہ سودی صورت سمجھ میں نہ آئی؟

(۸) فتاویٰ نذیریہ جلد۔۲' ص۔۱ میں یہ صورت لکھی ہے اور اس پر جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے جس پر مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کی مہر ثبت ہے۔ نیز اسی جلد کے ص۔۳ پر دوسرا فتویٰ درج ہے اس پر بھی محدث دہلوی مرحوم کی تصدیقی مہر ہے جس میں یہ ہے کہ اگر بائع نقد کی صورت یا ادھار کی صورت کو متعین کر کے فروخت کرے تو یہ بیع حلال و جائز ہے۔

پھر جامع ترمذی کے حوالہ سے یہ لکھا ہے۔ جامع ترمذی میں ہے: عن ابی هریرة قال نهی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن بیعتین فی بیعة وقد فسر بعض اهل العلم قالوا بیعتین فی بیعة ان یقول ابیعک هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسیئة بعشرین ولا

يفارقه على احد البعين فاذا فارقه على احدهما فلا باس اذا كانت العقدة على احد منهما' انتهٰی۔ "یعنی رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع کرنے سے منع فرمایا ہے اس کی تفسیر بعض اہل علم نے یہ کی ہے کہ ایک بیع میں دو بیعوں کی صورت یہ ہے کہ بائع یوں کہے کہ میں تجھے یہ کپڑا دس روپے نقد میں اور بیس روپے ادھار میں فروخت کرتا ہوں اور وہ دونوں (نقد اور ادھار) میں سے کسی ایک کو دوسری سے جدا کرے پس جب وہ دونوں میں ایک کو جدا کر کے عقد کرے تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔" یعنی نقد یا ادھار میں سے ایک کا عقد کرے جیسے صورت مسئولہ میں ہے تو یہ جائز ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جن علماء نے یہ تفسیر کی ہے ان کے نزدیک بھی صورت مسئولہ جائز ہے اور جو یہ تفسیر کرتے ہی نہیں بلکہ وہ اور تفسیریں کرتے ہیں جو صورت مسئولہ سے بالکل متبائن ہیں تو ان کے نزدیک یہ صورت بطریق اولیٰ جائز ہے۔ پس محدثین' متقدمین کا اس پر اتفاق ظاہر ہو گیا اور کوئی ایسا معتبر امام اور محدث باقی نہ رہا جس پر اعتماد کیا جا سکے۔

(۹) حضرت مولانا شاہ ولی اللہ مرحوم محدث دہلوی مسوی شرح موطا ص۔۳۶۳ میں رقمطراز ہیں: قلت فى شرح السنة فسروا البيعتين فى بيعة على وجهين احدهما ان يقول بعتك هذا الثوب بعشرة نقدا او بعشرين نسيئة الى سنة فهو فاسد عند اكثر اهل العلم فاذا باته على احد الامرين فى المجلس فهو صحيح لا خلاف فيه' انتهٰی۔ "یعنی شرح السنہ میں ہے کہ ایک بیع میں دو بیعوں کی جو حدیث میں ممانعت ہے اس کی تفسیر علماء نے دو طرح سے کی ہے۔ ایک یہ کہ بائع مشتری سے کہے میں نے تجھے یہ کپڑا دس روپے نقد میں یا بیس روپے ادھار میں سال کی مہلت تک فروخت کیا تو یہ بیع اکثر علماء کے نزدیک فاسد ہے اور جب دونوں (نقد یا ادھار سے) ایک کا عقد قطعی طور پر اسی مجلس میں معین کر دے تو یہ بالاتفاق صحیح ہے۔"

تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی ربع ثانی ص۔۲۳۶ میں ہے: قال البائع ابيعك هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسيئة بعشرين فقال المشترى اشتريتهٗ بنقد بعشرة ثم نقد عشرة دراهم فقد صح هذا البيع وكذالك اذا قال المشترى اشتريتهٗ بنسيئة بعشرين وفارق البائع على هذا صح البيع لانه لم يفارقه على ابهام وعدم استقرار الثمن بل فارقه على واحد معين منهما۔ "یعنی بائع مشتری سے کہے کہ میں تجھے یہ کپڑا دس روپے نقد میں

فروخت کرتا ہوں اور بیس روپے ادھار میں۔ پس مشتری نے کہا کہ میں اس کو دس روپے نقد سے خریدتا ہوں پھر دس روپے نقد دے دیئے تو یہ بیع صحیح ہے اور اسی طرح جب مشتری نے یہ کہا کہ میں اُس کو بیس روپے ادھار سے خریدتا ہوں اور بائع سے علیحدہ ہو گیا تو یہ بیع بھی صحیح ہے کیونکہ وہ بائع سے مشتبہ اور مبہم بیع سے جدا نہیں ہوا اور مول کو مجہول نہیں چھوڑا بلکہ ایک عقد معین طے کر کے جدا ہوا ہے۔"

(۱۰) فقہ محمدیہ طریقہ احمدیہ حصہ چہارم ص-۲۸ پر اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں بطور فیصلہ یہ لکھا ہے، لیکن اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دن کے نرخ سے زیادہ مول کے ساتھ بیچنا جائز ہے۔ (مسک الختام ص-۱۶)

مسک الختام کے حوالہ سے ظاہر ہے کہ جناب نواب صدیق حسن خان صاحب محدث کا بھی یہی مذہب تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے، تمام اکابر علماء دہلوی، لکھوی، بنارسی، لاہوری، غزنوی، امرتسری، روپڑی وغیرہ اس بیع کے جواز کے قائل ہیں۔ چنانچہ اپنی کتاب رسائل ومسائل ص-۲۹۶ میں فرماتے ہیں، "پہلی صورت تو صریحاً سود کی ہے۔" لیکن آنجناب نے اس کے سود ہونے پر کوئی دلیل شرعی پیش نہیں کی، صرف اپنے قول غیر صائب سے اس کو سود ثابت کر دیا جو ناقابل تسلیم ہے کیونکہ کیل کی موزوں سے بیع ہو تو اس میں نہ تفاضل حرام ہے اور نہ ادھار حرام ہے۔ اس لیے کہ ان میں اتحاد جنس اور اتحاد قدر نہیں ہے۔" کما لا یخفی علی اهل الرائے والبصر۔

فتاویٰ نذیریہ جلد-۲، ص-۲۳ میں ہے : كلما حرم الفضل حرم النسا ولا عكس وكلما حل النساء حل الفضل ولا عكس كذا فى الحلبى وهكذا فى الدر المختار وغيره۔

نیز نیل الاوطار جلد-۵، ص-۱۹۴ میں ہے : واجمع العلماء على جواز بيع الربوىٰ لا يشاركه فى العلة متفاضلا ومؤجلا كبيع الذهب بالفضة وبيع الفضة بالشعير وغيره من المكيل ۔ "یعنی اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ اگر کسی ایسی سودی چیز کی دوسری سودی چیز کے ساتھ بیع ہو جو علت سود میں اس کے ساتھ شریک نہیں ہے تو زیادتی اور ادھار سے یہ بیع جائز ہے جیسے سونا کی بیع گندم سے کہ چاندی کی بیع جَو وغیرہ کے ساتھ کی جائے تو یہ جائز ہے۔" پھر نہ معلوم کس قانون کی بناء پر اسے سود قرار دیا گیا ہے۔

(۱۱) مشکوٰۃ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو لشکر کا سامان تیار کرنے کا حکم فرمایا اور کہا کہ صدقہ کے اونٹوں کے وعدہ پر اونٹ (لوگوں سے) ادھار لے لو۔ چنانچہ ایک اونٹ دو اونٹوں کے بدلہ میں (تا زمانہ زکوٰۃ کے اونٹ آنے کے) عبداللہ رضی اللہ عنہ نے لیے۔

یہ صریح دلیل ہے اس بات کی کہ ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت یا بدلہ کی چیز لینا درست ہے۔ اس کے خلاف ایک حدیث حیوان کو حیوان کے عوض ادھار بیع ہونے کے منع ہونے میں وارد ہے جو مشکوٰۃ ہی میں ہے۔ لیکن امام المحدثین امام شافعی رحمہ اللہ نے ہر دو احادیث میں تطبیق کرتے ہوئے اس کی توجیہہ بیان فرمائی ہے کہ "ان یکون نسیئۃ من الطرفین معًا فیکون من بیع الکالی وھو لا یصح۔ "یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ دونوں طرف سے ادھار اکٹھی ہو تو حیوان کی بیع حیوان سے منع ہے۔" جیسے دوسری حدیث میں دین کی دین کے ساتھ بیع منع ہے۔ پس صورت متنازعہ کہ بازاری نرخ سے ادھار کی صورت میں کسی چیز کا زیادہ مول لینا جائز ہے' ان دلائل سے ثابت ہوا' فللّٰہ الحمد۔

(۱۲) بالآخر ایک الزامی دلیل پیش کرتا ہوں جس کے تسلیم کئے بغیر مفتی صاحب کو کوئی چارہ نہ ہوگا اور وہ یہ ہے کہ آنجناب نے دوسرے سوال کے جواب میں یہ فرمایا ہے "کہ اس صورت کے عدم جواز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ متعینہ تاریخ میں دونوں طرف نفع ونقصان کا امکان ہے۔ بائع کا منافع یقینی نہیں اور ایسی بیع جائز ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ یہی بات نقد ادھار کے مول میں فرق کر کے بیع کرنے کی صورت میں بھی ہے جیسا کہ مشاہدہ ذکر کیا گیا ہے اور دیگر لوگ بھی اناج کے بڑھتے گھٹتے نرخ سے خوب واقف ہیں کہ بازاری نرخ ایک وقت دس روپے من ہوتا ہے اور پانچ چھ ماہ کے بعد سولہ سترہ روپے من ہو جاتا ہے۔ اب جس نے اناج رکھ کر آگے فروخت کرنا تھا اس نے مشتری کے کہنے سے ادھار پر بارہ روپے من دے دیا اور بھاؤ میعاد تک بڑھ گیا تو اب بائع کو منافع کہاں رہا؟ وہ تو یہ خیال کرتا ہے کہ اگر میرا اناج پڑا رہتا تو اس کو آج سترہ اٹھارہ روپے من فروخت کیا جاتا۔ ایک تو میری رقم رک گئی کہ کوئی تجارت نہ کر سکا' دوم مول بڑھ گیا تو اس سے میں محروم رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ جن چیزوں کا نرخ بڑھتا گھٹتا رہتا ہے ان کی ادھار سے بیع کی جائے تو بائع کو منافع یقینی نہیں بلکہ نقصان کا امکان ہی ہے۔ "ما ھو جوابکم فھو

جوابنا۔"

آپ کا دوسرا فتویٰ پہلے کی اور پہلا فتویٰ دوسرے کی تردید کرتا ہے اور دونوں متضاد ہیں۔ دونوں میں ادھار ہے' دونوں میں نفع ونقصان احتمالی ہے اور دونوں میں بیع کے وقت کا بازاری نرخ متفاوت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلی صورت میں قیمت مقرر ہے اور بیع منعقد ہے اور دوسری میں قیمت مجہول ہے اور بیع فاسد موجب عزر ہے۔ اگر بازاری نرخ سے قیمت بڑھ گئی تو بائع کو نفع ہوا جو ادھار نے نفع کھینچا وہ آپ کے اصول سے سود ہو گیا اور اگر مقررہ تاریخ پر بازاری نرخ گر گیا تو مشتری کو فائدہ ہوا پھر مشتری بیاج سے بچ نہ سکا۔ بازاری نرخ اور ادھار کا نرخ آپ کے مذہب میں ربوٰی ہے جس کو بھی نفع رہے گا وہی بیاج کا مرتکب ہو جائے گا پھر یہ پہلی صورت کیوں ناجائز اور دوسری کیوں جائز ہے؟ پھر دوسری میں قیمت مجہول ہے جس سے یہ بیع فاسد ہے۔ کما سیاتی تفصیلہ فی موضعہ انشاء اللّٰہ۔

نقد اُدھار کی بیع میں قیمت زیادہ کرنا حرام اور اس پر تعاقب: جناب مولانا عطاء اللہ صاحب نے بازاری نرخ نقدی سے ادھار کی صورت میں زیادہ مول لینے کے حرام ہونے پر مندرجہ ذیل دلائل تحریر فرمائے ہیں۔ "یہ بیع ناجائز ہے بدو وجہ (الف) .... قرآن شریف میں تجارت کو تراضی کے ساتھ مقید فرمایا ہے۔ تجارۃ عن تراض منکم "یعنی ایسی تجارت جس کی بناء خوش دلی پر ہو۔" ظاہر ہے کہ غلہ کی کمیابی کی صورت میں کوئی شخص دریافت کردہ بیع کو کیسے خوش دلی سے قبول کر سکتا ہے' الخ۔

اس کے مفہوم مخالف سے یہ ظاہر ہے کہ اگر غلہ کی ارزانی اور فراوانی ہو اور پھر بائع ومشتری خوش دلی سے اپنے اپنے فائدہ کو مدنظر رکھ کر بیع کر لیں تو پھر بنفسہ یہ بیع جائز ہے۔ اس صورت میں اس آیت سے استدلال صحیح نہیں۔ دوم یہ کہ اگر حاجت مند کو اضطرار اور مجبوری لاحق نہ ہو اور وہ خود بائع کو منت ساجت کر کے اپنے کسی تجارتی مفاد کے لیے خوش دلی سے یہ بیع منظور کر لے تب بھی اس آیت کے خلاف نہیں۔ مثلاً اس طرح معاملہ کرنے کا عرف عام ہو گیا ہے۔ اب اکثر لوگ خوش دلی سے یہ لین دین کر رہے ہیں' کما لا یخفی علی اھل الکسب۔

بہرکیف نفس آیت سے صرف فریقین عاقدین کی تراضی کا ہونا ضروری ثابت ہے۔ لیکن اس صورت مسئولہ کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ جو خوش دلی اور رضامندی سے یہ بیع

کرتے ہیں' اس آیت سے ان کے لیے جواز ثابت ہوا۔ کما ذکرت سابقا بالتفصیل۔
اب تراضی کے معلوم کرنے کا طریقہ اور ذریعہ عاقدین کو جاننا چاہیے کیونکہ کسی کے دل کی رضا عدم رضا تو عالم الغیب ہی جانتا ہے۔ پھر وہ معاملات اور برتاؤ میں ایک دوسرے کو معلوم ہو تو کس طرح ہو؟ سو واضح ہو کہ تراضی کی قید اکراہ اور اجبار سے بچانا اور پرہیز کرانا مراد ہے یعنی کسی سے زبردستی اور جبراً اور قہراً خرید وفروخت کرنی کرانی حرام ہے اور اکل المال بالباطل ہے۔ بیع و شریٰ باہمی رضامندی سے ہونی لازم ہے' تراضی سے یہی مقصود ہے۔

چنانچہ مصفٰی شرح موطا امام مالک جلد۱' ص۔۳۴۲ میں ہے: دوران احکام بر حقیقت تراضی کہ کار دل است نمے تو اند شد پس لابدست از اقامت چیزے مقام او ولا بد است کہ دلالت آن چیز معلوم باشد نزدیک عاقدین وسائر اہل زباں پس در بیع واجارہ وامثال آن ایجاب وقبول است ومعاطاۃ نیز میتو اند شد۔ "یعنی احکام میں تراضی کی حقیقت جو کہ دل کا فعل ہے' معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس کے قائم مقام کسی چیز کو ٹھہرائے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے اور ضرور ہے کہ وہ ایسی چیز ہو جو عقد کرنے والوں اور تمام اہل زبان کے نزدیک رضامندی پر دلالت کرے پس وہ بیع اور اجارہ وغیرہ میں ایجاب وقبول ہے اور نیز اس چیز کا باہمی دینا لینا بھی ہے۔"

خلاصہ یہ کہ بیع میں ایجاب وقبول اور مال کا ایک دوسرے کے حوالے کرنا رضامندی پر دلالت کرے گا اور ان کے اس فعل سے بیع منعقد ہو جائے گی جبکہ بظاہر کوئی زبردستی اور جبر وقہر اُن کے اس معاملہ میں نہ پایا گیا یہی تمام تفاسیر اور کتب شرعیہ میں لکھا ہے۔ نیز مصفٰی ص۔۳۴۰ میں ہے: وشرط عاقدین اشد است ومکروہ نہ بودن الا اکراہ بحق کہ در حکم لا اکراہ است۔ "یعنی بیع وغیرہ عقد کرنے والوں میں سمجھ سوچ ہونا شرط ہے اور ان میں کسی پر زبردستی اور جبر نہ ہو مگر یہ کہ حق کے ساتھ۔" زبردستی ہو تو وہ کالعدم ہے۔

پس صورت مسئولہ میں عرف متعارف یہ ہے کہ نقد ادھار کی صورت میں مول کی زیادتی لوگوں کی باہمی رضامندی سے جاری وساری ہے۔ کوئی کسی پر تلوار یا بندوق وغیرہ یا کسی اور طریقہ سے اکراہ نہیں کرتا' لہٰذا یہ بیع جائز ہے۔ مانعین کا استدلال اس آیت سے باطل ہے۔ یہ دلیل قائلین بالجواز کی ہے۔ کما تقدم۔

باقی رہا یہ امر کہ وہ دل سے یہ نہیں چاہتے کہ اس طرح گرانی سے بیع ہو' نقدی بھاؤ کے

مطابق ملے تو لینے والے خوش ہوتے ہیں۔ سو ایسی خوش دلی کی کسی کے نزدیک بھی شرط نہیں ہے۔ ورنہ تجارت کا تمام سلسلہ اور لوگوں کا باہمی لین دین درہم برہم ہو جائے گا اور حرام سے کوئی بھی نہیں بچ سکے گا اور نہ یہ کسی دلیل سے ثابت ہے۔

کیونکہ یہ تنگ دلی اور ناپسندی تو نقدی خرید فروخت میں بھی پائی جاتی ہے کہ جب چیزیں اناج' کپڑا' گھی' چینی' سونا چاندی' دوائی وغیرہ گراں ہو جاتی ہیں اور سوداگر' دکاندار ارزاں نہیں دیتے تو خریدار غریب بہت تنگ دل ہوتے ہیں اور ضرورت سے مجبور ہو کر چیزیں خریدتے ہیں اور دل میں خوش نہیں ہوتے۔

پہلی مجبوری بیع میں حارج نہیں ہے۔ اگر دوسری ہے تو وہ خلاف شرع ہے مگر اس کی اطلاع تھانہ میں دینی چاہیے تاکہ حکومت انتظام کر کے اس کا انسداد کرے اور پہلی کے متعلق اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہی باسط رازق مسعر ہے' فتذکر۔ ورنہ لوگ تو املک بلاموال ہیں۔ وہ اپنی چیزوں کو نقد یا ادھار سے جیسا نفع معلوم کریں گے فروخت کریں گے۔

(دوسری دلیل) مولانا نے یہ حدیث بیان فرمائی ہے : عن علی نهی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم عن بیع المضطرہ (مشکوٰۃ رواہ ابوداؤد) "یعنی رسول اللہ ﷺ نے مضطر کی بیع سے منع فرمایا ہے۔" اس دلیل پر دو طرح سے کلام ہے۔ ایک علم روائت کی رُو سے' دوم علم درایت کی رُو سے۔

پس واضح ہو کہ اس حدیث کی اسناد میں ایک راوی صلح ابو عامر ہے جو کثیر الخطا ہے جس کو رئیس الجارحین امام ابن معین نے ضعیف کہا ہے اور دوسرا راوی بنی تمیم کا شیخ ہے جو مجہول ہے۔ اس وجہ سے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

تنقیح الرواہ تخریج مشکوٰۃ جلد ۲' ص ۱۷۰ میں ہے : فالحدیث ضعیف۔

محلّٰی جلد ۹' ص ۲۲ میں جناب مفتی صاحب کی ہر دو روایتوں مضطر اور مضطروں کو امام المحققین علامہ ابن حزم مجدد قرن خامس رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا ہے اور پھر جرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں : لو استندا هذان الخبران لقلنا بهما مسارعین لکنهما مرسلان ولا یجوز القول فی الدین بالمرسل۔ "یعنی اگر یہ دونوں روایتیں مستند ہوتیں تو ہم لپک کر ان کو لے لیتے لیکن یہ دونوں مرسل ہیں اور مرسل کے ساتھ دین میں فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔"

بہرکیف یہ روایت ضعیف ہے اور ضعیف احکام میں حجت نہیں۔

مقدمہ شرح نووی ص-۲۱ میں ہے : فانھم متفقون علی انه لا یحتج بالضعیف فی الاحکام الخ۔ "یعنی ائمہ محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ ضعیف حدیث احکام میں حجت نہیں ہے۔"

مفتی صاحب کی علمی قابلیت اور خلوص کا مجھے اعتراف ہے لیکن اس دلیل سے صورت مسئولہ پر استدلال محل تعجب ہے' فتفکر۔

اب درائت کی رُو سے غور فرمایئے کہ لفظ بیع لغت اضداد سے ہے جس کا معنی بیچنا اور خریدنا دونوں ہیں۔ اس لیے نہایہ میں اس کا معنی مبایعة لکھا ہے یعنی آپس میں خرید وفروخت کرنا۔ اسی طرح مضطر کا معنی مجبور اور اضطرار کا معنی مجبور کرنا ہے۔ پس اس حدیث میں مجبور اور مکرہ کی بیع سے ممانعت ہے سو یہ منع ہے۔ جس کی لفظ تراضی کے تحت تفصیل ہو چکی ہے لیکن صورت مسئولہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے نہ بائع پر کسی کا اکراہ ہے اور نہ مشتری پر ہی عرف متعارف ہے کہ سب اپنے مفاد کی بنا پر تراضی سے یہ بیع کر رہے ہیں۔ کما لا یخفی علی اھل الکسب والتجارة۔

مشکوٰة مترجم کے حاشیہ مظاہر حق میں اس حدیث پر لکھا ہے' "یعنی منع فرمایا اس سے کہ کسی سے زبردستی کچھ خریدے۔" اس بناء پر ہم بھی لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ کسی سے بالجبر خرید وفروخت نہ کریں کہ یہ ظلم صریح اور جرم قبیح ہے۔

تنقیح الرواة جلد-۲' ص-۱۷۰ میں نہایہ سے اس کی دو صورتیں منقول ہیں۔ ایک یہ کہ بطریق اکراہ کے کوئی شخص عقد بیع پر مجبور کیا جائے' یہ بیع تو فاسد ہے جو منعقد نہیں ہوتی (ھذا ھو الحق) دوسری یہ کہ کوئی شخص بوجہ قرضدار ہونے کے کسی چیز کے بیچنے پر مجبور کیا جائے یا اولاد اور اپنے ملازم کے خرچ کے بوجھ نے اس کو مجبور کیا کہ وہ اپنا سامان نقصان اٹھا کر کم قیمت سے بیچنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ قرضہ کے بارہ میں ہے۔ مروت یہ ہے کہ اس صورت میں اس سے بیع کا معاملہ نہ کیا جائے بلکہ اس کو آسانی کے وقت تک قرضہ دیا جائے یا اس کا سامان پوری قیمت سے خریدا جائے۔ اس صورت ثانیہ کا عقد کیا ہوا صحیح تو ہے لیکن اہل علم نے (خارجی سبب سے کہ مروت کے خلاف) اس کو مکروہ خیال کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان دونوں صورتوں کا صورت مسئولہ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ وہ ایک علیحدہ صورت ہے جو عام ہے اور یہ معاملہ غریب اور امیر سب کر رہے ہیں بلکہ اس بیع سے

بہت سے غریبوں اور مضطروں کو فائدہ پہنچ رہا ہے کہ آسانی کے زمانہ (فصل وغیرہ) تک مہلت سے چیز مل جاتی ہے اور ان کو ایسے وقت میں قیمت ادا کرنی پڑتی ہے جب کوئی اضطرار نہیں ہوتا اور سلمان خانگی بچ جاتا ہے۔ اگر یہ بیع بالفرض مضطر کی تصور کر ہی لی جائے تو بھی صحیح ہے اور یہ نہی تنزیہہ ہے کہ خلاف مروت بیع ہے جیسا کہ اس پر آیت ولا تنسوا الفضل بینکم (کہ باہمی مروت احسان کو فراموش نہ کرو) دلالت کرتی ہے لیکن بنفسہ عقد صحیح ہے' فتفکر۔

اب امام ہمام عالی مقام ابن حزم کا فیصلہ بالجزم سنئے۔ (مسئلہ نمبر ۱۶۲۹) واما المضطر الی البیع کمن جاع وخشی الموت فباع فیما یحی علیه نفسه واهله الخ۔ "یعنی مضطر بیع کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص بھوکا ہو گیا اور موت کے ڈر سے اس نے ایسی چیز فروخت کی جس کے ذریعہ سے اس نے اپنے نفس اور اہل کو بچا لیا یا اس نے دارالحرب میں اپنی جان یا کسی رشتہ دار' دوست کے بچانے کے لیے فدیہ دینے کو کوئی چیز بیچی یا یہ کہ کسی ظالم نے اس کو روک لیا اور تاوان ادا کرنے پر اس کو مجبور کیا جس کے باعث اس کو اپنی کوئی چیز یا سلمان فروخت کرنا پڑا۔" انتھی مترجما ملخصا۔

پھر اس بیع میں اختلاف کا ذکر کر کے مانعین کے دلائل پر جرح کرنے کے بعد فرماتے ہیں: قال ابو محمد فاذ لم یصح هذا ان الخبران فلنطلب هذا الحکم من غیرهما' الخ۔ "یعنی جب مانعین کی پیش کردہ دونوں احادیث صحیح نہ ہوئیں تو ہم اس حکم کو دیگر دلائل میں تلاش کرتے ہیں۔" سو ہم نے یہ معلوم کیا کہ ہر وہ شخص جو اپنے نفس اور اہل وعیال کی خوراک اور لباس خریدتا ہے وہ مضطر ہے' جو بلاشبہ ضرورت سے خریداری پر مجبور ہوا ہے۔ پس اگر مضطر کی بیع باطل ہے تو تمام ان لوگوں کی خرید وفروخت باطل ہو جائے گی جو خوراک زندگی اپنی اراضی اور جائیداد سے حاصل نہیں کر سکتے اور وہ لباس خوراک خرید کر لینے پر مجبور ہیں' وهذا باطل بلا خلاف "اور یہ بالاتفاق باطل ہے۔"

کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اہل کے لیے کئی صاع جو (تیس صاع) اپنی زرہ گروی رکھ کر خریدے اور اسی حالت میں فوت ہوئے کہ زرہ گروی تھی۔ فصح ان بیع المضطر الی قوة وقوت اهلها وبیعه ما یتباع به القوت بیع صحیح لازم فهو ایضا بیع تراض لم یجبره احد علیه فهو بنص القرآن۔ "پس صحیح یہ ہے یہ بات کہ بیع مضطر کی جو اپنے اور

اپنے اہل کے لیے خریدنے پر مجبور ہوا یا اس چیز کے بیچنے پر مجبور ہوا جس سے خوراک خریدی جا سکتی ہے۔ بیع صحیح اور لازم ہے اور یہ بیع تراضی ہے جس پر اس کو کسی نے مجبور نہیں کیا اور وہ بروئے نص قرآن صحیح ہے۔"

اس کے بعد امام موصوف الصدر نے اور بھی مضطر کی کئی صورتیں لکھی ہیں اور انہی مسلم طور پر بیع جائز قرار دی ہے۔ پس یا تو وہ حدیث قابل استدلال ہی نہیں یا اس سے مراد مکروہ ہے جس سے کوئی شخص زبردستی بیع کرے کرائے' یا قدرتی اضطرار اور اپنی ضرورت کی مجبوریاں ہیں جو نفس عقد میں حارج نہیں۔ ان میں بے رحمی اور بے مروتی ہو تو یہ مکروہ ہیں۔ نفس عقد صحیح ہے' فتذکر ولا تکن من الغابرین۔

(تیسری دلیل) مولانا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک خطبہ پیش کیا ہے کہ ایک ایسا وقت آئے گا کہ سرمایہ دار دولت پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں گے' حلانکہ ان کو اس کا حکم نہیں (الی قولہ) یبایع المضطرون۔

اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ عقد بیع بروئے قرآن وحدیث ایجاب وقبول تراضی عاقدین صحیح اور ثابت ہے۔ اب اس کو کسی یقینی قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت دلیل سے حرام کرنا چاہیے۔ مولانا وعظوں اور درسوں میں تو ایسی روایتیں ترغیبا اور ترہیبا سنا سکتے ہیں مگر فتوؤں اور احکام میں بطور ثبوت دعویٰ ومسئلہ ایسی کمزور دلیلیں کارآمد نہیں ہو سکتی ہیں۔

امام جامع منقول ومعقول عالم فروع واصول نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت محلّٰی جلد۔۹' ص۔۲۲ میں نقل کی ہے کہ اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور فرمایا ہے " ثم هي عن علي وعن رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم عن حذيفة ولكنهم قوم مضطربون۔" جب مضطر اور مضطرب کی بیع آپ صحیح نہیں جانتے تو مضطرب روایت کو صحیح کیوں جانتے ہیں' حلانکہ بیع تو مضطر کی صحیح ہے اور حدیث مضطرب صحیح نہیں ہے' كما لا يخفى على اهل العلم بالحديث۔

پھر اگر حدیث صحیح یا حسن تسلیم کرلی جائے تو اس سے بیع بصورت مسئولہ حرام اور باطل ثابت نہیں ہوتی' کما هو الظاهر۔ دیکھئے مسجد میں بیع کرنی منع ہے جیسا کہ حدیث میں آیا لیکن جو کرلیں گے ان کا عقد صحیح ہے۔ کیونکہ یہ نہی خارجی وجہ سے ہے اور وہ مسجد کا احترام ہے۔

نیل الاوطار جلد۔۲' ص۔۱۵۹ میں ہے' وقد اجمع العلماء على ان ما عقد من البيع

فی المسجد لا یجوز نقضه (الی قوله) واجماعهم علی عدم جواز النقض وصحة العقد لا منافاة بینه وبین التحریم "یعنی علماء اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ مسجد میں جو عقد بیع ہوا اس کا توڑنا جائز نہیں ہے اور صحت عقد پر اجماع اور تحریم میں کوئی منافاۃ نہیں ہے۔"

پس اسی طرح صورت مسئولہ میں سمجھ لیں کہ اس میں بیع تو صحیح ہے اور سرمایہ دار جو غریبوں کی رعایت نہیں کرتے' یہ ان کا خارجی جرم ہے' فتفکر۔

(چوتھی دلیل) مولانا موصوف فرماتے ہیں "زیادہ رقم اس مدت کے معاوضہ میں ہے جو بائع مقرر کرتا ہے اور یہ بھی شریعت کے خلاف ہے' سبل السلام میں ایک حدیث کی شرح میں لکھا ہے' لزوم الربا عند من یمنع الخ یعنی اس بیع میں سود لازم آتا ہے' کیونکہ ادھار کی وجہ سے حالیہ بھاؤ سے زیادہ گراں رقم وصول کی گئی ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے' ادھار کی قیمت مدت کے عوض میں نہیں ہے' بلکہ قیمت جنس کے عوض میں ہے اور مدت بطور شرط وارد ہے کیونکہ مدت خود کوئی مالیت نہیں ہے کہ اس کے عوض رقم لی جائے۔ چنانچہ اس کی تفصیل ہو چکی ہے اور اس پر جو سود کا حکم لگایا گیا ہے یہ بے دلیل ہے اور شرع میں بغیر دلیل کے حرمت کا حکم لگانا منع ہے' جس کا بیان پہلے ہو چکا ہے بلکہ اس کے خلاف مدت کی شرط سے مول زیادہ دینا ثابت ہے۔ چنانچہ حدیث عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ میں اس کی تفصیل ہو چکی ہے۔

باقی سبل السلام کی عبارت منقولہ کو حدیث کی قطعی شرح قرار دے کر حکم لگانا سائل سے غرر کا معاملہ کرنا ہے' کیونکہ اصل حدیث یہ ہے: نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیعتین فی بیعة "یعنی رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔" پس حدیث تو اتنی ہے کہ جس میں صورت مسئولہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ وہ صرف ادھار کی ایک بیع ہے' دو نہیں۔ کما هو الظاهر۔

لیکن علماء نے اس حدیث کی مختلف تفسیریں کی ہیں اور متفرق احتمال اور جدا جدا علتیں ظاہر کی ہیں۔ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال' پھر جو تفسیر کسی نے کی ہے اس میں مختلف طور سے علت بیان کی ہے۔ چنانچہ تنقیح الرواۃ میں سبل السلام وغیرہ سے منقول ہے' وعلة النهی علی الاول عدم استقرار الثمن ولزوم الربا عند من یبیع بیع الشئی باکثر

من سعر یومه لاجل نسیئة وعلی الثانی لتعلیقه بشرط مستقبل یجوز وقوعه وعدم وقوعه فلم یستقر الملک۔ "یعنی نہی کی علت پہلی تفسیر کی بنا پر قیمت کا بیع میں عدم استقرار ہے اور نزدیک اس شخص کے جو منع کرتا ہے بیع کو بربنا ادھار کے ساتھ زیادتی کے نرخ حالیہ سے لازم آنا بیاج کا ہے اور تفسیر ثانی میں شرط مستقبل کے ساتھ تعلیق ہے کہ اس کا وقوع اور عدم وقوع دونوں جائز ہیں جس سے ملک مستقر نہیں ہے۔"

جناب مفتی صاحب نے اس شخص (مجمول العین والحال) کا خیال لے لیا' حالانکہ پہلا احتمال علت کا بھی موجود ہے۔ چنانچہ ترمذی کی عبارت اور شاہ ولی اللہ مرحوم کی عبارت میں اس کی تصریح ہو چکی ہے' اس بناء پر اگر عقد صرف ادھار ہی پر ہو یا صرف نقد پر ہو تو بیع صحیح ہے۔ چنانچہ نیل الاوطار میں ہے : ان غایة ما فیها الدلالة علی المنع من البیع اذا وقع علی هذه الصورة وهی ان یقول نقدا بکذا ونسیئة بکذا الا اذا قال من اول الامر نسیئة بکذا فقط وکان اکثر من سعر یومه مع ان المتمسکین بهذه الروایة یمنعون من هذه الصورة ولا یدل الحدیث علی ذالک فالدلیل اخص من الدعوٰی' الخ۔ "یعنی انتہائی درجہ اس حدیث میں اس صورت کی ممانعت ہے جو یوں کہے کہ میں یہ چیز نقد اتنے کو بیچتا ہوں اور ادھار اتنے کو بیچتا ہوں مگر جب اول سے ہی یہ کہے کہ ادھار پر یہ چیز اتنی قیمت سے بیچتا ہوں اور یہ قیمت بازار کے حالیہ بھاؤ سے زیادہ ہو تو اس پر یہ حدیث دلالت نہیں کرتی' اس صورت کو جو دلیل لینے والے اس روایت سے منع کرتے ہیں یہ دلیل دعوٰی کے مطابق نہیں ہے۔" کیونکہ دلیل خاص ہے اور دعوٰی عام ہے۔ (ان میں تقریب تام نہیں ہے)

دیگر یہ کہ جس تفسیر کی بنا پر یہ علت بیان کی گئی ہے' اس تفسیر والی روایت اور ہے اور جس میں ربا کا ذکر ہے وہ اور ہے' ربا والی روایت ضعیف ہے' اس کے ایک راوی کی بابت نیل میں لکھا ہے وقد تکلم فیه غیر واحد "یعنی اس میں بہت سے محدثین نے کلام کی ہے۔" پھر فرمایا ہے لان ذالک المتمسک هو الروایة الاولٰی من حدیث ابی هریرة وقد عرفت ما فی راویها من المقال ومع ذالک فالمشهور عنه اللفظ الذی رواه غیره وهو النهی عن بیعتین فی بیعة ولا حجة فیه علی المطلوب۔ "یعنی محل استدلال ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کے راوی پر جرح معلوم ہو چکی ہے اور مشہور روایت صرف اتنی

ہے کہ ایک بیع میں دو بیع سے منع کیا' سو یہ مقصود پر دلیل نہیں ہے۔" پس معلوم ہوا کہ یہ دلیل اور استدلال بیکار ہے جو عموم اولہ کے مقابلہ میں قبیح نہیں ہے۔ فتفکر ولا تکن من الغافلین۔

(پانچویں دلیل) یہ حدیث موقوف کل قرض جر منفعة فھو ربا "یعنی ہر وہ قرض جو نفع کھینچے وہ بیاج (سود) ہے۔" بلوغ المرام میں ہے کہ مرفوع حدیث کی اسناد ساقط ہے اور شاہد اس کا ضعیف ہے۔ حاشیہ بلوغ المرام میں ہے کہ لم یصح فیه شئی "کہ اس بارہ میں کوئی دلیل صحیح نہیں ہوئی۔" ہاں موقوف روایت صحیح ہے مگر وہ حجت نہیں ہے۔ خصوصاً احکام میں اس سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ پھر یہ روایت اپنے عموم پر نہیں ہے کیونکہ جو نفع مشروط نہ ہو وہ حلال ہے۔ کما لا یخفی علی اھل العلم۔ پس کلیت باطل ہوئی اور یہ روایت متروک الظاہر ہوئی جو نصوص قطعیہ کے مقابلہ میں حجت نہیں ہے۔

دیگر یہ کہ صورت مسئولہ میں نفع احتمالی ہے جیسے کہ اس کی تفصیل ہو چکی ہے کہ آئندہ کے لحاظ سے بعض وقت مشتری کو نفع ہوتا ہے اور بعض وقت بائع کو (جبکہ بھاؤ جنس کا ارزاں ہو جائے) تو مفتی صاحب نفع ونقصان کے امکان میں جواز کے قائل ہیں' جیسا کہ جواب ثانی میں فتویٰ درج ہے' بہرکیف آپ کا فتویٰ قابل اصلاح ہے۔ لہٰذا نظرثانی فرما دیں۔

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالقادر عارف حصاری

اہل حدیث سوہدرہ' جلد-۶' شمارہ-۵' ۶' ۷' ۱۱' ۲۸' ۲۹

مورخہ یکم و ۸ و ۲۶ فروری و ۸ مارچ و ۲۴ جولائی و یکم اگست سنہ ۱۹۵۴ء

مسئلہ بیع سلم

دوسرا فتویٰ الاعتصام جلد-۱۹' شمارہ-۵۱ مطبوعہ ۱۹/ جولائی سنہ-۱۹۶۸ء میں ایک سوال درج ہے کہ "عمرو نے زید سے کہا کہ مجھے پانچ سو روپے دے دو میں تمہیں گندم کی فصل پر جس میں دو تین ماہ باقی ہیں' گندم دے دوں گا۔ زید نے جواب دیا کہ میں گندم دس روپے من لوں گا حالانکہ اس وقت گندم بازار میں بائیس روپے من فروخت ہو رہی ہے۔ عمرو روپیہ لے کر اس بھاؤ گندم دینے پر رضامند ہو گیا۔"

اب ایک شخص کہتا ہے یہ ظلم ہے' اس لیے ناجائز ہے۔ اگر جائز ہے تو اس کے جائز ہونے کی تفصیل تحریر کریں۔

اس کا جواب مولانا عبداللہ بڈھیمالوی' مدرس جامعہ سلفیہ لائل پور یوں تحریر فرماتے ہیں : "اگر لینے والا لاچار اور عاجز ہو کہ نہ لے بلکہ اپنی خوشی سے خریدے تو منع کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگر لینے والا عاجز اور بس بس ہے یعنی اس لائق ہے کہ اس پر صدقہ کیا جائے اور زکوٰۃ لینے کا مستحق ہے تو مالداروں کو چاہی کہ اس پر رحم کریں نہ کہ اس لاچاری میں اس کا خون چوسیں اور بے بس اور فقیر کر دیں۔ حدیث شریف میں ہے : ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السمآء۔ یعنی تم زمین والوں پر رحم کرو' آسمان پر جو اللہ کی ذات ہے وہ تم پر رحم کرے گا۔"

یہ فتویٰ مخدوش اور اہل رائے کی طرح قیاسی ہے جو اصل مسئلہ سے بالکل غیر متعلق ہے۔

اب غور کیجئے کہ سائل کا سوال بالکل صاف ہے کہ عمر زید سے مبلغ پانچ سو روپیہ لے کر اپنی گندم کا سودا کر رہا ہے۔ اس کی فصل کھڑی ہے' گندم برآمد ہونے کی امید قوی ہے۔ زید گندم کا بھاؤ مقرر کر کے روپے دینے منظور کرتا ہے اور عمر اس کو رضامندی سے قبول کر لیتا ہے۔ اس کا محدثانہ جواب یہ ہونا چاہیے تھا کہ عمر' زید کا یہ باہمی معاملہ شرعاً "بیع سلم" کی صورت کا ہے جس کو اہل حجاز کی لغت میں "بیع سلف" کہتے ہیں۔ اس میں چند شرائط ہیں جو فریقین کو ملحوظ رکھنی چاہئیں۔ مثلاً :

جنس مبیع کا مقرر اور معلوم ہونا اور بھاؤ' ماپ تول کا طے ہونا اور اس کی مدت ادائیگی معین کرنا اور اس جنس کے بھاؤ اور مقدار کی رو سے حساب کر کے اس کی قیمت نقد اسی مجلس میں ادا کرنا وغیرہ جو شرائط کتب حدیث اور ان کی شروح سے مستفاد ہوتے ہیں' لکھے جاتے اور بیع سلم کے ثبوت میں یہ دلائل دیئے جاتے جو مفتی صاحب طلباء کو کتب حدیث میں پڑھاتے ہیں۔

چنانچہ بلوغ المرام مع شرح سبل السلام' جزء ثالث ص۔۷۴ میں ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف فرما ہوئے تو ہم باغوں کے پھلوں کی بیع سلف کرتے تھے۔ جس کی مدت سال' دو سال' تین سال مقرر کر لیتے تھے۔ آنحضرت

ﷺ نے فرمایا فلیسلف فی کیل معلوم ووزن معلوم الی اجل معلوم (متفق علیہ) "یعنی بیع سلف کرو تو ماپ تول اور مدت مقرر ہونی چاہیے۔"

عبداللہ بن ابی اوفیٰ اور عبدالرحمٰن بن ابزی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم جناب سرور کائنات ﷺ کے ساتھ بموقع جنگ ہوتے تو مال غنیمت پاتے تھے۔ اس حال میں ہمارے پاس ملک شام کے نبطی لوگ آجاتے تو ہم ان سے گندم' جَو' زیتون کی جنسوں میں بیع سلم کرتے تھے۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ مدت مقرر ہوتی۔ کسی نے پوچھا کیا تم ان سے یہ دریافت کیا کرتے تھے کہ ان جنسوں کی تمہاری کھیتی موجود ہے؟ صحابی راویوں نے کہا کہ ہم نے ان سے یہ کبھی نہیں پوچھا۔

ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے ہیں : کنا نسلف علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وابی بکر وعمر فی الحنطة والشعیر والزیت والتمر ما نراه عندهم "یعنی عہد نبوی ﷺ میں اور عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں ہم جنس گندم' جَو' زیتون اور کھجور میں بیع سلف کیا کرتے تھے اور جن کو ہم قیمت دے کر جنس لینی کرتے تھے ان کے پاس یہ جنس ہم نہیں دیکھتے تھے۔"

ان دلائل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ضرورت مند لوگ مالداروں سے اور مالدار تاجر کاشتکاروں' زمینداروں سے عہد نبوی اور عہد خلفاء میں بیع سلف عام طور پر سفر وحضر میں کیا کرتے تھے۔ شارع علیہ السلام وخلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے ایسے موقعوں پر کبھی یہ نہ کہا کہ دیکھو مسکینوں اور حاجت مندوں پر رحم کرو اور ان کا خون نہ چوسو بلکہ مال روپیہ ان پر صدقہ کر دو۔ معاملات خرید وفروخت جو باہمی رضامندی سے ہوں' سب جائز ہیں اور یہ علیحدہ شعبہ ہے اور زکوٰۃ صدقات کرنے کا شعبہ اور ان کے مصارف کا شعبہ الگ ہے۔ کوئی محتاج مفلس سائل ہو کر آئے اور اس پر مالدار رحم کریں یہ الگ شعبہ ہے۔

بیع سلف میں ایسے شعبوں کو خلط ملط کر کے ظلم اور ناجائز بنانا سراسر نادانی ہے۔ عہد نبوی میں غرباء مساکین بہت تھے جو ضرورتوں' حاجتوں سے جنسوں کو بیع سلم سے فروخت کرتے تھے تو آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر یہ رحم اور ظلم کا مسئلہ بیان کیوں نہ کیا۔

سبل السلام میں ایسے موقعہ پر یہ قاعدہ لکھا ہے کہ ترک الاستفصال فی مقام

الاحتمال ینزل بمنزلة العموم فی الحال۔ ''یعنی جس موقع پر شارع حکم بیان کر رہا ہے اس میں کسی احتمال کے مقام پر اس کا فیصلہ اور فرق بیان چھوڑ دے تو وہ حکم بمنزلہ عموم کے ہوتا ہے۔''

اس میں کسی کو کوئی احتمال پیدا کر کے اپنی طرف سے حکم لگانا تخصیص عام بلا مخصص ہو گی جو شرعاً جائز نہیں ہے۔ سوال میں اس احتمال رحم کا کوئی مقام نہیں ہے۔ مفتی نے مجتہدین کو خود ہی احتمال پیدا کر کے اپنے وجدان سے اس کا جواب بنا لیا جو معاملات تراضی میں بالکل مردود ہے کہ اس کو خواہ مخواہ ظلم اور بے رحمی قرار دیا ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہل حدیث لاہور' مورخہ ۴/ اکتوبر سنہ۔۱۹۶۸ء

بحث بیع المضطر:

اُدھار بیع کی صورت میں قیمت کی زیادتی کا مسئلہ

سوال : کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل مسئلہ کے متعلق کہ گندم کا عام بھاؤ چودہ روپے من ہو اور زید کہتا ہے کہ میں سولہ روپے دوں گا۔ ضرورت مند اس سے سولہ روپے من کے حساب سے لے جاتا ہے کیا زید کے لیے یہ فعل جائز ہے؟

الجواب : اگر ضرورت تاجر ہو تو یہ سودا جائز ہے' الا ان تکون تجارة عن تراض منکم الایہ میں داخل ہے اور اگر مضطر ہے اور نرخ مذکورہ بازاری نرخ سے زیادہ ہو تو یہ درست نہیں۔ حدیث نہی بیع مضطر کے نیچے آتی ہے۔ (ملفظہ)

اس فتویٰ سے ان لوگوں کے مسلک کا رد ہو گیا جو یہ فرمایا کرتے ہیں کہ ''بازاری نرخ سے ادھار پر زیادہ قیمت لگا کر اناج فروخت کرنا بیاج میں داخل ہے۔''

اس دور کے عظیم محدث گوندلوی صاحب مولانا محمد عطاء اللہ حنیف اور حافظ محمد عبداللہ بڈھی مالوی کے استاد ہیں۔ ان کا فتویٰ ان ہر دو صاحبان پر فائق ہے کیونکہ مفتی صاحب ایک تو ان کے امیر جماعت ہیں' دوم استاد ہیں۔ جن کا علم مفتی صاحب سے مستفاد ہے۔ کہتے ہیں : نور القمر مستفاد من نور الشمس ''قمر کا نور شمس کے نور سے مستفاد ہے۔''

مذکور فتویٰ دو وجہ سے غلط اور باطل ہے۔
ایک یہ کہ جس روایت سے استدلال کیا ہے' یہ ضعیف ناقابل استدلال ہے۔ ضعیف حدیث سے حرام وحلال وغیرہ احکام شرعیہ پر دلیل لانا بروئے اصول محدثین جائز نہیں ہے۔ جیسے کتب اصول حدیث میں اس کی صراحت ہو چکی ہے۔ جو حضرت فاضل مفتی مدظلہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔
دوسری وجہ یہ کہ حدیث نہی بیع مضطر سے' صورت مذکورہ پر دلیل لانا بالکل بے محل ہے۔ کیونکہ اس بیع میں شرعی تراضی بین الفریقین ہوتی ہے۔ زمیندار لوگ امیر وغریب اپنے مفاد کے لیے کرتے ہیں۔ اضطرار شرعی کا اس میں نام ونشان بھی نہیں ہے بلکہ لوگ احسان سمجھتے ہیں اور نہایت منت اور سماجت سے اناج ادھار لے جاتے ہیں اور فصل ربیع پر اناج برآمد ہوتا ہے یا فصل خریف پر کپاس وغیرہ کی پیداوار آکر زمینداروں کے پاس روپیہ کی فراوانی ہو جاتی ہے تو قیمت دینی آسان ہو جاتی ہے۔ تنگ دستی کے وقت قرض لیا ہوا یسر (آسانی) کے وقت ادا کرنا ہرگز اضطرار میں داخل نہیں ہے۔ پس یہ استدلال روایت اور درایت کی رُو سے نہایت ہی غلط ہے۔ اب ہر دو وجہ کی تفصیل ملاحظہ ہو۔
وجہ اول' تغلیط کی یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ چنانچہ ابوداؤد میں یہ روایت موجود ہے جس میں ایک راوی صالح بن عامر ہے جس کو حافظ ابن حجر نے تقریب وغیرہ میں کثیر الخطاء قرار دیا ہے اور امام ابن معین رئیس الجارحین نے اس کو ضعیف بتایا ہے اور بعض ائمہ نے اس کی توثیق کی ہے۔ بہرحال یہ راوی متکلم فیہ اور مخدوش ہے۔
وجہ دوم' یہ کہ اس سند میں ایک راوی مجہول بھی ہے۔ چنانچہ سند کے الفاظ اس پر دال ہیں جو یہ ہیں : قال محمد حدثنا شیخ من بنی تمیم "یہ شیخ بنی تمیم کا راوی مجہول ہے۔" جس روایت میں راوی مجہول العین اور مجہول الحال واقع ہو' وہ روایت ضعیف ہوئی۔ چنانچہ مشکوٰۃ کی تخریج تنقیح الرواۃ کی جلد ثانی' ص-۱۷۰ میں یہ لکھا ہے : ھذا الشیخ مجھول فالحدیث ضعیف "اس حدیث کی اسناد میں ایک راوی شیخ مجہول ہے۔" پس اس وجہ سے یہ حدیث ضعیف ہے۔
مسند احمد میں حدیث نہی بیع مضطر کی درج ہے۔ اس کی شرح بلوغ الامانی جلد-۱۵' ص-۴۴ میں ہے : وفی اسنادہ رجل لم یسم "اس حدیث کی اسناد میں ایک راوی ایسا ہے جس کے نام کا پتہ نہیں ہے۔" یعنی مجہول العین ہے۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ نے حدیث بیع مضطر کی دو طریق سے ذکر فرمائی ہے اور پھر یہ لکھتے ہیں :
هذان الخبران لقلنا بهما سارعين لكنهما مرسلان ولا يجوز القول في الدين بالمرسل۔
(ص۔۲۴' جلد) "یعنی ہر دو روایتیں مرسل ہیں۔ اگر مرسل نہ ہوتیں تو ہم ان کو دوڑ کر لے لیتے لیکن حدیث مرسل پر حکم دینی کا دارومدار رکھ کر اس کو جاری کرنا جائز نہیں ہے۔"

یہ حال تو اس حدیث کی روایت کا ہے کہ سراسر ضعیف ہے' جس سے استدلال جائز نہیں ہے۔

درایت کی رُو سے یہ استدلال بایں طور پر باطل ہے کہ صورت مسئولہ میں بیع مضطر کی نہیں ہے کیونکہ مضطر کی صورتیں جو محدثین نے بیان کی ہیں' وہ اس صورت پر صادق نہیں آتیں۔ امام ابوداؤد نے اس حدیث پر یوں باب باندھا ہے : باب بيع المضطر "یہ باب مضطر کی بیع کے بیان میں ہے۔"

مولانا وحید الزمان رحمہ اللہ اس کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں : "یعنی ستائیں گے' ایذا دیں گے' لاچاری سے بیع کریں گے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا مضطر کے مال خریدنے سے یعنی ضرورت والے کے مال کو ارزاں خریدنے سے یا زبردستی کسی کا مال خریدنے سے اور دھوکہ کی بیع سے۔"

اور کتب شروح حدیث اور اس حدیث کے حواشی میں یہ لکھا ہے کہ اس کی دو صورتیں ہیں۔ (ا) ایک یہ کہ بائع مجبور ہو کر بصورت اکراہ کسی چیز کو بیچے تو یہ بیع فاسد ہے۔ (۲) دوسری صورت یہ کہ قرض سے لاچار ہو کر کسی چیز کو بیچے یا گھر والوں کی مئونت نے گھیر لیا پھر کسی چیز کو مجبور ہو کر بیچا۔

یہ صورتیں بیع مضطر کی ہیں۔ ان صورتوں میں بائع کی مجبوریوں کا ذکر ہے کہ اس پر ایسا جبر واکراہ ہوا۔ گھر والوں کی طرف سے یا اکراہ باہر سے کہ اس نے کوئی چیز دل کی ناراضگی سے بیع کی تو یہ بیع مضطر کی ہے۔ سو یہ بائع کے حق میں ہے۔ مشتری کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر مشتری کو بائع پر قیاس کر کے اس کی شرائط کو بھی بیع مضطر میں داخل کریں تو یہ قیاس فاسد ہو گا کیونکہ مشتری پر کوئی اکراہ بائع کی طرف سے نہیں ہے۔

اسی لیے تو ادھار کا بھاؤ ہر امیر اور غریب کے لیے عام طور پر کھول رکھا ہے جس کی مرضی ہو خریدے اور جس کی مرضی نہ ہو نہ خریدے۔ صرف خانگی ضرورت اور حاجت کو

اکراہ نہیں کہتے۔ کیونکہ اکثر معاملات ضرورتوں اور حاجتوں کی بناء پر ہوتے ہیں۔ یہ کسی صورت سے بھی اضطرار نہیں ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے خانگی ضرورت کی بناء پر ایک یہودی سے اناج قرض خریدا اور اپنی زرہ گروی رکھ دی۔ یہ اناج کی بیع مضطر کی بیع نہیں تھی بلکہ تراضی سے تھی۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی تھی کہ یہودی سے زرہ کا فیصلہ کر لیں' چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اگر یہ بیع مضطر ہوتی تو آنحضرت ﷺ یہودی سے یہ بیع کبھی نہ کرتے بلکہ امت کو بھی منع فرما دیتے کہ گھر کی تنگ دستی سے تنگ آ کر بیع و شرا نہ کرو کہ یہ بیع مضطر ہے جو بیع فاسد ہے۔ مگر آپ نے کسی کو منع نہیں فرمایا تو بیع جائز ہے۔ یہی جمہور علماء کا مذہب ہے۔

پھر صورت مذکورہ کا ان صورتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ آسانی کے وقت مقدرہ کی شرط سے ہوتی ہے۔ اس میں اضطرار نہیں ہے' اس لیے یہ بیع صحیح ہے۔ چنانچہ تنقیح الرواۃ میں ان صورتوں کے بعد یہ لکھا ہے کہ ولکن یعار او یقرض الی المیسرۃ او یشتری الی المیسرۃ او یشتری السلعۃ بقیمتھا فان عقد البیع مع الضرورۃ علی ھذا الوجہ صح مع کراھۃ اھل العلم۔ "یعنی اگر آسانی کے زمانہ تک کسی سے کوئی چیز عاریتاً یا ادھار لے یا آسانی کے وقت تک کوئی چیز خرید لے یا قیمت سے کسی کا سامان خریدے۔ پس اگر یہ عقد اس صورت سے کسی سے کیا گیا جو ضرورت لاحق ہونے کی وجہ سے تھا تو یہ عقد صحیح ہے۔ مگر اہل علم نے مروت کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس کو کراہت سے دیکھا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ عقد بالاجماع صحیح ہے اور کراہت بھی اس میں کوئی نہیں ہے کیونکہ ایک تو اس میں مشتری کو زمانہ میسرہ تک مہلت دی گئی ہے۔ اس کی نقد قیمت وصول نہیں کی گئی اور دوسرا یہ کہ اناج ہو یا گھی' ہر چیز کا بھاؤ بدلتا رہتا ہے۔ نفع و نقصان قسمت کا ہے۔ بعض وقت بازاری بھاؤ سے کسی چیز کی قیمت زیادہ لگائی گئی پھر زمانہ آسانی میں ادائیگی قیمت کے وقت اس چیز کا بھاؤ بیع کے وقت کے بھاؤ سے بلحاظ قیمت بڑھ گیا۔

مثلاً ہاڑ کے بعد ماہ اسوج میں کسی سے اناج ادھار اٹھارہ روپے من لیا' بازاری بھاؤ پندرہ روپے تھا۔ جب ماہ ماگھ آیا اور کپاس اُتری اور روپیہ وافر ہو گیا تو اناج بیس روپیہ من ہو گیا۔ اگر کسی نے بائع سے ایک من اناج جنس اناج دینے کی صورت سے لیا ہوتا' بصورت ادھار تو اس کو اناج خرید کر دینا پڑتا اور وہ بیس روپے من ملتا۔ لیکن جس نے قیمت سے ادھار لیا

تو اس کو اٹھارہ روپے دینے آسان ہو گئے۔

اب مفتی صاحب بتائیں کہ مضطر کون ہوا؟ پھر مفتی صاحب یہ بتائیں کہ عقد بیع کے وقت کے بھاؤ سے اضطرار کا حکم لگایا جائے گا' یا وقت ادائیگی قیمت کے بھاؤ سے اضطرار شمار ہو گا؟ اگر شق اول ہے تو اس وقت مشتری سے کچھ بھی نہیں لیا گیا بلکہ اناج یا مال دیا گیا ہے پھر اضطرار کیسے ہوا؟ اس کو اناج مل گیا جس سے اس کے اہل و عیال کا فاقہ دور ہوا۔ اگر ادائیگی کے وقت کے بھاؤ کے لحاظ سے اضطرار ہے تو اس وقت روپیہ کی فراوانی ہو گئی پھر اضطرار کیسا؟

بہرحال ضرورت اور حاجتوں سے خرید و فروخت کرنے کو اضطرار کہنا باطل ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں : فلو بطل ابتیاع هذا المضطر بطل بیع کل من لا یصیب القوت من ضیقه وهذا باطل بلا خلاف۔ "یعنی اگر اس طرح ضرورتوں اور حاجتوں کی وجہ سے اس مضطر کا خریدنا باطل ہو جائے تو پھر اس شخص کی بیع باطل قرار پائے گی' جس کو قوت میسر نہ ہوا ہو' اپنے سامان سے۔ یہ بالاتفاق باطل ہے۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بیع ادھار' ادھار کی مروجہ مذکورہ در سوال بیع مضطر کی نہیں ہے لہذا فتویٰ غلط ہے۔

از عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہلحدیث لاہور' مورخہ ۱۸/ اکتوبر سنہ ۱۹۶۸ء

نقد اور اُدھار بیع میں نرخ کی کمی بیشی کا مسئلہ

(۱)

محترم مولانا محمد صاحب خطیب جامع اہل حدیث شام کوٹ نو (غربی)

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

سوال : اس وقت ہمارے مواضعات میں حاضر مال اچھی گندم کا بھاؤ مبلغ سولہ روپے فی من مقرر ہے جو کہ کھلے بازار نقد اور ادائیگی کی صورت میں ملتی ہے۔ زید' بکر سے تین چار ماہ کے عرصہ کے لیے گندم ادھار طلب کرتا ہے۔ بکر کہتا ہے کہ میں ادھار پر بیس روپے فی من کے حساب سے گندم دوں گا۔ زید اس بیع کو بخوشی منظور کرتا ہے اور بکر بیس روپے فی

من کے حساب سے گندم زید کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ کیا یہ شرعاً جائز ہے؟ اگر جائز نہیں تو مناسب شرعی احکام سے مطلع فرمایا جائے۔ بعض علماء کرام اس کو سود تصور کرتے ہیں۔ (سائل : صوفی قاسم علی شام کوٹ نو)

الجواب : سائل کے سوال میں ابہام ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے علاقے میں خرید وفروخت اس طریقہ پر شہرت پکڑ گئی ہے کہ جس کے پاس گندم ہے وہ کہتا ہے کہ میں نقد والے کو فی من دس روپیہ دوں گا اور ادھار والے کو فی من پندرہ روپے دوں گا۔ ان دو بھاؤں سے جو منظور ہو خرید لیں۔

اس قسم کی بیع قرآن وحدیث کی رُو سے فاسد اور ناجائز ہے۔ اس بیع کو صاحب مشکوۃ نے ان بیعوں میں بیان کیا ہے جو شرعاً باطل اور ناجائز ہیں۔ امام نسائی نے باب کی شکل پیش کر کے اور اس کے تحت حدیث کو بیان کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس طرح کی بیع سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے :

بیعتین فی بیعة وهو ان یقول ابیعک هذه السلعة بمائة درهم نقد او بمائتی درهم نسیئة عن ابی هریرة رضی الله تعالٰی عنه قال نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیعتین فی بیعة۔ (نسائی۔۶۹۷) ”ایک بیع میں دو بیعتین کرنا یہ ہے کہ میں یہ سامان آپ کو نقد سو روپیہ کو دوں گا۔ اگر ادھار لیں تو دو سو کو دوں گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس طرح کی بیع سے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔“

قال مالک فی رجل اشتری من رجل سلعة نقد او بشاة موصوفة الی اجل قد وجب علیه البیع باحد الثمنین ان ذلک مکروه ولا ینبغی لان رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی عن بیعتین فی بیعة وهذا من بیعتین فی بیعة۔ (موطا امام مالک ص۔۴۷۲) ”امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے خریدا بکری کو نقد ایک دینار سے اور ادھار دو دینار سے اور ان دونوں بھاؤں سے ایک بھاؤ پر بیع واجب ہو گئی یعنی ایک قیمت تعین ہو گئی۔ یقیناً یہ بیع حرام ہے اور مسلمان کے لیے یہ بیع کرنا ناجائز ہے اس لیے کہ نبی ﷺ نے اس طرح کی بیع سے منع فرمایا ہے۔“

ایک بیع میں دو بیعیں کرنے سے نبی ﷺ نے جو منع فرمایا ہے وہ یہی بیع ہے بوجہ طوالت کتب کے حوالہ پر اختصار کرتا ہوں۔

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب المحلّٰی الجزء التاسع ص۔۲۶ میں فرماتے ہیں : "نقد قیمت کی کمی اور ادھار کی زیادتی میں جو بیع کی صورتیں پیدا ہوں گی تمام کی تمام حرام ہوں گی۔"

فھٰذا کلہ حرام منسوخ ابدًا محکوم فیہ بحکم الغصب ' اس طرح کی بیع غریبوں کے مال پر ڈاکہ مارنے کا حکم رکھتی ہے۔

سبل السلام۔۲۳' موطا امام مالک۔۲۷۴' مشکوٰۃ مع تنقیح الرواۃ' مشکوٰۃ مع شرح مظاہر حق۔۳/۷' ابوداؤد۔۱۳۴' الھدایہ ابن حجر۔۲۸۲' نسائی شریف۔۲۹/۷' المحلّٰی ابن حزم جلد۔۹۔ ان کتابوں میں موجود ہے کہ نقد قیمت اور ادھار قیمت میں فرق کرنے سے یعنی ایک وقت میں بیع حرام اور باطل ہو جاتی ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی ص۔۲۳۶ پر لکھتے ہیں : علی ان غایۃ ما فیہ الدلالہ علی المنع من البیع اذا وقع علی ھذہ الصورۃ وعلٰی ان یقول نقدا بکذا او نسیئۃ بکذا۔

اگر اس طریقہ سے بیع کی جائے کہ نقد دس روپیہ اور ادھار پندرہ روپیہ تو یہ بیع فاسد اور ناجائز ہے۔

قال اللّٰہ تعالٰی فی القرآن الحکیم ولا تنسوا الفضل بینکم قال علٰی رضی اللّٰہ عنہ سیاتی علی الناس زمان عضوض یعض المو سر علٰی ما فی یدیہ ولم یومر بذلک عن حذیفہ انہ حدث عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ قال ان بعد زمانکم ھذا زمانا عضوضا یعض الموسر علٰی ما فی یدیہ ولم یومر بذلک الحرام المسلم اخو المسلم لا یظلم ولا یخونہ وان کان عندک خیر تھدیہ علی اخیک ولا تزدہ ھلاکا الی ھلاکہ۔

جو صورت بیع کی سائل نے اپنے سوال کی بیان کی ہے وہ ناجائز اور فاسد ہے۔ اس لیے جو بیع کی شکل جواب میں بیان کی گئی ہے اس بیع کی تہ میں ایک برائی ہے۔ اس طرح کی خرید وفروخت اقسام سود سے ہیں۔

راقم

محمد خطیب مدرسہ محمدیہ

شام کوٹ نو' تحصیل چونیاں ضلع لاہور۔

الجواب (۲)

از محقق شہیر عبدالقادر حصاری

آج مورخہ ۱۴/ نومبر سنہ ۱۹۶۱ء کو ایک فتویٰ بذریعہ ڈاک موصول ہوا جو صوفی قاسم علی صاحب نے شام کوٹ سے ارسال کیا ہے اور درخواست کی ہے کہ اس کے صحیح یا غلط ہونے کی نسبت کتاب وسنت کی رُو سے غور کیا جائے۔ اس فتویٰ میں پہلے جو سوال درج ہے' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "گندم کا بھاؤ نقدی بازار میں سولہ روپے من ہے۔ زید' بکر سے ایک معین مدت کے وعدہ پر گندم ادھار خریدتا ہے۔ بکر اس کو بیس روپے من گندم بیع کر دیتا ہے جس کو زید بخوشی لے کر چلا جاتا ہے اور وعدے پر روپے ادا کر دیتا ہے۔ یہ جائز ہے یا نہیں؟"

اس کا جواب شام کوٹ کے ایک مفتی صاحب نے دیا ہے جن کا اسم گرامی محمد ہے۔ اس فتویٰ میں سائل کے نفس مسئلہ کا کوئی مدلل جواب نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے اپنی طرف سے ایک موضوع حدیث تراش کر فتویٰ صادر کیا ہے جو سراسر غلط بلکہ باطل ہے پھر اپنے اختراعی موضوع پر بھی جو دلائل دیئے ہیں وہ بھی غلط ہیں کہ دلیل اور دعویٰ میں مطابقت نہیں ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

> "جس کے پاس گندم ہے وہ کہتا ہے کہ میں نقد والے کو فی من پندرہ روپے دوں گا۔ ان دو بھاؤں سے جو منظور ہو خرید لیں۔ اس طرح کی بیع قرآن وحدیث کی رُو سے فاسد اور ناجائز ہے۔"

مفتی صاحب کا یہ قول بالکل غلط ہے کہ وہ اس کو بیع قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ کسی مذہب میں بھی بیع نہیں ہے۔ یہ تو اناج کا مالک اپنے اناج کا بھاؤ بتلا رہا ہے کہ نقدی بھاؤ یہ ہے اور ادھار کا بھاؤ یہ ہے جس طرح کوئی چاہے خریدے۔ اب کوئی خریدار نقدی کا یا ادھار کا آئے گا اور وہ کوئی بھاؤ اور قیمت مقرر کر کے عقد بیع کرے گا تب بیع ہو گی۔ بیع میں تو کسی چیز کی قیمت معین ہو کر بائع اور مشتری کا ایجاب وقبول لین دین ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی نے آکر اس اناج والے سے یہ کہہ دیا کہ میں نقد خریدتا ہوں اور سولہ روپے من کے دوں گا' بائع نے منظور کر کے گندم ایک من دے دی اور روپے وصول کر لیے تو یہ بیع ہو گئی کہ بیع کے رکن ایجاب قبول پائے گئے اور شرائط بھی موجود ہیں۔

اسی طرح کسی نے دوسرے وقت آکر یہ کہا کہ میں گندم ادھار خریدنا چاہتا ہوں۔ بائع یہ کہتا ہے کہ بیس روپے من کے حساب سے دوں گا اور فلاں ماہ کی فلاں تاریخ کو یہ قیمت وصول کروں گا۔ وہ خریدار اس کو منظور کر کے کہتا ہے کہ اچھا گندم تول دو' وہ تول دیتا ہے۔

یہ بیع بطور اقرار نامہ لکھی بھی جاتی ہے اور زبانی بھی عہد ہو جاتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے' کیونکہ بیع کی تعریف اس پر صادق آتی ہے جو یہ ہے : هو مبادلة مال بمال على سبيل التراضى۔ (حاشیہ نیل الاوطار جلد۔۵' ص۔۱۴۲) "یعنی دو شخصوں کا باہمی رضامندی سے مال کو مال سے بدلنا بیع کہلاتا ہے۔"

اگر دونوں طرف سے قیمت اور جنس نقد دی' لی جائے تب نقدی بیع کہلاتی ہے اور اگر جنس ادھار ہو اور قیمت نقد ہو تو بیع ادھار کہلاتی ہے۔ جیسے آنحضور ﷺ نے یہودی سے اناج قرض لیا تھا۔ حدیث میں ہے : ان النبى صلى الله عليه وسلم اشترى طعاما من يهودى نسيئة۔ "یعنی نبی اکرم ﷺ نے اناج ادھار خریدا تھا۔"

دیگر حدیث میں یہ وارد ہے کہ نبی ﷺ نے ایک یہودی کی طرف آدمی بھیجا کہ مجھے ایک آسانی کی مدت تک دو کپڑے بیع کر دو۔ بہرحال اناج' حیوان' کپڑا' برتن وغیرہ ادھار پر خریدنا یہ بھی بیع بالتراضی ہے جو جائز ہے۔ رہی یہ بات کہ ادھار کے بھاؤ اور نقد کے بھاؤ کا ایک ہونا ضروری ہے یا دونوں میں فرق ہو' تب بھی جائز ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ نقد ہو یا ادھار' نرخ اور قیمتیں مقرر کرنا متعاقدین یعنی بائع (بیچنے والا) اور مشتری (خریدار) کے آپس کی رضامندی پر موقوف ہے۔ نقدی ہو یا ادھار جو طے کر لیں' وہی جائز ہے۔

نقد اور ادھار کے نرخ کا ایک ہونا کوئی شرط نہیں ہے بلکہ نقدی بھاؤ بھی دو طرح کے ہوں تو بھی جائز ہے۔ مثلاً سولہ روپے من گندم کا بھاؤ ہو اور اس کو کوئی شخص پندرہ روپے من کے حساب سے بیع کر دے تب بھی جائز ہے اور اگر سترہ روپے من فروخت کر دے تب بھی جائز ہے۔ اسی طرح ادھار پر کوئی اٹھارہ روپے من فروخت کر دے' کوئی سترہ روپے من اور کوئی بیس روپیہ من بیچ دے تو یہ سب جائز ہے۔

نقدی' ادھار کا ایک بھاؤ مقرر کرنا یا بازار میں چیزوں کا ایک نرخ باندھنا' جسے آج کل کی اصطلاح میں کنٹرول کہتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ عہد رسالت ﷺ میں اناج وغیرہ چیزیں گراں ہو گئیں' نرخ بڑھ گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دربار رسالت میں درخواست

کی کہ "یارسول اللہ! آپ چیزوں کے بھاؤ مقرر کر دیں تو ٹھیک ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا : ان اللہ ھو القابض الباسط الرازق المسعر انی لارجو ان القی اللہ عزوجل ولا یطلبنی احد بمظلمۃ ظلمتھا ایاہ لا فی دم ومال۔ (رواہ الخمسہ الا النسائی وصححہ الترمذی) "یعنی تحقیق اللہ تعالیٰ ہی تنگ کرنے والا' فراخ کرنے والا' رزق دینے والا اور چیزوں کے بھاؤ مقرر کرنے والا اور ارزانی گرانی کا اختیار رکھنے والا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملوں گا کہ کوئی شخص مجھ سے اپنی جان یا مال میں ظلم کرنے کا عدالت الٰہی میں مطالبہ پیش نہ کرے گا۔"

میں کہتا ہوں کہ آنحضور ﷺ نے نرخ مقرر کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ یہ حکیمانہ اور دانش مندانہ اصول ہے کہ اس سے تاجر لوگوں کے مالوں میں ناحق کی دخل اندازی ہے اور ان کو ان کے مالوں میں اختیاری تصرفات سے روک دینا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی چیزوں کے خود مختار' مالک نہیں رہتے۔ اس لیے تسعیر یعنی نرخ باندھنا حرام اور تاجروں پر ظلم ہے۔

نیل الاوطار میں اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ووجھہ ان الناس مسلطون علی اموالھم والتسعیر حجر علیھم۔ الخ "یعنی لوگ اپنے مالوں پر غالب اور خودمختار ہیں۔ نرخ مقرر کرنے سے ان کے اختیار اور تصرف کو روک دینا ہے' یہ ظلم ہے۔"

میں کہتا ہوں جو حکام اناج وغیرہ اشیاء کی گرانی پر رعایا پر رحم کرنے کے ارادہ سے نرخ مقرر کر دیتے ہیں اور پھر جب کوئی اس نرخ مقررہ سے کم وبیش دے تو اس پر جرم لگاتے ہیں یا اس کے مال پر جبر اور ظلم کرتے ہیں' یا اس کو قید وغیرہ کر دیتے ہیں' یہ سراسر ظلم ہے۔ مذکورہ بالا فرمان نبوی ﷺ کی رُو سے قیامت کے دن ایسے لوگوں سے بازپرس ہو گی۔

تعاقب قادری بر فتویٰ محمدی: میاں قاسم علی صاحب شام کوٹی کا سوال اپنے معمول تجارت کے مطابق یہ تھا کہ گندم کا نقدی بھاؤ بازار میں سولہ روپے من ہے۔ زید تین چار ماہ کے عرصہ کے لیے بکر سے گندم طلب کرتا ہے۔ بکر کہتا ہے کہ "میں ادھار پر بیس روپیہ من کے بھاؤ سے گندم دوں گا۔" زید بخوشی اس بھاؤ کو منظور کر لیتا ہے اور بکر بیس روپیہ من کے حساب سے گندم زید کو فروخت کر دیتا ہے' یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

مفتی صاحب کو اس سوال کے مطابق شرعی فتویٰ صادر کرنا چاہیے تھا۔ اگر اس کے

خلاف کوئی دوسری صورت تھی تو وہ اس کی علیحدہ وضاحت فرما سکتے تھے۔ لیکن مفتی صاحب نے اصلیت چھوڑ کر از خود یہ سوال بتایا کہ "جس کے پاس گندم ہے وہ یہ کہتا ہے کہ میں نقد والے کو فی من دس روپیہ دوں گا اور ادھار والے کو فی من پندرہ روپے دوں گا۔ ان نرخوں سے جو منظور ہو خرید لیں۔"

اس پر مفتی صاحب نے فتویٰ صادر فرمایا کہ اس قسم کی بیع قرآن وحدیث کی رُو سے فاسد اور ناجائز ہے۔ اس بیع کو صاحب مشکوٰۃ نے ان بیعوں میں بیان کیا ہے جو شرعاً ناجائز اور باطل ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ سوال سائل کا نہیں ہے اور نہ یہ بیع ہے بلکہ وہ نرخوں سے ایک نرخ پر معاملہ طے کرنے کی بات چیت ہے۔ ہاں اگر وہ کسی ایک بھاؤ پر عقد نہ کریں گے اور اسی طرح مبہم لین دین کرلیں گے تو پھر یہ بیع فاسد ہے اور اس کے منع ہونے پر سب کو اتفاق ہے کیونکہ یہ بیع عدم استقرار ایک قیمت اور ایک بھاؤ کی وجہ سے مجہول المال ہے اور اس میں تعلیق ہے کہ وقوع عدم وقوع دونوں کا احتمال ہے۔

چنانچہ نیل الاوطار میں اس مسئلہ کی بحث پر یہ لکھا ہے: ان غاية ما فيها الدلالة على المنع من البيع اذا وقع على هذه الصورة وهى ان يقول نقدا بكذا او نسيئة بكذا۔ "یعنی انتہائی درجہ اس حدیث میں جو ایک بیع میں دو بیعوں کی ممانعت پر وارد ہے یہ ہے کہ اس صورت مبہم پر بیع کرنی منع ہے۔ جب یوں کہے کہ میں یہ چیز نقد اتنے کو بیچتا ہوں اور ادھار سے یہ چیز اتنی قیمت پر دیتا ہوں۔" (کسی ایک کی تعیین نہ کرے) یہ ابہام کی وجہ سے منع ہے۔ لیکن اگر دونوں (بائع اور مشتری) کسی ایک بھاؤ اور قیمت پر بات طے کر کے عقد کر لیں تو یہ منع نہیں ہے۔

چنانچہ لکھا ہے: الا اذا قال من اول الامر نسيئة بكذا فقط وكان اكثر من سعر يومه مع ان المتمسكين بهذه الرواية يمنعون من هذه الصورة ولا يدل الحديث على ذلك فما للدليل اخص من الدعوىٰ۔ "یعنی مگر یہ صورت کہ پہلے ہی وہ عقد میں یہ کہہ دے کہ میں ادھار پر یہ چیز اتنے روپے میں دیتا ہوں اور مشتری منظور کرلے اگرچہ بازاری بھاؤ سے زیادہ ہو تو یہ جائز ہے۔"

اس صورت کے منع ہونے پر دو بیعوں والی حدیث دلالت نہیں کرتی۔ دلیل خاص ہے

اور دعویٰ عام ہے' دونوں میں تقریب تام نہیں ہے۔

تحفۃ الاحوذی جلد۔۲' ص۔۲۳۶ میں ہے (ترجمہ درج کرتا ہوں) "بائع مشتری سے کہے کہ میں تجھے یہ کپڑا دس روپے نقد میں فروخت کرتا ہوں اور بیس روپے ادھار میں' مشتری نے کہا کہ میں اس کو دس روپے نقد سے خریدتا ہوں پھر دس روپے دے دیئے تو یہ بیع صحیح ہے اور اسی طرح اگر مشتری نے یہ کہا کہ میں اس کو بیس روپے ادھار سے خریدتا ہوں اور بیع کر کے علیحدہ ہو گئے تو یہ بیع بھی صحیح ہے۔ کیونکہ ایک عقد معین طے کر کے جدا ہوئے ہیں۔ مبہم بیع پر جدا نہیں ہوئے اور مول مجھول نہیں چھوڑا گیا۔"

اسی طرح حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی استاد عرب وعجم مسوی شرح موطا ص۔۳۶۳ میں رقم طراز ہیں: قلت فی شرح السنة فسروا البیعتین فی بیعة علٰی وجهین احدهما ان یقول بعتک هذا الثواب بعشرة نقد او بعشرین نسیئة الٰی سنة فهو فاسد عند اکثر العلماء فاذا باته علٰی احد الامرین فی المجلس فهو صحیح للاخلاف فیه۔ "یعنی میں کہتا ہوں کہ شرح السنہ میں لکھا ہے۔ ایک بیع میں دو بیعوں کی جو حدیث میں ممانعت ہے' اس کی تفسیر علماء محدثین نے دو طرح سے کی ہے۔ ایک یوں کی ہے کہ بائع مشتری سے کہے میں نے تجھے یہ کپڑا دس روپے نقد میں یا بیس روپے ادھار میں سال کی مہلت تک فروخت کیا تو یہ بیع اکثر علماء کے نزدیک فاسد ہے (کیونکہ ایک صورت معین نہیں کی) اور جب دونوں (نقد یا ادھار سے) ایک کا عقد اسی مجلس میں معین کر دے تو یہ بیع بالاتفاق صحیح ہے جسمیں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔"

اس تشریح سے یہ واضح ہوا کہ بیع کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بائع اور مشتری کسی چیز کے دو بھاؤ اور دو مول کر کے بغیر کسی ایک مول اور بھاؤ کے طے کئے ہی معاملہ کرلیں یہ تو ناجائز ہے۔ دوسرا یہ کہ کسی ایک مول اور ایک بھاؤ پر طے کر کے یہ عقد کریں تو یہ بیع جائز ہے۔

سائل کا سوال دوسری صورت کے متعلق ہے جو جائز ہے اور مفتی نے پہلی صورت پر دلائل دے کر اس کو حرام کیا ہے جس کو سائل نے نہیں لکھا تو یہ صریح مغالطہ ہے جس کا گناہ مفتی پر عائد ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تناصحوا فی العلم فان خیانة احدکم فی علم اشد خیانة فی ماله وان اللّٰه سائلکم "یعنی علم میں

ایک دوسرے کی خیر خواہی کرو کیونکہ مال کی خیانت سے زیادہ بدترین علمی خیانت ہے' جس کا اللہ تعالیٰ علماء سے محاسبہ کرے گا۔ اعاذنا اللّٰہ منھا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ خیانت ارادی نہیں ہے' کم علمی سے ایسا ہو گیا ہے تو پھر دوسرا جرم عائد ہو گا جو اس حدیث میں ہے کہ "من افتی بغیر علم کان اثمه علی من افتاہ" "یعنی جس شخص کو بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا ہے اس کا گناہ مفتی کے ذمہ ہے۔" (سائل کے ذمہ نہیں ہے)

اگر مفتی شام کوٹی نے یہ خیال کیا ہے کہ ایک چیز میں دو مول اور دو بھاؤ ذکر کرنے سے بیع حرام ہو جاتی ہے تو یہ بدیہ البطلان ہے کیونکہ اس کی ممانعت کسی دلیل شرعی سے نہیں ہے۔ من ادعی فعلیه البیان۔

یہ دو مول اور دو بھاؤ صرف مشتری کو بتلائے جاتے ہیں اور یہ مشتری کی رضامندی ہے کہ وہ جس صورت میں آسانی سمجھے اس کو منظور کر کے اس پر عقد کر لے جیسے مفتی نے خود یہ جملہ لکھا ہے۔ "ان دو بھاؤں سے جو منظور ہو' خرید لیں۔" اس سے ظاہر ہے کہ مشتری جس بھاؤ کو منظور کرے گا اس پر یہ بیع ہو گی۔ صرف بائع کے ذکر کرنے سے نہیں ہو گی اور اگر مفتی صاحب نے یہ خیال کیا ہے کہ جب صورت تعلیق اور مبہم منع ہے تو طے شدہ صورت کی بیع بھی منع ہے تو یہ قیاس فاسد ہے۔ کیونکہ معین صورت پر بیع ہونا بالاتفاق جائز ہے اور اس میں کوئی علت ممانعت کی موجود نہیں ہے۔ من ادعی فعلیه البیان بالبرھان۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بازاری بھاؤ کے خلاف ادھار پر مول بڑھانا جائز نہیں ہے تو اس کی دلیل درکار ہے جس کو مفتی نے پیش نہیں کیا اور جو دلائل پیش کئے ہیں' ان میں اس بات کا ذکر تک نہیں ہے۔ صرف نقد' ادھار دو بیعوں کا ایک عقد میں کرنا منع لکھا ہے۔ جس کو ہم بھی منع سمجھتے ہیں مگر سوال میں اس کا ذکر نہیں ہے تو فتویٰ لغو ہوا۔ فتذکروا۔

<u>(عقد بیع کی چار صورتیں):</u> (ا) زید' بکر سے یہ کہے کہ آپ اناج کیا بھاؤ دیں گے؟ بکر یہ کہے کہ گندم سولہ روپے من نقد اور ادھار بیس روپے من دوں گا۔ زید کہے کہ مجھے نقد چاہیے۔ یہ سولہ روپے لے لو اور ایک من تول دو۔ بکر نے روپے لے کر گندم ایک من

تول کر دے دی۔

(۲) زید نے بکر سے گندم کا بھاؤ اور نرخ دریافت کیا تو بکر نے اس کو دونوں بھاؤ بتلا دیئے پھر زید نے ادھار کے بھاؤ پر قیمت منظور کر کے بیع کر لی اور اناج لے لیا اور بیع نامہ لکھ لیا۔

(۳) زید نے بکر سے کہا کہ گندم ادھار پر فروخت کر دو۔ بکر نے کہا کہ بیس روپیہ من فروخت کروں گا۔ اس نے کہا کہ مجھے منظور ہے' یہ کہہ کر اس نے اناج لے لیا اور بیع نامہ لکھ دیا۔

(۴) زید نے بکر سے گندم کا بھاؤ اور مول دریافت کیا کہ کس طرح دو گے؟ اُس نے کہا کہ نقد دس روپیہ من اور ادھار بیس روپیہ من دوں گا۔ زید نے کہا کہ میں گندم لے جاتا ہوں۔ اگر نقد ملے تو نقد دے جاؤں گا ورنہ اُدھار کا مول ادا کر دوں گا' گندم لے گیا۔

اِن چار صورتوں میں سے پہلی تین صورتیں بالاتفاق جائز ہیں۔ سائل کا سوال صورت نمبر۳ میں داخل ہے۔ پس یہ بیع جائز ہے' اس کو حرام بتانا سخت حرام ہے کیونکہ یہ اپنی طرف سے حرام کرنا ہے۔ محلّٰی ابن حزم جلد۔۹' ص۔۱۱ میں ہے : فمن حرم ما لم یحرمه رسول الله صلی الله علیه وسلم فقد شرع فی الدین ما لم یاذن به الله۔ ''یعنی جس شخص نے ایسی چیز کو حرام کیا جس کو رسول اللہ ﷺ نے حرام نہیں کیا' اس نے بغیر اذنِ الٰہی کے دین میں نئی شریعت بنالی۔''

اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہر مفتی کو بڑی احتیاط سے اور نہایت غور و فکر سے تحریم اشیاء کا فتویٰ دینا چاہیے اور فتوے دینے کے فرائض معلوم کرنے چاہییں ورنہ سخت محاسبہ ہو گا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ تمہارے پاس اس صورت ادھار کے جائز ہونے پر کیا دلیل ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے پاس اس صورت کے جواز پر مندرجہ ذیل دلائل ہیں۔

ادھار پر چیزیں خریدنے پر دلائل : (۱) کسی چیز کے جائز ہونے کے لیے شرعی اصول یہ ہے جو محلّٰی ابن حزم جلد۔۱' ص۔۱۴ میں درج ہے : ان ما سکت عنه النبی صلی الله علیه وسلم فلم یامر به ولا نهی عنه فهو مباح۔ ''یعنی ہر وہ چیز جس سے جناب نبی اکرم ﷺ نے سکوت فرمایا کہ نہ اس کے کرنے کا حکم دیا اور نہ اس سے منع فرمایا' وہ شرعاً مباح ہے۔''

چنانچہ آنحضور ﷺ نے ایک خطبہ میں یوں خطاب فرمایا : ذرونی ما ترکتکم ''یعنی

جس چیز پر حکم لگانے میں' میں نے اس کو چھوڑ دیا ہے' تم بھی مجھے چھوڑ دو۔" دوسری حدیث میں ہے : وما سکت عنه فهو عفو (دارقطنی) "یعنی جس چیز سے رسول اللہ ﷺ نے سکوت فرمایا ہے' وہ معاف ہے۔" یہ اصول اہل علم کو مسلم ہے جس سے مفتی کو انکار کی گنجائش نہیں ہے تو پھر سائل کا صورت مسئولہ میں سودا کرنا جائز ہے۔ اس کی ممانعت ثابت نہیں اور اصل اشیاء میں حلت ہے' کما ثبت۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : احل اللّٰه البیع "کہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کر دیا ہے۔" بیع کی تعریف یہ ہے : مبادلة مال بمال علی سبیل التراضی "یعنی دو شخصوں کا اپنی رضامندی سے باہم مال کو مال سے بدلنا بیع کہلاتا ہے۔" یہ بیع نقد بھی جائز ہے اور ادھار بھی جائز ہے۔ نقد تو ظاہر ہے' اُدھار کا ثبوت یہ ہے : ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم اشتری طعاما من یهودی نسیئة۔ "یعنی نبی اکرم ﷺ نے اناج یہودی سے اُدھار خریدا تھا۔" اس سے ثابت ہوا کہ اناج ادھار پر خریدنا جائز ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی جامع صحیح میں یوں باب باندھا ہے : باب شراء النبی صلی اللّٰه علیه وسلم بالنسیئة "نبی اکرم ﷺ کے ادھار خرید وفروخت کرنے کا بیان۔" اس باب کے تحت انہوں نے یہ حدیث ذکر کی ہے کہ "نبی اکرم ﷺ نے ایک یہودی سے غلہ بطور ادھار خریدا۔"

نسائی شریف میں ہے : ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم بعث الی یهودی ابعث بثوبین الی المیسرة "یعنی نبی ﷺ نے کسی کو ایک یہودی کے پاس بھیجا کہ وہ آسانی کی مہلت تک دو کپڑے دے دے۔"

محلیٰ جلد ۹' ص ۱۵۵ میں ہے : والبیع یجوز بالدنانیر وبالدرهم حالا وفی النسیئة الی غیر اجل مسمی والی المیسرة "یعنی بیع نقد اور ادھار پر دیناروں اور درہموں سے کرنی جائز ہے۔"

ادھار اور نقد کی قیمت برابر رکھنے کا کوئی حکم قرآن وحدیث میں وارد نہیں ہے۔ بائع ومشتری مختار ہیں جس طرح چاہیں اپنا مال فروخت کریں۔ اگر کسی کے پاس کوئی دلیل' قیمت میں فرق رکھنے کی ہو تو وہ پیش کرے تاکہ اس پر غور کیا جائے۔

(۳) ادھار پر بیع کرنی قرآن سے ثابت ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے : اذا تداینتم بدین

الی اجل مسمی فاکتبوہ۔ اس کا معنی جامع البیان میں یہ لکھا ہے: ای تعاملتم بمعاملات متوجلة فاکتبوھا۔ "یعنی جب تم آپس میں ادھار پر معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: انزلت فی السلف حرم اللہ الربوا واباح السلف۔ یہ آیت ادھار پر معاملات کرنے پر وارد ہوئی ہے۔ "سود' اللہ نے حرام کر دیا اور ادھار پر بیع کرنا جائز کر دیا۔"

سود کی صورتیں اور ان کے اصول' کتب حدیث وکتب فقہ میں موجود ہیں۔ صورت مسئولہ ان میں داخل نہیں ہے ورنہ جمہور علمائے اسلام اس کے جواز پر متفق نہ ہوتے۔ صورت مسئولہ ادھار کی بیع ہے جو بروئے آیت کریمہ جائز ہے۔ کما لا یخفی علی اهل البصیرة۔

(۴) قرآن مجید میں ارشاد ہے: "تم ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ۔" الا ان تکون تجارة عن تراض منکم "مگر یہ کہ تجارت باہمی رضامندی سے کر کے کھا لو تو یہ درست ہے۔"

صورت مسئولہ میں یہ معاملہ باہمی رضا ورغبت سے ہو رہا ہے۔ مشتری آسانی کے وقت تک خوشی سے ادھار لے رہے ہیں اور عام عرف میں یہ سودا تراضی سے جاری ہے جس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

تراضی اپنے اختیار سے بیع کر کے ایک دوسرے کو مال دینے لینے کو کہتے ہیں۔ اگر اپنا اختیار نہ رہے اور دوسرا اس پر زبردستی کر کے بیع کرائے یا کوئی اس کے مال پر قابض ہو کر بغیر اس کی اجازت کے فروخت کرے تو وہ بیع خلاف تراضی ہے جو حرام ہے۔ جیسے بعض طاقتور لوگ کسی کا اناج اٹھا کر لے جاتے ہیں اور اپنی خواہش سے اس کی قیمت ادا کر دیتے ہیں' یہ بیع حرام ہے۔ یا پھاٹکوں میں حیوانات نیلام کئے جاتے ہیں جن میں مالکوں کی اجازت نہیں ہوتی' یہ بھی حرام ہے۔

لیکن جو مالک خود اپنے اختیار سے چیز بیچے اور دوسرا اپنے اختیار سے خرید لے اس میں تراضی پائی گئی' یہ بیع درست ہے۔

اگر دل میں کوئی شخص کراہت رکھے کہ یہ چیز اس بھاؤ میں نہیں دینی چاہیے تھی مگر مجھے ضرورت نے مجبور کیا تو یہ تراضی کے خلاف نہیں کیونکہ اس طرح تو اشیاء کے گراں

ہونے پر نقدی خرید وفروخت میں بھی قلبی کراہت پیدا ہو جاتی ہے جو کسی کے نزدیک باعث فساد بیع نہیں ہے۔

(۵) بیع سلم بالاتفاق درست ہے اور مولوی محمد صاحب بھی اس کے قائل ہیں جس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو کہے کہ نقد روپے لے لو اور مجھے فلاں وقت اتنے من غلہ (یا اور چیز) اس بھاؤ سے اتنے روپے کی دے دو۔ بائع منظور کر کے روپے لے لے اور اناج فصل پر وقت مقررہ میں ادا کرے اور فریقین کی تراضی سے یہ معاملہ طے ہو جائے تو یہ بیع جائز ہے جو منصوص ہے۔ اس میں قلبی تراضی نہیں ہوتی کہ بائع کسی ضرورت اور تنگی کی بنا پر یہ سودا کرتا ہے ورنہ ارزاں اناج کون دیتا ہے لیکن تاہم جائز ہے' اس میں شرعی' عرفی' تراضی پائی جاتی ہے۔

مثلاً بازاری بھاؤ سولہ روپے من گندم ہے۔ فصل پر کم وبیش بھی ہو جاتی ہے مگر نقدی خریدار دس روپیہ من خریدتا ہے جس کو بائع ضرورت سے مجبور ہو کر منظور کر لیتا ہے اور روپے لے کر وقت مقررہ پر اناج دے دیتا ہے۔ گو اناج دیتے وقت اس کا بھاؤ بارہ' تیرہ روپے من ہو اور بازار کا بھاؤ سولہ روپے من ہو' تاہم یہ بیع جائز ہے۔

مفتی صاحب اور ان کے ہم خیال مانعین اس کو جائز کہتے ہیں۔ حالانکہ بازاری بھاؤ کے خلاف یہ بھاؤ ادھار کی بنا پر طے ہوا ہے۔ ان کے اصول پر یہ بیاج ہونا چاہیے مگر نصوص شرعیہ میں اس کو جائز رکھا گیا ہے تو پھر صورت مسئولہ میں جواز کیوں تسلیم نہیں ہے؟ جبکہ علت وہی موجود ہے۔ فتفکروا یا اولی الالباب۔

بیع سلم کے جواز سے یہ اصول ظاہر ہوا' بازاری نرخ مشروط فی البیع نہیں ہے جیسے قیمت پہلے دے کر جنس ادھار رکھ کر بازاری نرخ کے خلاف سودا کرنا جائز ہے' ایسے ہی جنس پہلے دے کر قیمت ادھار رکھ کر بازاری نرخ کے خلاف سودا کرنا جائز ہے۔ بات ایک ہے' حقیقت ایک ہے۔ مانعین کی سمجھ کا پھیر ہے کہ دونوں کو ایک نہیں سمجھتے۔ ان کو چاہیے کہ اس معاملہ میں کوئی شرعی فرق ثابت کریں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب الرھن فی السلم باندھا ہے۔ اس کے تحت یہودی والی حدیث (جو پہلے گذر چکی ہے) ذکر کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زرہ رکھ کر اناج یہودی سے ادھار لیا تھا۔ بظاہر باب اور حدیث میں مطابقت نہیں ہے۔ کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اناج ادھار خریدا

تھا' نقد قیمت نہیں دی تھی اور نہ جنس ادھار تھی۔ زرہ گروی تھی' وہ قیمت اناج نہ تھی۔ جب یہ بیع سلم عرفی نہیں تو پھر حدیث کی باب سے مطابقت کیا ہوئی؟ اس کا جواب مولانا احمد علی صاحب حنفی سہارن پوری نے یہ نقل کیا ہے کہ سلم سے مراد ادھار ہے' خواہ نقد کی قسم سے ہو یا جنس کی قسم سے' برابر ہے یعنی خواہ پہلے قیمت دے کر جنس بعد میں لی جائے یا جنس پہلے لے کر قیمت آئندہ دی جائے' حقیقت ایک ہی ہے۔

میرا مشاہدہ ہے کہ سوداگروں نے آٹھ روپے من کے حساب سے موسم سرما میں بیع سلم کے طور پر غریب کسانوں کو رقمیں دیں جو ضرورت کی بنا پر لوگوں نے لیں اور فصل ربیع پر اناج دینے کا وعدہ کیا۔ اس وقت کا بھاؤ ۱۶۔۱۷ روپیہ تھا اور جنس کی وصولی کے وقت بھاؤ ۱۲ روپے من تھا۔ یہ تجارتی سودا سب کے نزدیک جائز ہے تو پھر صورت مسئولہ کے جائز ہونے میں کیا کلام ہے؟ "حمل النظير على النظير" کے اصول پر یہ صورت جائز ہے۔

مانعین جو حدیث "كل قرض جر منفعة فهو ربا" پیش کیا کرتے ہیں' بیع سلم پر پیش نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ بیع ہے۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ یہ بیع سلف ہے' یہ بھی درست ہے۔ ما هو جوابكم فهو جوابنا۔

یہ حدیث مرفوعاً صحیح نہیں اور موقوف حجت نہیں۔

(۶) امام الدنیا فی الحدیث نے بخاری شریف میں ہر ملک کے دستور کے موافق خرید وفروخت' معاملات میں حکم جاری کرنے کے لئے باب باندھا ہے۔ پھر اس کو اقوال واحادیث سے صحیح ثابت کیا ہے۔ اس اصول کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ "ثمن لاجل الاجل"۔

عرف متعارف ہے جو تمام ملکوں میں رائج ہے کہ تمام سوداگر چیزوں کو نقد ادھار میں فرق کرکے بیچ رہے ہیں اور سب اس کو برضا ورغبت قبول کر رہے ہیں۔ جس میں بائع اور مشتری اپنا اپنا فائدہ سوچ لیتے ہیں۔ مثلاً حیوانات کے بیوپاری حیوانات کی تجارت کرتے ہیں جو بھینس نقد چار سو روپے کی بیع کرتے ہیں' اس کو ادھار پر پانچ سو روپے میں فروخت کر دیتے ہیں جس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اسی طرح کپڑا وغیرہ بھی فروخت کرتے ہیں۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے "شفاء العلل فی حکم زيادة الثمن لمجرد الاجل" جس میں تحقیقات علمیہ سے اس صورت مسئولہ کی بیع کو جائز ثابت کیا ہے اور یہی اہل حدیث کا مذہب ہے۔

(۷) جمہور علماء کا یہ مسلک ہے کہ صورت مسئولہ کی بیع جائز ہے۔ نیل الاوطار جلد-۵' ص-۱۵۲ میں ہے: قالت الشافعية والحنفية وزيد بن علي والمويد بالله والجمهور انه يجوز لعموم الاولة القاضية "یعنی شافعیہ' حنفیہ' زید بن علی' موید باللہ اور جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہ ادھار کی بیع نقدی بھاؤ کے خلاف جائز ہے' جس پر عام دلائل دلالت کرتے ہیں۔ جمہور کا قول گو بذاتہ حجت نہیں ہے' جس طرح کہ اجماع حجت ہے لیکن وجہ ترجیح ضرور ہے یعنی متعارض دلائل میں کسی دلیل کو راجح کرنے میں اور کسی محتمل المعانی حدیث کے ایک معنی پر محمول کرنے میں جمہور کا قول کارآمد ہو جاتا ہے کیونکہ یہ بھی اجماع کے قریب کا درجہ رکھتا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے حجتہ اللہ میں بھی وجہ ترجیح یہی لکھی ہے: من كونه متمسكا اكثر اهل العلم "یعنی خارجی وجہ ترجیح یہ ہے کہ جمہور علماء نے اس سے تمسک کیا ہو اور صحابہ و تابعین کے اختلاف میں راجح جس چیز کو بتایا ہے' وہ یہ ہے: اما بكثرت من ذهب اليه "یعنی وجہ ترجیح کے لیے ایک وجہ یہ ہے کہ کثرت سے سلف اس طرف گئے ہیں۔" علماء محققین جو علم و فضل میں مفتی صاحب شام کوٹی اور ان کے ہم خیال علماء سے کئی درجے فائق ہیں' اس بیع کو جائز کہتے ہیں۔

ابن الرفعہ کی روایت سے قاضی نے نقل کیا ہے کہ اگر مشتری یہ کہہ دے کہ میں نے ایک ہزار روپیہ نقد میں یہ چیز قبول کی یا کہے کہ میں نے یہ چیز دو ہزار میں ادھار سے قبول کی تو صح ذاک "یہ بیع صحیح ہے۔"

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وقد عرفت الكلام في جواز بيع الشئي باكثر من سعر يومه لاجل النساء "یعنی میری گذشتہ بحث سے یہ معلوم ہوا کہ اس دن کے موجودہ نرخ سے بوجہ ادھار کسی چیز کو زیادہ قیمت پر بیع کرنا جائز ہے۔

(۸) فتاویٰ نذیریہ جلد-۲' ص-۱ میں یہ صورت لکھی ہے پھر اس کے جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے جس پر حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کی مہر ثبت ہے۔ نیز اسی جلد کے ص-۳ پر دوسرا فتویٰ درج ہے' اس پر بھی محدث دہلوی کی مہر ثبت ہے اور یہ لکھا ہے کہ اگر بائع نقد یا ادھار کی صورت کو متعین کر کے چیز فروخت کرے تو یہ بیع حلال و جائز ہے۔

مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی جماعت اہلحدیث کے قابل فخر بزرگ اور استاذ العلماء

ہیں۔ وہ بھی اس مسئلہ پر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ یہ بیع جائز ہے۔ فقہ محمدیہ وطریقہ احمدیہ حصہ چہارم پر اس مسئلہ کا ذکر کر کے آخر بطور فیصلہ یہ لکھا ہے' "لیکن اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن کے نرخ سے زیادہ مول کے ساتھ بیچنا جائز ہے۔" (مسک الختام ص۔۱۶)

مسک الختام کے حوالہ سے ظاہر ہے کہ جناب نواب صدیق حسن خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کے قائل ہیں۔ پس اسی طرح تمام اکابر علماء جو شان درجہ اور فضیلت رکھتے ہیں اور ہم سے بہتر ہیں' اس بیع کو جائز کہتے ہیں۔ علماء دہلوی' علماء لکھوی' علماء غزنوی' علماء بنارسی' علماء امرتسری' علماء روپڑی' علماء ملتانی' علماء غربا اہلحدیث' علماء ثنائی وغیرہم سب اس بیع کے قائل ہیں۔

شاید کوئی مولوی صاحب نہ معلوم کیا کمال رکھتے ہیں جو سب سے منفرد ہو کر اس بیع کو سود اور حرام کہتے ہیں۔ شاید یہ مولانا مودودی کی تقلید کرتے ہوں کہ وہ اپنی کتاب رسائل ومسائل ص۔۳۹۶ میں لکھتے ہیں: "پہلی صورت تو صریحاً سود کی ہے" حالانکہ یہ خیال سود کا سراسر باطل ہے' اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ مکیل کی بیع موزوں سے ہو تو نہ تفاضل حرام ہے اور نہ ادھار حرام ہے۔ اس لیے کہ اس میں اتحاد جنس اور اتحاد قدر نہیں ہے۔ کما لا یخفی علی اھل العلم۔

فتاویٰ نذیریہ جلد۔۲' ص۔۲۳ میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: کلما حرم الفضل حرم النساء ولا عکس وکلما حل النساء حل الفضل ولا عکس کذا فی الحلبی وھکذا فی الدر المختار وغیرہ "یعنی جب کسی چیز میں زیادتی حرام ہے تو اس میں ادھار کرنا بھی حرام ہے مگر اس کا عکس نہیں یعنی یہ بات نہیں کہ جس چیز میں ادھار حرام ہو' اس میں زیادہ لینا بھی حرام ہو۔"

مثلاً سونا کی سونا سے اور چاندی کی چاندی سے بیع ہو تو کسی طرف سے زیادتی دینا لینا حرام ہے اور اس معاملہ میں ادھار کرنا بھی حرام ہے لیکن یہ قاعدہ نہیں کہ جس چیز میں ادھار حرام ہو' اس میں زیادتی بھی حرام ہو۔ مثلاً گندم کی جو کے ساتھ بیع ہو تو زیادتی جائز ہے مگر ادھار حرام ہے۔ اسی طرح جب کسی چیز میں ادھار حلال ہے تو زیادتی بھی حلال ہے لیکن اس کا عکس صحیح نہیں ہے۔ مثلاً اناج ادھار پر روپوں کے ساتھ بیچنا حلال ہے تو اس کے

مول میں زیادتی بھی حلال ہے۔

نیل الاوطار جلد۔۵، ص۔۱۹۴ میں ہے کہ "علمائے اسلام کا اس بات پر اجماع ہے کہ کسی سود والی چیز (مثلاً سونا یا چاندی) کی بیع دوسری سودی چیز (مثلاً گندم یا جو) سے جبکہ سود کی علت میں اس کے ساتھ شریک نہ ہو زیادتی اور ادھار سے بیع کرنا جائز ہے جیسے سونا چاندی سے اناج غلہ کی خرید وفروخت کرنا درست ہے، نقد بھی، ادھار بھی۔ برابر بھی، کم وبیش بھی ہر طرح جائز ہے۔"

میں نے مولانا مودودی صاحب سے ان کے دفتر اچھرو لاہور میں بوقت ملاقات ان کے اس رسالہ کا حوالہ دے کر اس مسئلہ پر گفتگو کی تو مولانا کوئی ثبوت نہ دے سکے، صرف یہ کہا کہ اجل کے عوض مول میں زیادتی ہے، اس وجہ سے ناجائز ہے۔ میں نے کہا کہ فقہاء حنفیہ نے اس کو جائز رکھا ہے۔ انہوں نے فرمایا : "کہاں لکھا ہے؟" میں نے شامی وغیرہ بعض کتابوں کے حوالے پیش کئے اس پر ارشاد ہوا : "میں نے ان کا مطالعہ نہیں کیا، اب ملاحظہ کروں گا۔"

میں کہتا ہوں فقہاء حنفیہ کے نزدیک بھی یہ صورت مسئولہ متنازعہ بیع کی جائز ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے :

علماء حنفیہ کے نزدیک بھی نقد ادھار بیع میں فرق کرنا جائز ہے : (۹) شرح وقایہ کتاب المرابحہ میں ہے : فی النسیئۃ یزاد الثمن لاجل لاجل "یعنی ادھار کی صورت میں مدت کی وجہ سے مول میں زیادتی کی جا سکتی ہے۔"

حاشیہ چلپی میں لکھا ہے : یجوز ان یقدر الثمن فی البیع بالموجل اکثر مما فی المعجل بحیث تقابل کثرۃ المنوجل تعجیل القلیل "یعنی یہ درست ہے کہ کسی چیز کی قیمت جبکہ دام جلدی ادا کئے جائیں کم مقرر کرے اور جب دیر میں ادا کئے جائیں تو زائد مقرر کرے کہ جلدی کی کمی، دیر کی زیادتی کے برابر کر دے۔"

رد المختار میں ہے : ان الاجل یقابلہ قسط من الثمن "یعنی مدت کے مقابلہ میں قیمت کا کچھ حصہ مقرر ہو سکتا ہے۔"

بحر الرائق میں ہے : الاجل فی نفسہ لیس بمال ولا یقابلہ شئی من الثمن حقیقۃ اذا لم یشترط زیادۃ الثمن بمقابلۃ قصدا ویزاد فی الثمن لاجلہ اذا ذکر الاجل بمقابلۃ

زیادۃ الثمن قصدا "یعنی مدت خود کوئی مال نہیں ہے اور نہ اس کے مقابل میں کچھ قیمت ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں قصداً قیمت کی تصریح نہ کر دی جائے البتہ مدت کی وجہ سے قیمت زیادہ کی جا سکتی ہے جبکہ زیادتی کے مقابلہ میں مدت ذکر کر دی جائے۔"

کتاب الحج امام محمد کی تصنیف ہے' اس میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے : قال ابو حنیفة فی الرجل یکون له علی رجل مائة دینار الی اجل فاذا حلت قال له الذی علیه الدین سلقه یکون ثمنها مائة دینار نقدا بمائة وخمسین الی اجل ان هذا جائز لانهما لم یشرطا شیئا ولم یذکر امر یفسد الشراء "یعنی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر ایک شخص کے سو دینار تھے جن کے ادا کرنے کی مدت مقرر تھی۔ جب مدت گذر گئی تو مقروض نے کہا کہ میرے پاس ایک چیز ہے جس کے دام اگر نقد دو تو سو روپیہ ہیں اور اگر مدت مقرر کرو تو ڈیڑھ سو روپیہ ہیں' تو یہ بیع جائز ہے۔ کیونکہ انہوں نے بیع میں کوئی شرط نہیں لگائی اور نہ امر فاسد کا ذکر کیا ہے۔"

پھر چند سطروں کے بعد لکھا ہے : وھکذا ابتیاع الناس لانھم اذا اخروا ازدادوا لا باس بھذا "یعنی لوگ اس طرح باہم خرید و فروخت کیا کرتے ہیں کہ جب دام کی ادائیگی میں تاخیر ہو تو مول زائد کر دیتے ہیں' اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ جب امام محمد اور امام ابو حنیفہ کے عہد میں یہ سودا نقد ادھار کی قیمت میں فرق کرنے کا ہوتا رہا ہے اور اب تک ہوتا چلا آرہا ہے تو پھر یہ حرام کس دلیل سے ہے اور اس کے سود ہونے کی کیا وجہ ہے؟ مولانا مودودی اور مولانا صاحب شام کوٹی کو اس کے سود ہونے کی علت بیان کرنی چاہیے۔

اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ یہ اجل یعنی مدت کے عوض نفع اٹھانا ہے اور مدت کے عوض نفع اٹھانا حرام ہے کیونکہ مدت مال نہیں ہے تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ مدت کے عوض نفع نہیں ہے بلکہ مدت کی وجہ سے مال کا نفع ہے۔ مدت کے عوض نفع ہونے اور مدت کی وجہ سے مال کا نفع ہونے میں بڑا فرق ہے۔

مثلاً ایک شخص کے ذمہ ایک ہزار روپیہ قرض ہے جس کی میعاد ایک سال ہے۔ جب چھ ماہ گذرے تو قرض دینے والے نے مقروض سے کہا : "مجھے سخت ضرورت درپیش ہے' آپ روپے ادا کریں۔" اس نے کہا ابھی وعدہ نہیں آیا' میں فی الحال نہیں دے سکتا۔ قرض

خواہ نے کہا اگر آپ اس وقت روپیہ ادا کر دیں تو میں دو سو روپیہ تجھ کو چھوڑتا ہوں ورنہ وعدہ پر پورا ہزار ہی لوں گا۔ مقروض نے آٹھ سو روپیہ ادا کر دیا تو اس نے دو سو روپیہ اس مدت کے عوض لیا ہے جس کو حرام کہا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس کپڑا کی قیمت ادھار کی صورت میں بیس روپے ہے جس نے لینا ہو' لے لے' گو اس کپڑا کی قیمت نقدی پندرہ روپیہ ہے تو اس کپڑا کو ادھار پر بیس روپیہ میں خریدنا جائز ہے۔ یہ زیادتی اس کپڑا کا عوض ہے اور مول میں زیادتی مدت کی وجہ سے ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اناج' کپڑا وغیرہ اشیاء کا بھاؤ نقدی بدلتا رہتا ہے۔

بائع تاجر یہ سوچتا ہے کہ آج اناج ارزاں ہے اگر پڑا رہا تو چند ماہ کے بعد یہ گراں ہو جائے گا' اس وقت فروخت کروں گا مگر حاجت مندوں نے طلب کیا تو اس نے اس اناج کی قیمت آئندہ بڑھنے کی امید پر زائد لگا دی کہ اگر پڑا رہا تو پھر بھی اس وقت بیس روپیہ من تک بھاؤ اس کا ہو گا جو میں آج ہی اس وقت سے پہلے اس اناج کو بیس روپیہ پر فروخت کر دوں کہ آئندہ بھاؤ بڑھ بھی جاتا ہے اور کم بھی ہو جاتا ہے۔"

میرا مشاہدہ ہے کہ ایک وقت گندم بارہ روپے من تھی' اس کو ایک شخص نے ادھار پر پندرہ روپیہ من کے حساب سے فروخت کیا۔ جب فصل خریف کا وعدہ ادائیگی آیا تو اس وقت اناج بیس روپیہ تھا۔ اسی طرح فصل خریف کے موقعہ پر اناج نقدی سولہ روپیہ من تھا' اس کو نقدی بھاؤ پر کسی نے فصل ربیع کے وعدہ پر دے دیا۔ جب فصل ہاڑی آئی تو اناج دس روپیہ ہو گیا۔ بائع نے سولہ روپیہ من کے حساب سے قرضہ وصول کیا جس کے عوض اناج خریدا تو ایک من پر بیس سیر اناج نفع ہوا۔ یہ نقدی بھاؤ پر فروخت کرنے سے حاصل ہوا تو کیا یہ بھی سود ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو پھر کسی بھاؤ پر ادھار دینا بھی جائز نہ رہا' یہ بدیہی البطلان ہے اور اگر نہیں تو کیوں؟

یہ ادھار پر فروخت کرنے سے ایک من کے ڈیڑھ من حاصل کئے کیونکہ بھاؤ گر گیا۔ مقروض کو ایک من کے ڈیڑھ من قیمت میں ادا کرنے پڑے۔

الغرض معاملہ نقدی ہو یا ادھار ہو جن چیزوں کے بھاؤ اور مول بدلتے رہتے ہیں ان میں بتراضی فریقین جو بھاؤ اور مول طے ہو جائے گا' وہی درست ہے۔ نفع بائع کو رہے یا مشتری کو یہ قسمت کی بات ہے۔ اس لیے بیع درست ہے کہ دونوں طرف نفع و نقصان کا امکان ہے۔

(۱۰) مشکوٰۃ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ ”نبی کریم ﷺ نے ان کو لشکر کا سامان تیار کرنے کا حکم فرمایا اور یہ کہا کہ صدقہ کے وعدہ پر اونٹ لوگوں سے ادھار لے لو۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے حسب الحکم دو اونٹ دینے کر کے ایک اونٹ خریدا۔

یہ صریح دلیل ہے اس امر پر کہ مدت کی وجہ سے نفع اور مول زیادہ دینا لینا درست ہے اور ضرورت کی بنا پر ایسا کیا جا سکتا ہے' واللہ اعلم بالصواب۔

تلک عشرة کاملة: یہ دس دلائل ہیں جن کی بنا پر یہ بیع متنازعہ جائز ہے۔ اب اس کے بعد مفتی صاحب شام کوٹی کے دلائل پر تبصرہ کیا جائے گا (انشاء اللہ)

اُدھار کی صورت میں قیمت زیادہ لگانے کی حرمت کے دلائل اور ان پر تبصرہ:

مولانا محمد صاحب شام کوٹی نے نسائی کے حوالہ سے (۱) اول یہ حدیث پیش کی ہے کہ ایک بیع میں دو بیعوں کے کرنے سے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث کے اصل الفاظ مشکوٰۃ میں دو طریقوں سے یوں درج ہیں: عن ابی ھریرۃ قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیعتین فی بیعۃ ”یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیعوں کے کرنے سے منع کیا ہے۔“

اصل حدیث کے الفاظ نسائی میں صرف یہ ہیں' باقی تفسیر امام نسائی کی ہے وہ حدیث کے الفاظ نہیں ہیں۔ عام لوگ اس سے دھوکہ نہ کھائیں۔

(۲) دوسری روایت یہ ہے: عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جدة قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیعتین فی صفقة واحدة ”یعنی ایک عقد سے دو بیعوں کے کرنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔“

اس حدیث میں صرف یہ ذکر ہے کہ ایک عقد سے دو بیع نہ کرو۔ اس سے سائل کی پیش کردہ صورت کہ زید نے بکر سے گندم زید کو دے دی جس کو وہ بخوشی منظور کر کے لے گیا۔ یہ صورت منع ثابت نہیں ہوتی۔ یہ ایک بیع ادھار کی ہے' دو نہیں ہیں۔ پس فتویٰ سوال کے مطابق نہیں' لہٰذا غلط ہے۔ یہ تو سوال از آسمان جواب از ریسمان ہے' جو اہل علم کو قبول نہیں۔

حدیث کی مختلف تفاسیر: یہ حدیث مبہم ہے' اس کی تفسیریں علماء نے مختلف طور پر کی ہیں اور اس کی علت منع میں بھی اختلاف ہے پس یہ دلیل محتمل ہے جو مثبت مدعی نہیں ہے کہ کسی دلیل میں کئی احتمال ہوں تو اس سے استدلال صحیح نہیں۔

پہلی تفسیر: مفتی صاحب شام کوٹی نے امام نسائی سے نقل کیا ہے کہ ایک جمع میں دو بیع یہ ہیں کہ کوئی یوں کہے کہ میں یہ سامان آپ کو نقد سو روپے کو دوں گا اور اگر ادھار لیں تو دو سو کو دوں گا۔

اس تفسیر کی رُو سے بھی مفتی صاحب کا دعویٰ ثابت نہیں ہے۔ نیل الاوطار میں ہے : ولا حجة فيه على المطلوب۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ یہ کلام بائع کی طرف سے ہے' اب مشتری کی طرف سے جو سودا قبول ہو گا اس پر حکم نافذ ہو گا ورنہ اگر مشتری خاموش ہو کر اپنے گھر واپس چلا گیا تو کون عقلمند کہے گا کہ یہ بیع ہو گئی۔ اگر مشتری (خریدار) نے سودا اس کلام پر کیا تو تین حال سے خالی نہیں :

(۱) یہ کہ خریدار نے کہا کہ اچھا سامان دے دو جو قیمت میں چاہوں گا دے دوں گا۔ نقد روپے ملے تو نقد دے جاؤں گا اور اگر نہ ملے تو ادھار کی قیمت رہ جائے گی۔"

یہ بیع بلاتفاق فاسد ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس عقد میں تعلیق ہے اور ایک صورت کی تعیین نہیں ہے کہ استقرار ثمن ہو جاتا ہے۔ یہ ایک عقد میں دو بیع ہیں' اس لیے منع ہے۔ چیز ایک ہے اور نقد اور ادھار کی دو الگ الگ قیمتیں ہیں جو ایک عقد میں بیان ہوئی ہیں۔ اس طرح کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ بائع کا یہ کلام سن کر خریدار سمجھے کہ میں تو نقد کا بھاؤ منظور کر کے یہ کپڑا خریدتا ہوں' چنانچہ خرید لے گا۔

یہ بیع بلاتفاق صحیح ہے کیونکہ مشتری نے دو بیعوں میں سے ایک صورت بیع کو قبول کر لیا اور اس کو بائع نے بھی منظور کر کے سامان دے دیا تو یہ عقد درست ہے کہ قیمت مقرر ہے۔ بیع کا لین دین ہو گیا' رضامندی پائی گئی ہے۔ بیع کی یہ صورت مولانا شام کوٹی کے نزدیک بھی جائز ہے۔

(۳) یہ کہ خریدار نے کہا کہ میں یہ سامان دو سو روپیہ ادھار پر خریدتا ہوں۔ بائع نے منظور کر کے سامان دے دیا۔

بیع کی یہ صورت بھی صحیح ہے کیونکہ فریقین کی رضامندی سے قیمت مقررہ طے ہو چکی ہے اور اس کے جائز ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے۔ جیسے دوسری صورت کا جواز ہے ویسے ہی اس کا بھی ہے۔ ان میں سے ایک کو جائز کہنا اور دوسری کو حرام کہنا سراسر ظلم ہے

اور حدیث اس کے حرام ہونے پر ناطق نہیں ہے۔ وہ دو اکٹھی بیعوں کو منع کرتی ہے۔
اس لیے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے جن بعض اہل علم سے یہ تفسیر نقل کی ہے' اس میں یہ قید ہے کہ لا یفارقه علی احد البیعین "یعنی دو بیع اس شرط سے منع ہیں کہ دونوں میں سے کسی ایک پر فیصلہ کر کے جدا نہ ہوں اور دونوں صورتیں معلق کھڑی ہوں۔"
اگر دونوں بیع (نقد اور ادھار) میں سے کسی ایک پر فیصلہ ہو جائے تو پھر امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھا ہے: فاذا فارقه علی احدهما فلا باس اذا کانت العقدة علی واحد منهما "یعنی جب ایک صورت پر عقد کر کے ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو پھر عقد درست ہے۔"
امام نسائی نے صرف تفسیر نقل کر دی کہ یہ دو بیعوں کی صورت ہے اور امام ترمذی نے اس کی وضاحت کر دی کہ اگر دونوں بغیر فیصلہ کے قائم رہیں گی تو عقد منع ہے اور اگر ایک پر فیصلہ ہو گیا تو یہ درست ہے۔ ایک امام کی بات لے لینا اور دوسرے امام کی چھوڑ دینا یہ خواہش پرستی ہے۔
باقی ایک روایت میں جو یہ لفظ ہیں کہ فله او کسهما او الربا "یعنی ان دو بیعوں میں سے کم مول کا عقد قبول کر لے ورنہ بیاج ہے۔"
یہ روایت ثابت نہیں ہے کہ اس میں ایک راوی محمد بن عمرو بن علقمہ ہے' جس کی بابت نیل الاوطار میں ہے: قد تکلم فیه غیر واحد "کہ اس میں کئی ایک اماموں نے جرح کی ہے۔"
تقریب میں اس کی بابت لکھا ہے کہ له اوهام "اس کو وہم کی مرض ہے۔"
چونکہ حدیث کا صحیح متن وہی ہے جو میں نقل کر چکا ہوں۔ یہ جملہ زائد ہے جس کے ذکر کرنے میں یہ وہمی راوی منفرد ہے لہٰذا یہ زیادتی قابل قبول نہیں ہے۔
اس لیے امام خطابی نے اس روایت پر یہ فرمایا ہے کہ قال الخطابی لا اعلم احدا قال بظاهر الحدیث وصحیح البیع باوکس الثمنین الا ما حکی عن الاوزاعی وهو مذهب فاسد "یعنی اس روایت کا قائل کوئی عالم معلوم نہیں ہوا جو یہ کہے کہ نقد ادھار کی دو قیمتوں میں سے کم قیمت پر عقد صحیح ہو گا اور اگر زیادہ قیمت پر کیا تو یہ بیاج ہے مگر امام اوزاعی سے یہ حکایت کیا گیا ہے لیکن یہ مذہب فاسد ہے۔"

پس اصل علت اس تفسیر میں وہی ہے جو امام شوکانی نے بیان کی ہے کہ "والعلة فی تحریم بیعتین فی بیعة عدم استقرار الثمن فی صورة بیع الشی الواحد بثمنین والتعلیق بالشرط المستقبل فی صورة بیع هذا علی ان یبیع منه ذاک "یعنی اس حدیث میں دو بیعوں کے حرام ہونے کی علت یہ ہے کہ ایک شے کی دو بیع دو مول کرنے کی وجہ سے قیمت ایک مقرر نہ ہوئی اور شرط آئندہ سے معلق ہوئی۔ جبکہ اسی صورت پر بیع کی جائے اور اگر ایک جانب فیصلہ ہو کر بیع ہو تو پھر جائز ہے۔"

دوسری تفسیر: اس حدیث کی دوسری تفسیر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یوں مروی ہے کہ والثانی ان تقول بعتک عبدی علی ان تبیعنی فرسد (تنقیح الرواۃ جلد۔۲، ص۔۱۷۱) "یعنی دوسری تفسیر یہ ہے کہ تو اس طرح کسی سے بیع کرے کہ میں تجھے اپنا غلام اس شرط سے بیع کرتا ہوں کہ تو مجھے اپنا گھوڑا فروخت کر دے۔"

یہ بھی منع ہے کیونکہ یہ بیع بھی دوسری بیع پر معلق ہے۔ یہ ایک بیع میں دوسری بیع کی جا رہی ہے اس لیے فاسد ہے، دونوں بیع منعقد نہیں ہوتیں۔

تیسری تفسیر: نیل الاوطار میں ہے: وقیل فی تفسیر ذالک هو ان یسلفه دینارا فی تفسیر حنطة الی شهر فلما حل الاجل وطالبه بالحنطة قال بعنی القفیز الذی لک علی الی شهر بن بقضیرین فصار ذالک بیعتین فی بیعة لان البیع الثانی قد دخل علی الاول فیرو الیه او کسهما وهو الاول (کذا فی شرح السنن لابن اسلان) "یعنی ایک بیع میں دو بیع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو دینار ادھار دے کر یہ سمجھے کہ ایک ماہ تک مجھے اس کی ایک قفیز (پندرہ من گندم) دے دینا۔ جب مدت پوری ہوئی اور اس نے گندم کا مطالبہ کیا تو دوسرے نے کہا کہ میرے ذمہ جو آپ کی گندم ہے وہ دو ماہ کی مدت تک مجھے دو قفیز (تیس من) گندم میں فروخت کر دو۔"

پس یہ دو بیع ایک بیع میں ہو گئیں کیونکہ دوسری بیع پہلی بیع میں داخل ہو گئی۔ اس صورت میں پہلی بیع قائم رکھ کر دوسری رد کر دی جائے گی ورنہ دوسری میں بیاج لازم آئے گا جو حرام ہے۔ پھر پہلی بھی فاسد ہو جائے گی۔

جب حدیث کی تین تفسیریں ہوئیں تو یہ تین احتمال ہوئے۔ پس ادھار نقد کے ایک احتمال کو لے کر اس حدیث کی قطعی تفسیر قرار دینا صاف سینہ زوری ہے۔ اصل حقیقت یہ

ہے کہ حدیث ان تینوں صورتوں میں سے دو صورتوں کو ٹھیک طور پر شامل ہے۔ ایک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ والی صورت اور دوسری ابن رسلان والی صورت۔

ان دونوں صورتوں میں دو بیعوں کا وجود ظاہر ہے جس سے حدیث کا مفہوم ان کے عین مطابق ہے۔ رہا نقد ادھار کے دو مول تو اگر دو میں سے کسی ایک کا فیصلہ ہوئے بغیر عقد ہو کر مفارقت ہو جائے تو بیع باطل ہے کہ مول کا استقرار نہیں ہوا۔ وہ معلق رہا (ادھار اور نقد کے درمیان) یہ ناجائز ہے۔

لیکن جب نقد یا ادھار کا ایک فیصلہ ہو کر بیع ہوئی تو بالکل درست ہے کہ یہ ایک بیع ہے دو نہیں رہی ہیں۔ فتدبروا یا اولی الابصار۔ پس یہ ضعیف ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ: مولوی شام کوٹی صاحب نے امام املک رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ اس بارہ میں یوں نقل کیا ہے کہ "امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: (ترجمہ) "ایک آدمی نے خریدا بکری کو ایک دینار سے اور ادھار دو دینار سے۔ ان دو بھاؤں میں سے ایک بھاؤ پر بیع واجب ہو گئی۔ یقیناً یہ بیع حرام ہے اور مسلمان کے لیے یہ بیع کرنا ناجائز ہے اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی بیع سے منع فرمایا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ میرے پاس موطا بمع شرح مسوی و مصفّٰی ہے۔ اس میں عربی عبارت ان الفاظ منقولہ سے نہیں ہے۔ اگر بغیر شرح کے عربی موطا کے کسی نسخہ میں یہ عبارت ہے تو پھر مولوی شام کوٹی کو اس کا پورا حوالہ دینا چاہیے۔ اب اس کا جواب سنیئے:

مولوی شام کوٹی نے ترجمہ میں تصرف کیا ہے۔ عربی عبارات میں یہ الفاظ ہیں: ان ذالک مکروہ ولا ینبغی "یعنی اس طرح دو مول سے بیع کرنا مکروہ ہے' مناسب نہیں ہے۔"

مکروہ کا اطلاق ناپسندیدہ بات پر بھی آتا ہے' اس کا معنی حرام نہیں ہے۔ چنانچہ موطا میں ایک باب یوں باندھا گیا ہے: باب کراھیۃ کسب الحجام من غیر تحریم "یعنی یہ باب اس بارہ میں ہے کہ حجام کا پیشہ مکروہ ہے حرام نہیں۔"

اس سے ظاہر ہے کہ مکروہ ناپسند چیز کو کہتے ہیں۔ مکروہ تنزیہہ بھی ہوتا ہے اور تحریمہ بھی۔ یہاں مکروہ تنزیہہ مراد ہے اور اس پر دو لفظ دال ہیں۔ ایک لا ینبغی کہ ایسی بیع دو مول کی بلا فیصلہ لائق نہیں۔ اگر کرے گا تو اس طرح دو مول پر نہ رہے گی۔ ان دو میں سے ایک' مول نقد پر یا ادھار پر کرنی واجب ہو گی' جس پر یہ الفاظ دال ہیں: قد وجب علیہ

البیع باحد الثمنین ۔ یعنی بائع نے جو دو مول بولے ہیں‘ ان میں سے ایک مول کے ساتھ جو وہ مشتری اختیار کرے گا‘ بیع واجب ہو جائے گی مگر اس طرح دو مول بولنا مکروہ ہے۔

اب یہ فیصلہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہمارے حق میں ہوا کیونکہ اگر یہ بیع حرام ہوتی تو کسی قیمت پر واجب نہ رہتی بلکہ فاسد ہو جاتی“

ہوا ہے مدعی کا فیصلہ بھی اب مرے حق میں
زلیخا نے کیا خود چاک دامن ماہ کنعاں کا

اصل بات یہ ہے کہ کسی چیز کے دو مول بتانا تو جائز ہے مگر ان دونوں پر عقد کرنا جائز نہیں کہ کسی ایک صورت نقد یا ادھار کا تقرر ہونا ضروری ہے۔

حضرت علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ : تعلیقات سلفیہ حاشیہ نسائی جلد-۲‘ ص-۲۲۱ میں یہ لکھا ہے : قال المحقق ابن القیم فی تهذیب السنن۔ (ج-۵‘ ص-۱۰۶) وهذا التفسیر ضعیف فانه لا یدخل الربا فی هذه الصورة ولا صفقتین هنا وانما هی صفقة واحدة باحد الثمنین۔ ”یعنی جو لوگ نقد ادھار کے دو بھاؤ ایک چیز میں ذکر کرنے کو اس حدیث کی تفسیر ٹھہراتے ہیں یہ بالکل کمزور اور بودی بات ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بیاج داخل نہیں ہوتا اور نہ یہ دو عقد ایک چیز میں بنتے ہیں بلکہ یہ ایک عقد ہے جو مشتری کے ایک مول اختیار کرنے پر واقع ہو جائے گا۔“

گو بائع نے معلق کیا ہے مگر مشتری نے جس مول کو قبول کر لیا اور بائع بھی اس پر راضی ہو کر جدا ہوا تو بیع اسی مول پر واجب ہو گئی۔ جب یہ دو بیع نہیں بلکہ ایک ہے تو پھر اس کو حدیث کی تفسیر قرار دینا جیسا کہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے‘ غلط ہے۔

اب صحیح تفسیر سنئے جو علامہ ابن القیم بیان فرماتے ہیں۔ تعلیقات میں ہے : ثم قرر فی تفسیره : ان یقول ابیعکها بماة الی سنة علی ان اشتریها منک بثمانین حالة قال وهذا معنی الحدیث الذی لا معنی له غیره وهو مطابق لقوله فله او کسهما او الربا۔ ”یعنی ایک عقد میں دو بیع کی صحیح صورت یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو یوں کہے کہ میں تجھے یہ سامان ایک سال کی مدت تک سو روپیہ میں اس شرط سے بیع کرتا ہوں کہ تو مجھے یہ سامان اسی روپے نقد میں فروخت کر دے۔“

یہی تفسیر ٹھیک ہے‘ باقی کوئی تفسیر درست نہیں ہے اور یہ حدیث کے ان الفاظ کے

مطابق تفسیر ہے کہ یا تو کم مول پر بیع کر لے ورنہ بیاج ہے کیونکہ جب بائع نے ایک شے میں دو مول کئے تو اب اگر وہ سو روپے لے لے گا تو یہ نفع ہے جو بیاج ہے یا صرف اسی روپیہ لے گا تو یہ کم قیمت ہے جو ٹھیک ہے۔

اِس صورت میں نقد اور ادھار دو بیع ایک عقد میں ہو جاتی ہیں اور چیز ایک ہی رہتی ہے اور بیاج بھی لازم آجاتا ہے کہ دراصل یہ بیع دراہم معجلہ کی بیع دراہم موجلہ سے لازم آتی ہے جو صاف بیاج ہے۔ وہ اصل راس المال اسی (۸۰) روپیہ کا حقدار ہے سو کا نہیں ہے۔ اگر لے گا تو یہ سود ہو گا۔

مولوی صاحب شام کوٹی کو عصبیت چھوڑ کر یہ فیصلہ منظور کر لینا چاہیے اور اپنا غلط فتویٰ واپس لے لینا چاہیے کہ اس میں بیاج کا لزوم نہیں پایا جاتا۔

علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ: مولوی صاحب شام کوٹی نے علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ سے یہ فیصلہ نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں: نقد قیمت کی کمی اور ادھار کی زیادتی میں جو بیع کی صورتیں پیدا ہوں گی' تمام کی تمام حرام ہوں گی۔ فھذا کلہ حرام مفسوخ ابدا محکوم فیہ بحکم الغصب۔ اس طرح کی بیع غریبوں کے مال پر ڈاکہ مارنے کا حکم رکھتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مولوی شام کوٹی صاحب نے امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے فیصلہ کو سمجھنے میں بھی نہایت بے عقلی سے کام لیا ہے: یک من علم راده من عقل باید۔

علامہ ابن حزم نے تمام تفسیروں کو اور ایک عقد میں دو بیعوں کی سب صورتوں کو ذکر کر کے فرمایا ہے کہ یہ تمام حرام ہیں۔ نقد ادھار دو مول رکھ کر بلا فیصلہ عقد کر کے جدا ہو جانے کو ابن حزم نے حرام قرار دیا ہے' ایک عقد کی بیع کو حرام نہیں کہا۔

چنانچہ آگے بحث میں انہوں نے یہ لکھا ہے: واعمالھا لا باحد الامرین دون الاخر "عمل ایک صورت پر نہ ہو' دونوں کے ساتھ ہو۔"

اور یہ فرمایا کہ یقول اقرضنی دینارین علی ان اردلک دینارین الی شھر لکان قولا حسنا وعملا صحیحا "یعنی یوں کہے کہ دو دینار مجھے ادھار دے' اس شرط سے کہ ایک ماہ کے بعد دو دینار میں تجھے واپس کر دوں گا۔" یہ ایک ہی عقد ہے جو بات اچھی ہے اور عمل صحیح ہے۔

پھر ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ قال شرطین فی بیع ابیعک الی شھر بعشرہ فان

حبستہ شهرا فناخذ عشرة قال شريح اقل الثمنين وابعد الاجلين او الربا "یعنی ایک بیع میں دو شرطوں کی یہ صورت ہے کہ ایک شخص دوسرے کو یوں کہے کہ میں یہ چیز تجھے دس روپے کو ایک ماہ کے وعدے پر فروخت کرتا ہوں اور اگر تو ایک ماہ اور قیمت بند رکھے گا تو ہم دس روپے اور لیں گے۔ پس اس میں کم قیمت (صرف دس روپے) لے' زیادہ لینا بیاج ہے۔"

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فوجب ابطالهما معالانهما عن المنهي عنه "یعنی ایک عقد کی دو بیعیں جو اکٹھی کی گئی ہیں' باطل ہیں۔ کیونکہ یہ ممنوع ہیں۔ بعض میں تو سود ہے اور بعض میں قیمت کا استقرار نہیں' تعلیق ہے۔

ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ولا يصح البيع بغير ثمن سمى "یعنی قیمت مقرر کرنے کے بغیر بیع صحیح نہیں ہے۔ پس ادھار کی قیمت مقرر کر کے اس پر بیع کی جاتی ہے لہٰذا یہ درست ہے۔

الغرض یہ کہنا کہ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صورت ادھار پر مول متعین ہونے کو حرام کیا' سراسر دھوکہ ہے۔ سائل نے جو صورت لکھی ہے' ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قطعاً جائز ہے۔

کتب حدیث کا حوالہ بے جا: مولانا شام کوٹی نے موطا' مشکوٰۃ' درایہ' نسائی' محلّٰی' مظاہر حق وغیرہ کتابوں کے نام اور حوالے بے جا طور پر لکھ دیئے ہیں اور عوام کو یہ دھوکہ دیا ہے کہ ادھار پر کوئی چیز بازاری نرخ سے زیادہ مول پر فروخت کی جائے تو یہ حرام ہے حالانکہ ان کتابوں میں صرف یہ حدیث درج ہے کہ ایک عقد میں دو بیع نہ کرو۔ اس مسئلہ کی کوئی تفصیل درج نہیں ہے۔

درایہ میں محض حدیث بلا تفسیر درج ہے۔ اگر کہیں تفسیر درج ہے تو اس کا مطلب عرض کیا گیا کہ وہ صورت تعلیق پر محمول ہے۔ جب نقد یا ادھار ایک صورت معین پر بیع ہو تو وہ کسی دلیل سے منع نہیں اور نہ یہ کسی کتاب حدیث میں منع لکھی ہے۔ اگر کسی کتاب حدیث یا دلیل شرعی سے صرف ادھار کے نرخ معین اور قیمت مقرر پر بیع کو حرام ثابت کر دے تو مبلغ ایک سو روپے انعام حاصل کرے۔ هاتوا برهانكم ان كنتم صادقين۔

سراسر جھوٹ: مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ ان کتابوں میں موجود ہے کہ نقد قیمت اور ادھار قیمت میں فرق کرنے سے ایک وقت میں بیع حرام اور باطل ہو جاتی ہے' سراسر جھوٹ ہے۔

نقد ادھار کی قیمت میں فرق کرنے اور بتلانے سے چیز حرام نہیں ہوتی بلکہ نقد ادھار دو مول پر بیع معلق رکھ کر عقد کر کے جدا ہو جانے سے بیع باطل ہوتی ہے۔ اگر ایک قیمت پر فیصلہ ہو کہ عقد ہو گا تو باطل نہیں ہو گی۔ جیسے مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے شرح السنہ سے نقل فرما کر لکھا ہے: فاذا باعه علی احدا لامرین فی المجلس فهو صحیح لا خلاف فیه "یعنی جب بائع نقد یا ادھار ایک مول اور نرخ پر اسی مجلس میں بیع کر کے مشتری سے علیحدہ ہوا تو بلا خلاف بیع صحیح ہے۔"

مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری پر غلط الزام: مولوی شام کوٹی نے اپنے فتوٰی میں یہ لکھا ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی ص ۲۳۶ پر لکھتے ہیں: علی غایة ما فیه ....الخ "اگر اس طریقہ سے بیع کی جائے کہ نقد دس روپیہ اور ادھار پندرہ روپیہ تو یہ بیع فاسد اور ناجائز ہے۔"

مولانا پر غلط الزام ہے کہ وہ ادھار پر نقدی نرخ سے زیادہ مول پر بیع کرنے کو ناجائز فرماتے ہیں۔ یہ تو لا تقربوا الصلوٰۃ پڑھ کر وانتم سکاریٰ سے اغماض ہے جو عوام سے دھوکہ ہے اصل فیصلہ آپ کا یہ ہے:

محدث مبارک پوری کا محققانہ فیصلہ: بان قال البائع ابیعک هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسیئة بعشرین فقال المشتری اشتریته بنقد بعشرة ثم نقد عشرة دراهم فقد صح هذا البیع "یعنی بائع نے یہ کہا کہ میں تجھے یہ کپڑا دس روپیہ نقد اور بیس روپیہ ادھار پر فروخت کرتا ہوں۔ مشتری نے کہا میں دس روپیہ نقد میں اس کپڑا کو خریدتا ہوں اور پھر دس روپے نقد بائع کو ادا کر دئے تو یہ بیع صحیح ہے۔"

پھر لکھتے ہیں: وکذالک قال المشتری اشتریته بنسیئة بعشرین وفارق البائع علی هذا صح البیع لانه لم یفارقه علی ابهام وعدم استقرار الثمن بل فارقة علی واحد معین منهما۔ "یعنی نقد صورت کی طرح یہ صورت صحیح ہے کہ مشتری یہ کہہ دے کہ میں نے یہ کپڑا بیس روپے ادھار پر خریدا اور بائع مشتری اس عقد پر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تو یہ بیع صحیح ہے۔ کیونکہ اس میں نہ ابہام ہے اور نہ قیمت کا عدم استقرار ہے بلکہ وہ

ایک مول معین پر بات طے کر کے علیحدہ ہوئے ہیں۔"

یہ ہے اصل فیصلہ مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ رحمتہ واسعہ الیٰ یوم القیامتہ وادخلہ فی جنت الفردوس کا۔

مولوی شام کوٹی نے جو عبارت نقل کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بائع نے اسی صورت مبہمہ بلا فیصلہ نقد یا ادھار پر معاملہ کیا تو وہ فاسد ہے۔ سو اس کے فاسد ہونے پر ہمارا بھی اتفاق ہے کہ اس میں ابہام اور تعلیق ہے۔ چنانچہ تنقیح الرواۃ میں ان دو مول کی بیع کے منع ہونے کی علت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی نقل کی ہے : هذا بيع فاسد لانه ابهام وتعليق "کہ یہ بیع فاسد ہے کہ اس میں ابہام اور تعلیق ہے۔"

پھر نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ اگر اول سے یہ کہا کہ اتنے مول سے دوں گا تو حدیث اس صورت کے منع ہونے پر ہرگز دلالت نہیں کرتی۔

مولوی شام کوٹی کے پاس "تحفۃ الاحوذی" اور "نیل الاوطار" دونوں موجود ہیں۔ اگر وہ عقل وعلم کی روشنی سے کام لیتے تو فتویٰ میں ہرگز غلطی نہ کرتے کہ دونوں کتابوں میں اس مسئلہ کا صاف فیصلہ ہمارے حق میں موجود ہے۔ فللّٰہ الحمد۔

تحفۃ الاحوذی کی منقولہ عبارت میں الفاظ هذه الصورة اور نیل الاوطار کی عبارت هذه الصورة کا مشاراً الیہ' صورت معلقہ مبہمہ ہے۔ چنانچہ نیل الاوطار جلد-۵' ص-۱۵۳ میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ ان دونوں مولوں پر عقد ہو تو منع ہے۔

مشکوٰۃ مترجم جس کا حاشیہ مظاہر حق سے مستفاد ہے' اس حدیث کی دو تفسیریں حاشیہ پر درج ہیں۔ ایک یہ کہ ایک شخص یہ کہے کہ بیچا میں نے تیرے ہاتھ اپنا غلام' بدلے ہزار روپے کے اس شرط پر کہ تو بیچے میرے ہاتھ اپنا گھر بعوض سو روپے کے' یہ درست نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ کہے میں نے بیچا غلام اپنا تیرے ہاتھ دس روپے نقد کو یا بیس روپے قرض کو یہ بھی نادرست ہے۔ ان دونوں صورتوں میں ایک عقد میں دو مول اور دو بیع ہیں' اس لیے نادرست ہیں۔

لیکن اگر یوں کہے کہ "میں نے یہ کپڑا بیس روپے ادھار پر تجھے فروخت کیا" اور مشتری نے منظور کیا تو یہ کسی کے نزدیک منع نہیں ہے۔ الا من سفه نفسه۔ کیونکہ یہ ایک عقد اور ایک بیع ہے۔

کیا یہ بیع خلاف مروت ہے؟: مولوی شام کوٹی نے آیت : ولا تنسوا الفضل بینکم بھی لکھی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے پر فضل (احسان) کرنے کو نہ بھولو۔ اس سے بعض لوگ یہ استنباط کرتے ہیں کہ ادھار پر زیادہ مول سے دینا خلاف مروت ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے نفس بیع کے حرام اور ناجائز ہونے پر دلیل لینا ہرگز درست نہیں ہے۔ ایک دوسرے پر احسان مروت ضرور رکھو لیکن اگر کسی نے مروت احسان کو فراموش کیا اور روپے ادھار مانگنے پر نہ دیئے' آخر ضرورت مند نے اپنی بکری اس کو فروخت کر دی اور روپے قیمت میں لیے' اگر وہ بکری نہ خریدتا اور روپے قرض حسنہ اس کو دے دیتا اور بکری اس کے بال بچوں کے پاس رہنے دیتا تو یہ کار ثواب تھا اور احسان تھا۔ مگر اس نے ایسی مہربانی نہ کی اور بکری اس سے لے لی تو یہ بیع جائز ہے' اس عدم احسان کا نفس عقد میں کچھ دخل نہیں ہے۔ پھر اس کو اس کے حرام ہونے پر پیش کرنا عبث ہے۔

عجیب دلیل: مولانا صاحب نے ایک یہ دلیل بھی پیش کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "ایسا زمانہ آئے گا کہ مالدار غریبوں کو کاٹ کاٹ کر کھا جائیں گے۔" یہ بڑی عجیب دلیل ہے۔ اسی پر کہا گیا ہے کہ ؎

کہیں کی اینٹ' کہیں کا روڑا
بھان متی نے کنبہ جوڑا

کہتے ہیں کہ کسی شخص صالح نے ایک بے نماز کو نصیحت کی کہ تم نماز پڑھا کرو۔ یہ سخت گناہ ہے کہ تم تارک نماز ہو جاؤ اور پانچ وقت کی نماز سے غافل رہو۔ توبہ کرو اور نماز پڑھا کرو۔

بے نماز نے جواب دیا تمہارے باپ دادا نے بڑا جرم کیا کہ انہوں نے ایک دن لوگوں کی دعوت کی تو سالن میں نمک زیادہ ڈال دیا جس سے کھانا بے مزہ ہو گیا اور لوگ کھا نہ سکے' سب لوگوں نے اس کی شکایت کی۔

اب بتائیے کیا یہ باتیں ٹھکانے کی ہیں؟ ایسے ہی مفتی شام کوٹی کی یہ دلیل ہے جس کو دعویٰ سے کوئی تعلق نہیں البتہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہے۔

سنئے! اس حدیث میں تو اس زمانہ کا ذکر ہے جس میں مظالم بکثرت ہوں گے' حکام رشوت لیں گے' ڈاکہ فریب کاری' چوری وغیرہ سے لوگوں کے مال کھائیں گے۔ جابر اور ظالم لوگ

غریبوں کو لوٹ کھائیں گے' مال دار غریبوں سے بیاج کا لین دین کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس سے اکل بالباطل کی صورتیں مراد ہیں۔

ایک شخص اپنی چیز ادھار پر بیچ دیتا ہے اور دوسرا اس کو خرید لیتا ہے اس کو کون حرام اور ظلم کہتا ہے بلکہ یہ تو ایک دوسرے کی خیر خواہی ہے کہ نقد لینے کی غریب کو وسعت نہیں' وہ فصل برآمد ہونے یا تنخواہ آنے پر قیمت ادا کر سکے گا اور وہ کسی مالدار سے کوئی چیز اس وعدہ پر ادھار خرید لیتا ہے۔ وہ کچھ زیادہ قیمت سے اس کو بیع کر دیتا ہے تو بتائیے اس میں کیا ظلم ہے؟ اگر یہ ظلم ہوتا تو بیع سلم کو اللہ کے رسول ﷺ شرع میں جائز نہ کرتے کہ مالدار پیشتر روپے دے کر سستا اناج خرید لیتا ہے۔

ہمارے سامنے ایسے واقعات ہوئے کہ اناج اور چارہ کے لیے روپے پیشتر دے کر جنس بازاری نرخ سے بہت سستی خریدی گئی جس کو کسی نے ظلم اور ڈاکہ قرار نہ دیا تو پھر پیشتر جنس دے کر قیمت بعد میں وصول کرنا ڈاکہ ظلم کیسے بن گیا؟ ما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

<u>کیا یہ بیع اضطراری ہے؟</u>: نقد ادھار کی قیمتوں میں فرق کر کے بیع کرنے کی ممانعت پر یہ حدیث بھی پیش کی گئی ہے کہ یہ بیع مضطر کی ہے جو منع ہے کیونکہ لینے والا غریب بوجہ تنگ دستی کے ادھار پر زیادہ قیمت سے خرید تا ہے وہ مجبور اور مضطر ہے۔

قرآن میں تجارت کے لیے تراضی کی قید ہے اور حدیث میں ہے کہ انما البیع عن تراض "بیع باہمی رضامندی سے ہوتی ہے۔" مشتری نادار لاچار ہے جو گراں قیمت پر لے رہا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بروئے آیت وحدیث بیع خرید وفروخت میں تراضی ضرور شرط ہے۔ اگر بیع اکراہ' جبار' زبردستی اور ناراضگی سے ہو گی تو صحیح نہ ہو گی لیکن کسی کے دل کی حالت تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ وہی عالم الغیب ہے۔ ہمارے معاملات باہمی میں جو تراضی شرط ہے' اس کے معلوم کرنے کا طریقہ اور ذریعہ کیا ہے؟

تراضی سے مراد یہ ہے کہ کوئی فریق کسی فریق پر اکراہ اور جبر نہ کرے کہ جس سے وہ مجبور ہو کر وہ چیز خریدے یا بیع کرے' یہ بالاتفاق ناجائز ہے۔

محلّٰی میں ہے: ولا یحل بیع من اکراہ علی البیع وھو مردود "یعنی جس شخص پر جبر اور زبردستی کی گئی ہو کہ وہ کسی چیز کو بیچے یا خریدے تو یہ بیع حلال نہیں بلکہ حرام ہے۔"

لیکن زمینداروں کا موجودہ لین دین ادھار کسی جبر اور زبردستی پر مبنی نہیں ہے۔ یہ سب لوگ

اپنی اپنی مرضی اور خود اختیاری سے ایسا کر رہے ہیں۔ کبھی کسی تھانہ' عدالت' پنچایت یا برادری یا کسی عالم شرع کے پاس کوئی شکایت کسی مشتری کی پیش ہوئی نہیں سنی گئی کہ مجھ پر فلاں شخص نے اکراہ کیا اور مجھے جبراً فلاں چیز بیع کر دی۔ اگر کہیں ایسا ہوا ہے تو کوئی مفتی ایسا واقعہ پیش کرے۔

سنئے! بائع مشتری کا اپنے اختیار اور رضامندی سے بیع شراء ہو جانا تراضی فریقین پر دال ہے۔ مصفٰی شرح موطا جلد۔ا' ص۔۳۴۲ میں لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "احکام میں تراضی کی حقیقت جو کہ دل کا فعل ہے' معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس کے قائم مقام کسی چیز کو ٹھہرائے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور ضرور ہے کہ وہ ایسی چیز ہو جو عقد کرنے والوں اور تمام اہل زبان کے نزدیک رضامندی پر دلالت کرے۔ پس وہ بیع واجارہ وغیرہ میں ایجاب وقبول ہے اور نیز اس چیز کا باہمی لینا دینا بھی ہے۔"

فریقین کا بیع کے وقت عقد کرنا اور مال وقیمت کا ایک دوسرے کے حوالہ کرنا رضامندی پر دال ہے۔ اس سے بیع منعقد ہو جائے گی جبکہ بظاہر کوئی مارنے' ڈبونے' جبر وقہر کر کے معاملہ کرنے کا ثبوت نہ ہوا تو عاقدین کے لین دین کرنے سے تراضی کا مفہوم پایا جائے گا۔

صورت مسئولہ متنازعہ میں عرف متعارف یہ ہے کہ نقد ادھار کی صورت میں مول کی زیادتی کرنا کرانا قدیم سے رائج ہے اور یہ معاملہ لوگوں کی رضامندی سے جاری ساری ہے۔ کوئی شخص کسی پر تلوار' بندوق وغیرہ یا کسی اور خطرہ اندیشہ کی راہ سے جبر نہیں کرتا بلکہ خریدار لوگ تاجروں' سوداگروں سے خود منت سماجت کر کے اپنے مفاد کے لیے خوش دل سے جنسیں خریدتے ہیں اور مدت آسانی سے مقرر کر لیتے ہیں کہ جب فصل برآمد ہو گی یا فلاں وقت روپیہ آجائے گا تو قیمت ادا کر دی جائے گی' یہ عین تراضی ہے۔

باقی رہا دل میں خوش ہونا اور ناپسندی اور کراہت کا پایا جانا تو یہ طبعی چیز ہے جو شرعاً مقصود نہیں' یہ تو نقدی خرید وفروخت میں بھی ہوتا ہے کہ جب چیزیں کپڑا' اناج' گھی' کھانڈ' سونا' چاندی' ادویات وغیرہ گراں ہوتی ہیں' سوداگر اور دکاندار ارزاں نہیں دیتے تو خریدار غریب لوگ بہت تنگ دل ہو کر اور ضرورت سے مجبور ہو کر یہ چیزیں خریدتے ہیں۔ اس گرانی سے ناخوش ہو کر چیزیں مول لیتے ہیں۔ یہ اضطراری حالت قدرت نے پیدا کی ہے۔ ضروریات سے انسان لاچار ہے۔ چیزیں گراں ہیں۔ اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر خریدتا ہے

تو یہ کسی کی طرف سے اکراہ اور اضطرار ممنوعہ نہیں ہے جس کی بنا پر نقدی یا ادھار کا لین دین خلاف تراضی قرار پا کر حرام ہو جائے۔

امام ابن حزم نے بیع مضطر پر یہ لکھا ہے جس سے مفتی شام کوٹی نے اغماض کیا ہے اور اپنے مطلب کی تھوڑی سی بات لے لی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں: کل من یبیع قوت نفسه واهله للاكل واللباس فانه مضطر الى ابتياعه بلا شک فلو بطل ابتياع هذا المضطر لبطل بيع كل من لا يصيب القوت من ضيعة وهذا باطل بلا خلاف۔ "یعنی ہر شخص اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے کھانے پینے کی خوراک خریدتا ہے اور پہننے کے لیے کپڑا لیتا ہے اور وہ ضرورت لائقہ کی بنا پر کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں کو خریدنے پر لاچار ہے۔ اگر یہ خریداری مضطر کی ہے جو باطل ہے تو پھر ہر خریداری مضطر کی ہے جو باطل ہے تو پھر ہر خریداری اور بیع باطل ہے جس کسی کو کوئی چیز کھانے پینے کی میسر نہیں ہوتی اور وہ خریدنے پر مجبور ہے تو اس کی بیع باطل ہونی چاہیے حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔"

پھر کہتے ہیں: وقد ابتاع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اصواعا من شعیر لقوت اهله ومات علیه السلام ودرعه مرهونة فی ثمنها فصح ان بیع المضطر الی قوته وقوت اهله وبیع ما یبتاع به القوت بیع صحیح لازم فهو ایضا بیع تراض لم یجبر لا احد علیه فهو صحیح بنص القرآن۔ (محلّٰی جلد۹، ص۔۲۲) "یعنی نبی اکرم ﷺ نے خود اپنی ضروریات خانگی سے لاچار ہو کر اپنی زرہ گروی کر کے جَو کئی صاع خریدے اور آپ رحلت فرما گئے اور وہ زرہ گروی چھوڑ گئے۔ یہ بیع مضطر کی ہے جو صحیح اور لازم ہے جس پر کسی دوسرے نے مجبور نہیں کیا۔ یہ اضطرار (زمانہ کے بھاؤ اور اپنی ضروریات نے پیدا کیا ہے جو) تراضی کے خلاف نہیں بلکہ یہ قرآن کی رُو سے تراضی ہے جس سے بیع لازم ہو جاتی ہے۔"

بیع مضطر کی ممانعت پر یہ حدیث پیش کی جاتی ہے: عن علی نهی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم عن بیع المضطر "کہ رسول اللہ ﷺ نے مضطر کی بیع سے منع فرمایا ہے۔"

اس دلیل پر دو طرح سے کلام ہے۔ ایک علم روایت کی رُو سے اور دوم علم درائت کی رُو سے۔ علم روایت کی رُو سے یہ کلام ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے جو حرمت کے مسائل میں حجت نہیں کہ حرمت کے لیے نص قطعی درکار ہے۔ اس کی اسناد میں ایک راوی صالح ابو عامر ہے جو کثیر الخطاء ہے جس کو امام ابن معین نے ضعیف بتایا ہے۔ دوسرا راوی اس کی

اسناد میں بنی تمیم کا شیخ ہے جو مجہول ہے۔ لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔

امام المحققین حضرت العلامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے مضطر کی دو روایتوں کو ذکر فرما کر پھر یہ لکھا ہے : لکنهما مرسلان ولا یجوز القول فی الدین بالمرسل "یعنی یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں اور دین میں مرسل روایت پر فتوئ دینا جائز نہیں ہے۔"

جب یہ حدیث ضعیف ہے تو ضعیف سے مسائل احکام میں استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔ مقدمہ شرح نووی ص ۲۱ میں ہے : فانهم متفقون علی انه لا یحتج بالضعیف فی الاحکام "یعنی محدثین کرام اس بات پر متفق ہیں کہ ضعیف حدیث احکام میں حجت نہیں ہے۔" جب یہ حدیث حجت نہیں تو مفتی صاحب اور ان کے اعوان کا استدلال باطل ہوا۔

درایت کی رُو سے مضطر کی بیع میں یوں کلام ہے کہ نقد' ادھار کی قیمت میں فرق کر کے خرید و فروخت کرنا بیع مضطر میں داخل نہیں ہے کیونکہ عام لوگ اس طرح اپنی خوشی سے خرید و فروخت کر رہے ہیں' کوئی شخص اس بیع کے لیے بیمار' لاچار بہ اضطرار نہیں سنا گیا۔ اس حدیث میں ممانعت اس امر کی ہے کہ کسی سے زبردستی خرید و فروخت نہ کرو' سو اس کو کون جائز کہتا ہے' یہ ظلم ہے لیکن یہ بھی ظلم ہے کہ جو لوگ نقد ادھار کے فرق سے عام تجارتیں بتراضی کر رہے ہیں' اس کو اضطرار قرار دے کر حرام بتلایا جا رہا ہے۔

تنقیح الرواۃ میں مضطر کی دو صورتیں نہایہ سے نقل کی ہیں۔ ایک یہ کہ بطور اکراہ کے کوئی شخص عقد بیع پر مجبور کیا جائے جیسے حکومت اناج پکڑ کر کسی کو اپنے بھاؤ پر بیچنے پر مجبور کرے اور وہ لاچار ہو کر اس بھاؤ پر بیچے تو یہ بیع مضطر کی ہے۔ اس کو تو مولوی حکومت کے خوف سے جائز کہتے ہیں اور جو اپنی خوشی سے تجارت کر رہے ہیں' اس کو حرام کہہ رہے ہیں کہ ادھر نہ اللہ کا خوف ہے اور نہ حکومت کا ہے' پس جو مرضی ہے فتوئ دیں۔

دوسری صورت یہ لکھی ہے کہ کوئی شخص قرض دار ہے' اس کی چیز قرضہ میں قرق کر کر کے بیچی گئی۔ جب کوئی قرضہ نہ دے تو حاکم کو مقروض کا مال قرق کر کے بیچنا جائز ہے تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو اور حقدار کو اس کا حق پہنچ جائے۔ اگر حکومت کو یہ جبر کرنا جائز نہ رکھا جاتا تو کوئی مظلوم کسی ظالم سے حق نہ لے سکتا اور ظلم کا دروازہ کھل جاتا یہ اکراہ و اضطرار ممنوع نہیں ہے۔

اسی طرح یہ بھی مضطر میں داخل ہے کہ کوئی اپنی اولاد یا ملازم کے خرچ کے بوجھ میں آگیا' وہ

اپنا سامان کم قیمت پر نقصان اٹھا کر فروخت کرے' ایسے شخص کے بارہ میں مروت اور احسان یہ ہے کہ اس کو قرض حسنہ دیا جائے یا اس کا سامان زیادہ قیمت پر خرید ا جائے لیکن اگر اس پر کوئی رحم نہ کرے اور مال پسند کر کے کم قیمت پر خرید لے تو یہ عقد صحیح ہے۔

یہ خارجی سبب بے لحاظی' بے رحمی' بے مروتی علیحدہ چیز ہے جو اخلاقی جرائم سے ہے نفس عقد میں یہ حارج نہیں۔ کما لا یخفی علی اهل العلم۔

لیکن نقد ادھار کی صورت مروجہ ان میں سے کسی صورت میں بھی داخل نہیں ہے کہ بہت لوگ امیر غریب خوش دلی سے اپنے اپنے فائدوں کے پیش نظر یہ معاملہ کر رہے ہیں بلکہ ادھار کی صورت میں غریبوں اور تنگ دستوں کو بڑا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ بعض لوگوں کے پاس نقد روپے موجود ہوتے ہیں' وہ ان روپوں سے تجارت وغیرہ کئی کاروبار کر لیتے ہیں اور اناج آسانی کے زمانہ تک ادھار لے لیتے ہیں پھر فراوانی کے وقت ادا کر دیتے ہیں۔

بعض غریب لوگ فی الحال نادار ہوتے ہیں' وہ اپنی ناداری کی وجہ سے اس وقت تک ادھار چیزیں' اناج وغیرہ خرید لیتے ہیں اور فصل وغیرہ زمانہ آسانی میں ادائیگی کا وعدہ کر لیتے ہیں۔ ناداری کے وقت ان کو نقد دینے کی طاقت نہیں ہوتی کہ کم قیمت سے اناج وغیرہ خرید لیں۔ فصل پر ارزانی اور فراوانی ہو جاتی ہے اس وقت اس کو زیادہ قیمت دینا آسان ہو جاتا ہے کہ فصل کی آمد سے کشادگی ہو جاتی ہے۔ یہ غرباء لوگ اس طرح ہمیشہ اناج لیتے رہتے ہیں اور فصلوں پر دیتے رہتے ہیں۔ جب خریدتے ہیں تو حالت ناداری اور لاچاری ہوتی ہے اور جب ادا کرتے ہیں تو اس وقت آسانی ہوتی ہے۔ اگر حالت ناداری میں مالدار لوگ اناج ادھار نہ دیں تو نادار لوگ اپنا سامان خانگی اور اپنے حیوانات گائے' بھینس' بیل وغیرہ فروخت کریں تو ان کو اور زیادہ دشواری ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اپنا مال اور سامان بچا کر اسی میں آسانی سمجھتے ہیں کہ فصل وغیرہ فراوانی کے زمانہ تک اناج گراں بھی خرید لیا جائے۔ اگر سولہ روپے نقد موجود نہ ہوں کہ وہ گندم خرید لے اور بیس روپے پر ادھار مل جائے تو یہ بھی غنیمت ہے کہ چھ ماہ کے بعد فصل کپاس کی آمد ہونے پر بیس روپے دینا زمانہ حال کے نقد سولہ ادا کرنے سے آسان ہے' اس کو کون بے وقوف اضطرار یا اکراہ قرار دے گا کہ سب اپنے مفاد کو مدنظر رکھ کر یہ معاملات کر رہے ہیں اور یہ رواج عام شہروں اور دیہات میں ہے۔ ہاں بات صرف غور کرنے کے قابل ہے کہ بازاری نرخ اور مول سے بصورت ادھار

مول زیادہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس میں فرق کرنے سے سود لازم آتا ہے یا نہیں؟

ہم کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے اور سود اس میں لازم نہیں آتا کیونکہ یہ بیع ہے جس میں اصول شرع کی رُو سے سود لازم نہیں آتا اور اس کے سود ہونے پر اور اس بیع کے ناجائز ہونے پر کوئی شرعی دلیل ناطق نہیں۔ یہی اہل حدیث' حنفیہ اور علمائے جمہور کا مذہب ہے۔

لیکن شام کوٹی مولوی کا انوکھا فتویٰ ہے کہ یہ خرید وفروخت اقسام سود میں داخل ہے اور بیع فاسد ہے لیکن اس دعویٰ پر ایک دلیل بھی پیش نہیں کر سکے اور جو دلائل دیئے ہیں' ان کا دعویٰ سے تطابق وتوافق نہیں کہ کبھی کہتے ہیں یہ دو بیع ہیں حالانکہ سوال میں ایک بیع ادھار کی درج ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ بیع مضطر کی ہے حالانکہ حالت اضطراری نہیں ہے۔ لوگ اپنی سہولت کے لیے فصل وغیرہ زمانہ آسانی کے وعدہ پر ادھار زیادہ قیمت سے خرید رہے ہیں اور شرعی تراضی سے خرید وفروخت کر رہے ہیں۔ طبعی تراضی کا نہ علم ہے اور نہ وہ قابل اعتبار ہے۔ اصل ظاہری تراضی بول چال' لین دین کرنے سے صاف ثابت ہے' وہی معتبر ہے۔ کما تقدم بیانہ۔

تو یہ بیع بہرصورت جائز اور درست ہے اس کو حرام اور سود کہنا غلو فی الدین ہے۔

مفتی صاحب شام کوٹی اور مولانا حصاری کے فتویٰ پر

حضرت العلام جناب حافظ صاحب روپڑی مدظلہ العالی کا محاکمہ

مولوی عبدالقادر صاحب حصاروی کا تعاقب صحیح ہے۔ مفتی اول نے سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ اپنی طرف سے نئی صورت بنا کر جواب دیا ہے۔ اس کے علاوہ موطا کی عبارت غلط نقل کی ہے اور اس کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے۔ موطا کی اصل عبارت یہ ہے:

قال مالک فی رجل اشتری من رجل سلعةً بدینار نقداً او بشاة مرصوفة الی اجل قد وجب علیه البیع با حد الثمنین ان ذالک مکروه ولا ینبغی لان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم نهی عن بیعتین فی بیعة وهذا من بیعتین فی بیعة۔ (موطا امام مالک ص۔ ۲۷۴)

(ترجمہ) ''امام مالک اس شخص کے بارے میں فرماتے ہیں جس نے کوئی سامان دوسرے شخص سے نقد ایک دینار سے خریدا یا بکری کے ساتھ ادھار خریدا' جس کی وصف بیان کی گئی ہے۔ دونوں صورتوں سے ایک صورت پر بیع واجب ہو گی۔ اس شخص کے بارہ میں امام مالک فرماتے ہیں کہ (اُس کی) بیع مکروہ ہے۔ یہ شرعاً لائق نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیعوں سے منع فرمایا ہے اور یہ صورت ایک بیع میں دو بیعوں کی قسم سے ہے۔''

اس عبارت میں مفتی اول نے دو غلطیاں کی ہیں۔ ایک بکری کو الشیئی المبیع (فروخت کی گئی) قرار دیا ہے۔ حالانکہ بکری دینار کے مقابلے میں ہے جو قیمت ہے۔ فرق یہ ہے کہ دینار قیمت نقد ہے اور بکری قیمت ادھار ہے جو معین نہیں بلکہ اس کی وصف بیان کر دی گئی ہے کہ اس قسم کی بکری فلاں موقعہ پر دے دی جائے گی۔

دوسری غلطی یہ کی ہے کہ جملہ قد وجب علیہ البیع باحد الثمنین کو امام مالک کا کلام قرار دیا ہے اور یہ غلطی مولوی عبدالقادر سے ہوئی ہے۔ انہوں نے بھی اس کو امام مالک کا کلام قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ امام مالک کا کلام نہیں بلکہ متعاقدین کا کلام ہے۔ امام مالک کا کلام ان ذالک مکروہ سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا بیان آگے آتا ہے۔ امام مالک کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک چیز کی دو قیمتیں ہو گئیں۔ ایک نقد ایک ادھار تو وہ ایک بیع میں دو بیعیں ہو گئیں خواہ وہ قیمت ایک جنس کی ہو جیسے نقد ایک دینار اور ادھار دو دینار یا دو جنس کی ہو جیسے نقد ایک دینار اور ادھار بکری موصوفہ۔

اس عبارت میں دوسری صورت بیان کی ہے اور پہلی صورت اس عبارت سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں : قال مالک فی رجل ابتاع من رجل سلعة بعشرة دنانیر نقداً او بخمسة عشر دیناراً الی اجل قد وجبت للمشتری باحد الثمنین قال مالک انه لا ینبغی ذلک لانه ان اخر العشرة کانت خمسة عشر الی اجل وان نقد العشرة کان انما اشتری بها الخمسة عشر التی الی اجل۔ (حوالہ وصفحہ مذکور)

''یعنی ایک شخص نے دوسرے سے کوئی سامان خریدا نقد دس دینار سے اور ادھار پندرہ دینار سے۔ ان دونوں قیمتوں سے ایک کے ساتھ بیع واجب ہو گئی۔ امام مالک اس بیع کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ یہ (شرعاً) لائق نہیں کیونکہ اگر دس کو مؤخر کر دیا تو وہ ایک مدت تک پندرہ ہو گئے اور اگر دس نقد دے دیئے تو پندرہ جو ادھار لئے وہ دس خرید لئے۔ امام مالک کا

مطلب یہ ہے کہ بیع تو بنی نہیں کیونکہ قیمت کا تقرر نہیں ہوا بلکہ مبہم رہی اور دس اور پندرہ کا مقابلہ رہا تو یہ جائز نہیں کیونکہ اس میں کمی بیشی ہے جو سود ہے۔"

اس عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ قد وجب علیہ البیع متعاقدین کا کلام ہے' امام مالک کا نہیں کیونکہ یہاں قال مالک قد وجب کے بعد آیا ہے جس میں صراحت ہے کہ پہلا کلام متعاقدین کا ہے گویا متعاقدین کہتے ہیں کہ ہماری یہ بیع ان دونوں قیمتوں سے ایک پر پختہ ہیں' جو نہی چاہیں اختیار کر لی جائیں گی۔ بس اسی پر جدا ہو جاتے ہیں' اس کے علاوہ ایک دو اور دلیلیں سنئے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ امام مالک کا نہیں بلکہ متعاقدین کا کلام ہے۔ امام مالک بکری والی صورت کے بعد ایک صورت ذکر فرماتے ہیں :

قال مالک فی رجل قال لرجل اشتری منک هذه العجوة خمسة عشر صاعًا او الصیحانی عشرة اصوع او الحنطة المحمولة خمسة عشر صاعا او الشامیة عشرة اصوع بدینار قد وجب لی احداهما ان ذالک مکروه لا یحل وذالک انه قد اوجب له عشرة اصوع فهو یدعها ویاخذ خمسة عشر صاعا من العجوة او یجب له خمسة عشر صاعا من الحنطة المحمولة فیدعها ویاخذ عشرة اصوع من الشامیة فهذا مکروه لا یحل وهو ایضا یشبه ما نهی عنه من بیعتین فی بیعة وهو ایضا مما نهی عنه ان یباع من صنف واحدا من الطعام اثنان بواحد۔

(ترجمہ) "ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ میں تم سے عجوہ قسم کھجوریں پندرہ ٹوپے یا صیحانی کھجوریں دس ٹوپے (ایک دینار سے خرید کرتا ہوں) یا (یوں کہا) محمولہ گندم (گندم کی قسم ہے) پندرہ ٹوپے یا شامی گندم دس ٹوپے ایک دینار سے خریدتا ہوں۔ ان دونوں سے ایک صورت پر بیع میرے لیے واجب ہو گی۔ امام مالک فرماتے ہیں یہ بیع مکروہ ہے' حلال نہیں کیونکہ پہلے اس نے دس ٹوپے صیحانی کے اپنے لیے واجب کئے پھر ان کو چھوڑ کر پندرہ ٹوپہ عجوہ کے لیتا ہے یا اس کے لیے پندرہ ٹوپے گندم محمولہ کے واجب ہوئے۔ پھر ان کو چھوڑ کر دس ٹوپے شامی گندم کے لیتا ہے۔ پس یہ مکروہ ہے حلال نہیں۔ یہ ایک بیع میں دو بیعوں کی قسم سے بھی ہے جو منہی عنہ ہے اور یہ ایک قسم صنف طعام کے دو ٹوپے ایک ٹوپے سے فروخت کرنے کی قسم سے بھی ہے' جس سے نہی آئی ہے۔

امام مالک کا مطلب یہ ہے کہ بیع میں جیسے قیمت کا تقرر ہونا ضروری ہے' ایسے ہی بیع کا تقرر بھی ضروری ہے اور جیسے قیمت کا تقرر نہ ہونے سے دو بیعوں والی صورت یا سود والی صورت پیدا ہو جاتی ہے' ایسے ہی بیع کا تقرر نہ ہونے سے بھی دو بیعوں والی صورت یا سود والی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

موطا کی اس عبارت میں قد وجب لی احداھما میں لی کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ یہ متعاقدین کا کلام ہے نہ امام مالک کا کیونکہ امام مالک بیع نہیں کر رہے کہ وہ اپنے لیے لی کہیں بلکہ وہ اس کا حکم بتا رہا ہے جو "ان ذالک مکروہ" سے شروع ہوتا ہے۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ خطابی نے حدیث من باع بیعتین فی بیعۃ فلہ او کسھما کے تحت لکھا ہے کہ اس حدیث کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ بیع صحیح ہے۔ لیکن اقل قیمت پر اکتفا کرے ورنہ سود لازم آئے گا جو حرام ہے۔

پھر خطابی فرماتے ہیں کہ میں کسی کو نہیں جانتا کہ اس کا قائل ہوں۔ ہاں اوزاعی سے اس کے جواز کی کچھ حکایت ہوئی ہے مگر یہ مذہب باطل ہے کیونکہ اس میں دھوکہ ہے اور جہالت ثمن ہے۔ اس عبارت میں اوزاعی کا مذہب جواز بتایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام مالک کا یہ مذہب نہیں لیکن قد وجب کو امام مالک کا کلام قرار دیں تو لازم آتا ہے کہ امام مالک کا مذہب بھی امام اوزاعی والا ہو۔ چنانچہ مولوی عبدالقادر صاحب کی تشریح پر امام مالک کے نزدیک بیع جائز ہو گی۔ اس سے صرف نہی تنزیہ ہو گی' حالانکہ یہ کسی امام کا مذہب نہیں۔ صرف اوزاعی سے کچھ حکایت ہے پس ثابت ہوا کہ قد وجب کو علماء نے متعاقدین کی کلام قرار دیا ہے' نہ امام مالک کی۔

چوتھی دلیل یہ کہ قد وجب کو امام مالک کی کلام بنائیں تو یہاں دو حکم ہو جائیں گے۔ ایک وجب اور دوسرا مکروہ۔ ان دونوں کے درمیان واؤ عاطفہ چاہیے تھی یا لکن چاہیے تھا یعنی کلام یوں ہوتی : قد وجب علیہ البیع باحد الثمنین وان ذلک مکروہ یا یوں ہوتی قد وجب علیہ البیع باحد الثمنین ولکنہ مکروہ۔

پس معلوم ہوا کہ قد وجب علیہ البیع امام مالک کا کلام نہیں ورنہ عربیت کی رو سے یہ کلام کمزور ہو جائے گا۔

نوٹ : مولوی عبدالقادر صاحب نے مکروہ اور لا ینبغی کو کراہت تنزیہ پر حمل کیا

ہے' یہ بھی ڈبل غلطی ہے۔ چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی اگلی عبارت میں مکروہ لا یحل ہے اور لا ینبغی کے ساتھ یہ الفاظ ہیں : لانه ان احدا العشرة كانت خمسه عشر الخ۔ اس عبارت میں وجہ سود بیان کی ہے اور سود حرام ہے۔ نیز محدثین عام طور پر مکروہ اور لا ینبغی وغیرہ الفاظ اس معنی پر استعمال کرتے ہیں جس معنی پر عام طور پر قرآن وحدیث میں آئے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے : کل ذٰلک کان سیئهٗ عند ربک مکروها یہاں سے مکروہ بمعنی حرام ہے اور سورہ یٰسین میں ہے : لا الشمس ینبغی لها ان تدرک القمر یہاں لا الشمس ینبغی لها کے معنی ہیں کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ سورج چاند کو پالے۔ ایسے ہی امام مالک کے قول میں مراد ہے کہ شرع میں اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

تحقیق مسئلہ : حدیث نهی عن بیعتین فی بیعة کی دو تفسیریں مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ ایک چیز نقد ادھار دو قیمتوں سے فروخت کی جائے اور مبہم بیع ہو جائے اور ایک قیمت کا تعین نہ ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص دوسرے کو کہے کہ میں نے تجھ پر غلام ہزار دینار کو فروخت کیا۔ اس شرط پر کہ تو اپنا مکان مجھ پر اتنے اتنے کو فروخت کر دے۔

نیل الاوطار میں یہ دونوں تفسیریں امام شافعی وغیرہ سے نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ دونوں تفسیریں حدیث نهی عن بیعتین فی بیعة کی بن سکتی ہیں اور حدیث فله اوکسهما کی صرف پہلی تفسیر بن سکتی ہے۔ کیونکہ حدیث فله او کسهما میں سود کا ذکر ہے اور دوسری تفسیر کو سود سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں صرف ایک بیع کے لیے دوسری بیع شرط کی گئی ہے۔

رہی یہ بات کہ پہلی تفسیر کو سود سے کس طرح تعلق ہے' سو اس کے متعلق عرض ہے کہ اس تفسیر کی بنا پر بیعتین فی بیعة کی حرمت دو وجہ سے بیان کی جاتی ہے۔ ایک یہ کہ قیمت کا تقرر نہیں کیونکہ مبہم بیع ہے اور دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ادھار کی وجہ سے قیمت بڑھانا یہ سود ہے تو گویا اس کا تعلق سود سے ہوگیا اور اسی بنا پر بعض کا خیال ہے کہ اگر بیع مبہم نہ بھی ہو تو پھر بھی ادھار میں زیادہ لینا جائز نہیں۔ چنانچہ مفتی اول کا خیال ہے کہ موجودہ بھاؤ سے ادھار زیادہ قیمت پر فروخت کرے تو یہ جائز نہیں مگر یہ مذہب شاذ ہے۔

نیل الاوطار میں زین العٰبدین' ناصر' منصور' ہادویہ امام یحییٰ سے نقل کیا ہے مگر زین العٰبدین کے سوا سب شیعہ سے تعلق رکھتے ہیں اور زین العٰبدین کا مذہب بھی زیادہ تر کتب شیعہ میں ملتا ہے تو یہ کوئی تسلی بخش چیز نہیں۔ پھر امام شوکانی نے اس مذہب کی تردید میں چار وجوہ ذکر کی ہیں۔ پہلی یہ کہ حدیث اوکسھما کی سند میں عمرو بن علقمہ ہے' جس میں بہت علماء نے کلام کی ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ حدیث مشہور نھی عن بیعتین فی بیعة ہے جو اکثر راوی محمد بن علقمہ سے روایت کرتے ہیں۔ صرف یحییٰ بن ذکریا نے اکثر کے خلاف محمد بن عمرو بن علقمہ سے فله اوکسھما او الربا کے الفاظ ذکر کئے ہیں۔ پس یہ شاذ ہوئی جو ضعیف کی قسم ہے۔

تیسری وجہ یہ کہ فله اوکسھما کی ایک اور تفسیر بھی ہو سکتی ہے وہ یہ کہ ایک شخص نے بیع سلم کی مثلاً ایک دینار دے دیا اور کہا مہینہ تک مجھے ایک قفیز (بوری) گندم دے دینا۔ جب مہینہ پورا ہوا تو وہ گندم نہ دے سکا۔ اس نے کہا یہ قفیز جو تو نے مجھ سے لینا ہے اس کو مجھ پر دو' قفیز کے عوض فروخت کر دے۔ دو ماہ تک دو قفیز ادا کر دوں گا' یہ بیع ہوئی۔ اب ایک قفیز لے لے تو اس کا حق ہے اور قفیز قبض کرنے سے پہلے اس کو فروخت کر کے اس کے عوض دو ماہ تک دو قفیز لے لیے تو یہ سود ہو گیا۔

عون المعبود میں خطابی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تفسیر نقل کر کے کہا ہے کہ نہایہ میں ابن اثیر نے اور شرح سنن میں ابن رسلان نے بھی یہ تفسیر ذکر کی ہے۔ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ یہ تفسیر ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ جب یہ تفسیر بھی ہو سکتی ہے تو پھر اس میں احتمال پیدا ہو گیا تو پھر استدلال صحیح نہ رہا۔ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔

جناب مولانا حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ: مندرجہ بالا مسئلہ (یعنی نقد ادھار میں کمی بیشی کرنے کے جواز) پر میرا مضمون اخبار تنظیم اہلحدیث میں اس سے پیشتر قسط وار شائع ہو چکا ہے۔ مضمون مکمل ہو جانے کے بعد مجھے تفسیر محمدی مصنفہ جناب مفسر قرآن حضرت مولانا حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ دستیاب ہوئی۔ اس کا مطالعہ کیا گیا تو آپ کا فتویٰ اس مسئلہ متنازعہ میں فیصلہ کن دکھائی دیا۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اس کو بھی ہدیہ ناظرین کرام کیا جائے۔

اس فیصلہ کے ساتھ جناب حضرت العلام محدث زمان و مفتی اعظم حافظ صاحب روپڑی

دامت برکاتہ کا محاکمہ ملا کر پڑھیں تو ناظرین کے لیے نورٌ علی نورٌ کا رنگ ہو گا اور انشاء اللہ تعالیٰ مانعین کے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہ رہے گی اور ان کو یہ فیصلہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا۔

تفسیر محمد (پنجابی) جلد اول، ص۔۲۵۲ حاشیہ نمبر۱ میں یہ مسئلہ بطور سوال وجواب (پنجابی زبان میں) اس طرح درج ہے :

سوال : ایک مسلمان غلے والا غریباں نوں غلہ گھٹ نرخ نقداں دے تھیں بہ سبب ادھار دے دیندا ہے مثلاً نرخ بازار دا وینھہ (۲۰) سیر ہے اور ادھار دی سولہ سیر دیندا ہے۔ ایہ گھٹ دینا اوسنوں حرام تے بیاج ہے یا نہیں؟

جواب : وچہ اس معاملے دے حرام تے بیاج ہونا متصور نہیں۔ از روئے کتباں فقہ اتے حدیث دیاں دے جو ایہہ سود آکھدا نال روپے دے ہے' نہ دونویں بدلے ہک جنس دے ہیں نہ ہم قدر ہیں جو روپیہ وزنی تے کنک کیلی ہے۔ فر جو بعضے علماء بھولے یا ضدی یا کج فہم ایس نوں حرام تے بیاج ٹھہراوندے ہیں ایہہ تاویل کر کے مثلاً "اس نے دو من کنک دتی پنج روپیاں نوں جو نال نرخ نقداں دے چار روپیاں دی ہوندی اے' گویا اس نے چار روپیہ دے کے پنج روپیہ لینے کیتے پس بیاج ہوئی۔"

تے جے کہ انہاں مفتیاں نوں کہیا جاوے جو جیکر کوئی شخص نقداں گھٹ نرخ بازار تھیں اتنا فرق رکھ تے دیوے تاں فتویٰ دیندے ہیں جو ایہہ روا ہے کیوں جو سودا خوشی دا ہے۔ سبحان اللہ! کیا عقل ہے' کیا علم تے فہم ہے جبکہ کوئی چار روپیہ دے کر پنج نقد لوے ایہہ صاف بیاج حرام ہے وچ حدیثاں صحیحاں دے تے نال اجماع امت دے۔ فر جیکر کہیا جاوے جو شخص حیوان ویچدا ہے بدلے دس روپے دے بہ سبب ادھار دے تے قیمت نقداں دی اٹھ روپے دا ہے تاں فتویٰ دیندے ہیں ایہہ بھی روا ہے جو حیوان دا خرچ معین نہیں۔

سبحان اللہ! دانیاں دا نرخ کس نے شرط لکھیا ہے بلکہ کنز تے شرح وقایہ دے وچ خلاف اس دے موجود ہے۔ وچہ کنز الدقائق دے۔ وچہ باب الصرف دے دیکھو ص۔۲۲۱ ہے : یعنی درست ہے دو درھماں تے دینار بدلے ہک درھم تے دو دیناراں دی تے بیع ہک مانی کنک تے ہک جواں دے بدلے دو مانیاں کنک دیاں تے دو مانیاں جواں دے بدلے واسطے موجود ہونے خلاف جنس دے یعنی مانی کنک دے بدلے دو مانیاں جواں دیاں دے تے ہک مانی جواں

دے بدلے دو مانیاں کنک دیاں دے ہو گئی۔ فر دیکھو نرخ کدھر گیا‘ فقط۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر محمدی جلد اول‘ ص۔ ۲۵۲)

جو مولوی صاحبان نقد ادھار میں نرخ کی کمی بیشی‘ منع اور ناجائز کہتے ہیں‘ ان کو چاہیے کہ وہ اس فتویٰ کو غور سے پڑھیں اور سوچیں کہ وہ بھولے بھالے علماء سے ہیں یا ضدی اور کج فہم سے؟ اگر شق اول ہے تو حضرت حافظ صاحب لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ اور حضرت العلام روپڑی کے محاکمہ سے مسئلہ سمجھ جائیں گے اور اپنے غلط فیصلہ سے رجوع کر لیں گے انشاء اللہ اور اگر شق دوم ہے تو پھر علاج مشکل ہے۔ واللہ الموفق للصواب۔ (فقط)

حررہ ابو الشکور عبدالقادر عارف الحصاری غفرلہ الباری

ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث لاہور جلد۔ ۱۴

شمارہ۔ ۲۴‘ ۲۵‘ ۳۶‘ ۳۷‘ ۳۸‘ ۳۹‘ ۴۰‘ ۴۱‘ ۴۴‘ ۴۵‘ ۴۶‘ ۴۷‘ ۵۲۔ وجلد۔ ۱۶‘ شمارہ۔ ۱۰

مورخہ ۱۶‘ ۲۲ جنوری‘ ۲۳‘ ۳۰ مارچ‘ ۴‘ ۱۳‘ ۲۰‘ ۲۷/ اپریل‘ ۲۵ مئی‘ ۱‘ ۸‘ ۱۳ جون سنہ۔ ۱۹۶۲ء ۶/ ستمبر سنہ۔ ۱۹۶۳ء

مذاکرہ علمیہ --- حرام چیزوں سے علاج

اخبار اہل حدیث کے کسی پرچہ میں خون خرگوش سے کسی مرض کا علاج کرنا لکھا ہوا تھا۔ اس پر بندہ نے بارادہ اصلاح یہ لکھ دیا تھا کہ خرگوش کا دم (خون) مسفوح حرام ہے‘ اس سے علاج کرنا جائز نہیں ہے اور یہ اہل حدیث کی شان سے بہت بعید ہے تو بحکم حضرت مدیر مدظلہ العالی اس غلطی کی اصلاح کی گئی اور یہی مومن کی شان اور اہل حق کی علامت ہے کہ اپنی غلطی معلوم کر کے وہ فوراً اصلاح کر دیتے ہیں۔

مگر سخت تعجب ہوا کہ اخبار اہل حدیث مطبوعہ ۲۴/ اپریل سنہ۔ ۱۹۵۷ء میں اس مسئلہ کو مذاکرہ علمیہ بنا کر شائع کیا گیا ہے اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ خون خرگوش کیا ہر حرام سے علاج کرنا جائز اور مباح ہونا چاہیے اور اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے اور اس پر دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ مروجہ نظامہائے طب میں ایسی دوائیں استعمال کرائی جا رہی ہیں جن کا کھانا‘ پینا شرعی طور پر حرام ہے مگر طبیب اور ڈاکٹر انہیں بے کھٹکا مریضوں کو دے رہے ہیں جن کو جہلا کے علاوہ علماء بھی استعمال کر رہے ہیں۔

اس مذاکرہ کو پیش کرنے والے ہمارے دینی اور مذہبی دوست جناب حکیم سید محمود صاحب گیلانی ہیں۔ حکیم صاحب کے مضامین اور نظموں سے یہ ثابت ہے کہ آپ ماشاء اللہ بڑے موحد ہیں اور نہایت پختہ عقیدہ رکھتے ہیں اور کتاب وسنت پر اُن کے مذہب کا دارومدار ہے مگر بایں ہمہ انہوں نے حرام ادویہ سے علاج کرنے کو روا قرار دیا ہے جس کی ظاہر وجہ یہ ہے کہ حضرت محمود صاحب گیلانی حکیم ہیں اور حکما کا یہ تعامل ہے کہ اکثر وہ حرام چیزوں کو اور دوائیوں سے علاج کرتے ہیں اور انہوں نے یہ اصول قائم کر رکھا ہے کہ "الضرورات مبیح المحظورات" "یعنی ضرورت ناجائز چیزوں کو مباح کر دیتی ہے۔"

سو واضح ہو کہ اول تو اس مسئلہ کو مذاکرہ کے باب میں لانا علمی شان کے خلاف ہے کیونکہ حرام چیزوں سے علاج کرنا بالاتفاق حرام ہے اور علماء اہل حق اس پر متفق ہیں کیونکہ اس بارہ میں صاف نصوص شرعیہ وارد ہیں جو اس کی ممانعت اور حرمت پر دال ہیں۔ مذاکرہ ہمیشہ ان مسائل میں ہوا کرتا ہے جو مختلف فیہ ہوں اور دلائل ان کے متعلق متعارض وارد ہوئے ہوں اور وہ مسائل معرکتہ الآراء بن رہے ہوں جن میں ترجیح راجح کی ضرورت ہو۔ دوم ہم اہل حدیث ہیں اور علماء اہل حدیث تداوی بالحرام کو حرام جانتے ہیں' کما لا یخفی علی اھل العلم۔ لیکن جناب حکیم ممدوح نے حکیم ہونے کی حیثیت سے اس مسئلہ پر بحث کر کے اس کو پیچیدہ بنا دیا ہے۔ لہذا بندہ اپنی تحقیق جناب حکیم صاحب کی خدمت عالیہ میں پیش کرتا ہے۔ وہ اس پر حکیمانہ حیثیت کو چھوڑ کر شرعی حیثیت سے غور فرما کر انصاف کریں کہ آپ کا خیال کہاں تک درست ہے یا وہ بالکل غلط ہے۔

بس ہو رہے گا عشق وہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج یار امتحان پر

علاج اور دوا واجب نہیں: (ا) پہلی دلیل : مسلم شریف میں باب استحباب الرقیہ اور باب استحباب التداوی منعقد ہے اور منتقی الاخبار بمع نیل الاوطار جلد۔۸' ص۔۲۰۰ میں باب اباحۃ التداوی وترکہ منعقد ہے جن کا مطلب یہ ہے کہ تداوی اور علاج بالرقیہ مباح اور مستحب ہے' واجب نہیں ہے۔ حدیث لکل داء دواء پر امام نووی فرماتے ہیں : وفی ھذا الحدیث اشارۃ الی استحباب الرواء وھو مذھب اصحابنا وجمھور السلف وعامۃ الخلف "یعنی اس حدیث کے اشارۃ النص سے یہ ظاہر ہے کہ دوا کرنا کرانا مستحب

ہے اور جمہور سلف وخلف کا یہی مذہب ہے۔"

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ علاج بلدوا کا ترک جائز ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے ستر ہزار افراد بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے اور وہ وہی لوگ ہوں گے جو نہ دم جھاڑ کراتے ہیں اور نہ شگون لیتے ہیں اور نہ داغ لگاتے ہیں اور وہ صرف اپنے رب پر توکل رکھتے ہیں۔

دوسری حدیث میں یوں آیا ہے کہ ایک عورت کو مرگی آتی تھی اور وہ حکیم مدینہ کے شفاخانہ میں آئی اور اس نے درخواست کی کہ انی اصرع وانی اتکشف فادع اللّٰہ لی "یعنی مجھے مرگی آتی ہے اور میں تڑپ تڑپ کر بے پردہ ہو جاتی ہوں' آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے شفا دے۔" تب حکیم روحانی وجسمانی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان شئت صبرت ولک الجنة وان شئت دعوت اللّٰہ ان یعافیک فقالت اصبر "یعنی اگر چاہے تو صبر کرے تب تیرے لیے جنت ہے اور اگر تو چاہے کہ میں اللہ سے دعا کروں اور وہ تجھے شفا بخشے تو یہ کر لے۔ اس نے کہا کہ مجھے جنت منظور ہے میں اس بیماری کو صبر سے برداشت کروں گی۔" لیکن آپ یہ دعا کریں کہ میں مرگی کے دورہ کے وقت بے پردہ اور برہنہ نہ ہو جاؤں۔ فدعا لھا "تب آپ نے اس کے لیے دعا فرمائی۔" (اس کے بعد وہ برہنہ نہ ہوتی اور بیہوش ہو کر پڑی رہتی) (متفق علیہ)

ان دونوں احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ تداوی وعلاج والدعا فرض اور واجب نہیں ہے' صبر کرنا اور راضی برضا الٰہی رہنا اور اس پر توکل رکھنا افضل ہے' اس سے گناہ دور ہوتے ہیں اور درجات بڑھتے ہیں اور جنت ملتی ہے اور بلا حساب بخشش میسر ہوتی ہے۔

نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ وفیہ ان الصبر علی بلایا الدنیا یورث الجنة وان الاخذ بالشدة افضل من الاخذ بالرخصة لمن علم من نفسه الطاعة ولم یضعف عن التزام الشدة "یعنی مصائب دنیا پر صبر کرنا موجب جنت ہے اور رخصت سے سختی قبول کر لینا افضل ہے۔ جبکہ اس کو برداشت کرنے کی طاقت ہو اور التزام شدت سے وہ بالکل کمزور نہ ہو۔"

پھر لکھتے ہیں : وفیه دلیل علی جواز ترک التداوی وان التداوی بالدعاء مع الالتجاء الی اللّٰہ انجع وانفع من العلاج بالعقاقیر "یعنی اس حدیث میں اس مسئلہ پر دلیل ہے کہ علاج کرانا چھوڑ دے تو یہ جائز ہے اور دعاء سے دوا کرانا جس میں خاص اللہ تعالیٰ کی طرف

التجا ہوتی ہے جڑی بوٹیوں سے علاج کرانے سے زیادہ مفید اور نافع ہے۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بروئے دلائل شرعیہ تداوی اور علاج کرانا مباح یا مستحب ہے' فرض واجب نہیں ہے۔ جب یہ ثابت ہوا تو اب یہ جان لیں کہ حرام کے استعمال سے بچنا واجب ہے جس پر تمام علماء اسلام کا اجماع ہے اور یہ کتاب وسنت سے ثابت شدہ مسئلہ ہے جس کے دلائل صاف روشن ہیں جن کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تداوی بالدواء مباح اور حرام سے اجتناب واجب ہوا تو واجب کے مقابلہ میں مباح اور مستحب کو ترک کیا جائے گا' لہٰذا تداوی بالحرام سے بچنا واجب ہے۔

(۲) دوسری دلیل : یہ ہے کہ دوائیں دو قسم ہیں۔ ایک جسمیہ' جو ادویہ مفردہ اور مرکبہ ہیں۔ دوم روحانیہ' جو آیات قرآنیہ وادعیہ' حدیثیہ ہیں۔ آنحضرت ﷺ ان کے ساتھ علاج کرتے رہے اور دونوں سے علاج کرنے کی رخصت فرما گئے لیکن آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی حرام دوا سے علاج نہیں کیا تھا' لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوة حسنة۔

(۳) تیسری دلیل : یہ ہے کہ اکثر ڈاکٹر اور حکماء دنیادار شراب اور منشی اشیاء سے علاج کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی ایسا ہی طبیب لوگ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک طبیب آیا اور اس نے آنحضور ﷺ سید الحکماء سے سوال کیا کہ شراب کے متعلق کیا حکم ہے؟ کہ انما اصنعھا للدواء "میں اس کو دوا کے لیے تیار کرتا ہوں" آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ انہ لیس بدواء ولکنہ داء "یعنی یہ دوا نہیں ہے بلکہ بیماری ہے۔"

اب غور کریں کہ جناب حکیم محمود صاحب کے برادران ڈاکٹر اور حکما کا تعامل یہ ہے کہ شراب بہت سی امراض کے لیے دوا ہے اور وہ اس سے علاج کرتے ہیں لیکن سید الحکماء ﷺ کا حکم ناطق یہ ہے کہ یہ دوا نہیں ہے بلکہ بیماری ہے۔ اس لیے صاحب سفر السعادۃ نے یہ لکھا ہے کہ طبیبوں کی طبابت طب نبوی کے ساتھ نسبت نہیں رکھتی کیونکہ طب وحی الٰہی پر مبنی ہے بحکم وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحٰی جو قلب نبوت اور کمال عقل سے صادر ہوئی ہے اور طب طبیبوں کے ظن اور تجربہ سے نکلی گئی ہے جس میں ظن اور گمان خطا کا ہے' لہٰذا ڈاکٹروں اور طبیبوں کا تعامل سید الحکماء کے مقابلہ میں متروک ہے۔

(۴) چوتھی دلیل : تداوی بالحرام کے حرام ہونے پر یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تداووا ولا تتداووا بحرام (ابوداؤد) "یعنی تم بیماریوں کا علاج کرو لیکن حرام چیزوں سے علاج

نہ کرو۔"

اور منشی (نشے والی) چیزوں کے بارہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان اللّٰہ لم یجعل شفاء کم فیما حرم علیکم (ذکرہ البخاری) "یعنی جو چیزیں تم پر حرام کی گئی ہیں اُن میں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے شفا نہیں رکھی۔" اب جناب حکیم صاحب یہ بتلائیں کہ آپ نے جن حرام چیزوں کا شمار کر کے ان سے علاج کرنا معمول بہا بتلایا ہے اس کو مانا جائے یا اس حکمی مرفوع حدیث کو مانا جائے کہ حرام میں تو شفا نہیں ہے۔ اگر آپ کہیں کہ تجربہ سے حرام دوائیوں سے شفا ظاہر ہوتی ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ حدیث سچی ہے اور تجربہ جھوٹا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا کہ میرے بھائی کو مرض اسہال ہے' اس کا پیٹ چلتا ہے۔ سید الاطباء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو شہد پلا دو۔ اس نے شہد پلا دیا تو اس سے اسہال بڑھ گئے۔ تب وہ شخص آیا اور اس نے مرض بڑھ جانے کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا پھر شہد پلاؤ۔ اس نے پلایا تو مرض اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس نے پھر شکایت کی تو آپ نے فرمایا شہد پلاؤ۔ جب اس نے شہد پلایا تو مرض پھر زیادہ ہو گیا۔ پھر اس نے شکایت کی تو آپ نے فرمایا کہ صدق اللّٰہ وکذب بطن اخیک "یعنی اللہ تعالیٰ نے جو (قرآن میں) فرمایا ہے (کہ شہد میں شفا ہے) وہ فرمان سچا ہے اور تیرے بھائی کا (جو) پیٹ (چل رہا ہے وہ) جھوٹا ہے۔" (مشکوٰۃ)

ٹھیک اسی طرح حدیث سچی ہے کہ حرام میں شفا نہیں ہے یعنی اس شفاء کا اعتبار نہیں ہے جو حرام کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے۔ جیسے ایک لذت منکوحہ عورت سے جماع کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور اس سے اولاد بھی پیدا ہوتی ہے اور دوسری لذت غیر عورت سے جماع کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور اس سے اولاد بھی پیدا ہوتی ہے لیکن یہ حرام ہے جس کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور یہ ایسی لذت ہے جو جہنم رسید کر دے گی۔ اسی طرح تداوی بالحرام بھی وہ بیماری ہے جو جہنم رسید کر دے گی۔

بہرحال حرام چیزوں سے دوا کرنا کرانا حرام ہے۔ نیل الاوطار میں ہے : ای لا یجوز التداوی بما حرمه اللّٰہ من النجاسات وغیرھا مما حرمه اللّٰہ ولو لم یکن نجسًا "یعنی حرام چیزوں سے علاج کرنا جائز نہیں ہے' خواہ وہ پلید ہوں یا نہ جبکہ اللہ نے ان کو حرام کر دیا

ہے۔" اگر آج کوئی حکیم دم مسفوح سے علاج جائز کہتا ہے تو کل خنزیر کے گوشت سے بھی جائز کہہ دے گا پس سب حرام چیزیں حلال کر لیں گے۔

(۵) پانچویں دلیل : یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الدواء الخبیث "یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبیث دوا کے استعمال سے منع فرما دیا ہے۔" (رواہ احمد وابوداؤد' ابن ماجہ' ترمذی)

ہر حرام چیز خبیث ہے جو یحرم علیھم الخبائث سے ظاہر ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طیبات کی تحلیل اور خبیثات کی تحریم فرماتے تھے۔ یہ آپ کی صفت قرآن میں ہے' ہر خبیث چیز حرام ہے اور خبیث سے علاج کی ممانعت ہے لہٰذا ہر حرام چیز سے علاج کرنے کی ممانعت ہے' خواہ بظاہر شفا ہو لیکن حکم شارع کا مقدم ہے ہم کو ایسی شفا کی ضرورت نہیں ہے۔

(۶) چھٹی دلیل : ایک طبیب نے دربار رسالت میں پیش ہو کر سوال کیا کہ مینڈک کو دوا میں ڈالنا درست ہے یا نہیں؟ فنھاہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن قتلھا "یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مینڈک کے مارنے سے منع فرمایا۔" جس کی ظاہر وجہ یہ ہے کہ مینڈک حرام ہے اور حرام سے علاج جائز نہیں ہے۔ اگر حلال ہوتا تو آپ منع قتل سے نہ کرتے کیونکہ حلال میں منفعت ہے۔

(۷) ساتویں دلیل : یہ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکیہ دم جھاڑے سے علاج کرنے سے منع فرمایا کیونکہ یہ حرام تھا' پس تداوی بالحرام حرام ہے۔

(۸) آٹھویں دلیل : یہ ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی زینب کی گردن میں ایک دھاگہ دیکھا تو کہا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ دھاگہ ہے جس پر منتر پڑھا گیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس دھاگہ کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کہا کہ آل عبداللہ شرک سے بے پرواہ ہیں' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ منتر اور منکے اور ٹوٹکے شرک ہیں۔ زینب نے کہا کہ میں نے کہا کہ آپ یہ بات کس طرح کہتے ہیں کہ میری آنکھ میں سخت تکلیف تھی' نکلی پڑتی اور میری آمدورفت فلاں یہودی کی طرف تھی۔ جب اس نے منتر پڑھ کر دم کیا تو آرام ہو گیا۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آنکھ کا دکھنا اور منتر سے اچھا ہونا یہ شیطانی اثر ہے۔ شیطان اپنے ہاتھ سے آنکھوں کو چوکتا ہے اور جب منتر پڑھا جاتا ہے

تو وہ رک جاتا ہے۔ تم کو یہ کافی ہے کہ دعا اذھب الباس رب الناس الخ پڑھ لیا کرو۔

اس سے ثابت ہوا کہ اگرچہ حرام سے بظاہر فائدہ ہو تب بھی اس سے علاج حرام ہے۔ چونکہ حکیم صاحب رمضان میں آٹھ تراویح پڑھتے رہے ہیں' اس لیے ان کو آٹھ دلائل بطور ہدیہ پیش ہیں۔ اللہ کے لیے ان کو قبول کر کے حرام سے علاج کرنے سے باز آجائیں اور طب ظنی کو چھوڑ کر طب نبوی کی ہدایات قبول فرمائیں کہ انہی میں ہدایت ہے' باقی آپ کے دلائل محض قیاسات اور آراء ہیں جو نصوص شرعیہ کے مقابلہ میں مردود ہیں۔

اگر بندہ ان پر بالتفصیل بحث کرے تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا جس کو مدیر اخبار شائع نہ کریں گے۔ مختصر عرض یہ ہے کہ کستوری کو آپ نے حرام میں شمار کیا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ آپ بخاری شریف ملاحظہ کریں' یہ حلال ہے۔ اس کو دم مسفوح خرگوش پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے اور باقی حکماء اور طلبا اور علماء کا تعامل خلاف تعامل نبوی و صحابہ کے معتبر نہیں ہے۔ فرقہ ناجیہ وہی ہے جو ما انا علیہ واصحابی کا مصداق ہے۔

یہ آپ کی دلیل اہل بدعت کی اس دلیل کی مثل بلکہ عین ہے کہ وہ بدعات پیدا کر کے اس کو معمول بہا بنا لیتے ہیں اور پھر یہ دلیل ان کے جواز پر پیش کرتے ہیں کہ ما راہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسنا "یعنی جس چیز کو مسلمان اچھی خیال کریں وہ اچھی ہے۔" یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے' حدیث نبوی نہیں ہے۔ اس سے کئی وجوہ سے استدلال صحیح نہیں ہے۔

اول یہ کہ یہ قول ہے اور قول حجت شرعی نہیں ہے۔ دوم خود عبداللہ رضی اللہ عنہ کا عمل ان کے قول کے خلاف ہے کہ آپ نے ایک قوم کو جو حلقہ باندھ کر تسبیح و تہلیل و تکبیر پڑھ رہی تھی اور یہ کہتی تھی کہ ما اردنا الا الخیر "یعنی ہم اس کو اچھا سمجھ کر کر رہے ہیں۔" ان کو اس سے منع کیا اور یہ کہا کہ کم من مرید للخیر لن یصیبہ "یعنی کتنے ہی نیکی کا ارادہ کر کے کوئی کام کرتے ہیں لیکن وہ نیکی کو نہیں پہنچتے۔" سوم المسلمون سے مراد صحابہ کرام ہیں کہ وہ بالاجماع جس کام کو کریں وہ نیک ہے کیونکہ اس حدیث موقوف میں پہلے صحابہ کا ذکر ہے۔ چہارم اگر صحابہ مراد نہ ہوں تو تمام اہل اسلام مراد ہوں گے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان بالاجماع جس کام کو اچھا سمجھ کر کریں وہ اچھا ہے تو اجماع حجت ہو گا۔ پس نہ بدعات مروجہ پر اجماع اہل حق ہے اور نہ تداوی بالحرام کے جواز پر لہٰذا استدلال باطل ہوا۔

نیز بعض علماء اونٹ کے بول سے علاج کرنے سے استدلال کرتے ہیں جو بحکم نبوی عہد نبوی میں ہوا۔ سو یہ استدلال بھی بیکار ہے کیونکہ اونٹ حیوان ماکول اللحم ہے اور ماکول اللحم کا پیشاب حرام نہیں ہے جس کی تفصیل شروح کتب حدیث میں ہے۔

(نوٹ) دیگر علماء کبار اس پر کچھ لکھتے تو اچھا تھا لیکن انتظاری کے بعد میں نے اپنی تحقیق پیش کر دی کیونکہ ؎

بلائیں زلف جاناں کی اگر لیں گے تو ہم لیں گے

والسلام

عبدالقادر عارف حصاری

ہفت روزہ اہل حدیث سوہدرہ

جلد۔۹' شمارہ۔۲۴'۲۵۔ مورخہ ۲۴ جون و یکم جولائی سنہ۔۱۹۵۷ء

چنگی کی ملازمت اور میونسپل کمیٹی کی ممبری کی بابت سوالات

سوال محترم مولانا عبدالستار صاحب! السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ بندہ کو مندرجہ ذیل مسئلہ درپیش ہے' اس لیے آپ کی خدمت میں تحریر کر رہا ہوں۔ مہربانی فرما کر اپنی پہلی فرصت میں جواب تحریر فرما کر مشکور فرمائیں۔ براہ کرم واضح الفاظ میں اور جہاں تک ہو سکے تشریح کے ساتھ تحریر فرمائیں تاکہ سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو' مسئلہ مندرجہ ذیل ہے:

(۱) محکمہ محصول چونگی میں ملازمت کرنی جائز ہے یا کہ نہیں یعنی کہ محرر چونگی' چپڑاسی چونگی' انسپکٹر چونگی اور سپرنٹنڈنٹ چونگی وغیرہ کی ملازمت اور روزی حلال ہے یا کہ حرام؟ کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مشکوۃ شریف میں محصول چونگی والے کی بخشش نہ ہونے کے متعلق تحریر ہے۔ تشریح کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

(۲) کیونکہ محکمہ محصول چونگی کا تعلق میونسپل کمیٹی سے ہوتا ہے' اس لیے میونسپل کمیٹی میں سیکرٹری یا کلرک یا چپڑاسی وغیرہ یا میونسپل کمیٹی کی کوئی اور ملازمت کرنی چاہیے یا کہ نہیں' شریعت کے مطابق کیا حکم ہے؟ ایسی روزی حلال ہو گی یا کہ حرام؟

(۳) میونسپل کمیٹی کے امور میں کسی قسم کا حصہ لینے کے متعلق کیا حکم ہے یعنی کہ

میونسپل کمشنر یا پریزیڈنٹ وغیرہ ہونا چاہیے یا کہ نہیں؟

عبدالعزیز سپروائزر گوٹھ ملاں اسماعیل' کلی موری حیدر آباد

جواب (۱) محصول چونگی لینا دینا حکومت کا قانون ہے۔ شرع میں اس کا حکم ثابت نہیں ہے۔ محصول چونگی میں ظلم ہوتا ہے' اس لیے اس کی ملازمت سے بچنا واجب ہے۔ کوئی نوکری جس میں گناہ کرنا پڑے' کرنی حرام ہے۔ (۲) میونسپل کمیٹی کا ممبر' رکن اور پریزیڈنٹ بننا جائز ہے مگر جائز کام کرے ناجائز نہ کرے۔ ہاں اگر ناجائز کام کرنا پڑے تو پھر جائز نہیں ہے۔

کتبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری۔

الجواب صحیح ابو محمد عبدالستار دہلوی

فتاویٰ ستاریہ' جلد چہارم' ص۔۱۶۵

ایک تعاقب --- فقہ حدیث

اخبار الاعتصام مطبوعہ ۲۷/ نومبر سنہ۔ ۱۹۵۳ء ص۔۶' کالم۔۱ میں دو سوالوں کے جواب میں دو فتوے شائع ہوئے ہیں جو قابل تنقید واصلاح ہیں۔ یہ فتویٰ جناب محترم المقام مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور مدظلہ العالی کے قلم سے صادر ہو کر شائع ہوئے ہیں جن کی علمی قابلیت اور خلوص کا اس خادم العلماء کو اعتراف ہے لیکن خطا ہو جانا کوئی محل تعجب نہیں ہے۔ کیونکہ بڑے بڑوں سے خطا صادر ہو گئی ہے۔

بہرکیف آپ کے دونوں فتوے محل کلام ہیں۔ پہلے فتویٰ پر گفتگو تو کسی دوسرے موقعہ پر دیکھا جائے گا لیکن دوسرے کے متعلق معروضات مختصر ہیں وہ ارسال خدمت ہے۔ سائل کا سوال یہ تھا کہ "گیہوں فروش کہتا ہے کہ گندم آج لے لو اور رقم ہمیں پوہ کی بیس تاریخ کو اس حساب سے جو بازار کا بھاؤ ہو گا وصول کروں گا۔ کیا ایسی تجارت جائز ہے یا نہیں؟"

اس کے جواب میں مولانا موصوف ارشاد فرماتے ہیں: "اس صورت کے عدم جواز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ متعینہ تاریخ میں دونوں نفع ونقصان کا امکان ہے۔ بائع کا منافع یقینی نہیں ہے اور ایسی بیع جائز ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ فتویٰ غلط ہے۔ بلکہ پہلے فتوے کے بھی خلاف ہے۔ تفصیل اس کی

یہ ہے کہ اس بیع میں گندم کی قیمت مجہول ہے اور جب عقد میں قیمت مجہول ہو تو وہ بیع فاسد ہوتی ہے۔ چنانچہ جس حدیث میں ایک بیع میں دو بیع کرنے کی مخالفت وارد ہے' اس کی ایک صورت ترمذی وغیرہ میں یہ مذکور ہے کہ "ایک شخص کہے کہ میں نقد یہ چیز اتنے کو بیچتا ہوں اور ادھار اتنے کو۔" تو اس میں علت تحریم عدم استقرار ثمن ہے۔

چنانچہ فتاویٰ نذیریہ جلد۔۲' ص۔۲۵ میں ہے کہ "چہ جہالت ثمن دریں یافتہ مے شود۔"

نیل الاوطار جلد۔۵' ص۔۱۵۳ میں ہے : والعلة فی تحریم بیعتین فی بیعة عدم استقرار الثمن فی صورة بیع الشئی الواحد بثمنین "یعنی ایک بیع میں دو بیعوں کے حرام ہونے کی علت عدم استقرار قیمت ہے کہ ایک شے کی بیع دو قیمتوں سے کی گئی ہے۔" جناب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح مسوی ص۔۳۴۳ میں ذکر فرمایا ہے : فھو فاسد عند اکثر اھل العلم فاذا باعه علی احد الامرین فی المجلس فھو صحیح لا خلاف فیه "یعنی جب ایک عقد میں دو بیعوں کا ذکر کرے تو اکثر علماء کے نزدیک یہ بیع فاسد ہے اور اگر صرف ایک (نقد یا ادھار) پر قطع کر کے کہے تو بلا اختلاف جائز ہے۔"

ترمذی میں بھی ہے کہ فاذا فارقه علی احدھما فلا باس اذا کانت العقدة علی احد منھما۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدم استقرار وجہالت ثمن موجب فساد بیع ہے۔ دوم یہ کہ اس میں "غرر" ہے۔ چنانچہ بلوغ المرام وغیرہ میں مسلم کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے "غرر" سے (یعنی دھوکہ کی بیع سے) منع فرمایا ہے۔ غرر کی بہت سی صورتیں ہیں جو سب ناجائز ہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بیع غرر سے جو نہی وارد ہے یہ اصول بیوع میں سے اصل عظیم ہے جس میں اس قدر مسائل داخل ہیں کہ جن کا شمار نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جس قدر بیوع ممنوعہ اور محرمہ ہیں' ان میں اکثر ایسی ہیں جن میں غرر ہے اور اس کی وجہ سے وہ بیوع منع کی گئی ہیں مثلاً بیع ملامسہ' منابذہ' حبل الحبلہ' بیع حاضر لباد' بیع صبرہ' بیع ثمار قبل از اصلاح وغیرہ۔ اسی میں وہ بیع داخل ہے جو بلا تقرر قیمت کی جائے۔

چنانچہ محلّٰی جلد۔۹' ص۔۲۳ میں مسئلہ نمبر۔۱۵۳ کے تحت لکھا ہے : ولا یصح البیع بغیر ثمن مسمی کمن باع بما یبلغ فی السوق او بما اشتری فلان او بالقیمة فھذا کله باطل لانه بیع غرر واکل مال بالباطل لانه لم یصح فیه التراضی ولا یکون

التراضی الا بمعلوم المقدار وقد یرضی لانہ یبلغ ثمناھا فان بلغ اکثر لم یرضی المشتری وان ہلبغ اقل لم یرض البائع۔ "یعنی قیمت مقرر کئے بغیر بیع کرنا صحیح نہیں ہے۔ جیسے کہے کہ جو قیمت بازار پہنچنے پر معلوم ہو' اسی کے ساتھ بیع ہے یا کہے کہ جس قیمت سے فلاں شخص خریدے' اس کے ساتھ بیع ہے۔ یہ سب باطل ہے' کیونکہ اس میں "غرر" ہے اور یہ ناجائز طریقے سے مال کھانے کی صورت ہے کیونکہ اس میں تراضی نہیں ہے۔ تراضی قیمت مقرر ہونے پر ہوا کرتی ہے اور عقد کے وقت اس گمان سے تراضی ہو گئی کہ شاید مناسب قیمت ہو گی جب پہنچے گا۔ تو اب اگر قیمت حد سے زیادہ ہو گئی تو مشتری ناخوش ہو گا اور اگر بہت کم ہوئی تو بائع ناراض رہے۔"

بہرحال تراضی ایک نہ ایک طرف سے مفقود ہو گی۔ علاوہ ازیں ایسی بیع شرعاً ثابت نہیں ہے' لہٰذا ناجائز ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری منٹگمری (ساہیوال)

الاعتصام جلد ۵' شمارہ ۱۹' مورخہ ۱۸/ دسمبر سنہ ۱۹۵۳ء

مسئلہ سود پر ایک تحقیقی بحث

آج کل پاک و ہند میں سودی کاروبار کا سلسلہ عام طور پر جاری ہے اور وہ معاشی نظام جو اسلام نے قائم کیا تھا وہ بالکل درہم برہم ہو رہا ہے اور اس کے اصول واحکام دلوں سے محو ہوتے جا رہے ہیں اور ہمارے گرد وپیش کی دنیا پر سود کی وباء پوری طرح محیط ہے۔ نہ صرف عملاً بلکہ مدعیان اسلام کے دل ودماغ پر عقیدہ کی صورت میں بھی چھا گئی ہے اور وہ اس کو جائز تصور کر رہے ہیں اور جو اس کو ناجائز سمجھتے ہیں وہ بھی اس میں نامساعد حالات میں مجبور ہو کر یا اتباع ہوئی اور ناجائز طمع سے اختیاری طور پر مبتلا ہو گئے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ پیشگوئی صحیح ثابت ہو گئی ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ لوگوں پر ایک ایسا دَور آئے گا : لا یبقی احد الا آکل الربو فان لم یاکلہ اصابہ من غبارہ "یعنی اس وقت سود کھانے والے کے سوا کوئی باقی نہ رہ جائے گا اگر نہ کھائے گا تو سود کا اثر اس کو ضرور پہنچ جائے گا۔"

سو آج یہی دَور ہے کہ کوئی سود دینے والا ہے' کوئی لینے والا ہے' کوئی دلانے والا ہے' کوئی

گواہ ہے، کوئی تمسک لکھنے والا ہے، کوئی وکیل ہے، کوئی اس کا فتویٰ دینے والا ہے، کوئی اس کا محاکم بن کر فیصلہ کرنے والا ہے، کوئی اس کے گھر کی ضیافت کھانے والا ہے، کوئی اس سود خور سے معاملہ کرنے والا ہے۔

الغرض سود کا غبار سب کو پہنچ رہا ہے اور اس سے بچنے کی صورت بہت دشوار ہے کیونکہ کہیں یہ "بنک" کی صورت میں نمودار ہے، کہیں "انشورنس" کمپنی کی عمیق غار ہے، کہیں عام "لین دین" اور "خرید و فروخت" میں اس کا غبار ہے۔ نظام معیشت کا کوئی شعبہ اس کے بخار سے بچا ہوا نہیں ہے حتیٰ کہ اسلامی نظام معیشت پر سرمایہ داری کا نظم معیشت ایسا غالب نظر آرہا ہے کہ اس پیشگوئی نبوی کا پورا ظہور ہے:

یأتی علی الناس زمان لا یبالی المرء ما اخذ منہ امن الحلال ام من الحرام "یعنی لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ کوئی آدمی معاملات میں اور لینے دینے میں یہ پرواہ نہیں کرے گا آیا یہ مال حلال سے لیا ہے یا حرام سے لیا ہے یعنی حلال حرام کی کوئی تمیز باقی نہ رہے گی۔"

چنانچہ یہ دَور یہی ہے کہ آج سود سرمایہ داری کی جان اور اس کی روح رواں ہے۔ اس کے بغیر سرمایہ داری کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا اور کسی ایسے نظام معاشی کا سود سے خالی ہونا غیر ممکن ہے۔ پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ سودی کاروبار کا اعلانیہ سلسلہ رکھنے والے علمی اور عملی حیثیت سے اسلام کے پیرو بھی ہیں کہ نفس سود کو تو زبان سے حرام کہتے ہیں مگر نظام سرمایہ داری میں اس کے جتنے مسمی پائے جاتے ہیں، ان سب کو حلال جانتے ہیں؎

کعبہ کا حج بھی کیا گنگا کا اشنان بھی
خوش رہے شیطان بھی راضی رہے رحمان بھی

یہ ان لوگوں کا مذہبی تخیل ہے۔

<u>سود کی تعریف</u>: راقم السطور اول ربوا محرم یعنی سود کی تعریف عرض کرتا ہے پھر اس کا حکم اور جو اس پر وعید شرعی وارد ہے، عرض کرے گا اور پھر سرمایہ داری کی جن شاخوں پر یہ پھیل رہا ہے ان کو عرض کرے گا۔ ان ارید الا الاصلاح وما توفیقی الا باللہ۔

واضح ہو کہ کتاب و سنت میں سود کے لیے لفظ "ربوا" استعمال کیا گیا ہے جس کا معنی "بڑھوتری" اور "زیادت" ہے اور اصطلاح شرع میں سود اس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک

اندازہ مقرر یا بلا تقرر کچھ زائد لینے کی شرط کرے کہ وہ عوض مالی سے خالی ہو یا قرض کے لحاظ میں کچھ نفع حاصل کرے۔ پس یہ "ربوا" بیع نقد اور قرض میں قطعاً حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ منکر اس حرمت کا اور مستحل کافر خارج از اسلام ہے اور مرتکب اس گناہ کا گنہگار وعاصی ہے جس کو فاسق کہتے ہیں۔

سود پر وعید: اس کی حرمت پر تمام امت اسلامیہ کا اجماع ہے اور کتاب وسنت میں اس سے بچنے کی بڑی تاکید ہے اور مرتکب کے حق میں نہایت سخت وعید آئی ہے۔ چنانچہ چند دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) سود خور مومن ہے تو سود چھوڑ دے: اہل ایمان کو خطاب ہے کہ اتقوا اللّٰہ وذروا ما بقی من الربٰو ان کنتم مؤمنین "یعنی اللہ سے ڈرو اور جو سود تمہارا لوگوں پر باقی ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم ایمان رکھتے ہو۔" پس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ سود اللہ تعالیٰ سے ڈر کر چھوڑ دیا جائے جو نہ چھوڑے اور اس پر اصرار کرے تو وہ مومن نہیں۔

(۲) اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ: فان لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللّٰہ ورسولہ "یعنی اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ قبول کرو۔" اس فرمان الٰہی میں اتنی سخت وعید ہے کہ اتنی کسی دوسرے گناہ پر وارد نہیں ہوئی کہ سود خور اللہ تعالیٰ سے جنگ قبول کر رہے ہیں اور اس کے رسول کے ساتھ بھی لڑائی لڑ رہے ہیں حالانکہ اللہ اور رسول سے جنگ کرنا کفر ہے۔

اس کی تفسیر اس واقعہ سے خوب ظاہر ہے کہ آنحضور ﷺ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا، اس میں واضح الفاظ میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ اگر تم سودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ کالعدم ہو جائے گا اور ہم کو تم سے جنگ کرنی پڑے گی۔

علاوہ اس کے دوسرا واقعہ یہ ہے کہ بنو مغیرہ عرب میں بڑے مشہور سود خور تھے۔ فتح مکہ کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کی تمام سودی رقمیں باطل کر دیں اور عامل مکہ کو یہ حکم لکھا کہ اگر وہ باز نہ آئیں تو ان سے جنگ کرو۔

اس سے یہ قانون ظاہر ہوا کہ اگر اسلامی حکومت ہو تو سود کو حکماً روک دیا جائے۔ جو قوم باغی ہو کر اس حکم کی نافرمانی کرے اور سود کا کاروبار کرے، اس کے ساتھ حکومت جنگ کا اعلان کر دے۔ یہ اللہ اور رسول سے جنگ کی تشریح ہے۔

خود آنحضور ﷺ نے اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ کی بابت حجتہ الوداع میں یہ اعلاج فرمایا کہ جاہلیت کے تمام سود ساقط کئے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں خود اپنے چچا عباس کا سود ساقط کرتا ہوں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا تجارتی کاروبار میں سود کا بڑا وسیع معاملہ تھا اور آپ ایک بڑے مہاجن سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں کی اصلاح فرمائی تاکہ تمام قوم کے لیے نمونہ قائم ہو جائے۔

(۴) <u>زمانہ جاہلیت کا سود</u>: اہل ایمان کو یہ خطاب ہوا کہ لا تاکلوا الربٰو اضعافا مضاعفة واتقوا اللّٰہ لعلکم تفلحون "یعنی سود کو دگنا کر کے نہ کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور اس کے عذابوں سے ڈرتے رہو تب فلاح ہو گی۔"

اس آیت میں بھی اہل ایمان کی فلاح کا دارومدار سود کے (اللہ کے خوف سے) نہ کھانے پر رکھا گیا ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں' جاہلیت کا سود یہ تھا کہ ایک شخص دوسرے کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا اور ادائیگی قیمت کے لیے ایک وقت مقررہ تک مہلت دیتا۔ اگر وہ مدت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو پھر وہ مزید مہلت دے دیا کرتا اور رقم میں کچھ اضافہ کر دیتا تھا۔

امام مجاہد کہتے ہیں جاہلیت کا ربوا یہ تھا کہ ایک شخص کسی سے قرض لیتا اور کہتا کہ اگر تو مجھے اتنی مہلت دے تو میں اتنا زیادہ دوں گا۔ (ابن جریر جلد۔ ۴' ص۔ ۶۲)

ابوبکر جصاص نے بیان کیا کہ اہل جاہلیت جب ایک دوسرے سے قرض لیتے تو باہم یہ طے کر لیتے کہ اتنی مدت تک اتنی رقم اصل راس المال سے زیادہ ادا کی جائے گی۔ (احکام القرآن)

امام رازی نے اہل جاہلیت کا یہ دستور بتایا کہ وہ ایک شخص کو ایک مقررہ مدت کے لیے روپیہ قرض دیتے اور اس سے ماہوار ایک مقررہ رقم سود کے طور پر وصول کرتے رہتے۔ جب وہ مدت ختم ہو جاتی تو مقروض سے اصل روپیہ کا مطالبہ کیا جاتا۔ اگر وہ ادا نہ کر سکتا تو پھر اس کو ایک مدت کے لیے مہلت دی جاتی اور سود میں اضافہ کر دیا جاتا۔ (تفسیر کبیر)

زمانہ کفر کی یہ صورتیں ملک میں رائج تھیں۔ اس غالب رواج کی رُو سے اضعاف مضاعفہ دگنا دگنا سود حرام کیا گیا لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ دگنا سود ہو تو تب ہی

حرام ہے' اس سے کم ہو تو حرام نہیں۔ یہ قید بطور اغلب رواج کے ہے جیسا کہ قرآن میں یہ وارد ہے : ولا تقتلوا اولادکم خشية املاق "کہ اپنی اولاد کو تنگ دستی اور افلاس کے خوف سے قتل نہ کرو۔" یہ قید غالب رواج کی رُو سے ہے ورنہ اولاد کا قتل ہر حال میں جرم ہے۔

(۴) سود خوروں کا حشر: قرآن میں ہے : الذین یاکلون الربا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطه الشیطان من المس "یعنی جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ اپنی قبروں سے نہیں کھڑے ہوں گے مگر اس طرح جس طرح کہ کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جو آسیب زدہ ہے۔"

یعنی سود خور باؤلے اور مصروع شخص کی طرح اپنی قبروں سے کھڑے ہوں گے اور اس طرح گرتے پڑتے محشر کو چلیں گے۔

حضرت قتادہ تابعی رحمۃ اللہ علیہ امام جلیل فی التفسیر نے فرمایا کہ قبروں سے مجنون ہو کر اٹھیں گے اور گرتے جائیں گے جس سے اہل موقف پہچان لیں گے کہ یہ سود خور ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ بعض سود خوروں کو جنون' صرع وغیرہ میں مبتلا کر دیتا ہے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔

(۵) بیاج (سود) مطلقاً حرام ہے: ذالک بانهم قالوا انما البیع مثل الربوا واحل الله البیع وحرم الربٰو۔ سود خوروں کا یہ حشر اس وجہ سے ہو گا کہ "انہوں نے یہ کہا ہے کہ سود بھی بیع کی طرح ہے کیونکہ بیع کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔"

اِس سے ثابت ہوا کہ سود مطلقاً حرام ہے اور جو لوگ اس کو بیع اور تجارت کا نام لے کر حلال اور جائز کہتے ہیں' ان کی سزا یہ ہے کہ وہ محشر میں مجنون بن کر اُٹھیں گے۔

(۶) سود خور دوزخی ہے: ومن عاد فاؤلٰئک اصحاب النار هم فیها خالدون ۔ جو لوگ اللہ کی نصیحت سننے کے بعد پھر سودی کاروبار کریں گے اور اس کو حیلہ بہانہ سے بیع اور تجارت قرار دے کر حلال سمجھیں گے تو وہ دوزخی ہیں جو ہمیشہ ہی دوزخ میں رہیں گے۔

اس دلیل سے سود خوروں کا جہنمی ہونا ثابت ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ اللہ کے حکم کے سامنے عقلی باتیں لانا اور حیلے کرنا موجب سزا ہے۔

سود کی حرمت اور اس کی وعید قرآن وحدیث کی روشنی میں

(۱) سود خور اور سود کا عملہ سب ملعون ہیں: یہ حدیث شریف مشکوٰۃ میں ہے کہ عن جابر قال لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اکل الربٰو وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء۔ (رواہ مسلم) "جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیاج (سود) لینے والے اور دینے والے اور لکھنے والے اور گواہوں پر لعنت کی ہے اور یہ فرمایا کہ یہ سود کے محکمہ کا سب عملہ گناہ میں برابر ہے۔"

یعنی نفس گناہ میں سب مساوی ہیں اگرچہ مقدار میں مختلف ہوں مثلاً بیاج (سود) لینے والے نے بیاج لیا اور دینے والے نے دیا تو یہ برابر ہو گئے پھر لینے والے نے اس حرام کو کھلایا اور اپنے اہل وعیال کو کھلایا تو اب یہ مقدار میں سب سے بڑھ گیا۔ حدیث میں ہے کہ لا یدخل الجنۃ جسد غذی بالحرام "نہیں داخل کیا جائے گا بہشت میں وہ جسم کہ پرورش کیا گیا ساتھ مال حرام کے۔"

پھر حرام کھانے سے عبادت قبول نہیں ہو گی۔ یہ مقدار میں تفاوت ہے۔ پھر سود ادا کرنے والا بعض نامساعد حالات میں مجبور بھی ہو سکتا ہے لیکن سود لینے والا' کھانے والا مختار ہے' مجبور نہیں ہے۔

(۲) سود کے گناہ کا ادنیٰ درجہ: حدیث میں ہے کہ قال صلی اللّٰہ علیہ وسلم الربا سبعون حوبا اھونھا کوقع الرجل علی امہ وفی روایۃ اھونھا کالذی ینکح امہ "یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ سود کے ستر گناہ ہیں' ان میں سے معمولی درجہ یہ ہے کہ جیسے ماں سے صحبت کرنا۔" (رواہ ابن ماجہ والبیھقی)

اور طبرانی کی روایت میں یوں ہے کہ الربا سبعون بابا اھونھا مثل ان ینکح الرجل امہ "سود کے ستر دروازے ہیں چھوٹے کا مقدار یہ ہے کہ وہ ماں سے نکاح کرنے کی مثل ہے۔"

نکاح سے مراد عقد نکاح ہو جو موجب جماع ہے یا صحبت کرنا مراد ہو۔ بہرحال یہ سود کے سترہویں گناہ کا درجہ ہے۔ باقی اس سے بھی بڑے ہیں تو سود کے گناہوں کی مقدار کون بیان کر سکتا ہے؟ العیاذ باللّٰہ۔

(۳) **سود خور کا حال عالم برزخ میں:** کتاب الکبائر للذہبی اور تفسیر ابن کثیر میں یہ حدیث بروایت بیہقی وابن جریر وابن ابی حاتم درج ہے کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مجھے سیر کرایا گیا تو میں ایک ایسی قوم کے پاس سے گذرا جن کے شکم ان کے سامنے پڑے ہوئے تھے اور ہر شخص کا پیٹ مثل بھاری مکان کے تھا اور وہ اس راستہ پر پڑے ہوئے تھے جہاں صبح وشام قوم فرعون کا دوزخ کی طرف جانے کے لیے گذر ہوتا ہے جبکہ وہ ایک شکست خوردہ اونٹ کی طرح بھرے دیوانے ہو کر گذرتے ہیں تو وہ پیٹو اس لشکر کو آتے دیکھ کر کھڑے ہونا چاہتے ہیں لیکن بڑے ضخیم پیٹوں کی وجہ سے کھڑے نہیں ہو سکتے۔ تب فرعون کا لشکر ان پر چھا جاتا ہے اور پاؤں تلے سب کو روندتا ہوا چلا جاتا ہے اور دوزخ کو آتے جاتے ان کا یہی حال کرتا ہے۔ یہ ان کا برزخی عذاب تھا۔ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ یہ کون بدبخت قوم ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے ہیں۔ یہ قیامت کو باؤلوں کی طرح کھڑے ہوں گے۔"

(۴) بروایت احمد وابن ماجہ ترغیب وترہیب میں یہ روایت ہے کہ "جب مجھے معراج ہوا اور میں ساتویں آسمان پر پہنچا تو میں نے اپنے سر پر سے رعد کی اور بجلی کی آوازیں سنیں اور کئی لوگ دیکھے کہ ان کے شکم مثل مکانوں کے بڑے بھاری ہیں جن میں سانپ اور بچھو بھرے ہوئے ہیں جو باہر سے صاف نظر آرہے ہیں۔ میں نے جبرائیل علیہ السلام سے استفسار کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ یہ سود خور قوم ہے۔"

ان احادیث میں کوئی تعارض اور تخالف کا وہم نہ کرے کیونکہ سود کی صورتیں مختلف ہیں جن میں سود کی مقدار بھی مختلف ہے۔ اس لیے برزخی عذاب بھی مختلف نوعیت کے ہوں گے۔ چنانچہ ایک حدیث بخاری کی روایت سے مندرجہ ذیل وارد ہے۔

(۵) ایک طویل حدیث خوابی معراج میں یہ بیان ہے کہ "ہم ایک سرخ رنگ نہر مثل خون پر وارد ہوئے تو اس نہر خونی میں ایک شخص تیرنے والا تیرتا ہوا آتا ہے۔ جب وہ نہر کے کنارہ پر آتا ہے تو وہاں ایک شخص ہے جس کے پاس بہت سے پتھر جمع ہیں۔ جب تیرنے والا کنارے نہر پر آکر اپنا منہ کھولتا ہے تو وہ شخص ایک پتھر اٹھا کر اس کے منہ میں پھینک دیتا ہے۔ پس وہ واپس چلا جاتا ہے' اسی طرح وہ بار بار تیرتا ہوا آتا ہے تو وہ شخص پتھر مار کر اسے

واپس کر دیتا ہے۔ میں نے اپنے لے جانے والوں سے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے؟ تو انہوں نے بتلایا کہ نہر میں تیرنے والا اور منہ میں پتھر کھانے والا سود خور ہے۔"

(۶) سود خور کا حال میدان حشر میں: قرآن مجید کے الفاظ میں یہ گذر چکا ہے کہ سود خور قبروں سے مصروع اور آسیب زدہ شخص کی طرح اٹھائے جائیں گے جس کی تفسیر حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مروی ہے کہ ان اکل الربا یبعث یوم القیامۃ مجنونا "سود خور دیوانہ بنا کر قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔"

(۷) سود خور جنت میں داخل نہ ہو گا: ترغیب وکتاب الکبائر میں یہ حدیث منقول ہے کہ چار اشخاص کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کو یہ حق ہے: ان لا یدخلھم الجنۃ ولا یذیقھم نعیمھا مد من الخمر واکل الربا واکل مال الیتیم بغیر حق والعاق لوالدیہ الا ان یتوبوا "کہ ان کو جنت میں داخل نہ کرے اور نہ جنت کی کوئی نعمت چکھائے۔ ایک تو ہمیشہ شراب پینے والا، دوم سود خور، سوم یتیم کا مال کھانے والا، چہارم ماں باپ کا عاق۔ مگر یہ کہ وہ اپنے ان گناہوں سے خالص توبہ کر جائیں۔"

(۸) سود خور دوزخ کی آگ میں: کتاب الکبائر للامام الذہبی ص۔۶۳ میں ہے کہ عن ابی بکر الصدیق قال الزائد والمستزید فی النار "سود دینے والا اور لینے والا دوزخ میں ہوں گے۔"

یہ حدیث حکماً مرفوع ہے کیونکہ یہ حکم غیر مدرک بالقیاس ہے۔ بغیر سماع از شارع بیان نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد یار غار، مبشر بالجنۃ قیاس سے حکم بالنار نہیں لگا سکتے۔

(۹) مقروض سے تحفہ لینا بھی سود ہے: مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اذا اقرض الرجل احدکم فلا یاخذ ھدیۃ "جس وقت کوئی شخص کسی کو قرض دے تو اس سے تحفہ نہ لے" کتاب الکبائر میں امام ذہبی سے نقل کیا ہے کہ عن ابن مسعود قال اذا کان لک علی رجل دین فاھدی لک شیئا فلا تاخذہ فانہ ربا "جلیل القدر صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تمہارا قرض کسی شخص کے ذمہ ہو اور وہ تم کو کوئی تحفہ دے تو اس کو قبول نہ کرو کیونکہ وہ سود ہے۔"

ہاں اگر پہلے سے دوستانہ تعلق یا رشتہ داری کی بنا پر تحفہ دینے لینے کا رواج ہو اور قرض کی لحاظ داری مدنظر نہ ہو تو پھر جائز ہے کہ عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔ نیز مشکوٰۃ کی دوسری روایت میں اس کی صراحت ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سود قطعاً حرام ہے اور نہایت سخت کبیرہ گناہ ہے جسے آنحضور ﷺ نے مہلکات میں شمار کیا ہے اور اس پر بہت وعید وارد ہے کہ وہ باؤلہ ہو کر جنت سے محروم رہتے ہوئے دوزخ میں جائے گا۔ اس لیے تمام اہل اسلام کو اس سے بچنا چاہیے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج اس زمانہ میں بہت عام بلکہ خواص بھی مختلف طرح کے حیلے بہانوں سے ہیر پھیر اور تاویلوں سے اس بلاء عظیم میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ حالانکہ بروئے حدیث صحیح شبہات سے بھی بچنا واجب ہے اور اسی کا نام تقویٰ ہے۔

سود کی مشتبہ صورتوں سے بچنے کا حکم: نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: الحلال بین والحرام بین وبینھما امور مشتبھة فمن ترک ما یشتبه علیه من الحرام کان لما استبان اترک ومن اجترا علی ماشک فیه من الحرام اوشک ان یواقع ما استبان۔ (صحیحین) "حلال ظاہر ہے اور حرام بھی صاف ظاہر ہے۔ ان کے درمیان بعض امور مشتبہ ہیں۔ جو شخص مشتبہ چیزوں کو چھوڑ دے گا وہ ظاہر حرام کو بطریق اولیٰ چھوڑ دے گا اور جو شکی امور میں پڑنے پر دلیری کرے گا وہ بہت ممکن ہے کہ حرام ظاہر میں بھی مبتلا ہو جائے۔"

چنانچہ آج ایسا ہی ہو رہا ہے کہ جو لوگ متقین صالحین ہیں' وہ شبہات سے بچتے ہیں تو سود کی صریح حرام صورتوں سے بھی بہت دور ہیں اور جو مشتبہ امور سے نہیں بچتے وہ آج صاف صریح سود کھا رہے ہیں۔ حضرت عمرفاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب آیتوں کے آخر میں (دربارہ معاملات) جو آیت نازل ہوئی ہے وہ آیت ربوا ہے۔ اس کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گئے اور اس آیت کی مفصل تمام جزئیات کے ساتھ تفسیر نہ فرما گئے۔ فدعوا الربوا والریبة۔ (مشکوٰۃ) "پس تم چھوڑ دو سود کو اور ہر اس چیز کو جس میں سود کا شبہ ہو۔"

ان دلائل سے یہ ثابت ہوا کہ صریح بیاج اور شبہ بیاج کو چھوڑنا واجب ہے لیکن افسوس ہے کہ آج مدعیان اسلام مشتبہ سود سے تو کیا صریح بیاج سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔

تمام سرمایہ داری سود پر چل رہی ہے اور پھر اس پر طرفہ یہ کہ اس کو باب الحیل کے تحت جائز بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حالانکہ سودی معاملہ شرعی لحاظ سے اس قدر خطرناک ہے کہ جس شخص کے اندر کچھ بھی ایمان اور خوف الٰہی ہے وہ کتاب و سنت کے مذکورہ دلائل کو پیش نظر رکھ کر کبھی سودی معاملہ نہیں کر سکتا۔

بنکوں کی بیاج پر ایک نظر: یہ دعویٰ میں ادلہ شرعیہ قطعیہ عامہ سے ثابت کر چکا ہوں کہ سود حرام ہے اور وہ مطلقاً حرام ہے۔ اس دور پرفتن میں جو لوگ نئی نئی صورتیں پیدا کر کے اس حرام کو حلال بنانے کی سعی کر رہے ہیں' یہ حیلہ ہے۔ یہود کو ہفتہ کے روز شکار کرنا منع تھا۔ انہوں نے اس حرام کو حلال بنانے کے لیے یہ حیلہ کیا کہ مختلف حوض بنا کر ان میں جال لگا دیئے جن میں ہفتہ کے روز مچھلیاں نکل کر حوضوں میں آجاتی تھیں اور جالوں میں پھنس جاتی تھیں۔ یہودی اتوار کو جا کر ان کو پکڑ لاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس حیلہ کو باطل قرار دے کر ہفتہ کا شکار ٹھہرایا اور ان کو مجرم بنا کر بندروں کی شکل میں مسخ کر دیا۔

اس پر امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : ھکذا الذین یتحیلون علی الرباء بانواع الحیل فان اللہ لا تخفی علیه حیل المحتالین۔ (کتاب الکبائر) "اِسی طرح سود خور سود لینے کے لیے مختلف قسم کی حیلہ سازیاں کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں۔"

چنانچہ ان میں سے ایک بنک کی صورت ہے جس کو بعض جائز کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ سرمایہ داروں کی ایک منظم سودی روش ہے جو قطعاً حرام ہے کیونکہ بنک سرکاری ہو یا غیر سرکاری' ان میں صاف سودی کاروبار ہو رہا ہے۔ جب سود کا ہونا سب کو مسلم ہے تو پھر حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رافع الغنک کے صفحہ ۷ میں یہ فرماتے ہیں کہ "جس بنک میں روپیہ داخل کیا ہے وہ علی الاطلاق سرمایہ اور سود کا ذمہ دار ہے خواہ اس کو نفع ہو یا نقصان۔ یا ایسا نہیں بلکہ نقصان ہونے سے حصہ داروں پر بھی نفع نقصان ڈالا جاتا ہے۔ اگر صورت ثانیہ ہے تو اس کی حقیقت شرکت ہے' قرض نہیں اور ایک شریک یا اس کے ملازمین دوسرے شریک کا وکیل ہوتا ہے اور وکیل کا فعل شرعاً موکل کی طرف منسوب ہوتا ہے اور بنک والے جیسا حصہ داروں کو سود دیتے ہیں' اسی طرح دوسرے قرض خواہوں سے

سود لیتے ہیں اور ان قرض خواہوں میں کوئی قید اسلام اصلی یا غیر اصلی یا کفر کی نہیں (کہ حربی اور مسلم کے سود کے جواز کا احتمال پیدا ہو) پس وکالت کے واسطے گویا اس حصہ دار نے مطلقاً مسلمانوں سے بھی سود لیا جو کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں اور پہلی صورت میں یہ محذور تو لازم نہیں آتا کیونکہ وہ بنک والوں کے ذمہ قرض اور ان کی ملک ہو گیا لیکن دوسرا یہ محذور ضرور لازم آیا کہ اس شخص نے ایسے لوگوں کو قرض دیا جو اس سے ربوا کا نفع حاصل کریں گے۔ یہ ان کی اعانت ہوئی' معصیت پر جو کہ مقدمہ ثالثہ کی رُو سے معصیت ہے۔"

اس سے ایک تو یہ ظاہر ہوا کہ بنک میں سودی معاملہ ہوتا ہے اور سود حرام ہے تو بنک کا بنانا اور ان میں ملازم ہونا اور اس سے روپیہ لے کر کاروبار کرنا اور اس میں روپیہ داخل کرنا وغیرہ سب امور حرام اور گناہ کبیرہ ہیں۔ دوسرا یہ معلوم ہوا کہ روپیہ کی حفاظت کے لیے اس کو بنک میں امانت کے طور پر داخل کرنا بھی حرام ہے کیونکہ یہ تعاون علی المعصیت ہے۔ اس رقم سے بنک والے سودی کاروبار کریں گے جو گناہ ہے۔ اس رقم سے ان کا تعاون ہو گیا۔

قرآن میں ہے : تعاونوا علی البر والتقوٰی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان○ "نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم زیادتی پر کسی کی مدد نہ کرو۔"

آج بہت سے سرمایہ دار اس گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں' جس کا کچھ احساس نہیں ہے۔ اس کا احساس اس وقت ہو گا جس وقت سود خور عذاب میں گرفتار ہوئے تو یہ بھی ساتھ ہی گرفتار ہو جائیں گے۔ اعاذنا اللّٰہ تعالٰی منہ ومنھم۔

ہاں اگر کوئی ایسا قومی بنک قائم کیا جائے کہ جس میں سرمایہ دار اپنے حصص شامل کر کے تجارت وصنعت کے ذریعہ حلال منافع حاصل کریں اور سودی کاروبار سے بچیں بلکہ غریبوں کو قرض دے کر اُن کی امداد کریں یا مضاربت کے طور پر ان کو روپیہ دے کر ان کا کاروبار چلائیں اور لوگوں سے ان کے مال کے تحفظ کے لیے مال لیں اور ان کو تجارتی کاروبار سے حصہ دیں اور ان سے یہ حصہ طے کر لیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن سودی کاروبار کے بنکوں کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ سود جیسے انفرادی طور پر معاملہ کرنے میں لینا دینا حرام ہے۔ ویسے ہی اجتماعی صورت سے لینا دینا بھی حرام ہے۔ بنگالی بنک' یا لندن بنک

وغیرہ میں جو رقم سرکاری کفالتوں میں دے کر یا زر ضمانت رکھ کر وہاں سے منافع حاصل کئے جاتے ہیں' یہ سب سود ہیں۔ ہاں اگر مدرسوں یا قیدیوں کا روپیہ یا فوجیوں کی تنخواہیں بغیر ان کے داخل کرنے کے سرکاری طور پر کسی بنک میں جمع ہوں اور ادائیگی کے لیے وہ ان کو سود دیں تو وہ سود وصول کر لیں لیکن پھر یا فقراء پر صدقہ کر دیں لیکن ثواب کی نیت سے نہیں بلکہ اپنے ذمہ سے دوسروں کا حق ساقط کرانے اور حرام کو اپنے ذمہ سے نکالنے کی غرض سے صدقہ کر دیں یا حکومت کے کسی ناجائز شعبہ میں دے دیں۔ یہ مجبوری صورتوں میں ہے لیکن اختیاری طور پر بنک سے کوئی معاملہ کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر مجبوری صورت میں یا کسیکو مسئلہ سمجھ کر اب خیال ہو کہ میں اپنا روپیہ بنک سے وصول کر لوں تو اس صورت میں جو حساب سے سود ملے اس کو بنک میں نہ چھوڑیں کیونکہ یہ تعاون علی المعصیت ہو گا بلکہ وصول کر کے فقراء کو دے دیں یا کسی حرام راستہ پر لگا دیں مثلاً کسی حاکم نے ناجائز طور پر جرمانہ کر دیا تو وہاں یہ سودی رقم دے دیں خود اختیاری طور پر نہ سودی معاملہ کریں اور نہ سود کھائیں کہ یہ سب حرام اور گناہ ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تمام بنکوں میں سودی کاروبار ہوتا ہے اور سود کی حرمت ثابت کر چکے ہیں' لہٰذا بنکوں سے لین دین کرنا جائز نہیں ہے۔ بنکوں میں سود ہونے پر رنگون سے ایک صاحب کی شہادت سنئے' وہ لکھتے ہیں :

> "مسلمان خود تو بنک قائم نہیں کر سکتے کیونکہ سود کے بغیر بنک نہیں چل سکتا لیکن دوسرے بنکوں سے معاملہ کر کے لاکھوں کا سود دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ان اجنبی بنکوں کے رحم پر ان کی زندگی اور تجارت موقوف ہو جاتی ہے۔ وہ جب چاہتے ہیں' انہیں دیوالیہ بنا لیتے ہیں۔" (رسالہ سود مودودی ص۔۱۵۹)

میں کہتا ہوں کہ پاکستان میں مسلمانوں کے بنک ہیں' وہ بھی سودی معاملات کر رہے ہیں تو مسلمانوں کے بنک ہوں یا غیر مسلموں کے' جب سودی کاروبار کریں تو ان میں روپیہ داخل کرنا یا ان سے قرض لے کر تجارت وغیرہ سے فائدہ اٹھانا ناجائز اور حرام ہے۔

<u>بیمہ زندگی پر تبصرہ:</u> بیمہ زندگی بھی دنیا میں کاروباری سلسلہ کی ایک شاخ ہے جس کی وضاحت کتابوں' رسالوں' اخباروں میں کافی ہو چکی ہے اور اس سے ہر سرمایہ دار اور اہل علم

خوب واقف ہے کہ انشورنس کمپنی ایک ادارہ ہے جس میں ایک فریق جس کی زندگی بیمہ کی جاتی ہے۔ اس ادارہ کے شرائط کے مطابق ایک طے شدہ رقم مدت مقررہ تک بالاقساط کمپنی کو ادا کرتا رہتا ہے اور کمپنی اس رقم کے محفوظ اور وقت مقررہ پر ادائیگی کی ضامن ہوتی ہے۔ اختتام مدت پر وہ رقم اس کو یا بصورت موت اس کے وارث کو ادا کر دی جاتی ہے۔ جیسا معاہدہ ہوتا ہے ویسا عمل درآمد کیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ کے متعلق بظاہر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ یتیموں اور بیواؤں وغیرہ کی حفاظت کا ایک طریقہ ہے۔ روپیہ محفوظ ہو جاتا ہے' کسی وقت مصیبت زدوں کے کام آتا ہے۔ یہ ادارہ ضرورت کے وقت اپنے بھائیوں کی امداد کرتا ہے اور یہ سلسلہ اپنی اور دوسروں کی مدد کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ اس کے منع ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ ادارہ ایک امین ہے جو اپنے فرائض کو پورے طور پر سرانجام دیتا ہے اور خیر خواہی کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ ادارہ بھی حرام کو حلال بنانے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس کی ظاہریت کو سرسری نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے' حقیقت کے لحاظ سے غور کرنا چاہیے کہ اسلام نے جو قواعد مقرر کئے ہیں' ان کی رُو سے یہ باہمی معاملہ کس نوعیت کا ہے؟

سو واضح ہو کہ یہ طریقہ بیمہ زندگی کا اصولاً باطل ہے کیونکہ ایک تو اس میں جوا کی صورت پائی جاتی ہے۔ جوا کی حقیقت یہ ہوتی۔ ہے کہ اس میں ایک کا نقصان اور دوسرے کا نفع ہو لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ نفع کس کو ہو گا اور نقصان کس کو ہو گا۔ اس ادارہ میں زندگی بیمہ کرانے والے کئی اشخاص ہوتے ہیں جو قسط وار اپنا سرمایہ داخل کرتے ہیں۔ اب ان میں سے جو لوگ ایک دو قسطیں ادا کر کے فوت ہو گئے تو وہ حسب معاہدہ بیمہ کی رقم کے مستحق ہو گئے جس کو اس کے وارث لے جائیں گے۔ اس سے باقی اراکین کو نقصان ہوا کیونکہ ان کی رقم سے یہ روپیہ ادا ہوا جس سے ان کی آمد کو نقصان پہنچا اور جلدی مرنے والے کو نفع ہوا کہ ایک دو قسطوں سے ہی کثیر رقم وصول کر لے گیا۔ اس کا روپیہ امانت شدہ تھوڑا تھا۔ یہ کثیر رقم دوسروں کی تھی جو ادارہ نے متوفی کے وارثوں کو دے دی ہے' یہ جوا ہے اس میں کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو نفع یا نقصان ضرور ہوتا ہے۔ یہ ہار جیت قسمت کی ہے' اس کو قمار کہتے ہیں جو بروئے کتاب وسنت حرام ہے اور یہ اکل اموال الناس بالباطل کی قسم سے ہے۔

احادیث میں اس کے نظائر بیع ملامہ، بیع حصاۃ ہیں جن کو حرام قرار دیا گیا ہے کیونکہ اگرچہ وہ بظاہر بیع ہیں اور ان کا نام بھی بیع رکھا گیا ہے مگر حقیقت ان کی جوا ہے۔ اس میں بھی بائع کو کبھی نفع اور کبھی نقصان ہوتا ہے۔ مشتری کو بھی کبھی نفع یا نقصان ہوتا ہے مگر معلوم نہیں ہوتا کہ اس معاملہ میں نفع کس کو اور نقصان کس کو ہو گا۔

اور مشکوٰۃ میں حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیوان کے ساتھ گوشت کی بیع منع فرمائی اور اس کو جاہلیت کا قمار قرار دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جوا کی کئی صورتیں ہیں۔ وہ کسی ایک صورت میں محدود نہیں ہے۔ پس اسی طرح یہ بیمہ زندگی بھی جوا کی ایک قسم ہے جس سے بچنا واجب ہے۔

دوسری وجہ اس میں سودی معاملہ ہے کہ یہ کمپنی سود پر قرضہ دیتی ہے اور اس جمع شدہ رقم سے سودی کاروبار کرتی ہے۔ گویا یہ ادارہ سود خور تعاونی مجلس ہے۔ سود کے ذریعہ روپیہ کما کر اس ادارہ کے ملازموں کو بطور تنخواہ دیا جاتا ہے اور اس روپیہ سے کمپنی کا روزانہ خرچ بھی پورا کیا جاتا ہے تو سود اس کا یقینی ذریعہ ہے۔ پھر اس کے حرام ہونے میں کسی مسلمان کو کیا شبہ ہے کیونکہ سود تو بہر نوع حرام ہے، خواہ وہ کسی صورت سے ہو، کما تقدم۔

پھر اس میں قسطیں وعدہ پر ادا نہ ہوں تو باقی رقم ضبط کر لی جاتی ہے۔ یہ بھی اکل المال بالباطل ہے۔ حدیث میں بیع عربان سے منع کیا گیا ہے کہ اس میں سائی (ایڈوانس) کے طور پیشگی روپیہ دیا ہوا ضبط کیا جاتا ہے جو ناجائز طریقہ ہے۔

پھر اس کو امانت قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ امانت میں زر امانت بعینہٖ محفوظ رکھنے کا حکم ہے۔ کمپنی اس رقم میں تصرف کرتی ہے تو یہ قرضہ کی قسم ہو گی جس پر نفع دینا لینا سود ہو گا جو حرام ہے۔ الغرض بیمہ زندگی کا سلسلہ اسلامی قواعد کی رُو سے ناجائز ہے۔ پس ہر مسلمان کو اس سے بچنا لازم ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر عارف الحصاری منٹگمری (ساہیوال)

الاعتصام لاہور

جلد ۱۱، شمارہ ۱۴، ۱۵۔ مورخہ ۱۱ ستمبر و ۹/ اکتوبر سنہ ۱۹۵۹ء

فقہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور فقہ حنفیہ ایک تقابل

مسئلہ نمبر۔۳ بحث مسئلہ مصراۃ کی بیع کا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ محلّٰی ابن حزم جلد۔۹، ص۔۶۷ میں صحیح حدیث بطریق بخاری یہ درج ہے: عن عبداللّٰہ بن مسعود قال من اشتری مصراۃ فلیرو معھا صاعا من تمر وھذا اسناد کاللولو "یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ جس شخص نے کوئی ایسا جانور خریدا (اونٹنی، گائے، بھینس وغیرہ) جس کا دودھ تھنوں میں جمع کر کے بھرا ہوا تھا تو خریدار کو چاہیے کہ وہ حیوان بائع کو واپس کر دے (کہ اس نے دھوکہ کیا ہے) اور اس کے ساتھ ایک صاع (پونے تین سیر) کھجور (دودھ کے معاوضہ میں) بائع کو دے دے۔"

صحیح بخاری میں یہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من اشتری غنما مصراۃ فاحلبھا فان رضیھا امسکھا وان سخطھا ففی حلبتھا صاع من تمر "یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے ایسی بکری کسی شخص سے خریدی جس کے پستانوں میں دودھ بھرا تھا، جب مشتری نے اس کو گھر لا کر دودھ دوہا تو معلوم ہوا۔ اب اگر وہ اس بیع پر راضی ہو جائے تو اِس بکری کو اپنے گھر میں بند رکھے اور اگر وہ اس دھوکہ کی بیع سے ناراض ہو تو بائع کو واپس کر دے اور ساتھ اس کے ایک ٹوپہ کھجوروں کا بائع کو دے دے۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتویٰ اِس حدیث کے موافق ہے جس کی اسناد ایسی صحیح ہیں جو اعلیٰ درجہ کے موتی کی طرح چمکتی ہیں۔ علاوہ ازاں آئمہ اثبات وثقات نے اِس حدیث کو روایت کیا ہے اور امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق یہ روایت متواتر کا حکم رکھتی ہے جس کو کوئی شخص ایمان دار رد نہیں کر سکتا مگر وہ شخص جو فضل ورحمت الٰہی سے محروم ہے اور حق قبول کرنے کی توفیق نہیں دیا گیا۔ لیکن ایک فرقہ اس حدیث کو محض قیاس کے مقابلے میں مسترد کر چکا ہے۔

چنانچہ اصول فقہ کی پہلی کتاب اصول شاشی جو درسی ہے، اس کے ص۔۱۳۳ مترجم میں حدیث کے راویوں کی قسمیں مجتہد اور غیر مجتہد، فقیہ اور غیر فقیہ ظاہر کرتے ہوئے حضرت ابوہریرہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما کو غیر مجتہد، غیر فقیہ قرار دے کر ان کی روایت کو

قیاس کے مقابلے میں مسترد کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ لکھا ہے: وعلی هذا ترک اصحابنا روایة ابی هریرة فی مسئلة المصراة بالقیاس "یعنی اس اصول حنفیہ کی بنا پر ہمارے علماء حنفیہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو جو مسئلہ مصراۃ کے بارہ میں مروی ہے' قیاس کے مقابلہ میں ترک کر دیا ہے۔"

اور اب بھی اپنی درس گاہوں میں ان اصولی کتابوں کو پڑھا کر محدثین کی ان روایتوں کو جو صحاح ستہ وغیرہا میں پائی جاتی ہیں مسترد کرتے رہتے ہیں۔ اس اصول میں مقلدین اہل رائے نے مندرجہ ذیل جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔

اول یہ کہ صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے حضرت ابو ہریرہ اور انس رضی اللہ عنہما وغیرہ کو اپنے امام کے مقابلے میں غیر فقیہ قرار دیا ہے' صرف اس بنا پر کہ ان کی اکثر احادیث مذہب حنفی کی جڑ کاٹتی ہیں۔ حالانکہ باتفاق محدثین صحابہ کرام سب عدول ہیں۔ خصوصاً ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تو بڑے محدث اور مجتہد اور مفتی مشہور ہیں جن کے مقابلے میں تمام ائمہ اہل رائے محض ہیچ ہیں۔

دوسرا جرم' حدیث نبوی قطعی الثبوت کو محض قیاس امام کے مقابلے میں مسترد کرنا۔

تیسرا جرم یہ کہ اس حدیث کو غیر فقیہ کی روایت قرار دے دیا حالانکہ یہ روایت ان بعض صحابہ سے بھی مروی ہے جو خود حنفیہ کے نزدیک بھی مجتہد ہیں۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت گذر چکی ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں جن کے مناقب شروع مضمون میں گذر چکے ہیں اور حنفیہ اپنے مذہب کی بنیاد اس صحابی پر بتلاتے ہیں۔ علماء حنفیہ میں علم حدیث کی قلت ہے اِس لیے یہ روایت ان کو معلوم نہ ہوئی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مشہور صحابی سے اعراض کر گئے اور اپنے مطلب کے وقت یہ روایت بیان کیا کرتے ہیں کہ صحابہ کرام مثل ستاروں کے ہیں۔ جس ستارہ کی بھی اقتدا کی جائے' اسی میں ہی ہدایت ہے لیکن اِس مسئلہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ستارہ نہ سمجھا اور اپنے امام کو ستارہ بنا لیا جو سب اماموں میں ضعیف ہے۔

بعض علماء جو یہ کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ ضعیف حدیث کے مقابلے میں بھی قیاس کو چھوڑ دیتے تھے جیسے انہوں نے قہقہہ سے وضو فاسد ہو جانے کی ضعیف روایت لے کر اپنے قیاس کو چھوڑ دیا تھا' یہ خیال غلط ہے۔ قہقہہ کی حدیث ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی

ہے اور وہ ان کو معروف بالفقہ کہتے ہیں۔ اس لیے قیاس کو ترک کیا تھا۔ اگر یہ روایت غیر فقیہ کی معلوم کرتے تو ہرگز قیاس کو نہ چھوڑتے ورنہ ان کا یہ اختراعی اصول باطل ہو جاتا کہ غیر فقیہ کی روایت خلاف قیاس متروک ہو گی ورنہ ہماری رائے وقیاس کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

(مسئلہ نمبر۔۴) سورۃ فاتحہ نماز جنازہ میں پڑھنے کا ہے۔ ابن المنذر نے ذکر کیا ہے کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنا ابن مسعود اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور امام شافعی اور امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہی مذہب تھا۔

میں کہتا ہوں کہ کتاب الجنائز میں حضرت ابن عباس، سہل بن حنیف رضی اللہ عنہما وغیرہ سے بھی منقول ہے اور یہ روایت ہے کہ جس شخص نے حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا جنازہ پڑھا تھا، اس نے ان کے جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھی تھی اور مرعاۃ المفاتیح میں ہے کہ ان کا جنازہ حضرت صہیب صحابی رضی اللہ عنہ نے پڑھا تھا۔ جب اس قدر صحابہ کا تعامل ہے اور حدیث نبوی سے بھی نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ ثابت ہے۔ بایں ہمہ نام کے اہل سنت والجماعت مقلدین حنفیہ نماز جنازہ میں قرآت قرآن، فاتحہ وغیرہ پڑھنا منع جانتے ہیں۔

فتاویٰ قاضی خاں جلد۔۱، ص۔۹۳ اور شرح وقایہ وغیرہ میں ہے: "نماز جنازہ میں دیگر دعائیں پڑھو اور سورہ فاتحہ نہ پڑھو۔" بہشتی زیور کے گیارہویں حصہ کے ص۔۹۲ میں ہے کہ اس نماز میں التحیات اور قرآن مجید کی قرآت نہیں ہے۔ پس مذہب حنفی خلاف ابن مسعود اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حدیث نبوی کے ہے۔ سنن نسائی میں ہے، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی تو انہوں نے سورہ فاتحہ اور دیگر سورہ بلند آواز سے پڑھی۔ جب فارغ ہوئے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ کیا یہ اسی طرح کرنا ٹھیک ہے۔ انہوں نے یہ فرمایا "سنۃ وحق" کہ شرعی طریقہ یہی ہے اور عین حق ہے۔ پس مذہب حنفی خلاف حق ہے۔

عبدالقادر عارف حصاری

الاسلام ہفت روزہ لاہور

جلد۔۲، شمارہ۔۲۰، مورخہ ۱۸/ رجب سنہ۔۱۳۹۸ھ مطابق ۲۶/ جولائی سنہ۔۱۹۷۶ء

دوکانات ومکانات کی سلامی (مروجہ پگڑی) لینا شرعاً حرام ہے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○ الجواب بعون الوھاب وھو الموفق للصواب۔ الحمد للّٰہ رب العالمین۔ امابعد! وباللّٰہ التوفیق۔

واضح ہو کہ جواب دینے سے پہلے ایک قاعدہ فقیہہ عرض کرتا ہوں اس کو غور کر کے سمجھ لیں پھر جوابات ملاحظہ فرمائیں۔ جو چیز کسی کو دی جاتی ہے' اس کی دو حالتیں ہیں یا تو بعوض دی جاتی ہے یا بلا عوض۔ جو چیز بدلہ میں دی جاتی ہے وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ ایسی شے کا عوض ہے جو متقوم اور قابل عوض ہے یا ایسی شے کا عوض ہے جو شرعاً متقوم وقابل عوض نہیں۔ خواہ حقیقتاً نہ ہو جیسے عقود باطلہ میں ہے یا حکماً نہ ہو جیسے عقود فاسدہ میں ہے اور جو بلا عوض چیز دی جاتی ہے وہ بھی دو حال سے خالی نہیں۔ یا محض طیب خاطر اور آزادی سے دی جاتی ہے یا تنگی خاطر وکراہت قلب سے دی جاتی ہے۔ اگرچہ تنگی وکراہت زیادہ ہو یا کم ہو' پس یہ کل چار قسمیں ہو گئیں۔

قسم اول جو متقوم شے کے عوض میں حاصل ہو۔ دوسری قسم جو غیر متقوم شے کے عوض میں حاصل ہو۔ تیسری قسم جو بلا عوض طیب خاطر کے حاصل ہو۔ چوتھی بلا عوض جو دل کی کراہت اور تنگی سے حاصل ہو۔ اب ان کا حکم سنئے کہ قسم اول بوجہ عوض اجرت وقیمت ہونے کے اور قسم تیسری بوجہ ہدیہ' عطیہ' ہبہ ہونے کے حلال ہے۔ قسم دوسری بوجہ رشوت یا ربا حقیقی یا حکمی ہونے اور چوتھی قسم بوجہ ظلم وجبرفی التبرع ہونے کے حرام ہے۔

اب اپنے سوالوں کا جواب نمبروار ملاحظہ کیجئے اور یہ اصطلاحات سمجھئے کہ اجارہ کسی چیز کو کرایہ پر دینے کو کہتے ہیں اور موجر کسی چیز کو کرایہ پر دینے والے کو کہتے ہیں اور مستاجر کسی چیز کو کرایہ پر لینے والے کا نام ہے۔ پس شرع میں اجارہ یہ ہے کہ بیچنا کسی چیز کی منفعت کا اور اس کو غیر کے ملک کرنا۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ اجارہ جائز نہ ہونا چاہیے کیونکہ منافع معدوم شے ہے یعنی موجر نے جو مکان یا دوکان کرایہ پر دی ہے اور مستاجر نے اس کو کرایہ

پر لیا ہے' اس مکان یا دوکان سے جو منافع حاصل ہوتا ہے وہ معدوم ہے۔ پس معدوم چیز پر فریقین نے عقد کیا ہے۔ معدوم چیز پر عقد صحیح نہیں تو اس کو شارع ﷺ نے لوگوں کی حاجت اور ضرورت کے پیش نظر جائز کر دیا جو احادیث اور آثار سے ثابت ہے لیکن اس میں ظلم اور زیادتی اور غلو پایا جاتا ہے۔ اس لیے اب ناجائز ہے۔

مثلاً موجر کی طرف سے یہ ظلم کہ چھ ماہ یا سال کا کرایہ پہلے لینا۔ دوسرا کرایہ کے علاوہ سلامی لینا جس کو عرف عام میں پگڑی کہتے ہیں' یہ مستاجر سے وصول کرنا۔ یہ دونوں باتیں ناجائز ہیں اور مستاجر کی طرف سے یہ ظلم ہے کہ اس مکان یا دوکان کا مالک بن جاتا اور بغیر اذن مالک کے اس میں تصرف کرنا کہ اس کا آگے کسی اور شخص سے یہی معاملہ کرنا یا دوکان کا قبضہ نہ چھوڑنا یہ دونوں کام ظلم ہیں۔

صحیح شرعی طریقہ یہ ہے کہ موجر دوکان مستاجر کو دے یا مکان دے' اس پر جو کرایہ مقرر ہو (ماہوار) تو اس کا معاہدہ لکھا جائے اور یہ شرط طے ہو کر لکھی جائے کہ فلاں میعاد پر دوکان خالی کر دی جائے گی۔ پھر مستاجر اس دوکان پر قبضہ کر کے اپنا کاروبار شروع کرے یا مکان ہو تو اس میں سکونت کرے۔ جب ایک ماہ گذر جائے یا دو ماہ گذر جائیں تو موجر مستاجر سے کرایہ وصول کرے۔ پس جو لوگ چھ ماہ یا سال کا کرایہ پہلے وصول کرتے ہیں' اس کا ثبوت دلیل شرعی سے نہیں پایا گیا ہے۔ ہاں مستاجر کے نفع حاصل کرنے پر ان دنوں کا حساب کر کے موجر کرایہ وصول کرے تو یہ جائز ہے جو شرعی دلائل سے ثابت ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے: فان ارضعن لکم فاتوھن اجورھن "یعنی جن عورتوں نے تمہارے بچوں کو دودھ پلایا ہے' ان کو ان کی اُجرت دے دو۔" اس آیت میں دودھ پلانے کے بعد اُجرت دینے کا حکم وارد ہوا ہے۔ دوسرا واقعہ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ اور حضرت شعیب علیہما السلام کا ہے کہ جب حضرت موسیٰ حضرت شعیب علیہما السلام کے پاس پہنچے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا مزدور رکھا' اس شرط پر کہ وہ آٹھ سال ان کی بکریاں چرائیں تو ان کو اپنی ایک لڑکی نکاح میں دے دیں گے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ مدت پوری کرنے کے علاوہ دو برس اور خدمت کر دی تو ان کو حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی لڑکی نکاح کر دی۔ قرآن اس پر یوں ناطق ہے: فلما قضٰی موسٰی الاجل وسار باھلہ (الآیۃ) کہ حضرت موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور اپنی بیوی کو شہر مدین سے مصر کو لے

چلے۔

قرآن کریم کی ان دو دلیلوں سے ثابت ہوا کہ اُجرت کسی چیز پر بعد عمل کے ملتی ہے۔ آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی اراضی کو حصہ پر دیتے یا نقدی ٹھیکہ پر دیتے تو حصہ یا ٹھیکہ بعد پیداوار کے لیتے تھے اور باغوں کے میوے کھجور جب درختوں پر بیچ دیتے اور ان پھلوں پر آفت آجاتی اور پھل مارے جاتے تو ان پھلوں کا معاوضہ نہ لیتے کہ یہ لینا حرام تھا۔

منتقی الاخبار بمع نیل الاوطار جلد۔۵' ص۔۱۷۷ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا :

ان بعت من اخیک تمرا فاصابتھا جائحة فلا یحل لک ان تاخذ منھا شیئا بما تاخذ مال اخیک بغیر حق "یعنی اگر تو نے اپنے بھائی مسلمان کو کھجور فروخت کی اور اس کی کھجوروں پر آفت آگئی تو تیرے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ تو اس مشتری سے کوئی مال وغیرہ چیز لے۔ اگر تو نے اپنے بھائی مسلمان سے کوئی چیز ان کھجوروں کے معاوضہ میں لی تو اس کا مال بغیر حق شرعی کے کھایا جو حرام ہے۔"

پس جو لوگ باغ یا زمین ٹھیکہ پر دیتے ہیں اور ان میں پیداوار نہ ہو یا نقصان اولوں یا سیلاب یا بارش کی کثرت سے پیداوار پر آجائے تو اجارہ فاسد ہوا' مالک کو ٹھیکہ کی رقم لینا حرام ہے۔ اگر لے لی ہے تو واپس کرنے کا حکم ہے۔ پس جو لوگ دوکان یا مکان چھ ماہ یا سال بھر کی میعاد پر دیتے ہیں۔ اگر اس مدت کے درمیان دوکان یا مکان گر گیا یا مدت کے درمیان مستاجر مرگیا تو اجارہ فسخ ہو گیا۔ اب موجر کو لیا ہوا کرایہ مستاجر یا اس کے وارثوں کو واپس کرنا لازم ہو گا۔ صرف ان دنوں کا وصول کرے گا جن دنوں کا مستاجر نے فائدہ اٹھایا ہے۔ کیونکہ کرایہ اس دوکان اور مکان کی منفعت کی قیمت ہے۔ جب منفعت حاصل نہ ہوئی تو کرایہ بلا عوض موجر نے لیا ہے جو حرام ہے۔ چونکہ قبل منفعت کے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے' اس لیے پیشگی کرایہ لینا جائز نہیں ہے۔ جو علماء جائز کہتے ہیں' ان سے دلیل شرعی کا مطالبہ کرنا چاہیے جو واجب الاتباع ہو ورنہ ہمارے دلائل ناطق ہیں اور ان میں کسی فریق کو کوئی نقصان نہیں ہے۔ یہ تو کرایہ دوکان وغیرہ کا پہلے وصول کرنے کا شرعی حکم ہے' فتذکروا۔

دوسری چیز مالک دوکان نے کرایہ دار سے پگڑی کی رقم لی ہے۔ یہ خاص حرام ہے اور

بالاتفاق حرام ہے۔ ہاں حرمت کی علت اور سبب میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ سلامی کی رقم رشوت ہے' اس لیے حرام ہے۔ چنانچہ مولانا ثناء اللہ صاحب فاضل امرتسری رحمۃ اللہ علیہ جو علماء میں شیر پنجاب تھے' وہ اس کو رشوت قرار دیتے ہیں۔

فتاویٰ ثنائیہ جلد-۲' ص-۴۱۰ میں سوال یہ ہے کہ "آج کل سلامی کا رواج عام ہے' مکان کا مالک اپنے کرایہ داروں سے ہزار دو ہزار پہلے وصول کر لیتا ہے اور بعد میں ستر' اسی روپے ماہوار کرایہ پر دیتا ہے۔ جو روپیہ سلامی کے طور پر پہلے وصول کرتا ہے اس کو کرایہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ سلامی کا روپیہ شرعاً جائز ہے یا ناجائز ہے؟ (سائل ابو نعیم عبدالحکیم قصوری جامع اہل حدیث رنگون)

الجواب : اس قسم کا سودا ناجائز ہے کیونکہ یہ رشوت کے حکم میں ہے۔ (اخبار اہلحدیث ۱۸/ جولائی سنہ-۷ ۱۹۴۶ء)

آگے بحوالہ نذیریہ فتاویٰ جلد ثانی' ص-۳۱ اس کی یہ تشریح درج ہے۔ "رشوت کے معنی ہیں کسی شخص کو کچھ مال اس غرض سے دینا کہ وہ شخص امر باطل اور ناحق پر اس کی اعانت کرے۔ اس غرض سے جو مال دیوے وہ راشی ہے اور جو مال لیوے وہ مرتشی ہے اور جو شخص دونوں میں لین دین کی بات چیت کرے' وہ رائش ہے اور حدیث میں ان تینوں شخصوں پر لعنت آئی ہے اور امر حق کے حاصل کرنے کے لیے یا ظلم ظالم کے دفع کرنے کے لیے مال دینا رشوت نہیں ہے۔" پھر عربی عبارت بطور ثبوت لکھی ہے جو لغت کی کتاب مجمع البحار سے منقول ہے۔ اس کے بعد حضرت العلام مولانا عبدالسلام صاحب محدث دہلوی کی تصدیق درج ہے کہ "امر حق کے حصول کے لیے یا ظالم کے ظلم کے دفعیہ کے لیے مال دینا رشوت نہیں ہے۔"

اور میں کہتا ہوں کہ مالک مکان جو روپیہ کرایہ کے علاوہ کرایہ دار سے لیتا ہے وہ سود ہے جس کو عربی میں ربا کہتے ہیں۔ ربا لغت میں اس زیادتی کا نام ہے جو عوض سے خالی ہو اور عقد میں شرط کی جائے یہ قطعاً حرام ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا صاف ارشاد ہے : وحرم الربٰو "کہ بیاج (سود جو بلا عوض مال لیا گیا ہے اس) کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے۔ اس لیے ہر بیع اور سودا جو منع ہے وہ بیاج میں داخل ہے کہ اس میں جو مال لیا جاتا ہے' وہ کسی شرعی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ پس تمام عقود باطلہ اور فاسدہ کے ذریعے جو مال حاصل کیا

جاتا ہے وہ سود میں داخل ہے۔ کیونکہ کسی عقد اور سودا میں جو مال بغیر اذن شارع ﷺ کے زیادہ لیا جاتا ہے' وہ شرعی اصول سے قطعاً بیاج ہے۔ مکان' دوکان کا کرایہ اس کی منفعت کا عوض ہے اور سلامی کا روپیہ اس کرایہ سے جو زائد مال ہے' وہ صریح بیاج ہے جس کا سخت گناہ ہے۔

مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ ایک درہم بیاج کا لینا' کھانا چھتیس زنا سے بڑھ کر ہے اور بیاج لینے والا ملعون ہے' اس کو ستر گناہ ہوتے ہیں۔ اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ جیسے اپنی ماں سے زنا کرے۔ اور قیامت کے دن اس کے پیٹ میں سانپ بھرے جائیں گے۔ پس پگڑی کا روپیہ کھانے والے زانیوں سے زیادہ بدکار ہیں۔ اگر کوئی مولوی عالم ایسا گناہ کرتا ہے تو اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا اور اس کو امام بنانا درست نہیں ہے۔ اگر وہ کسی انجمن کا رکن ہے یا کسی عہدہ پر مقرر ہے تو اس کو فوراً معطل کر کے اس کا بائیکاٹ کر دینا چاہیے کیونکہ وہ حرام خور ہے۔ اس کی کوئی عبادت قبول نہیں ہے۔ کراچی' لاہور' لائل پور وغیرہ شہروں میں عوام کالانعام کے علاوہ نام نہاد علماء یہ معاملہ حرام کا کر رہے ہیں اور وہ شر العلماء میں شمار ہیں۔

سود دو قسم کا ہے۔ ایک متعارف اور دوسرا غیر متعارف ہے۔ متعارف یہ ہے کہ جو عام طور پر عقود باطلہ اور فاسدہ کے ذریعہ باطل طریقہ سے مال کھا رہے ہیں کہ یہ مسلمان بھائیوں کے مالوں پر دست درازی ہے اور غیر متعارف یہ ہے کہ مسلمان بھائی کی توہین اور بے عزتی کرنا ناحق کہ یہ مسلمان کی عزت پر دست درازی ہے۔ اس کو بیاج پر بیاج یعنی بہت بڑا بیاج قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ حدیث میں وارد ہے : قال صلی اللہ علیہ وسلم ان اربی الربا الاستطالہ فی عرض المسلم بغیر حق۔ (ابوداؤد) "یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سب بیاجوں سے بڑا بیاج مسلمان کی عزت پر ناحق دست درازی کرنا ہے۔" مثلاً اس پر تہمت وبہتان لگانا یا گالیاں دے کر اس کی بے عزتی کرنا وغیرہ۔ جب مومن کی عزت پر دست اندازی کرنے کو بہت بڑا بیاج قرار دیا تو اس کے مال پر دست درازی کرنا بھی بیاج ٹھہرا۔ اس لیے نیل الاوطار کی جلد ۵' ص ۱۸۹ پر یہ لکھا ہے کہ ویطلق الربا علی کل مبیع محرم "کہ بیاج کا اطلاق ہر اس چیز پر ہے جو بیع حرام سے حاصل ہوئی ہے۔" اجارہ کا عقد بھی مثل بیع کے

ہے۔ پس اس کا عقد حرام بھی سود ہے۔

(۲) جب نمبر(۱) کے جواب سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ حرام ہے تو آگے دوسرے' تیسرے آدمیوں کی طرف یہ سلسلہ چلانا بھی حرام در حرام ہے کیونکہ یہ وہی عقد باطل ہے جو سب میں چلا جا رہا ہے بلکہ پہلا شخص جس نے مالک دوکان سے پگڑی کا حرام عقد کیا' اس نے کرایہ اور سلامی کا روپیہ ادا کیا۔ اب وہ آگے مزید منافع پر یہ حرام عقد کرے گا۔ تو اس نے اپنی ادا کردہ رقم پر نفع لیا تو یہ صریح بیاج ہے۔ علاوہ اس کے اس شخص مستاجر نے بغیر اذن مالک کے دوسرے شخص سے یہ باطل معاملہ کیا تو یہ حرام ہونے کی دوسری وجہ پائی گئی۔ کیونکہ مالک دوکان نے صرف اس شخص سے اجارہ کیا تھا تو اسی کو خود اس دوکان میں کاروبار کرنا چاہیے تھا' دوسرے کو دینا یہ امانت میں خیانت ہے۔

اب دوسرے شخص نے دوکان میں کوئی ایسا کاروبار کیا جس سے دوکان کو نقصان پہنچا تو اجارہ فاسد ہوا۔ اس کا تاوان مالک دوکان اس شخص مستاجر سے لے گا جس کو اس نے دوکان دی تھی۔ اگر دوسرے مستاجر نے اس دوکان میں کوئی حرام کیا مثلاً قمار بازی' ڈھول باجے' راگ کے ساز یا تمباکو' افیون' بھنگ وغیرہ اشیاء محرمہ کا یا کسی رنڈی وغیرہ نے وہ دوکان لے لی' اس میں ناجائز کام شروع کیا جس سے مالک دوکان ناراض ہوا تو اجارہ فاسد ہو گیا۔ اگر مالک دوکان کوئی بے دین شخص ہوا جو ان کاموں پر راضی ہوا تو پھر سب گنہگار ہو گئے۔ کیونکہ یہ تعاون علی الاثم والعدوان ہے جو حرام ہے۔ بہرحال یہ پگڑی کا سلسلہ گناہ متعدی ہے جس قدر یہ عقد باطل کرتے جائیں گے سب حرام کے مرتکب ہوں گے اور ان کو حرام خور قرار دیئے جائیں گے تو اہل اسلام اتقیاء کو ان حرام خوروں سے بچنا واجب ہے۔

(۳) پگڑی والے مستاجر کا یہ عذر کہ مجھے اس دوکان کے کاروبار میں خسارہ ہوا ہے اس کو پورا کرنے کے لیے آگے پگڑی کا معاملہ کرتا ہوں تو یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ کیونکہ اس نے یہ سودا اجارے کا باطل شرط پر کیا ہے جس سے اجارہ باطل ہو گیا تو آگے باطل طریقہ سے اس خسارہ کو پورا کرنا باطل در باطل معاملہ ہے جو شرعاً جائز نہیں ہو سکتا۔ یہ مستاجر دگنے گناہوں کا مرتکب ہے جو مستوجب تعزیر شرعی ہے۔ انجمن کو چاہیے کہ کسی متشرع عالم کو بلا کر اس کو تعزیر لگا دیں' خصوصاً جب عالم ہو تو اس کو ضرور تعزیر لگانی چاہیے کیونکہ

عالم کا گناہ اور حرام معاملہ عوام پر برا اثر ڈالتا ہے۔

زیادہ تر لوگ علماء' بد عملوں اور ظالم حکومتوں کے اثرات سے متاثر ہو کر گمراہ ہوئے ہیں۔ علماء یہود کی طرح ہیر پھیر اور حیلوں تاویلوں سے حرام کو حلال کرتے ہیں۔ دوکان میں خسارہ پگڑی کی رقم دینے سے آیا' سو یہ مستاجر کا اپنا گناہ موجب خسارہ ہوا۔ پہلے حدیث گذر چکی کہ کھجوروں کے سودا میں خریدار ٹھیکیدار کو خسارہ آیا تو مالک باغ کو قیمت لینا حرام قرار دیا تو اس مستاجر کو کسی اور سے حرام کا سودا نہ کرنا چاہیے۔ مالک دوکان سے پگڑی کی رقم واپس لینی چاہیے اور عذر گناہ بدتر از گناہ سے آگے حرام کا معاملہ نہ کرنا چاہیے کہ خسارہ پگڑی کا معاملہ کرنے کا شرعی سبب نہیں بن سکتا۔ یہ نفسانی اور شیطانی قیاس مثل رائے اہل ہوئی کے ہے۔

اخبار الاعتصام میں جو فتویٰ شائع ہوا ہے وہ بالکل حق اور درست ہے کہ پگڑی کا معاملہ باطل اور اکل بالباطل کا موجب ہے' جس کی قرآن میں ممانعت ہے۔ لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل "کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ۔" پس پگڑی کا معاملہ باطل طریقہ ہے جو شریعت کی کسی نص سے ثابت نہیں اور نہ کسی اصول شرعی کے تحت آسکتا ہے۔ یہ مکاسب غیر شرعیہ سے ہے اور یہ اس زمانہ کی معاملہ میں بہت بڑی بدعت ضلالہ ہے جس کا ثبوت قرون ثلاثہ میں نہیں پایا گیا۔ نہ نصاً اور نہ اجتہاداً پس اس کا عامل بدعتی ہے جو اس کو شرع کی رُو سے جائز کہتا ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ عبدالقادر العارف الحصاری غفرلہ الباری

المرقوم ۲۴/ شعبان سنہ ۱۳۹۵ھ

اہلحدیث لاہور جلد ۷ شمارہ ۲۲

مورخہ ۱۴ مئی تا ۴ جون ۱۹۷۶ء

الاستفتاء

دوکانات ومکانات کی پگڑی حرام ہے

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ

(۱) ایک شخص کاروبار کرنے کے لیے دوکان کرایہ پر لیتا ہے اور مالک دوکان کرایہ کے

علاوہ پگڑی کی رقم الگ وصول کرتا ہے۔

(۲) ایک شخص دوکان یا مکان کرایہ پر لیتا ہے اور اسے کچھ مدت تک استعمال کرنے کے بعد پھر کسی اور شخص سے منہ مانگی پگڑی وصول کر کے اسے کرایہ پر دے دیتا ہے جبکہ دوکان کسی غیر کی ہے یا وقف جائیداد سے تعلق رکھتی ہے۔

(۳) بعض دفعہ پگڑی وصول کرنے والا یہ عذر پیش کرتا ہے کہ میں نے اس دوکان یا مکان سے چونکہ فائدہ نہیں اٹھایا ہے اور جس شریک کے ہمراہ کام کیا تھا' اس نے بھی نقصان پہنچایا ہے' لہٰذا خسارہ کے عوض میں' میں پگڑی وصول کرتا ہوں۔

کیا پگڑی کی یہ مروجہ صورتیں شرعاً جائز ہیں یا نہیں؟ علماء کرام کی خدمت میں گذارش ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں مندرجہ بالا مسئلہ کو حل فرمائیں' بینوا توجروا۔

الجواب از مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی لاہور۔

(۱) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الجواب باللّٰہ التوفیق۔

سوال میں مذکورہ پگڑی وصول کرنے کی سب صورتیں اکل اموال الناس بالباطل (ناجائز طریقوں سے لوگوں کے مال ہتھیانے) کے ضمن میں آتی ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ "پگڑی" کسی چیز کا کوئی معاوضہ نہیں۔ اگر تجارت کا کوئی اڈا یا مکان کا محل وقوع کوئی قدر وقیمت رکھتے ہیں تو وہ اصل مالک کا حق ہے نہ کہ کرایہ دار کا۔ یہ کرایہ دار صاحب پگڑی کی مزید رقوم کے معاوضہ میں متبادل کرایہ دار کو کیا چیز دیتے ہیں؟ تجارت کے ذیل میں تو یہ "کاروبار" آتا نہیں جس میں "معاوضہ" ضروری ہے۔ التجارة فی اللغة عبارة عن المعاوضة (احکام القرآن لابن العربی المالکی ص۔۴۰۸ جلد اول طبع جدید)۔

لہٰذا سوال میں مذکورہ "پگڑی" شرعاً ناجائز ہے۔ لقولہ تعالیٰ یاایھا الذین امنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارة عن تراض منکم ولا تقتلوا انفسکم ان اللّٰہ کان بکم رحیماO (النساء : ۲۹) "یعنی ایمان والو! اپنے مالوں کو (یعنی ایک دوسرے کے مالوں کو) باطل (ناجائز) طریقوں سے نہ کھاؤ (ہاں) تجارت ہو خوش دلی سے (تو ٹھیک ہے) اور خود کو تباہ مت کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر رحیم ہے۔"

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے آٹھویں صدی ہجری کے مفسر حافظ اسماعیل بن کثیر رحمہ اللہ

لکھتے ہیں : ینهی الله تبارک وتعالٰی عباده المؤمنین ان یاکلوا اموال بعضهم بعضا بالباطل ای بانواع المکاسب التی هی غیر شرعیة کانواع الربا والقمار وهاجری حجری ذالک من سائر صنوف الحیل وان ظهرت فی غالب الحکم الشرعی الخ۔ (جلد اول' ص۔۴۷۹)

تفسیر ابن جریر (جلد۔۵' ص۔۳۰ طبع جدید) میں امام سدی مفسر سے منقول ہے : نهٰی من اکلهم اموالهم بینهم بالباطل بالربا والقمار والنجس والظلم الا ان تکون تجارة الخ۔

تفسیر روح المعانی (جلد۔۲' ص۔۷۷' طبع اول) میں ہے : وعن الحسن (الباطل) هو ما کان بغیر استحقاق من طریق العواض' انتهٰی۔

احکام القرآن للجصاص (جلد۔۲' ص۔۲۰۹) میں ہے : وقال ابن عباس والحسن ان یاکله بغیر عوض انتهٰی یعنی "باطل" سے مراد بلا کسی عوض کے کسی کا مال حاصل کر لینا ہے۔

ولا تقتلوا انفسکم الایة کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں : ای بارتکاب محارم الله وتعاطی معاصیه واکل اموالکم بینکم بالباطل (ان الله کان بکم رحیما) فیما امرکم به ونهاکم عنه۔

تفسیر ابن جریر (جلد۔۵' ص۔۳۵) میں ہے : ان الله تبارک تعالٰی حظر اکل مال بعضکم علٰی بعض بالباطل الا عن تجارة یملک بها علیه رضاه وطیب نفس لولا ذالک هلکتم واهلک بعضکم بعضا قتلا وسلبا وغصبا انتهٰی۔

خلاصہ سب عبارتوں کا یہ ہے کہ جائز تجارت (اور اجارہ) کے سوا دوسرے ایسے کاروبار جن میں سود' قمار اور ان جیسے دوسرے ظالمانہ طور سے مال ہتھیانے کے ذرائع اختیار کئے گئے ہوں' سب "باطل" کے ذیل میں آتے ہیں جو اگر رواج پا جائیں تو نتیجتاً معاشرہ میں تباہی مچ جاتی ہے۔ بنابریں ایسے رواجوں پر عمل کرنے سے اس وعید کا خطرہ ہے جس کا ساتھ ہی ذکر فرمایا گیا ہے : ومن یفعل ذالک عدوانا وظلما فسوف نصلیه نارا (النساء : ۳۰) هذا ما عندنا والله اعلم بالصواب۔

(۲) صورت مسئولہ میں واضح ہو کہ ایک کرایہ دار کا دوسرے کرایہ دار کو مکان یا دوکان "پگڑی" پر دینا جس کا آج کل عام رواج پایا جاتا ہے کہ ایک کرایہ دار مکان یا دوکان دوسرے

کرایہ دار کو دیتا ہے اور اس کے بدلہ میں کافی رقم بطور "پگڑی" وصول کرتا ہے' یہ موجودہ زمانہ کی ایجاد کردہ بدعت ہے۔ جس کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں بلکہ یہ اپنے بھائی کا ناجائز طور پر مال کھانا ہے جس سے کتاب وسنت میں منع فرمایا گیا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے : من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد ۔ (متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ شریف) "یعنی جو شخص ہمارے دین میں کوئی ایسی چیز نکالے جو اس میں جائز نہیں وہ مردود ہے۔" لہٰذا یہ ایک امر منکر ہے جس سے پرہیز کرنا لازم ہے' واللہ اعلم۔

تائید از استاذ العلماء حافظ محمد صاحب مدظلہ العالی گوجرانوالہ : بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ (۱) الجواب۔ پہلی صورت میں کرایہ کے علاوہ بھی رقم وصول کر سکتا ہے وہ سب رقم کرایہ میں شمار ہو گی۔ (۲) دوسری صورت میں چونکہ یہ مالک مکان نہیں' اس واسطے پگڑی کی رقم وصول نہیں کر سکتا۔ (۳) یہ عذر پگڑی کو جائز نہیں بناتا کیونکہ یہ شخص مالک نہیں' کرایہ مالک کا حق ہے اور پگڑی کی رقم اس سے زائد ہے۔ یہ محض قبضہ کا حق سمجھ کر وصول کرتا ہے (جو کہ حرام ہے)۔

العبد : محمد گوندلوی گوجرانوالہ (۱۳ شعبان سنہ ۱۳۹۵ھ)

الاعتصام لاہور

حَدیثِ ربٰو

بعض ملکوں میں جو سود کی وبا پھیلی ہے اور حرام ذرائع سے لوگ مال کما رہے ہیں' اس کا سبب علماء اہل رائے ہیں۔ انہی کے فتووں کی بنا پر بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کے سلسلے شروع ہو کر ملکوں میں حرام پھیلا ہے۔ اب اس سیلاب کا روکنا علماء اہل حق کو ایسا ہی مشکل ہے جیسا کہ کسی حکومت کو ملک کے دریاؤں اور سمندروں کے سیلابوں کا روکنا دشوار ہے بلکہ اس سے بھی دشوار تر ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

پانی میں ہے آگ کا لگانا دشوار' بہتے ہوئے دریا کو پھیر لانا دشوار
دشوار تو ہے مگر نہ اتنا جتنا بگڑی ہوئی قوم کا بنانا دشوار

سود کی حرمت کتاب وسنت کے دلائل قطعیہ سے ثابت ہے اور اس پر تمام امت اسلامیہ کا اجماع ہے اور یہ حرمت عام اور مطلق ہے خواہ اہل اسلام دارالاسلام میں بستے

ہوں یا دارالکفر میں مقیم ہوں۔ کسی قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت دلیل سے مسلمانوں کو دارالکفر یا دارالحرب میں سود لینے کی اجازت یا اباحت ثابت نہیں ہے۔ صرف ایک روایت مخدوش بعض کتب فقہ میں مروی ہے جو علمائے اہل رائے کے پاس سب سے بڑی دستاویز ہے اور وہ یہ ہے : عن مکحول عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لا ربٰو بین المسلم والحربی۔ (کتاب الام للشافعی)

بعض اہل رائے نے یہ لکھا ہے کہ اس روایت کو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بروایت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نقل کیا ہے۔ مصنف ہدایہ نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے جس پر درایہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ میں یہ لکھا ہے کہ "لم اجدہ" میں نے اس حدیث کو صحیح سند کے ساتھ کتب متعبو میں نہیں پایا ہے۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ذکر کیا ہے اور اسی طریق سے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا : قال ابو یوسف وانما قال ابو حنیفۃ ھذا لان بعض المشیخۃ حدثنا عن مکحول عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لا ربٰو بین اھل الحرب اظنہ قال واھل الاسلام "یعنی اہل حرب اور اہل اسلام کے درمیان کوئی سود نہیں۔"

تمام فقہاء مجوزین سود نے اسی حدیث پر دارومدار اپنے مذہب کا رکھا ہے۔ اس دلیل مخدوش کے کئی جواب ہیں :

اول یہ کہ یہ روایت بالکل ناقابل احتجاج ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے پہلے راوی قاضی ابو یوسف ہیں جن کے متعلق میزان الاعتدال مصری جلد۔۳، ص۔۳۲۱، تذکرۃ الحفاظ مطبوعہ دائرۃ المعارف ص۔۲۶۷ میں ہے کہ قال الفلاس صدوق کثیر الغلط وقال البخاری ترکوہ "یعنی امام فلاس نے کہا ہے کہ ابویوسف ویسے تو سچے ہیں مگر علم روایت میں غلطیاں بہت کرتے ہیں اور امام الجارحین بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ محدثین نے ان کو ضعیف جان کر ترک کر دیا ہے۔"

کتاب الضعفاء مطبوعہ انوار احمدی ص۔۳۸ میں ہے : یعقوب بن ابراھیم القاضی سمع ابن السائب ترکہ یحییٰ وابن مھدی وغیرھما "یعنی ابو یوسف یعقوب قاضی نے ابن السائب سے روایت کی ہے مگر امام الناقدین یحییٰ اور ابن مہدی وغیرہ ائمہ محدثین نے ان کو ترک کر دیا ہے۔" یعنی کتب حدیث میں ان سے روایت نہیں لی۔ یہی وجہ ہے کہ کتب

حدیث متداولہ میں ان سے روایت نہیں لی گئی۔ یہ متروک الحدیث ہیں۔ جب یہ راوی ضعیف ہیں تو یہ روایت مخدوش ہے۔

دوسرے راوی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کے متعلق میزان الاعتدال مصری جلد۔۳' ص۔۲۳۷ میں ہے : ضعفه النسائی من جهة حفظه وابن عدی وأخرون "یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو حافظہ کی رُو سے امام نسائی اور ابن عدی اور دیگر محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔"

تمہید شرح موطا جلد۔۳' ص۔۲۷۲ میں حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں : وهو سیئی الحفظ عند اهل الحدیث "یعنی امام ابوحنیفہ محدثین کے نزدیک سیئی الحفظ ہیں۔"

الفیہ عراقی مطبوعہ فاروقی کے حاشیہ نمبر۔۴۵ میں ہے : فیکون قادحا کما فسر الذهبی وابن عبدالبر وابن عدی والنسائی والدارقطنی فی ابی حنیفة انه ضعیف من قبل حفظه "یعنی جرح مفسر ہو گی تو راوی میں قدح پیدا کرے گی جیسا کہ ذہبی اور ابن عبدالبر اور ابن عدی اور نسائی اور دارقطنی نے ابوحنیفہ کے بارے میں جرح مفسر کی ہے کہ وہ حافظہ کی وجہ سے ضعیف ہیں۔"

تخریج ہدایہ حافظ ابن حجر فاروقی کے حاشیہ ص۔۹۳ میں ہے : عن ابی حفص عمر بن علی قال ابو حنیفة لیس بحافظ مضطرب الحدیث ذاهب الحدیث "یعنی ابو حفص عمر بن علی نے کہا ہے کہ امام ابو حنیفہ حدیث میں مضطرب ہیں' ان کو حدیث یاد نہیں رہتی تھی۔"

کتاب الضعفاء والمتروکین امام نسائی مطبوعہ انوار احمدی ص۔۳۵ میں ہے : ابو حنیفة لیس بالقوی فی الحدیث وهو کثیر الغلط والخطاء علی قلة روایته "یعنی امام ابوحنیفہ علم حدیث میں قوی نہیں ہیں اور وہ باوجود قلت علم روایت کے حدیث میں بہت غلطی اور خطا کرنے والے ہیں۔"

دراسات اللبیب مطبوعہ لاہور ص۔۱۳۳ میں ہے : ان ابن القطان جرح الحدیث الاول وقال علته ضعف ابی حنیفة فی الحدیث "یعنی امام ابن قطان رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث اول پر جرح کی ہے اور اس کی علت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا علم حدیث میں ضعیف ہونا ہے۔"

سنن دارقطنی فاروقی ص۔۱۲۲ میں بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ضعیف قرار دیا ہے۔ تخریج

ہدایہ فاروقی کے حاشیہ ص۔۳۱ میں ہے کہ علی بن مدینی کے بیٹے عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ علی بن مدینی (استاد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ) سے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا حال پوچھا تو انہوں نے ان کو ضعیف بتایا اور کہا کہ پچاس احادیث میں انہوں نے خطا کی ہے۔

نیز مذکورہ کتاب میں ہے کہ ابوبکر بن داؤد نے کہا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کل ڈیڑھ سو احادیث روایت کی ہیں جن میں سے نصف میں ان سے بھول واقع ہوئی ہے۔ دار قطنی ص۔۳۰۷ میں ہے کہ ابن ہیثمہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین سے سنا کہ کان الثوری یعیب علی ابی حنیفة حدیثا کان یرویه "یعنی امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر ایک حدیث میں عیب ظاہر کرتے تھے۔"

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الضعفاء میں فرمایا ہے: سکتوا عن رایه وحدیثه "یعنی محدثین نے ان کی رائے اور حدیث لینے میں سکوت کیا ہے۔"

امام رازی نے رسالہ ترجیح شافعی میں یہ لکھا ہے: کان یقبل المجاهیل والمقاطیع والمراسیل "یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مجہولہ' مقطوعہ اور مرسل روایتیں اپنے شہر کی لے لیتے تھے اگرچہ وہ ضعیف ہوں اور دوسرے شہروں کی روایتوں کو نہ لیتے تھے اگرچہ وہ صحیح ہوں۔"

جب اتنے محدثین نے جرح کی ہے اور جرح بھی مفسر ہے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ علم حدیث میں ضعیف ثابت ہوئے۔ باقی آپ کا تقویٰ اور فقاہت اور شہرت علیحدہ امور ہیں۔ یہاں علم حدیث کی رُو سے محدثین کا فیصلہ لیا جائے گا کہ وہ ضعیف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتب متداولہ میں ان سے روایات ثابت نہیں ہیں۔ حالانکہ دیگر ائمہ امام شافعی' امام احمد رحمہما اللہ وغیرہ سے بکثرت احادیث کتب متداولہ میں ہیں۔ خصوصاً امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی تو موطا مشہور آفاق کتاب ہے۔ جب اس روایت اہل حرب کے دو راوی ضعیف ہیں تو یہ روایت قرآن کی قطعی الثبوت آیات اور احادیث صحیحہ کے مقابلہ میں بالکل ناقابل قبول ہے۔

دوسرا یہ کہ اس کی سند میں "بعض المشیخة" راوی مجہول ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ کون ہے۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی یہ روایت ناقابل التفات ہے۔

سوم یہ کہ مکحول نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ مکحول تابعی ہے' صحابی نہیں۔ لہٰذا یہ روایت مرسل ہے اور مرسل قسم ضعیف سے ہے جیسا کہ اصول حدیث میں

صاف تصریح ہے۔ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے محلّٰی جلد۔۹، ص۔۲۲ میں فرمایا ہے : ولا یجوز القول فی الدین بالمرسل "یعنی دین میں مرسل حدیث کی بنا پر کوئی بات کہنی جائز نہیں ہے۔"

پھر یہ حدیث عراقی ہے، اس کا اصل حجاز میں جو مرکز رسالت ہے، نہیں پایا گیا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے : اذا خرج الحدیث عن الحجاز القطع نخاعه "یعنی جب کوئی حدیث خارج از حجاز ہو گی تو اس کا مغز جاتا رہا۔" امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی فرمایا ہے۔ (تدریب الراوی) ابوداؤد میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے : لیس لحدیث اهل الکوفة نور۔ "اہل کوفہ کی روایت (جس کی اصل حجاز میں نہ ہو) میں نور نہیں ہے۔" وہ ظلمت سے پر ہے۔

تدریب الراوی میں امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے : ان فی حدیث اهل الکوفة زغلا کثیرا "اہل کوفہ کی بیان کردہ احادیث میں بڑی کدورت ہے۔" پس یہ حدیث اہل کوفہ کی ہے جس کا اصل حجاز میں نہیں ہے تو یہ بے نور پراز کدورت ہے، اس سے استدلال صحیح نہیں ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث ظنی الثبوت ہے اور قرآن واحادیث کتب صحاح متفقہ قطعی الثبوت ہیں جو سود کی حرمت پر بالعموم اور بلااطلاق دلالت کرتی ہیں تو یہ خبرواحد اور پھر مخدوش دلائل عامہ ومطلقہ کی مخصص نہیں بن سکتی۔ اصول فقہ کا یہ مشہور مسئلہ ہے کہ خبر واحد سے زیادت علی القرآن جائز نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے سیرت النعمان میں اس پر حنفی مذہب کی حمایت میں بڑی بحث کی ہے۔

اور زیادت علی الکتاب دو معنوں میں مستعمل ہے۔ ایک تخصیص عام، دوم تقیید مطلق۔ عند الحنفیہ خبرواحد سے قرآن پر زیادت ہر دو معنی سے ناجائز ہے۔ مولوی اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنے رسالہ رافع الضنک ص۔۶ پر اس کو تسلیم کیا ہے کہ "طرفین (امام ابوحنیفہ و امام محمد رحمہما اللہ) کی دلیل یا خبرواحد ہے یا قیاس جو کہ ظنی ہیں اور قطعی کی تقدیم کا وجوب ظنی پر اجماعی ہے۔"

مولانا مودودی صاحب جو سابقہ جماعت اسلامی کے امیر ہیں، وہ اپنے رسالہ کے ص۔۱۱۲ میں فرماتے ہیں : "ایک طرف آیت قرآنی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد صریح و صحیح اقوال اور عہد نبوی کا ثابت شدہ عمل درآمد ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے نہ

صرف سود بلکہ تمام عقود فاسدہ مطلقاً ناجائز ہیں اور اس میں مسلم وغیر مسلم یا حربی وذمی کا کو
امتیاز نہیں ہے۔ دوسری طرف صرف ایک مرسل حدیث ہے جو ان سب کے خلاف حر
اور مسلم کے درمیان صرف سود کو حلال ثابت کر رہی ہے۔"

پس اس رُو سے بھی یہ حدیث ناقابل استدلال ہے۔

عبدالقادر عارف الحصاری

صحیفہ اہل حدیث کراچی

جلد۔۴۰' شمارہ۔۲۴' مورخہ ۱۶/ ذوالحجہ سنہ۔۷۹ ۱۳ھ

زمین ایک بیگھے کی بجائے دو بیگھے الاٹ کرا لے تو جائز ہے یا نہیں؟

سوال اگر کسی کی زمین ایک بیگھ ہو اگر اثر ورسوخ کی وجہ سے کوئی آدمی دو بیگ
الاٹ کروا لے جائز ہیں یا نہیں؟ واپسی ڈاک مطلع فرمائیں' ضروری تاکید ہے۔

کلثوم بی اجرانے والی چک نمبر۔۲۵ ضلع سرگو

جواب جس قدر زمین کا حق ہو' اسی قدر حاصل کرو۔ اثر ورسوخ سے زیادہ لینی ناج
ہے۔ خود حکومت رحم کر کے زیادہ دے دے تو درست ہے۔

کتبہ عبدالقادر حصاری

فتاویٰ ستاریہ' جلد چہارم' ص۔ ۸۳

الوراثة

لاولد متوفیہ کے ترکہ کے بارے میں سوال

(سوال) زید کی عورت لاولد فوت ہوئی جس کے وارثان والدین زندہ ہیں اور صرف زید
س کی عورت منکوحہ مدخولہ تھی، زندہ ہے۔ (۱) جہیز جو کہ والدین نے دیا (۲) زیورات جو کہ
س کے خاوند نے خود بنوائے تھے۔ اب متوفیہ کے والدین اور شوہر میں صرف پارچہ جات اور
زیورات کا جھگڑا ہے۔ ازروئے شرع شریف فیصلہ فرمایا جائے۔

(مولوی) اللہ بخش (صاحب) ٹھیکیدار موضع محمد پور

(جواب) جو عورت لاولد فوت ہوئی اور اپنا ملک چھوڑ گئی ہے، وہ اس کا ترکہ ہے۔ اس کا
ارث زید اس کا خاوند ہے، اس کو نصف حصہ ملے گا۔ باقی ترکہ اس کے والدین کا ہے۔ خاوند
نے جو زیورات بنا کر دیئے اور والدین نے جو کچھ دیا وہ عورت کا ملک ہو گیا۔ اب اس کا ورثہ
ہ گا جو بمطابق شرع تقسیم کرنا چاہیئے، جھگڑنے کی ضرورت نہیں جو ظلم کرے گا وہ پکڑا
ئے گا، والسلام۔

تبہ عبدالقادر الحصاری غفرلہ الباری۔

ی ستاریہ جلد چہارم، ص۔۱۴۴

کیا ایسی لڑکی وراثت سے محروم کی جاسکتی ہے

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں ایک عورت بال بچہ دار اور خاوند والی
ر کے ایماء پر) اپنے والدین کو سخت تنگ کرتی ہے اور بہت نافرمان ہے، بد زبانی اور طرح
ح کے غلط الزام اور بہتان باندھتی ہے۔ اپنے آپ کو حرامی اور غیروں کی طرف منسوب
ی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو ہندوؤں کی لڑکی کہتی ہے۔ والدین کے مرنے کے انتظار
ہے اور مال جبراً و چوری کھا رہی ہے۔ والدین اس سے تنگ آکر اپنے مال متروکہ اور

منقولہ اور غیر منقولہ سے اسے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ازروئے شرع ایسی لڑکی کو محروم کرسکتے ہیں؟ بینوا توجروا۔ (محمد نسین خان بابرے ۷۹۔کٹڑی مصری خان ملتان)

الجواب بعون الوهاب: الحمدللہ رب العالمین۔ اما بعد فاقول وباللہ التوفیق۔ بشرط صدق سوال و صحت صورت مسئولہ جواب اس کا یہ ہے کہ وہ عورت جس کا ذکر سوال میں ہے' وہ عاق ہے اور اپنے والدین سے اعراض کرنے اور اپنے آپ کو حرامی کہنے اور والدین پر بلا ثبوت شرعی بہتان لگانے اور ان کو تنگ کرنے اور ستانے کی وجہ سے وہ کافرہ ہے۔ حدیث میں آیا ہے : من رغب عن ابیه فقد کفر یعنی جو شخص اپنے والدین سے اعراض کر جائے وہ کافر ہے اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہے۔ نیز جب وہ یہ کہتی ہے کہ میں حرامی ہوں اور غیروں کی طرف اپنی نسبت کرتی ہے اور اپنے آپ کو ہندوؤں کی لڑکی کہتی ہے تو وہ خود ہی اپنے والد کی وراثت کی حقدار نہیں بنتی۔ اس کو تو اسی درہ کی سزا پنچایت اور مسلمانوں کے اہل حل وعقد مل کر لگائیں اور جائیداد سے محروم کر دیں اور باپ اپنی جائیداد فروخت کر دے یا ویسے دیگر اولاد مطیع کو ہبہ کر دے یا دیگر کسی کارخیر میں صرف کر دے تو یہ جائز ہے۔ بشرطیکہ ان والدین کی اور اولاد صالحہ نہ ہو۔ اگر موجود ہو تو وہ جائیداد کی حق دار ہے۔

ہاں اگر اس فیصلہ سے پہلے لڑکی شرعی سزا پا کر اپنے ظالمانہ رویہ اور عقوق سے اور الزام و بہتان بازی سے توبہ کر کے اپنے والدین سے معافی مانگ کر مصالحت کر لے تو پھر شرعی حصہ سے وراثت والدین کی حقدار بن سکتی ہے ورنہ نہیں۔ ہبہ کے بارہ میں ابوداؤد کی روایت میں یہ آیا ہے : ان لهم علیک من الحق ان تعدل بینهم ولک علیهم من الحق ان یبروک۔ یعنی باپ پر اولاد کا یہ حق ہے کہ ہبہ کرنے اور جائیداد دینے میں ان پر برابری کرے جیسے اولاد پر یہ حق ہے کہ وہ باپ پر احسان اور نیکی کریں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اگر اولاد اپنے ماں باپ کے ساتھ احسان اور حسن سلوک نہ کرے تو اس نے اپنے والدین کا حق ادا نہ کیا۔ پس اس پاداش میں والدین عاق اولاد کا حق ادا نہ کرے تو یہ باصول جزاء سیئة سیئة مثلها کہ برائی کا بدلہ اسی طرح کی برائی سے عاق اولاد کو محروم کر دے تو یہ جائز ہے۔ هذا ماعندی واللہ اعلم بالصواب۔

از عبدالقادر عارف حصاری سلمہ الباری

اہل حدیث لاہور جلد-۷' شمارہ-۱۵ مورخہ ۹/ اپریل سنہ-۱۹۷۶ء

کیا بعض اولاد کو چھوڑ کر بعض کو بذریعہ تملیک جائیداد دی جا سکتی ہے؟ شرعاً یہ عمل کیسا ہے؟

(سوال) کیا فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم ﷺ کہ ایک شخص اہلحدیث (جس کی حقیقی اور صلبی اولاد ایک بیٹا اور تین بیٹیوں پر مشتمل ہے) نے اپنی ایک حقیقی اور صلبی بیٹی کو اپنی تمام جائیداد سکنی اور زرعی سے محروم کر کے اپنے ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کو بطور وراثت اپنی حین حیات میں للذکر مثل حظ الانثیین (الایہ) تملیک کر دی ہے اور تیسری بیٹی جو دیندار' متشرع اور صوم وصلوٰۃ کی بھی پوری پابند ہے' اس کو بالکلیہ اپنی ہر قسم کی جائیداد منقولہ غیر منقولہ سے محروم کر دیا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے' اس کے بارے میں کیا احکامات ہیں؟

(۲) کیا ایسے شخص کی اقتداء بالصلوٰۃ جائز ہے؟

(۳) جن اشخاص کو یہ جائیداد اسی طرح منتقل کر دی گئی ہے کیا ان کے لیے شرعاً اس جائیداد پر قابض اور متصرف رہنا جائز ہے؟ جبکہ وہ خود بھی اہل حدیث ہونے کے مدعی ہیں اور اس صورت حال کا بھی علم رکھتے ہیں؟

والسلام ---- محمد منیر کاشف حسین آگاہی ملتان شہر

الجواب بعون الوهاب: الحمد للہ رب العالمین۔ امابعد فاقول وباللہ التوفیق۔ واضح ہو کہ بشرط صدق سوال وصحت صورت مسئولہ جواب باصواب اس کا یہ ہے کہ اس شخص نام نہاد اہل حدیث کا یہ معاملہ دو طرح سے باطل ہے۔ ایک یہ کہ اس نے اپنی حین حیات میں جملہ جائیداد بطور وراثت تقسیم کر دی ہے' یہ طریقہ باطل ہے کیونکہ ورثہ کی تقسیم بعد موت کے ہوا کرتی ہے۔ زندگی میں جو جائیداد تقسیم کی جائے اس کو ہبہ اور عطیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہبہ اور ورثہ میں فرق بین ہے۔ ورثہ میں اصول شرعی یہ ہے: "للذکر مثل حظ الانثیین" کہ مرد کو عورت کے مقابلہ میں دگنا حصہ ملتا ہے اور عورت کا متروکہ مال اس کا قرضہ اور وصیت پورا کرنے کے بعد تقسیم ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔ ہبہ اور عطیہ انسان کی زندگی میں ہوا کرتا ہے اور اس میں اصول شرعی یہ ہے کہ ہبہ اور عطیہ سب اولاد ذکور اور اناث میں بطور مساوات

یعنی برابری کے ساتھ ہوتا ہے- اس میں مرد عورت کا فرق کر کے کمی بیشی کرنا ناجائز ہے-

چنانچہ صحیح بخاری شریف جلد ا' ص- ۳۵۲ مطبوعہ اصح المطابع دہلی کے باب الاشہاد فی الہبہ میں یہ حدیث درج ہے: عن عامر قال سمعت النعمان بن بشیر وھو علی المنبر یقول اعطانی ابی عطیة فقالت عمرة بنت رواحة لا ارضٰی حتی تشھد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فاتٰی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فقال انی اعطیت ابنی من عمرة بنت رواحة عطیةً فامرتنی ان اشھدک یارسول اللّٰہ! قال اعطیت سائر ولدک مثل ھذا قال لا قال فاتقوا اللّٰہ واعدلوا بین اولادکم قال فرجع فرد عطیته-

یعنی عامر سے روایت ہے' انہوں نے بیان کیا کہ میں نے یہ حدیث نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے سنی ہے- درآنحالیکہ وہ منبر پر تشریف فرما تھے- انہوں نے یہ فرمایا کہ میرے باپ بشیر بن سعید رضی اللہ عنہ نے مجھے عطیہ دیا- اس پر میری والدہ عمرہ بنت رواحہ نے کہا کہ میں اس معاملہ کو اس وقت تک پسند نہیں کرتی جب تک جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر گواہ نہ بنا لئے جائیں- تب میرا باپ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے یوں عرض کی کہ میں نے اپنے اس بیٹے کو جو عمرہ بنت رواحہ کے شکم سے ہے' ایک عطیہ دیا ہے اور اس نے یہ کہا ہے کہ آپ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عطیہ پر گواہ کر لیں تب مجھے منظور ہے- اس لیے میں حاضر خدمت ہوا ہوں- تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم نے تمام اولاد کو اسی طرح عطیہ دیا ہے یا صرف اس ایک کو؟ بشیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ باقی اولاد کو میں نے کچھ نہیں دیا- تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کا خوف کرو اور اس سے ڈرو اور تم سب اولاد میں انصاف سے کام لو کہ سب کو برابر عطیہ دو- (یہ ظلم ہے میں اس پر گوا نہیں بنتا) تب بشیر رضی اللہ عنہ نے اپنا دیا ہوا عطیہ واپس لے لیا-

تمام روایات اس قصہ میں جو وارد ہیں' ان میں سے ہر ایک میں کچھ الفاظ زیادہ ہیں- جن سے اس قصہ کی پوری تفصیل سامنے آجاتی ہے- ایک روایت میں ہے کیا تجھے یہ پسند ہے کہ تیرے ساتھ کوئی شخص برابری کا معاملہ کرے؟ بشیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں- آپ نے فرمایا پھر تم بھی اپنی اولاد میں برابری کرو- دیگر روایات میں ہے لا اشھد علٰی جورٍ کہ میں اس ظلم پر گواہ نہیں بنتا اور دیگر روایت میں ہے کہ وہ عطیہ ایک غلام تھا جو نعمان رضی اللہ عنہ کو بشیر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا- اور بشیر رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے نعمان رضی اللہ عنہ کو بھی ساتھ لے گیا تھا کہ اپنے اس بیٹے

کو غلام ہبہ کر رہا ہوں۔ آنحضور ﷺ نے اس معاملہ کو مردود قرار دے کر عطیہ واپس کرا دیا۔

منتقی میں اس حدیث پر یوں باب منعقد کیا ہے "باب التعدیل بین الاولاد فی العطیة والنھی ان یرجع احد فی عطیته الا الوالد" یعنی یہ باب اس مسئلہ کے بیان میں ہے کہ چیزیں دینے میں سب اولاد میں برابری کرنی چاہیے اور عطیہ وہبہ کسی کو دے کر واپس لینا منع ہے لیکن باپ اپنی اولاد کو کوئی چیز ہبہ کر دے تو وہ واپس لے سکتا ہے' جیسے بشیر صحابی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کا فیصلہ مان کر اپنا عطیہ نعمان رضی اللہ عنہ سے واپس لے لیا تھا۔

اب اگر وہ شخص نام نہاد اہل حدیث سچا اہل حدیث ہے اور اس نے جہالت سے اپنی جائیداد کم وبیش تقسیم کر دی ہے اور ایک حقیقی لڑکی کو محروم کر دیا ہے تو اب وہ اپنی اولاد سے سب جائیداد واپس لے کر پھر عدل و انصاف سے سب میں برابر تقسیم کر دے اور کسی کو محروم نہ کرے ورنہ ظالم قرار پائے گا۔ اس کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے کہ ظالموں کو بروز قیامت سخت عذاب ہو گا۔ اولاد میں تسویہ کا حکم ہے اور یہ تسویہ واجب ہے۔

نیل الاوطار جلد۔۶' ص۔۷ میں ہے : تمسک به من اوجب التسویة بین الاولاد فی العطیة کما صرح البخاری یعنی اس حدیث سے دلیل لی ہے' ان علماء نے جو اولاد کو عطیہ میں برابری کو واجب قرار دیتے ہیں جیسا کہ امام بخاری نے تصریح کر دی ہے۔ یہی محدثین اور اہل حدیث کا مذہب ہے جو علماء اہل الرائے کم وبیش ہبہ کرنا اور ہبہ کے بعد واپس لینے کو باپ کے لیے ناجائز کہتے ہیں۔ ان کا قول خلاف حدیث کے مردود ہے۔ پھر اس نام نہاد اہل حدیث نے دوسرا ظلم یہ کیا کہ اپنی لڑکی صلبی کو ہبہ اور وراثت پدری سے محروم کر دیا۔ حالانکہ وہ مسلمان موحدہ پابند صوم وصلوٰۃ ہے اور اس نے لڑکی پارسا کا ورثہ قطع کیا ہے' یہ سخت ظلم ہے۔

مشکوٰۃ ص۔۲۶۶ میں یہ حدیث ہے :عن انس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم من قطع میراث وارثه قطع اللّٰہ میراثه من الجنة یوم القیامة رواہ ابن ماجة ورواہ البیھقی فی شعب الایمان عن ابی ھریرۃ۔ اور ابن ابی شیبۃ وسعید بن منصور میں سلیمان بن موسیٰ سے مرفوعاً یہ روایت یوں ہے :من قطع میراثا فرضه اللّٰہ ورسوله قطع اللّٰہ میراثه من الجنة یعنی جو اللہ اور رسول کی مقرر کردہ میراث کسی وارث کی قطع کر کے اس کو محروم کر دے گا' اللہ تعالیٰ اس کو جنت سے محروم کر دے گا۔ نیز مسند احمد' موطا' مسلم' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ ایک شخص نے مرض موت میں اپنی تمام جائیداد چھ غلام فی سبیل اللہ آزاد کر کے

وارثوں کو اپنی وراثت سے محروم کر دیا- جب آنحضور ﷺ کو علم ہوا تو آپ نے اس سے سخت نفرت کا اظہار کیا اور یہ فرمایا کہ وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کا جنازہ پڑھوں اور یہ فرمایا کہ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں اُسے مسلمانوں کے قبرستان میں ہرگز دفن نہ ہونے دیتا پھر آنحضرت ﷺ نے وہ چھ غلام واپس لے کر دو آزاد کر دیئے اور چار اس کے وارثوں میں تقسیم کر دیئے-

پس بربناء ان دلائل کے وہ شخص جب تک یہ معاملہ ظالمانہ درست نہ کرے' مذہب اہل حدیث سے خارج ہے- نہ یہ شخص اور نہ اس کا بیٹا جو ظالمانہ ورثہ لے کر اس پر قابض ہے' امامت و خطابت کے قابل ہیں اور نہ اس سے اسلامی برتاؤ جائز ہے- مسلمانوں کو ان ظالموں سے بائیکاٹ اور قطع تعلق کرنا چاہیے- نہ سلام نہ دیگر مراسم اسلامیہ میں ان کے ساتھ شامل ہونا جائز ہے اور نہ ان کا جنازہ پڑھنا درست ہے-

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامت کا منصب بخشا تو انہوں نے اپنی اولاد کے لیے بھی امامت کی درخواست کی تو ارشاد ہوا قال لاینال عھدی الظالمین کہ ظالموں کو یہ منصب نہ ملے گا- چونکہ انہوں نے اپنے ذاتی رنج اور تعصب سے لڑکی کو وراثت سے محروم کیا ہے' لہٰذا یہ ظالم ہیں-اگر اس معاملہ کو درست کہیں تو پھر یہ حرام کو حلال قرار دینا ہے-جو موجب کفر بواح ہے پھر یہ کافر ہیں' ان کو اپنی اصلاح کرنی اور توبہ کرنی واجب ہے- ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب-

عبدالقادر عارف حصاری سلمہ الباری

ہفت روزہ اہل حدیث لاہور جلد-٦' شمارہ-١١' مورخہ ١١/ مارچ سنہ-١٩٧٥ء

کن کن گناہوں کی بنیاد پر اولاد کو وراثت سے محروم کیا جا سکتا ہے؟

کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا دریں مسئلہ کہ کسی شخص کے کئی لڑکے ہوں' ان میں سے بعض بے نماز اور فسوق و فجور کے عادی اور اپنے والد کے عاق ہوں اور بعض خدمت گذار اور نمازی ہوں تو ان کا والد اپنی مملوکہ جائیداد میں سے زندگی میں جائیداد اور مال تقسیم کرے یا زندگی کے بعد اپنی مملوکہ جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ کی بابت وصیت کر دے کہ میری

اولاد سے جو بے نماز اور زانی شرابی اور میرا عاق اور باغی ہے اور فلاں کمیونسٹ ہو گیا اور تارک الصلوٰۃ اور تبع ہوئی ہے' اس کو میرا ورثہ نہ دیا جائے تو یہ وصیت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الوہاب: الحمد للہ رب العالمین امابعد! پس واضح ہو کہ اگر کسی کی اولاد میں سے کوئی شخص اللہ اور رسول کے احکام سے بھی باغی ہو گیا ہو جیسے بے نماز ہو گیا یا سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں سے مل کر شریعت سے آزاد ہو گیا ہو اور اپنے والدین کا عاق ہو کر ان کو قتل کی دھمکی بھی دیتا ہو اور اس کی سرکشی سے خطرہ ہو کہ یہ اپنے باپ کو قتل کر دے گا تو اس کو اس کا والد اپنی وراثت سے محروم کر سکتا ہے جس کی دو صورتیں ہیں- ایک یہ کہ اپنی زندگی اور صحت میں اپنا تمام مال عاق اولاد کے ماسوا دیگر وارثوں میں تقسیم کر دے اور عاق بیباک کو محروم کر دے' اس کے لیے کچھ نہ چھوڑے- اس صورت میں اس مورث کا یہ تصرف اپنے ملک میں ہوا ہے جو بالکل جائز ہے جیسے کسی شخص کی عورت منکوحہ اس کی عاق ہو کر کسی غیر شخص کے ساتھ چلی گئی ہو تو بالاتفاق اس کا نان نفقہ خاوند سے ساقط ہو جاتا ہے- ایسا ہی عاق اولاد کا نان نفقہ اور دیگر مالی حقوق ساقط ہو جاتے ہیں-

حدیث میں ہے : من رغب عن ابیه فقد کفر یعنی جو شخص اپنے باپ سے اعراض کر کے اس کا باغی ہو گیا وہ کافر ہوا- (بخاری)

عقوق والدین سخت کبیرہ گناہ ہے جس سے والدین اپنی اولاد عاق سے مقاطعہ کر سکتے ہیں' اس کی ایک صورت اپنی جائیداد سے محروم کر دینا ہے- دوسرا جرم یہ کہ وہ بے نماز اور سوشلسٹوں میں شامل ہو گیا ہے- بے نماز کو نبی کریم ﷺ نے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کافر قرار دیا ہے اور اس کو فرعون' قارون ایسے اکابر کفار کے ساتھ شامل کر دیا ہے اور سوشلسٹ گروہ پر ایک سو تیرہ علماء نے کفر کا فتویٰ دے دیا ہے- جب ایسا عاق کافر ہے تو اس کو اپنی جائیداد سے محروم کر دینا بالاتفاق جائز ہے-

دوسری صورت یہ ہے کہ عاق اولاد کا باپ اپنے پسماندگان اور دیگر وارثوں کو وصیت نامہ لکھ دے کہ میری متروکہ جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کا جو شخص میری اولاد سے عاق اور شرع سے باغی ہے اور نماز ترک کر کے سوشلسٹوں میں شامل ہو گیا ہے وہ وارث نہ ہو اور اس کو ورثہ نہ دیا جائے اور اگر وہ مجھے قتل کر دے تو پھر بالکل ہی میری جائیداد کا ایک حبہ نہ دیا جائے کیونکہ ایک تو وہ کافر ہے' دوسرا میرا قاتل ہو گیا تو میری جائیداد کا ذرہ بھر حق دار نہ رہا- پس یہ وصیت اس مورث وصی کی جائز اور صحیح

ہو گی اور اس کے فوت ہونے کے بعد اس طرح نافذ کرنی واجب ہو گی۔

قرآن مجید سورہ بقرہ میں ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے : کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیر الوصیة للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین فمن بدلہ بعد ما سمعہ فانما اثمہ علی الذین یبدلونہ ان اللہ سمیع علیم۔ یعنی جب کسی کو موت قریب اور حاضر ہو تو اس پر واجب ہے کہ جو جائیداد اور مال اس کا ہے' اس کی بابت اپنے والدین کو اور دیگر قریبیوں کو مناسب اور جائز وصیت کر دے یہ متقیوں پر حق ہے کہ وہ اس طرح عمل کریں۔ اب اگر اس کی موت پر کوئی شخص اس وصیت کو بدلے گا تو اس کا گناہ اس بدلنے والے پر ہو گا۔ بیشک اللہ سمیع علیم ہے۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے امام شوکانی تفسیر فتح القدیر جلد ۱' ص ۱۵۵ میں لکھتے ہیں :

قال ابن المنذر اجمع کل لمن نحفظ عنہ من اھل العلم علی ان الوصیة للوالدین لا یرثان والاقرباء الذین لا یرثون جائزة۔ یعنی جن علماء سے ہم نے علم حفظ کیا ہے' ان سب کا اس بات پر اجماع ہے کہ کوئی شخص اپنے ایسے والدین اور اقرباء کو کسی قسم کی جائیداد اور مال متروکہ کے متعلق وصیت کر دے جو شرعاً اس کے وارث نہیں ہیں تو یہ جائز ہے۔ چونکہ عاق اولاد جو موصی کے اقرباء سے ہے اور وہ کفر کی حد تک پہنچ کر اس کی شرعاً وارث نہیں ہے تو ان کی بابت مورث کو وصیت کرنی عین حق اور صواب ہے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے خود یہ وصیت فرمائی کہ میری بیویوں اور میرے عامل کی مؤنت کے بعد سب ترکہ صدقہ ہے۔ لا تقسم ورثتی دیناراً ولا درھما۔ میرے وارث میرے ورثہ کے دینار اور درہم کوئی چیز تقسیم نہ کریں۔

آپ کی یہ وصیت جائز تھی۔ نیز حدیث میں ہے :لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہے اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہے۔ دیگر حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا :لا یرث القاتل شیئا یعنی قاتل مقتول کی کسی شئے کا وارث نہیں ہو سکتا۔

پس ان احادیث کی بناء پر کافر عاق اولاد کی بابت وارث کو وصیت کرنی جائز ہے اور اس کو اسی طرح نافذ کرنا واجب ہو گا۔

از عبدالقادر عارف الحصاری سلمہ الباری۔

الاہل حدیث لاہور جلد ۲' شمارہ ۳' مورخہ ۱۵/ جنوری سنہ ۱۹۷۱ء

عاق اولاد کیلئے وعید سخت ہے

تاہم وراثت سے محروم نہیں کی جاسکتی

ایک "فتویٰ" پر تعاقب

تحقیق و تنقید جناب مولانا حافظ محمد ابراہیم صاحب کمیر پوری خطیب جامع اہلحدیث سرگودھا

مولانا عبدالقادر حصاری بلاشبہ جماعت کے ان مشاہیر علمائے کرام کا بقیہ ہیں جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ موصوف علم و فضل اور عمر ہر لحاظ سے ہمارے لیے قابل احترام ہیں۔ مسلک اہلحدیث کی حمایت اور دفاع میں ان کی تحریری خدمات کا دائرہ بڑا وسیع اور وقیع ہے۔ انہوں نے گذشتہ چالیس سال میں ہزاروں صفحات پر مشتمل جو مدلل اور دستاویزی مقالے تحریر فرمائے ہیں' وہ ان کے وسعت مطالعہ اور ان کی عالی ہمتی کا بین ثبوت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حصاری صاحب اتنا زیادہ لکھتے ہیں کہ جماعت کے اخبارات متعدد ہونے کے باوجود تنگ دامانی کا اعتراف کرتے اور مدیران جرائد اکثر حضرت موصوف سے ان کی نگارشات شائع نہ کر سکنے پر معذرت خواہ رہتے ہیں۔

اتنے بسیار نویس سے کبھی کبھار سہو و نسیان' استدلال کی خامی' نتائج میں لغزش اور دعویٰ و دلیل میں عدم مطابقت بالکل معمولی بات ہے۔ علم و فضل میں اعلیٰ مقام کے حامل بھی آخر انسان ہی ہوتے ہیں۔ ان کی بھول چوک ان کے علمی مقام کو قطعاً مجروح نہیں کرتی۔ صرف انسانی معلومات کی حدود اور بشری عقل و فکر کی نارسائی کا پتہ دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اہل علم نہ تو عقلی' فکری اور استدلالی غلطی کو اپنے لئے ناممکن خیال کرتے ہیں اور نہ اس پر توجہ دلانے پر برہم ہوتے ہیں اور نہ ہی ایسے انتباہ کو سوء ادب کا درجہ دیتے ہیں بلکہ علمی اور سنجیدہ تنقید کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے اور اس کی وضاحت یا تسلیم سے متعاقب کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔

اہل علم کے یہی وہ اخلاقی اصول ہیں جن سے تحقیق و تنقید کی راہیں کھلتی ہیں اور

متلاشیان حق و صواب کے یہی اسلوب ہیں جن سے نہ صرف فکر و نظر جلا پاتے ہیں بلکہ اس گروہ کی انہی مساعی جمیلہ سے فکر واجتہاد کی برکات عملاً ظہور پذیر ہوتی ہیں اور ان کے اسی طریقہ کار سے دعویٰ و دلیل میں باہمی ربط کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی کی بدولت افراط و تفریط کے عین بیچ نکتہ اعتدال کا سراغ ملتا ہے۔

ان تمہیدی گذارشات کے بعد ہم آج کی فرصت میں مولانا حصاری کے اس فتویٰ پر تعاقب کرنا چاہتے ہیں جو حال ہی میں "اہلحدیث" پندرہ جنوری سنہ ۱۹۷۱ء کے صفحہ ۹ پر شائع ہوا ہے۔ ہمارے دل میں مولانا محترم کے لیے بے حد احترام ہے۔ ہم ان کے علم و فضل کے دل کی گہرائیوں سے معترف ہیں اور ہماری یہ جسارت محض احقاق حق کے پیش نظر ہے۔ ہم مولانا موصوف کے اپنے طرز عمل کی بناء پر پرامید ہیں کہ وہ ہماری اس تحریر سے برہم نہیں ہوں گے بلکہ وسعت قلب کا مظاہرہ فرماتے ہوئے اپنی فروگذاشت کا اعتراف یا محبت و شفقت کے انداز میں ہماری تنقیدی گذارشات پر قلم اٹھائیں گے۔ ہم دونوں صورتوں میں ان سے بزرگانہ طرز عمل کے متوقع ہیں اور یہی توقع ہے جس نے ہمیں اس تعاقب کا حوصلہ بخشا ہے۔

مولانا حصاری صاحب نے اس استفتاء پر جو فتویٰ دیا ہے' وہ یہ ہے "کیا حکم ہے شریعت محمدیہ کا دریں مسئلہ کہ کسی شخص کے کئی لڑکے ہوں' ان میں سے بعض بے نماز اور فسق و فجور کے عادی اور اپنے والد کے عاق ہوں اور بعض خدمت گذار اور نمازی ہوں تو ان کا والد اپنی مملوکہ جائیداد میں سے زندگی میں جائیداد اور مال تقسیم کرے یا زندگی کے بعد اپنی مملوکہ جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ کی بابت وصیت کر دے کہ میری اولاد سے جو بے نماز ہے' زانی اور شرابی ہے میرا عاق اور باغی ہے اور فلاں کمیونسٹ ہو گیا اور تارک الصلوٰۃ اور تمبع ہوئی ہے اس کو میرا ورثہ نہ دیا جائے تو یہ وصیت جائز ہے یا نہیں؟"

مولانا حصاری کا جواب ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے: "الحمد للہ رب العالمین' امابعد پس واضح ہو کہ اگر کسی کی اولاد میں سے کوئی شخص اللہ اور رسول کے احکام سے بھی باغی ہو گیا یا سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں سے مل کر شریعت سے آزاد ہو گیا اور اپنے والدین کا باغی ہو کر ان کو قتل کی دھمکی بھی دیتا ہو اور اس کی سرکشی سے خطرہ ہو کہ یہ اپنے باپ کو قتل کر دے گا تو اس کو اس کا والد اپنی وراثت سے محروم کر سکتا ہے۔"

ہم مفتی صاحب کے اصل جواب اور ان کے دلائل کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ کرنے سے قبل ان کے اس پیراگراف میں اس فقرہ کا جواز معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ "اپنے والد کا عاق ہو کر ان کو قتل کی دھمکی بھی دیتا ہو اور اس کی سرکشی سے خطرہ ہو کہ یہ اپنے باپ کو قتل کر دے گا۔"

ہم اس فقرہ کی وضاحت اس لیے چاہتے ہیں کہ جب سوال میں یہ الفاظ نہیں ہیں تو مفتی صاحب نے جواب میں اس کا تذکرہ کیوں کیا؟ اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ مفتی اپنے منصب سے تجاوز کر رہا ہے اور فیصلہ کی بجائے استغاثہ کا کردار انجام دے رہا ہے اور ملزم کو سنگین سزا دینے کے لیے ازخود مقدمہ سنگین بنا رہا ہے۔ ہم حضرت مولانا سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کیا عدالت کو یہ حق ہے کہ ملزم کی چارج شیٹ میں ایسے جرائم کا اضافہ کرے جس کا استغاثہ کی کہانی (دعویٰ) میں ذکر تک نہ ہو؟

ہمارے نزدیک مفتی صاحب نے اس فقرہ کے اضافہ سے اپنے منصب غیر جانبداری کو مجروح کیا اور اپنی ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ ہم اس مقام پر حضرت مولانا سے بھی دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اندیشہ قتل کا صحیح علاج یہی ہے کہ اسے ورثہ سے محروم کر دیا جائے؟

مولانا صاحب نے اپنے جواب کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے : "اس کی (یعنی ایسے لڑکے کو ورثہ سے محروم کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اپنی زندگی اور صحت میں اپنا تمام مال عاق اولاد کے ماسوا دیگر وارثوں میں تقسیم کر دے اور عاق بیباک کو محروم کر دے۔ اس صورت میں مورث کا یہ تصرف اپنی ملک میں ہوا ہے جو بالکل جائز ہے..... حدیث میں ہے : من رغب عن ابیه فقد کفر (بخاری) یعنی جو شخص اپنے باپ سے اعراض کر کے اس کا باغی ہو گیا' وہ کافر ہوا۔ عقوق والدین سخت کبیرہ گناہ ہے جس سے والدین اپنی اولاد عاق سے مقاطعہ کر سکتے ہیں اور اس کی ایک صورت اپنی جائیداد سے محروم کر دینا ہے۔ دوسرا جرم یہ ہے کہ وہ بے نماز اور سوشلسٹوں میں شامل ہو گیا ہے۔ بے نماز کو نبی کریم ﷺ نے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کافر قرار دیا ہے اور اس کو فرعون' قارون ایسے اکابر کفار کے ساتھ شامل کیا ہے اور سوشلسٹ گروہ پر ایک سو تیرہ علماء نے کفر کا فتویٰ دے دیا ہے۔ جب ایسا عاق کافر ہے تو اس کو اپنی جائیداد سے محروم کر دینا بالاتفاق جائز ہے۔"

عرصہ ہوا کہ ہم نے مدیر تنظیم اہلحدیث کی حیثیت میں مولانا حصاری کی ایک کتاب پر ریویو کرتے ہوئے مولانا کے مزاج کے تشدد کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ موصوف نے اپنے تشدد کے سبب متعدد صغائر کو کبائر میں شامل کر دیا ہے۔ خیر وہ بات تو اتنی خطرناک نہ تھی کہ معاملہ ترغیب و ترہیب تک محدود تھا لیکن آج ہم اس تلخ حقیقت کے اظہار پر مجبور ہیں کہ مولانا تکفیر کے سنگین معاملہ میں بھی اسی راہ پر گامزن ہیں حالانکہ یہ راہ بڑی پر خطر ہے اور اس میں دوسرے سے کہیں زیادہ اپنے تحفظ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس میں معمولی سی غلطی انسان کو بڑے خطرناک مقام پر لے آتی ہے۔ ہم اس جسارت پر معذرت خواہ ہیں کہ مولانا کا مسلک تکفیر کے معاملہ میں محدثین کے بجائے معتزلہ اور خوارج کے زیادہ قریب ہے حالانکہ اس باب میں صحیح' معتدل اور محتاط راہ وہی ہے جسے محدثین کرام نے اپنایا ہے۔

مولانا موصوف کی عمر کا بیشتر حصہ احناف سے قیل و قال اور بحث و جدال میں گزرا ہے' غالباً ان کا یہ تشدد حنفیہ کی وسیع القلبی کا رد عمل ہے۔ مولانا کے طبعی تشدد ہی کا اثر ہے کہ وہ اپنے مذکورہ جملہ میں عقوق والدین کو کبیرہ گناہ بھی تسلیم فرماتے ہیں۔ پھر اس کبیرہ گناہ کے نتیجہ میں اسے کافر بھی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ مسلک محدثین میں ہر کبیرہ گناہ کفر نہیں بلکہ اسی مرتکب کبیرہ کو کافر کہا جاتا ہے جس کو زبان رسالت سے کافر کہا جا چکا ہو۔ اس کے برعکس معتزلہ اور خوارج کا یہ مسلک ہے کہ ہر کبیرہ گناہ کفر ہے اور اس کا مرتکب کافر اور مخلد فی النار ہے۔

مولانا محترم نے نافرمان اولاد کو محروم الارث قرار دینے کے لئے اسے کافر بنایا اور بزعم خویش ان کے کفر پر جو دلائل دیئے ہیں' ان سے پہلی دلیل بخاری کی یہ حدیث ہے : من رغب عن ابیہ فقد کفر۔

موصوف نے اس حدیث کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ "جو شخص اپنے باپ سے اعراض کر کے اس کا باغی ہو گیا وہ کافر ہوا۔"

ہم بڑی حیرت اور افسوس سے عرض کرتے ہیں کہ مولانا حصاری نے اس حدیث کے ترجمہ اور استدلال میں ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا بلکہ ترجمہ میں تصرف اور استدلال میں غیر پسندیدہ جسارت کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ حدیث کے الفاظ بالکل سادہ اور مختصر ہیں جن کا ترجمہ محض اتنا ہے کہ "جس نے اپنے باپ سے اعراض کیا کافر ہوا" اب مولانا حصاری کا اس مختصر

فقرہ میں ایک اور فقرہ ("اس کا باغی ہو گیا") کا اضافہ آخر کس لفظ کا ترجمہ ہے۔ ہماری رائے میں مولانا اس فقرہ کے اضافہ سے وہ مطلب حاصل کرنا چاہتے ہیں جو متن حدیث سے حاصل نہیں ہوتا اور انہوں نے ترجمہ میں تصرف اور اضافہ محض اس لیے کیا ہے کہ حبینہ نافرمان بچے کو اس کے اصل جرم سے زیادہ سزا دے سکیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ امام بخاری اس حدیث کو اپنی صحیح میں اس لیے لائے ہی نہیں کہ نافرمان اولاد کا کفر ثابت کریں اور نہ ہی اس حدیث کا تعلق باپ کے نافرمان اور گستاخ بچے سے ہے بلکہ اس میں ایک اور ہی مسئلہ بیان ہوا ہے۔ صاحب صحیح بخاری حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو باب من ادعٰی الٰی غیر ابیہ کے تحت ان الفاظ سے لائے ہیں کہ "لا ترغبوا عن آباء کم فمن رغب عن ابیہ فھو کفر" ایک نسخہ میں فھو کفر کی بجائے فقد کفر کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

شارح بخاری صاحب فتح الباری حدیث کے الفاظ (رغب عن ابیہ) کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "المراد بہ من تحول عن نسبہ لابیہ الٰی غیر ابیہ" یعنی وہ حدیث میں مذکورہ وعید (کفر) کی زد میں وہ شخص آتا ہے جو اپنا نسب اپنے باپ کی بجائے کسی اور سے ملائے پھر لفظ کفر کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "لیس المراد بالکفر حقیقۃ الکفر الذی یخلد صاحبھا فی النار" یعنی "اس کفر سے مراد حقیقی کفر نہیں جس کا مرتکب مخلد فی النار یعنی دائمی جہنمی ہے۔"

نتیجہ صاف ہے کہ اس حدیث کا مورد وہ شخص نہیں جو سوال میں مذکور ہے بلکہ امام بخاری کی تبویب' حدیث کے الفاظ اور حضرت حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی وضاحت سے معلوم ہوا کہ یہاں والدین کے نافرمان بچے کا نہیں بلکہ اس غلط کار انسان کا ذکر ہے جو کسی دنیاوی مفاد یا مصلحت کے لیے اپنا نسب تبدیل کرے اور اپنی ابنیت کی نسبت باپ کے سوا کسی اور کی طرف کرے۔ مزید برآں یہ شخص اس معنی میں کافر نہیں نہ مخلد فی النار ہو گا اور جنت کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہوں بلکہ یہ شخص اپنے گناہ کی سزا پانے کے بعد نیک اعمال اور صحیح عقائد کے سبب جنت میں داخل ہو گا۔ ہمیں امید ہے کہ مولانا محترم ہم سے اتفاق فرمائیں گے کہ ایسا کافر نہ تو ملت اسلامیہ سے خارج ہوتا ہے اور نہ ہی اسلامی حقوق شہریت (وراثہ وغیرہ) سے محروم۔

مولانا عبدالقادر صاحب یہ حدیث اپنی کتاب الکبائر ص-۱۳۶ پر بھی صحیح مسلم کے حوالہ سے لائے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صحیح مسلم کی روایات اور شارح مسلم امام نووی رحمہ اللہ کی تشریحات کا تذکرہ بھی کر دیا جائے تاکہ بات پوری طرح صاف ہو جائے۔

امام مسلم رحمہ اللہ اس ضمن میں ایک تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث لائے ہیں جس کا تذکرہ ہو چکا اور اس کے علاوہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث لائے ہیں جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں کہ : "لیس من رجل ادعٰی الٰی غیر ابیه وهو یعلم الاکفر" یعنی "جو شخص اپنے باپ کو جانتے ہوئے اپنی ابنیت کی نسبت کسی اور کی طرف کرے وہ کافر ہے۔"

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں : "فیه تاویلان احدهما انه فی حق المستحل والثانی انه کفر النعمة والاحسان ولیس المراد الکفر الذی یخرجه من ملة الاسلام ومعنٰی ادعٰی بغیر ابیه ای انتسب الیه واتخذه ابا" یعنی "اس حدیث میں جو لفظ کفر استعمال ہوا ہے' علماء اس کی دو تاویلیں کرتے ہیں۔ (اول) کافر وہ شخص ہو گا جو اس کام (غیر باپ کی نسبت) کو حلال اور جائز سمجھ کر کرے۔ (دوم) یہاں کفر سے مراد وہ کفر نہیں جو انسان کو ملت اسلامیہ سے خارج کر دیتا ہے بلکہ اس سے مراد کفران نعمت یعنی والدین کے احسان کا انکار ہے۔" مزید فرماتے ہیں کہ "ادعٰی الٰی غیر ابیه" کا معنی یہ ہے کہ غیر باپ کو باپ بنانا اور اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرنا ہے۔"

پھر امام نووی حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کے تحت فرماتے ہیں : "یقال رغب عن ابیه ای ترک الانتساب الیه وجحده" یعنی حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ میں رغب عن ابیه کا معنی یہ ہے کہ اپنے باپ کی ابوت کا انکار کرے اور اپنی ابنیت کی نسبت کسی اور کی طرف کرے۔ اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے ہم صحیح مسلم کے اسی باب کی ایک اور حدیث ہدیہ قارئین کرتے ہیں۔

"من ادعٰی الٰی غیر ابیه وهو یعلم انه غیر ابیه فالجنة علیه حرام" امام نووی اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں : "ان جزاءه انها محرمة علیه اولا عند دخل الفائزین واهل السلامة ثم انه دخولهم ثم یدخلها بعد ذالک وقد لایجازی بل یعفو اللّٰه سبحانه وتعالٰی۔"

ہم نے مولانا حصاری کی پیش کردہ حدیث' محدثین کی اس پر تبویب اور شارحین حدیث کی تشریح سے ثابت کر دیا ہے کہ اس حدیث کو ان کے دعویٰ سے کوئی تعلق نہیں اور اس سے نافرمان اولاد کے کفر پر استدلال قطعاً صحیح نہیں پھر اس سے کسی وارث کو محروم الارث قرار دینا انتہائی جسارت اور ناروا تصرف ہے جو اہل علم کی شان سے بعید ہے۔

مذکورۃ الصدر پیراگراف میں مولانا موصوف نے فرمایا کہ "اس صورت (یعنی زندگی میں ورثہ تقسیم کرنے اور نافرمان کو محروم کرنے) میں مورث کا یہ تصرف اپنی ملک میں ہوا جو بالکل جائز ہے۔"

ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ملک میں تصرف کے لیے کوئی شرعی ضابطہ ہے؟ یا مالک اپنی ملک میں ہر طرح کے تصرف کا مجاز ہے؟

مولانا محترم نے مذکورۃ السوال نافرمان اولاد کو محروم الارث قرار دینے کے لیے پہلی صورت یہ تجویز کی تھی کہ وہ کافر ہے اور مورث کو حق ہے کہ اپنی زندگی میں اپنی تمام جائیداد اپنے مسلمان ورثہ میں تقسیم کر دے پھر مبینہ نافرمان اولاد کے کفر پر تین دلائل قائم کئے تھے جن میں اول دلیل یہ تھی کہ والدین کی نافرمانی کفر ہے' اپنے اس دعویٰ پر جو دلیل انہوں نے پیش کی تھی' اس پر بقدر ضرورت گفتگو کے بعد ہم ان کی دوسری اور تیسری دلیل کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس اولاد کے کفر کی دوسری وجہ ترک نماز اور تیسری وجہ ان کا سوشلسٹ ہونا ہے۔

ہمارے نزدیک ترک نماز بلاشبہ ایک ایسا سنگین جرم ہے جس پر احادیث صحیحہ میں کفر کا اطلاق ہوا ہے۔ تاہم یہ کفر کیسا ہے؟ ملت اسلامیہ سے اخراج کے معنی کیا ہیں؟ جس سے وہ اس دنیا میں اسلامی حقوق سے کلیۃً محروم اور آخرت میں مخلد فی النار ہوتا ہے یا کفر دون کفر کے انداز میں؟ جس کا مرتکب نہ تو اسلام کے عطا کردہ شہری حقوق (جملہ) سے محروم ہوتا ہے اور نہ ہی مخلد فی النار!

یہ مسئلہ شروع سے زیر بحث رہا ہے اور سلف سے آج تک اس بات پر اتفاق نہیں ہو سکا۔ خود مولانا حصاری اپنی مشہور کتاب "کتاب الکبائر" میں فرماتے ہیں کہ "تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ نماز کا ترک کرنا جرم عظیم ہے لیکن اگر عمداً نماز ترک کر دی تو کیا وہ کافر ہو کر اسلام سے باہر ہوا یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ ص۔۱۴۔ اس اختلاف کی

تفصیلات اور دلائل کتب شروح اور کتب عقائد میں مذکور ہیں اور فریقین کے دلائل میں وزن ہے لیکن تمام نصوص کو ملحوظ رکھتے ہوئے قول وسط اور مسلک اعتدال وہی ہے جسے محدثین نے کفر دون کفر کے اصول میں سمو دیا ہے۔ مرجیہ اور حنفیہ کی وسیع القلبی اور خوارج و معتزلہ کی تنگ نظری افراط و تفریط کی راہیں ہیں جن سے آپ کو متعدد نصوص کی تاویل اور تعارض ادلہ کی دشوار گذار گھاٹی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

مسئلہ تکفیر میں ہمارا مزاج اپنے مخاطب کے مزاج سے مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک جو حق ہے ہم اسے شوکانی اور مولانا الشیخ ابوالحسن عبیداللہ الرحمانی المبارک پوری الہندی کے الفاظ میں ہدیہ قارئین کرتے ہیں۔

اول الذکر محقق اپنی مایہ ناز کتاب "نیل الاوطار" میں اسی مسئلہ پر فریقین کے دلائل بیان کرنے کے بعد بطور فیصلہ فرماتے ہیں: "قد عرفناک فی الباب الاول ان الکفر انواع منها لاینافی المغفرة ککفر اهل القبلة ببعض الذنوب التی سمی الشارع کفرا وهو یدل علی عدم استحقاق کل تارک الصلوٰة للتخلید فی النار" (جلد۱، ص۳۶۸، ۳۶۹) یعنی "ہم اس سے پہلے باب میں بتا چکے ہیں کہ کفر کی کئی انواع ہیں اور بعض کفر ایسے بھی ہیں جو مغفرت کے منافی نہیں جیسے اہل قبلہ کو شارع علیہ السلام نے بعض گناہوں کی بناء پر کافر کہا ہے اور کفر کی بعض انواع کا مغفرت کے منافی نہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ ہر تارک صلوٰۃ دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔"

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس فیصلہ سے ظاہر ہے کہ سستی کے سبب تارک نماز نہ ملت اسلامیہ سے خارج ہے نہ اسلامی حقوق (وراثت وغیرہ) سے محروم اور نہ ہی مخلد فی النار ہے۔

ہمارے دوسرے مایہ ناز محدث "مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح" میں صحیح مسلم کی حدیث "بین العبد وبین الکفر ترک الصلوٰة" کی شرح میں ائمہ حدیث اور اہل الرائے کا اختلاف اور اس کے دلائل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "والحق عندی ان تارک الصلوٰة عمدا کافر و لو لم یحجد وجوبها لصحة الاحادیث فی اطلاق الکفر علیه لکنه کفر دون کفر ای لم یرد بهذا الکفر کفرا یرده الی ما کان علیه فی الابتداء ففی الکفر مراتب کثیرة بعضها اخف من بعض غیر موجب للخلود وعدم المغفرة کما ان فی الایمان مراتب بعضها اعلی من بعض واللّٰه اعلم۔" (جلد۱، ص۳۷۶) یعنی

میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ عمداً تارک نماز بہرحال کافر ہے اگرچہ وجوب نماز کا اقرار ہی ہو کیونکہ صحیح حدیث میں تارک نماز پر کفر کا اطلاق ہوا ہے لیکن یہ کفر "کفر دون کفر" کا مصداق ہے کیونکہ ایمان کی طرح کفر کے بھی کئی مراتب ہیں پس ترک نماز کفر تو ہے لیکن اس سے آدمی نہ تو ملت اسلامیہ سے خارج اور نہ ہی مخلد فی النار ہوتا ہے۔

"محقق" حصاری صاحب نے سوشلسٹ ہونے کو بھی وجہ کفر قرار دیا ہے اور اس کی دلیل میں ایک سو تیرہ علماء کا فتویٰ پیش کیا ہے۔ بہتر یہ تھا کہ محقق موصوف اپنی "محدثانہ" روش کے پیش نظر خود براہ راست کتاب و سنت سے تمسک فرماتے۔

بہرحال جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ ماں باپ کا نافرمان کافر ہے پھر یہ نافرمان اور تارک نماز اور سوشلسٹ نظریات کے حامل اس معنی میں کافر ہیں کہ وہ ملت اسلامیہ سے بالکل خارج اور اسلامی مملکت میں جملہ شہری حقوق سے محروم ہیں' اس وقت تک محقق محترم کا فتویٰ قابل قبول نہ ہو گا۔ اس مقام پر ہم مولانا سے اس امر کی وضاحت بھی چاہتے ہیں کہ وراثت اور ہبہ ہم معنی ہیں یا مختلف المعنی؟ اور کیا مورث اپنی زندگی میں اپنی جائیداد بطور ورثہ تقسیم کر بھی سکتا ہے؟ بصورت اثبات یہ بتایا جائے کہ اگر اس کی موت سے قبل ان سے کوئی مر جائے تو اس تقسیم کا حشر کیا ہو گا اور اس کی موت سے پہلے کوئی اور وارث پیدا ہو جائے تو وہ اپنا حصہ کس سے اور کیسے وصول کرے؟ ہم مولانا سے یہ بھی التماس کرتے ہیں کہ وہ خیر القرون سے کوئی ایسی مثال پیش کریں کہ کسی مورث نے کسی وارث کو کبائر کے سبب میراث سے محروم کیا ہو۔

مولانا عبدالقادر حصاری نے ایسی اولاد کو ورثہ سے محروم کرنے کی دوسری صورت یہ تجویز کی ہے کہ "عاق اولاد کا باپ اپنے پسماندگان اور دیگر وارثوں کو وصیت نامہ لکھ دے کہ میری متروکہ جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کا جو شخص میری اولاد سے عاق اور شرع سے باغی ہے اور نماز ترک کر کے سوشلسٹوں میں شامل ہو گیا ہے وہ وارث نہ ہو اور اس کو ورثہ نہ دیا جائے اور اگر وہ مجھے قتل کر دے تو پھر بالکل ہی میری جائیداد کا ایک حبہ نہ دیا جائے کیونکہ ایک وہ کافر ہے اور دوسرا میرا قاتل ہو گیا تو میری جائیداد کا ذرہ بھر حق دار نہ رہا۔ پس یہ وصیت اس مورث وصی کی جائز اور صحیح ہو گی اور اس کے فوت ہونے کے بعد اس طرح نافذ کرنی واجب ہو گی۔ قرآن مجید سورہ بقرہ میں ہے "کتب علیکم اذا حضر احدکم

الموت ان ترک خیرا ن الوصیة للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین فمن بدله بعد ما سمعه فانما اثمه علی الذین یبدلونه ان اللہ سمیع علیم۔"

اس آیت کے لفظی ترجمہ کے بعد مولانا حصاری صاحب امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر فتح القدیر سے ذیل کی عبارت نقل فرماتے ہیں: "قال ابن المنذر اجمع کل من تحفظ عنه من اهل العلم علی ان الوصیة للوالدین لا یرثان والاقرباء الذین لا یرثون جائزة۔" یعنی "جن علماء سے ہم نے علم حفظ کیا ہے' ان سب کا اس بات پر اجماع ہے کہ کوئی شخص اپنے ایسے والدین اور اقرباء کو کسی قسم کا جائیداد اور مال متروکہ کے متعلق وصیت کر دے جو شرعاً اس کے وارث نہیں ہیں تو یہ جائز ہے چونکہ عاق اولاد جو موصی کے اقرباء سے ہے اور وہ کفر کی حد تک پہنچ کر اس کی شرعاً وارث نہیں ہے تو ان کی بابت مورث کو وصیت کرنی عین حق اور صواب ہے۔"

ہم حیران ہیں کہ مولانا حصاری اس فتوی میں اپنی علمی اور تحقیقی سطح سے اتنے نیچے کیوں آگئے ہیں کہ بے ربط' بے موقعہ اور بے محل باتیں لکھ رہے ہیں۔ خود مولانا ہی فرمائیں کہ مذکورہ آیت وصیت کا ان کے مدعا سے کیا تعلق؟ ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ مورث اپنی نافرمان اولاد کو وصیت کے ذریعہ ورثہ سے محروم کر سکتا ہے جبکہ مذکورہ آیت میں والدین اور اقرباء کو کچھ دینے کے لیے وصیت کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ کہاں ان لوگوں کو کچھ دینے کے لیے وصیت جو شرعاً وارث نہیں ہیں اور کہاں ان لوگوں کو محروم کرنے کی سکیم جو شرعاً متروکہ جائیداد کے حقدار ہیں' آخر یہ تحکم نہیں تو اور کیا ہے؟

تفسیر فتح القدیر کی عبارت کا مفہوم بھی اسی قدر ہے کہ اگر والدین اور وہ اقرباء جو اصولاً تو وارث ہیں لیکن کسی مانع (وجہ شرعی) کے سبب ورثہ پانے کے اہل نہ ہوں تو پھر مورث ان کے مفاد کے لیے وصیت کر سکتا ہے یعنی اپنے اختیار وصیت سے انہیں کچھ دے سکتا ہے۔

صاحب فتح القدیر امام شوکانی اور صاحب فتح البیان حضرت النواب (رحمہما اللہ) اور دیگر مفسرین کو یہ گفتگو اس لیے کرنی پڑی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "لا وصیة لوارث" کی موجودگی میں آیت وصیت اور آیات میراث میں تطبیق ہو سکے اور آیت وصیت کو منسوخ کہنے کی بجائے خاص حالات پر محمول کیا جائے۔

ہماری تحقیق میں قرآن و سنت میں کوئی ایسی نص ہے ہی نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ

مورث بذات خود اپنے کسی وارث کو محروم یا اسے محروم کرنے کی وصیت کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس حق بات یہ ہے کہ مورث کو نہ اس بات کا حق ہے کہ کسی وارث کو اللہ تعالیٰ کی طرح سے مقررہ حصہ سے زیادہ کی وصیت (بلا رضائے دیگر ورثہ) کر سکے اور نہ ہی یہ حق ہے کہ کسی جائز وارث کو اس کے حق سے محروم کر سکے جیسا کہ صاحب مشکوٰۃ "باب الوصایا" میں یہ حدیث لائے ہیں کہ "من قطع میراث وارثه قطع الله میراثه من الجنة" یعنی "اپنے وارث کو (بوصیت وغیرہ) ورثہ سے محروم کرنے والے کو اللہ تعالیٰ جنت کی میراث سے محروم کر دے گا۔"

مولانا محترم کو اگر ہماری تحقیق سے اختلاف ہو تو ہم غیر متعلقہ باتوں کی بجائے ان سے کوئی واضح اور مثبت دلیل کے متمنی ہیں۔ ہمارے محقق مخاطب نے اپنے مضمون کے آخر میں وصیت کے اثبات کے لیے (حالانکہ یہ مسئلہ قابل نزاع ہے ہی نہیں) یہ دلیل بھی دی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ وارث میرے ورثہ کے دینار اور درہم کوئی چیز تقسیم نہ کرلیں) آپ کی یہ وصیت جائز تھی۔

ہمیں مولانا کی خدمت میں یہ عرض کرتے ہوئے شرم آرہی ہے کہ اس حدیث کو ان کے مدعا سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا مفاد صرف یہ ہے کہ میرا ورثہ (درہم دینار) میرے ورثہ میں تقسیم نہیں ہو گا بلکہ صدقہ ہو گا اور یہ فرمان کسی وارث کو محروم کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس بناء پر ہے کہ انبیاء کا مالی ورثہ تقسیم نہیں ہوتا۔ ان کا اصل ورثہ علوم نبوت ہیں جس سے ہر امتی جتنا چاہے حصہ لے سکتا ہے۔ خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے ما ترکت بعد نفقة نسائي ومونة عاملي فهو صدقة (مشکوٰۃ) نیز حدیث میں ہے لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہے اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہے) دیگر حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا لا يرث القاتل شيئا یعنی قاتل مقتول کی کسی شے کا وارث نہیں ہو سکتا۔ پس ان احادیث کی بناء پر کافر عاق اولاد کی بابت وارث کو وصیت کرنی جائز ہے اور اس کو اسی طرح نافذ کرنا واجب ہو گا۔

ہم مولانا کے اس آخری پیراگراف پر اتنا عرض کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ ان احادیث کو آپ کے فتویٰ سے کیا تعلق؟ بیشک احد الفریقین کا کفر مانع ارث ہے لیکن پہلے آپ مبینہ اولاد کو اس معنی میں کافر تو بنا لیں جو ملت اسلامیہ سے خارج اور حقوق شہریت (ورثہ وغیرہ) سے

محروم ہو۔

پھر آپ یہ بھی فرمائیں کہ جب یہ دونوں احادیث اپنے مفہوم میں واضح ہیں کہ کافر مسلمان کا اور قاتل مقتول کا وارث ہو ہی نہیں سکتا تو پھر آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ کافر اور قاتل کو ورثہ سے محروم رکھنے کے لیے وصیت کی جا سکتی ہے جب آنحضرت ﷺ ایسے شخص کو اس کے جرائم کی بناء پر محروم الارث قرار دے چکے ہیں تو پھر مورث کی وصیت کا کیا معنی؟ آپ کے فقرہ کا معنی تو یہ ہوا کہ نبوی عدالت سے محروم الارث عملاً اسی وقت محروم الارث ہو گا جب مورث اپنی وصیت سے نبوی فیصلہ کی تصدیق کرے اور اگر مورث نے وصیت نہ کی تو نبوی فیصلہ کالعدم تصور ہو گا گویا نبوی فیصلہ کسی ایسی ماتحت کا فیصلہ ہے جس کے اجرا کے لیے کسی فائنل اتھارٹی (یعنی مورث) کی توثیق ضروری ہے۔

ہمارا ارادہ مولانا حصاری کے فتویٰ پر تفصیل سے تعاقب نہ تھا۔ ہماری صحت اور مشاغل بھی اس کی اجازت نہ دیتے تھے لیکن مشیت الٰہی یہی تھی کہ ان کے مضمون کا کوئی فقرہ بلا تبصرہ نہ رہے۔ یہی تصرف غیبی تھا کہ ہماری توقع کے خلاف یہ مقالہ چند گھنٹوں میں مرتب ہو گیا۔ فللہ الحمد۔ مقالہ کے خاتمہ پر ہم اسی مسئلہ پر حضرت مولانا ابوالوفا ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے دو فتاویٰ درج کئے دیتے ہیں جو قارئین کرام کے لیے مزید اطمینان کا موجب ہوں گے۔

<u>اول سوال</u> : زید کے ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں۔ لڑکا دس گیارہ سال کی عمر میں باپ سے ناراض ہو کر کہیں چلا گیا' بعد ایک مدت کے زید یعنی باپ اس کا پتہ پا کر کسی دوسرے شہر میں اس سے جا ملا اور اس کو اپنے ساتھ لانے کی کوشش کی۔ لڑکے نے انکار کر دیا اور اپنے اہل و عیال سے وہیں رہ گیا۔ اس کے بعد باپ آٹھ نو سال زندہ رہا اور اس عرصہ میں باپ اور بیٹے میں کسی طرح کا تعلق نہ رہا اور یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ آیا وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے اور اس کے بال بچے زندہ ہیں یا نہیں۔ زید نے مرتے وقت اس نافرمان لڑکے کو وراثت سے محروم کر کے اس حصہ کو آپس میں تقسیم کر لینے کے لیے اپنی تینوں لڑکیوں کو وصیت کی۔ زید کا انتقال ہوئے تین چار سال ہو گئے ہیں' ابھی تک لڑکا مذکور لاپتہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ :

(۱) اس لڑکے کے حصہ کو جو بطور امانت سرکار کے پاس ہے کیا کیا جائے؟

(۲) زید کا ایک حقیقی بھائی یعنی لڑکیوں کا چچا زندہ ہے۔ آیا اس کو بھی اس میں سے کچھ ملنا

ہے یا نہیں؟

(۳) زید کی وصیت پر عمل کرنے سے شریعت کا خلاف ہو گا یا نہیں؟

جواب: کچھ شک نہیں کہ زید کا لڑکا نافرمان ہے' سخت مجرم ہے جس نے باپ کا حکم نہ مانا مگر جب تک کلمہ اسلام پڑھتا ہے' وراثت سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے زید کی وصیت ناجائز ہے' لڑکیاں اپنا حصہ لے لیں اور لڑکے کا حصہ داخل خزانہ سرکار رہے۔ جب وہ ملے یا اس کی اولاد ملے' وہ لے لے گی۔ واللہ اعلم (اہلحدیث ۶/ شعبان سنہ۔۱۳۴۷ھ فتاویٰ ثنائیہ جلد۔۲' ص۔۲۵۶)

دوم سوال: زید نے اپنے لڑکے کو اس جرم میں گھر سے نکال دیا کہ اس نے روزہ' نماز ترک کی اور ہر قسم کے نشہ کا عادی تھا' بدفعلی اس کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔ غرض جملہ خرابیوں کا مجموعہ تھا۔ اب عرض یہ ہے کہ ایسا لڑکا اپنے باپ کے مال کا وارث ہو سکتا ہے؟ والد اپنی زندگی میں بطور وصیت لکھ سکتا ہے کہ جب تک ان فعلوں سے توبہ نہ کرے اور نیک چلن اختیار نہ کر لے تب تک میرے مال کا وارث نہیں ہو سکتا' از روئے شرع شریف و قانون گورنمنٹ موجودہ کیا حکم ہے؟

جواب: اولاد جب تک مسلمان ہے باپ کی وارث ہے۔ بدفعلی یا نافرمانی سے باپ کے انعلمات خاصہ سے محروم ہو جائے گی مگر وراثت سے نہیں کیونکہ قرآن شریف میں وراثت کی بناء تعلق نسلی پر ہے۔ اگر احد الفریقین کافر ہوں تو تعلق نسلی بمنزلہ معدوم کے ہو جاتا ہے۔ گورنمنٹ کا قانون مسئلہ وراثت میں قانون شریعت کا ماتحت ہے۔ اہل حدیث ۲۹/ جمادی الاول سنہ۔۱۳۴۶ فتاویٰ ثنائیہ جلد۔۲' ص۔۲۷۶۔

وانا العبد الاثیم المسمٰی بمحمد ابراهیم المعروف حافظ کمیر پوری۔

الاعتصام جلد۔۲۲' شمارہ۔۳۴' ۳۵' ۳۶ مورخہ ۲۶/ مارچ و ۲' ۹/ اپریل سنہ۔۱۹۷۰ء

کافر اور عاق اولاد کی وراثت کا حکم

تعاقب کا جواب

"اخبار اہلحدیث" لاہور مجریہ ۱۵/ جنوری سنہ ۱۹۷۱ء میں زیر عنوان "مسائل واحکام" عارف حصاری کا ایک فتویٰ کافر اور عاق اولاد کے بارہ میں بایں الفاظ شائع ہوا ہے۔ واضح ہو کہ اگر کسی کی اولاد میں سے کوئی شخص اللہ اور رسول ﷺ کے احکام سے باغی ہو گیا ہو جیسے بے نماز ہو گیا یا سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں سے مل کر شریعت سے آزاد ہو گیا ہو اور اپنے والدین کا عاق ہو کر ان کو قتل کی دھمکی دیتا ہو اور اس کی سرکشی سے خطرہ ہو کہ "یہ اپنے والدین کو قتل کر دے گا تو اس کو اس کا والد اپنی وراثت سے محروم کر سکتا ہے۔" انتہی۔

اس فتویٰ کا سبب بھی دراصل میرا اپنا لڑکا تھا جس کے مختصر حالات عاق نامہ میں لکھ کر اخبار "اہلحدیث" لاہور مطبوعہ ۳۱/ جولائی سنہ ۱۹۷۰ء میں شائع کرایا گیا تھا۔ اس اعلان پر کسی شخص نے سائل بن کر اخبار "الاعتصام" لاہور میں یہ سوال کیا کہ کیا عاق اولاد وراثت سے محروم ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب جناب مفتی "الاعتصام" نے یہ دیا کہ "عاق اولاد وراثت سے محروم نہیں ہو سکتی۔"

بندہ نے اپنی طرف سے سوال وجواب کی صورت میں اخبار "اہلحدیث" مذکور میں شائع کرا کر ان جمعیت کے علماء کے لیے یہ وضاحت کر دی کہ جس لڑکے کو عاق قرار دے کر وراثت سے محروم قرار دیا گیا ہے' وہ محض عاق نہیں ہے بلکہ وہ تارک صلوٰۃ اور کمیونسٹ آزاد خیال ہو کر متمع ہوا اور بدکاریوں کا عادی ہو چکا ہے۔ اس وضاحت سے جو فتویٰ میں بصورت سوال وجواب کی گئی اور کچھ 'بفحوائے اھل البیت ادریٰ بما فیہ' مورث کے علم میں تھی۔ صاف ظاہر ہوا کہ لڑکا حدود کفر میں داخل ہو کر باپ کے دین ومذہب سے الگ ہو چکا ہے۔ اب وہ وراثت کا حق دار نہ رہا۔ وہ ایسے ہی باپ کے اہل سے خارج ہوا جیسے حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان حضرت نوح علیہ السلام کے اہل سے خارج ہو کر گمراہ ہوا۔

راقم الحروف (حصاری) کے اس صاف اور حق پر مبنی فتویٰ پر حافظ محمد ابراہیم صاحب کمیرپوری خطیب سرگودھا نے خواہ مخواہ تعاقب کر دیا۔ مضمون پڑھ کر بے ساختہ زبان سے نکلا۔ ؎

تو نقش بنداں را چہ دانی' تو شکل و پیکر را چہ دانی
گیاہ و سبزہ داند قدر باراں' تو خشکی قدر باراں چہ دانی
ہنوز از کفر و ایمانت خبر نیست' حقائق ہائے ایماں را چہ دانی

میرے مخاطب ماشاء اللہ عالم دین ہیں' ان کو ناراض نہ ہونا چاہیے۔ بعض اعتراضات بے سمجھی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی حالانکہ دوسرے کپڑے ان کے پاس موجود تھے۔ اس پر ایک شخص معترض ہوا کہ آپ نے اس طرح کیوں کیا؟ انہوں نے جواب دیا لیرانی احمق مثلک (میں نے اس طرح اس لیے نماز پڑھی ہے تاکہ تیرے جیسا احمق دیکھ لے کہ ایک کپڑے میں بھی نماز جائز ہے' اگرچہ زیادہ کپڑے موجود ہیں) پس ننگے سر نماز پڑھنے والے کو برا کہنے والے بیوقوف ہیں۔

حافظ ابراہیم صاحب کے تعاقب کا جواب بذریعہ "تنظیم اہلحدیث" عرض کیا جاتا ہے۔ حافظ صاحب کے کلام کو "حافظ صاحب کمیرپوری" اور اپنے جواب کو "عارف حصاری" کے عنوان سے تحریر کروں گا۔ میرے کلام میں کہیں تلخی محسوس ہو تو گوارہ کرلیں۔

چمن میں تلخ نوائی تو مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کام تریاقی

ان ارید الا الاصلاح وما توفیقی الا باللہ۔

حافظ صاحب کمیرپوری : عاق اولاد کے لیے وعید سخت ہے' تاہم وراثت سے محروم نہیں کی جاسکتی۔

عارف حصاری : حافظ صاحب نے العاق' فساق' کفار کی وکالت شروع کرکے ان کو عقوق اور فسق وفجور اور کفر آزادی پر مزید دلیر کر دیا ہے۔ ان کے اس تعاون علی الاثم والعدوان پر سخت افسوس ہے۔ اور اسی وجہ سے کتاب الکبائر شائع کی گئی ہے۔ عن معاویۃ بن حیدۃ قال خطبهم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال حتی متی تنزعون عن ذکر الفاجر اهتکره حتی یحذره الناس۔ (مجمع الزوائد) "یعنی معاویہ بن حیدہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو خطبہ سنایا اور فرمایا کہ تم بدکاروں کی تردید سے کب تک رکے رہو گے۔ ان کے پردے چاک کردو تاکہ لوگ ان کے شر سے محفوظ رہیں۔"

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے : ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔ "تم ظالموں

کی طرف نہ جھکو ورنہ تم کو بھی جہنم کی آگ اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔"

جناب حافظ صاحب نے مضمون کا عنوان غلط قائم کیا۔ اگر آپ کو عارف حصاری کے فتویٰ پر تعاقب کرنا ہی تھا تو عنوان یوں قائم کرتے "کافر عاق بیٹے کی وراثت کا حکم" لیکن جب آپ کا عنوان ہی غلط تھا تو اس پر بحث کیسے صحیح ہوتی؟

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج!

شاید آپ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ ہم کسی قسم کے عاق کو کافر لکھتے ہی نہیں اور نہ ہی کسی قسم کے عاق کو وراثت سے محروم سمجھتے ہیں۔ تو جناب حافظ صاحب یہ عقیدہ آپ کا بالبداہت فاسد ہے کیونکہ عاق کے مختلف انواع ہیں۔ ایک محض عاق جو تین باتوں سے ہوتا ہے۔

(الف) ایک یہ کہ اگر والدین اپنے بیٹے پر اعتماد کر کے کسی کام یا بات پر قسم اور حلف اٹھائیں کہ وہ یہ کام ضرور کرے گا اور ہم اس سے کرائیں گے تو وہ لڑکا وہ کام نہ کرے اور باپ کو حانث کر دے۔ (ب) دوسرا یہ کہ باپ جو حکم کرے وہ اس کی اطاعت نہ کرے۔ (ج) تیسرا یہ کہ باپ کی امانت میں خیانت کرے۔ (کتاب الکبائر بنام الزواجر لابن حجر الہیثمی)

دوسرا عاق وہ ہے جو اپنے باپ سے لڑ کر اس کو قتل کر دے۔ تیسرا عاق وہ ہے جو باپ کے مذہب سے مرتد ہو کر بے نماز ہو جائے یا کسی گمراہ فرقہ میں شامل ہو جائے جو حد کفر تک پہنچا ہو۔ چوتھا عاق وہ ہے جو اپنے باپ سے اعراض کر کے کسی دوسرے کا بیٹا ہونے کا دعویٰ کرے اور اصل باپ کے باپ ہونے سے انکار کر دے۔

ان چار قسم کے عاقوں میں سے پہلی قسم کے عاق کی بابت تو یہ حکم شرعی ٹھیک ہے کہ وہ باپ کی وراثت سے محروم نہیں ہے' ایسے عاق کی بابت کوئی نزاع نہیں ہے۔ آپ اور مفتی "الاعتصام" دونوں بزرگ غلطی کر رہے ہیں اور ہمارا فتویٰ جو باقی تین اقسام کے متعلق نافذ ہوا ہے' اس کو پہلے عاق کے حکم میں داخل کر کے فضول خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔ اگر تم یہ کہو کہ ہم ہر قسم کی اولاد عاق کو وراثت کا حقدار سمجھتے ہیں تو پھر اس پر اصولی بحث ہو گی جس سے آپ حضرات کی علمیت اور صداقت کا امتحان ہو گا۔

پس آیئے اور پوری طرح مسلح ہو کر آیئے؟

بس ہو کے رہے گا عشق اور ہوس میں امتیاز
اب آیا ہے مزاج ترا امتحان پر!

حافظ صاحب کمیرپوری : اس فقرہ کا جواز معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے والد کا عاق ہو کر ان کو قتل کی دھمکی دیتا ہے' الخ۔ ہم اس فقرہ کی وضاحت اس لیے چاہتے ہیں کہ جب سوال میں یہ الفاظ نہیں تو مفتی صاحب نے جواب میں اس کا تذکرہ کیوں کیا؟ الخ۔

عارف حصاری : غالباً حافظ صاحب نے جامع صحیح بخاری کسی کامل محدث جامع العلوم سے سمجھ کر نہیں پڑھی۔ حافظ صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ بخاری شریف کتاب العلم آخری باب امام الدنیا فی الحدیث نے یوں منعقد کیا ہے : "باب من اجاب السائل باکثر ما سألہ" "یہ باب اس بارے میں ہے کہ سائل نے جتنا پوچھا' اس سے زیادہ جواب دینا جائز ہے۔"

پھر اس دعویٰ کے اثبات میں حضرت الامام رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کی ہے کہ ایک شخص نے سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ محرم جب احرام باندھے تو کیا لباس پہنے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا کہ قمیص نہ پہنے' عمامہ نہ باندھے' پائجامہ نہ پہنے اور نہ وہ ٹوپی پہنے اور نہ وہ کپڑا استعمال کرے جس پر ورس اور زعفران لگی ہوئی ہو اور اگر جوتا میسر نہ ہو تو پھر موزے پہنے لیکن ان کو ٹخنوں سے نیچے تک کاٹ دے۔

سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے فتویٰ سے ظاہر ہوا کہ جس بات کا سوال ہو' اس کے علاوہ اس کے متعلقات سے کچھ اور بھی بتلا دیا جائے تو جائز ہے' اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جتنا سوال ہو' اتنا ہی جواب دیا جائے۔ اب پوری دنیا کے مفتی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس حکمت پر غور کریں کہ سائل کا سوال ہے جائز لباس سے کہ وہ کیا پہنے؟ اور فتویٰ میں جواب ہے ناجائز لباس کا کہ فلاں فلاں چیزیں نہ پہنیں۔ جس سے بطریق مفہوم مخالف کے معلوم ہوا کہ بغیر سلے ہوئے کپڑے کا مختصر لباس دو چادریں جائز ہیں۔ یہ سائل مخلص تھا جو جواب سے سب مطلب پا گیا۔

اگر اس وقت کمیرپوری حافظ صاحب موجود ہوتے تو فوراً فرماتے کہ حضرت! آپ اپنے منصب سے تجاوز فرما رہے ہیں۔ سائل کا سوال جائز لباس سے ہے' آپ صرف مختصر سا جواب دیں کہ بغیر سلے فلاں دو کپڑے پہن لو۔ پھر آپ سے اختیاری لباس کا سوال ہے اور

آپ اضطراری لباس کا ذکر رہے ہیں- یہ آپ سے کب پوچھا گیا تھا؟

جب سوال میں عاق بے باک کا ذکر ہے تو اس بندہ نے بدکردار رفیق اشرار کے دیگر بعض افعال کا بھی ذکر کر دیا تو کمیرپوری حافظ صاحب ناحق وکالت کے لیے کھڑے ہو گئے۔

حافظ صاحب : مولانا حصاری کی ایک کتاب پر ریویو کرتے ہوئے مولانا کے مزاج کا تشدد ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ موصوف نے اپنے تشدد کے سبب متعدد صغائر کو الخ۔

عارف حصاری : حافظ صاحب علم وکالت میں بڑے ماہر ہیں اور اپنے آپ کو بہت نقاد تصور کرتے ہیں کہ جس پر میں نے ریویو کر دیا کہ یہ متشدد ہے۔ بس وہ مجروح ہو گیا جیسے محدثین متشددین کی جرحیں قبول نہیں کی جاتیں تو ان کا بھی فتویٰ اور کوئی حکم شرعی قبول نہ کیا جائے گا ...... آپ جانتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی متشدد کہا گیا اور ان کا تشدد قبل از اسلام اور بعد از اسلام شہرۂ آفاق تھا۔ چنانچہ قیدیان بدر کا واقعہ مشہور ہے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے بوقت وفات آپ کو خلیفہ تجویز کیا تو بعض لوگوں نے کہا آپ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور کیا جواب دیں گے کہ آپ ایک ایسے شخص کو ہم پر خلیفہ بنا رہے ہیں "وقد تریٰ غلظته" جس کا تشدد آپ کو معلوم ہے۔" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کا بہت مناسب جواب دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود کعب احبار رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ "کیف تجد نعتی" "میری صفت آپ کو کیسی معلوم ہے" کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اجد نعتک قرنا من حدید" "کہ مجھے آپ کی صفت یہ معلوم ہے کہ آپ لوہے کے سینگ ہیں۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوہے کے سینگ کا مطلب کیا؟ تو کعب رضی اللہ عنہ نے کہا "امیر شدید لا تاخذه فی اللہ لومة لائم" "ایسا سخت حاکم کہ اللہ کے دین کے بارے میں اس کو کسی ملامت کرنے والے کی ملامت روک نہیں سکتی۔"

حدیث میں ہے کہ ان الشیطان لم یلق عمر منذ اسلم الاخر لوجهه۔ "یعنی جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا ہے' شیطان آپ سے نہیں ملا مگر ملا تو منہ کے بل گرا۔ (تاریخ الخلفاء) ایک مرتبہ عورتوں نے آپ کو سخت مزاج کہا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جس راستہ سے عمر رضی اللہ عنہ جا رہا ہو شیطان اس راستہ سے دُور بھاگ جاتا ہے۔ نیز ایک روایت میں ہے ولا فی الارض شیطان الا وھو یفرق من عمر۔ "یعنی زمین میں جہاں کوئی شیطان ہے' عمر رضی اللہ عنہ سے ڈرتا ہے۔"

عہد نبوی میں دو شخصوں کا باہم نزاع ہوا- وہ مقدمہ کا فیصلہ کرانے کے لیے عدالت نبوی میں پیش ہوا- آپ ﷺ نے اس نزاع کا فیصلہ فرما دیا تو ایک شخص کے خلاف فیصلہ ہوا تھا- وہ اس فیصلہ پر راضی نہ ہوا اور اُس نے عدالت فاروق رضی اللہ عنہ میں اس مقدمہ کی اپیل دائر کر دی- حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے حالات سن کر فرمایا "مکانکما حتی اخرج الیکما- "کہ میرے واپس آنے تک تم یہاں ٹھہرے رہو-" فخرج الیھما مشتملا علی سیفہ فضرب الذی قال ردنا الی عمر فقتلہ- یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار لے کر آئے اور اس شخص کو قتل کر دیا جو فیصلہ نبوی سے روگرداں ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فیصلہ کرانے آیا تھا- دوسرا پیچھے کو دوڑا اور اُس نے عدالت نبوی میں اطلاع کر دی کہ میرے فریق مقدمہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قتل کر دیا ہے- آنحضور ﷺ نے فرمایا ما کنت اظن ان یجتری عمر علی قتل مومن- "یعنی میں یہ گمان نہ رکھتا تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ ایک مومن شخص کے قتل کرنے کی جرأت کرے گا-"

تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی : فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک (الایۃ) یعنی اے میرے نبی! تیرے رب کی قسم یہ لوگ ایماندار نہیں ہو سکتے جب تک آپ کو حاکم بنا کر آپ کا فیصلہ اپنے نزاع میں دل وجان سے تسلیم بالرضا نہ کریں گے- فاھدر دم الرجل وبری عمر من قتلہ- (تاریخ الخلفاء سیوطی)

اس واقعہ سے یہ اصول ظاہر ہوا کہ جو شخص کسی مسئلہ اور نزاع میں فیصلہ نبوی جو احادیث کی رُو سے ہوا ٹھکرا دے گا اور وہ اس مقدمہ کا فیصلہ عدالت طاغوتی میں لے جائے گا' وہ مومن نہیں کافر ہے اور شرعی عدالت قائم ہو تو اس کی سزا قتل ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح احکام شرعیہ میں اظہار حق وابطال باطل بلا لومتہ قائم کرنا چاہیے-

حدیث میں فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد (او کما قال) "کہ ایک عالم فقیہ جو اظہار حق' امر بالمعروف' نہی عن المنکر کرتا ہو' وہ ہزاروں عابدوں سے زیادہ شیطان پر گراں ہے-" پس جو ساکت عن الحق اور مداہن ہے' وہ گونگا شیطان ہے- اب اس دور میں اکثر ملا' مولوی' حافظ' قاری' خطیب ایسے ہی پائے جاتے ہیں- فاروقی جذبہ رکھنے والے اقل قلیل ہیں-

باقی رہا حافظ صاحب کا یہ فرمان کہ کتاب میں بعض صغائر کو کبائر میں شامل کر دیا ہے' یہ آپ کی غلطی ہے۔ آپ نے کتاب کی تمہید میں کبائر کی تعریفوں پر غور نہیں فرمایا اور کتاب الکبائر ذہبی اور الزواجر ھیثمی کا مطالعہ نہیں کیا اور تحقیق مسائل میں محنت دماغی سے کام نہیں لیا۔ ان کا شغل اور شوق یہ ہے کہ آج یوں خطبہ دینا ہے اور فلاں جلسہ میں فلاں موضوع پر تقریر کرنی ہے' صبح یوں درس دینا ہے۔ مسائل کی پوری تحقیق سے مجرموں کی نشاندہی کرنا اُن پر صحیح فرد جرم لگانا دنیا آخرت کی سزا کا تصور دلانا' مسائل اختلافیہ اور نزاعیہ کی چھان بین کر کے صحیح مسلک ظاہر کرنا فی زمانہ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ میں نے موجودہ دور کے کئی مشہور علماء کے حالات سنے ہیں۔ اُن کے سامنے تصویر کشی ہو رہی ہے' وہ خاموش ہیں بلکہ اپنی تصویر بھی کھچوا رہے ہیں۔ مشترکہ اجلاس ہوتا ہے' وہاں ندائے غیر اللہ کے نعرے لگ رہے ہیں اور یہ گرو نانک کا مذہب رکھنے والے صلح کلی منکوس بن کر خاموش ہیں۔ اُن کا مسلک یہ ہے ؂

حافظا گر وصل خواہی صلح کن باخاص وعام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

ایسے مولویوں کے اخلاق کی تعریف ہوتی ہے اور اُن کو مزاج حلیم رکھنے والا کہا جاتا ہے۔
الزواجر میں یہ لکھا ہے : اعلم ان جماعة من الائمة انكروا ان فى الذنوب صغيرة بل سائر المعاصى كبائر (الى قوله) وقالت المعتزلة الذنوب على ضربين صغائر وكبائر هذا ليس بصحيح۔ "یعنی یہ بات جان لیں کہ ایک جماعت ائمہ کی اس بات سے انکاری ہے کہ گناہوں میں بعض گناہ صغیرہ بھی ہیں بلکہ تمام گناہ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں ہیں' کبیرے گناہ ہیں۔ اور معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ گناہ دو قسم کے ہیں۔ صغائر اور کبائر۔ یہ ان کا مسلکٔ صحیح نہیں ہے۔" حافظ صاحب کو اس پر غور کرنا چاہیے۔

حافظ صاحب : لیکن آج ہم اس تلخ حقیقت کے اظہار پر مجبور ہیں کہ مولانا تکفیر کے سنگین معاملہ میں بھی اسی راہ پر گامزن ہیں۔ حالانکہ یہ راہ بڑی پر خطر ہے۔

عارف حصاری : حق بات عموماً کڑوی ہوتی ہے' الحق مرٌّ۔ ہم بھی اسی حکم کی وجہ سے مجبور ہیں۔ قل الحق ولو كان مراً "کہ حق کہہ دو خواہ کڑوا لگے۔" اصل میں آپ کے اور ہمارے مسلک میں اختلاف ہے' اس لیے اتفاق ممکن نہیں۔ ہمارا مسلک تو یہ ہے کہ ہم اہل

السنۃ والجماعت اہلحدیث ہیں۔ اصحاب ظواہر فرقہ ناجیہ ہیں۔ ان سب ناموں کی ایک ہی تعریف ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے :

ھم الاخذون فی العقیدۃ والعمل جمیعا بما ظھر من الکتب والسنۃ وجری علیہ جمھور الصحابۃ والتابعین۔ (حجتہ اللہ جلد ا' ص-۱۷۰) "یعنی فرقہ ناجیہ وہ لوگ ہیں جو تمام عقائد اور اعمال میں ان احکام کو لیتے ہیں جو کتاب و سنت سے ظاہر ہوتے ہیں اور اُن پر جمہور صحابہ و تابعین کا تعامل جاری ہوتا ہے۔"

اور غیر ناجیہ کی یہ تعریف کی ہے کہ غیر ناجی وہ فرقہ ہے جو سلف کے عقائد کے خلاف عقائد اور ان کے اعمال کے خلاف عمل رکھے۔

اور مقدمہ حجتہ اللہ میں فرمایا کہ جب یہ زمانہ آیا کہ ہر شخص اپنی ہی رائے کا پابند ہونے لگا اور اپنے ہی خیالات فاسدہ کو پسند کرنے لگا تو ایک قوم نے ظاہر قرآن و احادیث کو نہایت مضبوط پکڑ لیا اور وہ عقائد سلف پر ہی قائم رہی اور قواعد عقلیہ کی موافقت اور مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کی۔

دراسات اللبیب ص-۳۰۲ میں ہے : واما اصحاب الظواھر فھم اھل الحدیث خیر اھل الحدیث خیر اھل العمل علی الارض وخیار العلماء وسادات ھذہ الامۃ والفرقۃ الناجیۃ ان شاء اللّٰہ تعالٰی۔ یعنی اصحاب الظواہر وہی اہل حدیث ہیں جو فرقہ ناجیہ اور اس امت کے سردار ہیں اور روئے زمین پر کتاب وسنت کے بہترین عامل ہیں اور خیار العلماء ہیں۔

پس کتاب وسنت کے نصوص کے وہ معانی ظاہرہ جو اہل لسان میں متعارف ہوں اور جن کو سنتے ہی ذہن اُن کی طرف منتقل ہو جائے مراد لینے چاہئیں۔ علامہ تفتازانی نے اپنی شرح میں لکھا ہے کہ ملاحدہ کو باطنیہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نصوص کے ظاہری معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ کچھ باطنی ہوتے ہیں۔ بنابریں جن آیات اور احادیث میں شرک اور کفر کا لفظ آیا ہو' ان میں ہم وہی شرک وکفر مراد لیتے ہیں جو متعارف اور متبادر الی الذہن ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کتاب و سنت کے اعلم بالمراد سمجھتے رہے۔ ہاں اگر کوئی قرینہ دوسری قسم کے کفر کا ہو تو پھر وہ مراد ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔ مثلاً حدیث یکفرون العشیر میں کفرباللہ مراد نہیں کفران عشیر مراد ہے۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے : من اتی حائضا او امراۃ فی دبرھا او کاھنا فقد کفر بما انزل علی محمد (ﷺ) "یعنی جس شخص نے حائضہ عورت سے جماع کیا یا عورت سے وطی فی الدبر کی یا کاہن کے پاس گیا کہ غیب کی خبریں دریافت کرے تو اس نے شریعت سے کفر کیا جو محمد ﷺ پر نازل کی گئی ہے۔"

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو تغلیظ اور تشدید پر محمول کیا ہے۔ اہل علم نے اس کی یہ توجیہ کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس حدیث میں او واؤ کے معنی میں ہے کہ جس شخص نے متبع ہوئی ہو کر یہ تینوں کام کئے وہ کافر ہوا۔ سو اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا شخص کافر ہے۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں : فصدقہ بما یقول فقد کفر۔ یعنی جس شخص نے کاہن کی باتوں کی تصدیق کی جو اس نے غیب دانی کا دعویٰ رکھ کر بیان کی تھیں' وہ کافر ہوا۔

اسی وجہ سے علماء اہلحدیث اور فقہائے احناف ان لوگوں کو کافر و مشرک سمجھتے ہیں جو انبیاء اور اولیاء کو غیب دان جانتے ہیں۔ پس تکفیر کے سلسلہ میں ہم قواعد اور اصول شریعت کے پابند ہیں۔ اس لیے ہم کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہاں مداہن مولویوں کو خطرہ ہے جو لومۃ لائم سے ڈرتے ہیں اور ان کا یہ مسلک ہے "

حج کعبہ بھی کیا گنگا کا اشنان بھی
راضی رہے رحمان بھی خوش رہے شیطان بھی

کسی شخص کو مومن یا کافر اس کے عقائد یا اعمال کی بناء پر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے : "ایک رات بارش ہوئی نبی ﷺ نماز فجر سے فارغ ہو کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ہی خوب جانتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ صبح کی میرے بندوں نے مومن اور کافر ہو کر۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس شخص نے یوں کہا کہ "اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی وہ میرے ساتھ مومن اور ستاروں کے ساتھ کافر ہے اور جنہوں نے یوں کہا کہ فلاں فلاں ستاروں کی تاثیر سے بارش ہوئی' وہ ستاروں کے ساتھ مومن اور میرے ساتھ کافر ہیں۔

پس سب بندے دو حال سے خالی نہیں ہیں۔ (۱) وہ جو بارش کو اللہ کے حکم اور اس کے فضل پر موقوف سمجھتے ہیں۔ یہ اللہ کے ساتھ مومن اور موحد ہیں اور ستاروں کی تاثیر سے بارش کے

منکر ہیں- ان کو کافر بالکواکب کہیں گے- (۲) وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں فلاں ستارہ' فلاں فلاں منزل میں گردش کرتا ہے تب بارش ہوتی ہے' یہ مومن بالکواکب اور کافر باللہ ہیں-

خلاصہ کلام یہ کہ ہم اللہ اور رسول کے احکام کے اصول کے تحت کسی کو مومن اور کسی کو کافر کہتے ہیں- اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں : هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ- (پارہ-۲۸) "اللہ وہ ذات ہے جس نے تم کو پیدا کیا پس بعض تم سے مومن ہیں اور بعض کافر- اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو (جس کی بناء پر تمہارے مومن یا کافر ہونے کا فیصلہ کرنا ہے) دیکھ رہا ہے-"

اللہ تعالیٰ نے مومنین کے صفات اور اعمال بیان فرما کر ارشاد فرمایا : أُولٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا- (یہ پختہ مومن ہیں- اب ان کو جو شخص مومن نہ کہے کافر سمجھے وہ خود کافر ہو جائے گا-)

اسی طرح ہمارا مسلک ہے کہ ایمان بھی کم وبیش ہوتا ہے اور کفر بھی- اب جو شخص اس کا انکار کرے گا وہ کافر ہو گا کیونکہ کتاب وسنت کے متواتر اور قطعی دلائل اور اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا انکاری ہے- تفسیر فتح القدیر میں ہے : والایات المتکاثرۃ والاحادیث المتواترۃ ترد ذالک وتدفعه- "یعنی جو لوگ ایمان کے کم وبیش ہونے سے انکار کرتے ہیں' اُن کے اس عقیدہ کو بہت سی آیات اور متواتر احادیث رد کرتی ہیں-"

اسی طرح ایمان قول وفعل کا نام ہے- پس جو شخص صرف قول یا صرف تصدیق یا قول وتصدیق ہر دو کا نام ایمان رکھتا ہے وہ گمراہ اور مرجیہ ہے اور یہ عقیدہ باطل ہے اور جو قول وفعل کا نام ایمان رکھتا ہے اور فعل کو دو قسم فعل القلب' فعل الجوارح قرار دیتا ہے وہ اہل حق سے ہے- یا یوں کہتا ہے کہ ایمان' قول باللسان اور تصدیق بالقلب اور عمل بالارکان کا نام ہے' یہ بھی درست ہے- اس کے ماسوا گمراہی ہے-

حافظ صاحب : مولانا کا مسلک تکفیر کے معاملہ میں محدثین کی بجاء معتزلہ وخارج کے ___ الخ

عارف حصاری :

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خون نکلا

میرے مخاطب حافظ ابراہیم صاحب کیرپوری کہلاتے ہیں۔ اس لیے میں نے سمجھا تھا کہ ان کا عقیدہ بھی حضرت العلام محدث و مفتی اعظم روپڑی رحمۃ اللہ علیہ و دیگر اکابر بزرگان دین کی طرح اہل حدیث سلفی ہو گا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ حافظ صاحب کیرپوری کا عقیدہ ان کے خلاف ہے۔ اگر ان کے موافق ہوتا تو بے نمازوں' سوشلسٹوں' عاق سرکشوں کی حمایت میں محدثین کرام پر الزام نہ لگاتے۔

حافظ صاحب کو میرا مشورہ ہے کہ وہ توحید اور سنت نبوی میں کمال حاصل کرنے کے لیے حضرت العلامہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "دین خالص" کسی عالم باللہ وعالم بامر اللہ کی شراکت سے مطالعہ کریں۔ خصوصاً جلد اول ص-۱۱۵ تا ص-۱۱۷ ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ نواب صاحب مرحوم نے مدعیان اسلام' کلمہ گو کی موجبات کفر سے تکفیر ثابت کی ہے اور کئی ایک مسائل کے نظائر پیش کرتے ہوئے ص-۱۱۵ میں یوں ارشاد فرمایا ہے :

وقد ذھب جماعۃ من الصحابۃ ومن بعدھم الی کفر تارک الصلٰوۃ متعمدا حتی خرج وقتھا منھم ابن مسعود وابن عباس وابن عمر ومن غیر الصحابۃ احمد بن حنبل واسحاق وابن المبارک وھذا فی ترکھا۔ "یعنی جو شخص جان بوجھ کر نماز چھوڑ دے اس کو ایک جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کافر قرار دیا ہے جن میں حضرات ابن مسعود' اور ابن عباس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اور غیر صحابہ میں مشہور ائمہ دین امام احمد' امام اسحاق' ابن مبارک رئیس التابعین ہیں۔ یہ تکفیر محض ترک نماز پر منقول ہے۔"

پھر لکھا ہے کہ علامہ محلی نے بے نماز کی تکفیر پر اور امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الصلٰوۃ کفر بے نماز کے بارے میں بہت اچھی لکھی ہے۔ پھر فرمایا "کتاب ہدایۃ السائل الی ادلۃ المسائل میں ایک مستقل بحث کی گئی ہے کہ جو شخص عمداً بلا عذر شرعی نماز ترک کر دے گا وہ کافر ہے' یہ حکم شرعی میں صحیح ہے۔"

نیز لکھا ہے : قال بکفر تارک الصلٰوۃ جماعۃ من الصحابۃ والتابعین ففی کتاب الترغیب والترھب للمنذری عن عمرو بن حزم انہ جاء کفر تارک الصلٰوۃ عن عمرو عبدالرحمٰن بن عوف ومعاذ بن جبل وابی ھریرۃ۔ "یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت تارک صلٰوۃ کے کافر ہونے کی قائل ہے اور امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ترغیب والترہیب میں لکھا ہے کہ حضرت عمر' عبدالرحمٰن بن عوف' معاذ بن جبل اور

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مشہور اہل حدیث تارک صلوٰۃ کو کافر کہتے تھے۔"

اب حافظ محمد ابراہیم صاحب کمیرپوری کو اختیار ہے کہ وہ تمام اکابر صحابہ' تابعین' محدثین اور ائمہ دین کو معتزلہ لکھیں یا اس الزام سے توبہ اور رجوع کریں۔ ومن لم یتب فاولئک ھم الظالمون۔

عارف حصاری کا مسلک وہی ہے جو مذکورہ بالا سلف صالحین کا ہے۔ جو شخص ان اکابر سلف صالحین کو معتزلہ و خوارج قرار دے گا وہ جھوٹا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب غنیتہ الطالبین میں نماز کی اہمیت بیان کرتے ہوئے تارک نماز کی بابت ائمہ دین کا مسلک بیان کیا ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ لکھا ہے کہ "جو شخص نماز کو فرض سمجھنے کے باوجود محض سستی سے ترک کرے' اس کو نماز کے وقت نماز پڑھنے کے لیے بلانا چاہیے۔ اگر اس پر بھی وہ حاضر نہ ہو اور نماز کا وقت تنگ ہو گیا تو وہ شخص کافر ہے اور اس کا تلوار سے قتل کرنا اس وقت جائز ہے کہ تین روز تک اس سے توبہ کرائی جائے۔ اگر وہ توبہ نہ کرے تو دونوں حال میں مرتد کی مانند ہے۔ اس کا مال چھین کر مسلمان بیت المال میں داخل کریں۔ اس کا جنازہ نہ پڑھا جائے' نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔"

دوسرا قول عدم تکفیر کا ذکر کر کے شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا فیصلہ یوں دیا ہے : والدلیل علی کفرہ ما ذکرنا فیما تقدم من الایات والاخبار۔ "یعنی بے نماز کے کفر پر ہم پہلے قرآن وحدیث سے دلائل ذکر کر چکے ہیں۔"

اس کے بعد مزید دلائل بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی اور کفر و شرک کے درمیان پیوند لگانے والی چیز ترک نماز ہے۔ پھر دوسری حدیث لکھی ہے کہ فمن ترکھا فقد کفر "جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہو گیا۔" اب حافظ صاحب کمیرپوری بتائیں کہ شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کا کیا فتویٰ ہے؟ اگر آپ پیر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ پر فتویٰ نہیں لگا سکتے تو پھر عارف حصاری کو کیوں خواہ مخواہ معتزلہ اور خوارج کی طرف دھکیل رہے ہیں؟

علاوہ ازیں اور سنئے! آپ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کو جانتے ہیں' وہ اندلس کے شہرہ آفاق مجتہد اور محقق گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنی نفیس کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" کی جز سابع

ص-۹۷۰ میں لکھا ہے : والذی لا یشک فیه ان من بلغته هذه الآثار وصحت عنده ثم استجاز خلاف ماصح عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اتباعا لقول ابی حنیفة ومالک فهو کافر مشرک حلال الدم والمال لا حق بالیهود والنصاریٰ۔ "یعنی اس میں شک نہیں کہ جس شخص کو کسی مسئلہ میں احادیث صحیحہ نبویہ پہنچ گئیں پھر اس نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید پر جمود کرتے ہوئے صحیح احادیث کا خلاف کیا' وہ شخص کافر' مشرک اور یہود ونصاریٰ کا ساتھی ہے۔ شرعاً اس کا خون بہانا اور مال لوٹنا جائز ہے۔"

اب حافظ صاحب کمیرپوری خود ہی بتائیں کہ تقلید شخصی پر اس قسم کا جمود رکھنے والوں کے حق میں ان کا کیا فتویٰ ہے اور کیا ایسے گناہ پر تکفیر کرنے والا معتزلہ یا خوارج ہے؟

کشف الغمہ جلد ا' ص-۷۹ میں ہے : کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول بین الرجل وبین الکفر ترک الصلوٰۃ فمن ترکها فقد کفر۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ بندہ اور کفر کو ملانے والا گناہ ترک صلوٰۃ ہے جس نے نماز چھوڑ دی وہ کافر ہوا۔"

پھر ابو یعلیٰ کی یہ حدیث نقل کی ہے : عری الاسلام وقواعد الدین ثلثة علیهن أسس الاسلام من ترک واحدة منهن فهو بها کافر حلال الدم والمال شهادة ان لا اله الا اللّٰہ والصلوٰۃ المکتوبة وصوم رمضان۔ "یعنی اسلام کی رسی اور دین کی بنیاد تین چیزیں ہیں۔ کلمہ طیبہ' فرض نماز اور رمضان کا روزہ۔"

اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کو ترک کرے گا تو وہ ایسا کفر ہو جائے گا جس کا قتل کرنا اور مال لوٹنا روا ہے۔

ترغیب میں اور کشف الغمہ ص-۲۰۳ میں ہے : وفی روایة من ترک واحدة فهو باللّٰہ کافر ولا یقبل منه صرف ولا عدل وقد حل دمه وماله۔ "یعنی جو تینوں میں سے کسی ایک کو چھوڑ دے گا وہ کافر باللہ ہے۔ جس کی کوئی نیکی' فرض' نفل وغیرہ قبول نہیں' اس کا خون اور مال سب حلال ہے۔" اس حدیث کی سند حسن ہے اور اس نے بے نماز کے کفر کو کفر دون کفر کی تاویل کرنے والوں کی زبان بند کر دی ہے۔ اب وہ کوئی تاویل نہیں کر سکتے۔

حافظ محمد ابراہیم صاحب کمیرپوری بھی سوچ سمجھ کر بات کریں۔ اگر وہ کشف الغمہ کو حدیث کی معتبر کتاب نہ سمجھیں تو وہ یہی حدیث ترغیب وترہیب منذری کی کتاب الصلوٰۃ' کتاب الصوم میں تلاش کر لیں۔ کشف الغمہ میں لکھا ہے : وکان الخلفاء الراشدون رضی

اللہ عنهم لا یرون شیئا ترکه کفر غیر الصلٰوة۔ "یعنی خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نماز کے سوا کسی چیز کے ترک کو کفر نہ جانتے تھے۔"

اس سے بھی کفر دون کفر کا رد ہو گیا۔ کیونکہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کفر دون کفر تو بعض دیگر چیزوں میں جانتے تھے۔ ترک نماز کو حقیقی کفر سمجھتے تھے۔ میرے پاس کئی کتاب الصلٰوۃ ہیں۔ ایک کتاب علامہ محقق محمد عبدالرزاق حمزہ امام ثانی حرم مکہ شریف کی ہے۔ انہوں نے بے نماز کو کافر خارج از اسلام لکھا ہے۔ چنانچہ ص-۵ پر احادیث تکفیر لکھ کر کہتے ہیں : قال ابو محمد بن حزم وقد روی عن عمر بن الخطاب وعبدالرحمٰن بن عوف ومعاذ بن جبل وابی هریرة وغیرهم من الصحابة رضی اللہ عنهم ان من ترک الصلٰوة فرض واحدة متعمدا حتی یخرج وقتها فهو کافر مرتد ولا نعلم لهٰؤلاءِ من الصحابة مخالفا۔ "یعنی ابو محمد بن حزم نے بیان کیا کہ حضرات اکابر صحابہ کرام عمرؓ عبدالرحمٰنؓ معاذؓ ابوہریرہ وغیرہم رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ جس شخص نے ایک فرض نماز چھوڑ دی کہ اس کا وقت بالکل چلا گیا اور اس نے عمداً نہ پڑھی تو وہ کافر مرتد ہو گیا۔ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف کوئی صحابی معلوم نہیں ہوا۔"

میں کہتا ہوں کہ اس میں اشارہ ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بے نماز کے کافر مرتد ہونے پر اجماع تھا اور اس اجماع پر چار دلیلیں اور بھی ہیں۔

اول یہ کہ مشکوٰۃ میں بحوالہ ترمذی عبداللہ بن شقیق کی روایت ہے' وہ فرماتے ہیں : کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لا یرون شیئا من الاعمال ترکه کفر غیر الصلٰوة۔ "یعنی صحابہ کرام اعمال میں سے کسی عمل کے ترک کو کفر نہ سمجھتے تھے' سوائے نماز کے۔"

اس حدیث کی شرح میں علامہ عبیداللہ محدث مبارک پوری مدظلہ کہتے ہیں :

والحدیث فیه دلیل ظاهر علی ان الصحابة رضی اللہ عنهم کانوا یعتقدون ان ترک الصلٰوة کفر۔ یعنی اس حدیث میں اس بات پر صاف ظاہر دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اعتقاد رکھتے تھے کہ نماز چھوڑنا کفر ہے جو نہ رکھے وہ مردود العقیدہ ہے۔ پھر علامہ مبارک پوری فرماتے ہیں کہ "اس مقالہ سے ظاہر ہے کہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع ہے۔ کیونکہ لفظ اصحاب جمع کا صیغہ ہے جو لفظ رسول کی طرف مضاف ہے تو جب تک کسی

کا استثناء ثابت نہ ہو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی مراد ہیں۔" پس بے نماز کے کافر ہونے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ثابت ہو گیا۔ جو شخص اس کے خلاف عقیدہ رکھے گا وہ خارق اجماع ہے۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع کے حجت شرعی ہونے پر بھی علمائے اہل حق کا اجماع ہے جس کا خلاف گمراہی ہے۔

دوسری دلیل اجماع کی یہ ہے کہ امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الصلوٰۃ میں باسنادہ حضرت ایوب تابعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے: قال ترک الصلوٰۃ کفر لا یختلف فیہ۔ "یعنی نماز کا چھوڑنا ایسا کفر ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، یعنی سب کا اتفاق ہے۔" امام محمد بن نصر مروزی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس مسئلہ پر کتاب لکھی ہے کہ "بے نماز کافر ہے۔"

تیسری دلیل اجماع کی یہ ہے کہ کتاب الصلوٰۃ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کے ص۔۱۴۴ میں "ام اجماع الصحابة" کا عنوان لکھ کر پھر باسناد عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے واقعہ شہادت کا ذکر کیا ہے کہ حضرت پر غشی طاری تھی جب ہوش آئی تو فرمایا ھل صلی الناس "کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟" حاضرین نے کہا ہاں ہم نے نماز پڑھ لی ہے۔ فقال لا اسلام لمن ترک الصلوٰۃ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "جس شخص نے نماز چھوڑ دی، اس کا کوئی اسلام نہیں ہے۔

دوسرے سیاق میں یوں ہے: لا حظ فی الاسلام لمن ترک الصلوٰۃ۔ یعنی جس شخص نے نماز ترک کر دی اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ پھر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے اس نازک حالت میں نماز ادا کی۔ پھر لکھا ہے کہ فقال ھذا یحضر من الصحابة ولم ینکروا علیہ۔ یعنی حضرت فاروق رضی اللہ عنہ (جن کے دل اور زبان پر حق جاری تھا) نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع میں بے نمازوں پر یہ فتویٰ صادر فرمایا جس پر کسی نے انکار نہ کیا تو ثابت ہو گیا کہ بے نماز کے خارج از اسلام ہونے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔ بے نمازوں اور ان کے وکیلوں، ملا مولویوں سے عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ نماز کی اسلام میں کس قدر اہمیت ہے۔ پڑھے گا تو مسلمان ہے، نہ پڑھے گا تو اسلام سے خارج ہے۔ اگر خارج نہ ہوتا اور اس کے کلمہ کا اعتبار ہوتا تو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ علی الاطلاق اس کے اسلام کی نفی نہ کرتے، کچھ نہ کچھ ضرور بتلاتے۔

نماز رُکن اسلام ہے: تارک نماز کے کلمہ کا اعتبار نہیں ہے۔ کیونکہ جیسے شہادتین رُکن اسلام ہے، ویسے ہی نماز (جو مقرون بالشہادتین احادیث میں مذکور ہے) رُکن اسلام ہے۔

رکن کی جو تعریف علماء اصول نے کی ہے' وہ حضرت شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ اصول فقہ کے ص-۲۱ کے حاشیہ نمبر-۴ میں یہ لکھی ہے : رکن الشئی مالا یوجد ذالک الشئی الا بہ۔ "یعنی کسی چیز کا رکن وہ ہوتا ہے جس کے بغیر اصل چیز کا وجود نہ پایا جائے-" یعنی رکن ہر چیز کی ماہیت میں داخل ہوتا ہے- جیسے سورہ فاتحہ نماز کا رکن ہے پس فاتحہ کے سوا نماز کا وجود متحقق نہ ہو گا-

شرح عقائد نسفی ص-۷۶ ایمان کی بحث میں لکھا ہے کہ القطع بانہ لا تحقق الشئی بدون رکنہ "یعنی یہ قطعی بات ہے کہ کسی شے کا تحقق بغیر رکن کے نہیں ہوتا-" نماز عین ایمان ہے- جیسے فاتحہ عین نماز ہے تو نہ بغیر فاتحہ کے نماز کا وجود قائم ہوتا ہے اور نہ بغیر نماز کے ایمان اور اسلام کا وجود قائم ہوتا ہے-

<u>تارک فاتحہ بے نماز ہے :</u> امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ احکام الاحکام کے ص-۳۳ میں فرماتے ہیں : کان من لم یقراھا لیس مصلیا فمن قراٰھا فھو مصل بلا شک۔ "یعنی جس نے نماز میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی' وہ نمازی نہیں اور جس نے فاتحہ' نماز میں پڑھ لی وہ بلاشبہ نمازی ہے-" پس اسی طرح قرآن کی آیت وما کان اللّٰہ لیضیع ایمانکم میں بروئے تفسیر حدیث نبوی وعلماء ایمان سے مراد نماز ہے- ایمان کو نماز اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں نیت' قول اور عمل تینوں پائے جاتے ہیں یا یوں سمجھ لیں کہ ایمان کے تین رکن ہیں- تصدیق' اقرار اور عمل- نماز میں یہ تینوں موجود ہیں' اس لیے نماز عین ایمان ہے- جس نے نماز ترک کر دی اس کا ایمان ختم ہوا- وہ بے ایمان ہے' مومن نہیں ہے-

کتاب الصلوٰۃ لابن القیم کے ص-۱۵۴ میں ہے : فلا یسمی تارک الصلوٰۃ مسلما ومومنا۔ "یعنی تارک نماز کو نہ مسلمان کہہ سکتے ہیں اور نہ مومن-" حافظ صاحب کمیرپوری امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کو معتزلہ کہیں یا خارجی- علمائے اہل حدیث نے ان کو محققین میں اور ملا علی قاری نے اولیاء اللہ میں شمار کیا ہے- فتذکروا۔

اجماع کی چوتھی دلیل امام اسحاق رئیس الائمہ کی شہادت ہے- چنانچہ امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کتاب الصلوٰۃ کے ص-۱۵۵ میں یوں نقل کرتے ہیں : قال عبداللّٰہ بن نصر سمعت اسحاق یقول صح عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم الی یومنا ھذا ان تارک الصلوٰۃ عمداً من غیر علر حتی یذھب وقتھا کافر۔ "یعنی عبداللہ بن نصر نے کہا کہ میں نے امام

اسحاق سے سنا ہے' وہ فرماتے تھے کہ جناب نبی کریم ﷺ سے صحیح طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تارک نماز کافر ہے۔" یہی رائے ہے تمام اہل علم کی نبی اکرم ﷺ سے لے کر ہمارے اس دن تک کہ نماز کو جو شخص بغیر کسی عذر کے جان بوجھ کر چھوڑ دے گا" وہ کافر ہے۔

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کتاب و سنت اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم سے دلائل پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ فلا یستحی من هذا قوله من انکاره تکفیر من شهد بکفره الکتاب والسنة۔ "یعنی وہ شخص جس کا یہ قول ہے کہ بے نماز مومن ہے' وہ حیا اور شرم نہیں کرتا کہ ایسے شخص کی تکفیر سے انکار کرتا ہے جس کے اوپر کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ ﷺ اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم شاہد ہیں۔"

سلف صالحین کا اجماع ثابت ہو گیا تو حافظ صاحب کیرپوری کی وکالت باطل ہو گئی اور وہ اس تکفیر کے انکار کی وجہ سے خود گنہگار اور مجرم ہیں۔ سنیئے! معتزلہ وغیرہ گمراہ فرقے علی الاطلاق کبیرے گناہ کرنے والوں کو ایمان سے خارج اور مخلد فی النار کہتے ہیں۔ ہمارا یہ مسلک نہیں ہے' ہم رکن ایمان کے تارک اور اصول ایمان کی رُو سے جس پر کفر کا حکم عائد ہوتا ہو' اس کو کافر کہتے ہیں جیسا کہ علمائے کتب دینیات میں موجبات کفر ذکر کیے ہیں۔ مثلاً :

ملا علی قاری حنفی نے شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ "اولیائے کاملین سے عبادات ظاہر ساقط ہو جاتی ہیں اور وہ صرف تفکر اور تحسین اخلاق باطنہ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔" هذا کفر وزندقة وضلالة وجهالة۔ "یعنی ایسا عقیدہ کفر اور بے دینی اور گمراہی اور جہالت ہے۔"

پھر لکھا : فقد قال حجة الاسلام ان قتل هذا اولی من مائة کافر۔ "یعنی ایسے عقیدہ وگفتار والے شخص کا قتل کرنا سو کافروں کے قتل کرنے سے بہتر ہے۔" لیکن یہ کام حکومت مسلمہ کا ہے۔ اب بے نمازوں' زندیقوں اور سوشلزم کے حامیوں کی وکالت کرنے والوں کو غور کرنا چاہیے کہ یہ کیسی سختی ہے جو اکابر علماء کر چکے ہیں کہ کلمہ گو ایمان باللہ رکھنے والوں پر ایسا حکم لگا رہے ہیں کہ ان کا قتل سو کافر منکرین اسلام کے قتل کے برابر ہے۔

تارک صلوٰۃ کے کفر پر عالمانہ بحث : رسالہ "حکم النبی بکفر من لا یصلی" ملاحظہ کریں۔ اس کے صفحہ نمبر۳۹ پر عربی عبارت کا ترجمہ یہ لکھا ہے : "حافظ عبدالحق اشبیلی نے اپنی کتاب تارک الصلوٰۃ میں فرمایا یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت ومن

بعلھم کا فتویٰ ہے۔ تکفیر تارک الصلوٰۃ پر' یہاں تک کہ نکل جائے تمام وقت اس کا۔ انہی میں سے :

- حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔
- حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ۔
- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔
- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ۔
- حضرت جابر رضی اللہ عنہ۔
- حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ۔
- اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

اور غیر صحابہ میں سے :

- حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ۔
- حضرت امام اسحاق رحمۃ اللہ علیہ۔
- حضرت امام ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ۔
- حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ۔
- حضرت حکم بن عینیہ رحمۃ اللہ علیہ۔
- حضرت ایوب سختیانی رحمۃ اللہ علیہ۔
- حضرت ابوداؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ۔
- حضرت ابوبکر بن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ۔
- حضرت ابو خیثمہ رحمۃ اللہ علیہ۔
- حضرت زہیر بن حرب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہیں۔

اب کمیرپوری حافظ صاحب جواب دیں کہ مذکورہ بالا ائمہ دین محدثین میں شمار ہیں یا نہیں؟ اگر آپ اثبات میں جواب دیں تو آپ توبہ کریں اور اگر مذکورہ بالا ہستیاں آپ کے نزدیک محدثین میں شمار نہیں ہیں تو پھر آپ اپنے علم اور معلومات کا ماتم کریں۔

حافظ صاحب : مولانا کے طبعی تشدد ہی کا اثر ہے کہ وہ اپنے مذکورہ جملہ میں عقوق والدین کو کبیرہ گناہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اس کبیرہ کے نتیجہ میں اسے کافر بھی قرار دیتے

ہیں۔ الخ"

عارف حصاری : یہ بات تو ٹھیک ہے کہ ہر کبیرہ گناہ کفر مخرج اسلام نہیں لیکن ہر کبیرہ گناہ کفر کی شاخ ہے۔ جیسے ہر نیکی اور عمل صالح' ایمان کی شاخ ہے۔ اور یہ آپ کی جہالت کا ثمرہ ہے کہ آپ کبیرہ گناہ اور کفر میں تضاد اور تخالف بتا رہے ہیں۔ ایک ہی چیز کبیرہ گناہ بھی ہو سکتی ہے اور شرک اور کفر بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً حدیث میں سحر (جادو) کو کبائر میں شمار کیا گیا ہے اور سحر کو کفر بھی قرار دیا گیا ہے۔ (وغیر ذالک)

اور یہ بھی سمجھ لو کہ جب کبیرہ گناہ پر اصرار کیا جائے جس سے خوف الٰہی دل میں نہ رہے اور حکم شرعی سن کر گنہگار ناراض اور رُوگرداں ہو جائے تو ایسا کبیرہ گناہ حد کفر میں داخل ہو جاتا ہے۔

"دائمی بے نماز علمائے حنفیہ کے نزدیک بھی کافر ہیں": شرح فقہ اکبر ص ۲۰۶ میں موجبات کفر کے ضمن میں لکھا ہے : "الاصرار علی الکبیرۃ کفر حقیقی" "یعنی کسی بڑے گناہ پر ہمیشگی کفر حقیقی ہے۔" مثلاً کسی نے کسی بے نماز کو کہا کہ میاں نماز پڑھا کرو تو اس نے کہا رمضان تک صبر کرو پھر پڑھیں گے تو وہ کافر ہوا۔ اس کی کلام سے ظاہر ہے کہ بغیر رمضان میں وہ نماز فرض نہیں جانتا۔ اسی طرح بے نمازوں کے نماز سے انکار کی بہت سی صورتیں آج کل پائی جاتی ہیں جن کا کفر اجماعی قرار پاتا ہے۔ یہ حافظ صاحب کی مداہنت ہے کہ وہ علی الاطلاق سب بے نمازوں کو اپنا مسلمان بھائی سمجھتے ہیں۔ اگر یہ عاجز کافر کہتا ہے تو وہ اس کو میرا طبعی تشدد اور معتزلہ وغیرہ کی ہم نوائی قرار دیتے ہیں جو صریح ظلم ہے۔ اگر یہ میرا طبعی تشدد ہے کہ میں کسی بے نماز عاق بیٹے کو کافر نااہل وراثت قرار دیتا ہوں تو پھر آپ حضرت جامع العلوم نواب صاحب محدث بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ کو کیا خطاب دیں گے۔

نواب صدیق خاں رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ: نواب صاحب اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں فرماتے ہیں : "یہ آیت اور سارے اخبار و آثار مذکورہ وغیر مذکورہ دلیل واضح ہیں۔ اس بات پر کہ حکم تارک حج اور تارک نماز کا ایک ہی ہے جس طرح عمداً نماز فرض کے چھوڑنے سے کافر ہو جاتا ہے' اسی طرح عمداً حج نہ کرنے سے کافر بن جاتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اسلام کی پانچ بنائیں ہیں۔ ان پانچوں کا حکم وجوب و فرضیت یکساں ہے۔ یہ بات غلط مشہور ہے کہ تارک روزہ و حج و زکوٰۃ فاسق ہوتا ہے نہ کافر' بلکہ حنفیہ تو تارک نماز کو بھی کافر نہیں سمجھتے۔ مگر امام

احمد وشافعی وتمام محدثین رحمہم اللہ اجمعین کے نزدیک دیدہ ودانستہ ایک فرض نماز کے ترک کرنے سے (بلا عذر شرعی' جیسے سو گیا یا بھول گیا یا بیماری میں بیہوش رہا) بلاشک وشبہ وہ کافر ہو جاتا ہے۔ اس کو بعد طلب توبہ کے اگر نہ ملنے تو فی الفور قتل کریں (لیکن یہ کام حکومت اسلامیہ ہی کرے گی۔ (مدیر) نماز جنازہ نہ پڑھیں' مقابر مسلمین میں دفن نہ کریں ...... یہی حکم ہے ہر بنائے اسلام کا جو حدیث "بنی الاسلام علی خمس" میں مذکور ہے۔" (انتھی بلفظہ) (تفسیر ترجمان القرآن بلطائف البیان ص-۴۷۷)

اس عبارت کو پڑھ کر حافظ صاحب فیصلہ صادر کریں کہ یہ حضرت نواب محدث بھوپالی رحمہ اللہ کا شرعی تشدد تھا یا طبعی؟

حافظ کمیرپوری : عقوق والدین کو کبیرہ گناہ بھی تسلیم کرتے ہیں پھر اس کبیرہ گناہ کے نتیجہ میں اسے کافر بھی قرار دیتے ہیں حالانکہ مسلک محدثین میں ہر کبیرہ گناہ کفر نہیں۔

عارف حصاری : حافظ صاحب! آپ میرے فتویٰ پر نظرثانی کریں کہ اس میں صرف عاق پر کفر کا حکم عائد نہیں کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ اور وجوہ کفر بھی ہیں اور عاق بے باک جو اپنے باپ سے روگرداں ہو کر باغی ہو گیا' اس پر بموجب حدیث پیش کردہ کفر کا حکم لگایا ہے۔ حافظ صاحب آپ عدالتی وکیلوں کی طرح غلط اور ناجائز حمایت نہ کریں اور فتویٰ کی عبارت سے کتر بیونت کر کے کام نہ لیں۔ اسے دنیوی مقدمہ کی جیت ہار نہ سمجھیں بلکہ یہ شرعی مسئلہ ہے جس کا محاسبہ آپ سے قیامت کے دن بہ نسبت دیگر وکیلوں کے سختی سے ہو گا۔ ملحد زندیق لوگ قرآن سے لا تقربوا الصلوٰۃ پڑھ کر نماز سے استعفیٰ دے دیا کرتے ہیں' وہ بھی کلمہ گو ہیں اور آپ کے بھائی مسلمان کہلاتے ہیں اور ایک اور قسم کے اولیائی لباس میں رہ کر یہ سمجھتے ہیں کہ نماز وغیرہ عبادات ہم سے ساقط ہیں کیونکہ قرآن میں ہے واعبد ربک حتی یاتیک الیقین کہ عبادت اپنے رب کی اس وقت تک کرو کہ اس کی ذات کی معرفت اور یقین حاصل نہ ہو۔

آپ ذرا سوچ سمجھ کر وکالت کریں' بے نماز کلمہ گو کی مغفرت ونجات کے ذمہ دار ہو کر جنت کے داخلہ کا ٹھیکہ نہ لیں۔ جو بلا سوچے سمجھے مجرموں کے وکیل بن جاتے ہیں' وہ آخر کار شکست کھا کر شرمندگی اٹھایا کرتے ہیں۔ دیکھو زنا کرنا' شراب پینا کبیرے گناہ ہیں اور جھوٹ بولنا بھی بہت بڑا گناہ ہے۔ اگر کسی سے یہ گناہ صادر ہو جائیں لیکن وہ مجرم ان کو گناہ سمجھ کر

ندامت کریں اور خوف الٰہی ان کے دل میں ہو اور قیامت کے عذابوں کا ڈر بھی ہو تو پھر یہ مجرم گنہگار فاسق فاجر ہیں لیکن جب زنا کو اپنا پیشہ بنا لیں جیسے کنجر قوم اور بازاری رنڈیاں ہیں کہ ان کو کوئی حیا اور ندامت نہیں' وہ زنا کو پیشہ سمجھ کر اپنی کمائی پر خوش ہیں اور ان کے دلوں میں خوف الٰہی نہیں ہے تو یہ مستحل کے حکم میں آکر کافر شمار ہوں گے۔

اسی طرح شرابی لوگ جو شراب کے عادی ہیں اور شراب کا ٹھیکہ لے کر یہ کام کرتے ہیں' نہ ان کو ندامت ہے اور نہ خوف الٰہی ہے۔ جب ان کو اللہ رسول کا حکم سنایا جائے تو یہ لوگ مذاق کرتے ہیں اور حجت سازی سے جواب دے کر ناصح کو حقیر جانتے ہیں۔ ایسے لوگ (کبیرہ گناہ کرنے والے) کافر ہیں۔ آپ فقہائے محدثین کے موجبات کفر کا مطالعہ کر کے پھر ان گناہ پیشہ لوگوں کی وکالت کریں ورنہ آیت ولا تکن للخائنین خصیما۔ "یعنی نہ ہو خائنوں کی طرف سے جھگڑنے والا۔" کی خلاف ورزی پائے جائے گی اور آپ اس آیت کے مورد ہو جائیں گے: ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔

قرآن میں ہے: لا یامن مکر اللّٰہ الا القوم الخاسرون۔ "یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خاسرون ہی بے خوف ہوتے ہیں۔" "خسران مبین" کفار کے لیے قرآن میں وارد ہے۔ اس لیے اس کی تفسیر' تفسیر مدارک جلد-۲' ص-۴۳ میں یوں کی گئی ہے: الا الکافرین الذین خسروا انفسھم حتی ھاروا الی النار۔ یعنی عذاب الٰہی سے بے خوف کافر لوگ ہی ہوتے ہیں جو اپنے نفسوں کو خسارہ دے کر جہنم میں جا پہنچتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو وعظ و نصیحت کی جائے تو وہ سنتے ہیں اور نہ قبول کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر ضلالت اور کفر کی مہر لگا دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ونطبع علی قلوبھم فھم لا یسمعون۔ "یعنی جو لوگ کھلم کھلا بے خوف ہو کر گناہ کرتے ہیں' ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں تو وہ وعظ و نصیحت نہیں سنتے۔"

قرآن کی سورۃ مطففین میں ارشاد ہے: کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون۔ "یعنی خبردار! بات یہ نہیں جو تم کہتے ہو بلکہ ان کے دلوں کو ان کے گناہوں نے زنگ آلود کر دیا ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تحقیق بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے

دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ پس اگر اس گناہ سے توبہ کر لے تو دل صاف کیا جاتا ہے اور اگر زیادہ گناہ کرتا ہے تو وہ نقطہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔" سو یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا کلا بل ران علٰی قلوبھم ما کانوا یکسبون۔

تفسیر فتح القدیر آخری جلد' ص ۳۸۹ میں ہے : ھو الذنب علی الذنب حتٰی یعمی القلب۔ "یعنی جب انسان گناہ پر گناہ کرتا ہے تو اس کا دل گناہوں کی کثرت سے اندھا ہو جاتا ہے۔" یہ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

امام مجاہد رئیس التابعین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "دل مثل ہتھیلی کے سمجھو۔" یہ کہہ کر انہوں نے ہتھیلی کھول کر بلند کی اور فرمایا "انسان جب گناہ کرتا ہے تو اس کا دل منقبض ہو جاتا ہے۔ (پھر ایک انگلی بند کر لی اور فرمایا) پھر جب دوسرا گناہ کرتا ہے تو اس کا دل اور منقبض ہو جاتا ہے (پھر ایک اور انگلی بند کر لی) پھر اسی طرح سب انگلیاں بند کر لیں اور فرمایا کہ پھر گناہوں کی کثرت سے دل پر گمراہی کی مہر لگ جاتی ہے اور دل بند ہو جاتا ہے۔ پھر اس پر کسی واعظ کا وعظ اور کسی ناصح کی نصیحت اثر نہیں کرتی)"

ایسے لوگوں کی بابت مولانا حافظ محمد مرحوم رحمۃ اللہ علیہ نے احوال الآخرت میں یہ فرمایا ہے :

جنہاں دے دل مہراں جڑیاں ازلی قہر الہوں
اوہ وچ گمراہی گئے پریرے رد ہوئے درگاہوں
نال قرآن حدیث جے اوناں کرے نصیحت کوئی
اک ذرہ اثر نہ ہووے ہرگز قسمت مندی ہوئی

پس ایسے ہی جرائم پیشہ' زنگار آلودہ' مہر زدہ لوگوں کو ہم کافر کہتے ہیں۔

<u>کفر دون کفر پر بحث:</u> حافظ صاحب کمیر پوری نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "مسئلہ تکفیر میں ہمارا مزاج اپنے مخالف کے مزاج سے مختلف ہے۔" یہ سب عقیدہ اور عمل اصولی اختلاف سے بگڑتا ہے۔ مثلاً

ہم سورہ فاتحہ کو ذات نماز کا جزء بلکہ اس کی روح اعتقاد سمجھتے ہیں۔ اس لیے تارک فاتحہ کو مثل مسئی صلٰوۃ کے کہتے ہیں۔ ارجع فصل لم تصل فانک لم تصلی (کہ دوبارہ نماز ادا کرو پہلی نماز جو بغیر فاتحہ کے تھی اس کا وجود ہی نہیں ہے) اور ہم اس پر حدیث لا صلوٰۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب جو متواتر ہے' پیش کرتے ہیں اور لام نفی جنسی کا قرار دیتے

ہیں جیسے کہ کلمہ لا الہ الا اللہ میں ہے لیکن حنفیہ لاَ نفی کمال کا ٹھہرا کر بغیر فاتحہ کے نماز کا وجود شمار کرتے ہیں۔ یہ اختلاف ان کا اور ہمارا قدیم سے چلا آتا ہے۔

اور یہی اصولی اختلاف ایمان کے بارہ میں ان کے ساتھ قائم ہے کہ ہم ارکان اسلام کو ایمان کی ذات کے اجزاء قرار دیتے ہیں اور وہ کمال ایمان کو شرط ٹھہراتے ہیں۔

یہی اختلاف عارف حصاری اور حافظ کمیرپوری کا ہے کہ عارف حصاری نماز وغیرہ ارکان اسلام کو ذات ایمان کا جزو قرار دیتا ہے اور حافظ کمیرپوری کمال ایمان کی شرط کہتے ہیں۔ اب محدثین کرام جو مسلک اہل حدیث رکھتے ہیں' اُن کا مسلک سنئے :

"رسالہ التبیان" مصنفہ مولانا عبدالجبار محدث کھنڈیلوی مرحوم کے ص-۲۰ میں لکھا ہے :

قال صاحب المصابیح اتفقت الصحابة والتابعون فمن بعدهم من علماء اهل السنة علی ان الاعمال من الایمان لقوله تعالٰی انما المؤمنون الذین اذا ذکر اللّٰه (الایة) فجعل الاعمال ایمانا الٰی آخرها اولئک هم المؤمنون حقا یعنی لا شک فی ایمانهم۔ (تفسیر خازن جلد-۳' ص-۱۷۷) "یعنی امام حسین بن مسعود فراء بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ تمام صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد کے علماء اہل سنت کا یہ مسلک ہے کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں کیونکہ سورہ انفال کی آیات اس پر دلیل ہیں جن میں اعمال جوارح نماز وغیرہ کا ذکر ہے اور اس کے بعد یہ حکم لگایا گیا کہ جن میں یہ اعمال ہیں وہ پکے (پختہ) مومن ہیں اور ان کے ایمان میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس سے اعمال قلوب اور اعمال جوارح' ایمان کی حقیقت میں داخل وثابت ہیں۔"

فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں : لقیت اکثر من الف رجل من علماء الامصار فما رأیت احدا منهم یختلفون فی ان الایمان قول وعمل یزید وینقص۔ "یعنی میں ایک ہزار سے زیادہ مختلف شہروں کے علماء اہل سنت سے ملاقات کر چکا ہوں۔ اس بات میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ ایمان' قول اور عمل کا نام ہے اور وہ بڑھتا گھٹتا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب وسنت اور اقوال صحابہ کرام' تابعین عظام سے ساٹھ کے قریب دلائل پیش کئے ہیں کہ اعمال' ایمان کی حقیقت میں داخل ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں جو لکھا ہے کہ معتزلہ وخوارج اعمال کو صحت ایمان

کی شرط ٹھہراتے ہیں اور سلف' کمال کی شرط ٹھہراتے ہیں۔ اس پر محدث کھنڈیلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل صحیحہ سے بحث کر کے یہ لکھا ہے کہ فقول الحافظ غلط لیس بصحیح لان السلف صرحوا ان الاعمال اجزاء حقیقة من الایمان۔ "یعنی حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا قول غلط ہے' صحیح نہیں ہے کیونکہ سلف صالحین نے صاف صراحت کر دی ہے کہ اعمال' ایمان کی حقیقت کے اجزاء ہیں۔"

اس رسالہ پر جمعیت اہل حدیث کے موجودہ امیر مولانا حافظ محمد گوندلوی اور دیگر علمائے جمعیت کی تصدیقی تقاریظ درج ہیں لہٰذا حافظ صاحب کمیرپوری اس مسلک حقہ کی تردید نہیں کر سکتے۔

رسالہ تبیان میں بحوالہ تمہید امام ابن عبدالبراس بات پر علمائے اہل حق کا اجماع نقل کیا ہے کہ "ایمان' قول اور عمل کا نام ہے اور عمل بغیر نیت کے صحیح نہیں ہے اور ایمان طاعت سے بڑھتا اور معصیت سے گھٹتا ہے۔"

اور رسالہ "تبیان" میں لکھا ہے کہ فاهل الاسلام متفقون علی انه من لم یات بالشهادتین فهو کافر واما الارکان الاربعة فقال ابن تیمیة رحمه اللّٰه اختلفوا فی تکفیر تارکها واما نحن فنذهب الی ان تارکها کافر لاسیما الصلٰوة المفروضة۔ "یعنی اس بات پر تو سب اہل اسلام متفق ہیں کہ جو شخص کلمہ شہادت نہ کہے گا وہ کافر ہے لیکن ارکان اربعہ کے تارک کے بارے میں اختلاف ہے۔"

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے لیکن ہمارا مذہب یہ ہے کہ وہ کافر ہے۔ خصوصاً نماز کا تارک تو اصلی کافر ہے۔ اب حافظ صاحب کمیرپوری کو اختیار ہے کہ جس کے ساتھ چاہیں اپنا مزاج ملالیں مگر امام المحدثین امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ سن لیں کہ وہ آپ کے مزاج کی کس طرح تنقید کرتے ہیں۔ امام صاحب موصوف رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے "عقیدہ اہل سنت" اس رسالہ کے ص-۳ میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھا ہے' جس کا ترجمہ مولانا محمد اشرف صاحب مرحوم نے یوں کیا ہے : "سب اہل علم' اہل حدیث اور اہل سنت (جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق اور پکے شیدائی ہیں) اور اس اتباع سنت کے بارے میں' ان کی اقتداءِ اور پیروی کی جاتی ہے' اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک یہ مذہب ہے اور اسی مذہب پر میں نے حجاز (مکہ مکرمہ ومدینہ منورہ) شام اور دوسری جگہ کے علماء کو پایا ہے

پس جو کوئی ان عقیدوں میں سے کسی ایک کا بھی خلاف کرے یا اس پر طعن کرے یا اس کے قائل پر نکتہ چینی کرے' وہ مخالف' بدعی' اہل سنت والجماعت اور اہل حدیث سے خارج ہے۔"

شیخ المشائخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لا یکون للّٰہ ولی الا علی اعتقاد احمد بن حنبل۔ (التاج المکلل ص۔۱۴۴) "یعنی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ والا عقیدہ رکھنے کے بغیر کوئی شخص ولی نہیں ہو سکتا۔"

اب ایمان کے بارے میں حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا عقیدہ سنئے۔ آپ عقیدۂ اہل سنت کے ص۔۳۰ پر تحریر فرماتے ہیں:

ان الایمان قول ونیة وتمسک
بالسنة والایمان یزید وینقص

"ایمان' قول اور نیت اور طریقہ نبویہ کے مطابق احکام شرعیہ پر عمل کرنے کا نام ہے اور یہ بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے۔"

پیر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عقیدہ کو یوں بیان فرمایا ہے کہ "ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ تحقیق' ایمان اقرار کرنا ہے زبان سے اور پہچان کرنا ہے دل سے اور عمل کرنا ہے اعضاء سے۔"

عقائد محمدی جو ترجمہ ہے "عقیدہ اہل سنت" کا' اس کے ص۹ پر لکھا ہے: "مرجیہ وہ فرقہ ہے جن کا عقیدہ ہے کہ ایمان نام ہے صرف تصدیق کا .... (تا آخر) جو شخص فقط زبان سے ایمان لائے اگرچہ کوئی سا عمل کرے' تاہم وہ سچا پکا مومن ہے۔ یہ کل عقیدہ مرجیہ کا ہے اور یہ بڑا خبیث عقیدہ ہے۔"

اور اس صراحت سے یہ ثابت ہوا کہ اہل سنت کے نزدیک ایمان کی ماہیت میں عمل داخل ہے اگر اعمال وفرائض کا تارک ہوا تو وہ مومن نہ ہوا۔ اور مرجیہ کہتے ہیں کہ "ایمان قول اور تصدیق کا نام ہے۔" بعض مرجیہ صرف قول کو ایمان ٹھہراتے ہیں۔ بعض صرف تصدیق کو اور بعض قول وتصدیق دونوں کو۔"

اس کی تفصیل امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الایمان" میں اور محدث کھنڈیلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تبیان میں کی ہے۔ جب یہ ثابت ہوا تو جس نے نماز ترک کردی' وہ مومن نہ رہا۔ اسی لیے احادیث میں اس کو کافر ومشرک کہا گیا ہے کہ یہ کفر وشرک متضاد ایمان ہے اور اس پر

ایسے مضبوط قرائن پائے جاتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کفر حقیقی، متضاد ایمان مخرج از اسلام ہے۔

۱۔ بے نماز کے کفر حقیقی پر قرائن قویہ: حدیث میں آیا ہے کہ بین العبد وبین الکفر والایمان الصلوة فاذا ترکھا فقد اشرک۔ (کتاب الصلوٰة ابن القیم وغیرہ) "یعنی کفر اور ایمان کے درمیان حد فاصل نماز ہے جسنے اس کو ترک کر دیا وہ بندہ مشرک ہو گیا۔"

کچھ شک نہیں کہ اس حدیث صحیح میں کفر کے مقابلہ میں لفظ ایمان وارد ہے جو حقیقی ایمان ہے تو کفر سے بھی مراد حقیقی کفر ہے۔ کیونکہ وہ ایمان حقیقی کے مقابلہ میں وارد ہے۔ پھر تارک صلوٰة پر شرک کا جرم لگایا گیا ہے تو اس سے پوری تائید ہو گی کہ یہ کفر دون کفر اور شرک دون شرک نہیں ہے بلکہ وہ کفر اور شرک حقیقی ہے جو متضاد ایمان ہو کر تارک نماز کو مشرک قرار دے رہا ہے۔

۲۔ حدیث میں ہے: "جو شخص نماز کی حفاظت نہ کرے گا تو اس کی نجات کی کوئی دلیل نہ ہو گی اور وہ ڈبل کفار فرعون، قارون، ہامان وغیرہ کے ساتھ شامل کیا جائے گا۔ یہ کفار حقیقی کفر رکھنے والے خارج از اسلام ثابت ہوا۔ اسی لیے ڈبل کافروں کے ہمراہ قیامت کو رکھا گیا۔"

۳۔ حدیث میں آیا ہے کہ: لا سھم فی الاسلام لمن لا صلوٰة له ولا صلوة لمن لا وضوء له۔ (ترغیب) "یعنی بے نماز کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے اور جس کا وضو نہیں اس کی نماز نہیں ہے۔" اس حدیث میں لا نفی جنس کا ہے کہ بے نماز کے اسلام کی اسی طرح نفی ہے جس طرح بے وضو کی نماز کی نفی ہے، دونوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

۴۔ چوتھا قرینہ سب سے زیادہ مضبوط ہے اور کفر دون کفر کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: ولا تترکوا الصلوٰة عمداً فمن ترکھا عمدًا متعمدًا فقد خرج من الملة۔ (کتاب الصلوة لابن القیم) "یعنی تم نماز کو عمداً ترک نہ کرو کیونکہ جس نے عمداً اور قصداً نماز چھوڑ دی، وہ ملت اسلامیہ سے خارج ہوا۔

اس حدیث نے حافظ صاحب کمیرپوری کی تاویل کفر دون کفر کو باطل کر دیا ہے اور اس سے ثابت ہوا کہ یہ کفر حقیقی ہے جو بے نماز کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ پس ان کا یہ کہنا کہ بے نماز کافر تو ہے لیکن اسلام سے خارج نہیں، سراسر غلط ہو گیا ہے۔

اس حدیث کی سند لا باس بہ ہے۔ اگر یہ ضعیف بھی ہو تب بھی کفر کے دو احتمالوں میں سے ایک احتمال کفر حقیقی کو متعین کرتی ہے۔ مثلاً نماز عصر کی حدیث میں ثلاثۃ فراسخ اور ثلاثۃ امیال کے الفاظ میں تردد ہے تو دوسری حدیث میں فرسخ کی تعیین آگئی ہے تو احتمال ثلاثۃ امیال متعین ہو گیا۔

اس لئے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا : ویقتضی الجواز فی اقل من ثلاثۃ فراسخ۔ "کہ تین فرسخ سے کم مسافت میں بھی قصر جائز ہے۔"

بہرحال کسی حدیث میں تردد یا اجمال ہو اور دیگر کسی حدیث میں اس کی صراحت آجائے۔ اگرچہ وہ ضعیف ہو تو دوسرا احتمال رفع ہو کر ایک متعین ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی حکیم الامت الحنفیہ نے اپنی آخری کتاب بوادر النوادر جلد-۲' ص-۴۶۷ میں لکھا ہے : "حدیث ضعیف کو احد الشقین کے لیے مرجح اور موئد کہہ سکتے ہیں۔"

میں کہتا ہوں "حدیث ضعیف ساقط الاعتبار ہوتی ہے لیکن دوسری حدیث اس معنی پر آجائے وہ اگرچہ ضعیف ہو تب پہلی حدیث ضعیف بھی قابل اعتبار ہو جائے گی۔"

علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نیل الاوطار جزء-۶' ص-۳۰۵ میں فرماتے ہیں : وروایۃ الضعیف مع الضعیف توجب الارتفاع عن درجۃ السقوط الی درجۃ الا عباد۔ "یعنی جب ایک روایت ضعیف کو دوسری روایت ضعیف کے ساتھ ملایا جائے جبکہ مفہوم دونوں کا ایک ہو تو وہ درجہ سقوط سے نکل کر درجہ اعتبار کو پہنچ جاتی ہے۔ تو پھر کسی حدیث کے احد الشقین کے لیے مرجح کیوں نہ ہو گی۔" خلاصہ کلام یہ ہے کہ بے نماز کا کفر مخرج از ملت اسلامیہ ہے۔

۵۔ تارک نماز پر احادیث نبویہ میں کفر و شرک ہر دو کا اطلاق وارد ہے اور بظاہر عرف شرع یہ ہے کہ جس پر ان ہر دو کا اطلاق آجائے وہ حقیقی کافر ہوتا ہے۔ پس ظاہر الفاظ سے عدول کرنا خلاف اصول ہے۔ فتدبروا۔

۶۔ ترک صلوٰۃ کو کفر بواح کے مساوی ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں یہ حدیث متفق علیہ وارد ہے کہ "حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ان امور میں بیعت کی کہ خلفاء کے احکام سمع و اطاعت کریں' عسر یسر' نشاط اور کراہت کی حالت میں مخالفت نہ کریں اور اس امر حکومت میں ان سے منازعت اور بغاوت نہ کریں۔ الا ان تروا کفرا بواحا عندکم من اللہ فیہ برھان۔ "یعنی مگر یہ کہ تم اہل حکومت میں کفر

صریح دیکھو تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس دلیل پائی گئی۔"

اب ایسے خلفاء اور اہل ولائت سے مقابلہ کرنا جائز ہے۔

حاشیہ مشکوٰۃ میں مرقاۃ سے یہ معنی مستفاد ہیں : والمعنی انه حینئذ تجوز المنازعة بل یجب عدم الطاعة۔ "یعنی اگر اہل حکومت سے صاف صریح کفر صادر ہو تو ان کافروں کی اطاعت واجب نہیں ہے۔ منازعت اور مقابلہ کرنا واجب ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ معنی نقل کیا ہے : والمعنی لا تنازعوا ولاۃ الامور فی ولایتھم ولا تعرضوا علیھم الا ان تروا منھم منکرا محققا تعلمونه من قواعد الاسلام فاذا ارایتم ذالک فانکروه علیھم وقوموا بالحق حیث ما کنتم۔ "یعنی اہل حکومت سے ان کے امور حکومت میں نزاع اور تعرض نہ کریں مگر یہ کہ ان میں اصول اسلام کی رو سے کوئی ایسا امر منافی اسلام محقق ہو جائے (جو حد کفر کو پہنچے) تو پھر اس پر انکار کرنا اور مقابلہ جائز ہے۔ تم ہمیشہ حق کے ساتھ رہو جہاں کہیں بھی ہو۔"

اس دلیل شرعی سے ثابت ہوا کہ "کفار حکومت کی اطاعت مسلمانوں پر فرض نہیں ہے بلکہ ان کے کافرانہ قانون اور اعمال پر مقابلہ کرنا واجب ہے۔" اس حدیث میں لفظ اِلَّا آیا ہے۔ حرف استثناء لا کر صرف کفر بواح پر مقابلہ کرنا اور ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچنا بیان کیا گیا ہے۔

اب اس بارہ میں دوسری حدیث ملاحظہ فرمایئے : اشرار حکام و ولاۃ کا ظالمانہ رویہ آنحضرت ﷺ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ تم کو دشمن جانیں گے اور تم ان کو برا اور دشمن سمجھو گے۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا افلا ننبابزھم عند ذالک۔ "کیا اس نازک حالت میں ہم ان کی مخالفت اور مدافعت نہ کریں؟" تب آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا : لا ما اقاموا فیکم الصلٰوۃ لا ما اقاموا فیکم الصلٰوۃ۔ اور دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں : افلا نقاتلھم قال لا ما صلّوا لا ما صلّوا۔ یعنی کیا ہم ایسے ظالموں سے جنگ نہ کریں؟ فرمایا ان سے ہرگز جنگ اور بغاوت نہ کریں جب تک وہ نمازوں کو قائم رکھیں اور ہمیشہ پڑھتے رہیں۔

اس پر حاشیہ مشکوٰۃ میں بحوالہ لمعات یہ لکھا ہے : وفیه ان ترک الصلٰوۃ موجب لمنابزتھم ونزع الید من طاعتھم لان الصلٰوۃ عماد الدین والفارق بین الکفر والایمان

بخلاف سائر المعاصی۔ یعنی نماز چھوڑ دینا' صدروں اور وزیروں' گورنروں حاکموں کا بے نماز ہو جانا' ان کی مخالفت اور عدم اطاعت اور ان سے مقاتلہ کا موجب ہے۔ کیونکہ نماز دین کا بہت بڑا ستون ہے جو کفر اور ایمان کے درمیان فارق ہے یعنی اگر نماز پڑھتا ہے تو مومن ہے اور نہیں پڑھتا تو کافر ہے۔

پس دونوں احادیث کے ملانے سے ظاہر ہوا کہ ترک نماز کفر بواح ہے۔ اگر ترک نماز کو بواح قرار نہ دیا جائے تو یہ حصر باطل ہو جاتا ہے۔ الا ان تروا کفرا بواحا۔ پس یہ قوی دلیل ہے کہ ترک نماز کفر دون کفر نہیں ہے بلکہ کفر بواح ہے۔

۷۔ بے نماز کا کفر حقیقی ہے: کیونکہ اس کفر سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حدیث صحیح میں ہے: من ترک صلوة العصر فقد حبط عمله۔ "کہ جس شخص نے عصر کی نماز ترک کر دی اس کا عمل برباد ہوا۔" یہ کفر حقیقی سے برباد ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن ناطق ہے: ومن یکفر بالایمان فقد حبط عمله "یعنی جس شخص نے ایمان کے ساتھ کفر کیا اس کا عمل حبط ہوا۔" کفر دون کفر سے اعمال صالحہ حبط نہیں ہوتے' کفر حقیقی سے ہو جاتے ہیں۔

۸۔ کلمہ توحید: پر جس طرح اعمال کی قبولیت موقوف ہے یعنی جو لوگ کلمہ طیبہ نہیں پڑھتے وہ موحد نہیں ہیں' ان کا کوئی عمل صالح قبول نہیں ہے اور جو لوگ کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گئے' ان کے اعمال صالحہ قبول ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جو لوگ نمازیں پڑھتے ہیں' ان کے اعمال صالحہ صدقہ' خیرات' روزہ وغیرہ قبول ہیں اور جو نماز کے تارک ہیں' ان کا کوئی نیک عمل قربانی' نماز عید' روزہ' صدقہ' خیرات قبول نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ اول حساب قیامت کو نماز کا ہو گا۔ فان صلحت صلح سائر عمله وان فسدت فسد سائر عمله۔ "یعنی اگر نماز درست ہوئی تو باقی اعمال بھی درست قرار دیے جائیں گے۔ اگر نماز خراب نکلی تو باقی اعمال بھی خراب ہو جائیں گے۔" بحقها قبلت منه وقبل منه سائر ومن ردت علیه صلوة رد علیه سائر عمله۔ یعنی جس نے نماز کو کماحقہ ادا کیا' اس کی نماز قبول کی جائے گی اور باقی اعمال بھی قبول کیے جائیں گے اور جس کی نماز مردود ہو گئی اس کے باقی تمام اعمال بھی مردود ہو جائیں گے۔

تارک صلوٰۃ کے کفر وعدم کفر کی عالمانہ تحقیق: جناب شیخ الاسلام ابن القیم

رحمۃ اللہ علیہ "کتاب الصلوٰۃ" میں فرماتے ہیں : فلا یقبل اللہ من تارکھا صوما ولا حجًا ولا جھادًا ولا شیئًا من الاعمال۔ "اللہ تعالیٰ بے نماز کا نہ روزہ قبول کرے اور نہ حج' نہ صدقہ قبول کرے' نہ جنگ جہاد اور نہ کوئی نیک اعمال قبول کرے۔"

حافظ صاحب کمیرپوری کے مسلمہ مفتی مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے مسئلہ دریافت کیا کہ "زید تارک صلوٰۃ ہے اور دنوں میں نماز نہیں پڑھتا" البتہ ماہ رمضان المبارک میں ایک ماہ نماز پنجگانہ باجماعت معہ تراویح پڑھتا ہے۔ کیا زید رمضان کی حدیث کے مطابق ستر گنا ثواب کا حقدار ہے؟

مولانا نے اس کا جواب یہ تحریر فرمایا : تارک نماز جب تک توبہ کر کے پابند نماز نہ ہو جائے رمضان المبارک کے ثواب موعودہ کا حقدار نہیں۔ (فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱' ص ۳۳۰)

لیکن حافظ کمیرپوری کے نزدیک بے نماز مومن مسلمان ہے' اس کی ہر نیکی قبول ہے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک تھا لیکن زمانہ ہندوستان میں بندہ نے اخبار تنظیم اہلحدیث روپڑ (ضلع انبالہ) میں ان کے مسلک پر شدید تعاقب کیا جو کئی قسطوں میں جاری رہا' اس پر مولانا موصوف رحمۃ اللہ علیہ نے بے نماز کے کفر کی طرف رجحان کر لیا۔

<u>نماز کے بغیر جنت میں داخلہ نہ ہو گا:</u> حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : مفتاح الجنۃ الصلوٰۃ ومفتاح الصلوٰۃ الطھور۔ (رواہ احمد والدارمی والبیھقی فی شعب الایمان واسنادہ صحیح) "یعنی جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی وضو ہے۔"

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ جیسے وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی' اسی طرح نماز کے بغیر جنت میسر نہ ہو گی۔ یہ جو بعض احادیث میں آیا ہے کہ جنت کی کنجی کلمہ ہے' وہ بھی ٹھیک ہے کیونکہ اصل کنجی کلمہ ہے اور نماز وغیرہ ارکان اسلام اس کنجی کے دندانے ہیں۔ اور یہ بدیہی بات ہے کہ جب تک کنجی کے دندانے نہ ہوں' کنجی بیکار ہے۔

<u>نماز میں جلد بازی نہ کرو:</u> جو شخص نماز میں جلد بازی کرتا ہے' اس کو عربی میں مسئی الصلوٰۃ کہتے ہیں۔ وہ بھی بے نماز کے حکم میں ہے۔ چنانچہ ایک شخص مسئی الصلوٰۃ نے نماز پڑھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا : ارجع فصل فانک لم تصل "تو واپس لوٹ کر آ اور نماز دوبارہ پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔" اس نے پھر اسی طرح نماز

پڑھی تو آپ نے پھر وہی ارشاد فرمایا کہ "واپس آ اور پھر دوبارہ نماز پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔ اُس نے تین بار نماز پڑھی تو آنحضرت ﷺ نے اس کی نماز کا اعتبار نہ کیا اور اس کو کالعدم قرار دے کر دوبارہ پڑھنے کا حکم دیا کیونکہ اس کی نماز کے ارکان' رکوع' سجود' قومہ' جلسہ اور ان میں اعتدال اور اطمینان نہ پائے گئے جن کے بغیر نماز باطل ہو جاتی ہے۔ پھر اس نے اپنی بے خبری کی معذرت کی تو آپ نے اس کو شرعی نماز کی تعلیم دی۔

اس سے ثابت ہوا کہ مسئی الصلٰوۃ بری طرح نماز پڑھنے والا بے نماز ہے اور بے نماز کافر ہے تو بغیر ارکان پورے کرنے کے نماز پڑھنے والا بھی کافر ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک شخص مسئی الصلٰوۃ کو آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ وہ رکوع اور سجود پورے نہیں کرتا تھا بلکہ جلد بازی کرتا تھا۔ آپ نے اس کو ارشاد فرمایا : لو مات هذا على حاله هذه مات على غير ملة محمد صلى الله عليه وسلم۔ یعنی اگر یہ شخص جو بری طرح نماز پڑھتا ہے' رکوع اور سجود پورے اطمینان کے ساتھ ادا نہیں کرتا' اسی حالت میں مرگیا تو یہ ملت محمدیہ پر نہ مرے گا' بے دین ہو کر مرے گا۔

یہ حدیث ترغیب ترہیب جلد ا' ص ۳۳۶ میں ہے۔ اس کے حاشیہ پر ایک فاضل محشی لکھتے ہیں : لانه لا يتم اركان صلوته فبطلت فانهدم ركن من اسلامه فخرج منا۔ یعنی اس شخص کے ملت محمدیہ پر ہونے کے باوجود بے دین ہو کر مرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے نماز کے ارکان پورے نہ کئے تو نماز باطل ہو گئی۔ نماز باطل ہوئی تو اسلام کا بہت بڑا رکن گر گیا جس سے وہ شخص اسلام سے خارج ہو گیا۔

اب حافظ صاحب کمیرپوری جو بے نمازوں کی وکالت کر رہے ہیں' ذرا غور و فکر فرما کر یہ بتائیں کہ جب مُسئی الصلٰوۃ کا یہ حکم ہے کہ اگر وہ اسی حالت میں مرگیا تو ملت اسلامیہ سے خارج ہو گا تو بے نماز ملت اسلامیہ سے کیوں خارج نہ ہو گا؟ جو کہ بالکل ہی نماز کا تارک ہے۔ بلکہ بے نماز تو بطریق اولیٰ خارج از اسلام ہو گا۔ جب مُسئی الصلٰوۃ اور تارک نماز بالکلیہ اسلام سے خارج ہوئے تو اس سے ظاہر ہوا کہ بے نماز کے بارے میں جو کفر کا لفظ آیا ہے وہ کفر حقیقی ہے جو مخرج از اسلام ہے۔ کفر دون کفر نہیں ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بے نماز کو کافر کہا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد نے صاف فرمایا ہے : من لم يصلی فهو كافر۔ "جس شخص نے نماز نہ پڑھی وہ کافر ہے۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ مشہور صحابی نے فرمایا : من لم یصلی فھو کافر۔ "جس نے نماز نہ پڑھی وہ کافر ہے۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا : من ترک الصلٰوۃ فقد کفر۔ "جس شخص نے نماز ترک کر دی وہ کافر ہوا۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا : لاحظ فی الاسلام من ترک الصلٰوۃ۔ "جس شخص نے نماز ترک کر دی' اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہ رہا یعنی وہ خارج ہو گیا۔" حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا : لا ایمان لمن لا صلٰوۃ لہ ولا صلٰوۃ لمن لا وضوء لہ۔ "یعنی جس کی نماز نہیں ہے' اس کا ایمان نہیں ہے۔ اور جس کا وضو نہیں' اس کی نماز نہیں ہے۔" حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا : من ترک الصلٰوۃ فلا دین لہ۔ "یعنی جس شخص نے نماز ترک کر دی اس کا کوئی دین نہ رہا' وہ بے دین ہو گیا۔"

اسی طرح دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے بلکہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بے نماز کے کفر پر اجماع ہے۔ چنانچہ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے : کان اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم لا یرون شیئا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلٰوۃ۔ "یعنی تمام اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سوائے نماز کے کسی عمل کے ترک کرنے کو کفر نہ جانتے تھے۔"

حضرت ایوب تابعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا : "نماز چھوڑنا ایسا کفر ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔"

ان اقوال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صاف ثابت ہوا کہ "بے نماز کا کفر حقیقی ہے۔ اگر کفر دون کفر ہوتا تو اس طرح صاف طور پر کھلم کھلا کافر نہ کہتے۔" یہ سب اقوال ترغیب وترہیب وغیرہ میں مذکور ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً روایت کیا ہے : من ترک الصلٰوۃ متعمدًا فقد کفر جھارا۔ "یعنی قصداً نماز چھوڑنے والا کھلم کھلا کافر ہے۔"

حافظ گمیرپوری صاحب نے بے نمازوں کی وکالت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "غفلت اور سستی سے نماز ترک کرنا کفر نہیں۔" یہ سراسر خلاف حدیث ہے۔ چنانچہ ترغیب میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : بکروا بالصلٰوۃ فی یوم الضیم فانہ من ترک الصلٰوۃ فقد کفر۔ "یعنی ابر والے دن نماز سویرے پڑھو' ابر کی وجہ سے سستی نہ کرو کیونکہ جس شخص نے نماز چھوڑ دی' وہ کافر ہوا۔" اس حدیث میں فا تعلیلیہ ہے کہ نماز ترک کرنا کفر ہے۔

یہ دلائل صریحہ اور گیارہ قرائن صاف ناطق ہیں کہ بے نماز کافر خارج از ملت اسلامیہ ہے۔ پس کفر دون کفر کی تاویل باطل ہو گئی۔ رأیت احد عشر کوکبا۔

چونکہ ان کے مقابلہ میں کوئی قرینہ صارفہ موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ بے نماز کا کفر دون کفر ہے، کفر حقیقی نہیں ہے۔ پس زیادہ سے زیادہ یہ غیر مکفرین مؤولین کلمہ وغیرہ اور احادیث شفاعت کو لا کر بے نماز کو قابل شفاعت اور جنتی ثابت کریں گے۔ سو یہ خلاف اصول اور سراسر نادانی پر مبنی ہے۔ کیونکہ مولانا سیالکوٹی حافظ ابراہیم مرحوم نے شہادۃ القرآن میں یہ اصول لکھا ہے کہ: "دلائل خاصہ کے مقابلہ میں دلائل عامہ پیش کرنا درست نہیں ہے۔ یہ گمراہ فرقوں کا طریقہ ہے۔ فاتحہ خلف الامام کے موضوع پر بحث ہو یا مرزائیوں سے ختم نبوت پر تو یہ لوگ اس اصول کے خلاف کرتے ہیں۔ افسوس بعض اہل حدیث کا بھی یہی طریقہ ہے جو باطل ہے۔ (فقط)

کتبہ عبدالقادر عارف حصاری

تنظیم اہل حدیث لاہور

جلد-۲۴، شمارہ-۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵

مورخہ ۲۳ و ۳۰/ اپریل و ۷ و ۱۴ و ۲۱ و ۲۸ مئی و ۴ و ۱۱ و ۱۹، ۲۵ جون و ۲ و ۹ و ۱۶ و ۲۳ جولائی اور ۶ و ۱۳ اور ۲۰/ اگست سنہ ۱۹۷۱ء

۹۹-جے ماڈل ٹاؤن-لاہور
نمبر .....19190....